★ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیتِ داعیٔ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خط

★ تذکرہ و تبصرہ (سیاسی صورت حال پر امیر تنظیم کا تبصرہ اور مشور

رفقاء و احباب نوٹ فرمالیں

اِرسال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام

سالانہ محاضراتِ قرآنی

اِن شاء اللہ العزیز لاہور میں ۲۴ تا ۲۸ مارچ ۸۹ء

اور

تنظیم اسلامی کا

چودھواں سالانہ اجتماع

لاہور ہی میں ۲۹ اور ۳۰ مارچ کو منعقد ہوگا

یہی ہے رختِ سفر!

تنظیم اسلامی پاکستان کا چودھواں سالانہ اجتماع توانشاءاللہ ۲۹۔ ۳۰ر مارچ ۱۹۸۹ء کو لاہور میں ہوگا اور اس کے ساتھ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے محاضرات قرآنی کے لئے ۲۴ تا ۲۸ر مارچ کی تاریخیں طے ہوئیں ہیں لیکن انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام کراچی میں پچھلے ماہ ۷ا تا ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو جو محاضرات قرآنی "اسلام کا نظام حیات" کے موضوع پر ہوئے' انہوں نے بھی تنظیم اسلامی کے رفقاء کو مل بیٹھنے کا اچھا موقع فراہم کر دیا۔ ملک کے کونے کونے سے ہمارے ساتھی سمٹ آئے تھے اور اگرچہ سب کے لئے اس پروگرام میں شرکت لازم نہ تھی' تاہم ترغیب و تشویق کے نتیجے میں اُن سب لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جانا جو استطاعت و فراغت کا انتظام کر سکے اور یوں اس اجتماع میں ہر علاقے کی نمائندگی بہرحال بھرپور ہو گئی۔ شام کی نشستیں امیر تنظیم اسلامی اور انجمن کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے پانچ لیکچروں پر مشتمل تھیں اور دن کے یومیہ دو پروگرام تربیتی نوعیت کے تھے۔ اول الذکر میں سامعین کی کثیر تعداد شریک ہوتی رہی اور مؤخر الذکر تنظیم کے وابستگان کے لئے مخصوص تھے۔ ان کی نسبتاً تفصیلی روداد "میثاق" کے زیر نظر شمارے میں ہی مل جائے گی' یہاں ان کے بارے میں محض دو پہلوؤں پر گفتگو مقصود ہے۔ ایک یہ کہ تنظیم اسلامی میں اجتماعیت کی بنیاد مقبول عام دستوری و جمہوری انداز کے برعکس بیعت کی مسنون نہج پر ہونے کے باوجود مشاورت و احتساب کا وہ قابل عمل نظام کارفرما ہے جو سیاسی جماعتوں میں تو کیا نظر آتا' آج کی مذہبی جماعتوں اور دینی تحریکوں میں بھی موجود نہیں۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر بجالائیں' کم ہے لیکن بہرحال یہ نعمت اتباع سنت کی برکات میں سے ایک ہے۔ اس پہلو کی تفصیل اور مشاورتی و احتسابی مجالس کی نوعیت و کیفیت کا ذکر بشرط زندگی کسی اور موقع پر ہوگا۔ دوسرا پہلو یہ کہ بعض مہمان مقررین کے خطابات نے سامعین کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان میں سے بھی صرف ایک پر ہی اس صحبت میں بات ہو رہی ہے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی کی ذات والا صفات ہمارے قارئین کے لئے محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ بھارت کے معروف عالم دین ہیں' جامعہ رحیمیہ دہلی کے مہتمم و شیخ التفسیر ہیں۔ تنظیم اسلامی کے ساتھ عمومی اتفاق اور قلبی لگاؤ کا رشتہ رکھتے ہیں۔ اپنے سالانہ معمول کے مطابق پاکستان تشریف لائے اور حسن اتفاق سے ان دنوں کراچی میں ہی مقیم تھے۔ انہوں نے ہی کی ایک نشست میں محفل کو رونق بخشی جس کے دوران بعض رفقاء کا یہ تاثر زبانوں پر آیا کہ تنظیم کی عددی قوت میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو رہا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے اپنی منزل کی طرف کتنا سفر طے کر لیا اور کس قدر ابھی باقی ہے۔ مولانا سے استفادے کے لئے اگلے دن کا تعین پہلے سے تھا جس میں انہوں نے کمال حکمت سے اسی موضوع کو منتخب کیا۔ ان کی سادہ لیکن دل میں اتر جانے والی تقریر نے قلت و کثرت کے وہ پیمانے اور نشانات منزل کو پہچاننے یا شمار کرنے کے وہ معیار دیئے جو معلوم تو سب کو ہیں لیکن ذہن میں مستحضر نہ تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اجتماعیت کی کسی بھی شکل میں شریک افراد کی قلت و کثرت اور اہداف سے قرب یا بُعد کا معاملہ ہمیشہ ہی زیر بحث آتا ہے اور شرکاء کے حوصلے پر اس جائزے کے جو مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں' ان کی اہمیت سے انکار بھی ممکن نہیں۔ تاہم اجتماعیت کی نوعیت و ماہیت اس جائزے کے نتیجے کو باہم دگر بالکل مختلف رنگ دیتی ہے۔ اس فانی دنیا سے متعلق محدود مقاصد اور چند روزہ زندگی کے مدار پر محیط طریق ہائے کار اختیار کرنے والی جماعتوں کی کامیابی و ناکامی کے پیمانے بہت تنگ ہیں جبکہ عاقبت کو مطمحِ نظر بنانے اور منہج نبوی کی اساس پر جمع ہونے والے اس انقلابی گروہ کے لئے فوز و خسران کا مفہوم بہت وسعت رکھتا ہے جو حبل اللہ المتین سے بندھا ہو۔ اور تنظیم اسلامی جیسی انقلابی جماعت کا معاملہ تو اس تناظر میں زیادہ ہی مختلف ہو جاتا ہے جو ایک داعی کی پکار پر جمع ہونے والے افراد پر مشتمل ہے اور جس کے بارے میں اس کے قائد و امیر کا کسی ادعا کے بغیر کہنا محض یہ ہے کہ ایک جماعت بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ الحمدللہ کہ ہمارے رفقاء کے ذہنوں میں اپنی تنظیم کے مقاصد' طریق کار' شرائط شمولیت' عددی قوت اور مختصر تاریخ کے بارے میں مواد کی کمی نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ دم بھر کو من میں ڈوب کر وہ ان میں ربط باہم کا سراغ پا جائیں۔ محترم مولانا اخلاق حسین قاسمی نے ہلکے پھلکے انداز میں جو رہنمائی فرمائی' اس سے سامعین کو دروں بینی میں بڑی مدد ملی۔

ہمیں اللہ والوں کی اس جماعت سے نسبت کا شرف حاصل ہے جس کے امیر محمد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ قدسیوں کے اس گروہ کی ہمسری کا خیال تو ذہن کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا' ہماری حیثیت اس کے لاکھویں درجے میں ہو تب بھی ایک اعزاز ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ تنظیم اسلامی نے اپنے ہدف' طریق تنظیم اور طریقہ کار کو شعوری طور پر اس نہج پر رکھا ہے جو اللہ کے رسولؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ ہم جس راہ کے راہی ہیں اس پر میر کارواںؐ اور قافلہ والوںؓ کے نقوش پا ثبت ہیں۔ کیا ہم نے کبھی سوچا کہ آج کی دنیا میں اجتماعیت اور جماعت سازی کے رائج و معروف اسلوب ترک کر کے اور ہدایت و رہنمائی کے اصل سرچشمہ کی طرف لوٹ کر ہم نے کتنی بڑی سعادت کمائی ہے۔ یہ منزل بھی قوموں کی زندگی میں بڑی کٹھن ہوتی ہے جسے ہم نے اللہ کی تائید و توفیق سے سر کر لیا۔ پھر اس دور میں منفرد ایک افتخار یہ بھی ہمیں حاصل ہے کہ ہماری دعوت کسی نعرے' کسی منشور اور کسی پروگرام کے گرد نہیں گھومتی' تذکیر بالقرآن پر مشتمل ہے۔ ہم اپنی تنظیم کی طرف رجوع کا آوازہ بعد میں لگاتے اور رجوع الی القرآن کی دعوت پہلے دیتے ہیں۔ منزل ہمارے قدموں سے بہت دور تو ہے لیکن نظروں سے اوجھل نہیں۔ یہ اطمینان ہمیں ضرور میسر ہے کہ اسی راہ پر گامزن ہیں جو منزل مقصود ہی کی طرف جاتی ہے۔

ہمارے بزرگ مولانا قاسمی نے فرمایا کہ تنظیم اسلامی کے رفقاء اپنی تعداد کی قلت پر کیوں ہراساں ہیں۔ کیا انہیں یاد نہیں کہ بدر کے میدان میں ہمارے آقا و مولاؐ نے تین سو تیرہ افراد کو لا کھڑا کیا اور خود اپنے رب کے حضور سجدے میں گر گئے تھے کہ اے اللہ! یہ میری تیرہ سالہ محنت کی کمائی ہے جو اگر اس معرکہ میں کام آ گئی تو روئے ارضی پر تیرا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا۔ اپنے بارہ تیرہ سال کے کام کے ثمرات سے بددلی محسوس کرنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ تین سو تیرہ نفوس مطہرہ ہما شما کے نہیں' حضور نبی کریمؐ کے کام کا حاصل تھے جنہیں جنت و دوزخ سامنے پڑی نظر آتی تھی' جن پر قرآن مجید نازل ہو رہا تھا اور قدم بقدم رہنمائی کے لئے فرشتے آتے تھے۔ مولانا نے ہمیں مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہی کیوں ہوتا ہے کہ اب تک ہم نے حاصل کیا کیا ہے۔ یہ حاصل کیا کم ہے کہ میرے سامنے ڈھائی تین سو اللہ کے بندے بیٹھے ہیں جو ملا مولوی نہیں لیکن چہروں پر مسنون داڑھیوں کی بہار رکھتے ہیں۔ پٹھان' پنجابی' سندھی' بلوچی اور مہاجر ہیں لیکن ایک ہیں۔ بریلوی' دیوبندی اور وہابی ہیں لیکن اپنے آپ کو صرف مسلمان سمجھتے ہیں۔ کاروبار میں' ملازمتوں میں اور بال بچوں میں مصروف رہنے والے ہیں لیکن چھ سات دن نکال کر دور دو

نزدیک سے محض دین کے لئے چل کر آئے ہیں۔ اللہ کے ایک بندے ڈاکٹر اسرار احمد کی محنت کا جو مولوی نہیں جدید تعلیم یافتہ ماڈرن آدمی ہے' ثمرہ اس سے بہت کم ہوتا تب بھی بہت تھا کہ ہزار بارہ سو مسلمانوں کو اس نے دین کے لئے جوڑ دیا ہے۔ آپ لوگ بے تاب کیوں ہیں' وہ مرحلہ بھی آ کر رہے گا جب آپ کو نقد جاں ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترنا ہو گا' فی الحال توجمع ہونے اور جُڑنے کو غنیمت جانئے اور تیاری کا حق ادا کیجئے۔ مولانا نے کہا کہ میں علماء کے حلقوں میں جاکر کہا کرتا ہوں کہ اس ماڈرن آدمی سے خوف نہ کھایئے۔ وہ تو آپ کا اکرام کرتا ہے' آپ کے بزرگوں کا خوشہ چیں ہے اور پڑھے لکھے لوگوں کے مجمع میں' خالص مسلم لیگی ذہن رکھنے والوں میں بھی حضرت شیخ الہند" اور مولانا مدنی" کی مدح میں رطب اللسان رہتا اور ان سے استفادے پر فخر وانبساط اور ممنونیت کا اظہار کرتا ہے۔

یہ سب باتیں بڑی دل خوش کن تھیں۔ پژمردہ روحوں میں زندگی کی جوت جگانے والی تھیں لیکن ہمارا کوئی ساتھی اگر زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو' ہم چو ما دیگرے نیست کا زعم اگر پیدا ہو گیا ہو تو گھاٹے کا سودا ہے۔ اپنی قلت کو کثرت میں ہمیں بہرحال تبدیل کرنا ہے۔ وقت فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے۔ عشرتِ منزل کو تو حاشیۂ خیال میں بھی لانے کا موقع نہیں آیا۔ ابھی تو تپتی راہیں ہمیں پکار رہی ہیں' گھنیری چھاؤں کو پاؤں نہ پکڑنے دیجئے۔ اور قلت کو کثرت میں بدلنے کی کوشش میں اپنے آپ کو نہ بھول جایئے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک اکائی ہے اور انہیں اکائیوں کے تانے بانے سے ہماری اجتماعیت کا سائبان تیار ہوا ہے۔ اس تانے بانے میں کمزوری ہوئی' ان میں ایک بھی تار عنکبوت ہوا تو اس سائبان میں سے آفات بارش کی طرح ٹپکیں گی' دھوپ کی طرح نہلائیں گی۔ ساتھیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ضرور ڈال کر چلئے لیکن قدم اپنے مضبوط رکھئے تاکہ یمین و یسار جو بھائی آپ کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں انہیں کھڑا رہنے اور چلتے رہنے میں آسانی ہو' سہارا ملے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ہر آن اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ انانیت اور کہیں نہیں صرف یہاں مطلوب و محمود ہے۔ میں اگر مضبوط ہوں تو تنظیم بھی مضبوط ہے۔ میرے فکر میں اگر خامی نہیں تو تنظیم بھی کسی کجی کا شکار نہ ہو گی۔ میرا مقصود رضائے الٰہی ہے تو تنظیم بھی صراط مستقیم پر گامزن رہے گی' دائیں بائیں جھاڑ جھنکار میں الجھ کر نہ رہ جائے گی۔ میں فعال ہوں تو تنظیم بھی سرگرم عمل ہے۔ میں نے اپنی ترجیحات میں دین کی منشاء کے مطابق تقدیم و تاخیر کر لی ہے تو تنظیم کی ترجیحات میں کبھی الجھاؤ پیدا نہ ہو گا۔ میں محنت و ایثار کی روش پر چل نکلا ہوں تو تنظیم میں اسی شعار کو فروغ ہو گا۔ مجھے خود چراغ راہ بننا

ہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس فردا کا منتظر نہیں رہنا جب بہت چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔

اجتماعیت کا یہ فائدہ تو ہے کہ افراد ایک دوسرے کی کوتاہیوں کی تلافی کرتے ہیں۔ اللہ تعالٰی نے پانچ انگلیاں یکساں نہیں بنائیں۔ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ' لیکن سب کی چمک دمک برابر نہیں ہوتی۔ ہاں جتنی کچھ روشنی قلب و ذہن میں پیدا ہو چکی ہو اسے کام میں لانے' پھیلانے اور عام کرنے میں بخل نہیں کیا جانا چاہئے۔ مقدور بھر کرنے سے ہی بات بنے گی۔ اللہ کا دین آج مغلوب ہے' اس کے خالی تالاب کو ہمیں غلبہ کے دودھ سے بھرنا ہے۔ اس امید میں کہ دوسرے تو دودھ ہی لائیں گے' ہم نے پانی کی لٹیا اس میں جا انڈیلی تو وہ آب آب ہو گا۔ دودھ کے رنگ کا شائبہ بھی شاید اس میں موجود نہ ہو۔ ہفتہ بھر گھر بار سے دور رہ کر' سفر کی صعوبت اور اخراجات برداشت کرنے کے بعد اور بہت کچھ کہنے سننے سے اتنی بات ہی ہماری سمجھ میں آ گئی ہو تو بہت ہے۔ یہی ہے رخت سفر میرے کارواں کے لئے۔

آیئے مل جل کر اللہ تعالٰی سے توفیق طلب کریں۔ اس کی طرف سے توفیق کی ارزانی ہو جائے' ہمیں فکر و عمل کی جو راستی میسر ہے وہ میسر رہے اور ہم میں سے ہر شخص جادۂ عزیمت پر چلتے رہنے کی ٹھان لے تو اسی قلت میں کثرت ہے۔ اس اقلیت کا جذب دروں ہی بوقت ضرورت مقناطیس بن کر اکثریت کو کھینچ لے گا۔ ہمیں ہجوم کی اور دھوم دھڑکے کی اس مرحلے میں ضرورت بھی نہیں جو ہماری توجہ کو تقسیم کرنے کا باعث بنے۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں جلسہ ہائے عام میں خطاب کرنا صرف دعوت کے لئے ضروری ہے' تنظیم و تربیت کے لئے تو ایک ایک دل کے دروازے پر جا کر دستک دینی ہوگی' دستک بھی دھیمی دھیمی جو کواڑوں کو توڑنے والی نہ ہو' کھلوا کر دم لے۔ ہمارے تخاطب میں وہ سوز و گداز ہو' ایسی ہمدردی ہو کہ دلوں پر جو روح ربانی کے مسکن ہیں' تالے نہ پڑ جائیں۔ کوئی بھی اپنے کواڑوں کو مقفل نہ کرے' اب یہاں روز کوئی درد لئے آئے گا۔

تصویر کے دو رُخ

جمہوریت کی بحالی باعثِ مسرت لیکن ایک اسلامی ملک میں خاتون کا سربراہ بننا مقامِ افسوس ہے

ذیل میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دو خطاباتِ جمعہ کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ ۲ دسمبر کے فکر انگیز خطاب میں محترم ڈاکٹر صاحب نے محترمہ بے نظیر کے وزیر اعظم نامزد کیے جانے پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور گویا اس طرح باشعور دینی حلقوں کے جذبات و احساسات کو زبان کا لبادہ پہنایا ہے۔ ۹ دسمبر کا خطاب موجودہ سیاسی حالات کے تناظر میں مذہبی اور دینی جماعتوں کی خدمت میں اُن گزارشات اور مشوروں پر مشتمل ہے جن کا ذکر اس سے قبل منتشر انداز میں مختلف تقاریر میں آ چکا ہے تاہم اِس خطاب میں اُن سب کو جامع اور مربوط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ دونوں خطابات ہفت روزہ 'ندا' کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں۔

(ادارہ)

حمد و ثنا کے بعد!

"جیسی عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں اسی کے مثل ان کے حقوق بھی ہیں دستور کے موافق' اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہے اور اللہ سب پر غالب ہے' حکمت والا" (سورۃ البقرہ آیت ۲۲۸) "اور مت تمنا کرو اس معاملے میں جس میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو (خیر و شر) وہ کماتے ہیں اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو (نیکی یا بدی) وہ کماتی ہیں .. مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے"۔ (سورۃ النساء آیات ۳۲ اور ۳۴)

"کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے' ہنستے مسکراتے' بشارتیں حاصل کرتے اور کتنے ہی چہرے اس روز غبار آلود ہوں گے' ان پر چھائی ہوگی سیاہی (سورۃ عبس آیات ۳۸ تا ۴۱)

حضرات! آج میں اپنی گفتگو کا آغاز سورۃ عبس کی آیات کے حوالے سے کر رہا ہوں اس لئے کہ اس میں میدان حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ حساب کتاب کے انتظار میں کھڑے

ہوں گے تو ان کی کیفیات بڑی متضاد ہوں گی۔ الفاظ مبارک یہ ہیں "وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○" بہت سے چہرے اس دن روشن اور تابناک ہوں گے اور ہنس رہے ہوں گے یا یوں کہئے کہ تبسم ہو گا ان کے چہروں پر جیسے انہیں کوئی بہت بڑی خوشخبری ملنے والی ہے۔ اس کے برعکس "وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ" بہت سے چہرے اس دن ایسے غبار آلود ہوں گے جیسے دھواں سا آگیا ہو۔ "تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ" مایوسی کی سیاہی ان پر چھائی ہوئی ہو گی۔ یہ ہے قیامت کا نقشہ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس بڑی قیامت سے پہلے دنیا میں بھی کچھ چھوٹی بڑی قیامتیں آتی ہیں مثلاً ایک قیامت وہ ہے جس کی طرف حضورؐ نے اشارہ فرمایا کہ "جس شخص کا انتقال ہو گیا اس کی قیامت تو واقع ہو گئی"۔ اس لئے کہ جو مہلت عمل تھی وہ ختم ہوئی اب نتیجے کا اعلان یوم قیامت کو ہو جائے گا۔ اسی طرح ہائی سکول کے طلبہ کا ہی وہ نقشہ ذہن میں لائیے جب وہ رزلٹ سننے کے لئے سکول کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ عام طور پر وہ طلبہ جنہیں اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے بڑے خوش و خرم نظر آتے ہیں اور وہ جنہوں نے پورا سال پڑھائی کی جانب کوئی توجہ ہی نہیں دی' ناکامی ان کے چہروں پر لکھی نظر آتی ہے۔

ملک میں آج وہی نقشہ ہے

آپ میں سے سب کا احساس ہو گا اور مجھے بھی شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے کہ آج ہماری قوم واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کے ہاں خوشیوں کے شادیانے بج رہے ہوں گے' جشن کی تیاریاں ہوں گی اور نجانے ابھی اس جشن کے سلسلے میں

[illegible]

اور کیا ہو گا۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں کہ جن کے چہرے پر افسردگی ہے' مردنی چھائی ہوئی ہے اور مایوسی کی سی کیفیت ہے۔ یہ دو بالکل متضاد کیفیات آج ہمارے ملک میں بہت نمایاں ہیں۔ اللہ کرے کہ اس معاملے میں جذبات بے قابو نہ ہوں جشن منانے والے بھی حدود سے تجاوز نہ کریں' دوسروں کے جذبات کا لحاظ کریں اور جو افسردگی کا شکار ہیں' ان کی مایوسی بھی

اس درجے کو نہ پہنچ جائے کہ جذباتی طرزِ عمل اختیار کرلیں۔ اس لئے کہ یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہے
ر قومی سطح پر سیاسی جماعتوں کا ایک اور امتحان ہے جس سے چند دنوں میں قوم کو گذرنا ہے۔
م مشورہ دے سکتے ہیں اور دعا کرسکتے ہیں کہ جیسے پچھلے مراحل سے ملک و قوم کو اللہ تعالیٰ نے
یثیت مجموعی بخیر و عافیت گذار دیا ہے۔ ویسے ہی اس مرحلے پر بھی لوگوں کو ہمت دے کہ اپنے

ذبات کو قابو میں رکھیں اور ان لوگوں کو مزید رنج پہچانے والے انداز اختیار نہ کریں جو ناکام
وئے ہیں۔ جو لوگ ناکام ہوئے وہ بھی یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ جمہوریت کی گاڑی پٹڑی پر
چلے گی تو یہ مراحل بار بار آئیں گے۔ یہ کوئی آخری شکست اور آخری فیصلہ نہیں ہے۔ میرا تو
ندازہ ہے کہ بمشکل ڈیڑھ دو سال کے اندر دوسرا الیکشن اس ملک میں ہو کر رہے گا اور اسی وقت
ب پائیدار نتیجہ بر آمد ہو گا۔ ملک میں گیارہ برس تک سیاسی گھٹن رہنے کے بعد یہ سلسلہ ختم
ہے تو اس کے نتائج غیر معمولی ہیں اور ان میں ردعمل کو بہت دخل حاصل ہے۔ اس
یقت کو سامنے رکھیں اور آئندہ کے لئے ہمت کریں۔ اپنے اپنے نظریات اور اپنے اپنے
وگرام سامنے لائیں' اپنی اپنی جماعتوں کو منظم کریں اور ان میں کاڈر معین کریں۔
ا ء اللہ تعالیٰ یہ گاڑی آگے چلے گی تو اس میں سے خیر بر آمد ہو گا۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا
۔ وہ ہار جیت تو بس ایک ہے جس کے بعد کوئی ہار اور جیت نہیں اور وہ قیامت کے دن کی ہار
ہے' ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ جو اس روز جیتا' وہ جیتا جو ہارا' وہ ہارا۔ دنیا میں تو یہ
لات چلتے رہتے ہیں ہماری کرکٹ ٹیم پے بہ پے شکستیں کھانے کے بعد بھی ہمت نہیں
رتی' از سرِ نو کوشش شروع کر دیتی ہے۔ ہاکی میں ہم اپنا اعزاز عالمی سطح پر کس بری طرح کھو
ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کھیل کو چھوڑ ہی دیا جائے۔ سیاست کے
لے میں بھی وہی سپورٹس مین سپرٹ سیاسی کارکنوں کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے۔ بہرحال
ک اور بجھے چہروں کی یہ جو تقسیم آج کے دن ہمارے ملک میں نمایاں ہے اس کی سب سے
مثال سندھ کی ہے۔ اندرون سندھ پیپلز پارٹی کو جو فتح حاصل ہوئی ہے اس کی مثال ۷۰ء
عوامی لیگ کی فتح تھی بلکہ وہ بھی نہیں بنتی۔ اس لئے کہ وہاں بھی کچھ لوگوں نے بڑا مقابلہ کیا
ہ سندھ میں تو مقابلہ رہا ہی نہیں۔ اسی طرح کراچی میں ایم کیو ایم نے جس طرح کی فتح

حاصل کی ہے اس کی بھی ہمارے ملک کی تاریخ میں کوئی مثال موجود نہیں۔ چنانچہ سندھ میں اترے ہوئے چہرے کم ہیں اور تروتازہ زیادہ۔ پنجاب اور سرحد میں اس کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں دونوں گروہ برابر کی چوٹ ہیں۔ پنجاب میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو فتح حاصل ہوئی تو صوبائی انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد بازی لے گیا اور کچھ ایسا ہی معاملہ سرحد کا بھی ہے۔ بلوچستان کی حد تک کوئی صورتحال واضح نہیں ہے۔

مسرت اور غم کا امتزاج

اب اس پس منظر میں عرض کر رہا ہوں کہ ایک کیفیت میری ہے جو ان دونوں سے بالکل مختلف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی اسی کیفیت میں ہیں۔ اگرچہ ملک کی آبادی کے اعتبار سے انہیں MICROSCOPIC MINORITY خوردبینی اقلیت ہی کہا جا سکتا ہے۔ میرا' میرے ساتھیوں اور ہم خیال لوگوں کا معاملہ اس اعتبار سے بالکل منفرد اور ان دونوں گروہوں سے بالکل مختلف ہے کہ ایک پہلو سے ہمیں خوشی ہوتی ہے اور ایک امید افزا صورتحال' مایوسی کے اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن نظر آ رہی ہے تو دوسرے پہلو سے شدید رنج و غم ہے اور سخت فکرمندی اور صدمے کی کیفیت۔ میرے یہ چند دن اسی کیفیت میں گذرے اور خاص طور پر آج کی رات میں نے بڑے کرب میں گذاری ہے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ آج جب یہاں حاضری ہو گی تو کس طرح میں اپنے خیالات کو مجتمع کر سکوں گا اور کیسے اپنے صحیح احساسات بیان کر سکوں گا۔ جب میں یہ سوچ رہا تھا تو بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں کی ایک روایتی بڑھیا یاد آئی جس کے بارے میں آیا کہ ایک طرف دیکھتی تو ہنستی تھی اور دوسری طرف دیکھتی تو روتی تھی۔ بالکل اسی طرح کی کیفیت میری ہے کہ اس وقت دو بالکل متضاد چیزیں میرے سامنے ہیں۔ ایک کے اعتبار سے امید افزا صورتحال ہے تو دوسرے کے اعتبار سے مایوس کن نقشہ سامنے آیا ہے اور جب میں نے غور کیا تو یاد آیا کہ پہلے بھی میں اپنی تقریروں میں ایک الجھن (DILEMMA) کا تذکرہ کرتا رہا ہوں۔ آج وہ الجھن اور تضاد ہماری قومی اور ملی زندگی میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ ایک تضاد جب تک بہت نمایاں نہ ہو بہت کم لوگ اسے پہچان کر اس کا ادراک و شعور حاصل کر سکتے ہیں لیکن جب وہ بہت نمایاں ہو جاتا ہے تو پھر اندھے کو بھی نظر آ جاتا ہے کہ یہ صورتحال ہے۔ آج مجھے یاد آیا کہ ۳۱ اکتوبر ۱۷ء کو یعنی مشرقی پاکستان کے سقوط سے دو مہینے پہلے کی فضا میں بھی میرا احساس بہت شدید

تھا اور میں نے اس روز ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن لاہور کے ایک اجلاس میں جہاں مجھے بطور خاص مدعو کیا گیا تھا کہ ملک و ملت کے اہم مسائل کے موضوع پر جو اس وقت موجود ہیں ہم سے خطاب کرو' تو میں نے جو تقریر کی اور وہ "میثاق" کے شمارہ نومبر ۷۱ء میں شائع ہوئی۔ اس تقریر میں' میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس وقت پاکستان عدم استحکام سے دوچار ہے۔ بلکہ میں اس زمانے میں یہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان روئے ارضی پر غالباً واحد ملک ہے کہ جس میں ذرا آندھی بھی چلتی ہے تو لوگوں کو خطرہ ہونے لگتا ہے کہ ملک رہے گا یا نہیں رہے گا کہیں اور اپوزیشن لیڈر برملا یہ نہیں کہتے کہ ہم اس ملک کو توڑ دیں گے۔ اس وقت تک اگرچہ جی ایم سید صاحب اتنے واضح الفاظ کے ساتھ سامنے نہیں آئے تھے لیکن ولی خان صاحب کے الفاظ یاد ہوں گے کہ یہ زنجیر جو طور خم پر لگی ہوئی ہے' ہم لا کر مارگلہ پر لگا دیں گے۔ گویا برملا وہ اعلان کر رہے تھے کہ سرحد کا ہی نہیں پنجاب کا بھی خاصا بڑا شمالی حصہ ہم کاٹ کر لے جائیں گے' پاکستان سے علیحدہ ہو جائیں گے دنیا میں کون ملک ایسا ہو گا جہاں ایک اہم اپوزیشن لیڈر اس حد تک جاتا ہو

اصل عقدہ کیا ہے

اپنی اس تقریر میں' میں نے تجزیہ کیا تھا کہ اس صورتحال کا سبب کیا ہے اور DILEMMA کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے قومی وجود کا یہ عقدہ لاینحل ہے اور اس کے ساتھ ایک لفظ اور آتا ہے HORNS OF DILEMMA یعنی ایک طرف ایک انتہائی بات ہے اور دوسری طرف دوسری انتہائی بات۔ ان دونوں کے درمیان ایک مخمصہ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایک طرف ہم نے ایک ملک پاکستان بنایا ہے جس کے لئے واحد وجہ جواز صرف اور صرف اسلام ہے' جس کے علاوہ کوئی JUSTIFICATION ہی نہیں۔ یہ ملک ہر اعتبار سے ایک مصنوعی ملک تھا۔ برعظیم پاک و ہند کے درمیان کوئی فطری لکیر نہیں تھی۔ پنجاب کے میدان کیک کی طرح کاٹے گئے حتیٰ کہ اس کے دریا بھی کاٹ دیئے گئے یا تقسیم کر دیئے گئے۔ ہم نے یہاں کے طبعی جغرافیہ کے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔ اتنی بڑی بڑی لنک کینالز (LINK CANALS) کیوں بنانی پڑیں' جو مصنوعی دریا ہیں اس لئے کہ تقسیم بالکل غیر طبعی اور مصنوعی تھی جس میں جغرافیہ کا کوئی لحاظ ہی نہیں رکھا گیا۔ تو یہ جو تقسیم ہوئی ہے' درحقیقت اس کا جواز صرف اور صرف اسلام ہے اور اس کے استحکام کے لئے کوئی بنیاد نہیں

سوائے اسلام کے۔ اس کی یکجہتی کے لئے کوئی فارمولا نہیں سوائے اسلام کے اور بعد میں میں نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں اپنے اس خیال کو بڑی تفصیل سے اور دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کیا ہے کہ کوئی نیشنلزم ہمارے ہاں ممکن نہیں ہے۔ نہ کوئی نسلی قومیت ہے' نہ لسانی قومیت اور نہ علاقائی قومیت۔ بلکہ وطنی قومیت کی تو کلی طور پر نفی کر کے پاکستان بنایا گیا ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہماری قومیت کی بنیاد تو مذہب ہے ہم وطن کی بنیاد پر قومیت کے قائل نہیں۔

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربیؐ است

جس ملک کی بنیاد ہی وطنی قومیت کی نفی پر رکھی گئی ہو' اس کے لئے وطنی قومیت استحکام کی بنیاد کیسے بن جائے گی بہرحال میں نے عرض یہ کیا تھا کہ ایک عقدہ درپیش ہے۔ کہ ایک طرف ایک ایسا ملک ہے جس کے لئے کوئی بنیاد سوائے اسلام کے کوئی اور نہیں اور دوسری طرف اسلام ہی وہ شے ہے جو یہاں نہیں ہے۔ نہ دیکھنے میں ہے' نہ کہنے میں۔ اور رسموں کے سوا اور کسی شے میں اسلام نہیں ہے۔

معاشرے کی حقیقی صورتِ حال

میں حیران ہوتا ہوں کہ میرا اس وقت کا احساس کتنا شدید تھا جس کے تحت میں نے ایک تجزیہ دیا جو اب میری کتاب "استحکام پاکستان" میں شامل ہے کہ اگر میں اس معاشرے کو دیکھتا ہوں تو دین و مذہب کے اعتبار سے مجھے یوں نظر آتا ہے کہ چار ہم مرکز دائرے (CONCENTRIC CIRCLES) ہیں' ایک چھوٹا سا دائرہ' پھر ذرا بڑا دائرہ' پھر اس سے بڑا دائرہ اور آخر میں سب سے بڑا دائرہ جو پورے معاشرے پر محیط ہے۔ بیرونی بڑے دائرے میں ہماری آبادی کا ۸۵ سے لے کر ۹۰ فیصد تک آجاتا ہے جس کا کوئی تعلق سرے سے دین و مذہب کے ساتھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ نام مسلمانوں کے سے ہیں' مردے وہ دفنائیں گے اور شادی ہوگی تو مولوی آ کر نکاح پڑھائے گا۔ باقی اور کوئی سروکار انہیں دین سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر پیمانہ وہ لیا جائے جو محمد عربیؐ نے عطا فرمایا۔ تو الفرق بین الاسلام والکفر الصلوة۔ (اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل نماز ہے) اور یہ نہیں کہ سال میں ایک بار پڑھ لی یا جمعہ کے جمعہ پڑھ لی تو وہ حد فاصل ہو جائے گی۔ مراد نماز

پنجگانہ ہے جس کی پابندی نہ ہو تو نماز نہیں۔ اس پیمانے سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آبادی کے ۸۵ سے ۹۰ فیصد میں اسلام نہیں ہے سوائے ایک نسلی' ایک روایتی اور ایک نام کے مذہب کے۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس اعتبار سے بنگلے اور محل میں رہنے والوں کا حال کٹیا میں بسنے والوں اور فٹ پاتھ پر سونے والوں سے مختلف نہیں۔ کارخانہ دار اور مزدور' زمیندار اور کاشتکار سب یکساں ہیں۔ ہماری عظیم اکثریت کا نماز سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے اندر کے دائرے میں ایک دوسرا حلقہ ہے جس کا مذہب سے کچھ لگاؤ ہے۔ کچھ نہ کچھ نماز روزہ' مسجد سے کچھ تعلق اور یہ کل دس پندرہ فیصد بنے گا۔ لیکن اس کی غالب اکثریت کا تصور مذہب محدود (LIMITED) بھی ہے اور مسخ شدہ (PERVERTED) بھی۔ اس لئے کہ آپ کو یہاں حال وہ ملے گا کہ ایک طرف عمرے ہو رہے ہیں اور سال بہ سال حج ہو رہے ہیں تو دوسری طرف بلیک مارکیٹنگ ہے' سودی کاروبار ہے' ڈٹ کے سٹہ کھیلا جا رہا ہے۔ مسجدوں کی سرپرستی ہے' عالیشان مسجدیں تعمیر کی جا رہی ہیں اور فرشی (WALL TO WALL) کارپٹ بچھائے جاتے ہیں اور بہترین فانوس لٹکا دیئے گئے ہیں لیکن اکثر و بیشتر لوگ جو اس نیک کام میں آگے آگے ہیں' ان کے کاروبار سارے کے سارے حرام پر چل رہے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ تصور مذہب ہے جو نوجوان نسل کو اپنے دین سے برگشتہ کر رہا ہے۔ تیسرا طبقہ اس کے اندرونی چھوٹے دائرے میں ہے اور پانچ سات فیصد سے زیادہ نہیں۔ ان کا تصور دین کافی وسیع ہے' علامہ اقبالؒ کی شاعری' مولانا مودودی کی کتابیں اور دیگر اہل قلم کی تصانیف انہوں نے پڑھی ہیں۔ اس سے تصور تو مل گیا کہ دین مکمل نظام زندگی ہے' غلبہ چاہتا ہے اور ہمیں اس کا پورا نظام قائم کرنا چاہئے۔ لیکن ان لوگوں کی اکثریت بھی یوں سمجھئے کہ ان پانچ سات فیصد میں سے نصف بلکہ زائد' خود کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر دین کا مرثیہ کہتے رہیں گے' افسوس کرتے رہیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے' لیکن ان کی صبح و شام کے انداز نہیں بدلتے۔ کئی کئی کورسز کا ڈنر کھانے کے بعد جب گفتگو ہو گی تو اسلام کے لئے بڑا درد ہو گا اور بڑی خواہش ہو گی کہ اسلام آنا چاہئے' اس کے لئے ہمیں کام کرنا چاہئے' یہ کیا ہو گیا اس نے کیا کہہ دیا اور اس نے کیا کر دیا لیکن یہ کہ اس کے لئے نہ خود کو بدلنے کو تیار' نہ قربانی دینے کو تیار۔ ان میں کل تین چار فیصد ہماری آبادی ایسی ہے جسے فعال (ACTIVISTS) کہا جا سکتا ہے' جو کام کرتی ہے اور کسی نہ کسی تحریک سے وابستہ ہے جو کام کرتے ہیں بھاگ دوڑ کرتے ہیں' لیکن ان لوگوں کا بھی المیہ یہ ہے کہ ایک

دوسرے سے دست و گریباں ہیں لہٰذا غیر مؤثر ہو کر رہ گئے ہیں۔

یہ ہے اسلام کے نقطہ نگاہ سے عملاً ہمارے معاشرے کا حال۔ میرا یہ تجزیہ ۱۷۹۱ء کا ہے لیکن سترہ برس میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں آئی۔

ہماری خوش قسمتی ہی بدبختی ہے

اہل پاکستان کے دینی' ملکی اور قومی فرائض کے ضمن میں بھی میں نے بارہا ایک تجزیہ کیا ہے اور آج پھر عرض کر رہا ہوں کہ ہر انسان پر بہت سے فرائض کا بوجھ ہے۔ لقدْ خَلَقْنا الْاِنسانَ فِیْ کَبَدٍ۔ ایک بوجھ تو وہ ہے جس کے لئے جذبہ اس کے اندر سے ابھرتا ہے لہٰذا وہ بوجھ بھی اٹھاتا ہے' مشقت بھی کرتا ہے اور اس کا کسی پر احسان بھی نہیں دھر سکتا۔ اس کے لئے نہ کوئی ترغیب ضروری' نہ کوئی وعظ کہنے کی ضرورت۔ اندر سے پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کام کرتا ہے کہ اپنے پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اسی طرح ہر شخص کو کوئی نہ کوئی جھونپڑا' کوئی چھت اپنے سر پر چاہئے لہٰذا ہر شخص گھر بنائے گا۔ چاہے جھونپڑا بنائے یا کوئی کٹیا یا محل' بنائے گا ضرور۔ کبھی آپ نے یہ وعظ نہیں سنا ہو گا کہ مکان ضرور بناؤ۔ ایک ذاتی تقاضے کے طور پر شادی بھی ہر شخص کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک جنسی جذبہ ہے اس کے لئے بھی وعظ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شادی کر کے ہر شخص کئی کئی پیٹوں پر مشتمل کنبے کی کفالت کرتا ہے اور ہماری محنت کا ۹۰ فیصد حصہ اسی کام میں لگا ہوا ہے۔ البتہ ان تین ذاتی تقاضوں کے ساتھ تین فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق شعور اور فکر سے ہے۔ لہٰذا ان کے لئے یاد دلانے کی اور وعظ و نصیحت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ تین کیا ہیں؟ پہلا یہ کہ جس ملک میں

> سب سے بڑی ذمہ داری ان کی ہے جو مذہب کے نام پر کام کرتے ہیں' مذہب [illegible]

انسان رہتا ہو اس کی عزت و آزادی کے بقاء اور تحفظ کے لئے ایثار اور قربانی کرے۔ دوسرے یہ کہ جس قوم سے اس کا تعلق ہے اس قوم کے لئے بھی اپنی محنتوں اور صلاحیتوں کا کچھ حصہ وقف کرے جو اگر نہیں کرے گا تو قوم ذلیل و رسوا ہو جائے گی۔ تیسرا یہ کہ جس دین اور مذہب کا نام لیتا ہے' اس کے لئے دل میں خواہش رکھے کہ سربلند ہو اور اس کا بول بالا ہو اور یہ

تب ہی ممکن ہے جب اس کے لئے محنت و مشقت کی جائے۔ وقت' صلاحیت اور توانائی اس پر لگائی جائے۔

ہمارے دین کو شان نصیب ہوئی تھی تو اس لئے کہ صحابہ کرام ؓ نے اپنا تن من دھن لگا دیا۔ ایسے ہی تو نہیں ہو گئی۔ اللہ ہی کو اگر کر دینا ہوتا تو آج بھی کر دیتا۔ حضرت نوح ؑ کے زمانے میں بھی کر سکتا تھا آن واحد میں' لیکن یہ تو لوگوں کی ذمہ داری ہے' وہ دین کے لئے قربانیاں دیں' محنتیں کریں' جدوجہد کریں تو دین سربلند ہو گا اور اگر وہ دین کو پیٹھ دکھا دیں' لگ جائیں اپنے نفس کے تین تقاضوں کے پیچھے تو قوم بھی ذلیل ہو گی' وطن بھی رسوا ہو گا اور دین بھی پامال ہو جائے گا۔

یہی وہ اصل بات ہے جس کے لئے مجھے اتنی تمہید باندھنی پڑی کہ ہم مسلمانان پاکستان اس آسمان تلے اور زمین کے اوپر کی خوش قسمت ترین قوم تھے کیونکہ ہمارے یہ تینوں غیر نفسانی تقاضے ایک وحدت بن گئے تھے۔ ہمارا ملک بھی وہ جو ابن اسلام ہے جیسے حضرت سلمان فارسی ؓ فرمایا کرتے تھے یہ ملک اس نعرے پر وجود میں آیا کہ پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ۔ پھر ہماری قومیت بھی اسلام۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وطن کے اعتبار سے ہم پاکستانی ہیں تو قومیت کے اعتبار سے اس ملت اسلامیہ کا حصہ ہیں کہ جو مشرق اقصیٰ سے مغرب بعید تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور تیسری آخری بات یہ کہ ہمارا دین بھی اسلام ہے۔ اب ہم تین شکار ایک تیر سے کر سکتے تھے یعنی ایک تیر سے دو شکار والے محاورے سے بھی ہمارا معاملہ بہتر تھا۔ اگر دین کو مستحکم کر لیتے تو ملک بھی مستحکم اور قوم بھی مستحکم۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کے لئے کسی ہندوستانی مسلمان کا تصور کیجئے۔ ملک اس کا بھارت ہے۔ وطن کا تقاضا ہے بھارت کے ساتھ وفاداری اور اس کی بہتری کے لئے سوچنا' لیکن دل اس کا پاکستان کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ یہ تضاد اور داخلی جذبوں کا تصادم اس کی شخصیت کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہو رہی ہو تو حب وطن کا تقاضا ہے کہ جس ملک میں اس کا گھروندا اور چھوٹا موٹا کاروبار ہے' اس کی خیر ہو لیکن اس کا دل پاکستان کی فتح کی دعا مانگتا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھئے کہ ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔ ہمارے وطن کا تقاضا' ہماری قومیت کا تقاضا اور ہمارے دین کا تقاضا ایک وحدت ہے۔ لیکن میں کہا کرتا تھا کہ ہم نے اپنی اسی انتہائی خوش قسمتی کو اپنی سب سے بڑی بدقسمتی بنا لیا ہے۔ دین کو ہم نے مستحکم نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا وطن بھی دو ٹکڑے ہوا اور دو ٹکڑے سے آگے ہو کر کئی ٹکڑے ہونے والا تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے بہتری کی شکل پیدا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے

بہتری کی امید ہے ورنہ حالات جس رخ پر جا رہے تھے اس میں ہماری تباہی کے پوری دنیا کے اندر چرچے تھے۔ بین الاقوامی سطح کے تجزیہ نگاروں نے کہا کہ چالیس سال گذرنے کے بعد بھی پاکستان اپنے تشخص کی تلاش میں ہے۔ کراچی سمیت سندھ کی نوجوان نسل تو اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ اس نے پاکستان کو اور اس کے جذباتی عنصر نے اسلام سے بھی رشتہ منقطع کر لیا۔ یہ

اسلام جو عائلی اور معاشرتی نظام دیتا ہے اس میں عورت کا یہ مقام نہیں کہ کسی
مسلمان ملک کی سربراہ ہو۔

صورتحال کیوں ہوئی؟۔ اس لئے کہ اسلام کو ہم نے مستحکم نہیں کیا بلکہ کمزور کیا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ہمارے لئے کوئی وطنیت رہی' نہ قومیت۔ یاد رکھئے کہ کوئی قومیت ایسی نہیں جو پاکستان کو متحد رکھ سکے کیونکہ اب قومیتیں وہ ہیں جو پاکستان کو توڑنے پھوڑنے والی ہیں' ایک اور متحد رکھنے والی نہیں۔ بنگلہ دیش تو بن ہی گیا اور سندھو دیش کے لئے حالات بالکل تیار ہو چکے تھے۔

عورت کی سربراہی

آج اس تضاد کی دونوں انتہاؤں کا جو بھرپور مظاہرہ سامنے آیا ہے۔ اسے اسی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ شاید قبل ازیں اس قدر نمایاں نہیں ہوا تھا آخر کیوں؟ ایک طرف دین میں عورت کا جو مقام ہے اسے کون شخص نہیں جانتا۔ اس پر فنی بحث ہو سکتی ہے کہ حرام مطلق ہے یا نہیں اور کم از کم میں نے یہ لفظ اپنی پندرہ دن پہلے کی تقریر میں استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ یہ یقیناً اسلام کے مزاج کے منافی اور دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام جو عائلی اور معاشرتی نظام دیتا ہے اس میں عورت کا یہ مقام نہیں کہ کسی مسلمان ملک کی سربراہ ہو اور حکومت کی سربراہ بن جائے۔ اور یہ بات اتنی نمایاں ہے کہ آج دینی حلقے چونک گئے ہیں۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کا یہی ملک تھا جس کی قسمت میں یہ ہونا لکھا تھا۔ میں نے بعض دوسرے علماء سے بھی گفتگو کی' معلوم ہوا وہ بھی اس رائے کے ہیں کہ حرام مطلق نہیں ہے البتہ مکروہ ہے۔ مکروہ اس چیز کو کہتے ہیں جو دین میں ناپسند ہو' جو دین کے مزاج کے منافی ہو لیکن اس کی حرمت پر کوئی نص قطعی موجود نہ ہو تاہم یہ مکروہ تحریمی ہے یعنی شدید ناپسندیدہ۔ یہ درست ہے کہ رضیہ سلطانہ اس ملک پر حکمران رہی ہے اور یہ خاندان غلامان کا وہ دور تھا جس سے بہتر دور کبھی بھی اسلام کا اس برعظیم پاک و ہند میں نہیں آیا تھا۔ وہ التمش کی

بیٹی تھی جو خلیفہ مجاز رہے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جیسے ولی اللہ کے۔ التمش کا کہنا تھا کہ میرے بیس بیٹے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایسا لائق نہیں کہ حکومت کی ذمہ داری سنبھال سکے سوائے میری اس بیٹی رضیہ کے۔ لیکن بہرحال شریعت کا معاملہ اپنی جگہ رہے گا اور تاریخی شواہد اپنی جگہ۔ اسی دور میں مصر میں ممالیک کی حکومت تھی۔ ممالیک بھی غلاموں کو کہتے ہیں۔ عالم اسلام کا یہ عجیب دور تھا کہ مسلمانوں کی دو بہترین حکومتیں ہندوستان اور مصر میں غلاموں کے ہاتھ میں تھیں اور ان کا بھی سب سے شاندار زمانہ دو خواتین کی سربراہی میں رہا۔ تاہم عورت کی سربراہی مکروہ تحریمی بہرحال ہے۔ میں نے پندرہ دن پہلے کہا تھا کہ اللہ مجھ پر میری زندگی میں وہ دن نہ لائے کہ میں دین کے کسی منکر کو معروف قرار دوں۔ غلطی مجھ سے بھی ہو سکتی ہے لیکن جو بات میں نے سمجھی ہے اس کے بیان کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ میں نے مرحوم ضیاء الحق کے سامنے کھڑے ہو کر بات کی ہے اور اس دور میں جب میرے دل میں مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی انتہائی عقیدت تھی' جماعت کے سالانہ اجتماع میں انہیں FACE کیا' ان سے اختلاف کیا جبکہ میری عمر بمشکل پچیس برس تھی۔ مجھے اس کے منکر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ میں نے تقریریں کی ہیں اور اس موضوع پر میری کتاب "اسلام میں عورت کا مقام" موجود ہے۔ وہی آیات جن کا میں نے آج حوالہ دیا ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی جیسے ان کے فرائض ہیں ویسے ہی ان کے حقوق ہیں۔ اور یہی دنیا کا معروف اصول ہے۔ جہاں آپ نے ذمہ داری کا بوجھ زیادہ ڈالا ہو' وہیں اختیارات بھی زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ اور "وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ سے ظاہر ہو گیا کہ مردوں کو ایک درجہ فوقیت کا ان پر حاصل ہے تو قرآن کے یہ الفاظ کہاں لے جائیں گے۔ تاویلات اپنی جگہ 'لیکن قرآن کے الفاظ تو یہی ہیں اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے اس نے جو نظام بنایا ہے اختیار مطلق سے بنایا کہ جو چاہے حکم دے تاہم اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔ آگے سورۂ نساء میں فرمایا وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (اور نہ تمنا کیا کرو ان چیزوں کی جن میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی) کسی کو خوبصورت بنایا کسی کو بدصورت۔ اب وہ بدصورت اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہے تو کسی کا کیا بگاڑ لے گا' اپنی ہی شخصیت کو مسخ کرے گا۔ کسی کو مرد بنایا کسی کو عورت' عورت ساری عمر اسی میں پیچ و تاب کھاتی رہے کہ مجھے مرد کیوں نہیں بنایا اس سے کیا حاصل۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا

اکْتَسَبُوا (دیکھو مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو انہوں نے کمایا) وَلِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ (اور عورتوں کے لئے اس میں سے جو انہوں نے کمایا) کمائی سے مراد کیا ہے؟ نیکی اور بدی کے یہ میدان کھلے ہوئے ہیں۔ عورت اگر کسی درجے میں کم تر رہ گئی ہے تو نیکی کا میدان کھلا ہوا ہے' وہ لاکھوں کروڑوں مردوں سے آگے نکل سکتی ہے۔ کیا رابعہ بصریؒ آگے نہیں نکل گئیں؟ کیا حضرت مریمؑ آگے نہیں نکل گئیں؟۔ کیا حضرت خدیجہؓ سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں سے اوپر نہیں چلی گئیں؟۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی مثالیں بھی سامنے ہیں اور پھر آخری آیت سورۃ نساء کی اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ اللہ نے مردوں کو قوام بنایا ہے عورتوں پر' وہ حکمران ہیں' ان کے ذمے ہے نگرانی و نگہبانی اور عورتوں کے لئے صحیح روش کیا ہے "بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ" میں اشارہ کر دیا ہے۔ اللہ نے فضیلت دی ہے بعض کو بعض پر۔ پہلے اسی کے لئے تمہید تیار کی گئی تھی کہ اللہ نے جو فضیلت دی بعض کو بعض پر' اس پر تلملانا نہیں چاہئے' پیچ و تاب نہیں کھانا چاہئے۔ یہ اللہ کی حکمت ہے۔ اب یہاں پر بات صاف کر دی کہ اللہ نے مردوں کو ایک فضیلت دی عورت پر "لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مردوں کو قوام بنایا ہے خرچ کرنے کا معاملہ ان ہی کے ذمے لگایا ہے یہ دوسرا پہلو تو عائلی زندگی سے متعلق ہو گیا۔ لیکن پہلا اصول عام ہے "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ" اور یقیناً اس میں قوم و ملک کی سربراہی بھی شامل ہے۔ تو میرے سامنے یہ محکمات قرآن مجید کی نصوص ہیں۔ ایک طرف یہ نقشہ سامنے آ رہا ہے لیکن دوسری طرف جمہوریت کا تقاضا ہے کہ اس خاتون کو قوم نے منتخب کیا ہے۔

تضاد صرف نمایاں ہوا ہے

غلام اسحاق خان صاحب نے رات جو بات کہی صد فیصد درست کہی ہے۔ یہ خاتون کہیں آسمان سے تو نہیں ٹپک پڑی' اس قوم کے لاکھوں افراد نے ان کو ووٹ دیا ہے۔ کل میں نے ایک صاحب سے ملاقات کی جو ابھی سعودی عرب سے آئے ہیں انہوں نے ایک ایسا جملہ کہا جو جا کر سیدھا دل پر تیر کی طرح لگا ہے۔ وہاں لوگ کہہ رہے تھے "عند کم ما فی الرجال" (اے پاکستانی قوم کیا تمہارے پاس مرد نہیں رہے) یہ دوسری بات ہے کہ ان

کے ہاں کیا نظام ہے' اس کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے کیونکہ وہ طرز حکومت نہایت استبدادی نظام ہے' اس میں عوام کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ لیکن جو طعنہ انہوں نے ہمیں دیا وہ تو اپنی جگہ صحیح ہے۔ کیا یہاں کوئی مرد ایسا نہیں ہے جس پر قوم اعتماد کرتی' جو قوم کا اعتماد حاصل کرتا۔ جس کو یہاں پر ووٹ ملتے جو میدان میں آتا اور اپنی حیثیت منواتا۔ معلوم ہوا کہ حقائق تو یہی ہیں چاہے ہمیں کتنے ہی تلخ معلوم ہوں۔ ایک تضاد ہے جو نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ پہلے جو ہوا اسے جانے دیجئے لیکن اس صدی میں پوری دنیائے اسلام میں پاکستان کے حصے میں یہ ناقابل رشک سعادت آئی ہے کہ ایک خاتون وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہیں۔ اس ملک میں جو اسلام کے نام پر بنا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام سے ہمارے معاشرے کا تعلق ہے کتنا؟ ۸۰۔ ۸۵ فیصد کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی سوچ ہی یہ نہیں' ان کا فکر ہی یہ نہیں' ان کی اقدار کا پورا ڈھانچہ (VALUE STRUCTURE) وہ ہے ہی نہیں۔ جو نماز پنج گانہ بھی نہیں پڑھتے انہیں اس سے کیا بحث کہ اسلام میں کیا حرام اور کیا حلال ہے۔ معاشرے میں عورت کا مقام کیا ہے۔ پھر یہ کہ گیارہ برس تک خود ہم نے کون سا فلسفہ چلایا ہے۔ یہی کہ عورت اور مرد کو شانہ بشانہ چلنا چاہئے۔ گویا ہم نے مغربی کلچر کو مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ گیارہ برس تک ہمارا طرز عمل یہ رہا کہ ہمارے تمدن اور مغربی کلچر میں کوئی فرق نہیں۔ ہمارے صدر نے امریکی شہر ہوسٹن میں پورے اطمینان سے یہ کہا کہ دیکھتے نہیں میری بیگم میرے ساتھ ہیں۔ پردہ کیا ہوتا ہے' یہ اسلام کا معاملہ نہیں ہے۔ گویا گیارہ سالہ دور کا مفتی اعظم یہی فتویٰ دیتا رہا کہ اسمبلیوں میں عورتوں کا جانا گویا مغربی کلچر کا ہی نہیں اسلام کی روح کے بھی عین مطابق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم نے اسلام کا فتویٰ اگر لینا ہوتا تو پہلے لیتی۔ قوم کا معاملہ " اعمالکم عمالکم کما تکونون کذلک فیؤمّر علیکم ہے۔ میں نے بارہا یہ حدیث آپ کو سنائی ہے لیکن آج میں تضاد (CONTRAST) کو نمایاں کر رہا ہوں۔ اس پہلو سے جتنا مجھے دکھ ہے میں ہی جانتا ہوں۔ میری ایک بات کو لے کر لوگوں نے کچھ اور رنگ دے ڈالا جو دوسرے رخ سے متعلق تھی اور جو میں ابھی بیان کروں گا۔

تصویر کا دُوسرا رُخ

وہ دوسرا رخ کیا ہے؟ وہ ہے جمہوریت کا رخ' اس ملک کی بقا کا تقاضا اس وقت یہ ہے کہ جمہوریت ہو تو ٹھیک ورنہ ملک چلا جاتا ہے یہ حقیقت جس طرح مجھ پر منکشف ہے شاید کسی اور پر

نہیں۔ میں نے جس طرح اس ملک میں گھوم پھر کر دیکھا ہے بلکہ پنجاب میں تو شاید ایک آدھ آدمی ہی ایسا ہو جس نے خود جا کر اندرون سندھ حالات کا مطالعہ کیا ہو۔ محمود مرزا صاحب بھی صرف شہروں تک گئے' دیہات تک نہیں گئے۔ میں دیہات کے اندر تک گیا ہوں' دادو ضلع کی گہرائی میں گوٹھوں تک گیا۔ بلاول جن کے نام پر بے نظیر صاحبہ نے اپنے بیٹے کا نام رکھا' ان کی خانقاہ تک گیا ہوں' جہاں ڈاکو کھلے عام پھرتے ہیں اور وہ ڈاکو میرے درس کے سامعین میں موجود تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ ڈاکو کل شام سے آپ کے منتظر تھے کہ آپ آئیں گے تو آپ کی تقریر سن کر جائیں گے۔ رائفلیں ان کے پاس موجود تھیں۔ میں اندرون سندھ وہاں تک گیا ہوں جہاں کوئی لاء اینڈ آرڈر نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں حالات کیا تھے' لہٰذا جس شدت کے ساتھ مجھے یہ رنج ہے کہ آج پوری دنیا میں یہ ملک ایک منکر کے حوالے سے نمایاں ہو گیا ہے تو دوسری طرف یہ راحت ہے کہ جمہوریت بحال ہو گئی جو ملکی سطح پر ہماری سالمیت کا لازمی تقاضا تھی۔ اس کی گاڑی یہاں نہیں چلنے دی گئی' اسے روکے رکھا گیا' اسلام کے خالی نعروں کے زور پر روکا گیا' لہٰذا یہ اس کا ایک ردعمل (REACTION) تھا۔ کوئی بڑا ہی کٹھور شخص ہو سکتا ہے جو اس ملک کے مستقبل اور اس کی سالمیت سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ جسے مذہبی تقاضے تو نظر آ رہے ہوں لیکن دوسرے تقاضوں سے وہ بے خبر ہو کہ اس ملک اور اس کے وجود' اس کی بقاء کیلئے اس وقت جمہوریت ناگزیر ہے ورنہ یہ ملک ٹکڑوں میں بٹ جائے گا' ختم ہو جائے گا۔ یہ دوسرا تقاضا بھی میرے سامنے اسی شدت کے ساتھ ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس مملکت خداداد کا وجود اور قائم رہنا ایک معجزہ ہے۔ مجھے تو یہ اللہ تعالیٰ کی کسی طویل المیعاد سکیم کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ پورے کرہ ارض پر اسلام کا جو غلبہ (GLOBAL DOMINATION) ہو کر رہے گا اور جس کی خبر دی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے' میرے نزدیک یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ دیر ہو سکتی ہے' اندھیر نہیں ہو سکتا۔

میں سمجھتا ہوں اور چار سو سالہ تاریخ کے اشاروں سے سمجھتا ہوں کہ وہ مشیت ایزدی پاکستان ہی کے حوالے سے پوری ہو گی۔ میرے نزدیک اس کی بقاء کی بڑی اہمیت ہے اور مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ اگر سندھ کو کچھ ہو گیا ہوتا' سندھ میں اگر کوئی آتش فشاں پھٹتا اور ملک دو ٹکڑے ہو جاتا تو یہ صرف پاکستان کی تباہی نہ ہوتی پورے جنوبی ایشیا یعنی بھارت' بنگلہ دیش اور پاکستان سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کی یہ تمہید بن سکتی تھی اور اندلس کی تاریخ دہرائی جا

سکتی تھی۔ سن ۹۳ ہجری اور ۷۱۲ عیسوی میں سپین کے راستے اسلام یورپ میں داخل ہوا اور اسی سال سندھ کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ یہاں محمد بن قاسمؒ آئے' وہاں طارق بن زیادؒ گئے تھے' لیکن وہاں سے اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان پانچ صدیوں پہلے مٹ چکا ہے۔ میرے جذبات کی شدت کا عالم یہ تھا کہ سوچتا رہا کہیں یہاں بھی وہی تاریخ دہرائی تو نہ جائے گی۔

اس ملک کیلئے قائداعظمؒ نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ ٹی بی تیسرے درجہ کو پہنچ گئی' لیکن انہوں نے تحریک پاکستان میں دن رات ایک کر دیئے۔ قیام پاکستان کے بدترین مخالفین کا طرز عمل بھی ریکارڈ پر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ پاکستان نہ بنتا تو اور بات تھی لیکن اب بن گیا ہے' تو اس کو کوئی گزند پہنچنا اسلام کیلئے بہت برا دن ہو گا۔ مولانا مدنیؒ کا قول میں سنا چکا ہوں۔ ڈابھیل کے مدرسہ کی محفل میں پاکستان کے قیام کے سال بھر بعد ہی کسی نے مولانا کو چھیڑنے کیلئے پاکستان کی بات شروع کر دی۔ تو اس عظیم مجاہد آزادی' تدیّن' تقویٰ اور خلوص کے اس پہاڑ نے کہا کہ بھائی ایک جگہ جب تک مسجد تعمیر نہ ہو' اختلاف کی گنجائش ہے کہ کہاں اور کیسے بنائیں' لیکن بن جائے تو اس کی حفاظت ہر مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے۔

یہی ہے وہ ملک' جس کی حفاظت کا تقاضا آج اسلام کی حفاظت کے تقاضے سے متضاد ہو گیا ہے اور یہ ہے وہ عقدہ (DILEMMA) اور (SIMULTANIOUS CONTRAST) کہ میرے نزدیک اس کی بقاء کا تقاضا جمہوریت ہے اور جمہوریت تو جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے' ویسے ہی ہو گی جیسے جمہور ہوں گے۔ جمہوریت تو دکھا دیتی ہے کہ آپ کیا ہیں کیا نہیں' آپ کا معاشرہ کیا ہے کیا نہیں' آپ کی سوچ کیا ہے کیا نہیں اور آپ کی اقدار کیا ہیں کیا نہیں۔ یہ تو

[illegible]

گنبد کی آواز ہے' جو کہو گے سن لو گے۔ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تمہارے اوپر حکمران آجائیں گے' وہی تمہارے نمائندہ ہوں گے' اسی کی 'REFLECTION' ہو گی۔

یہ ہے میری کیفیت کہ ایک طرف انتہائی رنج وصدمہ کا دن اور دوسری طرف خوشی کا موقع ہے۔ جمہوریت کی گاڑی چلی ہے۔ اب کچھ امید ہو سکتی ہے کہ فوری بحران'

(CRISIS) سے یقیناً ہم بچ گئے ہیں۔ سندھ میں جو اس کے کھلم کھلا مخالفین تھے اور جو براہ راست نظریہ پاکستان کے معاندین تھے، ان کی ناک رگڑی گئی ہے اور وہ بالکل ناکام ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ سندھی قوم پرستی ہی نے یہ حکمت عملی اختیار کی ہے کہ اب پیپلز پارٹی کو ووٹ دیا جائے۔ لوگوں کی یہ بات کسی حد تک درست بھی ہو سکتی ہے، لیکن آپ کو

معلوم ہے کہ وہ آخری وقت تک میدان میں رہے ہیں۔ آخری وقت تک جی ایم سید بھٹو کو گالیاں دیتا رہا ہے۔ لیکن اس وقت جو بھی ووٹ آیا، میرے نزدیک وہ پاکستان کے حق میں آیا ہے۔ اگرچہ اس سے مسائل پیدا ہوں گے، لیکن پہلی بات یہ کہ جمہوریت کی گاڑی پٹڑی پر چڑھی اور جو بحرانی کیفیت ہم پر طاری تھی وہ فی الحال ٹل گئی ہے۔ میں کوئی جمہوریت کے میدان کا سپاہی نہیں ہوں، میری ترجیح اسلام ہے۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ ایک مریض، اگر بحرانی کیفیت میں ہے، ۱۰۶ درجہ کا بخار چڑھ گیا ہے تو تشخیص، باقاعدہ علاج اور اصل مرض کی دوا ثانوی حیثیت اختیار کرے گی۔ پہلے اس کا بخار کم کیا جائے گا۔ چاہے برف کے پانی کی پٹیاں رکھی جائیں یا کچھ اور کیا جائے۔ ہمارے ملک کو جو ۱۰۶ درجہ کا بخار چڑھا ہوا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ یہ ملک جہاں آمریت کی سیاست کے ذریعہ اور مذہب کے نام پر جس عمل کو روکے رکھا گیا تھا، وہ چلے، آگے بڑھے اور پٹڑی پر رواں دواں ہو۔ یہ ہو گیا ہے تو میرے لئے خوشی کا دن ہے۔ یہ میرے لئے امید کی ایک کرن ساتھ لے کر آیا ہے۔ میں آپ سے صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت یہی پہلو ہے میری خوشی کا کہ پاکستان میں عوامی دور کا دوبارہ آغاز ہوا ہے۔ یہ دوبارہ کا لفظ میں نے کیوں کہا ہے۔ تحریک پاکستان اور قائداعظم و قائد ملت کے زمانے کو چھوڑ دیجئے، لیکن اس کے بعد بھٹو کے مخالفین کو بھی ماننا پڑے گا کہ پہلی مرتبہ پاکستان میں عوامی سیاست کا دور بھٹو صاحب سے شروع ہوا۔

بھٹو مرحوم کے دو کارنامے

میں آج آپ سے ایک بات عرض کر دوں جو میں کراچی میں کہہ کر آیا ہوں۔ اگرچہ وہاں بڑی مخالفانہ فضا ہے، لیکن میں ڈنکے کی چوٹ پہ بات کہہ آیا ہوں۔ اپنے دوستوں سے

بارہا کہا لیکن خطاب عام میں یہ بات پہلے نہ آئی تھی کہ بھٹو صاحب نے دو کام نہایت عظیم کیے تھے' اگرچہ ان کے نتائج فوری طور پر منفی نکلے۔ پہلا کام یہ کہ انہوں نے مزدور اور کسان کو عزت نفس (SELF RESPECT) دی۔ یہ شعور بیدار کیا کہ ہم بھی انسان ہیں' ہمارے بھی حقوق ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا اور نہ اس ملک میں ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ جملہ میں نے نجی محفلوں میں بارہا سنایا ہے' جو مجھے تو ایک صاحب نے بتایا جو دولتانہ صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ اس روایت کے مطابق دولتانہ صاحب نے اپنے مزارعوں سے پوچھا کہ "کیوں تسی اوندا ناں لیندے او۔ بھٹو تہانوں کی دتا" تم لوگ بھٹو کا نام کیوں لیتے ہو' اس نے تمہیں کیا دیا اور جواب تھا۔ "میاں جی! دتا دلایا کو۔ پر اوہ اساندا ناں تے لیندا اے"۔ میاں صاحب! دیا دلایا کچھ نہیں' لیکن وہ ہمارا نام تو لیتا ہے۔ سٹیم بنا لینا ہی آخری کام نہیں' اس بھاپ کو استعمال کرنا اصل کام ہے' جس کی صلاحیت بھٹو صاحب میں ثابت نہ ہوئی۔ نتیجہ منفی نکلا' انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور صنعتی زندگی مفلوج ہو گئی۔ دوسرا جو کام ہوں نے بہت بڑا اور عظیم کیا تھا کہ سیاست جو ہمارے وڈیروں' جاگیرداروں اور کچھ سرمایہ اروں کی لونڈی اور ڈرائنگ روم تک محدود تھی' اسے سڑک اور گلی میں نکال لائے۔ یہ وسری بات ہے کہ بعض جگہ سڑک پر اور گلی میں غنڈوں کا قبضہ تھا لہٰذا وہ غنڈوں کے ہاتھ میں لی گئی۔ فوری طور پر یہ ردعمل ہوا' لیکن ہر جگہ نہیں۔ آخر سیاست جب گلی میں آئی تو وہی کچھ ونا تھا جو کچھ وہاں ہوتا ہے۔ وہاں وڈیروں کے سے رکھ رکھاؤ اور آداب تو نہ ہو سکتے تھے۔ یکن اب امید ہے کہ یہ جو دوسرے دور کا آغاز ہوا ہے اس میں انشاءاللہ وہ منفی نتائج پیدا نہیں وں گے بلکہ بہتر نتائج نکلیں گے۔

سیاست میں خیر کی توقعات

بہتر نتائج کی امید کیوں؟ اپنی بیک وقت صدمہ اور مسرت کی کیفیت اور وجوہات میں ان کر چکا ہوں' اب عرض کرتا ہوں کہ بہتری کی توقع کن کن چیزوں سے ہے۔ پہلی یہ کہ اب بات نہیں رہی' فصلی بٹیروں والا دور گیا' اب پارٹی سے وابستگی (AFFILIATION) بڑی ہو رہی ہے۔ پنجاب میں قومی اسمبلی کے الیکشن کے بعد صوبائی الیکشن میں جو معاملہ ہوا' وہ ت صحت مند علامت ہے۔ اگر یہ پنجابی نیشنلزم کا ردعمل ہے' جیسا کہ بعض لوگ کہہ ہے ہیں' تو یہ اس کا منفی پہلو ہو گا لیکن میرے نزدیک وہ پہلو دبا ہوا ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ

اب پارٹی سے وابستگی مضبوط ہے' جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب ہمارے ملک کے
صدر غلام اسحاق خان صاحب نے ٹائم ٹیبل بدل دیا اور اس کے لئے انہوں نے جو دلائل دیئے
وہ صحیح ہیں اور جب تین چار دن پہلے یہ طے ہو گیا تھا کہ اب بے نظیر بھٹو یہاں کی وزیر اعظم بن
رہی ہیں' تب بھی پنجاب کی صورت حال میں تبدیلی نہ آئی۔ یعنی اب اراکین اسمبلی مینڈکوں
کی پسیری نہیں ہیں کہ آج ادھر کل ادھر اور پرسوں ادھر۔ اب ہر شخص کو سوچنا ہو گا او
اپنے لئے ایک مستقل مقام اور مستقل موقف طے کرنا ہو گا۔ یہ بھی درحقیقت ایک اچھ
علامت ہے۔ گویا اب اس ملک کے اندر واقعتاً سیاست مستحکم بنیادوں پر ہو گی۔ دوسرے،
صورت حال بھی امید افزاء ہے اور اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک پریشان کن ہے' لیکر
میرے نزدیک (HOPEFUL SIGN) ہے کہ ایک بہت بڑی پارٹی اگر مرکز میں حکومت ؛
رہی ہے اور دوسری کو وہاں اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے تو اسی پارٹی کو سب سے بڑے صو
پنجاب میں اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا ہے۔ ایک بیلنس ہے جو اس ملک میں نظر آئے گا۔ بے نظ
صاحبہ کو اگر ثابت کرنا ہے کہ ان میں واقعی صحت مند روایات (HEALTHY
TRADITIONS) قائم کرنے کی صلاحیت ہے تو انہیں اپنے عمل سے دکھانا ہو گا۔ وہ بات نہ ہ
جیسے ماضی میں ہوئی کہ این اے پی اور جے یو آئی کی حکومت کو بلوچستان میں زچ کر کے برطرف
کر دیا گیا اور احتجاجاً صوبہ سرحد کی مفتی محمودؒ وزارت نے بھی استعفاء دے دیا۔ وہ شکل اگر
ہوئی تو خود ان کی کری کرائی گیارہ برس کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ جیسا کہ میں۔
پہلے عرض کیا' انہوں نے گیارہ برس تک حکومت کا ٹارگٹ رہ کر بھی اپنا وجود برقرار رکھا او
ایک ٹیسٹ پاس کیا ہے لیکن ایسا ہوا تو ان کی بہت بڑی ناکامی ہو گی۔ اس سلسلے میں اپوزیشن او
حکومت کے لئے جو باتیں غلام اسحاق خان صاحب نے کہی ہیں وہ میرے نزدیک حرف آخ
ہیں۔ یہ ساری باتیں ہمارے ماضی کے اعتبار سے تو شاعری معلوم ہوتی ہیں کہ یہاں ایسا کبھی ہ
ہی نہیں۔ ہمارے ہاں تو خود بھٹو صاحب نے اپوزیشن والوں کو باقاعدہ اٹھوا کر اسمبلی سے با
پھنکوا دیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اچھی روایات موجود نہیں' تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اب
صورت حال بدل گئی ہے اور اب ان (INSTITUTIONS) کو باقاعدہ چلانا ہو گا۔ اگر وہ خو

پنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مارنا چاہتیں اور اپنے سارے کیے دھرے کی خود ہی نفی نہیں کرنا
چاہتیں تو انہیں ان تمام (INSTITUTIONS) کا پورا احترام کرنا ہو گا۔ تیسری امید
فزابات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ آج پھر دہرا رہا ہوں کہ اب جب کہ ایک عوامی دور شروع
ہو گیا ہے' حکومت کو کام کرنا پڑے گا۔ خالی نعروں کا دور گذر چکا ہے۔ خالی نعرہ روٹی' کپڑا
ور مکان کا جو ایک دفعہ چل گیا تھا' اس دفعہ اگرچہ وہ چلا ہی نہیں' تاہم چلے گا بھی نہیں۔ اور
خالی نعرہ اسلام کا بھی جو اسی وقت جواب میں چلا۔ اس دفعہ نہیں چلا اور نہ چلے گا۔ اب تو جو
حکومت میں آیا ہے واقعتا کام کرنا ہو گا اور ظاہر بات ہے کہ جب حکومت ذمہ دار ہو اور
ساتھ ہی جمہوری بھی تو پھر وہ پھولوں کی سیج نہیں ہوتی' کانٹوں بھرا بستر ہوتی ہے۔ ہر وقت کا دہرا
حتساب اگر موجود رہے کہ ایک طرف پارلیمینٹ اور اسمبلی کے اندر ایک مضبوط و باصلاحیت
پوزیشن قدم قدم پر ٹوکنے والی ہو اور ہر نکتہ (POINT) پر حکومت ٹوٹنے کا خطرہ موجود
رہے اور دوسری طرف عوامی عدالت میں بھی احتساب ہوتا ہو تو کس کی ہمت ہو گی کہ من مانی
کرے۔ نعروں کا دور گیا۔ عوام اب سوئے ہوئے نہیں ہیں۔

رنج وصدمہ کا اصل سبب

مسرت و اطمینان کی کیفیت اور صدمہ و رنج کی صورت بیان کر کے میں عرض کر چکا
ں کہ مسرت و اطمینان کی وجہ کیا ہے۔ اب بتاؤں گا کہ رنج و صدمہ کا سبب کیا ہے۔ جو کہ
یہ ہے دین کے ساتھ ہمارے معاشرے کے بالفعل تعلق کا۔ یہ تضاد کیوں ہے کہ اسلام کے
م پر بننے والے ملک کے اندر جمہوریت جب آئی تو اس مشکل میں آئی کہ ایک طرف خوشی اور
سری طرف صدمے کا باعث بنی ہے؟ میرے نزدیک اس میں مجرم تو خیر ہم سب ہیں۔ تاہم
ں ملک کے بنانے والوں کا سب سے پہلے فرض تھا کہ یہاں اسلام کی فیصلہ کن بالادستی کا
ان کرنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کرتے۔ کوتاہی وہاں ہوئی ہے۔ بہت حیص بیص
ے بعد قرارداد مقاصد پاس ہوئی تو اس لئے کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آخری دھمکی دے دی
ں کہ اگر تم لوگ اس کو پاس نہ کرو گے تو پھر میں پبلک میں جاؤں گا اور صاف کہوں گا کہ تم
ریک پاکستان کے مقاصد سے غداری کر رہے ہو۔ ورنہ کتنے ہی لوگوں نے کہا تھا کہ آج جو
رداد یہاں پاس کی جا رہی ہے' اس کی وجہ سے ہم اپنی گردن شرم کی وجہ سے اٹھا نہیں سکتے'
مہذب دنیا سے آنکھیں چار نہیں کر سکتے کہ ؎

بر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں۔

لیکن بہرحال جرم میں سب شریک ہیں۔ جس نے بھی اس ملک کی فضا میں سانس لیا اور دو وقت کی روٹی کھائی' اگر اس نے اسلام کا حق ادا نہیں کیا تو وہ برابر کا مجرم ہے' سیاسی جماعتیں بھی مجرم ہیں' لیکن میں یہاں سب سے زیادہ جس بات پر زور دوں گا وہ مذہبی جماعتوں کی غلط حکمت عملی ہے۔ سب سے بڑی ذمہ داری انہی پر ہے' جو مذہب کے نام پر کام کر رہے تھے' مذہب کے لئے کام کر رہے تھے اور مذہب کے نام پر سیاست کر رہے تھے۔

پہلے مرحلہ میں اپنے دینی حلقوں کو دو حصوں میں منقسم کر لیجئے۔ ایک وہ ہیں جنہیں سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ وہ اپنے درس و تدریس میں مشغول ہیں' جہاں سے ہر سال لوگ نکلتے ہیں جو مسجدوں کے خطیب بنتے ہیں' امام بنتے ہیں یا کچھ لوگ زیادہ ذہین ہوں تو انہی مدرسوں میں استاد بنتے ہیں۔ ان حضرات سے تو مجھے صرف ایک شکایت ہے اور یہ آج سے نہیں یہ میں نے ۶۷ - ۶۸ء میں "میثاق" میں لکھا تھا اور مولانا بنوریؒ نے بھی "بینات" میں اداریئے لکھے تھے۔ اور اس بات کی تائید کی کہ پاکستان بننے کے بعد انہیں اپنی حکمت عملی میں جو تبدیلی کرنی چاہئے تھی' وہ نہیں کی گئی۔ انہوں نے نصاب کو بھی نہیں بدلا' وقت کے تقاضوں کو نہ پہچانا کہ پہلے انگریز کا دور تھا' جس میں انہیں صرف اسلام کی حفاظت کرنی تھی۔ چنانچہ نہ انگریزی پڑھی اور نہ کچھ اور کیا' لیکن اب تو یہ مسلمانوں کا ملک تھا' اب اس کے نظام کو چلانا تھا۔ تو جو کام انہیں کرنا چاہئے تھا نہ کیا کہ اسلام کو اس طریقے سے پیش کرتے' جو اس دور کے تقاضوں کو پورا کر سکے' اس نہج پر لوگوں کو تیار کرتے جو اس دور کی قومی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں۔ جن حضرات کا کام صرف درس و تدریس تھا' ان سے تو یہی شکایت ہے لیکن اصل اور بڑے مجرم ہیں وہ دیندار لوگ جنہوں نے سیاست کی' صرف نعرہ بازیوں سے کام لیا' جذباتی تحریکیں چلائیں' الیکشن میں اسلام کا نام استعمال کیا اور اصل کام جو کرنے چاہئیں تھے' یعنی ذہنی اور فکری تبدیلی لانا اور اخلاقی اور عملی تبدیلی برپا کرنا' ان کی طرف توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہوا میں تو بڑا جھاگ اچھلتا رہا' سوشلزم اور اسلام کی جنگ ہوتی رہی۔ لیکن معاشرے کی کیفیت دن بدن ابتر ہوتی گئی۔ معیار پست سے پست تر ہوئے۔ قومی سطح پر عمل کا حساب کر

لیں' اخلاق کے پیمانے سے ناپ لیں' گراف نیچے گیا ہے۔ قومی سطح پر دین اور عبادات کے ساتھ وابستگی کا تعلق نیچے گیا ہے۔ آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ مسجدیں اب زیادہ آباد ہیں' خاص طور پر پچھلے گیارہ سال کے دور میں زیادہ لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں' لیکن یہ ساری رونق متوسط طبقہ کی ایک چھوٹی اقلیت سے ہے۔ عوام الناس میں جائیے' وہ دین سے دور سے دور تر ہوئے ہیں۔ الحاد اب آپ کے (GRASS ROOT LEVEL) ٹرانزسٹر سے کیسٹ اور پھر ٹی وی سے ہو کر نچلی جڑوں تک پہنچ گیا ہے۔ اس لئے کہ عوام تک اس کی رسائی ہے۔ الحاد اب اوپر کی سطح سے اتر کر عوام میں بھی نفوذ حاصل کر چکا ہے۔ ان کی اقدار خالص مادی بن چکی ہیں۔ تو یہ میرے نزدیک جذباتی نعرہ بازی اور سیاست میں اسلام کے نام سے فائدہ اٹھانے کی وجہ سے ہوا' جو پچھلے گیارہ برس میں اپنے انتہا کو پہنچ گیا' جس میں سیاست کی گاڑی کو روک دیا گیا تھا۔ پہلے تیس برس میں تو اپوزیشن ہی اسلام کا نعرہ استعمال کرتی تھی اور الیکشن میں ووٹ لینے کے لئے اسلام کی سرپرستی قبول کرتی تھی۔ پھر آمریت نے اسے ڈھال بنالیا۔

سیاست نے اسلام سے رسّی تڑالی

اس کے نتائج کیا نکلے؟ نوٹ کر لیجئے' اول یہ کہ معاشرے کا حقیقی' واقعی اور عملی اسلام سے تعلق کم سے کم تر ہو گیا اور دوئم زیادہ خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام ایک متنازعہ مسئلہ (COTROVERTISL ISSUE) بن گیا۔ ایک جماعت اگر الیکشن میں ووٹ لینے کے لئے اسے اچھال رہی ہے تو دوسری گویا اس کی مدمقابل خود بخود بن گئی۔ اسلام کو ایک اختلافی مسئلہ بنادیا گیا۔ اسلام کے نام پر ووٹ مانگنے والی قوت ایک ہی ہوتی تو خیر تھی' لیکن وہ چار ہوئیں' دچار اسلام وجود میں آگئے۔ فرقہ واریت انتہائی بھیانک شکل اختیار کر گئی۔ یہ منفی نتائج ہیں جو

پیدا ہوئے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ عمل پچھلے گیارہ برس میں اپنے ' CLIMAX ' کو پہنچا۔ وہاں تو سیاست کی گاڑی اسلام کے نام پر روکی گئی اور یہ الفاظ وہ ہیں جو ۸۲ء میں میں نے صدر ضیاء الحق صاحب کے نام خط میں لکھے تھے کہ خدا کے لئے آپ سیاست کی گاڑی کو چلنے

دیجئے' اسلام کے نام پر اسے نہ روکئے۔ ہر عمل کا برابر رد عمل ہوتا ہے اور یہ فزکس میں نیوٹن کا تیسرا اصول ہے۔ چنانچہ گیارہ سال بندھی رہنے کے بعد اب سیاست کی گاڑی رسہ تڑا کر بھاگی ہے تو اسلام سے اس کا کوئی آس پاس کا بھی تعلق نہیں رہا۔ یہ آپ ہی کے تو عوام ہیں' جنہوں نے ووٹ دیئے ہیں۔ کس کو معلوم نہیں کہ عورت کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ جس زمانے میں خواتین کے بارے میں بحث چل رہی تھی' میں نے کہا کہ چاہے کوئی مسلمان پردہ کرتا ہو یا نہ کرتا ہو' اس کے گھر میں پردہ نہ بھی ہو تب بھی وہ جانتا ہے کہ اسلام میں پردہ ہے۔ جیسے کون نہیں جانتا کہ اسلام میں سود حرام ہے۔ چاہے مجبوری اور بہانے سے اس میں مبتلا ہوں' لیکن جانتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ کون نہیں جانتا تھا کہ اسلام میں عورت کا مقام یہ نہیں ہے' اس کے باوجود وہ منتخب ہو کر آئی ہیں تو میں اس کو تعبیر کر رہا ہوں کہ اب سیاست کی گاڑی نے لگام تڑوالی ہے' جسے اسلام کے نام پر گیارہ سال روکے رکھا گیا۔

بہرحال اب بھی موقع ہے کہ ہم اپنے عمل کی اصلاح کریں' سبق حاصل کریں اور کوتاہیوں کو درست کریں۔ اس سلسلے میں دینی جماعتوں کو کیا کرنا چاہئے۔ وہ تو میں اگلی مرتبہ بیان کروں گا' مجھے اس وقت بے نظیر صاحبہ سے اپنی اس گفتگو کے پس منظر میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

نئی وزیراعظم کے لیے مشورے

حکومت بے نظیر بھٹو کو مل رہی ہے اب انہیں چاہئے کہ جمہوریت کی مسلمہ روایات کی پوری پاسداری کریں۔ اپوزیشن کو اس کا جائز حق دیں اور اس کو ساتھ لے کر چلنے کی پوری کوشش کریں۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کو پیپلز پارٹی بحیثیت مجموعی اور محترمہ بے نظیر صاحبہ اپنے سامنے ذاتی طور پر رکھیں کہ اگر وہ واقعتاً اس ملک کو مستحکم دیکھنا چاہتی ہیں' اگر وہ اس قوم و ملک کے اندر ایک نئی تازہ حیات پیدا کرنا چاہتی ہیں' تو دو باتوں کو جانے اور مانے بغیر چارہ نہیں۔ نمبر ایک یہ کہ اس ملک کے لئے واحد وجہ جواز اسلام ہے۔ کوئی شے اس کو جواز نہیں دے سکے گی۔ چاہے کتنی ہی جمہوریتیں آجائیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمیں ایک بڑے زبردست دشمن کا مقابلہ کرنا ہے۔ وہ ایک بہت بڑے ویکیوم کی طرح ہمیں کھینچ رہا ہے۔ اس کی مالی حیثیت' اس کا معاشی استحکام اور اس کی فوجی قوت ہم سے بہت بڑھ کر ہے۔ دنیا میں کوئی اور ملک ایسا نہیں ہے' جو دشمنوں کو ساتھ لے کر پیدا ہوا ہو۔ ایک مثال البتہ

اسرائیل ہے' لیکن اسے امریکہ کی پوری پوری پشت پناہی حاصل ہے۔ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی عالم عرب سے اس کی پیدائشی دشمنی وجود میں آگئی تھی۔ بھارت کو ہم سے پیدائشی دشمنی ہے۔ اس کا کلچرل ویکیوم بھی ہے جو ہمیں کھینچتا ہے۔ لسانی بنیاد پر وہ ہمیں کھینچتے ہیں' کلچرل اور ثقافت کے طائفے ان کے محبت بھرے گیت الاپتے ہوئے آئے ہیں' شعراء آئے ہیں نظمیں کہتے ہوئے۔ ان کا ٹی وی کے ذریعے سے ہم پر الگ کلچرل حملہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ محض جمہوریت کی بحالی سے ملک مستحکم نہیں ہو سکتا۔ بحران ختم ہو گیا ہے اور صحیح ہے کہ جمہوریت سے رفع ہوا' لیکن اس کا استحکام مثبت طور پر صرف اور صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ بات بھی صدر غلام اسحاق خان صاحب نے کہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس پر پورا زور دیا جائے۔ تیسری بات جو میں بتانا چاہتا ہوں' اس سے اہم تر ہے۔ اس قوم میں' جو بظاہر بڑی مردہ نظر آتی ہے' بڑا دم خم (POTENTIAL) ہے۔ بہت قوت ہے' بہت صلاحیت ہے لیکن ہر قوم میں اس کی خوابیدہ صلاحیتوں اور قوتوں کو ایک طریقے سے بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیز اس کے جذبات کو اپیل کرے' اس کے اندر ہلچل پیدا کر دے' جو اس کے اندر کسی مقصد کے لئے تن من دھن لگا دینے کا جذبہ پیدا کرے اور جو اس کے لئے گردنیں کٹوانے کی آرزو پیدا کر دے' وہ جذبہ اس قوم میں صرف اور صرف اسلام کے ذریعے سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کوئی اور اپیل نہیں یہاں کوئی دنیاوی اپیل کام نہ آئے گی۔ میں منفی راستہ نہیں دکھا رہا کہ ان کو چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنی جگہ ہے' اس کا حق جائز ہے اور ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے کہ سب حقوق واجب ہیں لیکن اس قوم کے اندر سے ان قوتوں کو' جذبات کو اور اس کی خوابیدہ صلاحیت کو اگر بر آمد کرنا ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام کے حوالے سے ہو گا۔ ان حقائق پر غور کر لیں' علم سیاست (POLITICAL SCIENCE) کے جو بھی مسلمہ اصول ہیں ان کے حوالے سے غور کر لیں' میری کتاب "استحکام پاکستان" کا مطالعہ کر لیں اور اس میں اگر کوئی بات غلط ہے تو مجھے بتائیں۔ میں نے اس اعتبار سے بارہا یہ مصرعہ پڑھا ہے کہ ؏

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

ہماری قوم سیکولرازم کو AFFORD ہی نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے تو واحد بنیاد اسلام ہے۔ مجھے بے نظیر بھٹو صاحبہ کی دو باتوں میں امید کی کرن نظر آئی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں اور یہ بھی امید افزاء بات ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ میں سب سے پہلے عمرہ کروں گی اور یہ کہ نماز کے وقت تمام کاروباری مراکز بند کر دیئے جائیں گے' حوصلہ افزاء

ہے۔ چاہے انہوں نے خالص ڈپلومیٹک انداز میں یہ باتیں کہی ہوں۔ خلوص و اخلاص اور نیت تو اللہ جانتا ہے' ہم نہیں جانتے۔ چلئے آپ شک بھی کر لیجئے تب بھی یہ تو ثابت ہو گیا کہ انہیں معلوم ہے اس قوم کو کیا چیزیں پسند ہیں اور کن باتوں سے اس قوم کا دل جیتا جا سکتا ہے۔ بھٹو صاحب نے بھی دو کام کئے تھے' لیکن وہ تھی بھاگتے بھاگتے کرنے والی بات۔ انہوں نے جمعہ کی چھٹی اور شراب کی بندش اگرچہ اس وقت کی تھی' جب ان کی کرسی ڈول چکی تھی۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ اب میرا چل چلاؤ ہے' یہ جاتے جاتے کی بات اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن اسی طرح جاتے جاتے ضیاء الحق صاحب نے بھی شریعت آرڈی نینس نافذ کیا جو بھاگتے چور کی لنگوٹی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دونوں مثالیں میرے نزدیک برابر ہیں' لیکن بے نظیر بھٹو کا معاملہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس وقت پاور میں آ رہی ہیں۔ اس وقت ان کا سر بہت اونچا ہے' بڑی زبردست فتح حاصل ہوئی ہے' پوری دنیا کی نگاہیں ان پر مرتکز ہیں' پوری دنیا سے اخباری نمائندے آئے ہوئے اور ان سے ملاقات کے منتظر ہیں۔ اس وقت اگر انہوں نے سمجھا ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کی نفسیات کیا ہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ بھی وہ ان سب حقیقتوں کو پیش نظر رکھیں گی۔

موجودہ سیاسی حالات میں
مذہبی اور دینی جماعتوں کے لیے لائحۂ عمل

امیر تنظیم اسلامی کے ۹ دسمبر ۸۸ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

پچھلے جمعہ میں عرض کر چکا ہوں کہ حالیہ انتخابات کا پرامن ' آزادانہ اور منصفانہ ہونا خوشی کی بات ہے اور یہ امر بھی باعث اطمینان ہے کہ انتقال اقتدار بھی خوبی سے ہوا ' جسے پوری دنیا مانتی ہے۔ انتخابی نتائج سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ ایک طرف تو ہمارے معاشرے میں مذہبی اور دینی سیاسی جماعتوں کا مجموعی عمل دخل بہت کم ہے۔ ان گیارہ سالوں کے دوران اثرات میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ بعض اعتبارات سے کمی واقع ہوئی ہے اور دوسری طرف اس واقعہ کی علامتی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ تمام دینی حلقوں کے اس مسئلہ پر اتفاق کے باوجود کہ مسلمان ملک میں عورت کی سربراہی اسلام کے مزاج کے خلاف ہے ' ایک خاتون وزیراعظم منتخب ہوئی اور اچانک نہیں ہوئی کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے کا مطلب بے نظیر بھٹو کو اس منصب پر فائز کرنا ہے۔ یہ بھی تفصیل سے بیان ... کا کہ ہمارے معاشرے میں لوگوں کے دین سے تعلق کا کیا حال ہے ———— ہماری پچاسی ' نوے فیصد آبادی کا دین سے واسطہ محض نام کا ہے۔ باقی دس ' پندرہ فیصد کا تصور دین بھی نہ صرف محدود ہے بلکہ مسخ شدہ بھی۔ کھانے پینے میں حرام حلال کے علاوہ بس نماز روزے کا اہتمام ہے ' جس کے ساتھ ہر طرح کے حرام کام بھی چلتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہماری نوخیز نسل کے حساس حصے کو دین سے بدظن کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے نصف کو دین کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کا شعور حاصل ہے اور خواہش بھی ہے کہ وہ دنیا میں رائج و نافذ العمل ہو ' لیکن بس گفت و شنید تک ورنہ پوری توانائیاں دنیا کمانے اور اسے سجانے میں صرف ہوتی ہیں۔ لے دے کر دو تین فیصد لوگ ہمارے معاشرے میں ایسے پائے جاتے ہیں جو کچھ کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ اپنی توانائیاں دین کے کاموں میں لگاتے ہیں اور کسی نہ کسی تنظیم سے منسلک ہیں لیکن ان کا بھی المیہ یہ ہے کہ آپس میں دست

نوائے وقت کا اداریہ

دینی جماعتوں کا شوق سیاست - لمحہ فکریہ!

تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے خطبہ جمعہ کے دوران تجویز پیش کی ہے کہ ملکی سیاست کی گاڑی کو معاشرے کے مجموعی مزاج کے مطابق چلنے دیا جائے اور کسی مذہبی مسئلے پر عوام کو مشتعل کر کے اس گاڑی کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے حالیہ انتخابات میں دینی جماعتوں کے کردار کے پیش نظر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر سیاسی جماعتیں بنانے سے نہ سیاست کو فائدہ پہنچا ہے اور نہ دین اور اس کے علمبرداروں کو۔ اس لئے علمائے کرام اگر سیاسی میدان میں کوئی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں میں شامل ہو کر ان کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ بریلوی مکتب فکر کے علمائے کرام تحریک پاکستان کے زمانے کی طرح آج بھی مسلم لیگ میں شامل ہو کر ایک مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے باقی دینی جماعتوں کو بھی مشورے دیئے ہیں اور ان کے استدلال سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ حالیہ انتخابات میں دینی جماعتوں کے حصے میں کوئی بڑی کامیابی نہیں آئی بلکہ ان کی وجہ سے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ میں سے کسی کو واضح اکثریت حاصل نہیں ہو سکی جس کی بناء پر موجودہ حکومتی نظام میں بے حد عدم توازن پایا جاتا ہے اور کسی ایک فریق کو اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع نہیں مل رہا۔ اس پس منظر میں اگر دینی جماعتیں کم از کم آئندہ انتخابات کے لئے حکمت عملی اپنا سکیں کہ وہ ملک کی دو بڑی جماعتوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دیں اور اس کے اندر شامل ہو کر اسے اپنے طرز فکر سے متاثر کرنے کی کوشش بھی کریں تو اس سے کم از کم آئندہ انتخابات میں کسی ایک سیاسی پارٹی کو اکثریتی ووٹ مل سکے گا اور جمہوری نظام کے اندر جو موجودہ کھینچا تانی شروع ہے اس کا خاتمہ ہو سکے گا۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ملک میں دو یا تین جماعتوں کو پنپنے کا موقع مہیا کرنے کے لئے ہمارے علمائے کرام بلند ہمتی کا مظاہرہ کریں گے اور دینی جماعتوں کو خالصتاً مذہبی تعلیمات کے فروغ کے لئے وقف کرتے ہوئے سیاسی شوق پورا کرنے کے لئے اپنی اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں میں شمولیت اختیار کر لیں گے۔ ڈاکٹر اسرار کا یہ مشورہ صائب ہے کہ چونکہ بریلوی مکتب فکر کے علماء کرام تحریک پاکستان میں سرگرم کردار ادا کر چکے ہیں اس لئے اب ان کا مسلم لیگ کے ساتھ چلنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس ضمن میں مولانا عبدالستار نیازی کے لئے کوئی فیصلہ کرنا بہت آسان ہے کیونکہ وہ اقبالؒ و

قائد" کے پیروکار ہیں اور ان کی جماعت کو تقویت پہنچانے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ موجودہ مسلم لیگ ان کے تصورات پر پوری نہ اترتی ہو تو اس کے لئے مولانا نیازی اور ان کے ساتھی جید علمائے کرام مسلم لیگ کے مزاج کو صحیح خطوط پر ڈھالنے کی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں۔ اس طرح دیوبند مکتب فکر کے بعض علماء کو ماضی میں مسلم لیگ کے مخالف جماعت کے ساتھ چلنے میں کوئی راحت ملتی تھی تو ان کے لئے اب پیپلز پارٹی کا ساتھ دینے میں آسانی ہے۔ جے یو آئی (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) نے ایم آر ڈی کے اندر ایک عرصے تک پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کی ہے اور محض انتخابات کے موقع پر الگ راستہ اختیار کیا ہے جب کہ تشکیل حکومت کے مرحلے میں غیر جانبداری کا اعلان کرنے کے باوجود بیگم بے نظیر کے ساتھ "شانے سے شانہ ملا کر چلنے" کی پالیسی اپنانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس طرح اگر انہیں پسند ہو تو وہ من وتو کی تمیز ختم کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کی عملی سیاست کا حصہ بن سکتے ہیں تاکہ کم از کم انتخابات میں ایک تو لوگوں کے ووٹ ضائع نہ ہوں اور دوسرے ووٹ تقسیم ہو کر غیر مستحکم سیاسی نظام کو جنم نہ دیں۔ حالیہ انتخابات میں دیگر مذہبی گروپوں نے بھی اپنے اپنے نام سے شرکت کرنا ضروری سمجھی لیکن انہیں کامیابی نہ ہو سکی جماعت اسلامی اپنے آپ کو دینی اور سیاسی جماعت کہلاتی ہے اور تقریباً نصف صدی کی جدوجہد کے باوجود نہ تو اس کے ارکان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ بڑھ سکی ہے اور نہ اسے انتخابات میں چند سیٹوں سے زیادہ حصہ ملتا ہے جس سے اس کے سیاسی امیج کو چنداں فائدہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اسرار صاحب چونکہ پرانے جماعتیئے ہیں اس لئے انہیں اپنے سابق ساتھیوں سے خود ہی گفتگو کرنی چاہیے اور انہیں اپنے مؤقف کا قائل کرنا چاہیے۔ جماعت اگرچہ اس وقت ایک انتخابی اتحاد میں شامل ہے لیکن سیاسی اور انتخابی اتحادوں کی ماضی کی تاریخ خاصی مایوس کن ہے اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ جماعت اپنا سیاسی کردار مسلم لیگ کے اندر شامل ہو کر پورا کرے تاکہ کم از کم یہ جماعت تو ضروری طاقت حاصل کر سکے۔ اور آئندہ انتخابات کے نتائج کسی ایک پارٹی کے حق میں واضح ہو سکیں۔ آج بہرحال جو سیاسی عدم استحکام نظر آرہا ہے اس کی وجہ سیاسی اور انتخابی پارٹیوں کی کثرت ہے۔ اگرچہ کافی جماعتیں تو مکمل طور پر مسترد کر دی گئی ہیں تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑنے کے رجحان کی بھی حوصلہ شکنی کی جائے اور آئندہ کے لئے چند بڑی جماعتوں کو ابھرنے کا موقع دیا جائے تاکہ عوام ان میں کسی ایک کے بارے میں دوٹوک فیصلہ دے سکیں اور موجودہ عدم استحکام کی کیفیت دوبارہ پیدا نہ ہو۔

(الوار - ۱۱ دسمبر ۱۹۸۸ء)

گریبان ہیں۔ یہ لوگ بھی ایک مٹھی کی طرح متحد ہوں تو اثرانداز ہو سکتے ہیں' لیکن اختلاف اور تفرقہ سے ان کی مجموعی قوت بھی غیر مؤثر ہو گئی ہے۔ ہم لوگوں کا اسلام تو اعمال سے ظاہر ہوتا ہے اور خوب ظاہر ہو رہا ہے۔ ایمان کے اعتبار سے بھی صورت حال مایوس کن ہے۔ ایمان میں اتنی جان نہیں کہ عمل پر اثرانداز ہو سکے۔

تاہم مجھے یقین ہے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ کے وعدے اور حضورؐ کے فرامین پر اعتماد ہے اسے ماننا پڑے گا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہو گا اور پاکستان کا معاملہ منفرد ہے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا چنانچہ جسے بھی یہاں بساط حکومت بچھانے کی خواہش ہے اور ملک کو توڑنے کی بجائے صحیح سالم رکھنے کی آرزو ہے' اسے لازماً اسلام کا نام تو لینا ہی پڑے گا۔ طوعاً و کرہاً لے' یا دلی آمادگی سے' کیونکہ اس خطۂ ارضی کے پس منظر میں چار صدیوں کا احیائی اور تجدیدی کام موجود ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے شروع ہوا۔ اور گزشتہ نصف صدی میں تو یہاں جو کام ہوا' اس کی نظیر پوری دنیا میں موجود نہیں۔ اس کام کے اثرات بکھرے ہوئے ہیں' معدوم نہیں ہوئے۔ اہل دین باہم دگر الجھے ہوئے ہیں۔ اگر ان میں اتفاق و اتحاد کی شکل پیدا ہو جائے تو صورت حال مایوس کن نہیں امید افزا ہو گی۔ ملک کے موجودہ حالات اور وقت کے تیور مذہبی اور دینی جماعتوں سے کس طرز عمل اور کون سی حکمت عملی کا تقاضا کرتے ہیں' اس کے بارے میں میری مخلصانہ اور مؤدبانہ گزارشات التفات سے سنی جانی چاہئیں اور مناسب معلوم ہوں تو قبول بھی کی جائیں۔

سیاست کی گاڑی چلنے دی جائے

جہاں تک ملکی سیاست کا تعلق ہے اسے معاشرے کے مجموعی مزاج کے مطابق چلنے دیا جائے۔ اس میں فوری تبدیلی کی خواہش تو رکھی جا سکتی ہے لیکن بحالات موجودہ ممکن نہیں۔ اس گاڑی کو چلنے دیا جائے۔ کسی مذہبی مسئلے کو اٹھا کر اور عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے آپ چلتی گاڑی کو روک تو سکتے ہیں۔ وہ رک جائے گی لیکن صحیح سمت میں اڑے گی نہیں۔ اور اس رک جانے کا ملک و قوم کو شدید نقصان ہو گا۔ سیاست کی سمت میں جو ارتقاء ہو سکتا ہے' سیاسی روایات جو قائم ہو سکتی ہیں اور سیاسی شعور نکھر کر حکمرانوں کے احتساب کا جو رواج ڈال سکتا ہے' اس کا امکان معدوم ہو جائے گا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو نظامہائے باطل میں بھی موجود ہیں۔ ایک حدیث مبارک کا' جس کی سند اس وقت میرے پاس موجود نہیں' مفہوم ہے کہ

حکومت کفر کے ساتھ تو چل سکتی ہے' ظلم کے ساتھ نہیں چلتی۔ ہمارے ہاں بھی سیاست کی گاڑی چلی تو رفتہ رفتہ ظلم کا خاتمہ ہو گا۔ اسے چلنے دیا جائے۔ وقتی شوشے چھوڑ کر اسے روک دینے کو اپنی کامیابی سمجھنا بہت مہلک ثابت ہو گا۔ اور یہ چلے گی تو اس میں چلن سکہ رائج الوقت کا ہی ہو گا۔ جاگیرداری' سرمایہ داری' برادری' پیری مریدی اور پیسہ ہی بروئے کار آئے گا۔ فیصلہ کن عمل دخل انہی عوامل کا رہتا ہے چاہے معاملہ مسلم لیگ کا ہو یا پیپلز پارٹی کا۔ ان جماعتوں میں لوگوں کی آمدورفت نظریاتی وابستگی کے سبب نہیں ہوتی۔ ایک ہی خاندان کے کچھ لوگ ایک طرف ہوتے ہیں تو کچھ دوسری طرف۔

جمعیت علمائے پاکستان کو مشورہ

البتہ جو لوگ سیاست میں مذہبی عامل کو بھی کسی نہ کسی درجے میں داخل کرنا چاہتے ہیں' ان سے عرض کروں گا کہ کسی نہ کسی سیاسی جماعت میں داخل ہو کر یہ کام کریں۔ وہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر اپنی علیحدہ تنظیمیں بنا کر جب یہ کام کرتے ہیں تو اس سے دین کو نقصان پہنچتا ہے اور سیاست کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ دین کو نقصان ہوتا ہے کہ فرقہ واریت اور گہری' اور پختہ ہو جاتی ہے اور سیاست کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا بھی ہے تو وقتی اور بے حقیقت۔ فضل حق صاحب کو ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے مولانا سمیع الحق کی رفاقت اختیار کر لی اور نواز شریف صاحب کو حاجت تھی تو جماعت اسلامی کو ساتھ لے آئے' حالانکہ ان کے درمیان کوئی ذہنی' فکری اور مزاجی ہم آہنگی نہ پہلے تھی' نہ اب ہے۔ ماضی میں تحریک پاکستان کے دوران جو علماء مسلم لیگ میں شامل ہوئے انہوں نے عوام کے مذہبی تصورات سے ہم آہنگ ہونے کے باعث مثبت کردار ادا کیا۔ آج بھی یہ حضرات قومی جماعت میں شامل ہو جائیں تو مؤثر ہو سکتے ہیں۔ آج بھی مسلم لیگ کے احیاء کا ایک سنہرا موقع ہے۔ میں نے پیپلز پارٹی کے بارے میں کہا کہ وہ ایک مضبوط جماعت کے طور پر ابھری اور اس نے اپنا وجود ثابت کر دیا ہے تو لوگوں نے برا منایا حالانکہ سیاسی جماعتوں کا استحکام ملک کی سیاست کے لئے خوش آئند ہے۔ مسلم لیگ کے بارے میں بھی میری خواہش تھی اور ہے کہ وہ اپنی تاریخی حیثیت کا ادراک کرے۔ ماضی میں اس نے شاندار کارنامہ انجام دیا اور آج بھی کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہے۔ اس نے اپنے تشخص سے محروم ہو کر نقصان اٹھایا ہے۔ اسلامی جمہوری اتحاد میں مدغم ہو کر اس نے کوئی وقتی سا فائدہ اٹھا لیا ہو تو علیحدہ بات ہے ورنہ بحیثیت جماعت وہ گھاٹے میں رہی۔ شخصی اعتبار سے کسی کا بھلا ہو گیا ہو تو نہیں کہہ سکتا اور مسلم لیگ کونسل کے اجلاس

اسلام آباد میں وہی باتیں کہی گئیں جو میں کہتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد سے نہ مسلم لیگ کو فائدہ ہوا اور نہ جماعت اسلامی کو۔ میں نے انتخابات اور اتحاد بننے سے پہلے ہی مولانا نورانی میاں کو مشورہ دیا تھا کہ کوئی مؤثر کام کرنا چاہتے ہیں تو مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ ان کے اسلاف نے بھی یہی کیا تھا۔ اپنی علیحدہ جماعت نہ بنائی اور مسلم لیگ کو تقویت دی۔ دیوبندی حلقے کے بھی تھانوی گروپ نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ مسلم لیگ کا احیاء وقت کی ضرورت

> پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا بھائیو ایک دفعہ اور پڑھ لو اگر جماعت اسلامی کی حکومت آگئی تو درود پر پابندی لگ جائے گی۔

ہے' اس میں جماعتی عہدوں کو حکومتی مناصب سے الگ کر دیا جائے اور جو لوگ عوامی مزاج کے مطابق مذہبی تصورات رکھتے ہیں' انہیں اس میں شامل ہو کر مؤثر کردار ادا کرنا چاہئے۔

دوسرے دینی حلقے سے گزارش

ان کے برعکس اہل حدیث حضرات' دیوبندی مسلک کے لوگ اور جماعت اسلامی والے میرے نزدیک قومی سیاسی میدان میں کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ان تینوں کو بریکٹ کر کے ایک لفظ "وہابی" ان پر چسپاں کر دیا جاتا ہے اور عوام کی اکثریت کسی کافر اور ہندو کے مقابلے میں وہابی سے زیادہ بدکتی ہے۔ مسلم لیگ کو بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ نواز شریف صاحب اور جنرل فضل حق جیسی بعض شخصیات کو وقتی ضرورت لاحق ہو گئی تھی ورنہ مجھے بتایا گیا ہے کہ بعض مقامات پر یہ انتظام کیا گیا کہ جماعت اسلامی کے لوگ زیادہ نمایاں نہ ہوں' پیچھے رہ کر کام کریں ورنہ ہمیں ووٹ نہ ملیں گے۔ محنت اور بھاگ دوڑ ان کی تھی لیکن چونکہ گستاخ رسولؐ' وہابی اور پیروں فقیروں کے منکر کے طور پر مشہور تھے لہٰذا عوام میں ان کی پذیرائی مشکوک رہی۔ ایک لطیفہ نما واقعہ ہے' لیکن اس سے صورت حال کا اندازہ لگانے میں مدد ملے گی۔ مولانا شفیع اوکاڑوی مرحوم ۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی کے مقابلے میں الیکشن لڑ رہے تھے۔ اپنے ایک انتخابی جلسے میں انہوں نے لوگوں سے کہا کہ لو بھئی درود پڑھ لو۔ پڑھا گیا تو کہا ایک بار اور پڑھ لو۔ پھر کہا ایک بار اور۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا بھائیو ایک دفعہ اور پڑھ لو' اگر جماعت اسلامی کی حکومت آگئی تو درود پر پابندی لگ جائے گی۔ خود ہی سوچ لیجئے کہ مجمع پر اس کا کیا اثر ہوا ہو گا۔

سیاسی میدان میں مقابلہ ہوا تو ان لوگوں کو ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہو گا۔ یہ لوگ یاست میں مئوثر نہیں ہوسکتے۔ عوام کی اکثریت کی مذہبی سوچ اور مزاج کو تو یہ لوگ شرک کہتے ں' بدعت اور دین کی روح کے منافی قرار دیتے ہیں اور یہیں سمجھ لیجئے کہ بریلوی علماء سیاست کے میدان میں کیوں آئے' جمعیت علمائے پاکستان کیوں متحرک ہوئی۔ انہوں نے جب دیکھا ۔مذہب کے نام پر ووٹ مانگے جارہے ہیں تو سوچا کہ اس کے تو ہم زیادہ حقدار ہیں۔ ملک کا واد اعظم تو ہمارے خیالات اور مذہبی تصورات سے قریب تر ہے۔ اسی بات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں گروہ یعنی اہل حدیث' دیوبندی اور جماعت اسلامی' انتخابی سیاست میں کامیابی کے جھنڈے نہیں گاڑ سکتے کیونکہ ان پر وہابیت کی پھبتی چست کر دی جاتی ہے۔

مولانا داؤد غزنوی کی فراست

حال ہی میں میں نے مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں ایک واقعہ پڑھا اور پھر اس کے راوی جناب اسحاق بھٹی نے خود بھی مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے مولانا مرحوم سے' جو جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے' کہا کہ ہم سیاسی طور پر منظم ہو کر انتخابات میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ مولانا خاموش رہے۔ کچھ دنوں بعد پھر کہا تب بھی چپ سادھے رکھی۔ تیسری دفعہ اپنی بات دہرائی تو مولانا مرحوم نے فرمایا کہ مولوی صاحب میں تمہیں عقلمند آدمی سمجھتا تھا' لیکن تم تو عقل سے کورے ہو۔ جیسے ہی ہمارا کوئی آدمی سیاست کے میدان میں اترا' اسے وہابی کا لیبل چسپاں کر کے ناکام بنا دیا جائے گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو کر اس کا ٹکٹ لیں اور اس کے منشور کی بنیاد پر الیکشن لڑیں۔ اس صورت میں تو کوئی امکان ہو سکتا ہے' بصورت دیگر نہیں۔ دیوبندی حلقے کے تھانوی گروپ نے بھی اس حقیقت کو خوب سمجھا۔ انہوں نے کبھی سیاست میں حصہ نہ لیا۔ درس و تدریس میں مشغول رہے' تصنیف و تالیف کی اور دار العلوم چلائے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا سیاست میں گزر ہی نہ ہوا۔ ان کے جو شاگرد رشید اس میں آئے' وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر آئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنے اپنے علاقوں میں بہت کام کیا۔ تبلیغی جماعت نے بھی' جو خود

دیوبندی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں' اس نکتہ کو خوب سمجھا ہے۔ اگرچہ اجتناب میں حد سے بڑھ گئے ہیں تاہم وہ سیاست میں ٹانگ ہی نہیں اڑاتے' جانتے ہیں کہ اگر ہم مدمقابل بن گئے تو ہماری بات کون سنے گا۔

دیوبندی حلقے کا ایک گروہ البتہ کچھ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور میں اس میں مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق دونوں کے گروپ جمع کر رہا ہوں۔ یہ ایک ہیں' ایم آر ڈی میں شمولیت کے سوال پر دو حصوں میں تقسیم ہوئے اور جلد یا بدیر اکٹھے ہو جائیں گے۔ لیکن جغرافیائی اعتبار سے ان کا حلقہ اثر محدود ہے۔ صوبہ سرحد سے شروع ہو کر بلوچستان کے پختون علاقے ژوب تک ایک پٹی چلی جاتی ہے جس میں عوامی سطح پر مذہب کو اثر و نفوذ حاصل ہے۔ تہذیب و ثقافت میں بھی مذہب کے اثرات موجود ہیں اور نماز روزے کی پابندی بھی ہے۔ اسی علاقے سے مولانا مفتی محمودؒ نے بھٹو صاحب کو اس وقت شکست دی جب وہ طوفان کی طرح چڑھے تھے۔ اب وہیں سے ان کے فرزند ارجمند ڈٹ کر کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی جمعیت علمائے اسلام نے بلوچستان میں خاصی سیٹیں لی ہیں۔ دونوں دھڑوں کا ملا جلا اثر اس پختون پٹی میں اور پنجاب کے ملحق علاقوں میں موجود ہے' لیکن باقی ملک میں کوئی حیثیت نہیں۔ کسی جوڑ توڑ اور گٹھ جوڑ کے ذریعے ہی کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ مفتی محمودؒ کو سرحد کی وزارت علیا بھی مل گئی تھی لیکن کتنے دن چلی۔ اس دفعہ یہاں تک سننے میں آیا کہ مولانا فضل الرحمٰن کو وزارت عظمیٰ کی پیشکش ہوئی ہے۔ کوئی بڑا گروہ اپنی کسی وقتی مصلحت کے تحت ایسے چھوٹے گروہوں کو کوئی عارضی اہمیت دے بھی سکتا ہے' لیکن اس سے زیادہ کوئی پائیدار اثر ملکی سیاست پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔

جماعت اسلامی کا معاملہ

جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے' اس کا معاملہ پاکستان کی موجودہ سیاست میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ اہم ترین گروہ ہے جس کی تفصیل میں آگے بیان کروں گا' لیکن اس وقت میں اس کے کمزور پہلو سامنے لا رہا ہوں۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے بانی اور قائد مولانا مودودی مرحوم نے مولانا حسین احمد مدنیؒ' مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جمعیت علمائے ہند پر شدید ترین تنقیدیں کی تھیں۔ ان حضرات کے عقیدت مند وقتی ضرورت کے تحت اکٹھے ہو سکتے ہیں جیسے شریعت محاذ میں بھی جمع ہو گئے تھے' لیکن جن کے بزرگوں کو مولانا مودودی مرحوم نے کفر تک پہنچا دیا' وہ جماعت اسلامی کو کبھی معاف نہیں کر

سکتے۔ اسی طرح تحریک پاکستان کی مخالفت' اس سے علیحدگی' یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن سے بھی لاتعلقی تاریخی حقائق ہیں اور فراموش نہیں کیے جاسکتے۔ مولانا مرحوم نے جس طرح قائداعظم کی مخالفت قیام پاکستان سے پہلے اور بعد بھی کی۔ اس نے مسلم لیگ والوں کے سینے چھلنی کر دیئے تھے اور وہ سب ان کی یادداشت میں بھی محفوظ ہے چنانچہ جہاں بھی سینئر مسلم لیگی جمع ہوتے ہیں ویسی ہی باتیں سننے کو ملتی ہیں جیسی جماعت اسلامی کے بارے میں مسلم لیگ

> تجدیدی مساعی سے لوگوں میں دو خوبیاں پیدا ہوں گی۔ ایک مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کی قوت ارادی اور دوسرے دین کا فہم و شعور۔

کونسل کے اجلاس اسلام آباد میں کہی گئیں۔ کسی وقتی مصلحت کے تحت ان کا ساتھ ہو سکتا ہے' مسلم لیگ ضرورت پڑنے پر جماعت اسلامی کو استعمال ضرور کرلے گی' لیکن سیاسی سطح پر ان میں کوئی پائیدار رفاقت ممکن نہیں۔

ماضی میں جب مسلم لیگ اور جماعت اسلامی ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی ہوئیں تو کیا لیگ والوں نے تاریخ کھول کر نہ رکھ دی تھی؟۔ اپنے اپنے وقت میں لیاقت علی خاں' سردار عبدالرب نشتر' اشتیاق حسین قریشی اور محمود حسین قریشی جیسے لیگی زعماء نے کیا جماعت کو آئینہ نہیں دکھایا۔ آج اگر ایسا نہیں ہو رہا اور زبانوں پر مصلحت کے قفل پڑے ہوئے ہیں تو یہ نہیں کہ تاریخ سے ان ابواب کو نکال دیا گیا ہو۔ پھر جماعت اسلامی عقائد کی بات بھی کرتی ہے۔ دینی تصورات اور ان کے عملی پہلوؤں پر بھی ایک نقطہ نظر رکھتی ہے جو عوام میں موجود ہیں لہٰذا جماعت کے لئے انتخابی میدان میں کوئی مؤثر کردار ادا کرنا قطعاً ممکن نہیں۔ جو کام کر سکتی ہے' وہ بہت اہم اور حد درجہ قیمتی ہے۔

رنے کا اصل کام

جن تین طبقات کا اب تک میں ذکر کر چکا ہوں یعنی جمعیت اہل حدیث' جمعیت علمائے لام اور جماعت اسلامی' ان کے کرنے کا اصل کام اصلاحی' تبلیغی اور تعلیمی ہے اور تینوں جمع کر لیجئے تو یہ دین کی تجدیدی مساعی ہیں۔ عقائد کی اصلاح' اوہام کی صفائی' بدعات و ومات سے گلوخلاصی' لوگوں کو دین کا صحیح فہم دینا اور دین کا مکمل و جامع تصور پیش کرنے کا م علمائے کرام جمعہ جماعت اور دارالعلوموں کے ذریعے کر سکتے ہیں اور جماعت اسلامی

لٹریچر اور دیگر ذرائع ابلاغ استعمال کر کے یہ تجدیدی کام جاری رکھ سکتی ہے۔ ذرا غور کیجئے تو اس کام کا بالواسطہ اثر سیاست پر لازماً مرتب ہو گا۔ تجدیدی مساعی سے لوگوں میں دو خوبیاں پیدا ہوں گی۔ ایک مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کی قوت ارادی اور دوسرے دین کا فہم و شعور۔ یہ ارادہ پیدا ہو گا تو افراد قوم خود اس کھوج میں ہوں گے کہ دین کی تعلیم کیا ہے اور دین کا فہم و شعور ان میں یہ صلاحیت پیدا کرے گا کہ کھرے اور کھوٹے کو پہچان سکیں۔ ان دونوں خصائص کا پھیلاؤ جیسے جیسے بڑھے گا ویسے ویسے انتخابات پر بھی ان کے اثرات ظاہر ہوں گے۔ ووٹ مانگنے والا اپنے آپ کو لامحالہ اسلام سے وابستہ کرے گا اور ووٹروں کی نظر بندی بھی نہ کر پائے گا کیونکہ وہ جانتے ہوں گے کہ اسلام کیا ہے' کیا نہیں۔ گویا تجدیدی مساعی کرنے والے لوگ سیاست کے رخ کو باہر سے موڑیں گے۔ اگر وہ خود منجدھار میں کود پڑیں اور مدمقابل بن کر آجائیں تو یہ کام نہ ہو گا اور ہوا تو مؤثر نہ ہو گا۔

دو سبق آموز واقعات

اب تک کی گفتگو میں دو کام گنوا چکا ہوں کہ اول سیاست کی گاڑی کو اپنے رخ پر چلنے دیا جائے اور یہ چلے گی ویسے ہی جیسے اس کی چال ہے۔ دوئم تجدیدی کام پر توانائیاں صرف کی جائیں جس کے اثرات سیاست پر خود بخود ظاہر ہوں گے۔ سیاست کی گاڑی کو مصنوعی بریک نہ لگایا جائے۔ لوگوں کی مذہبی حساسیت کو بھڑکا کر اس کے سامنے رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں۔ اس طرز عمل کی بہت سی مثالیں میں پاکستان کی گزشتہ تاریخ سے دے سکتا ہوں' لیکن بات طویل ہو جائے گی اور شاید بعض حضرات برا بھی مانیں۔ دوسرے کام کے سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی دو دن پہلے میں مانسہرہ سے آگے پہاڑوں میں "اگی" کے مقام پر تصوف کے سلسلے کے ایک بزرگ سید عبدالرؤف شاہ صاحب سے مل کر آیا ہوں۔ انہوں نے یہ بات سنائی اور میں اسے ریکارڈ پر لا رہا ہوں۔ ان کی ذاتی دوستی مفتی محمودؒ سے تھی۔ ایک ملاقات میں ان سے کہا کہ مفتی صاحب! جمعیت علمائے ہند ہندوستان میں جہاد حریت کر رہی تھی۔ انگریزی استعمار سے آزادی حاصل کرنی تھی۔ اب پاکستان بننے کے بعد آپ کا کیا کردار ہے؟۔ سیاست میں حصہ لینے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو اپنے اسلاف کے کام کی طرف پلٹنا چاہئے جو معاشرے کی دینی و اخلاقی اصلاح' اس کا رخ اسلام کی طرف موڑنا اور پھر لوگوں میں دین کا فہم عام کرنا تھا۔ تو جواب میں مفتی صاحب مسکرا دیئے اور فرمایا کہ میرے بھائی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ گویا بات ہنس کے ٹال دی' ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ایک اور واقعہ اس موقع پر میں تاریخ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا عذیر گل صاحب
شاء اللہ ابھی بقید حیات اور مالاکنڈ کے علاقے میں مقیم ہیں۔ میں کئی سال پہلے ان کی خدمت
ں حاضر ہوا۔ وہ اسلاف کی نشانی ہیں۔ حضرت شیخ الہند جب مولانا مدنیؒ کے ساتھ مالٹا میں
سیر تھے تو تیسرے ساتھی یہی پرانے خادم، مولانا عذیر گل تھے۔ جمعیت علمائے اسلام کے جس
جوان عالم دین کی رہنمائی میں یہ سفر میں نے طے کیا تھا، اس نے واپسی پر سنایا کہ مولانا عذیر گل
نے خود مولانا مفتی محمودؒ سے اپنی گفتگو کا ذکر اس سے کیا۔ مفتی صاحب مولانا کے پاس تشریف
لائے اور کہا کہ ہم نے ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے، ہماری کامیابی کے لئے
دعا فرمایئے۔ مولانا عذیر گل نے مولانا مفتی محمودؒ سے فرمایا کہ خیر دعا تو میں کر دوں گا لیکن اس
راستے سے اسلام کبھی نہ آئے گا۔ اسلام آیا تو اسی انقلابی راستے سے آئے گا جو حضرت شیخ
الہندؒ کا تھا۔ یہی بات میں کہتا چلا آ رہا ہوں۔ یہ کوئی ضدم ضدا نہیں۔ ۱۹۵۷ء میں جماعت
اسلامی سے علیحدگی ہوئی تو اسی بنیاد پر ہوئی تھی کہ الیکشن کے طریق کار میں وقت اور صلاحیت
برباد نہ کیجئے۔ یہ راستہ آپ کو کہیں نہ پہنچائے گا۔ اسے چھوڑ کر وہی کام اختیار کیجئے جو تقسیم
سے پہلے کر رہے تھے۔

اعلیٰ ترین کام۔ انقلابی جدوجہد

کرنے کا تیسرا اور اعلیٰ ترین کام انقلابی جدوجہد ہے۔ اس انقلابی کام کا جذبہ جمعیت
علمائے اسلام میں بھی پایا تو جاتا ہے، مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق کی تقاریر میں انقلاب
کا ذکر بھی ضرور آتا ہے لیکن آخر میں پرنالہ آ کر گرتا ہے تو انتخاب پر۔ ان لوگوں میں انقلابی

میری دانست میں اسلامی انقلاب کے لئے جتنا جذبہ اور استعداد جماعت اسلامی میں
موجود ہے اور کسی جماعت میں نہیں۔

جذبہ موجود ہے لیکن انتخابی میدان میں سرگرداں ہو کر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میرے
نزدیک اس سلسلے میں جذبہ اور استعداد دونوں کے اعتبار سے جماعت اسلامی سرفہرست ہے۔
جماعت سے میری دلچسپی کا معاملہ صرف اس لئے نہیں کہ کبھی میں اس میں شامل تھا، دراصل
میری دانست میں اسلامی انقلاب کے لئے جتنا جذبہ اور استعداد جماعت اسلامی میں موجود
ہے، اور کسی جماعت میں نہیں۔ اور وہ اس لئے کہ قدیم اور جدید کا جیسا امتزاج ان میں پایا

جاتا ہے۔ اور کہیں نہیں۔ میرے نزدیک مولانا مودودی مرحوم و مغفور علامہ اقبال مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم دونوں کے فکر کے جانشین تھے۔ علوم جدیدہ پر اسلام کی تنقید کا حق علامہ اقبال نے ادا کیا تو قرآن کی طرف دعوت اور جہاد کا علم مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک بلند کیا۔ مولانا مودودی دونوں کے جانشین تھے اور اس اعتبار سے ان میں جامعیت تھی اور آج میں یہ بھی بتادوں کہ مولانا کی تربیت میں جمعیت علمائے ہند کے اکابرین نے بھی حصہ لیا تھا۔ بالکل نوجوانی کے دور میں وہ ''الجمعیت'' کے ایڈیٹر رہے' جہاں انہیں حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد قریبی ساتھیوں' مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعیدؒ سے قرب حاصل تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کو اسلامی انقلاب کے فکری پہلوؤں پر بڑی جامعیت عطا کی تھی۔ انہوں نے دین کا ایک جامع تصور دیا جو اگرچہ علامہ اقبال کی شاعری میں بھی موجود ہے اور جذبہ بیدار کرتا ہے لیکن پوری طرح مربوط نہ تھا۔ مولانا نے اسے اپنی کتابوں کے ذریعے ایک مربوط نظام کی شکل دی۔ فرائض دینی کا تصور دیا اور بتایا کہ عبادت صرف نماز روزہ نہیں' پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کا نام ہے۔ اور یہ کہ امت کا فرض منصبی دین کی شہادت اور دین کو عملاً پیش کرنا ہے۔ جب تک امت یہ کام کرتی رہی' اللہ کی رحمت سے نوازی جاتی رہی۔ جب سے یہ کام چھوڑا ہے' عذاب الٰہی کی گرفت میں ہے۔

مولانا مودودی نے دلائل و شواہد کے ساتھ بتایا کہ ہمارے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ لوگوں پر دین کی قولی اور عملی گواہی کا کام پھر سے شروع کریں۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے حق کی حجت قائم کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک اسلام کا نظام قائم نہ کیا جائے' اس وقت تک ساری زبانی کلامی تبلیغ بیکار ہے۔ اسی کا نام اقامت دین ہے اور اسی تصور

اس انقلابیت کے کچھ مظاہر آپ کو دکھاتا ہوں جو قبل از تقسیم جماعت اسلامی میں موجود تھی۔

کی بنیاد پر ایک خالص اسلامی انقلابی جماعت وجود میں آئی تھی جس میں ہر مسلمان کو شمولیت کی دعوت نہ تھی' وہی آسکتا تھا جو اسلام پر عمل کرنے اور اپنی زندگی پر اسے نافذ کرنے کا فیصلہ کرکے آئے۔ اس انقلابیت کے کچھ مظاہر آپ کو دکھاتا ہوں جو قبل از تقسیم جماعت اسلامی میں موجود تھی۔ انقلابی جماعتوں کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ داخلہ کی سخت شرائط' تحریک پاکستان سے علیحدگی' فلسطین کے مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا تھا اس سے بھی بے اعتنائی کہ

جرم کی سزا تھا جس کا ارتکاب شہادت حق کا فریضہ ترک کر کے امت نے کیا اور
کے الیکشن سے لاتعلق جو پاکستان کے لئے ریفرینڈم کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن بہرحال
آدمیوں پر مشتمل ایک قافلہ ضرور وجود میں آگیا تھا' جس کا نقشہ میں نے اپنی کتاب
جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ " میں کھینچا ہے۔ کتنے عظیم تھے یہ لوگ۔ کچھ
نے تو چند سال پہلے افغانستان کی طرف ہجرت کی تھی' ان لوگوں نے اپنے ملک میں رہتے
ہجرت کی۔ حرام کاروبار چھوڑ دیئے اور انگریز کی ملازمتوں پر لات مار دی کہ انگریز
ہے اور اس کے ساتھ تعاون دین کی حکمت کے منافی ہے۔

ولانا عزیر گل نے مولانا مفتی محمود سے فرمایا کہ خیر دعا تو میں کر دوں گا لیکن اس راستے
ے اسلام کبھی نہ آئے گا۔ اسلام آیا تو اسی انقلابی راستے سے آئے گا جو حضرت شیخ
ہند کا تھا۔

ت کا صحیح اور غلط کام

جماعت اسلامی ایک نہایت منظم جماعت تھی۔ آزادی کے بعد اس نے دو کام
ایک بالکل درست اور بدقسمتی سے دوسرا ویسا ہی غلط۔ اس نے بروقت مطالبہ کیا کہ
میں دستور اسلامی ہونا چاہئے۔ اس مطالبے' مسلم لیگ میں اسلامی ذہن رکھنے والوں
دگی اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی اسمبلی میں نشست نے یہ کام دکھایا کہ قرارداد مقاصد
گئی۔ اس مطالبہ کو جاری رکھا جاتا تو دستور میں رفتہ رفتہ اسلام کا غلبہ ہوتا جاتا۔ لیکن
ے غلط کام نے اس کی اپیل محدود کر دی۔ وہ غلط کام انتخابی میدان میں چھلانگ لگا دینا
وہ خود ایک فریق بن گئی اور اسلام متنازعہ مسئلہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اب ایک سنہرا
سر آیا تھا۔ میں نے الیکشن سے پہلے اپنے خطابات عام کے ذریعے اور قاضی حسین احمد
' پروفیسر غفور احمد اور محمود اعظم فاروقی جیسے اکابرین سے گفتگو میں جماعت کو یہ
ی کوشش کی کہ خدا کے لئے آپ الیکشن کے اکھاڑے سے باہر نکل آئیں۔ اس سے
عوام کی زبردست خیر سگالی حاصل ہوگی کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دینی جماعتوں کا باہمی
ی ان کی ناکامی کا سبب ہوتا ہے۔ ان کے دل دکھے ہوئے ہیں۔ آپ اگر نکل آئے تو
ھارس بندھے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ جو مذہبی اور دینی حلقے الیکشن میں حصہ لے

رہے ہوں گے' وہ آپ کے قریب آئیں گے تاکہ آپ کے حلقے کے ووٹ انہیں مل سکیں. یوں مخالفت کی بجائے موافقت اور مقابلے کی بجائے رجوع ہو گا۔ لیکن بہرحال میرا مشورہ قبول نہ کیا گیا تو دیکھئے کہ جماعت از کجا تا بہ کجا پہنچی ہے۔

انتخابی کامیابی کا موازنہ

موازنہ کے لئے جماعت اسلامی کے انتخابی میدان میں اترنے کے تین نقشے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں حصہ لیا گیا تو میں بھی ایک کارکن تھا۔ میں نے بھی ماڈل ٹاؤن میں مولانا امین احسن اصلاحی کے لئے کام کیا جو جماعت اسلامی کے ٹکٹ ہولڈر

میں نے بھی ماڈل ٹاؤن میں مولانا امین احسن اصلاحی کے لئے کام کیا جو جماعت اسلامی کے ٹکٹ ہولڈر نہیں 'اسلامی انتخابی پنچایت کے نمائندے تھے۔

نہیں 'اسلامی انتخابی پنچایت کے نمائندے تھے۔ اس کے لئے ایک اعلیٰ نظام وضع کیا گیا تھا۔ امیدواری حرام تھی اور پارٹی ٹکٹ ایک لعنت۔ پنچایتیں بنا کر لوگوں کو منتخب کیا اور مجبور کیا گیا کہ ہماری طرف سے الیکشن لڑو۔ امیدوار کو خود کچھ خرچ نہ کرنا تھا' اس پر تو ذمہ داری کا بوجھ آ رہا تھا لہٰذا سارا خرچ پنچایت نے کیا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس سیٹوں کی امید میں سے ایک بھی ہاتھ نہ آئی کیونکہ دھن' دھونس' دھاندلی کا کھلا استعمال ہوا جو مولانا مودودی ہی کی وضع کردہ ایک خوبصورت اصطلاح تھی۔ لیکن معاشرے کا چلن یہی تھا۔ محض مولانا محی الدین لکھوی منتخب ہوئے اور وہ بھی اس لئے کہ ان کے حلقے میں کئی گاؤں اہل حدیث حضرات کے تھے جن پر ان کا اثر گہرا تھا۔ کہا گیا کہ ہم کامیاب رہے کیونکہ ہم اپنے اصولوں کے پابند رہے لیکن اس کے بعد ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں امیدواری بھی جائز ہو گئی اور پارٹی ٹکٹ بھی رحمت بن گیا۔ باقی بھی بساط بھر سب کچھ ہوا۔ جب حرام چیزیں حلال ہو گئیں تو معاشرے میں مروج دوسری باتیں بھی جو حرام و حلال کے مابین تھیں' اختیار کر لی گئیں لیکن نتیجہ کیا ہوا؟۔ پورے ملک سے چار جمع ایک ر پانچ سیٹیں ملیں۔ چار جماعت کے اپنے امیدوار جو سب اراکین تھے اور ایک مولانا ظفر احمد انصاری جنہیں جماعت کی حمایت حاصل تھی۔ اب اٹھارہ برس بعد کا نتیجہ دیکھئے۔ انیس (۱۹) اور اٹھارہ (۱۸) کل سینتیس (۳۷) برس کچھ کم وقت نہیں۔ نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں۔ ۱۹۸۸ء میں اصول تو خیر سب چھوڑ ہی دیئے گئے' اپنی

جماعتی حیثیت بھی باقی نہ رہی۔ جماعت کے ٹکٹ پر نہیں' اتحاد میں جماعت کے کوٹے پر پانچ آدمی قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ چھ کا دعویٰ کیا گیا لیکن ایک صاحب (خواجہ کمال) نے بیان دے دیا ہے کہ ان کا تعلق جمعیت علمائے اسلام (درخواستی گروپ) سے ہے۔

انتخابی معرکے کے اس نتیجے کے ساتھ کچھ اور تلخیاں بھی ہیں۔ قائدین میں سے ایک بھی نہ آسکا۔ پانچ غیر معروف آدمیوں میں سے تین ہی جماعت کے رکن ہیں اور ملکی سطح کا کوئی ایک بھی نہیں۔ جماعت کا پہلا قلعہ کراچی بنا' وہ پہلے ہی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ دوسرا مورچہ لاہور قرار پایا تھا۔ جہاں سے پچھلے الیکشن میں سید اسعد گیلانی' لیاقت بلوچ اور حافظ سلمان بٹ آئے تھے۔ یہاں سے اب ایک رہ گئے جو جماعت کے رکن نہیں۔ کچھ ملا ہے تو ملک کے بالائی حصے میں' جیسے گرم ہوا اوپر کو اٹھتی ہے۔ اللہ رحم کرے کراچی سے اٹھتی یہ وہاں تک جا پہنچی ہے۔ تو یہ ہے چالیس سال کی محنت کا حاصل!

خود احتسابی کا وقت ہے

یہ خود احتسابی کا وقت ہے۔ جماعت کے لوگ اپنا اور اپنی قیادت کا احتساب نہیں کریں گے تو گاڑی اسی ڈگر پر چلتی رہے گی۔ تحریکیں اسی طرح بوڑھی ہو کر دم توڑ دیتی ہیں ورنہ

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

جماعت سے میری دلچسپی ہے تو اس لئے کہ ابھی وہاں مواد ہے۔ وہ نوجوان موجود ہیں جنہوں نے دین کے جامع تصور کو شعوری طور پر اختیار کیا ہے' اقامت دین کو اپنا فرض سمجھا ہے اور جو اس کے مختلف تقاضوں کے لئے قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن ایک غلط حکمت عملی سے وہ قوت غیر مئوثر ہو رہی ہے اور پورا مواد صحیح نتائج پیدا نہیں کر رہا۔ قاضی حسین احمد صاحب سے ایک امید قائم ہوئی تھی' لیکن افسوس کہ انہوں نے بہت مایوس کیا۔ اس سارے جوڑ توڑ کے دوران جماعت اسلامی کے ایک اہم رکن کی روایت کے مطابق وہ کئی گھنٹے نواز شریف صاحب کے ہاں جمے بیٹھے رہے کہ جب تک میرے امیدواروں کا فیصلہ نہیں کریں گے' یہاں سے اٹھوں گا نہیں۔ بار بار انہوں نے اشارے کئے کہ کرلیں گے' بس اب اٹھئے۔

لیکن نہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان جو پوری دنیا میں ایک معروف قوت ہے اس کا امیر اور اس کا یہ حال ہو تو مجھے آج بھی اس سے دکھ ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ دوبارہ غور کریں۔ اس انتخابی اکھاڑے سے نکلیں۔ اپنے انقلابی رخ کو اختیار کریں اور وہ قوت پیدا کریں کہ پھر جب میدان میں آکر چیلنج دیں تو جو صورت حال پیدا ہو' اسے سنبھال بھی سکیں جیسا کچھ تھوڑا بہت نقشہ ایران میں جما۔ اگرچہ وہ بھی کسی ایک جماعت کی جدوجہد کا نتیجہ نہ تھا۔ اگر ایک جماعت کی جدوجہد ہوتی تو کئی گنا بہتر نتائج نکلتے اور استحکام پیدا ہوتا۔ وہ بھی ایک متحدہ محاذ تھا' ہماری نظام مصطفیٰؐ تحریک کا سا متحدہ محاذ۔ لیکن بہرحال مظاہرے کی قوت کے ذریعے ایک انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کے لئے ضروری قوت پہلے فراہم ہو چکی ہو۔

اس انقلابی کام کے لئے سب سے موزوں مواد جماعت اسلامی کے پاس ہے اور میری دلچسپی کی بس یہی وجہ ہے ورنہ میں بھی اسے بس ایک سیاسی جماعت سمجھوں تو کوئی بات نہیں۔ فتح و شکست سیاست کے میدان میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں ع کہ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ اب نہیں تو پانچ سال بعد سہی۔ سیاسی جماعتوں کے لئے یہ سارے الٹ پھیر معمولات کا حصہ ہیں۔ سو یہ تین باتیں میں نے کہیں۔ اول سیاست کی گاڑی کو چلنے دیا جائے۔ نئی حکومت کے پاس اگر عوام کے لئے کوئی مثبت پروگرام ہے تو قرار میسر ہو گا ورنہ ان کے پاؤں خود بخود اکھڑ جائیں گے۔ لیکن انہیں موقع تو دیجئے کہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو کریں۔ دوئم اہل حدیث' جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی تجدیدی کام کریں اور سوئم انقلابی نہج پر اعلیٰ ترین کام کے لئے جماعت اسلامی کے پاس بہترین مواد ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو توفیق دے کہ میری باتوں پر خلوص سے اور خالی الذہن ہو کر غور کریں۔ ورنہ میری کوئی ذاتی یا گروہی غرض انہیں اس راستے پر ڈالنے میں نہیں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیت

داعیٔ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک پُرتاثیر اور فکر انگیز خطاب

ترتیب و تسوید۔ (شیخ) جمیل الرحمٰن

پیشِ کردہ یہ خطاب محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے آج سے پانچ سال قبل دسمبر ۱۹۸۳ء (مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۴ھ) میں کراچی بورڈ آف سیکنڈری اینڈ انٹرمیجیٹ ایجوکیشن کراچی کے ایک اجتماع میں ارشاد فرمایا تھا جس میں کراچی کے اکثر سیکنڈری اسکولز اور انٹر کالجز کے پرنسپل، ہیڈ ماسٹرز، اساتذہ اور لیکچرارز قریباً چھ سو کی تعداد میں شریک تھے چند دوسرے حضرات بھی تشریف لائے تھے۔ محبوب ربّ العالمین، سیّد المرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کا تذکرہ مبارک اور ڈاکٹر صاحب کا پُرتاثیر و فکر انگیز انداز اور اسلوبِ خطاب۔ پھر ایک بالکل نئے زاویہ سے سیرتِ مبارکہ کا بیان۔ ان تمام چیزوں نے مل کر پورے اجتماع کو مسحور کر رکھا تھا۔ شرکاءِ اجتماع گوش بر آواز تھے اور ان کی نگاہیں خطیب کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پورے اجتماع میں خطاب کے دوران ایک گمبھیر خاموشی چھائی رہی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جب ان تعذیب و تشدّد، جور و ستم اور مصائب کا ذکر شروع کیا جو داعیٔ الی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ

پر دعوتِ حق پیش اور قبول کرنے کی پاداش میں توڑے گئے تھے تو اس عاجز نے شرکاء کا جائزہ لیا تو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو نمناک نظر نہ آئی ہو ۔ بھائی منصور احمد بٹلہ مرحوم و مغفور "مطالعۂ فطرت اور ایمان" نامی مشہور کتاب کے مؤلف اس عاجز کے ساتھ تشریف فرما تھے ۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی ۔ خطاب کے اختتام پر انہوں نے اس عاجز سے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ ایمان باللہ توحید کی یہ تشریح و تعبیر میرے سامنے پہلی مرتبہ آئی ہے اور آج پوری طرح واضح ہوا ہے کہ اسلام واقعۃً "ایک انقلابی دین" ہے ۔۔۔ مرحوم نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ اپنی زیرِ تالیف کتاب کی تیاری سے فارغ ہو کر وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس خطاب کو پاکستان کے کونے کونے میں اپنے ذاتی خرچ سے طبع کرا کے پھیلا دیں گے ۔ انہوں نے اس عاجز سے اپیل کے انداز میں فرمایا کہ میں اس خطاب کو جلد از جلد ٹیپ سے سفینۂ قرطاس پر منتقل کر دوں اور کوشش کروں کہ محترم ڈاکٹر صاحب اس پر نظرِ ثانی فرما لیں ۔ اسے عاجز نے رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ میں انجام دے لیا تھا لیکن اِدھر ڈاکٹر صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث اس پر نظرِ ثانی نہ فرما سکے اُدھر مارچ ۷۸ء میں بھائی منصور بٹلہ کا قضائے الٰہی سے ہارٹ اٹیک کے باعث اچانک انتقال ہو گیا ۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ ۔ بعدہٗ یہ خطاب محترم ڈاکٹر صاحب کی نظرِ ثانی کے انتظار میں پڑا رہا ۔ لیکن موصوف کو تا حال اس کا موقع نہ مل سکا ۔ اب یہ خطاب موصوف کی نظرِ ثانی کے بغیر قدرے حک و اضافے کے ساتھ ہدیۂ قارئینِ میثاق کیا جا رہا ہے ۔ ماہنامہ میثاق میں اس کی تکمیل کے بعد اسے ان شاء اللہ العزیز کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام ہو گا اور توقع ہے کہ اللہ نے چاہا تو یہ خطاب "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے خلاصہ کا کام دے گا ۔۔۔ کسی خطاب کو تحریری شکل دینا کافی مشکل کام ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و توفیق ہی سے اس عاجز کے ہاتھوں یہ کام انجام پایا ہے ۔ اس خطاب میں جو صواب ہے وہ من جانب اللہ ہے اور اگر کوئی خطا ہے، اظہارِ مدعا میں کوئی تقصیر ہے، ابہام ہے، بے ربطی ہے تو اس کی ذمہ داری اس عاجز کے

وں پر ہے جس کے لئے یہ عاجز بارگاہِ ربّ العزّت میں دست بدعا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج

احقر،
جمیل الرحمٰن عفی عنہ
یکم دسمبر ۱۹۸۸ء

●

الحمد للّٰہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی
خصوصاً علٰی افضلھم وخاتم النبیّین سیّد المرسلین
محمدٍ الامین وعلٰی اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔ امابعد
فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ط
یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ

حضراتِ گرامی! ہر شخص جانتا ہے کہ سیرت النبی علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا موضوع نہایت وسیع، کثیر الاطراف ہے۔ اس کے متعدد پہلو ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں سیرتِ مطہرہ ہمارے لئے مشعلِ راہ نہ ہو۔ بلا تشبیہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسے چمنستان کا تصور کیجئے جو لاتعداد انتہائی حسین وجمیل، انتہائی دلآویز، انتہائی دلکش و دلربا اور انتہائی لطیف و مسحور کن خوشبوؤں سے لبریز و معطر پھولوں سے لدا پھندا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے رنگ و بو کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ بایں صورتِ حال انسان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی ایک پھول کا انتخاب کرے۔ میں سیرت النبیؐ کی تقاریر میں متعدد بار اپنے اس تاثر کو بیان کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعے سے میں مبہوت ہو جایا کرتا ہوں اور میرے قلب و ذہن پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ اور قدسی شخصیت کا جو گہرا نقش و اثر ثبت اور قائم ہوتا ہے وہ حضورؐ کی جامعیت کا ہوتا ہے کہ اتنی گمبھیر اور ہمہ گیر اور اتنی جامع زندگی تو ہمارے تصور اور حیطۂ خیال میں بھی نہیں ۔ حضورؐ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اسوۂ حسنہ کے اعتبار سے اکمل و اتم نہ ہو۔

سیرتِ مطہرہؐ کے بے شمار پہلو

لیکن ظاہر ہے کہ کسی ایک تقریر یا مضمون کے لئے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا کوئی ایک پہلو، کوئی ایک گوشہ بطورِ عنوان و موضوع متعین کرنا ضروری ہے ورنہ بات مختلف گوشوں میں پھیلے گی اور ہو سکتا ہے کہ

اس طرح سیرتِ مطہرہ کا کوئی معین پیغام سامنے نہ آ سکے۔ یقیناً آپ کے علم میں ہوگا کہ نبی اکرم صلی
علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دو کا ذکر بطور مثال پیش کرتا ہ
جنرل اکبر خاں نے ایک کتاب لکھی "حضورؐ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے"۔ ہمارے مشہور مفکر و محق
ڈاکٹر حمید اللہ مدظلہٗ نے ایک نہایت مبسوط کتاب تحریر فرمائی "حضورؐ ایک سیاست دان کی حیثیت س
مزید یہ کہ ہمارے صوفیاءِ کرامؒ اور اولیاءِ عظامؒ کے حلقوں میں حضورؐ کی سیرت بحیثیت "مُربّی و مزکّی" زی
آئی اور اس موضوع کے اعتبار سے متعدد پہلوؤں پر بے شمار تصانیف منصۂ شہود پر آئیں۔ اسی طرح
بہت سے مفکّرین اہلِ قلم نے "حضور بحیثیتِ داعی۔ بحیثیتِ مبلّغ۔ بحیثیتِ معلّم" وغیرہ کے موضوعا
پر نہایت اعلیٰ معیار کی کتابیں لکھیں۔ گویا مختلف لوگوں کا جو علمی ذوق اور طبیعت کا رجحان و میلان ہوگا
مناسبت سے سیرتِ مطہرہ کے بحرِ بے کنار اور لامتناہی گلستان سے اپنے اپنے دامن کی وسعت کے
سے اہلِ علم علم و حکمت اور اسوۂ حسنہ و کاملہ کے دُرِّ شہوار اور معطّر گل ہائے رنگا رنگ لے سکیں گے۔
مراد آبادی کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

حضور بحیثیت داعیٔ انقلاب: لہٰذا میں نے یہ طے کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہ
پر "حضورؐ بحیثیت داعیٔ انقلاب" کے موضوع پر آج گفتگو کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چند اسباب
اس وقت دنیا میں "اسلامی انقلاب" کا لفظ کافی لکھنے اور بولنے میں آرہا ہے۔ ایران میں جو تبدیلی آئی
بلاشبہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے، اس نے ایک مرتبہ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پھر چونکہ ہمارے ا
بھائیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک خالص اسلامی انقلاب ہے تو یقیناً پوری دنیا کے مسلمانوں کو اس معا
غور کرنا چاہیئے اس لئے بھی کہ اس وقت شاید ہی مسلمانوں کا کوئی ملک ہو جہاں اسلامی نظام برپا کرنے
تحریکیں برسرِ کار نہ ہوں یا یہ جذبہ اور عزم موجود نہ ہو۔ الغرض گذشتہ نصف صدی سے مختلف مسلم
ممالک میں جو تحریکیں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے لئے چل رہی ہیں، ان میں سب سے بڑا EAK
THROUGH) ایران میں ہوا ہے لہٰذا نتیجۃً اور فطرتاً توجہات اس طرف مرتکز ہوئی ہیں اور یہ انقل
بہت زیادہ زیرِ بحث چلا آرہا ہے۔ اس کی موافقت میں بھی بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اور مخالفت میں
اس وقت انقلابِ ایران میرا موضوع نہیں ہے البتہ اگر ہمارے پاس ایک پیمانہ ہو، ایک معیار ہو، ا
کسوٹی ہو تو پھر اس کے حوالہ سے ہم خود ASSESS کر سکیں گے، خود جانچ سکیں گے کہ جس جگہ جو

ہے اس کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے!!

اس موضوع سے ہمارے ملک کا تعلق: پھر ہم سب جانتے ہیں کہ اس مسئلہ کا تعلق خود ہمارے ملک سے بھی ہے۔ اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ملک "اسلام" کے نام پر قائم ہوا تھا۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص، سوائے اس کے جو انتہائی ڈھٹائی اور تعصب پر آمادہ ہو گیا ہو، اس بات سے انکار کر سکے کہ اس ملک کے استحکام کے لئے حقیقی بنیاد "اسلام" ہی ہے — اور اس ملک کو متحد رکھنے والی شے "اسلام" ہی ہے — لیکن یہ اسلام اب تک یہاں کیوں نہیں آیا! اور آئے گا تو کیسے آئے گا! یہ مسائل ہیں جو ہمارے غور و فکر کے مستحق ہیں۔ کیوں نہیں آیا! میں اس وقت اس مسئلہ پر گفتگو نہیں کروں گا چونکہ اس کے ڈانڈے عملی سیاست سے مل جائیں گے کہ کس کا کتنا قصور ہے! کسی کی کتنی کوتاہی ہے! پھر یہ کہ یہ گفتگو آج کے موضوع سے غیر متعلق بھی ہے۔ البتہ ہمارے ملک میں اسلام کیسے آسکتا ہے! یہ مسئلہ کا مثبت پہلو ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک آج کے موضوع سے بھی ہے — چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں کوئی دو مسلمان بھی مختلف الرائے نہیں ہو سکتے کہ وہ آسکتا ہے تو اسی نہج اور طریقہ پر کہ جس پر انقلاب برپا فرمایا تھا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے — امام دار الہجرت صاحب مؤطا امام مالک رحمہ اللہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک نہایت ہی حکیمانہ قول نقل ہوا ہے کہ: لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا۔ "اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر اسی طور سے کہ جس طور سے پہلے حصہ کی ہوئی تھی"۔ — معلوم ہوا کہ ہمارا جو قرنِ اول ہے، جو دورِ اول ہے، جو صدرِ اول ہے اس میں جو تبدیلی آئی تھی اور جو عظیم، اکمل و اتم اور صالح انقلاب برپا ہوا تھا تو اس کے متعلق ہمیں امکانی حد تک معروضی (OBJECTIVELY) طور پر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ نہج، وہ طریقہ، وہ عمل (PROCESS) کیا تھا! جس کے نتیجہ میں یہ انقلاب رونما ہوا — یہ ہیں وہ مختلف پہلو اور گوشے جن کے اعتبار سے آج کا موضوع بہت اہم ہے۔[1]

---

[1] اس موضوع پر الحمد للہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے دس خطابات پر مشتمل کتاب "منہج انقلابِ نبویؐ" کے عنوان سے موجود ہے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اغیار کی نظروں میں مقام

اس سے قبل کہ میں نبی اکرمؐ کی سیرت "بحیثیت داعیٔ انقلاب" پیش کروں۔ تمہیداً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس بات کو صرف حُسنِ عقیدت پر محمول نہ کیا جائے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو انقلاب برپا فرمایا تھا' وہ نہ صرف عظیم ترین تھا بلکہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے اعتبار سے اکمل و اتم تھا۔ بلکہ ناقدانہ طور پر اس امر کا اچھی طرح جائزہ لے لینا چاہئے کہ کہیں یہ محض ہمارے حُسنِ عقیدت اور فرطِ محبت کا کرشمہ تو نہیں ہے یا دراصل یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت اور واقعہ ہے۔ میں اس ضمن میں اپنوں کے بجائے چند اغیار کے حوالے دینا چاہتا ہوں۔ چونکہ دنیا کی یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے' یہ مسلّمہ اصول ہے کہ : اَلْفَضْلُ مَا شَہِدَتْ بِہِ الْاَعْدَآءُ " اصل فضیلت وہ ہے جس کا اقرار دشمن کریں "۔ اس اعتبار سے دیکھئے کہ ایچ جی ویلز جس کا سائنٹیفک فکشن میں جو بلند مقام ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس نے فکشن کے علاوہ پوری دنیا کی تاریخ پر بھی دو کتابیں لکھیں۔ دونوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ایک کتاب تھی SHORT HISTORY OF THE WORLD' اور دوسری تھی 'CONCISE HISTORY OF THE WORLD' یہ دوسری کتاب خاصی ضخیم تھی۔ "تھی" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اب اس کا جو نیا ایڈیشن آیا ہے تو اس میں پبلشرز نے کافی ردّ و بدل کر دیا ہے چونکہ ایچ جی ویلز تو کبھی کا مرکھپ چکا۔ وہ اعتراض و احتجاج کرنے کے لئے موجود نہیں۔ لیکن اس کی جو اصلی کتاب تھی جواب بھی اکثر بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہے۔ اس میں اُس نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تذکرے پر ایک CHAPTER لکھا ہے ـــــ پہلے تو یہ بات جان لیجئے کہ وہ حضورؐ کا عقیدت مند نہیں بلکہ دشمن تھا۔ اس نے حضورؐ کی نجی زندگی پر شدید حملے کئے ہیں۔ تعدّدِ ازدواج کی کڑوی گولی مغرب کے حلق سے نہیں اتر سکتی۔ اس لئے کہ عیسائیوں کی آئیڈیل شخصیتیں دو ہیں حضرت مسیح اور حضرت یحییٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام ـ اور ان دونوں برگزیدہ شخصیتوں نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ لہٰذا عیسائیوں کے یہاں تصوّر یہ ہے کہ اصل روحانی زندگی تجرّد کی زندگی ہے۔ ایک شادی کرنا بھی ان کے نزدیک روحانی اعتبار سے ایک کم درجہ کا فعل ہے۔ روحانی مملکت کا وہ SECOND RATE CITIZEN ہے جس نے شادی کر لی اور جس نے متعدد شادیاں کی ہوں چاہے اس کی دینی اعتبار سے کتنی ہی مصلحتیں اور حکمتیں کیوں نہ ہوں' یہ کڑوا گھونٹ ان کے حلق سے اترنے والا نہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ پر ایچ جی ویلز نے بڑے رکیک حملے کئے ہیں۔ میں اس کا ذکر نہ کرتا۔ نقل کفر کفر نباشد۔ لیکن میں نے اس کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہ

(ESTABLISH) ہوجائے ۔ یہ بات واضح ہوجائے کہ وہ حضورؐ کا معتقد نہیں بلکہ دشمن تھا لیکن
...ص باب ۔ آخر میں آتا ہے تو پہلے وہ قریباً پورا خطبہ حجۃ الوداع نقل کرتا ہے اور پھر تسلیم کرتا ہے کہ یہ
حقوقِ انسانی کا پہلا منشور ہے ۔ اس کے الفاظ ہیں (THE FIRST CHARTER OF HUMAN
RIGHTS) اس میں وہ لکھتا ہے :

"یہ تاریخِ انسانی کا پہلا عظیم انقلاب ہے جو برپا کیا ہے محمدؐ نے (صلی اللہ علیہ وسلم)"
پھر وہ لکھتا ہے اور عیسائی ہوتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

"جہاں تک انسانی حریت (HUMAN FREEDOM) اخوت (FRATERNITY) اور مساوات (EQUALITY) کا تعلق ہے تو اس کے مواعظ (SERMONS) پہلے بھی بہت کہے گئے ۔ مسیح ناصری (JESUS OF NEZZARETH) کے یہاں بھی وعظ تو بہت ہیں لیکن یہ مانے بغیر چارا نہیں کہ ان تین اصولوں (حریت ۔ اخوت اور مساواتِ انسانی) پر مبنی فی الواقع ایک معاشرہ تاریخِ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل قائم کیا محمدؐ نے (صلی اللہ علیہ وسلم)"

اسی طرح میں آپ کی توجہ ایم این رائے کی گواہی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔ برِصغیر پاک و ہند میں
قابلِ ذکر چند انقلابی پیدا ہوئے ہیں ، ان میں ایم این رائے کا شمار چوٹی کے انقلابیوں میں ہوتا ہے ۔ اس
نے ایک کتاب لکھی ہے جو بڑی مشہور ہے اس کا نام ہے "THE HISTORICAL ROLE OF ISLAM"
...یں وہ تسلیم کرتا ہے کہ تاریخِ انسانی کے عظیم ترین انقلابی ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ۔

آپ میں سے اکثر کے علم میں ہوگا کہ امریکہ میں مسٹر مائیکل ہارٹ کی ایک کتاب (THE
HUNDRED) کے نام سے چند سال پہلے چھپی ہے ۔ اس کے مصنف نے تاریخِ انسانی کی
...عظیم ترین شخصیتوں کا انتخاب کیا ۔ پھر ان میں درجہ بندی (GRADATION) قائم کی —
مشاہیرِ عالم پر کتابیں پہلے بھی لکھی گئی ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسا کورچشم بھی گزرا ہو کہ جس نے حضورؐ
کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا ہو ۔ لیکن ان کتابوں میں حضورؐ کا ایک عالم شخصیت کی حیثیت سے تذکرہ
ہوا ہوگا ۔ پھر یہ کہ ایسی کتابوں میں جو تذکرہ ہوتا ہے وہ یا تو تاریخی اعتبار (CHRONOLOGICAL
ORDER) سے ہوتا ہے یا حروفِ تہجی (ALPHABET ORDER) کے اعتبار سے —
لیکن 'THE HUNDRED' اس لحاظ سے منفرد اور مختلف کتاب ہے کہ اس میں جو ترتیب
ہے وہ مصنف نے اپنے خیال کے مطابق عظمت کے اعتبار سے قائم کی ہے ۔ یعنی مصنف کے

نزدیک عظیم ترین شخصیتوں میں اوّلین کون ہے! دوسرے نمبر پر کون ہے! پھر تیسرے نمبر پہ کون ہے! وقس علیٰ ہذا۔ اس میں نہ تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے نہ علاقہ اور مقام کا ۔۔ وہ اپنی کتاب میں نمبر ایک پہ لارہا ہے جناب محمد کو (صلی اللہ علیہ وسلم) ۔۔۔ غور کیجئے کہ کتاب چھپ رہی ہے مین ہیٹن (امریکہ) میں جو یہودیوں کا گڑھ ہے۔ پوری دنیا کی دولت کا بہت بڑا حصّہ وہاں مرتکز ہے۔ لکھنے والا ہے عیسائی۔ اس نے لکھا ہے کہ "میں نمبر ایک پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر کر رہا ہوں تو لازماً مجھے اس کی توجیہہ کرنے پڑے گی" اس کے الفاظ ہیں:

"NATURALLY I OWE AN EXPLANATION" پھر اس نے ان الفاظ میں اس انتخاب کی توجیہہ کی ہے کہ:

"HE IS THE ONLY PERSON SUPREMELY SUCCESSFUL IN BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR FIELDS"

"صرف وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) (تاریخ انسانی میں) واحد شخصیت ہیں جو مذہب اور سیکولر (لادینیت) دونوں میدانوں میں اعلیٰ ترین سطحوں پر کامیاب (ہوگئے) ہیں۔"

فی الوقت صرف مغرب کے مفکرین ہی کا نہیں بلکہ کرۂ ارضی کا مستقل ذہن یہ بن گیا ہے کہ وہ انسانی زندگی کو دو کھاتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک انفرادی۔ دوسرا اجتماعی ۔۔ انفرادی کھاتے میں مذہب ہے، عقائد ہیں، مراسم عبودیت ہیں، چند معاشرتی رسوم (شادی بیاہ، پیدائش وفوتگی وراثت وغیرہ) اور اخلاقیات ہیں۔ یہ گویا (PRIVATE AFFAIRS OF INDIVIDUALS) کا میدان (FIELD) ہے۔ اجتماعی کھاتے میں سیاست ہے، تمدّن ہے، قوانین ہیں، عدالت ہے، معیشت ہے، بین الاقوامی معاملات ہیں۔ الغرض پورا نظام حکومت ہے۔ یہ گویا اجتماعیت کا میدان (SECULAR FIELD) ہے۔ یہ ہے خدا ناآشنا مفکّرین کے غور و فکر کا حاصل اور نقطۂ نظر ۔۔ اسی کے تحت عیسائی ہونے کے باوجود وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو نمبر دو پر لاتا ہے پھر وہ لکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "جتنی بھی عظیم ترین شخصیتیں ہیں ان کا معاملہ عجیب ہے کہ ادھر RELIGIOUS FIELD میں کچھ عظمت ہے تو اُدھر SECULAR FIELD میں کچھ بھی نہیں۔ اِدھر بلندی پر ہیں تو اُدھر کہیں بھی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مہاتما گوتم بدھ مکارم اخلاق، عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت اونچی چوٹی پر لیکن سیاست، حکومت، تمدن کے اعتبار سے زیرو (ZERO) ۔۔ اُدھر سکندرِ اعظم، چنگیز، ہلاکو، اٹیلا

SECULAR FIELD میں بہت اعتبارات سے چوٹی پر لیکن RELIGIOUS FIELD میں بالکل تہی دامن بلکہ اس اعتبار سے انتہائی وحشی، ظالم اور غارت گر ـــــ جیسے علامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

اِسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

آپ چاہیں تو ہٹلر کو بھی ان میں شامل کر لیجئے۔ اس نے ایک وقت تو پوری دنیا کو نچا کر رکھ دیا تھا۔ یہ سب اِدھر چوٹی پر نظر آتے ہیں تو اُدھر صرف زیرو ہی نہیں بلکہ MINUS VALUE دینی پڑتی ہے۔ اس تناظر میں وہ کہتا ہے کہ:

" انسانی تاریخ میں عظیم ترین شخصیت صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔ جو SECULAR FIELD اور RELIGIOUS FIELD دونوں میں بیک وقت انتہائی کامیاب و کامران شخصیت ہیں۔"

ہم اس کی تعبیر یوں کریں گے کہ پوری انسانی زندگی میں ایک کُلی، ہمہ جہتی تبدیلی اور ایک کامل و اتم صالح انقلاب تاریخِ انسانی میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا ہے۔ کسی نے نئے عقائد دیئے، اخلاقیات کے وعظ اور درس دیئے لیکن وہ نئی تہذیب، نیا تمدن، نیا نظامِ اجتماعی نہیں دے پایا ـــــ کسی نے نئی مملکت قائم کر دی، ملک پر ملک فتح کر لئے لیکن وہ کوئی نئے عقائد، اعلیٰ اخلاق، نیا فکر نہیں دے پایا۔ یہ تمام چیزیں گمبھیر طور پر اور ایک کُل کی حیثیت سے اگر تاریخِ انسانی میں نظر آتی ہیں تو صرف انقلابِ محمدی میں نظر آتی ہیں۔ علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔

فلسفۂ انقلاب معلوم کرنے کا واحد ذریعہ

ایک بات اور بھی عرض کر دوں۔ وہ یہ کہ میرے نزدیک فلسفۂ انقلاب معلوم کرنے کا واحد ذریعہ صرف اور صرف سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ اگر کوئی سمجھنا چاہے کہ 'انقلاب' کسے کہتے ہیں اور اس کا منہجِ عمل کیا ہے؟ تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے پاس واحد موجود ذریعہ (THE ONLY AVAILABLE SOURCE) صرف اور صرف سیرتِ مطہرہ ہے[1]

[1] اس موضوع کی تفہیم کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف کی فکر انگیز کتاب "منہجِ انقلابِ نبوی" کا مطالعہ فرمائیے

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک مرتبہ ہوا ہے کہ ایک فردِ واحد نے کوئی دعوت شروع کی ہو، اس کی تبلیغ بھی خود ہی کی ہو، پھر اس دعوت کو قبول اور تسلیم کرنے والوں کو خود ہی منظم کیا ہو، ان کا تزکیہ اور ان کی تربیت بھی خود ہی کی ہو۔ پھر اپنی جمعیت کو پہلے سے قائم شدہ نظام سے خود ہی ٹکرایا بھی ہو۔ پھر اس ٹکراؤ اور تصادم میں ہر ہر قدم اور ہر ہر مرحلہ پر خود ہی قیادت بھی کی ہو اور بنفسِ نفیس ایک وسیع و عریض خطۂ زمین پر ایک نظام کو بالکلیہ بدل کر رکھ دیا ہو۔

انقلابِ محمدیؐ کی جامعیّت اور ہمہ گیری

پھر یہ تبدیلی اتنی ہمہ گیر اور جامع ہو کہ اس خطۂ زمین پر بسنے والوں کا صدیوں سے قائم شدہ نظامِ عقائد بدل گیا ہو۔ تین سو ساٹھ بتوں کو پوجنے والے ایک الٰہِ واحد کے بندے اور پرستار بن گئے ہوں۔ ان کی سوچ بدل گئی ہو، ان کا فکر بدل گیا ہو، ان کی اقدار بدل گئی ہوں، ان کا اخلاق بدل گیا ہو، ان کے عزائم بدل گئے ہوں، ان کے مقاصد بدل گئے ہوں، اُن کی آرزوئیں اور تمنائیں بدل گئی ہوں، ان کی معاشرت بدل گئی ہو، ان کے دن بدل گئے ہوں، ان کی راتیں بدل گئی ہوں، ان کی صبحیں بدل گئی ہوں، ان کی شامیں بدل گئی ہوں، ان کی زمین بدل گئی ہو، ان کا آسمان بدل گیا ہو، جو رہزن اور ڈاکو تھے وہ امن و سلامتی کے پیغام بر بن گئے ہوں، جو غارت گر تھے وہ لوگوں کی جان و مال کے محافظ بن گئے ہوں، جو زانی و شرابی تھے وہ عصمت و عفّت کے نگران اور تقویٰ و طہارت کے پیکر بن گئے ہوں، جو شقی القلب اور کٹھور دل تھے وہ رؤف اور رحیم و شفیق بن گئے ہوں، جو اَن پڑھ اور اُمّی تھے وہ نئے نئے علوم و فنون کے موجد بن گئے ہوں۔ یہاں تک کہ اگر پہلے زندگی عزیز تھی تو اب اپنے مقصد کی تبلیغ اور دعوت کی توسیع و ترویج میں موت ان کو زندگی سے کہیں زیادہ عزیز و محبوب ہو گئی ہو۔ بقول علامہ اقبالؔ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

الغرض ڈھونڈے بھی کوئی ایسی چیز نہ مل سکے گی جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ یہ تبدیل ہونے سے رہ گئی ہو۔ ایسے ہمہ گیر، ہمہ جہت، مکمل و اتم اور جامع ترین۔ ساتھ ہی صالح ترین انقلاب کی دنیا میں

دنیا کے دوسرے دو بڑے انقلابات

اب دنیا کے دوسرے دو بڑے بڑے انقلابات کا جائزہ لیجئے۔ پہلا انقلابِ فرانس ہے تو اس کے لئے فکر دینے والے والٹیر اور روسو جیسے بیسیوں مفکرین و مصنفین تھے۔ لیکن وہ صرف قلم کے دھنی تھے، میدان کے مرد نہیں تھے، لہٰذا ان کے دیئے ہوئے فکر پر انقلاب کا عمل از خود چلا ہے اور کافی طویل رصہ تک چلا ہے۔ پھر جب وہ آیا ہے تو اس کی قیادت چند اوباش قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ ہی وجہ ہے کہ وہ نہایت خونین انقلاب تھا۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں صرف یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ ملوکیت ادور ختم ہوا اور جمہوریت کے دور کا آغاز ہوا گویا نظامِ حکومت میں محض سیاسی پہلو کے اعتبار سے ایک تبدیلی ائی ــــ دوسرا انقلابِ روس ہے۔ اس انقلاب کی تاریخ عجیب ہے۔ فکر دینے والا کارل مارکس جو برمنی میں پیدا ہوا۔ اس نے اشتراکیت و اشتمالیت (COMMUNISM AND SOCIALISM) کا فلسفہ اولاً جرمنی میں پیش کیا اور بعدہٗ اسے انگلستان میں مدون کیا اور اپنا فکر اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ڈاس کیپٹل" (DASS-CAPITAL) کے ذریعے پیش کیا ــ ان دونوں ممالک (جرمنی اور انگلینڈ) میں بالشویک اور کمیونسٹ انقلاب آج تک نہیں آیا ــ اور مارکس صاحب اپنی زندگی میں ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہ کر سکے نہ کوئی انقلابی پارٹی تشکیل دے سکے۔ انقلاب آیا تو کہاں! روس میں۔ ایک فعال و متحرک شخصیت لینن نے مارکس کے فلسفہ کو ہاتھ میں لے کر انقلاب برپا کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں صرف معیشت کے ڈھانچہ میں یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ تمام ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت سے نکل کر ریاست کی اجتماعی ملکیت میں چلے گئے اور مادیت نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادیت کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجۃً ایک جابرانہ اجتماعی نظام (TOTALITARIANISM) وجود میں آ گیا۔

ــــ ان دونوں انقلابات کے متعلق یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ جس جمہوریت اور جس اشتراکیت کا نقشہ اور خاکہ اُن کے مفکرین نے پیش کیا تھا اس کے مطابق کہیں بھی ایک دن کے لئے بھی وہ نظام ہائے زندگی تاحال قائم و نافذ نہیں ہوئے۔ جمہوریت اور اشتراکیت کے نام سے جو نظام اس وقت رائج ہیں وہ اصل مفکرین کے پیش کردہ خاکوں اور نقشوں کی مسخ شدہ (PERVERTED) شکلیں ہیں۔

یہ انقلابات جزدی ہیں ، معلوم ہوا کہ انقلابِ فرانس ہو یا انقلاب روس ۔ وہ انقلاب اصل مفکرین کے
کے مطابق ایک دن بھی کہیں قائم و نافذ نہیں ہوا ۔ پھر یہ کہ وہ کئی نسلوں (GENERATIONS) پر
پھیلا ہوا عمل (PROCESS) ہے ۔ مزید یہ کہ یہ انقلابات بھی جزدی ہیں۔ یعنی اجتماعی نظامِ زندگی
میں کوئی تبدیلی اس کے سوا نہیں آئی کہ انقلابِ فرانس کے نتیجہ میں ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے
لی اور انقلابِ روس کے نتیجہ میں انفرادی سرمایہ داری کے بجائے اجتماعی سرمایہ داری آ گئی۔ رہا اجتماعی
اخلاقیات کا معاملہ ! اس شعبہ میں کوئی بہتر تبدیلی آنا تو درکنار، وہ روز بروز انحطاط و زوال سے دوچار
ہوتا چلا گیا۔ جبکہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا معاملہ یہ ہے کہ ایک فردِ واحد صلی اللہ علیہ وسلم
کی ذاتِ اقدس سے دعوت شروع ہو کر کل بیسؔ برس کی قلیل مدت میں ایک عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا
جس کے نتیجہ میں سابقہ مشرکانہ و استحصالی نظام بیخ و بُن سے اکھڑ کر انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر ایک
عادلانہ، منصفانہ اور صالح نظام قائم و نافذ ہو گیا ۔۔۔ لہٰذا جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اگر کسی کو سمجھنا ہو کہ
"انقلاب" کسے کہتے ہیں ! اس کا منہجِ عمل (PROCESS) کیا ہے ! اس کے مراحل و مدارج کیا
ہیں ! ان مراحل کے مختلف تقاضے اور لوازم کیا ہیں !! تو میں کسی فرطِ عقیدت اور فرطِ محبت کے بغیر یہ
سمجھتا ہوں ۔۔ اور میرے نزدیک یہ سمجھنا خالص واقعیت پسندی ہے ۔۔۔ کہ اس کے لئے ہمارے
پاس واحد AVAILABLE SOURCE صرف سیرتِ محمدی ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام۔

فلسفہ انقلاب اور اس کے مراتب و مدارج

آئیے اب ہم "انقلاب" کے فلسفہ اور اس کے مراحل، مدارج اور لوازم کو سیرت النبیؐ سے
سمجھنے کی کوشش کریں ۔۔۔ کسی انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز (STARTING POINT): اور اس
کا سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی نظریہ ہو، کوئی انقلابی IDEOLOGY ہو، کوئی انقلابی
فکر ہو اور وہ واقعی انقلابی ہو۔ انسانی زندگی کے جو تمدنی اور اجتماعی پہلو ہیں وہ رائج و نافذ الوقت نظام
کی جن بنیادوں پر قائم ہوں، وہ انقلابی فکر واقعی اور حقیقی طور پر ان بنیادوں پر تیشہ بن کر پڑے اور ان کو
بیخ و بُن سے اکھاڑنے کے درپے ہو جائے۔ جب تک کوئی ایسا انقلابی فکر اور نظریہ نہیں ہوگا

نقلابی عمل شروع نہیں ہو سکے گا۔ وعظ (SERMON) سے نصیحت سے، نیکیوں کی تلقین سے
انقلابی عمل شروع نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کچھ بہتر افراد (INDIVIDUALS) وجود
میں آجائیں گے۔ معاشرہ میں دیانت و امانت کی اگر کوئی سطح موجود ہے تو وہ کچھ بلند ہو جائے گی۔ معاشرہ
میں شرافت کی جو سطح موجود ہوگی وہ کچھ اونچی ہو جائے گی۔ نمازی کم تھے وہ کچھ بڑھ جائیں گے۔ ڈاڑھیوں
والے کم تھے ان کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن اس سے آگے بڑھ کر نظام کو بدلنا ہو
اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ انقلاب کا مطلب و مقصد اور اس کے معنی تو نظام کو بدلنے کے
ہیں۔ محض تبلیغ و نصیحت سے اس کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکتی۔ انقلاب کے لئے لازمی اور
ناگزیر ہے کہ اس کی دعوت کے ابتدائی نکات (INITIAL POINTS) رائج الوقت اجتماعی
نظام کے اساسی معتقدات اور تعامل کی نفی پر مشتمل ہوں اور ان کے برعکس انقلابی تصورات کے حامل ہوں۔
دعوتِ محمدیؐ کا نقطۂ آغاز: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کے آغاز میں
اہم ترین چیز ہے وہ ہے انذارِ آخرت۔ آخرت کی خبر۔ اس حقیقتِ کبریٰ کی خبر کہ مرنے کے بعد
دوبارہ جی اٹھنا ہے۔ اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ جیسے سورۃ المطففین میں فرمایا: اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ
اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (ترجمہ) "کیا یہ
لوگ) نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن (یعنی قیامت کے دن) یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟
اس دن جبکہ سب لوگ ربّ العٰلمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (آیات : ۴ ـ ۶) ــــ پھر روزِ
قیامت ہر ذی نفس کو اپنی پوری زندگی کے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا اور اس کے مطابق ہر
انسان کے لئے عدالتِ خداوندی سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے، جیسے سورۃ الغاشیہ کے آخر
فرمایا: اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۙ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (ترجمہ) "ان لوگوں کو پلٹنا
ہماری طرف ہی ہے، پھر ان کا حساب لینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے۔" (آیات ۲۵، ۲۶) ــــ
دور کی ابتدائی سورتوں میں اسلامی انقلاب کے تین اساسی و بنیادی نکات توحیدؔ۔ رسالتؔ اور
(یعنی آخرت میں سے آخرت کے انذار پر سب سے زیادہ زور (EMPHASIS) ملے گا۔
خطباتِ نبویؐ کی کتابوں میں ایک خطبہ ملتا ہے جو یقیناً اسی ابتدائی دور کا ہے۔ اس خطبہ کے
میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَ بِالسُّوْءِ سُوْءٌ وَ اِنَّھَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا۔

(ترجمہ) "اللہ کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو۔ پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی"۔

سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات کے متعلق ہمارے متقدمین میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ پہلی وحی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، لیکن یہ رائے شاذ ہے۔ امت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلم ہے کہ حضورؐ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ سے مَا لَمْ یَعْلَمْ تک ہے اور یہ وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ اکثر مفسرین متقدمین کی رائے ہے جو کافی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہوا اور سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ رسالت پر فائز فرمائے گئے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔ اس سورۂ مبارکہ کی دوسری اور تیسری آیات سے ہمارے موضوعِ زیرِ گفتگو کا گہرا تعلق ہے لہٰذا میں ان کی قدرے تفصیل سے تشریح و توضیح کروں گا۔ البتہ اس موقع پر یہ بات جان لیجئے کہ ابتدائی ساتوں آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست خطاب ہے۔ پہلی آیت صرف خطاب پر مشتمل ہے: یٰۤاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ "اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے!" اس طرزِ خطاب سے یہ لطیف مفہوم نکلتا ہے کہ اے میرے محبوب بندے! تم لپٹ لپٹا کر لیٹ کیسے گئے! تم پر تو ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جانے والا ہے۔ جس کا ذکر سورۃ المزمل میں جو بعض مفسرین متقدمین کے نزدیک دوسری وحی ہے۔ بایں الفاظ فرما دیا گیا ہے: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ہ (آیت ۵) (اے نبیؐ!) ہم تم پر ایک بھاری بات (بارگراں) ڈالنے والے ہیں"۔ اگلی چھ آیات آٹھ اوامر و ہدایات پر مشتمل ہیں جن کا کارِ رسالت سے لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔ دوسری اور تیسری آیت تین اوامر پر مشتمل ہے جن کا تعلق اُس قولِ ثقیل سے یا بارِ گراں سے ہے جس کو سورۃ المزمل میں بیان کر دیا گیا تھا۔ دوسری آیت میں اسلامی انقلاب

آغاز یعنی انذارِ آخرت کا حکم ہے اور تیسری آیت میں اس انقلابِ اسلامی کے منتہائے مقصود کو بیان
کیا گیا ہے یعنی تکبیرِ ربّ۔ اللہ تعالیٰ کی تشریعی کبریائی کا بالفعل قیام و نفاذ۔

انقلابِ محمدیؐ کا فلسفہ اور منہاج

آیئے اب ان تین آیات کی روشنی میں بطریقِ تدبّر انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے فلسفہ
و منہجِ عمل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ حضورؐ سے خطاب ہوتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ "اے لحاف میں
لپٹ کر لیٹنے والے!" قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ "اب اپنے منصبِ رسالت کی ادائیگی کے لئے کھڑے
ہو جاؤ۔ کمر کس لو اور اپنی جدوجہد کا آغاز کرو"۔ یہ پہلا موقع ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھ کھڑے
ہونے اور اس شہر اور معاشرہ میں اپنا انقلابی مشن کی دعوت دینے کا حکم دیا جا رہا ہے جو شرک کا گڑھ ہی نہیں ہے
بلکہ بیت اللہ شریف کے باعث مکّہ مکرّمہ تمام مشرکینِ عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا ہے۔ اور قریش اس
کے مجاور ہیں جس کی وجہ سے ان کو عرب کی مذہبی سیادت و قیادت بھی حاصل ہے اور جو ان کی معاش کا
بھی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کعبہ شریف اور اس میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بتوں پر جو چڑھاوے
چڑھتے تھے ظاہر بات ہے کہ وہ حسبِ مراتب خاندانِ قریش میں تقسیم ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ اسی بیت اللہ
کے طفیل قریش کے تجارتی قافلے یمن سے شام اور شام سے یمن تک بے خوف و خطر آتے جاتے تھے
جبکہ قریباً پورے عرب میں لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم رہتا تھا۔ دوسرے قبائل کے تجارتی قافلوں
کا محفوظ طور پر اس وقت تک گزر جانا ممکن نہ تھا جب تک ان کے ساتھ حفاظت کے لئے کافی بڑی تعداد
میں مسلح نفری موجود نہ ہو۔ دریں حالات ایک شخص کا تن تنہا اٹھ کھڑے ہونا اور اسلام کی انقلابی دعوت
دینا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن حکمِ الٰہی ہے کہ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ کمربستہ ہو کر کھڑے ہو جاؤ اور
اپنے کام کا انذار سے آغاز کرو۔ آخرت کے فکر سے بے نیاز اور بے پروا لوگوں کو خبردار کرو۔ غفلت
کے ماتوں کو جگاؤ۔ ان کو WARN کرو۔ ان کو آگاہ کرو کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی نہیں ہے۔ ایک
یومِ عظیم آنا ہے جب تم کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور تمہیں محاسبہ اور جواب دہی کے لئے اپنے ربّ،
اپنے خالق، اپنے مالک کے حضور میں کھڑے ہونا ہو گا۔

ایمانیاتِ ثلاثہ کا باہمی ربط و تعلّق

اس آیت پر تدبر کے نتیجہ میں یہ اصل الاصول مستنبط ہوا کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں
اسلامی انقلاب کی دعوت کا نقطۂ آغاز انذارِ آخرت ہے۔ غور و فکر سے اس کی حکمت بھی سمجھ میں
آجاتی ہے۔ دیکھئے ہمارے دین کے ایمانیاتِ ثلاثہ توحیدؔ۔ رسالتؐ اور معادؔ یا آخرت جہاں با
مربوط اور ایک وحدت ہیں وہاں ان کے تقاضے اور مفاہیم میں بعض اعتبارات سے تھوڑا اتھ
فرق ہے۔ نظری و علمی اعتبار سے اہم ترین ایمان "ایمان بالتوحید" ہے۔ قانونی و آئینی اعتبا
اہم ترین ایمان "ایمان بالرسالت" ہے۔ انسان کو تقوٰی کی روش اختیار کرنے اور دین کے تقا
کے مطابق آمادۂ عمل کرنے کے اعتبار سے اہم ترین ایمان "ایمان بالمعاد" یا "ایمان بالآخر
ہے۔ ایک شخص توحید کا قائل ہے لیکن جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا بالکلیہ منک
یا اس کا مقرّ تو ہے لیکن ساتھ ہی آپؐ کے بعد سلسلۂ نبوت کے جاری رہنے کو تسلیم کرتا ہے تو وہ کسی حال میں بھ
مومن نہیں ہے۔ یا وہ ختمِ نبوّت کا بھی قائل ہے لیکن وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنتوں
فرمودات کو دین میں حجت تسلیم نہیں کرتا اور آپؐ کو ہر زمان و مکان میں مطاع نہیں مانتا تو اس کا ا
بھی غیر معتبر ہے۔ اسی طرح کوئی شخص دین کی ان تعلیمات کو تو بالکل صحیح طور پر تسلیم کرتا ہے لیکن تو
آخرت، حساب کتاب، وزنِ اعمال اور جنّت و جہنّم کی قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ وصحیحہ میں بیا
حقائق اور امور کی من مانی اور اپنی ناقص عقل سے ایسی تعبیرات و تاویلات کرتا ہے جو کتاب و سنّ
کے نصوص، منشاء اور مدعا کے یکسر خلاف ہیں تو وہ بھی مسلم و مومن نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں نبی اکرم صل
علیہ وسلم کا یہ فرمانِ مبارک قولِ فیصل کی اہمیت و حیثیت کا حامل ہے:۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش نفس اس ہدایت
کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔"

انذارِ آخرت کی اہمیت: میں عرض کر رہا تھا کہ اسلامی انقلاب کا نقطۂ آغاز (STARTING POINT) انذارِ آخرت ہے۔ تجدیدِ دین اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ یعنی دین اللہ کو بحیثیت نظامِ حیا

، قائم و نافذ کرنے کے لئے کوئی تحریک اٹھے لیکن وہ انذارِ آخرت پر وہ زور نہ دے جس کا
قرآن و حدیث اور سیرتِ مطہرۃ کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آتا ہے تو وہ تحریک اور وہ
منہاجِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام پر نہیں ہوگی۔ ایسی تحریک و دعوت منہاجِ نبوت پر
ت تک قرار دیئے جانے کی مستحق نہ ہوگی جب تک اس کے پیشِ نظر کوئی دنیوی غرض نہ ہو۔ نہ
نیا میں کسی صلہ اور اجر کی تمنا ہو حتیٰ کہ اس کا مطلوب و مقصود دنیا میں حصولِ اقتدار بھی نہ ہو۔
لیٰ اپنے فضلِ خاص سے اسے تمکّن فی الارض عطا فرما دے تو یہ اس کا انعام ہوگا۔ حصولِ اقتدار
نصب العین کا درجہ دیا گیا تو تمام اعمالِ صالحہ کے حبط ہونے کا اندیشہ بلکہ خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ مزید
ئی تحریک و دعوت منہاجِ نبویؐ پر نہیں ہوگی جب تک اس کے آغاز میں اسلامی انقلاب کی دعوت
رین نکتہ انذارِ آخرت نہ ہو۔ جب تک اس تحریک و دعوت کے وابستگان اور متوسلین کا اصل
العین (MOTIVE) آخرت کی نجات، اُخروی فلاح اور رضائے الٰہی کا حصول نہ بن جائے۔
ب تک یہی امور تمام اعمالِ صالح اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے اصل جذبۂ محرکہ کا مقام
ل نہ کرلیں۔ تب تک وہ صحیح معنوں میں اسلامی انقلابی تحریک نہیں کہی جا سکے گی۔ اس لئے کہ اسلامی
ب کے لئے مخلصانہ، حقیقی، پائیدار اور مستحکم جذبۂ عمل صرف رضائے الٰہی کے حصول اور نجاتِ
ی کو نصب العین بنانے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ چیز کمزور ہوگی تو اللہ کی راہ میں سعی و محنت کرنے،
د مال کھپانے، ایثار کرنے اور قربانیاں دینے کا جذبۂ صادق کہاں سے آئے گا۔! قوتِ محرکہ
(MOTIVATING FORC) کیسے پیدا ہوگی!!

انقلاب کے کارکنوں کے لیے عظیم ترین محرک

آپ کو معلوم ہے کہ انقلابی تحریک میں حصہ لینے والے کو تو ذہناً اس بات کے لئے تیار رہنا
ہے کہ مجھے اس راہ میں اپنا سب کچھ لگانا اور کھپانا ہے، سب کچھ حتیٰ کہ جان بھی قربان کرنی ہے۔
ی وہ جانتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ انقلاب میری زندگی کے دوران نہ آئے۔ میں اپنی آنکھوں
نقلاب کی کامیابی نہ دیکھ سکوں ۔ اکثر انقلابی لوگ اپنی زندگیاں دے دیتے ہیں کامیابی اگر
ی ہے تو ان کے بعد ہوتی ہے۔ وہ تو گویا آئندہ نسل کی بھلائی اور ______

بہتری کے لئے انقلابی تحریک میں پورے جوش و خروش سے کام کر رہے ہوتے ہیں ۔۔ یہ
کیجئے کہ کسی وقت بھی ان کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ ہم جو یہ مصیبتیں جھیل رہے ہیں تو آخر کم
اپنی زندگی میں ہمیں تو انقلاب کے کامیاب و کامران اور بار آور ہونے کی کوئی امید نظر نہیں
تو دنیوی طور پر اس انقلاب کے نتائج سے بہرہ مند نہیں ہوسکیں گے ۔۔ ! یہ محض خیالی بات
بلکہ خالص منطقی (PURE LOGICAL) تجزیہ ہے ۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ یہ جو ایمان بالآخر
یہ جو رضائے الٰہی اور اُخروی نجات کا نصب العین ہے، وہ ایک بندۂ مومن کو اس کی زندگی
سانس تک فعال اور متحرک رکھتا ہے ۔ چونکہ اس کا مطلوب و مقصود دنیا اور اس کے فوائد نہیں
اس کا اصل نصب العین آخرت ہے جس پر اسے پختہ ایمان و ایقان حاصل ہے اور وہ شعور
جانتا ہے کہ میری زندگی میں دنیا میں انقلاب آئے نہ آئے ۔ انقلابی عمل کامیاب ہو یا ناکام ۔
میں اس نے جو سعی و محنت کی ہے، جو جان و مال لگایا ہے، جو صلاحیتیں اور توانائیاں کھ
جو مصائب و شدائد برداشت کئے ہیں، جو قربانیاں دی ہیں، جو ایثار کیا ہے وہ سب کچھ ضا
والے نہیں ۔ ان سب کا اجر اس کے لئے آخرت میں محفوظ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ا
اور فدا کاروں کے لئے یہ نوید جانفزا موجود ہے :

أَنِّي لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّنۢ بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا۟ وَأُخْرِجُوا۟ مِن دِيَـٰرِهِمْ وَأُوذُوا۟ فِى سَبِيلِى وَقَـٰتَلُوا۟ وَقُتِلُوا۟ لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّـَٔاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّـٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ عِندَهُۥ حُسْنُ ٱلثَّوَابِ ○

"میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں ۔ خواہ وہ
مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو ۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر
اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گ
اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے میں ان سب کے قصور لازماً معاف کردوں گا او
انہیں لازماً ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ یہ اُن کی جز
ہے اللہ کے یہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے ۔" (آلِ عمران : ۱۹۵)
اور بقول علامہ اقبال ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

بات کو اقبالؔ نے ایک دوسرے اسلوب سے یوں ادا کیا ہے، جس کو میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں:

؎ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

رت سے تین مثالیں: تفہیم کے لئے سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے تین مثالیں
کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ـــــ غزوۂ بدر میں مشرکین کے ستر سربرآوردہ اشخاص مقتول ہوئے تھے
یں امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا فرعون، اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل بھی واصلِ جہنم
تھا۔ غزوۂ احد میں چند مسلمانوں کی اجتہادی غلطی کے سبب سے مسلمانوں کی ابتدائی فتح شکست سے
گئی تھی اور اس میں ستر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ لیکن اس
میں قریش کے بھی چند ممتاز لوگ مقتول ہوئے تھے جن میں ایک نمایاں شخصیت حارث ابن عامر کی تھی
بن کو حضرتِ خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قتل کیا تھا۔ بایں وجوہ مشرکینِ مکہ کے سینوں میں انتقام کی
یاں سلگ رہی تھیں۔ اس پس منظر میں دو قبیلوں کے چند لوگوں نے سنہ ۴ھ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
دمت میں حاضر ہو کر اپنے قبیلوں کے اسلام قبول کرنے کا اقرار کر لیا اور درخواست پیش کی کہ قبیلے کے
ں کو اسلامی عقائد و احکام کی تعلیم کے لئے چند صحابہؓ کو ان کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ حضورؐ نے دس صحابہؓ
ذکر دیئے۔ مکہ اور مدینہ کے وسطی مقام رجیع میں ان غداروں نے بدعہدی کی اور بنولحیان کو جو اس
میں مقیم تھا خفیہ طور پر پیغام بھیج دیا کہ ان اصحابِ رسولؐ کا کام تمام کر دیں۔ دس افراد پر دو سو کے لشکر
یلغار کر دی۔ ان لوگوں نے بڑھ کر ایک پہاڑی پر پناہ لی۔ حملہ آوروں نے امان کا وعدہ کر کے ان
ہاڑی سے اترنے کی ترغیب دی لیکن سردارِ لشکر نے اس وعدہ پر اعتماد نہیں کیا۔ وہ اور ان کے
ت ساتھی لڑ کر شہید ہو گئے۔ دو حضرات، حضرت خبیب اور حضرت زید ابن الدثنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما
وں کے وعدہ پر اعتماد کر کے پہاڑی سے اتر آئے۔ کافروں نے بدعہدی کی اور ان کو باندھ کر مکہ
ئے اور بیچ ڈالا۔ حضرت خبیبؓ کو حارث ابن عامر کے بیٹوں نے خرید لیا تاکہ باپ کے بدلے میں ان کو
کریں۔ وہ ان کو حرم کی حدود سے باہر لے گئے۔ حضرت خبیبؓ نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت چاہی
وں نے اسے منظور کر لیا۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا "دیر تک پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن خیال
تم کو گمان ہوگا کہ موت کے ڈر سے طویل نماز پڑھ رہا ہوں"۔ پھر یہ اشعار پڑھے:

(ترجمہ) "جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں، تو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں کہ کس پہلو سے قتل کیا جاؤں گا۔ یہ جو کچھ ہے خالصۃً اللہ کے لئے ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل فرمائے گا۔"

دوسرے صحابی حضرت زید ابن الدثنہؓ کو قتل کے ارادہ سے صفوان ابن امیہ نے خرید اتھا۔ ان کے وقت قریش کے معزز سردار تماشہ دیکھنے آئے ـــــ حضرت زیدؓ کو ایک درخت سے باندھا اُنؓ کے خون سے اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے لوگ جمع ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں نیزہ ہے تیر کمان لئے کھڑا ہے، کسی نے تلوار سونت رکھی ہے۔ سب کو اپنی اپنی آگ بجھانی ہے۔ اس موقع سردار بولا "سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کئے جائیں تو کیا تم اس کو خوش قسمتی نہ سمجھتے!" حضرت زیدؓ نے جواب میں کہا۔

"خدا کی قسم! میں تو اپنی جان کو اسے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک میں ایک کانٹا چبھ جائے۔"

اس مکالمہ کے بعد ایک شقی آگے بڑھا۔ اُنؓ کے جگر میں نیزہ کی انی کا ایک کچوکا دیا۔ جب یہ لگا تو حضرت زیدؓ کی زبان سے الفاظ نکلے:

فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ

"رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا"

غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں کی فتح شکست و ہزیمت میں بدل گئی تھی، گھمسان کی لڑائی ہو رہی اس موقع پہ ایک نوخیز جوان صحابیؓ ایک طرف کھڑے کھجوریں کھا رہے تھے۔ وہ کھجوریں کھاتے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور آپؐ سے دریافت کیا کہ "اگر میں اس جنگ میں مارا جاؤں تو میں مجھے اس کا کیا صلہ اور کیا بدلہ ملے گا!" حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا "جنت" ـــ ان صحابیؓ نے ہاتھ سے کھجوریں پھینکیں کہ ان کو مزید کھانے میں جو وقت لگے گا وہ دخولِ جنت میں ہو! اور دیوانہ وار گھمسان کے معرکۂ جنگ میں گھس گئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے جام شہ نوش کر لیا ـــــ یہ جذبہ صرف اور صرف ایمان بالآخرۃ دے سکتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی نہیں ہے جو اس درجہ کا انسان کو جذبہ دے سکے۔ (جاری ہے)

آخرت پر ایمان (آخری قسط)

محمد غوری صدیقی

آخرت کا آخری مرحلہ

اللہ کی عدالت میں پیشی اور حساب کتاب کے بعد تمام انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو
ں گے۔ ایک گروہ جنتی ہو گا۔ دوسرا گروہ جہنمی ہو گا۔ آخرت کا انسانی معاشرہ دو علاقوں یا
جہانوں پر مشتمل ہو گا ایک جہان کا نام جنت ہو گا۔ دوسرے جہاں کا نام جہنم ہو گا۔
جنت میں آرام بغیر کام کے' لذت و راحت بغیر مشقت کے حاصل ہوں گی۔ جنت کا
م اس قدر اعلیٰ و ارفع اور تیز تر ہو گا کہ جنت کے شہری کی خواہش ہی جنت کے نازک نظام کو
کت میں لا کر فوراً مطلوبہ شے مہیا کر دے گی۔ روایات میں آیا ہے کہ جنتی کی خواہش پر
ختوں کے پھل خود جھک کر خود کو پیش کر دیں گے۔ جنتی دیکھے گا کہ خوش نما خوش آواز
ندے اڑے جا رہے ہیں۔ ان پرندوں کے کباب کی خواہش دل میں پیدا ہو گی اور دوسرے
ں لمحے ان کے کباب تھال میں سج کر پیش ہو جائیں گے۔ گویا ہر خواہش پوری ہونے کی جگہ
نت ہی ہے۔ یعنی کن فیکون کی طاقت دے دی جائے گی۔

ولکُمْ فِیہَا مَاتَشْتَہِیَ اَنفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیہَا مَاتَدَّعُوْنَ (سورۂ حٰم سجدہ)

ی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

جنت میں زندگی نہایت پاکیزہ اور صاف ستھری ہو گی۔ وہاں گندے' بدتمیز' بدکار'
بداخلاق' ناشائستہ اور غیر مہذب انسانوں کو داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔
"لَا یَسْمَعُوْنَ فِیہَا لَغْوًا وَّلَا کِذَّابًا" "وہ (جنتی) وہاں نہ لغو نہ جھوٹی بات سنیں

گے" جنت کی شہریت ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کے اخلاق پسندیدہ ' گفتگو شیریں ' کردا
دلکش و مضبوط ' جن کی چال ' ڈھال میں ایک شان ہو۔ ذوقِ نظر شستہ و پاکیزہ ہو۔ جن کی
طبیعت حق و صداقت ' محبت و مروت ' فیاضی و ایثار ' شرم و حیا غیرت و حمیت ' امانت و دیانت
رحم و کرم ' نظم و ضبط ' اور عدل و انصاف سے لبریز ہو گی۔ وہ لوگ جنت کے فردوسی معاشرہ کے
معیار پر پورے نہیں اتریں گے جو بدذوق ' بدنظر ' بداخلاق ' بے سلیقہ ' آوارہ مزاج ' بے لگا
ہوں گے۔ جن کے دل ہوا و ہوس سے گندے ' جن کے دامن گناہوں سے ناپاک ہو
گے۔ ایسے بزدل کہ نفس کے شیطان سے نہ لڑ سکے۔ ایسے سنگدل کہ مظلوموں ا
بے کسوں پر رحم کھانے کی بجائے ستم ڈھاتے رہے۔ وہ کہ جنہوں نے ہر باطل اور طاغوت کے
آگے سر جھکایا اور حق و صداقت کے ہر مطالبہ کو ٹھکرایا۔ نفرت و عداوت ' بغض و حسد ' ظلم
ستم ' حرص و طمع ' بزدلی و منافقت کی گندگیوں میں پروان چڑھے ایسے گندے ' بے حمیت
بودے کردار کے لوگوں کو جنت میں داخلہ نہ مل سکے گا۔ ان کو جہنم کے علاقے میں داخل
دیا جائے گا۔ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ○ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ "۔

دوزخ

حضورؐ نے فرمایا کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکا عذاب اس شخص پر ہو گا جس کی دونوں
جوتیاں اور تسمے آگ کے ہوں گے جس کی وجہ سے ہانڈی کی طرح اس کا بھیجہ کھولے گا۔ وہ
سمجھے گا کہ سب سے زیادہ عذاب مجھے ہی ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ دوزخ کی آگ دنیا کی آگ سے
۷۰ گنا سخت ہو گی۔ ایک روایت میں ہے کہ اگر دوزخی دنیا کی آگ میں آ جائیں تو ان کو نیند آ
جائے۔ فرمایا دوزخ میں ایک پتھر ڈالا جائے تو تہہ تک ۷۰ سال میں پہنچے گا۔

اہل دوزخ کے جسم بہت چوڑے چکلے بنا دیئے جائیں گے تاکہ عذاب کی سختی زیادہ محسوس
ہو۔ زخموں کا دھوون ' خون ' پیپ ' کھولتا پانی ان کا شربت ہو گا اور کانٹے دار جھاڑیاں
(ضریع) ان کا کھانا ہو گا۔ جن کو کھانے سے بھوک نہ مٹے گی سورۂ مومنون میں ہے۔
" آگ ان کے چہروں کو جھلستی ہو گی اور اس میں ان کے منہ بگڑے ہوں گے"۔

حضورؐ نے فرمایا کہ " اے لوگو! روؤ اور رونہ سکو تو رونے کی صورت بناؤ کیونکہ دوزخ میں
دوزخی اتنا روئیں گے کہ ان کے آنسوان کے چہرے پر نالیاں بنا دیں گے۔ روتے روتے آنسو

لنے بند ہو جائیں گے تو خون بہنے لگے گا جس کی وجہ سے آنکھیں زخمی ہو جائیں گی۔ خون اور نسوا اتنا نکلے گا کہ اگر اس میں کشتی چھوڑی جائے تو وہ چلنے لگے۔" (شرح السنہ)

جنت

یک حدیث میں (مسلم شریف کی) ہے کہ ادنیٰ درجہ کے جنتی کو جنت میں جو رقبہ دیا جائے گا وہ تمام دنیا سے دس گنا بڑا ہو گا ایک خدا سے ڈرنے والے کو دو دو باغ اتنے بڑے بڑے ملیں گے جن کی لمبائی چوڑائی اتنی ہو گی کہ مسافت میں سو برس لگیں۔ (جواہر التفسیر)
ہر مومن کے لئے جنت میں ایک موتی کا خیمہ ملے گا جس کی لمبائی ۶۰ میل کی ہو گی اور اس خیمہ میں اس کی بیویاں اس طرح قیام کریں گی کہ ایک دوسری کو نہ دیکھ سکیں۔ (مسلم شریف)
جنت والے اپنے اوپر والوں کو بلندی کے باعث اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم آسمان پر ستارے دیکھتے ہو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی ہو گی۔ کنکریاں موتیوں اور یاقوت کی ہیں اس کی مٹی زعفران کی بنی ہوئی زرد اور خوشبودار ہو گی جو کوئی اس میں داخل ہو گا چین و آرام سے رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہاں پر اس کو کبھی موت نہ آئے گی نہ اس کے کپڑے کبھی پرانے ہوں گے نہ اس کی جوانی کبھی فنا ہو گی سدا جوان رہے گا۔ حضورؐ نے فرمایا جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ "مالا عینٌ رأتْ ولا اذنٌ سمعتْ وما خطر علی قلب بشر"
"جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا نہ اس کے متعلق کسی انسان کے دل میں خیال آیا" ۔حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ جنت کی چیزوں کے نام دنیا کی چیزوں کی طرح ہیں لیکن ان کی حقیقتیں دنیا کی چیزوں سے بالکل مختلف ہوں گی کیونکہ دنیا کی چیزوں کا مادہ مٹی جیسی غلیظ اور کمتر چیز ہے اور جنت کی اشیاء نور کی بنی ہوں گی۔ (مسلم شریف)
اللہ تعالیٰ جنت کے مکینوں کو سورۂ الرحمٰن سنائیں گے۔ جنتی آپس میں دعوتیں کیا کریں گے آپس میں پہیلیاں اور خوش فعلیاں ہوں گی۔ جنت میں نہایت تیز رفتار سواریاں ہوں گی۔ ہر جمعہ کے روز جنتی اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جنتی اپنی جنتوں میں مشغول ہوں گے کہ ایک نور ظاہر ہو گا لوگ اوپر نگاہیں اٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی تجلی دیکھیں گے اس وقت رب العزت کا پہلا جملہ یہ ہو گا۔ "السلام علیکم یا اہل الجنۃ" یہ وہی سلام ہو گا جس کا وعدہ قرآن میں سورۂ یٰسین میں ہے۔ "سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ"۔

خاتمۂ بحث

اللہ تعالیٰ کی ناراضگی (عذاب دوزخ) سے بچنے اور اس کی رضا (جنت کی
ں اور اس کی شاندار زندگی) حاصل کرنے کے لئے ہم سب کو اس ناپائیدار زندگی میں ہی
ن کوشش اور جدوجہد کرنی ہوگی۔ یہ امتحانی وقت کب ختم ہو جائے کچھ پتہ نہیں لہٰذا جیسے
تباہ میسر آئے اور نصیحت مل جائے فوراً پچھلی کوتاہیوں پر صدق دل سے توبہ کرنی لازم
۔ راہ حق میں چلنے والوں کی مشکلات دوچند ہیں انہوں نے نفس کے شیطان کے علاوہ باطل
ہائے کے شیاطین سے بھی ہر وقت چومکھی جنگ لڑنی ہے۔ معاشرہ کے دباؤ کا بھی مقابلہ
ہے۔ اس کشمکش حیات سے صحیح طور پر سرخرو ہونے کے لئے آخرت کا صحیح اور ہمہ گیر تصور
ں کی صورت میں ہر وقت دل میں جاگزیں رہنا ضروری ہے۔ حضورؐ کی ایک جامع حدیث سنا
س مضمون کو تمام کرتا ہوں۔

هذه القلوب لتصدأ كما يصدأ الحديد اذا اصابه الماء قيل ما
لائها يا رسول الله قال كثرة ذكر الموت وتلاوة
قران"۔

بے شک ان قلوب کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو زنگ لگتا ہے جبکہ اس پر پانی
ے۔ پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ اس زنگ کا صیقل کیا ہے۔ فرمایا موت کو کثرت سے
کرنا اور قرآن کی تلاوت کرنا"۔

یادہ طریقۂ زندگی کہ موت کا خیال ہر دم پیش نظر رہے اور کثرت سے قرآن کی تلاوت۔

لا یتلو کا مطلب ہے کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ گویا تلاوت سے اصل مراد قرآن کے پیچھے
پیچھے چلنا ہے۔ صرف زبانی تلاوت نہیں۔ قرآن کریم اپنی تعلیمات اور تقاضوں کے ذریعے
ن جن گھاٹیوں سے گزارنا چاہتا ہے ان سے گزرا جائے جس تحریک اسلامی کے دوران یہ
آخری پیغامِ ہدایت نازل ہوا اس تحریک کو برپا کر کے قدم بقدم چلا جائے تو تلاوتِ قرآن کا حق
دا ہو گا۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء نے اسی قرآنی تحریکِ انقلاب کا ساتھ دینے کا عزم کر رکھا
ہے اب آخرت کے اس ہمہ گیر تصور کو دل میں بٹھا کر میدانِ عمل کا شہسوار بننے کی ضرورت
ہے۔ نفس کے طاغوت کے استیصال کے ساتھ ساتھ معاشرے کے غلط رسوم و رواج '
بدعات سے بھی انکار لازم ہے۔ ظالم نظام سے ٹکراؤ ضروری ہے۔

فمن یکفر بالطاغوت و یؤمن باللہ فقد استمسک

بالعروۃ الوثقیٰ لاانفصام لھا

پس جس نے طاغوت کا انکار اور اللہ پر ایمان رکھا اس نے (درحقیقت) ایک بہت بڑے
سارے (اللہ کا سہارا) کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے"۔

خرمیں صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اے الٰہ العٰلمین۔

میرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
ن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

صوصاً ہماری تنظیم اسلامی کے ذروں کو آفتاب بنا کر شرک و باطل کے اندھیارے دور کرنے
لا بنا دے۔ آمین

و اخر دعوانا ان الحمدلله رب العلمین۔
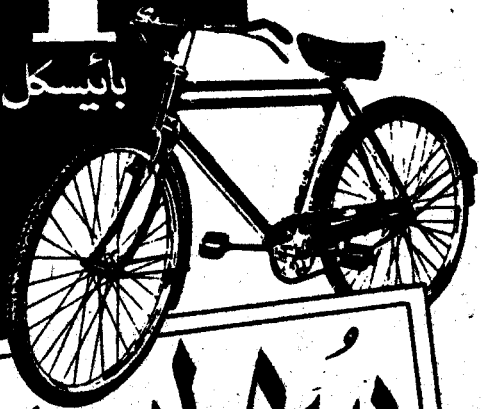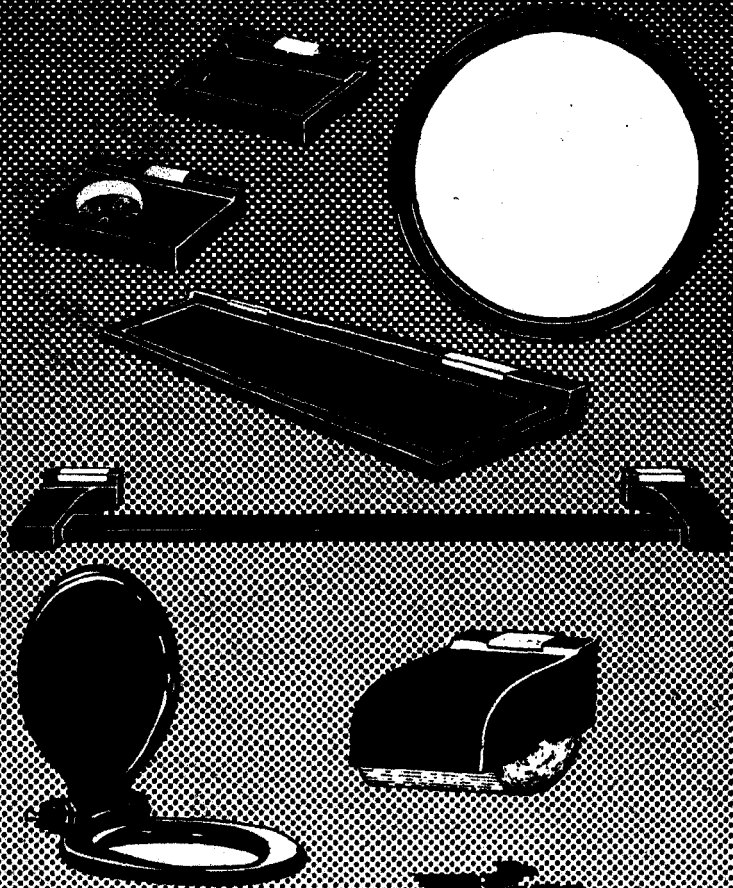
ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

تیز تر کِ گامزن . . .

دسمبر ۸۸ء میں کراچی میں منعقدہ تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام مرکزی تربیت گاہ اور انجمن خدّام القرآن سندھ کے زیر اہتمام محاضراتِ قرآنی کی رپورٹ

مرتب: رحیم کاشفی

کراچی میں رفقاء تنظیم اسلام کے لئے ایک مرکزی تربیت گاہ کا اہتمام ۱۸ر تا ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۸ء کیا گیا تھا جس میں انجمن خدام القرآن سندھ کی جانب سے منعقدہ پانچ روزہ محاضرات قرآنی کا پروگرام بھی شامل تھا۔ اس دفعہ محاضرات ...... (جن کا عنوان تھا "اسلام کا نظام حیات۔" اور اس میں امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کو پانچ ذیلی موضوعات پر خطاب کرنا تھا۔ یہ خطبات ۱۷ر تا ۲۱ر دسمبر طے تھے۔

رفقاء کراچی اس پروگرام کے لئے کئی ہفتوں سے سرگرم عمل تھے' جلسہ گاہ' طعام اور قیام کے علاوہ دیگر انتظامات کو آخری شکل دے کر ۱۷ر دسمبر کی صبح سے بیرونی وفود کے استقبال کے لئے مستعد منتظر تھے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ گاہ اور قیام کا بندوبست روایتی طریقوں کے بالکل برعکس جدید تقاضوں کے مطابق کیا گیا تھا۔ قیام کا انتظام تین مختلف مقامات پر تھا۔ اس کے لئے شہر کے قلب میں واقع ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کے علاوہ ایک فلیٹ بھی مختص کیا گیا تھا' تیسری جگہ ریلوے کا ریسٹ ہاؤس تھا' ان مقامات پر حتی المقدور سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ اسی طرح عین شہر میں واقع ایک معروف آڈیٹوریم کو بطور تربیت گاہ و جلسہ گاہ استعمال کیا گیا تھا اور اُسی کے عقب میں واقع بڑے سے خالی پلاٹ کو طعام گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ آڈیٹوریم اور قیام گاہوں کے درمیان ماسوائے ریسٹ ہاؤس کے دس منٹ کی پیدل مسافت تھی۔ لٹریچر اور آڈیو/ ویڈیو کیسٹس کی فروخت کے لئے آڈیٹوریم کے برآمدے میں اسٹالز لگائے گئے تھے۔ قریب ہی ایک استقبالیہ کاؤنٹر بھی بنایا گیا تھا۔ اس مختصر سی تمہید و ضروری تعارف کے بعد روزانہ کی رپورتاژ حاضر خدمت ہے۔

۱۷ر دسمبر ۱۹۸۸ء...... آج بیرون شہر کے رفقاء کی آمد رہی۔ انہیں متذکرہ بالا مقامات پر ٹھہرانے کے ساتھ ظہرانہ بھی قیام گاہوں میں ہی پیش کیا گیا۔ چونکہ محاضرات کا پروگرام ساڑھے چھ بجے شروع ہونا تھا لہٰذا رفقاء اپنے ذاتی کاموں کے لئے اس وقت تک فارغ تھے۔ اس دفعہ محاضرات اس لحاظ سے بھی منفرد تھے کہ مقرر صرف امیر محترم تھے اور ہر روز بعد از خطاب علماء و دانشوروں پر مشتمل ایک پینل ان سے موضوع کے متعلق سوالات کرتا اور امیر محترم اُن کے جوابات دیتے تھے جس سے

نفس موضوع مزید واضح ہو جاتا اور کئی اشکالات بھی دور ہو جاتے تھے۔ اہلیان شہر نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور ان کا ذوق و شوق محاضرات کے آخری روز تک قائم رہا۔ ان محاضرات میں شرکت عام کے لئے بذریعہ ہینڈ بلز پبلسٹی کی گئی تھی اور مختلف مساجد سے باقاعدہ اعلان بھی کروایا گیا تھا۔ وقت مقررہ پر انجمن خدام القرآن سندھ کے صدر جناب سراج الحق سید صاحب نے تعارفی کلمات سے محاضرات کا افتتاح کیا۔ بعدازیں امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے' جو کہ انجمن کے نگران اعلیٰ بھی ہیں' "اسلام کی نظریاتی اساس" پر ایک جامع و پر مغز خطاب فرمایا۔ ان کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

اسلام کی فکری اساس ایمان ہے' اگر فکر درست ہو تو عمل بھی درست ہوتا ہے اور اجتماعی سوچ اور نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا نہ ہو تو نظام تبدیل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کا نظام حیات کی اصطلاح ایک حادث اصطلاح ہے اس کا آغاز مرعوبیت اور شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کی فکری اساس یعنی ایمان کی تعمیر نو کے بغیر کوئی اسلامی تحریک اسلامی نظام کے قیام پر منتج نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم کے موروثی عقائد کی بنیاد پر' جس میں گہرائی اور گیرائی نہ ہو جو ذاتی سوچ میں پیوست نہ ہو کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے بغیر کوئی سیاسی تحریک تو برپا کی جا سکتی ہے' اس میں مذہبی رنگ گہرا ہو سکتا ہے اور لوگ جانیں بھی دے سکتے ہیں' لیکن نظام میں تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اسلام میں اس کی جڑ بنیاد ایمان باللہ ہے' جو ایک مثبت قوت کا نام ہے' اور یہ قوت قرآن ہی کے ذریعے پیدا کی جا سکتی ہے۔

اسلام جن چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے وہ عام انسانی فہم سے قریب تر ہیں' نیک اور بدی کا امتیاز انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ انسان کا روحانی وجود فرشتوں کے وجود سے بھی بلند تر ہے' اس میں عالم امر اور عالم خلق دونوں جمع ہیں' حقیقی انسان وہ وجود ہے' جو اس میں مضمر ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کسی فلسفی نے اپنی سوچ اور فکر کو یقین کے ساتھ حق قرار نہیں دیا اور نہ اس پر دوسروں کو ایمان لانے کی دعوت دی۔ صرف انبیاء کرامؑ نے اپنی تعلیمات کو جو وحی پر مبنی ہے حق قرار دیا اور جنہیں تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے۔ کائنات کے مابعد الطبیعیاتی حقائق کے علم کا نام ایمان ہے۔ حکماء اپنی سوچ بچار' عقل اور منطقی استدلال کے ذریعے فلسفے پیش کرتے ہیں' لیکن انبیاء کرامؑ اپنی تعلیمات کو غور و فکر کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ ایک اور ذریعے سے حاصل شدہ قرار دیتے ہیں' یعنی وحی جو کہ حق ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ موت ایک وقفہ ہے' معدوم ہونے کا نام نہیں بلکہ ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں تبدیل ہونے کا نام ہے۔ اور اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ قرآنی تعلیمات کے ذریعے ذہین اقلیت میں حقیقی ایمانی قوت پیدا کر کے ہی نظام میں تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے' صرف موروثی عقیدے سے جو اقدار میں سرایت کئے ہوئے نہیں ہے کام نہیں چلے گا۔

بعد از خطاب امیر محترم نے پینل میں شامل اہل علم و دانش کے سوالات کے جوابات دیئے۔ جس سے موضوع کے مزید گوشے نکھر کر سامنے آئے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی نامناسب نہ ہو گا کہ نماز عشاء خطاب کے اختتام پر آڈیٹوریم کے کمپاؤنڈ میں با جماعت ادا کی جاتی تھی۔ اسی طرح رفقاء ظہر' عصر اور مغرب کی نمازیں بھی وہیں با جماعت ادا کرتے تھے۔ البتہ فجر کی نماز اپنی اپنی قیام گاہوں میں با جماعت ادا کرنے کا اہتمام ہوتا تھا اور امیر محترم

کی ہدایت پر بعد نماز فجر مختصر سا درس قرآن یا کوئی وعظ دیا جاتا۔ یہاں یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ ناشتہ بھی قیام گاہوں پر ہی کرایا جاتا تھا البتہ ظہرانہ اور عشائیہ کا اہتمام آڈیٹوریم کے عقب میں طعام گاہ میں تھا اور تربیت گاہ کے آخری روز تک یہی نظم قائم رہا۔

۱۸ دسمبر...... رفقاء نے نماز فجر اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر تربیت گاہ کا قصد کیا۔ کیونکہ نظام العمل کے مطابق پہلی نشست کا آغاز صبح ۹ بجے ہونا تھا۔ صبح کی نشست کے اوقات ۹ تا ۱ بجے دوپہر تھے۔ درمیان میں آدھ گھنٹے کا وقفہ چائے و حوائج ضروریہ کے لئے رکھا گیا تھا۔ وقفہ میں رفقاء کو طعام گاہ میں چائے باقاعدگی سے پیش کی جاتی تھی۔

حسب پروگرام پہلی نشست کی ابتداء وقت مقررہ پر جناب سراج الحق سید صاحب امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی کے افتتاحی کلمات سے ہوئی جس میں انہوں نے رفقاء کو خوش آمدید کہتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسی کی توفیق سے ہم تربیت گاہ منعقد کرنے کے قابل ہوئے۔ انہوں نے رفقاء کی توجہ پابندیٔ وقت کی طرف دلائی اور خطابات کو غور سے سننے اور مذاکرات میں بھرپور حصہ لینے کی ضرورت پر زور دیا۔ بعدازیں امیر محترم نے خطاب فرمایا۔ انہوں نے مختلف تنظیمی امور پر روشنی ڈالی اور تربیت و محاضرات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ وقفے کے بعد اقامت دین کی جدوجہد پر تین سوالات کے عنوان سے ایک مذاکرہ کا آغاز ہوا۔ پروجیکٹر کی مدد سے اس پروگرام کو جناب سراج الحق سید صاحب نے کنڈکٹ کیا اور سوالات کی توضیح و تشریح اور جوابات کے لئے مختلف رفقاء کو موقع دیا گیا۔ ان سوالات کے ذریعے اجتماعیت، تنظیم اور بیعت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا تھا۔ تربیتی پروگرام کی دوسری نشست بعد نماز عصر شروع ہوئی جس میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے فرائض دینی کے جامع تصور پر بڑی جامعیت سے روشنی ڈالی۔ اس سلسلے میں فرائض دینی کے تصور کو ایک سہ منزلہ عمارت کے ماڈل کی شکل میں پروجیکٹر سے دکھایا گیا جس سے پورا تصور سمجھنے میں بڑی آسانی رہی۔

شام کو محاضرات قرآنی کی دوسری نشست تھی۔ موضوع تھا "اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام۔" امیر محترم نے اپنے فاضلانہ خطاب میں فرمایا تصوف و احسان کا اصل موضوع انسان کا اللہ کے ساتھ محبت کرنا ہے۔ دین بندے اور خدا کے مابین ایک عہد کا نام ہے۔ جو شخص چھوٹے چھوٹے عہد پورے نہیں کرتا وہ بڑا عہد ایفا نہیں کر سکتا۔ تصوف قرآن و سنت کی اصطلاح نہیں، قرآن نے اس کے لئے احسان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء کرام تھے۔ انہوں نے متعدد احادیث کے حوالے سے اخلاق کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ بہتر شخص وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔ خیر اور شر کا شعور انسان کے نفس میں ودیعت کر دیا گیا ہے جس کے لئے معروف اور منکر کی اصطلاحات

متعدد احادیث کے حوالے سے اخلاق کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ بہتر شخص وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔ خیر اور شر کا شعور انسان کے نفس میں ودیعت کر دیا گیا ہے جس کے لئے معروف اور منکر کی اصطلاحات
استعمال کی گئی ہیں اور یہ پوری ہی نوع انسان کا اثاثہ ہیں۔ بنیادی اخلاقیات کے لئے انسان تعلیم و تلقین کا محتاج نہیں ہے یہ اُسے اللہ نے ودیعت کر رکھا ہے۔ دنیا میں کئی اخلاقی نظام موجود ہیں لیکن وہ صرف جزوی طور پر ہی درست ہیں۔ اخلاق کے اس بگاڑ کا حل یہی ہے کہ ایمان کی گہرائی اور گیرائی کے لئے

کوشش کی جائے اس کا نام معرفت ہے اور ایمان کی آبیاری کے لئے سب سے مستحکم ذریعہ نماز ہے۔
انہوں نے اپنے طویل خطاب میں روحانی نظام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کے دور کی یہ بڑی محرومی
ہے کہ یہ موضوع بہت بدنام ہو چکا ہے اور لفظ تصوف تو بعض حلقوں میں ایک گالی بن کر رہ گیا ہے۔
جس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ کئی غیر اسلامی تصورات بدقسمتی سے تصوف کا جزو بن گئے ہیں۔ اس
وقت مادہ پرستانہ طرز فکر نے پوری کرہ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اسی لئے روح کے جداگانہ تشخص
کا انکار کیا جاتا ہے اور جان اور روح کو ایک ہی شے تسلیم کیا جاتا ہے۔ جبکہ انسان کا وجود مرکب ہے جسم
جان اور روح سے۔ خاک سے جسم بنا ہے جس میں ایک روح ہے جس کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی
ہے۔ جب روح کا غلبہ ہو تو دنیا کی حیثیت مومن کے لئے ایک قید خانہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ حیوانی
وجود اگر روحانی وجود پر غالب آ جائے تو گویا روح دفن ہو کر رہ جاتی ہے اور جسم روح کے لئے چلتا پھرتا
مقبرہ بن جاتا ہے۔ انہوں نے تزکیۂ نفس کے لئے روزہ اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت کو اجاگر کیا اور
تقرب الی اللہ کے لئے فرائض کے التزام کے ساتھ نوافل میں اعتدال و توازن کو ضروری قرار دیا۔
انہوں نے اللہ کے ساتھ محبت کی تشریح کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ عشق کا لفظ قرآن و سنت میں کہیں
استعمال نہیں ہوا اور اطاعت و محبت کے اعتبار سے اللہ و رسول یکجا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حب مال حب
دنیا کی علامت ہے۔ بعد از خطاب امیر محترم نے علماء اور دانشوروں پر مشتمل پینل کے سوالات کے
جوابات دیئے اور وضاحتیں فرمائیں۔ شہر بھر کے یاران نکتہ داں نے بھرپور شرکت کی۔ حسب سابق
نشست کے اختتام پر عشاء کی نماز ادا کی گئی۔

میں اپنے عزیز / دوست کے نام ایک سال / دو سال کے لیے

ماہنامہ میثاق جاری کرانا چاہتا ہوں۔ ازراہِ کرم درج ذیل پتے پر ایک سال / دو سال کے لیے میثاق جاری کر دیجئے۔ زرتعاون پچاس روپے ایک صد روپے بذریعہ منی آرڈر بنک ڈرافٹ ارسال خدمت ہے۔

نام ---------------

پتہ ---------------

نوٹ: جو حضرات زرتعاون چیک کی صورت میں بھیجنا چاہیں وہ ازراہِ کرم ایک سال کے لیے ۶۰/- روپے اور دو سال کے لیے ۱۱۰/- روپے کا چیک بھیجیں۔ اس لیے کہ ۱۰/- روپے بنک چارجز کے طور پر منہا کر لیے جاتے ہیں۔

* تحفہ کے لیے تفصیلات سامنے کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

تحفہ کارڈ

میں اپنے عزیز / دوست کے نام ایک سال / دو سال کے لیے

ماہنامہ میثاق جاری کرانا چاہتا ہوں۔ ازراہِ کرم درج ذیل پتے پر ایک سال / دو سال کے لیے میثاق جاری کر دیجئے۔ زرتعاون پچاس روپے ایک صد روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ ارسال خدمت ہے۔

نام ---------------

پتہ ---------------

نوٹ: جو حضرات زرتعاون چیک کی صورت میں بھیجنا چاہیں وہ ازراہِ کرم ایک سال کے لیے ۶۰/- روپے اور دو سال کے لیے ۱۱۰/- روپے کا چیک بھیجیں۔ اس لیے کہ ۱۰/- روپے بنک چارجز کے طور پر منہا کر لیے جاتے ہیں۔

* تحفہ کے لیے تفصیلات سامنے کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

کسی ادارے میں مساوی اختیار والے دو سربراہ نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اگر مصنوعی طور پر مساوات مرد و زن کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو خاندانی نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ میاں بیوی کا رشتہ باہمی اعتماد پر قائم رہتا ہے۔ مرد کی حاکمیت کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عورت کے

جوابی کاروباری سروس - پرمٹ نمبر ۱۳۱۹

اندرون پاکستان
ٹکٹ لگانے کی
ضرورت نہیں

منجانب
پتہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن
لاهور- ۵۴۷۰۲
پاکستان

جوابی کاروباری سروس - پرمٹ نمبر ۱۳۱۹

اندرون پاکستان
ٹکٹ لگانے کی
ضرورت نہیں

منجانب
پتہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن
لاهور- ۵۴۷۰۲
پاکستان

ذریعے آپ اپنے یا احباب میں سے کسی ایک یا دو حضرات کے نام ماہنامہ میثاق
جاری کرا سکتے ہیں ۔ اندرون پاکستان کوپن پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں ۔
نوٹ : آپ ٹیلی فون انڈکس یا کور میں سے جو پسند فرمائیں کارڈ پر درج فرمادیں۔

۱۹ ار دسمبر...... آج تربیت گاہ کی پہلی نشست کے پروگرام میں امیر محترم کی ہدایت پر تبدیلی کی گئی اور اسے حالات حاضرہ سے متعلق رفقاء کے نقطۂ نظر کے لئے مختص کر دیا گیا۔ جس میں مقررین نے کھل کر اپنا مؤقف پیش کیا۔ ہدفِ تنقید زیادہ تر سیاسی موضوعات خصوصاً جماعت اسلامی کے بارے میں "ندا" اور "میثاق" کے مضامین رہے۔ "ندا" کے بیالیسویں شمارے کے سرورق پر شائع شدہ تصویر پر بھی گرفت کی گئی۔ اس کے برعکس دو افراد نے "ندا" کی پالیسی سے اتفاق کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس نرم گرم نشست میں "ندا" سے متعلق اٹھائے گئے اہم نکات اور اعتراضات کے جواب میں وضاحتیں دوسری نشست میں مدیر "ندا" جناب اقتدار احمد صاحب نے خود پیش کیں۔ بعد ازیں امیر محترم نے بڑے مؤثر اور دلنشیں پیرایہ میں اشکالات رفع کیے۔ انہوں نے اصلاحی و تبلیغی اور احیائی و انقلابی کاموں میں فرق و تمیز کے حوالے سے نظری سیاست کی اہمیت کو واضح کیا۔ بعد نماز عصر حلقۂ تنظیم کی جانی پہچانی شخصیت مولانا اخلاق حسین قاسمی (دھلوی) مدظلہ نے خطاب فرمایا اور رفقاء کے طمانیت قلبی کا سامان مہیا کیا۔ انہون نے رفقاء کے حوصلے بلند کرتے ہوئے توجّہ دلائی کہ قلت و کثرتِ تعداد کامیابی و ناکامی کا پیمانہ نہیں ہے۔ اصل شے درست فکر و عمل ہے۔

شام کو محاضرات قرآنی کی تیسری نشست میں امیر محترم نے اسلام کے سماجی و معاشرتی نظام پر ایک فکر انگیز خطاب فرمایا۔ انہوں نے فرمایا کہ اجتماعی نظام کی اساس اجتماعی فکر ہوتی ہے۔ انسانوں پر ظلم تین جہتوں سے ہوتا آیا ہے جو سماجی سطح پر اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تقسیم کے ذریعے' معاشی میدان میں استحصال اور سیاسی سطح پر تمیزِ بندہ و آقا اور لوگوں کی آزادی سلب کر کے اپنا اظہار کرتا ہے۔ انہوں نے مختلف سماجی و معاشرتی نظریات کا تجزیہ پیش کیا کہ ان سب میں ظلم کا عنصر شامل ہے۔ اشتراکی اور سرمایہ داری نظام اپنے مخصوص نمائشی نعروں (CATCH WORDS) کے ذریعے حریّت و مساوات میں تقدیم و تاخیر کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کا مرکزی تصور عدل و قسط ہے۔ غیر مسلم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار حریت و مساوات و اخوت کی بنیاد پر ایک اجتماعی نظام عدل بالفعل قائم کر کے دکھا دیا تھا۔

انہوں نے کہا کہ عائلی و معاشرتی مسائل اتنے ہی قدیم ہیں جتنا خود انسان ہے اور سب سے وسیع ظلم معاشرتی سطح پر ہی ہوتا آیا ہے۔ جبکہ اسلام سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات کا درس دیتا ہے۔ جنس کی بنیاد پر شرف انسانیت میں کوئی فرق و تفاوت نہیں۔ پیدائشی طور پر نہ کوئی اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ۔ انسانی ہمدردی کا دائرہ غیر مسلموں تک وسیع ہونا چاہئے لیکن ان سے قلبی تعلق رکھنا قرآن و سنت کے منافی ہے۔ انہوں نے خدمتِ خلق کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سب سے بڑی خدمت خلق انسانیت کو جہنم کی آگ سے بچانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ معاشرتی زندگی کا نقطۂ آغاز رشتۂ ازدواج ہے۔ کسی ادارے میں مساوی اختیار والے دو سربراہ نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اگر مصنوعی طور پر مساوات مرد و زن کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو خاندانی نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ میاں بیوی کا رشتہ باہمی اعتماد پر قائم رہتا ہے۔ مرد کی حاکمیت کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عورت کے

لئے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا جس قدر آج مشکل ہے اتنا ہی پہلے بھی تھا۔ اسی لئے عائلی احکامات بھی تدریجاً نازل ہوئے۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں اور انہیں حاکمیت حاصل ہے۔ قرآن نے عائلی معاملات پر مفصل احکامات دیئے ہیں اور اس میں مکمل عائلی نظام موجود ہے۔ عورت کا بنیادی دائرہ کار اس کا گھر ہے' اس کی گود بہترین درس گاہ ہے۔ وراثت' شہادت اور طلاق و خلع کے معاملات کے حوالے سے انہوں نے فرمایا کہ قرآن عورت کو قانونی حیثیت دیتا ہے۔ اسلام نے عورت کو اخلاقی سطح پر بڑی فوقیت دی ہے اور ماں کے قدموں تلے جنت بتائی گئی ہے۔ والدین کو محبت بھری نگاہ سے دیکھنا بھی موجب اجر و ثواب قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے اختلاط مرد و زن کو خطرناک قرار دیتے ہوئے ستر و حجاب کی حکمت کو واضح کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر معیشت کے لئے ناگزیر ہی ہو جائے تو خواتین کے لئے ملازمت کے علیحدہ مواقع فراہم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ انہیں گھر پر ہی کام فراہم کیا جائے۔ انہوں نے خواتین کے لئے اوقات کار چار گھنٹے رکھنے کی تجویز پیش کی۔

بعد از خطاب معمول کے مطابق سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس خطاب میں بھی سامعین بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

۲۰ دسمبر..... نظام العمل کے مطابق آج صبح کی نشست میں مذاکرہ کا پروگرام تھا۔ موضوع تھا اقامت دین کا طریقۂ کار۔ کمپئرنگ کے فرائض جناب سراج الحق سید صاحب نے ادا کئے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سوالات کے ذریعے منہج انقلاب نبویؐ کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرایا اور ان کی توضیح و تشریح کی گئی۔ سوالات کو نمایاں کرنے کے لئے پروجیکٹر کا سہارا لیا گیا تھا۔ مذاکرہ وقفے کے بعد بھی جاری رہا۔ رفقاء نے بھرپور حصہ لیا اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں سوالات کے جواب دیئے۔
بعد نماز عصر ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب (کراچی) نے تزکیۂ نفس کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ انہوں نے تزکیۂ نفس کے اصول و مبادی بیان کئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف تنظیم اسلامی کے سابقہ رفیق ہیں۔
آج محاضرات کا موضوع تھا "اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام"۔ امیر محترم نے اپنے خطاب میں اسلام کے اصولِ سیاست و حکمرانی کو بڑی حسن و خوبی سے واضح کیا۔ اور اس بارے میں کئی ابہام دور کئے۔ انہوں نے اپنے طویل خطاب میں فرمایا کہ اسلامی ریاست قومی نہیں بلکہ نظریاتی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمدن کے ارتقائی عمل کی وجہ سے اسلام نے حکومت کی تشکیل کے بارے میں تفصیلی احکامات نہیں دیئے بلکہ صرف اصول عطا کئے ہیں۔ وفاقی' وحدانی اور صدارتی یا پارلیمانی طرز ریاست و حکومت میں سے کوئی بھی اسلام کے منافی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اسلام ہے۔ تمام مسلمان بلالحاظ رنگ' نسل' زبان اور علاقہ اسلامی ریاست کے شہری ہو سکتے ہیں۔ پچھلی صدی تک ملتِ واحدہ کا تصور پوری طرح رائج تھا۔ ایک مسلمان کسی بھی مسلم علاقہ میں سکونت اختیار کر سکتا تھا' اس کے لئے پاسپورٹ کی ضرورت نہیں تھی' لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی استعمار نے اس وحدت کو پاش پاش کر دیا اور مسلمانوں میں تقسیم در تقسیم کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ انہوں نے پاکستان کے حالات کے پس منظر میں کہا کہ اگر چار قومیتیں ہو سکتی ہیں تو پانچویں کو بھی اپنا وجود تسلیم کرانے کا حق ہے

ور اس کے بعد چھٹی اور ساتویں توجیتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، لیکن تقسیم در تقسیم کا یہ عمل وحدت ملت پر
کاری ضرب ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی ریاست میں حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کو حاصل ہے کسی اور
کے لئے ایسا تسلیم کرنا کفر ہے۔ نظام خواہ کوئی ہو اگر شرعی حدود میں رہ کر اختیارات استعمال کئے جائیں تو
وہ اسلامی حکومت کہلا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عوامی خلافت کا کامل نمونہ خلافت راشدہ تھی اور
اب اس کا بعینہ نقشہ قیامت تک قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ نبوت کا تتمہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس
وقت ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر سیکولر ہے۔ انہوں نے کہا اسلامی ریاست انقلاب کے نتیجہ میں ہی
معرض وجود میں آ سکتی ہے۔ اسلامی ریاست کے خدوخال کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے
فرمایا کہ اسلامی ریاست میں کوئی فرد قانون سے بالاتر نہیں اور حکمران کو کسی مجرم کی سزا معاف کرنے کا
اختیار نہیں۔ صرف مسلمان ہی اسلامی ریاست کا مکمل شہری ہو سکتا ہے البتہ غیر مسلموں کے حقوق
اور ان کی جان، مال اور آبرو کا تحفظ کیا جائے گا۔ انہیں آزادئ عقیدہ و عبادت ہوگی وہ اپنی نسل میں
اپنے عقیدہ کا پرچار کر سکتے ہیں مگر اسلامی ریاست میں کسی دوسرے مذہب کی عام تبلیغ نہیں ہو سکتی۔
انہوں نے ووٹر کے لئے عمر کی شرط چالیس سال تجویز کی جو کہ ذہنی پختگی کی عمر ہے۔ انہوں نے کہا کہ
ووٹ کے معاملہ میں فاسق و فاجر کی کوئی قید نہیں۔ قانونی اعتبار سے فاسق و فاجر اور مومن و متقی دونوں
برابر ہیں شہریت کی بنیاد اسلام ہے۔ خواتین بھی رائے دہی میں شامل ہو سکتی ہیں لیکن امور مملکت میں
حصہ نہیں لے سکتیں۔ اسلامی ریاست میں امور مملکت صرف مردوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ انہوں
نے علماء کو توجہ دلائی کہ اس وقت ان کا اہم ترین کام جذبۂ ایمان کی بیداری اور فہم دین کی اشاعت و
ترویج ہے تاکہ کوئی اسلام کے نام پر مسلمانوں کو دھوکہ نہ دے سکے۔

خطاب کے بعد حسب معمول سوال و جواب کی نشست رہی آج کے خطاب میں حاضری مزید بڑھ
گئی تھی اور اسٹیج پر دریاں بچھانی پڑیں۔ خطاب کے اختتام پر کراچی میں منعقد ہونے والی ایک مخلوط دوڑ
کے خلاف ایک قرارداد مذمت بھی پاس کی گئی جس کا متن شامل اشاعت ہے۔ ۲۱ دسمبر، آج تربیت گاہ
کے ساتھ محاضرات کا بھی آخری دن تھا۔ پہلی نشست کی ابتداء میں امیر محترم نے رفقاء سے مختصر خطاب
فرمایا۔ انہوں نے چند نووارد رفقاء کا تعارف پیش کیا اور ترک رفاقت کر جانے والوں کا بھی افسوس کے
ساتھ ذکر کیا۔ اور باقی وقت اسلام آباد کے مولانا فیض الرحمٰن صاحب کے لئے مختص فرمایا۔ مولانا
صاحب موصوف تنظیم کے نئے رفقاء میں سے ہیں۔ درس نظامی کے ساتھ گریجویٹ بھی ہیں اور اب
ایل ایل بی کا امتحان دے کر لاء گریجوایٹس میں شامل ہونے والے ہیں۔ ان دنوں اُن کے امتحانات بھی
ہو رہے تھے۔ اُن کی تقریر بڑی جاندار اور پرجوش تھی۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز بیان سے رفقاء
میں نہ صرف حرارت پیدا کی بلکہ مسکراہٹیں بھی تقسیم کیں۔ انہوں نے اقامتِ دین کی جدوجہد کو پشتو کی
ایک کہاوت سے واضح کیا کہ باپ کی زمین پر دشمنوں کا قبضہ ہو تو بیٹا صرف ابا جان، ابا جان کی گردان
کر کے (ایک انچ بھی) زمین واگزار نہیں کرا سکتا۔ انہوں نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا کہ اللہ کی زمین
پر طاغوت کا قبضہ ہو اور اللہ کے ماننے والے صرف اللہ ہو کی رٹ لگاتے رہیں تو دین قائم و نافذ نہیں ہو
سکتا اس کے لئے باطل قوتوں سے ٹکراؤ لازمی ہے۔

چائے کے وقفے کے بعد امیر محترم نے رفقاء کے سوالات کے جوابات دیئے اور کئی اشکالات رفع کیے۔ ایک لحاظ سے یہ تربیت گاہ کا آخری مرحلہ تھا جس کے بعد دعا مانگی گئی۔ لیکن امیر محترم کی خواہش کے مطابق بعد نماز عصر ایک مزید خطاب سندھ کی صورت حال پر بھی رکھا گیا۔ مقرر تھے سندھ کے معروف دانشور پروفیسر اسد اللہ بھٹو صاحب' اُن کا تعلق سکھر سے ہے۔ انہوں نے اندرون سندھ لادینیت و دہریت کا علمی سطح پر مقابلہ کے لئے ادارہ فکرو نظر قائم کیا ہے۔ وہ سندھ کی اسلامی تاریخ کے حوالے سے اسلامی فکر کو پھیلانے کا کام سرانجام دے رہے ہیں انہوں نے بڑی جذباتی تقریر کی۔ انہوں نے باب الاسلام سندھ کی اسلام سے وابستگی کی تاریخ کے حوالے سے موجودہ انتخابی نتائج کو بھی سندھیوں کے اسلام سے لگاؤ کا مظہر قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ سندھ کے عوام نے ایک طرف لادین عناصر کو شکست دی تو دوسری طرف اسلام کے بارے میں منافقانہ کردار ادا کرنے والوں کو بھی رد کر دیا۔ انہوں نے قدیم سندھی علماء کے سیرت و کردار پر مبنی لٹریچر کو بڑے پیمانے پر شائع کرنے اور پھیلانے کی ضرورت پر زور دیا۔ شام کو بعد نماز مغرب امیر محترم نے محاضرات قرآنی کے آخری موضوع "اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام" پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ خطاب کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام کا معاشی نظام پیچیدہ اور مشکل ہونے کے ساتھ کسی قدر اختلافی ہے۔ معاشی و اقتصادی امور ملکی معاملات میں بڑے مؤثر اور فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے آج کے دور میں انسان کو معاشی حیوان کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کے بعض اہم پہلو ملوکیّت کی وجہ سے تاریکی کے پردہ میں چلے گئے لیکن اب وہ دوبارہ نمودار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے دو بڑے نظام ہائے معیشت کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں آزادی ہے لیکن مساوات نہیں اور اشتراکی نظام میں مساوات ہے لیکن آزادی نہیں' لیکن دونوں کی قدر مشترک اور ان کی فکری و نظری اساس مادہ پرستی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی نظام معیشت کے دو پہلو ہیں ایک ایمانی و روحانی اور دوسرا قانونی و انتظامی اور دونوں میں بظاہر تضاد بھی معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ اسلام میں ملکیّت حقیقی صرف اللہ کی ہے اور انفرادی ملکیت کا تصور مجازی ہے۔ دراصل تمام دنیوی نعمتیں انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں انسان کو دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ اس کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے اور اسے اس پر صرف ضرورت کی حد تک حق تصرف حاصل ہے' جو بچ جائے وہ بطور امانت دوسروں کا حق ہے۔ انہوں نے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس کبھی مال جمع نہیں کیا کہ مال کا جمع رکھنا توکل علی اللہ کے اعلیٰ معیار کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام میں روحانی اور قانونی دونوں تعلیمات ہیں دنیا کا نظام روحانیت پر نہیں' قانون پر چلتا ہے' لیکن معاشرہ میں قانونی نظام کے مکمل نفاذ کے باوجود مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ روحانی نظام بھی ساتھ ساتھ نہ چلے گو وہ معاشرہ کی ایک اقلیت تک ہی محدود ہو اسلام سرمایہ کو پابند کرتا ہے اور سب سے زیادہ تحفظ محنت کو عطا کرتا ہے۔ انہوں نے قرآن و حدیث کے حوالے سے سود کی حرمت و شناعت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ معاشرہ سود میں اسطرح تیر رہا ہے جس طرح مچھلیاں پانی میں۔ اسلام میں اپنی ضروت سے زائد مال کے مصارف انفاق فی سبیل اللہ' قرض حسنہ اور مضاربت ہیں اسلام اسراف و تبذیر' منشیات اور جنسی نمائش کے ذریعے کاروبار کی ممانعت کرتا ہے۔

زراعت ممنوع اور ارتکاز دولت خلاف اسلام ہے۔ احتکار سٹہ اور آڑھت کی اسلامی معیشت میں کوئی گنجائش نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جزوی طور قومیانے کی پالیسی خلاف اسلام نہیں۔ موجودہ زوال پذیر معیشت کا حل پیش کرتے ہوئے انہوں نے توجہ دلائی کہ پاکستان کی زمین خراجی ہے عشری نہیں۔

خطاب کے اختتام پر معمول کے مطابق دانشوروں اور ماہرین کے پینل نے سوالات کئے اور توضیحات بھی پیش کیں جس سے اسلام کے نظام معیشت کی حقانیت مزید نکھر کر سامنے آ گئی۔ اس خطاب کے ساتھ ہی محاضرات قرآنی کا پروگرام بھی اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔

۲۲ر دسمبر ۱۹۸۸ء......... تربیتی پروگرام سے ہٹ کر' آج کے دن کے لئے بیرون شہر سے آئے ہوئے رفقاء کے لئے ایک اجتماعی تربیتی پروگرام بھی ترتیب دیا گیا' جو مختلف اہم اور دلچسپ مقامات کی سیر اور دورہ پر مشتمل تھی۔ اس کا دورانیہ چار گھنٹے تھا۔ متمنی رفقاء کے لئے بس کی سہولت بھی فراہم کی گئی تھی۔ سیر کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ حالات کا مطالعہ بھی ہے۔ امید ہے کہ ہمارے رفقاء نے یہ دونوں مقاصد حاصل کئے ہوں گے۔ اس طرح اللہ کے فضل و کرم سے تربیتی پروگرام مکمل ہوا اور رفقاء عازم سفر ہو گئے۔

مخلوط دوڑ...... مغرب کی بھونڈی نقالی

"انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام ریکس آڈیٹوریم میں منعقد ہونے والا محاضراتِ قرآنی کا یہ اجتماع جمعہ ۲۳ر دسمبر کی صبح مجوزہ مخلوط دوڑ پر تشویش کا اظہار کرتا اور اس کی پرزور مذمت کرتا ہے جسے ایک اشتہاری پوسٹر کے مطابق نیشنل گارڈ روڈ ریس ۱۹۸۸ء کا نام دیا گیا ہے اور جو مزارِ قائد اعظم سے شروع ہو کر اسی مقام پر ختم ہو گی۔ اس نام نہاد قومی دوڑ میں مردوں کے ساتھ جہاں قوم کی وہ بیٹیاں شریک ہوں گی جو مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کی آرزو رکھتی ہیں' وہاں ایسی بچیاں بھی شوقِ مہم جوئی کا شکار ہو جائیں گی جنہیں اس منکر کا شعور نہیں اور دین کی حدود و قیود کا پورا فہم بھی نہیں۔

کراچی شہر کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ طبقات کی نمائندگی کرنے والا یہ بڑا اجتماع اس پروگرام کی شدید مذمت کرتا اور اس کے ذمہ داروں کو متنبہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ کھل کھیلنے سے باز آ جائیں۔ ملک خداداد پاکستان کے مسلمانوں نے بالعموم اور دین و ملت کے بہی خواہوں نے بالخصوص اسلام کے مسلمہ اصولوں کے علی الرغم ملک میں سیاسی اور جمہوری عمل کے احیاء کے ضمن میں ایک خاتون کو اگر سربراہ حکومت کے طور پر گوارا کر لیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی غیرت و حمیت دینی کو مزید للکار کے ردعمل کے جارحانہ اظہار پر مجبور کیا جائے جو کراچی کی مخدوش فضا میں تلخی اور کشیدگی کے اضافے کا باعث ہو گا۔ اب بھی وقت ہے کہ مغرب زدہ اور اباحیت پسند حلقے اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت رکھنے والے اس ملک میں جو ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی پس منظر رکھتا ہے' مغربیت کی بھونڈی نقالی اور لادینیت کی یلغار برداشت نہ کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی اہل دین پر بھی لازم ہے کہ آبادی میں دین کا علم و شعور عام کریں تاکہ منکرات کو فروغ نہ ہو۔

یہ اجتماع عوام کے جذبات کی نمائندگی کا دعویٰ رکھنے والی سندھ کی صوبائی حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ صورت حال کی نزاکت محسوس کرے اور ملکِ عزیز میں اسلامی قدروں پر بلاواسطہ یا بالواسطہ وار کرنے والوں کے ہاتھ روکے۔ مجوزہ دوڑ کے منتظمین کو اگر خوب و زشت کا امتیاز نہیں تو حکومت کا فرض ہے کہ انہیں اس مخلوط دوڑ کے اہتمام سے باز رکھے اور اسے صرف لڑکوں اور مردوں کے لئے مخصوص کیا جائے۔"

ایک مسنون دُعا
اَللّٰھُمَّ طَہِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ
وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّيَاءِ وَاَلْسِنَتَنَا مِنَ الْكَذِبِ
وَاَعْيُنَنَا مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ
الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ۔
ترجمہ
اے اللہ ہمارے دِلوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ہمارے اعمال کو
ریا سے اور ہماری زبانوں کو جھوٹ سے اور ہماری آنکھوں کو خیانت سے
تجھ پر روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔
* * *
عطیہ اشتہار
میاں عبدُ الواحِدُ
نجگران سٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور

جائزہ جات

ریاض (سعودی عرب) سے محترم اختر ہاشمی کا مفصل مکتوب

مکتوب نگار خانوادۂ حضرت شیخ الہندؒ سے تعلق رکھتے ہیں اور جیسا کہ انہوں نے خود تحریر فرمایا ہے، اپنی عمر عزیز کے ساٹھ برس پورے کر چکے ہیں۔ عمر کا بیشتر حصہ اکابر علماء کی صحبت میں گزرا اور برصغیر کی اہم دینی احیائی تحریکوں کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ زیر نظر مکتوب کے جملہ مندرجات سے گو ادارے کو اتفاق نہیں لیکن مکتوب نگار کے علمی مقام کے پیش نظر اس خط کو من و عن شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

محترم المقام ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

اولاً اپنا تعارف

دہلی کا رہنے والا ہوں۔ ولادت ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ ننھیال ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خاندان سے متعلق ہے۔ والد صاحب حضرت شیخ الہندؒ سے نسبت رکھتے تھے۔ خلافت کے زمانہ سے پریکٹس چھوڑ کر تجارت اور انکم ٹیکس کے مقدمات کی پیروی تک محدود رہ گئے تھے۔ نہایت دین دار اور متقی بزرگ تھے۔ حج سے فراغت کے ایک سال بعد ۱۹۴۵ء میں وفات پا گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ سے تعلق بڑھا لیکن بیعت نہ ہوئے اور آخر میں مولوی محمد الیاس صاحبؒ بانیٔ جماعت تبلیغ سے عشق کی حد تک تعلق تھا...... ہم تین بڑے بھائی حافظ ہوئے اور عربی، فارسی کے عالم بھی۔ ساتھ ہی ضرورتِ وقت کے پیش نظر انگریزی تعلیم سے بھی بے بہرہ نہ رہے۔ یہ شاید اس کا اثر تھا کہ سابق وزیر و وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشیؒ کے تعلیمی دور میں دہلی میں میرے والد صاحب ہی ان کے سرپرست و نگران تھے...... میں نے دورۂ حدیث حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور شیخ الاسلام مولوی سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے زیر سایہ مکمل کیا، تفسیر میں مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ میرے استاد تھے۔ درس نظامی میں ان حضرات کے علاوہ مولوی

اشفاق حسین صاحب کاندھلویؒ اور مولوی شریف اللہ صاحب (یہ دونوں حضرات مولوی ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ اور مولوی اخلاق حسین صاحب قاسمی کے بھی استاد تھے) بھی شامل تھے...... قاسمی صاحب مجھ سے نسبتاً سینئر تھے وہ میرے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ کے ہیں...... میں نے حفظ قرآن کے بعد تجوید اور پھر سبعہ قرأت وغیرہ کی بھی تکمیل کی...... میری علمی، دینی اور ذہنی تربیت مولوی محمد کفایت اللہ صاحب اور مولوی قاری محمد طیب صاحب (بعد میں یہ دونوں حضرات رشتہ میں میرے سمدھی بھی بنے) مولوی سید حسین احمد صاحب مدنیؒ جو میرے شیخ اور مشفق استاد بھی تھے۔ مولوی محمد الیاس صاحبؒ، مولوی ابوالکلام آزاد صاحبؒ، مولوی احمد سعید صاحب، مولوی حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ اور قطبِ وقت حضرت مولوی عبدالقادر صاحبؒ رائپوری جیسے اکابر کی نگرانی میں ہوئی حاشا یہ خودستائی نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ ان سب کی ہی خصوصی صحبتیں، شفقتیں اور قربتیں مجھے نصیب رہیں فللّٰہ الحمد علیٰ ذلک!

سیاسی رجحان کانگریس ہی کی طرف تھا لیکن امام الہندؒ کی خدمت میں مسلسل حاضری سیاسی سے کہیں زیادہ جاں نثارانہ تھی جو ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء تک ان کے آخری غسل تکفین و تدفین تک جاری رہی......!

۱۹۴۷ء کی قیامت اور ہنگامۂ دار و گیر میں جب گھربار وغیرہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سبزی منڈی دہلی سے بلیماران دہلی منتقل ہوا۔ جائیدادیں مٹی اور اثاثے خاک ہو چکے تھے فکر معاش کے پیش نظر جب شکستہ سامانی سے بھری پُری دنیا میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ علم کی جو جنس میرے پاس ہے۔ اس کا کوئی خریدار ہی نہیں مجبوراً دنیاوی تعلیم کے حصول کی طرف توجہ کی اور حالات نے علی گڑھ کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا پھر جو دور گزرا سراسر دنیاوی اور مادی کہ معمّوں اور فلموں تک کی کمائی سے عار نہ رہا۔ (خدا کا شکر ہے شمع میگزین اور فلم ڈسٹری بیوشن سے تعلق ختم ہونے کے بعد سے اب تک تجارت ہی پیشہ ہے...... سعودی عرب میں دو سال ایک امریکی کمپیوٹر کمپنی کی ملازمت کے بعد سے اب پھر یہاں بھی محوِ تجارت ہوں) اگرچہ حضرات اکابر ایک ایک کر کے دنیا سے منہ موڑتے چلے گئے۔ پھر بھی جو دینی مزاج ایک مرتبہ ان حضرات اکابر کے صدقہ میں دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا تھا وہ کلیتہً نہ مٹ سکا۔

ثانیاً طلبِ صادق

کسی حد تک جماعت تبلیغ سے وابستگی برقرار رہی لیکن انُ کے ہاں تنظیم کا فقدان ہی نہ تھا

بلکہ وہ شجرِ ممنوعہ تھی جبکہ اسلام میں تنظیم اساسی حیثیت رکھتی ہے نماز با جماعت جمعہ و عیدین اس کا بدیہی ثبوت ہیں...... جماعت اسلامی جو یقیناً امام الہندؒ کی تحریک حزب اللہ کا ہی ریفلیکشن تھی اس کی چھان پھٹک سے ظاہر ہوا کہ مودودی صاحب نے بھی ابو الکلام کی انانیت کی بھونڈی تقلید کو اپنا شعار بنالیا جب کہ "چہ نسبت خاک را باعالمِ پاک" کے مصداق ابو الکلام میں انانیت نہیں بلکہ ایک پاکیزہ محبوبیت تھی' جو ان کی ذکاوت' فطانت' فکرو تدبر اصابت رائے اور دور بینی کی وجہ سے اتنی اوپری بھی محسوس نہ ہوتی تھی جب کہ مودودی صاحب میں سوائے تحریری صلاحیت کے کچھ بھی نہ تھا کہ ایک فری لانسر رائٹر کی طرح ان کی سب سے پہلی تحریر پردہ کی مخالفت میں تھی جو کسی مصری تحریر سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد پردہ کی حمایت میں ایک کتاب لکھ کر ہندوستان کے مذہبی مسلم حلقوں سے بھی خراج تحسین وصول کر لیا...... مقابلتاً ابو الکلام استقامت و عزیمت کی وہ چٹان تھا کہ ۱۹۴۶ء میں جب صحافیوں نے کلکتہ میں پوچھا کہ پاکستان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے تو نہایت متانت سے کہا:

> "پاکستان مسلمانوں کی اکثریت' کا مطالبہ ہے اس لئے بن جائے گا......
> لیکن اپنے تمام جغرافیائی اور علاقائی عوامل کے باوجود صرف مذہب کی بنیاد پر پاکستان کے یہ دونوں ٹکڑے متحد رہ سکیں گے؟ مجھے اس کا یقین نہیں......!"

یہ تھی...... اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور اللّٰہ والی بصیرت...... "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا" پھر اس پر مستزاد یہ کہ ابو الکلامؒ جیسی ٹھوس علمی و تحقیقی صلاحیت اور بھرپور مطالعہ سے محروم ہوتے ہوئے بھی تفہیم القرآن کی وجہ تالیف میں یہ تعلّی کہ قرآن جو عربی مبین میں تھا اس کی توضیح کے لئے کسی اردوئے مبین ہی کی ضرورت تھی۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

پھر یہ کہ جماعت اسلامی نے علمائے حق کی نظر اندازی کو ہی اپنا مطمح نظر بنالیا' جبکہ ابو الکلامؒ جیسے علمی بحر ذخار نے نہ صرف ان کا دم بھرا بلکہ پورا پورا احترام بھی کیا...... حضرت مدنیؒ کے سامنے وہ کیسے بچھ جاتے تھے یہ آنکھوں دیکھی بات ہے' جب کہ حضرت مدنیؒ اور ان کے رفقاء کی نظر ہمیشہ ابو الکلامؒ کی مدبرانہ' مجتہدانہ اور قائدانہ ہدایات پر رہتی تھی اس پر یہ نیازمندانہ اور

فدویانہ انداز لاریب ابوالکلام" کا ہی ظرف تھا کہ ع "دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر" کا صحیح مصداق تھا۔ ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

جب مسلم عوام سے علی برادران اور پھر مسٹر محمد علی جناح کے مقابلہ میں ان کے جذبۂ محبوبیت کو ٹھیس پہنچی تو مسلم عوام کے ساتھ کسی تحریک کو لے کر بڑھنے سے انہوں نے بے شک کنارہ کشی اختیار کرلی لیکن جذباتی مسلم نوجوانوں کی چیرہ دستیوں کے باوجود وہ مسلمانوں کی سیاسی تعمیرِ نو اور ان کے بہتر مستقبل کی فکر سے آخری سانس تک دست کش نہ ہوئے تھے۔ اس کی روداد تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں ہی کو معلوم ہے۔

مودودی صاحب کی وفات کے بعد ایک ضخیم کتاب "سید مودودی" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں مودودی صاحب کی مدرسہ مسجد فتح پوری دہلی کی تین سندات کا عکس ہے' جس میں سے صرف ایک تاریخ درج ہونے کی وجہ سے مستند کہی جاسکتی ہے اس سے بھی ان کی علم دین کی تکمیل کا اندازہ نہیں ہوتا۔ با ایں ہمہ انہوں نے زبان سے نہیں لیکن عملی طور پر ہمیشہ "ہم چوں من دیگرے نیست" کا ادّعا کیا اور علمائے حق کی طرف رجوع کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا اور صرف اردو میں لکھی ہوئی اسلامی تعلیمات کی کچھ کتابوں کو پڑھ کر ہی لوگوں کو علمائے حق کی ہمسری بلکہ علم میں ان سے بڑھ جانے کا احساس دلایا یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص اردو میں لکھی ہوئی الکیٹر یکل گائیڈ نامی کتاب پڑھ کر ایک کوالیفائیڈ الیکٹریکل انجینئر کی برابری کا دعویٰ کرنے لگے...... اس میں شک نہیں کہ علماء کے باہمی اختلاف نے علم دین کی ناقدری اور علماء سے دوری کے لئے زمین ہموار کی اور علماء سوء نے تو باقاعدہ اس کے سہارے اپنی دکانیں جمائیں' گدیاں سجائیں اور جلب منفعت کے لئے ان اختلافات کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا لیکن خدا کے فضل سے ہر دور میں علمائے حق نے ہمیشہ ہی اخلاص کے ساتھ اظہار حق کو اپنا طغرائے امتیاز بنایا...... یہ کل کی بات ہے کہ مسلم لیگ کے مقتدر رہنما علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے مسٹر لیاقت علی کے مقابلہ میں قاضی محمد احمد کاظمی (خلف الصدق مولوی محمد طفیل احمد صاحب مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل") کی ۱۹۴۶ء کے سنٹرل اسمبلی کے الیکشن میں حمایت کی جو کانگریس کے حمایت یافتہ تھے۔

مدتوں سے میں قرآن فہمی کی بہت سی تحریکات کا ذکر سنتا چلا آیا تھا جس میں مولوی فراہی' مولوی احسن اصلاحی اور سید قطب شہید مصری اور مولوی مودودی کے ناموں کے

ساتھ آپ کا نام بھی سنا تھا لیکن اس سلسلے میں میرا مسلک وہی تھا جو حضرت شیخ الہند ؒ نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ اس بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان خصوصاً شاہ عبدالقادر صاحب ؒ کا مسلک ہی مشعل راہ ہے۔ اسی لئے کبھی آپ کی تحریک کی طرف اتنی بھی توجہ نہ ہوئی جس قدر کہ مودودی صاحب کی طرف ہوئی تھی۔

حرف مطلب

______________ القرآن اکادمی بمبئی و دہلی

جس نے الفی (ہر سطر الف سے شروع ہونے والی) قرآن کریم کی اشاعت کا ایک مثالی کارنامہ انجام دیا ہے اس میں میرے شریک کار بلکہ بانی القرآن اکادمی برادم مکرم نورالدین صاحب آزاد نے آپ سے ۱۹۸۵ء میں ملاقات اور قرآن پاک سے آپ کے والہانہ شغف کا ذکر ریاض سعودی عربیہ میں ۱۹۸۷ء میں آکر مجھ سے کچھ اس انداز سے کیا کہ آپ کی تحریک کے مالہ وماعلیہ کے لئے کھوجنے کی ایک طلب پیدا ہوئی اور ابھی چند ماہ پیشتر دہلی سے واپسی پر آپ کے ریاض کے ایک حلقہ میں شرکت کا موقع ملا۔ سوء اتفاق اس روز مہمان خصوصی جماعت کی طرف سے جدہ سے ایک صرف کثیر پر بلائے ہوئے ایک جواں سال صاحب زادے تھے انہوں نے بیعت سلوک کی اس قدر سختی سے مخالفت کی اور اسے بدعت سیئہ قرار دیا کہ آپ سے اور آپ کی تحریک سے دلچسپی کا جو داعیہ پیدا ہوا تھا وہ بن کھلے ہی مرجھا گیا اس پر مستزاد یہ کہ تقریر میں ایسی غلط باتیں سننے میں آئیں جو کسی عالم سے ہونی ناممکن سی تھیں اور جب تقریر کے بعد میں نے ان کے قریب جاکر توجہ دلائی تو اپنی غلطیوں پر اصرار اور عذر گناہ بدتراز گناہ کے مصداق بے تکی تاویلیں چنانچہ میں نے اپنی جذباتیت میں یہاں تک کہہ دیا کہ آپ عربی سے واقف ہی نہیں اس کے باوصف رفقائے مجلس ان کے جبہ و دستار سے بدستور مرعوب تھے چنانچہ میں نے اس حلقہ کے بعض شناسا حضرات سے آپ کا کچھ لٹریچر حاصل کیا جس میں سے میثاق پہلے بھی دہلی میں مولوی وحیدالدین خاں صاحب کے ہاں نظر سے گزر چکا تھا اور بھی کتابچے تھے۔ ارادہ یہی تھا کہ ایسی جماعت کا جس کے سربر آوردہ اصحاب میں صاحب زادہ موصوف جیسے "واں کس کہ نداند وبداند کہ بداند" برخود غلط افراد ہوں تحریری طور پر تاروپود ضرور بکھیروں گا...... چنانچہ آپ کا لٹریچر بنظر عمیق پڑھنا شروع کیا۔ اس لٹریچر نے یہ ستم ڈھایا کہ میں جو عشاء کے بعد جلد سونے کا عادی ہوں میری راتوں کی نیند اچاٹ کر دی اور تحریک شیخ الہند ؒ نامی ضحنہ ہم کتاب نے تو آنکھیں کھول دیں اور بے ساختہ...... "کرشمہ دامن دل می

نشد کہ جاایں جاست" والی کیفیت پیدا ہو گئی اور سب سے زیادہ دل میں یہ بات اتری کہ آپ نے اپنے منتسبین کو یہ تاکید کی کہ مجھ سے بیعت کرنے والے اگر کسی اہل حق سے پہلے بیعت سلوک کر چکے ہیں تو ان کے بتائے ہوئے اور اد و اذکار کا بدستور اہتمام کرتے رہیں...... مجھے یاد آیا کہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے شیخ حضرت میاں نور محمد صاحب کے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب جو قطب وقت اور مسندِ سلوک کے ممتاز مربی تھے انہوں نے اپنے سے کہیں خورد سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی خود میرے شیخ حضرت مدنیؒ اور شیخ الہندؒ کے مشترک شیخ قطب العالم حضرت مولوی رشید احمد صاحبؒ گنگوہی سے جب کسی نے دریافت کیا کہ آپ سید العلماء ہوتے ہوئے حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی سے کیوں بیعت ہوئے جبکہ وہ عالم نہیں۔ آپ نے فرمایا وہ سلوک و طریقت میں ہمارے راہنما ہیں البتہ مسائل شرعی میں انہیں ہمارا کہا ماننا ہو گا...... اسی طرح علماء سے رجوع کی طرف آپ نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ یہ بھی ہزار بار لائق تحسین ہے...... اللہ پاک آپ کو اور آپ کے ذریعے آپ کے جملہ رفقاء کو زیادہ سے زیادہ اخلاص و استقامت نصیب فرمائیں......! یہ تقریباً ۶۱ سالہ ناکارہ و بیمار عاجز آپ کی جماعت کو تو کیا فائدہ پہنچا سکے گا! ہاں آپ سے اور آپ کے واسطے سے آپ کے رفقاء سے استقامت علی الحق، صحت و عافیت اور حسن خاتمہ کی دعاؤں کا ضرور طالب ہے۔ ایک بات کھٹکی تھی کہ "نبی امی کا امی امتی" لیکن آپ نے خود ہی توجہ دلانے پر اس سے اجتناب کر لیا۔

آخری گزارش...... ان تینوں باتوں پر پھر غور فرمائیں جو آپ رفقاء سے چاہتے ہیں۔
۱۔ سابقہ بیعت سلوک پر میری بیعت کو ترجیح دیں۔ ۲۔ اپنی آمدنی کا بیسواں حصہ تنظیم کو ضرور ادا کریں۔ ۳۔ صدقات واجبہ مستحق رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے بعد جماعت کے بیت المال میں دینے کی پابندی کریں۔

یہ امور تنظیمی طور پر ضروری ہوں تو ہوں لیکن شرعاً ان کی پابندی محل نظر ہے۔

تضییع اوقات کی معذرت کے ساتھ! طالب دعا ناکارہ

اختر ہاشمی

حالیہ پتہ پوسٹ بکس ۱۴۸۹ ریاض۔ سعودی عرب

(ا-ن) حال ہی میں پتہ چلا کہ صاحب زادہ صاحب موصوف نے آپ سے بیعت فسخ کر دی اور جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ میری اس جسارت کے فوراً بعد ہی ہوا۔ اگر اس میں کوئی شر ہے اور میں اس کا سبب بنا ہوں تو اللہ پاک مجھے معاف فرمائیں! ﴿⊙﴾

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

ایک سے محترم قاضی زاہد الحسینی کا مکتوب

عزیز گرامی قدر عاکف سعید سلام مسنون!

ادعیہ وافیہ'
میثاق باقاعدہ آرہا ہے اور احقر اس کا مطالعہ بھی کرتا رہتا ہے۔ جو سعی بھی دینِ اسلام کی اشاعت اور تحفظ عن المطاعن کے لئے کی جائے اسے اللہ تعالٰے قبول فرمادیں۔ آمین۔

نومبر ۱۹۸۸ء میں جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شائع ہوا ہے اس میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کے بارے میں گاندھی جی کا ایک تجزیہ یوں نقل کیا گیا ہے :-

مولانا اکبر آبادی نے تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پنڈت سندرداس نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ مولانا آزاد بہت بڑے عالم و فاضل ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے ہم انکے مشوروں کے محتاج رہتے ہیں ملکی معاملات میں ان کی رائے کو آخری رائے سمجھا جاتا ہے اور کانگریس کے اکثر فیصلے مولانا آزاد کی رائے کے مطابق ہوتے ہیں لیکن میں نے دیکھا ان میں روحانیت نہیں ہے اس کے برعکس مولوی حسین احمد مجھے ملتے ہیں تو میں ان میں روحانی کشش محسوس کرتا ہوں (مولانا اکبر آبادی نے مولوی حسین احمد کہا تھا) (ص ۴۸)

یہ بیان تو جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی کا ہے جو قابلِ رشک حافظہ کی بنیاد پر تحریر فرمایا ہے مگر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے برہان بابت ماہ نومبر ۱۹۶۱ء میں جو کلمات نقل کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

" ایک مرتبہ سندر لال جی نے بیان فرمایا کہ میں گاندھی جی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے سندر لال بھئی جو روحانیت مولانا حسین احمد میں ہے وہ کسی میں نہیں میں جب کبھی مولانا حسین احمد کے پاس بیٹھتا ہوں مجھے ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے اور میں ان کی طرف کشش

محسوس کرتا ہوں۔ اس کے بعد فرمایا مذہب اگر یہ روحانی کشش پیدا نہ کرے تو وہ مذہب ہی کس کام کا ہے۔" (ص ۲۵۹)

کسی کے اس تتمہ اور اختراعی حاشیہ سے حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی قدر و منزلت کم نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالےٰ اکرام مسلم کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اسی طرح اسی شمارہ کے ص ۷۰ پہ حضرت انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے تلامذہ میں صرف مولانا محمد چراغ کا اسم گرامی بھی محل نظر ہے۔ اسی پاکستان میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے چند نامور تلامذہ اور بھی ہیں جن میں مولانا عبدالقدیر صاحب شیخ الحدیث دار العلوم تعلیم القرآن راولپنڈی بفضلہٖ تعالےٰ علوم و معارف انوری کی اشاعت میں سرگرم عمل ہیں۔

یہ گناہگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی کا شاگرد رہا ہے۔ اسی رشتہ کی وجہ سے حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی نظر عنایت بھی رہی ہے احقر ان کے مزاج اور اخلاق کریمانہ کا کافی حد تک واقف ہے۔ میرے خیال میں ان کی زبان سے حضرت مدنی کے بارے میں مولانا حسین احمد ہی صادر ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

اگر یاد رہا تو جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض کر دیں۔ عریضہ کی رسیدگی کی اطلاع کے لئے واپسی لفافہ ارسال ہے۔ زیادہ دعا و سلام

مخلص

قاضی محمد زاہد الحسینی غفرلہٗ

ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریات

۶ دسمبر کے انگریزی روزنامہ "فرنٹیر پوسٹ" پشاور میں شائع شدہ مکتوب

محترم ثوبیہ سعید کے مراسلے کے سلسلے میں جو آپ کے مؤقر اخبار میں ۲۶ نومبر کو شائع ہوا، میں کہنا چاہوں گا کہ محترمہ کی طرح بہت سے لوگ ڈاکٹر اسرار صاحب کے بارے میں مغالطہ کا شکار ہیں اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ کچھ نے تو موصوف کے نقطۂ نظر کا سرسری سا مطالعہ کیا ہے اور کچھ جانتے بوجھتے ان کی باتوں کو غلط معنی پہناتے ہیں۔ بات اتنی سی ہے کہ ڈاکٹر اسرار سچ کہنے کے عادی ہیں۔ کرکٹ، چادر و چار دیواری، تعلیم نسواں اور دیگر مسائل پر ان کا مؤقف بالکل واضح ہے اور اس میں کوئی ابہام ہرگز نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت کی تو کبھی نفی نہیں کی البتہ اس بات پر ضرور زور دیا ہے کہ دونوں صنفوں میں اختلاط نہیں ہونا چاہئے خواہ وہ تعلیم کا میدان ہو یا کوئی اور شعبۂ حیات۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کا یہ موقف منطق کے عین مطابق
اکثریتی پارٹی کو بے چون وچرا اقتدار منتقل کیا جائے۔ ان
ار ہے کہ عوام کے فیصلے کا احترام کیا جانا چاہئے۔ میں
قارئین سے درخواست کروں گا کہ ان کی دو کتابیں
ام پاکستان" اور "پاکستان اور مسئلہ سندھ" ضرور
جو حال ہی میں شائع ہوئیں۔ ان میں ڈاکٹر صاحب نے
اختیار کو واضح انتباہ دیا ہے کہ عوام کی آواز کی طرف سے
رنہ کئے جائیں۔ کہیں تاریخ اپنے آپ کو دہرانے پر نہ آ
ور خدانہ کرے کہ ہمیں ایسے ہی ایک صدمے سے پھر
دونا پڑے جو پہلے ہم مشرقی پاکستان میں دیکھ چکے ہیں۔
ڈاکٹر اسرار نے اسلام کو ذاتی مقاصد اور مفادات کے
کیلئے اسلام کے ان نام نہاد علمبرداروں کی طرح کبھی
طور پر استعمال نہیں کیا جو حصول اقتدار کی دوڑ میں اپنا
کھو بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار کا مشن اسلام کا صحیح معنوں
اء اور غلبہ دین ہے اور اس معاملے میں ان کے نظریات
ر پوری طرح متعین ہیں۔ اس کے لئے وہ آنحضورؐ کی
مطہرہ سے اخذ کردہ طریق کار بیان کرتے ہیں جو خوب
ں آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے فکر کا تانا بانا قرآنی تصورات
دیث نبویؐ پر مشتمل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک
نظام یعنی دین ہے اور اس کا پھر سے قیام صرف انقلابی
کار ہی سے ممکن ہے۔ ان کا فلسفۂ انقلاب حضورؐ کی مکی
اور مدنی زندگی کے چھ یا سات ادوار کی تشریح و تشکیل کے سوا کچھ
اور نہیں۔

سیاسی سرگرمیوں اور انتخابات کے بارے میں بھی ڈاکٹر
اسرار کی سوچ صاف اور سادہ ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ
آزادانہ ماحول میں سیاست کا تسلسل ملک کی سلامتی کیلئے لازم
ہے اور اس کی اہمیت پر جتنا زور دیا جائے کم ہے کہ لوگوں میں
ملک کے معاملات کو چلانے میں شرکت کا احساس موجود رہنا
چاہئے۔ انتخابات موجودہ نظام کو چلانے والے ہاتھ بدلنے
کیلئے ضروری ہیں ورنہ کوئی آمرانہ سلسلہ اور موقع پرستوں کا
کوئی ٹولہ ملک کو تباہی کے کنارے پر پہنچا کر دم لے گا۔ تاہم
اس ملک میں اسلام کا احیاء اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر دین
کے غلبہ کا حصول انتخابات اور ووٹ کے ذریعے ممکن نہیں۔
اس مقصد کے حصول کیلئے ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ایک انقلابی
طریقہ کار ہی ضروری ہو گا جو اس موجودہ استحصالی نظام کی جڑوں
کو کاٹ کر رکھ دے جو معاشی عدم مساوات اور غیر اسلامی
تصورات پر قائم ہے۔ یہی طریقہ ہے جس سے سماجی انصاف
حریت، مساوات اور اخوت پر مبنی ایک معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا
ہے۔ میں قارئین کو مشورہ دوں گا کہ ان کے نظریات کو بہتر
طور پر سمجھنے کیلئے ڈاکٹر اسرار صاحب کے لٹریچر کا ضرور مطالعہ
کریں۔

اکرم عبداللہ۔ پشاور

جلد: ۳۸
شمارہ: ۲
جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ
فروری ۱۹۸۹ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 610 73rd street
Downers Grove IL 60516
Tel : 312 969 6755

c/o Mr. Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel : 313 977 8081

CANADA US $ 12/-
c/o Mr. Anwer H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1609
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel : 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr. Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlesex EN 34 RP
Tel : 01 805 8732

MID-EAST DR 25/-
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/-
c/o Mr. Hyder M. D. Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel : 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/-
c/o Mr. M.A. Habib
CC 720 Saudia P.O, Box 167
Jeddah 21231
Tel : 651 3140

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰- فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۱۰۰۴
سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی- فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

ہفت روزہ "تکبیر" کراچی کی ۱۲ر جنوری ۸۹ء کی اشاعت میں "پاسباں مل گئے کعبے سے صنم خانے کو!" کے عنوان کے تحت ایک مفصل تحریر کی صورت میں راقم الحروف کی کردار کشی کی وہ کوشش اپنے عروج کو پہنچ گئی جو اس سے قبل کی چند اشاعتوں میں تدریج کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

مدیر "تکبیر" نے اپنی اس کاوش کا آغاز ۱۵ر دسمبر کے شمارے میں نہایت "معصومانہ" انداز میں کیا تھا۔ چنانچہ "قرآن و سنت کی روشنی میں عورت کی سربراہی" کے موضوع پر اپنی ایک طویل تحریر کے اول و آخر میں دوبار راقم کا تذکرہ کسی قدر تائیدی انداز میں کرتے ہوئے قارئین کے ذہن میں ایک مبہم سے سوال کے حوالے سے ایک کانٹا بھی چبھا دیا تھا........ یعنی اگرچہ اول و آخر دو مرتبہ یہ صراحت کر دی گئی کہ "بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اسے دوسرے منکرات کی موجودگی میں مثلاً سود وغیرہ کی طرح گوارا تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے حق میں فتویٰ نہیں دیا جا سکتا" .... اور "حقیقت یہ ہے کہ بے نظیر کی سربراہی آئین کی رو سے بالفعل (DEFACTO) تو تسلیم کی جا سکتی ہے بلکہ بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اسے ایک منکر کے طور پر گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن شریعت کی رو سے اسے قانونی (DEJURE) تسلیم نہیں کیا جا سکتا" ...... لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فرما کر قارئین کے ذہن میں بطرز ایہام ایک وسوسہ بھی پیدا کر دیا کہ...... "ڈاکٹر صاحب نے بھی یہ نہیں بتایا کہ منکرات کے معاملے میں ایک مسلمان کا رویہ بس "گوارا" کر لینے پر آ کر رک جاتا ہے یا اس کے سلسلے میں اس کی ذمہ داریاں کچھ اور بھی ہیں......"

راقم الحروف دو روزناموں یعنی "نوائے وقت" اور "جنگ" کی سرخیاں تو التزاماً دیکھتا ہے (اس لئے کہ خبروں کے ضمن میں نہ ریڈیو سننے کا وقت دستیاب ہے نہ ٹی وی دیکھنے کا موقع!) ہفت روزوں اور ماہناموں کے دیکھنے کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے اور وہ بھی کسی رفیق کے کسی خاص مضمون کی جانب متوجہ کرنے پر' ...... "تکبیر" کا متذکرہ بالا "وسوسہ" راقم کے علم میں لایا گیا تو شدید تعجب ہوا۔ اس لئے کہ انکارِ منکر اور ابطالِ باطل کے انقلابی طریق کار پر راقم نے بے شمار تقریریں کی ہیں' پھر اس موضوع پر راقم کی کتاب "منہج انقلاب نبویؐ" عرصہ ہوا منصّہ شہود پر آ چکی ہے۔ ایک ذمہ دار صحافی کی حیثیت سے صلاح الدین صاحب کے بارے میں یہ بمشکل ہی باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس موضوع پر میرے خیالات سے واقف نہ ہوں۔ مزید بر آں لگ بھگ تین سال قبل ۱۴ر تا ۲۰ر فروری ۸۶ء کے "تکبیر" میں میرا ایک مفصل انٹرویو نہایت آب و تاب سے شائع ہو چکا ہے جو خود صلاح الدین صاحب نے اپنے ایک معاون کی معیت میں مجھ سے لیا تھا۔ اس میں بھی اس موضوع پر مفصل گفتگو شامل تھی.......... اور اس سے بھی بڑھ کر ٹی وی کے "روبرو" پروگرام میں اس موضوع پر مفصل سوال جواب مدیر "تکبیر" سے علیٰ رؤوس الاشہاد ہو چکا تھا.....!!..........
پھر اس تجاہل عارفانہ کا سبب؟ ع "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!" ....تاہم راقم نے اس ضمن میں کچھ تو حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے اسے قلم کی "رواروی" پر محمول کیا! اور کچھ اس بات کا الاؤنس بھی دیا کہ برادرم اقتدار احمد نے "ندا" میں نومبر ۸۸ء کے انتخابات کی مہم میں "تکبیر" کے کردار پر صراحت کے ساتھ جو تنقید کی تھی شاید یہ اس کا "عوض معاوضہ" ہے!۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی کا ریگولر پروگرام مارچ ۸۸ء میں لاہور میں منعقد ہو چکا تھا۔ اور اس کا انداز معمول کے مطابق ہی تھا۔ یعنی پورے چار روزہ پروگرام کا ایک جامع عنوان "اسلام کا نظام حیات" تھا..... اور ہر روز متعدد اصحابِ علم و اربابِ دانش اس کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے سیاسی نظام کے موضوع پر ایک نہایت خوبصورت تقریر جناب صلاح الدین صاحب نے بھی سورۂ نساء کی آیات ۵۸' ۵۹ کے حوالے سے کی تھی.......... انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام جو اضافی پروگرام "محاضرات قرآنی" ہی کے عنوان سے کراچی کے

ریکس آڈیٹوریم میں ۱۷ ر تا ۲۱ ر دسمبر ۸۸ء منعقد ہوا وہ اصلاً "شام الہدیٰ کراچی" کی ایک خصوصی صورت تھی جس میں اسلام کے نظامِ حیات کے مختلف پہلوؤں پر مفصل خطاب راقم الحروف کو کرنا تھا اور بعض اہل علم اور دانشور حضرات کو صرف بحیثیت "مستفسر" اس خیال سے دعوت دی گئی تھی کہ ان کی نشاندہی پر ممکنہ اغلاط کی تصحیح بھی ہو سکے اور گفتگو میں جو خلا باقی رہ جائیں وہ بھی پر کیے جا سکیں۔ اصحابِ علم و دانش کے لئے اس حیثیت کو قبول کرتے ہوئے اس پروگرام میں شرکت پر آمادگی یقیناً ذاتی ایثار کی متقاضی تھی۔ چنانچہ بعض حضرات کی صراحت کے ساتھ معذرت ہمارے لئے بالکل قابلِ فہم تھی...... اور خاص طور پر "ندا" کی متذکرہ بالا تنقید کے پیش نظر صلاح الدین صاحب کے بارے میں تو مجھے قطعاً امید نہ تھی کہ وہ اس پروگرام میں شرکت گوارا فرمائیں گے۔ لیکن کراچی پہنچنے پر جب رفیق مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب سے معلوم ہوا کہ انہوں نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے تو مجھے کسی قدر تعجب تو ہوا، لیکن میں نے اسے ان کی عالی حوصلگی اور وسعتِ ظرف ہی پر محمول کیا۔ اس لئے کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ کس ارادے اور نیت سے شرکت فرما رہے ہیں۔

(اور اب بھی اگرچہ فنی طور پر تو ان کی نیت پر شبہ سوء ظن ہی شمار ہو گا۔ لیکن اس کے قوی شواہد اس تحریر میں موجود ہیں جو "تکبیر" کے اس شمارے میں شائع ہوئی جس پر ۲۹ ر دسمبر کی تاریخ درج ہے۔ اس لئے کہ جب ۲۰ ر دسمبر کو وہ محاضرات قرآنی میں شرکت کے لئے تشریف لائے تو اغلباً وہ تحریر ان کے قلم سے نکل چکی تھی ورنہ یقیناً اس کا پورا ہیولیٰ تو ان کے ذہن میں تیار ہو ہی چکا تھا۔ اس تحریر کے بارے میں گفتگو بعد میں ہو گی۔ اس لئے کہ خود راقم کی نظر سے وہ بہت بعد میں گزری!۔)

۲۰ ر دسمبر کی شام کو ریکس آڈیٹوریم میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کا استقبال احسانمندی کے جذبات کے ساتھ کیا۔ اور اپنی تقریر کے دوران میرے یہ جذبات مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔ اس لئے کہ مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایک ایسے دانشور کے لئے جو خود صاحب قلم بھی ہو اور صاحبِ زبان و بیان بھی کسی دوسرے مقرر کی سوا دو گھنٹے کی تقریر سننا آسان کام نہیں ہے! اور اس کے لئے بڑے صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے!...... لیکن تقریر کے بعد سوال جواب کے سلسلے میں جب میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ باضابطہ "الجھنے" کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو ایک بار تو میں نے یہ عرض کیا کہ "یہاں بحث کی گنجائش نہیں ہے، اور اس اجتماع کا "FORMAT" یہ نہیں ہے"...... اور ایک مرحلے پر یہ کہا کہ "اس مسئلے میں میں اس سے

زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس لئے بھی کہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں اور اس لئے بھی کہ اس کا آج کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے" ۔اس حد تک تو معاملہ از بس غنیمت ہی تھا لیکن ان کے دو سوالوں پر میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے میری تقریر سنی ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ میری صراحتوں کے بالکل برعکس مؤقف میری طرف منسوب کر رہے تھے۔ اس پر ایک بار تو میں نے عرض کیا کہ شاید آپ نے میری بات پر توجہ نہیں کی۔ لیکن دوسری بات پر مجھے حیرت اور تعجب کے ساتھ یہ کہنا پڑا کہ "معاملہ کیا ہے؟ آپ نے تو شاید میری تقریر سنی ہی نہیں!" .... اس پر حاضرین کی جانب سے ایک بوابلند آہنگ قہقہہ پڑا' جس پر فطری طور پر صلاح الدین صاحب بھی خجل ہوئے اور مجھے بھی دلی افسوس ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس قہقہے کا اصل سبب یہ تھا کہ میری تقریر کے دوران صلاح الدین صاحب باقاعدہ سوتے رہے تھے' اور یہ بات میرے تو علم میں نہیں تھی۔ کیونکہ وہ میری بائیں جانب کسی قدر پیچھے کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ہال میں اگلی قطاروں میں بیٹھے ہوئے سامعین وناظرین نے انہیں سوتے ہوئے دیکھا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی میں نے کہا کہ شاید آپ نے میری بات سنی ہی نہیں تو ان حضرات کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اور یہ بات صلاح الدین صاحب کی خفت کا سبب بن گئی!۔ اسی طرح ایک مرحلے پر جب کہ وہ عورت کی سربراہی کے مسئلے پر زیادہ ہی الجھ رہے تھے میں نے بات کو ختم کرنے کے لئے "اسلامی جمہوری اتحاد" کی نمائندہ بیگم عفیفہ ممدوٹ صاحبہ کا ذکر کر دیا جس پر وہ بالکل بتاشے کی طرح بیٹھ گئے..... (اور خدا گواہ ہے مجھے اس پر بھی کوئی خوشی نہیں بلکہ افسوس ہی ہوا تھا) ۔

اجتماع کے اختتام پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ اپنا ۱۵ر دسمبر والا مضمون بھی کتابچے کی صورت میں لے کر آئے تھے جسے انہوں نے وہاں چیدہ چیدہ حضرات کو تقسیم بھی کیا۔ مزید برآں یہ کہ وہ اجتماع گاہ سے کسی قدر دل گرفتہ بلکہ بھنّائے ہوئے رخصت ہوئے تھے۔ اس پر میں نے اپنے دل میں بھی یہ طے کر لیا اور بعض احباب سے اپنے اس ارادہ کا تذکرہ بھی کر دیا کہ میں جب جنوری کے اوائل میں عمرہ کے لئے حجاز جاتے ہوئے کراچی آؤں گا تو ان سے ملاقات کر کے ان کی دلجوئی کی کوشش کروں گا۔

لاہور واپسی پر "تکبیر" کی اشاعت بابت ۲۹ر دسمبر والا مضمون بعنوان "اسلام میں عورت کا مقام۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی نگاہ میں!" جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے علم میں آیا۔ اس

مضمون میں ماہنامہ "میثاق" کی اس موضوع پر ایک خصوصی اشاعت (بابت مئی ۱۹۸۲ء) میں شائع شدہ تحریروں اور میری ۲۳ر مارچ اور ۲۶ر مارچ (۱۹۸۳ء) کی دو تقریروں کے مفصل اقتباسات دے کر تان اس "استفہامِ استعجابی" یا "استفہامِ انکاری" پر توڑی گئی کہ :-

"ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تو ٹی وی پر خاتون نیوز ریڈر بھی دیکھنے کے روادار نہیں' تو پھر اسے سربراہِ حکومت دیکھنا کیسے گوارا کریں گے؟ آخر اس استثناء اور رخصت کی کوئی شرعی توجیہہ ؟......"

اور اس کے بعد پروپیگنڈے کی "معروف" ٹیکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے میرے "نیاز مندوں کے ذہنوں" میں وسوسہ اندازی کی بھرپور کوشش کی گئی کہ :-

"یہ ایک ایسا سوال ہے جو ان کے نیاز مندوں کے ذہنوں میں ان کے تازہ مؤقف کی وجہ سے ہلچل مچائے ہوئے ہے!......"

اس پر اولین اور شدید ترین حیرت تو اس اعتبار سے ہوئی کہ ۱۵ر اور ۲۹ر دسمبر کے مابین میرے مؤقف میں وہ کونسی تبدیلی آئی ہے جس پر "تکبیر" نے اس صلیبی جنگ (CRUSADE) کا آغاز کر دیا ہے؟ - میرا مؤقف جو پہلے تھا وہی اب بھی ہے میں نے جس چیز کو پہلے ازروئے شرع و دین "منکر" قرار دیا تھا' اسے اب بھی منکر ہی قرار دے رہا ہوں بلکہ زیادہ شدّومد کے ساتھ قرار دے رہا ہوں' پھر یہ تبدیلی کیوں کہ پہلے حوالہ تائیدی انداز میں تھا اور اب اس پر چاندماری شروع کر دی گئی ہے! -

دوسرا سوالیہ نشان ذہن کے سامنے اس مسئلے پر آن کھڑا ہوا کہ میری ۸۳-۱۹۸۲ء کی تقاریر اب ہی کیوں یاد آئیں - اس وقت ان کی جانب التفات کیوں نہ ہوا جب پورے ملک میں اس مسئلے پر شور برپا تھا' اور میری تائیدو تحسین اور مخالفت و مذمت دونوں زوروں پر تھیں...... لیکن مرحوم ضیاء الحق صاحب "اتھارٹی میں ہوں' ڈاکٹر اسرار نہیں!" کے نعرے بھی لگا رہے تھے اور عورتوں اور مردوں کے "شانہ بشانہ" چلنے کی تائید ہی نہیں باضابطہ "تبلیغ" فرما رہے تھے' بلکہ انہوں نے اپنے قول و فعل میں یکسانیت کے مظاہرے کے لئے ایک جانب ہوسٹن (امریکہ) میں ایک سوال کے جواب میں اپنے طرزِ عمل کو اسلام کی عملی تفسیر کے طور پر پیش کیا تھا...... اور دوسری جانب منتخب اداروں میں خواتین کی نشستیں ایکدم کئی گنا بڑھا دی تھیں؟......؟؟ اس وقت تو میری تحریروں اور تقریروں کی تو بساط ہی کیا ہے' قرآن حکیم کی

وہ آیات، اور وہ احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام!) بھی لائقِ التفات نہ ٹھہری تھیں جو آج "عورت کی سربراہی" نامی کتابچے کی زینت ہیں!!۔

(ب "خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے" اور "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!" کا اطلاق..... اگر ضرور کرنا ہی ہے..... تو الفاظِ قرآنی۔ "وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ" کے مصداق اس معاملے پر کیجئے!۔)

بہرحال..... متذکرہ بالا دونوں باتوں پر تعجب اور تحیر تو بہت ہوا، لیکن اللہ گواہ ہے کہ کوئی سوءِ ظن مدیر "تکبیر" کی ذات سے اس وقت بھی پیدا نہیں ہوا۔ اور اگرچہ ذہن یہ تسلیم کرنے سے انکاری تھا کہ ان کی نگاہ سے میری وہ دو تقریریں نہیں گزری ہوں گی جو میں نے ۲ر اور ۹ر دسمبر کے اجتماعاتِ جمعہ میں کی تھیں، اور جو "ندا" کی ان اشاعتوں میں شائع ہو چکی تھیں جن پر ۲۰ر اور ۲۷ر دسمبر کی تاریخیں درج تھیں۔ بالخصوص ۲ر دسمبر والی تقریر جس میں میں نے ایک خاتون کے وزیراعظم نامزد کئے جانے پر شدید رنج و غم اور دلی صدمے کا اظہار کیا تھا..... تاہم میں نے اپنے دل کو یہی بہلاوا دیا کہ شاید میرا پورا موقف ان کے سامنے نہیں آیا۔ اور جب یہ تقاریر ان کی نظروں سے گزریں گی تو وہ اپنی "وسوسہ اندازی" سے رجوع کرلیں گے! (یہی وجہ ہے کہ میں نے ادارۂ "میثاق" کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان دونوں تقاریر کو "میثاق" میں بھی شائع کر دے۔ چنانچہ اس کی جنوری کی اشاعت میں وہ دوبارہ شائع کر دی گئیں!)

واضح رہے کہ "اسلام میں خواتین کے مقام" اور اسلام میں ستر و حجاب کے احکام، اور مخلوط معاشرے کا بحیثیت مجموعی اسلام کی روح اور اس کے مزاج کے مخالف ہونے کے ضمن میں میرے موقف اور رائے کے ضمن میں ۸۳۔ ۱۹۸۲ء اور ۸۹۔ ۱۹۸۸ء کے مابین سرِمو فرق نہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس معاملے میں میرے رویئے میں بھی بال برابر فرق واقع نہیں ہوا۔ اس لئے کہ ۸۲ء میں بھی میں نے نہ تو از خود کسی مہم کے طور پر اس مسئلے کو اٹھایا تھا اور نہ ہی اس پر کوئی سیاسی تحریک چلائی تھی۔ بلکہ یہ مسئلہ اٹھا بھی اس طرح تھا کہ ارشاد احمد حقانی صاحب نے ایک گفتگو کے آخر میں اٹھتے اٹھتے بلکہ چلتے چلتے بعض سوالات کئے اور جب ان کے بے تکلف اور بے ساختہ جوابات شائع ہوئے تو جدید تعلیم یافتہ مغرب زدہ خواتین نے شور و غوغا برپا کر دیا..... ان کے اس خلافِ شریعت شور و غوغا پر جو عوامی ردِ عمل بالخصوص بلا لحاظ مسلک و مشرب جملہ مذہبی حلقوں کی جانب سے ظاہر ہوا، اس سے فی الواقع ایسی صورت بن گئی

تھی کہ اگر میں کوئی "سیاسی حیوان" ہوتا تو صدر ضیاء الحق صاحب کی حکومت کے خلاف ایک سیاسی تحریک شروع کر دیتا...... لیکن اس کام کو میں نے نہ اُس وقت ملک و ملت اور دین و مذہب کے لئے مفید سمجھا تھا' نہ آج سمجھتا ہوں۔

اس ضمن میں مناسب ہے کہ مرحوم صدر ضیاء الحق کے ساتھ اپنی اس گفتگو کا حوالہ تحریری طور پر بھی دیدوں' جس کا ذکر میں نے اپنی بہت سی تقریروں میں کیا ہے جو کیسٹوں میں محفوظ ہیں۔

یہ ۵ مئی ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے کہ جب میں صدر ضیاء الحق صاحب کی شوریٰ سے استعفاء دینے ان کی خدمت میں گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں حاضر ہوا تو اثنائے گفتگو میں انہوں نے کسی اخبار کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "اس میں آپ کے بارے میں جو مضمون چھپا ہے کیا آپ نے پڑھا ہے؟" اس پر جب میں نے عرض کیا کہ وہ مضمون تو میری نظر سے نہیں گزرا لیکن آپ بتا دیجئے کہ اس میں کیا لکھا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ "صاحبِ مضمون نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ڈاکٹر اسرار بہت باصلاحیت شخص ہے اور ملک و قوم کی بہت مفید خدمت سرانجام دے سکتا ہے بشرطیکہ صرف ایک خواتین کے معاملے میں اپنے مؤقف میں لچک پیدا کر لے!" میں نے ان کا اشارہ پا کر ان کی خدمت میں تین باتیں اس وقت کے گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی صاحب کی موجودگی میں ان سے کہیں :

ایک یہ کہ میری رائے صرف دلیل سے بدلی جا سکتی ہے۔ اگر میں اپنے دینی مؤقف کو وقتی مصلحتوں کے تابع کر دوں تو میری معنوی موت واقع ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کہ آپ خود غور کریں کہ آپ یہ کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لئے ہوئے ہیں کہ آپ نے شرعی عدالت قائم کی ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے نافذ کردہ عائلی قوانین تک کے ضمن میں باندھ دیئے ہیں۔ شرعی عدالت کے جج آپ کا ذاتی انتخاب ہیں...... اور یقیناً آپ کو ان کے دین و شریعت کے فہم پر بھی اعتماد ہے اور ان کے کردار پر بھی..... تو کیوں نہیں آپ ان کے ہاتھ کھول دیتے کہ وہ شریعت کے مطابق فیصلہ کر دیں کہ ان عائلی قوانین کی کوئی شق خلافِ اسلام ہے یا نہیں اور ہے تو کون سی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ وہ کریں جو میں کہتا ہوں۔ میرا مطالبہ صرف یہ ہے کہ آپ شرعی عدالت پر سے پابندی ہٹا لیں...... پھر وہاں غلام احمد پرویز صاحب پر بھی (موصوف اس وقت تک بقید حیات تھے) کوئی قدغن نہیں ہے۔ جائیں اور اپنے تصنیف کردہ عائلی قوانین کا مطابقِ شریعت ہونا

ثابت کر دیں..... (افسوس کہ میری اس بات کا جو جواب مرحوم نے دیا وہ اس قدر بودا اور مضحکہ خیز تھا کہ اب ان کے انتقال کے بعد میں اسے نقل بھی نہیں کرنا چاہتا!)

تیسری بات، جس کے لئے یہ ساری تفصیل سپرد قلم کی گئی ہے، یہ تھی کہ اس وقت میں اس پوزیشن میں ہوں کہ اس مسئلے پر آپ کے خلاف ایک تحریک برپا کر دوں۔ لیکن یہ میں اس لئے نہیں کر رہا کہ میرے پاس کوئی مضبوط جماعت موجود نہیں ہے جو اسے کنٹرول کر سکے اور حدود و قیود کا پابند رکھ سکے..... لہٰذا اندیشہ ہے کہ اسے دوسری سیاسی قوتیں اپنی مطلب براری کا ذریعہ بنالیں گی!۔

بعینہٖ یہی مؤقف میرا آج بھی ہے کہ اگر اس وقت بھی عورت کی سربراہیٔ حکومت کے خلاف عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر کوئی ایجی ٹیشن شروع کر دیا گیا تو بحالاتِ موجودہ نہ صرف یہ کہ وہ کسی نہ کسی سیاسی کھیل کا ضمیمہ بن جائے گا..... بلکہ عین ممکن ہے کہ اسے ملک و قوم کے دشمن اپنے مذموم مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنالیں۔

باز آمدم بر سر مطلب.......... "تکبیر" کے ۲۹ر دسمبر کے شمارے والے مضمون پر دل اور دماغ کے مابین کشمکش اور کشاکش تو بہت رہی لیکن اس حسن ظن کی بنا پر جو اس وقت تک راقم کو مدیر "تکبیر" کی ذات سے تھا.......... میں اپنے اس فیصلے پر قائم رہا کہ ۳ر تا ۵ر جنوری اپنے کراچی کے قیام کے دوران کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر ان سے ضرور ملوں گا اور شکوک و شبہات کے ازالے کی کوشش کروں گا!

لیکن افسوس کہ جب ۳ر جنوری کو کراچی پہنچا تو "تکبیر" کا وہ شمارہ شائع ہو چکا تھا جس پر ۵ر جنوری کی تاریخ درج تھی..... اور مجھے بتایا گیا کہ اس میں ایک نہایت تہدید آمیز اور اشتعال انگیز اعلان نمایاں طور پر شائع ہوا ہے کہ۔

> "محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! علامہ اقبال اور خود اپنے آپ پر رحم فرمائیے.....!
> کراچی میں محاضرات قرآنی کے پروگرام کے تحت "اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام" کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے ارشادات کا جائزہ..... مدیر تکبیر محمد صلاح الدین کے قلم سے!"

اس پر میں نے اس خیال سے کہ اب ان سے ملاقات بزدلی اور فرار پر محمول کی جائے گی، ملاقات کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ اب دیکھ ہی لیا جائے کہ وہ کیا کہتے ہیں!

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

الہدیٰ

درس ۱۲، نشست ۵

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۴)

نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسوله الکریم .... امّا بعد

فاعوذ باللّٰه من الشیطٰن الرّجیم

بسم اللّٰه الرّحمٰن الرّحیم

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ○ (الحجرات ۱۱-۱۲)

صدق اللّٰه العظیم

"اے ایمان والو! تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے کہ وہ گروہ ان سے بہتر ہو۔ اور نہ ہی عورتیں دوسری

عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ہی تم اپنے آپ کو عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کے لئے برے نام رکھو۔ ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے۔ اور جو اس سے باز نہیں آئے گا تو (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! کثرت سے گمان کرنے سے بچو۔ اس لئے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ٹوہ لگایا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم سے کوئی شخص اسے پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ پس یہ بات تو تمہیں انتہائی ناپسند ہے اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ توبہ کو قبول کرنے والا (اور) رحم فرمانے والا ہے"۔

محترم حاضرین اور معزز ناظرین...... یہ سورۃ الحجرات کی آیات نمبر گیارہ اور بارہ ہیں' جن کی آپ نے تلاوت اور ترجمہ سنا۔ اس درس کے بارے میں میں نے جو تمہیدی گفتگو کی تھی اس میں عرض کر دیا تھا کہ اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو اگر تین حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پہلے اور آخری حصے میں مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعی اور حیاتِ ملی سے متعلق نہایت اہم اور اساسی و بنیادی باتیں زیر بحث آئی ہیں...... درمیانی حصے میں مسلمانوں کے مابین اتحاد و اتفاق اور محبت و مودّت کی فضا کو برقرار رکھنے کے لئے اور اختلاف و افتراق اور نفرت و عداوت کے سدِّباب کے لئے چند احکام دیئے گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دو حکم بڑے ہیں اور چھ ان دو کے مقابلے میں چھوٹے ہیں۔ میری اس بات سے کوئی غلط فہمی راہ نہ پائے اس لئے جان لیجئے کہ قرآن مجید کی کوئی بات چھوٹی نہیں ہے لیکن قرآن حکیم کی باتوں کے مابین ایک نسبت و تناسب ممکن ہے۔ چنانچہ آج ہم جن دو آیات کا مطالعہ کر رہے ہیں' ان میں وہ چھ احکام بصورتِ نواہی آرہے ہیں۔

ان چھ احکام کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ مجلسی برائیاں ہیں جو ہمارے یہاں بہت عام ہیں اور انہیں عام طور پر حقیر اور بہت معمولی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی وجہ سے بسا اوقات باہم دل پھٹ جاتے ہیں' رشتۂ محبت و مودّت منقطع ہو جاتا ہے اور نفرت و کدورت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ اگر ہم امّت مسلمہ کو ایک فصیل سے تشبیہ دیں تو ظاہر بات ہے کہ فصیل اینٹوں سے بنی ہوتی ہے اور فصیل کے مضبوط ہونے میں دو چیزوں کو دخل ہے۔ ایک یہ کہ ہر اینٹ پختہ ہو اور دوسرے یہ کہ ان اینٹوں کو باہم جوڑنے والا مسالہ بھی خالص اور مضبوط

ہو۔ ان دونوں میں سے ایک چیز بھی کمزور اور غیر خالص ہوگی تو اس کا نتیجہ فصیل کی کمزوری نکلے گا۔ ہم نے قرآن کریم کی ان آیات پر بھی غور کیا جن میں نہایت تاکید کی گئی ہے اور زور دیا گیا ہے کہ امتِ مسلمہ کے ہر ہر فرد کے سیرت و کردار کو پختہ کیا جائے۔ اور آج ہم ان آیات کا مطالعہ کر رہے ہیں جن میں مسلمانوں کے افراد و اشخاص کے مابین بھی' کنبوں اور خاندانوں کے مابین بھی اور قوموں اور قبیلوں کے مابین بھی جوڑنے والے مسالے کو مضبوط اور خالص رکھنے کے لئے جن چیزوں سے بچنا ضروری ہے' وہ ہمارے سامنے آتی ہیں۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ...... لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ...... اور وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ...... عام طور پر قرآن مجید میں جو احکام آتے ہیں وہ صرف مردوں سے خطاب کر کے ارشاد ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ احکام صرف مردوں ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ عربی گرامر کا یہ قاعدہ ہے کہ خطاب میں بر سبیلِ تغلیب کسی ایک چیز کا ذکر کر دینے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دوسری چیز جو اس کے تابع ہے وہ بھی مخاطب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر احکام صیغۂ مذکر میں دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس حکم کی خواتین کے لئے خاص طور پر تکرار آئی ہے۔ اس تکرار کی حکمت اور وجہ تھوڑے سے غور سے سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ مجلسی خرابی مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ مردوں کے سامنے زندگی کے بہت سے اہم تر مسائل اور تلخ تر حقیقتیں رہتی ہیں اور اُن میں ان کی مشغولیت رہتی ہے' جبکہ خواتین کا دائرۂ عمل چونکہ بالعموم محدود رہتا ہے لہٰذا یہ باتیں ان میں زیادہ رواج پا جاتی ہیں۔ کسی کے لباس پر کوئی فقرہ چست کر دیا۔ کسی کی شکل و صورت کے بارے میں کوئی استہزائی انداز کا تبصرہ کر دیا۔ کسی کا رہن سہن اور چلن اگر فیشن کے مطابق نہیں ہے تو اس کا تمسخر اڑا دیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہم قرار دے کر ان پر اس طرح کی پھبتیاں چست کر دینا' ان پر استہزائی اور تمسخر کے انداز میں تبصرے کر دینا عام طور پر عورتوں کی مجلسی زندگی میں یہ برائی زیادہ پائی جاتی ہے لہٰذا اُس کا یہاں خاص طور پر علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ خرابی مردوں میں نہیں ہے۔ مردوں میں بھی یہ برائیاں موجود ہیں' چنانچہ پہلے انہیں خطاب کیا گیا اور اس کے بعد اسے خواتین کے لئے دوہرا دیا گیا۔

اب اگر آپ مزید غور کریں گے تو واضح ہو گا کہ واقعہ یہ ہے کہ باہم دوستوں میں بھی ایک دوسرے کا تمسخر و استہزاء بسا اوقات رنجش کا سبب بن جاتا ہے اور دوستیاں ٹوٹ جاتی

ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مذاق کسی دوست سے دس مرتبہ کیا گیا اور وہ برداشت کر گیا' لیکن کسی وقت اس کا موڈ آف ہے تو ایسے لمحے میں ہو سکتا ہے کہ وہی مذاق اس کی برداشت سے باہر ہو جائے اور وہ پھٹ پڑے اور یہ پھٹ پڑنا ہو سکتا ہے کہ دیرینہ سے دیرینہ دوستی کے رشتے کو منقطع کرنے کا باعث بن جائے۔ یہ معاملہ خالص افراد کی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور گروہوں' خاندانوں' کنبوں اور قبیلوں کی سطح پر بھی ہو سکتا ہے۔ پس پہلا حکم یہ دیا گیا کہ تمسخر اور استہزاء سے باز رہو۔ اب دیکھئے کہ اس میں اپیل کا ایک بڑا مؤثر انداز بھی موجود ہے۔ اپیل کا اس سے زیادہ مؤثر اسلوب ممکن نہیں ہے۔ مردوں کے لئے فرمایا۔ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ۔ اور عورتوں کے لئے فرمایا۔ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ۔ تم جس کی ظاہری کمزوری یا عیب کو دیکھ کر مذاق اڑا رہے ہو' اس پر فقرے چست کر رہے ہو' اس شخص کے متعلق تمہیں کیا معلوم کہ اس کے دل میں اللہ کی کتنی محبت ہو' اس کے دل میں محبتِ رسولؐ کا کتنا بڑا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور اللہ کو تو قدر ان چیزوں کی ہے۔ جیسے ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی اَجْسَادِکُمْ وَلَا اِلٰی صُوَرِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ۔ "اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال پر ہے"۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ سیرت و کردار اور اللہ اور رسولؐ کی محبت و اطاعت اور فرمانبرداری میں تم سے کہیں آگے ہو' اللہ کے یہاں اس کا رتبہ بہت بلند ہو..... حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو صورت و شکل تھی' اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ پھر انؓ کا حال یہ تھا کہ عربی کے بعض تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ انؓ سے شین بالکل ادا نہیں ہوتا تھا۔ اذان میں وہ اسھدان لاالہ الا اللہ اسھدانّ محمّدا رّسول اللہ کہا کرتے لیکن انؓ کے دل میں اللہ پر' آخرت پر اور رسالت پر جو ایمان تھا اور انؓ کے ریشے ریشے میں اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شدید محبت رچی بسی تھی اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ امیر المؤمنین' خلیفۃ المسلمین انؓ سے سیدنا بلالؓ کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ تو پہلی بات یہ آئی اور اس کی ترغیب میں بہت ہی مؤثر اپیل سامنے آئی۔

دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ خود اپنے آپ کی عیب چینی نہ کیا کرو۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ۔ جو تنگ نظر رکھنے والا انسان ہو گا' جس کا اپنا ظرف چھوٹا ہو گا اس میں یہ بات نظر

آ ئے گی وہ دوسروں کے عیب تلاش کرے گا' عیب چینی کرے گا' عیب جوئی کرے گا' ان کی کسی برائی کو ان کے منہ پر دے مارے گا' ان کی توہین کرنے کو اپنا وطیرہ بنا لے گا۔ اب یہاں دیکھئے کہ کیسا پر تاثیر اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ تم اگر کسی مسلمان کی عیب جوئی کر رہے ہو' اس پر عیب لگا رہے ہو' اس کے عیب ظاہر کر رہے ہو تو وہ تمہارا اپنا مسلمان بھائی ہے۔ گویا اس طرح تم نے خود اپنے آپ کو عیب لگایا ہے۔ اب اس سے زیادہ مؤثر اپیل کا انداز اور دلنشین پیرایہ ممکن نہیں ہے۔ جیسے ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اپنے ماں باپ کو گالیاں مت دیا کرو"۔ اس پر کسی نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ "کون شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے گا!" حضورؐ نے جواباً ارشاد فرمایا "اگر تم کسی کے ماں باپ کو گالی دو گے اور وہ پلٹ کر تمہارے ماں باپ کو گالی دے گا تو درحقیقت یہ تم نے خود اپنے والدین کو گالی دی"۔ اگر یہ بات دل کی گہرائی میں اتر جائے تو وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کی بلاغت و حکمت واضح ہو کر سامنے آ جائے گی۔

تیسرا حکم آیا وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ ایک دوسرے کے برے نام' چڑانے والے نام' تحقیر آمیز نام رکھ کر ان ناموں سے کسی کو مت پکارا کرو۔ ظاہر بات ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور اس کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کمزور ہو' احتجاج نہ کر سکے اور وہ قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق اسے اندر ہی اندر پی رہا ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے جذبات مجروح نہیں ہوئے۔ یہی چیز وہ صورت اختیار کر سکتی ہے جیسے دو اینٹوں کے درمیان ان کو جوڑنے والا مسالہ کمزور پڑ جائے اور اپنی جگہ چھوڑ دے تو یہ چیز دشمن کے اندر در آنے کا سبب بن سکتی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ ایسے تمام رخنوں کو بند رکھنے کا اہتمام کرو۔ اس معاملہ میں احتیاط کا دامن تھامے رکھو۔

یہاں پھر دیکھئے کہ مؤثر اپیل کی انتہا ہے۔ دلنشین پیرایۂ بیان اختیار فرمایا گیا ہے۔ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ۔ "ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے"۔ جب اللہ نے ایمان جیسی دولت تمہیں عطا فرمائی' تمہیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہونے کا شرف عطا فرمایا تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور پستی کی طرف تمہارا یہ رجحان اس مقام سے مناسبت رکھنے والی چیز نہیں ہے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

اس ترغیب کے ساتھ ہی اب ترہیب و تہدید اور دھمکی بھی ہے۔ ارشاد فرمایا: وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ "اور جو باز نہیں آئیں گے' رجوع نہیں

کریں گے' اللہ کی جناب میں توبہ نہیں کریں گے تو جان لو کہ اللہ کے نزدیک ایسے لوگ ہی ظالم ہیں"۔ یعنی ایسے لوگوں کو آخرت میں اپنے ایسے تمام افعال و اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی اور ان کی سزا بھگتنی ہو گی' ان تمام چیزوں کو ACCOUNT FOR کرنا پڑے گا۔ یہ چیزیں ایسے ہی نہیں رہ جائیں گی جن کا حساب نہ لیا جائے۔

اگلی آیت میں پھر تین احکام بصورتِ نواہی آئے۔ اور قرآن مجید کا اعجازِ بیان دیکھئے کہ ان چھ باتوں کو دو آیتوں میں تقسیم کیا' تین پہلی آیت میں اور تین دوسری آیت میں۔ لیکن پہلی آیت میں وہ تین باتیں آئی ہیں جو رو در رُو ہوتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ طنز سامنے کیا جائے گا' طعنہ سامنے دیا جائے گا' تمسخر و استہزاء سامنے ہی کیا جائے گا' تب ہی تو اس سے لذت حاصل ہو گی۔ اسی طریقے سے کسی کو برے نام سے پکارنے کا معاملہ بھی علی الاعلان ہو گا۔ اگلی آیت میں ان تین برائیوں کا بیان آ رہا ہے جن کا اخفاء کے ساتھ یا پیٹھ پیچھے ارتکاب ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ۔ "اے اہلِ ایمان' گمان کی کثرت سے بچو"۔ یعنی خواہ مخواہ کسی کے بارے میں دل میں ایک گمان قائم کر لینا' کسی کے بارے میں خواہ مخواہ دل میں کوئی برا خیال بٹھا لینا' خواہ مخواہ کسی کے بارے میں دل میں یہ رائے قائم کر لینا کہ اسے مجھ سے دشمنی ہے' اسے مجھ سے کد ہے' جبکہ اس کے لئے کوئی دلیل اور بنیاد موجود نہ ہو۔ اسی طرح خواہ مخواہ کسی کے بارے میں کسی اور اعتبار سے سوءِ ظن قائم کر لینا' اس سے روکا گیا۔ یہاں بھی اپیل کا انداز دیکھئے ارشاد ہوا' اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ "یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں"۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا کوئی گمان درست ہو لیکن یہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ گمان تو گمان ہی ہے' علم تو نہیں ہے۔ لہٰذا تم نے بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی بنیاد کے کسی مسلمان بھائی کے بارے میں کوئی برا خیال اپنے دل میں بٹھا لیا ہے' کوئی غلط رائے قائم کر لی ہے تو یہ گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پکڑ ہو گی اور تمہیں اس پر سزا بھگتنی پڑے گی۔

دوسری بات فرمائی۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا۔ کسی کی ٹوہ میں رہنے اور تجسس سے منع کیا جا رہا ہے...... اس کی مثال ایسی ہے جیسے مکھی بیٹھنے کے لئے گندگی تلاش کرتی ہے' ایسے ہی بعض پست ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا یہ ایک ذوق اور مشغلہ ہوتا ہے کہ اس ٹوہ میں لگے رہیں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے' ان دو بھائیوں کے تعلقات ٹھیک ہیں' اس کی کیا وجہ ہے! ان دو دوستوں میں بڑا گہرا قلبی تعلق ہے' ایسا کیوں ہے! کہیں کوئی ایسی بات سامنے آئے جس سے

ان کا کوئی اختلافی معاملہ ہمارے علم میں آجائے۔ اس تجسّس اور ٹوہ کے وطیرے سے روکا گیا۔ بلکہ احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی ہے اور تلقین فرمائی ہے کہ "اگر تمہارے کسی بھائی کا کوئی عیب بغیر اس کے کہ تمہارا اس کو جاننے کا ارادہ تھا' تمہارے علم میں آجائے تو حتی الامکان اس کی پردہ پوشی کرو۔ اگر دنیا میں تم اپنے کسی مسلمان بھائی کے عیب کی پردہ پوشی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری آخرت میں پردہ پوشی فرمائے گا"۔ اس تلقین' اس تعلیم اور اس اخلاقی ہدایت کو سامنے رکھیں تو ایک مسلم معاشرے میں برکات ہی برکات مشہود ہوں گی۔

اس آیت میں تیسری اور آخری بات فرمائی: وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا۔ "اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو"۔ کسی کے پیٹھ پیچھے' کسی کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت ہے جبکہ نیت اس کی توہین وتذلیل کی ہو۔ اس کے بارے میں بری بات کو اس ارادے سے لوگوں تک پہنچانا اور پھیلانا تاکہ لوگوں کی نگاہ میں اس کی وقعت نہ رہے۔ اسی آیتِ مبارکہ میں اس غیبت کی مذمت بڑے شدید انداز میں بیان ہوئی' ارشاد ہوا: اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ۔ "کیا تم میں سے کوئی شخص اس کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے' پس اسے تو تم بہت ناگوار سمجھتے ہو!"۔ اب دیکھئے کہ اس میں مناسبت کیا ہے؟ جو شخص فوت ہو چکا ہے' وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا۔ آپ جہاں سے چاہیں اس کی بوٹی اڑا لیں۔ اسی طریقے سے جو شخص موجود نہیں ہے' وہ اپنی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ آپ جو چاہیں اس کے پیٹھ پیچھے اس کے بارے میں کہہ دیں۔ وہ کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی صفائی اور مدافعت میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہو' ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے بارے میں جو بات کہہ رہے ہیں' وہ غلط ہو۔ اگر وہ موجود ہو گا تو وہ وضاحت کر سکے گا۔ لیکن اگر وہ موجود نہیں ہے تو وہ اپنی عزت کی حفاظت اُسی طریقے سے کرنے سے قاصر ہے جس طریقے سے ایک مردہ لاش اپنے جسم کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نے اپنے کسی غیر موجود مسلمان بھائی کی کوئی برائی بیان کی ہے تو یہ غیبت ہے اور درحقیقت یہ اخلاقی سطح پر بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی مردہ بھائی کی لاش سے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہوں۔

البتہ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ تینوں چیزیں وہ ہیں جن میں کچھ استثناءات ہیں۔ بعض قرائن اور ظاہری شواہد کی بنیاد پر کسی کے متعلق بدگمانی دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت

میں ضروری ہو گا کہ جلد از جلد اس کے متعلق اپنی استعداد کے مطابق تحقیق کر لی جائے۔ اسی طریقے سے حکومت تفتیش اور صحیح صورتحال معلوم کرنے کے لئے تجسس کر سکتی ہے۔ وہ یہ جاننے کے لئے تجسس کا ایک مستقل شعبہ اور محکمہ قائم کر سکتی ہے کہ ملک میں غیر ممالک کے جاسوس تو سرگرم عمل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں وہ خود بھی دوسرے ممالک میں جاسوسی کا کوئی نظم قائم کرے تو یہ غلط نہیں ہو گا' چونکہ اس مقصد کے پیچھے ملک کی سلامتی کی مصلحت کارفرما ہوتی ہے مزید یہ کہ کسی خاندان میں آپ اپنی اولاد کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں یا کسی خاندان سے آپ کے بیٹے بیٹی کے لئے رشتہ آیا ہے تو آپ صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے تجسس یا بالفاظ دیگر تحقیق و تفتیش کر سکتے ہیں۔ اسی طریقے سے اس نیت اور ارادے کے بغیر کہ اپنے کسی بھائی کی عزت پر حملہ کرنا مقصود ہو' اگر کسی مسلمان کی کوئی برائی بیان کرنے کی ناگزیر ضرورت پیش آجائے مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آپ کے کسی بھائی کا کہیں رشتہ طے پا رہا ہے اور وہاں کی کوئی غیر مناسب بات آپ کے علم میں ہے تو آپ اپنے اس دینی بھائی کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت اسے وہ بات بتا رہے ہیں تو یہ غیبت شمار نہیں ہو گی۔ مزید برآں جہاں واقعتہً کوئی تمدنی ضرورت ہو تو کسی کی غیر موجودگی میں اس کی کسی بری بات کو جو فی الواقع اس میں ہو بیان کر دینا غیبت کی تعریف سے خارج ہو جائے گا۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوا۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیۡمٌ ○ "اور (ہر حال میں) اللہ کی نافرمانی سے بچو (اگر خطا ہو جائے تو اس کے حضور میں توبہ کرو) یقیناً اللہ نہایت معاف کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے"۔ کسی بندۂ مومن سے خطا ہو جائے تو اس کے لئے صحیح ترین رویّہ یہ ہے کہ وہ اس پر پشیمانی کا اظہار کرے اور اللہ کی جناب میں رجوع کرے اور اس سے توبہ اور معافی کا طالب ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کو نہایت معاف فرمانے والا' توبہ قبول فرمانے والا اور رحم فرمانے والا پائے گا۔

بہرحال ان دو آیات میں چھ نواہی بیان ہوئے۔ تمسخر و استہزاء سے بچنا' عیب جوئی اور عیب چینی سے بچنا' ایک دوسرے کے برے نام رکھنے سے بچنا' سوئے ظن سے اجتناب کرنا' تجسس سے بچنا اور غیبت سے بچنا۔ ان کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو ایک مسلم معاشرے میں افراد کو ایک دوسرے سے کاٹنے یا گروہوں' خاندانوں' کنبوں کے درمیان رشتۂ محبت اور اخوت و مودت کو منقطع کرنے کے لئے جو رخنے پیدا ہو سکتے ہیں' ان سب کا سدِباب ہو جائے گا۔

اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے' اس کے بارے میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

○ ...... سوال...... ڈاکٹر صاحب! آج کے درس سے معلوم ہوا کہ غیبت گناہ کبیرہ ہے تو یہ صرف توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے یا جس کی غیبت کی گئی ہے اس سے معافی طلب کرنے سے معاف ہو گا؟۔

☆ ...... جواب...... یہ گفتگو ان مجالس میں پہلے توبہ کے ضمن میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے درس میں آ چکی ہے کہ ان گناہوں کے معاملے میں جو حقوق اللہ سے متعلق ہوں...... مجرّد پشیمانی اور اس گناہ سے آئندہ اجتناب کے عزمِ مصمّم کے ساتھ توبہ کفایت کر جاتی ہے۔ لیکن حقوق العباد میں اس بندے سے جس کا حق تلف کیا گیا ہے یا جس کی غیبت کی گئی ہے معافی حاصل کی جائے یا اس کے حق میں کثرت سے مغفرت کی دعا کی جائے۔ ویسے شریعت کا منشاء یہ نظر آتا ہے کہ اگر اس بندے نے معاف نہیں کیا ہے تو آخرت میں DEBIT یا CREDIT ہو کر رہے گا۔ جس کی غیبت کی گئی ہے' جس کی عزت پر حملہ کیا گیا ہے یا تو اس کے نامۂ اعمال کی کچھ برائیاں غیبت کرنے والے کے نامۂ اعمال میں درج ہوں گی یا اس کی کچھ نیکیاں اس کو دی جائیں گی۔ مجرّد توبہ سے اس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

○ ...... سوال...... ڈاکٹر صاحب! کیا کوئی شخص اپنے کسی دوست کا کوئی عیب اس سے بیان کر سکتا ہے؟۔

☆ ...... جواب...... یہ بہت عمدہ سوال ہے۔ غیبت کے مقابلے میں تو یہ رویّہ بہت بہتر ہے کہ کسی کی برائی اس کے سامنے بیان کی جائے۔ البتہ یہ خیال رکھنا ہو گا کہ سامنے بیان کرنے سے نیت کیا ہے! اس سے معاملہ کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ اگر نیت اپنے اس دوست کی اصلاح کی ہے تو یہ کارِ ثواب ہے' اس پر اجر ملے گا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس کے لئے بڑا ہمدردانہ انداز ہونا چاہئے۔ دل سوزی کے ساتھ اور خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ بات کی جائے اور یہ کہ لوگوں کے سامنے اسے ذلیل نہ کیا جائے' اس سے تنہائی میں بات کی جائے۔ یہ اس طرزِ عمل کے آداب ہیں اور اگر دوسروں کے سامنے بات کی جا رہی ہے تاکہ اس کی توہین و تذلیل ہو تو یہ لمز ہے۔ یہ اس نہی کی زد میں آ جائے گا جو زیرِ مطالعہ سورۂ مبارکہ کی گیارہویں آیت میں وارد ہوئی کہ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ "اپنے آپ کو

عیب نہ لگاؤ' ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو" ۔ کسی کی توہین و تذلیل کی نیت سے اگر بات ہو گی تو وہ اس کے ذیل میں آئے گی اور اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

حضرات! آج ہم نے چھ نواہی' یعنی وہ چھ باتیں جن کے ارتکاب سے ہمیں روکا گیا ہے سورۃ الحجرات کی دو آیات سے سمجھیں۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ چھ باتیں ہماری مجلسی زندگی میں بہت عام ہیں۔ تمسخر و استہزاء بھی ہے' لمز بھی ہے' تنابز بالالقاب بھی ہے' سوئے ظن بھی ہے' تجسس بھی ہے اور غیبت بھی ہے...... پس ہم قرآن مجید کی جو کچھ تعلیمات و ہدایات ان مجالس میں پڑھ رہے ہیں یا سن رہے ہیں' ہمیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے' ورنہ محض اس پڑھنے اور سننے سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ فائدے کی صورت صرف یہی ہے کہ جو علم بھی ہمیں حاصل ہو اسے ہم اپنی زندگیوں میں جذب کر لیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین۔

و اٰخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بحیثیت
داعیٔ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد
کا ایک پُر تاثیر اور فکر انگیز خطاب

ترتیب و تسوید (شیخ) جمیل الرحمٰن

(۲)

ایمان بالتوحید کے تین لوازم

اسلامی انقلابی نظریہ اور فکر (IDEALOGY) کی بنیاد آخرت نہیں ہے۔ دراصل اسلامی انقلاب کے فکر اور نظریہ کی بنیاد نقطۂ توحید کی تین اہم ترین COROLLARIES ہیں یعنی اس کے وہ پہلے تین لازمی، بدیہی، توضیحی، تصریحی اور منطقی نتائج ہیں جو اجتماعی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے ایک ہے انفرادی توحید، عقیدہ کی توحید ـــ یعنی ایک انسان اپنی انفرادی اور شخصی زندگی میں مُوَحِّد ہو گیا جب اس نے مانا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ کے سوا کوئی رازق نہیں، اللہ کے سوا کوئی مددگار، کوئی کارساز، کوئی دستگیر نہیں، کوئی حاجت روا اللہ کے سوا نہیں، اللہ کے سوا کوئی دعا سننے والا نہیں ـــ اور اس نے ان معتقدات کے مقدرات اور متضمنات کے ساتھ اپنے آپ کو ہمہ تن، ہمہ وجوہ اللہ کے آگے ڈال دیا تو یہ اس کی انفرادی توحید ہے۔

لیکن اسی نقطۂ توحید کی تین اہم ترین تشریحات، توضیحات، مقتضیات متعلق ہیں نظام اجتماعی سے ـــ اور انقلاب نام ہے ہی اجتماعی نظام کے بدلنے کا۔ لہٰذا اگر نقطۂ توحید کے تین اہم ترین بدیہی پہلو اور نتائج پورے شعور و ادراک کے ساتھ سامنے موجود نہ ہوں تو صحیح اسلامی انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہو سکے گا۔

پہلا لازمہ : کامل مساواتِ انسانی

وہ تین COROLLARIES ، وہ تین لازمی و بدیہی پہلو اور نتائج کیا ہیں ! ــــ ان میں سے ایک وہ ہے جو میں ایچ جی ویلز کے حوالہ سے بیان کر چکا ۔ کامل انسانی مساوات (COMPLETE HUMAN EQUALITY) ــــ اچھی طرح مستحضر رہے کہ میں معاشی مساوات نہیں کہہ رہا ۔ کامل انسانی مساوات کہہ رہا ہوں ــ کوئی انسان اعلیٰ نہیں، کوئی انسان ادنیٰ نہیں کوئی انسان بڑھیا نہیں، کوئی گھٹیا نہیں، کوئی انسان اونچا نہیں کوئی نیچا نہیں ۔ تمام انسان مساوی ہیں ــ اس لئے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی اللہ کی مخلوق ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے آدمؑ اور حواؑ کی نسل سے ہے ــ وحدتِ انسانی کا یہ ہے وہ نکتہ جس پر ایچ جی ویلز جیسے دشمنِ رسولؐ (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو خواہی نخواہی TRIBUTE پیش کرنا پڑا ہے، خراجِ تحسین و عقیدت ادا کرنا پڑا ہے ۔ اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں ایسے شاندار الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ انسانی مساوات کی تعبیر و توضیح اس سے زیادہ فصیح و بلیغ اسلوب سے ممکن نہیں ۔ حضورؐ نے قریباً سوا لاکھ صحابہ کرامؓ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

> لیس لعربی علی عجمی فضل ولا لعجمی علی عربی فضل ولا لأسود علی أبیض فضل ولا لأبیض علی اسود فضل إلّا بالتقوی ۔ کلکم بنو آدم و آدم من تراب ۔

(ترجمہ) " نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت حاصل ہے نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت حاصل ہے ۔ بنائے فضیلت صرف تقویٰ ہے ۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے تخلیق ہوئے تھے ۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا :

(ترجمہ) " تمام نسلی اور قبائلی تفاخرات آج میرے ان دونوں قدموں کے تلے ہیں ۔ میں نے آج انہیں کچل کر رکھ دیا ہے ۔"

یہ بہت بڑی انقلابی بات ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی یہ بہت بڑا انقلابی تصور ہے جسے نوعِ انسانی کو دینے والے اور اس انقلابی تصور پر کرۂ ارضی پر پہلی بار ایک معاشرہ

بالفعل قائم کرنے والے ہیں رحمۃ للعالمین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ فداہ ابی و امی۔

موجودہ دنیا کا جائزہ : اس تناظر میں پہلے تو موجودہ دنیا کا ایک طائرانہ جائزہ لیجیے جو تمدنی اعتبار سے بڑی ترقی یافتہ' روشن خیال دنیا کہلاتی ہے اور مغربی ممالک بشمول تبا اعظم امریکہ بزعم خود دنیا کی مہذب ترین' روشن خیال' وسیع النظر' تعلیم یافتہ (CULTURED) ہونے کے مدعی ہیں۔ ان کے ہاتھوں افریقہ کے حبشیوں اور امریکہ کے نیگروں کے ساتھ رنگ و نسل کی بنیاد پر جو نارو امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اور ان پر ظلم و ستم کے جو مسلسل پہاڑ ڈھائے جاتے رہے ہیں' پوری دنیا ان سے واقف ہے۔ پھر ہندوؤں کے یہاں جو ذات پات اور چھوت چھات ہے' وہ تو ہم میں سے اکثر کے تجربہ و مشاہدہ کا معاملہ ہے ۔۔۔ ہم ان کو برا بھلا کہہ کر اپنا دل خوش کر لیتے ہیں ۔ اپنے گریبانوں میں نہیں جھانکتے کہ دین سے دوری کے باعث خود ہمارا اپنا کیا حال ہے! ہم بھی زوال و انحطاط کی ان حدوں تک پہنچ گئے ہیں کہ ہمارے یہاں علاقائی' لسانی' قبائلی اور برادری نیز امیری غریبی اور نسلی امتیازات و تعصبات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے آج سے قریباً ساٹھ ستر سال قبل اس کا گلہ کیا تھا کہ :

یوں تو سید بھی ہو' مرزا بھی ہو' افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

آج پہلے سے بھی دگرگوں حالت ہے ۔ سید زادہ یا زمیندار یا وڈیرہ یا جاگیردار زانی اور شرابی ہو تب بھی اس کے گھٹنے کو ہاتھ لگایا جائے گا ۔ اور اگر کوئی بے چارا چوڑھا چمار ابھی مسلمان ہوا ہے یا پہلے سے مسلمان ہے' وہ سید زادے اور وڈیرے کے ساتھ چارپائی یا صوفہ پر برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ آج ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہمارے نزدیک بھی وجہ اکرام اور شرافت یا نسل ہے' یا مال و دولت ہے یا دنیوی وجاہت ہے یا برادری' قبیلہ' علاقہ اور زبان کا تعلق ہے ۔۔۔ ادھر یہ صورت حال ہے' اُدھر کا معاملہ دیکھئے ۔ توحید کی انقلابی دعوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور تزکیہ کا یہ فیضان ہے کہ ایک حبشی النسل' سیاہ فام' زبان سے شین ادا نہ کر سکے' آزاد کردہ غلام ۔۔۔ اور اسے وہ شخص جو کبھی سب سے بڑا نسلی متعصب (RACIST) تھا ۔۔۔ جان لیجئے کہ مکہ میں بعثت محمدی علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کے وقت عمر ابن الخطاب اور عمرو ابن ہشام (ابوجہل) سے بڑا نسل پرست انسان (RACIST) کوئی اور نہیں تھا ۔ نسل پر فخر کرنے والے' اس پر مرمٹنے والے ۔ اس اعتبار سے یہ دونوں ہم وزن شخصیت تھے ۔ قرشیت کی مفاخرت و محافظت میں یہ دونوں سب سے آگے تھے ۔ اپنے آبائی مشرکانہ دین سے شدید محبت اور عقیدت حتیٰ کہ

عصبیت میں بھی دونوں مساوی تھے۔ ان معاملات میں حضرت عمرؓ بھی ابوجہل سے کم نہیں تھے ـــــ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حضور ان دونوں کا نام پیش فرمایا تھا کہ "اے اللہ! عمر ابن الخطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے ایک کو تو مِرا میری جھولی میں ڈال دے"۔ پھر یہی عمر ابن الخطاب ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی یہ قلب ماہیت ہوئی ہے کہ وہؓ فاروق اعظم اور دوسرے خلیفہ راشد بنے ہیں۔ فضیلت کے لحاظ سے پوری امت میں اُن کا مقام و مرتبہ بالاتفاق دوسرے نمبر کا ہے۔ پہلے مقام و مرتبہ پر صدیق اکبر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فائز ہیں ـــــ اُن عمرؓ کا جو ایام جاہلیت میں کٹر نسل پرست تھے، حال یہ ہے کہ وہ حضرت بلالؓ کا نام نہیں لیتے تھے جب تک "سیدنا" نہ کہہ لیں ـــ سیدنا بلالؓ۔ ہمارے آقا بلالؓ ـــ کہاں بادۂ توحید سے شاد کام ہونے سے پہلے نسل پرستی کی وہ انتہا اور کہاں دولت توحید سے مالامال ہونے کے بعد کی یہ کیفیت!

ط ببیں تفاوتِ رہ از کجا تا بکجا

پس اچھی طرح جان لیجئے کہ نقطۂ توحید کی پہلی ' COROLLARY ' اس کا پہلا بدیہی نتیجہ ہے خالص انسانی مساوات ـــــ قانونی سطح (LEGAL LEVEL) پر جو فرق ہوگا بھی تو اس بنیاد پر کہ کون اللہ کا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیوا ہے اور کون نہیں : هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ " وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن" (التغابن۔ ۲) ـــــ یہ ہے ہماری معاشرت کی اوّلین اساس ـــ نقطۂ توحید کا پہلا بدیہی نتیجہ!!

رہی اکرام و شرافت کی بنیاد! تو وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں کون زیادہ متقی ہے۔ سورۃ الحجرات میں اس اصل الاصول کو نہایت فصاحت، بلاغت اور وضاحت سے بیان کر دیا گیا۔ فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

(ترجمہ) "اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے مختلف خاندان اور قبیلے بنائے ہیں تاکہ باہم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو (نہ کہ تفاخر اور تکبر کے لئے)۔ بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک شریف، عزت دار اور لائق اکرام وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، (اللہ کی نافرمانی سے بچنے اور اس کے احکام پر چلنے والا ہو) بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔ (آیت: ۱۳)

معاشرتی سطح پر نقطۂ توحید کی پہلی "COROLLARY" یہ سامنے آئی کہ پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ قانونی طور پر فرق کفر و اسلام کا ہے اور اسلام میں عزت و شرافت اور اکرام کا معیار اتقیٰ (زیادہ متقی ہونا) ہے۔ غلام زادہ ہو، پیشہ کے اعتبار سے لوہار ہو، جولاہا ہو، کفش دوز ہو، نسل کے اعتبار سے چمار زادہ ہو اگر اس میں تقویٰ زیادہ ہے تو ہمارا پیشوا اور امام بن سکتا ہے۔ اور ہمارے سلف کی تاریخ میں یہ ہوا ہے کہ خلفاء اور شہزادوں نے ایسے حضرات کی جوتیاں سیدھی کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھا ہے اس لئے کہ وہ بزرگ تقویٰ میں، علم میں، تدیّن میں آگے نکل گئے تھے۔

دُوسرا لازمہ: انسانی حاکمیّت کی نفی

نقطۂ توحید کی دوسری 'COROLLARY'، دوسرا بدیہی نتیجہ ہے سیاسی سطح پر — حاکمیتِ مطلقہ اللہ کے سوا کسی کی نہیں۔ سب محکوم ہیں کوئی حاکم نہیں۔ سب بندے ہیں۔ کوئی آقا نہیں۔

؎ تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے

سیاسی اعتبار سے کامل مساوات — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں بڑی پیاری بات فرمائی کہ:

كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا ؎

"بن جاؤ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی"۔

سب بندے ہیں، سب غلام ہیں۔ آقا صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ — رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کل کائنات کا مالک اور آقا — اور اس اعتبار سے اختیارِ مطلق صرف اللہ کا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔

؎ سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

اس کائنات کی بادشاہت و حاکمیتِ مطلقہ کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے واشگاف فرمایا گیا ہے۔ چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں — کہیں فرمایا: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ — کہیں ارشاد ہوتا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ — کہیں فرمایا جاتا ہے: لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ۔

اطاعتِ رسولؐ: اطاعتِ الٰہیہ کا بنیادی پتھر

البتہ دنیا میں، عالمِ واقعہ میں اور تشریعی امور میں حاکمیتِ الٰہیہ پر عمل درآمد ہوتا ہے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ــــــــــ کی صورت میں۔ اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے مطاع اللہ کا رسولؐ ہے ــــ وحیِ اللہ کے احکام، اس کے اوامر و نواہی، اس کی شریعت انسانوں تک پہنچاتا ہے لہٰذا اس کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے: مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی پس یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ اور: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ــــ لیکن اصل الاصول یہی ہے کہ: إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ "حکم کا اختیارِ مطلق اللہ کے سوا کسی کو نہیں"۔ ــــ کوئی نظام ہو! ملوکیت ہو، سول (CIVIL) حکومت ہو، فوجی آمریت ہو۔ اگر "حاکم" اور کوئی دوسرا شخص قانونِ عدالت سے مستثنیٰ قرار پاتا ہو یا کسی شخص یا کسی "حاکم" کا حکم عدالتی معیار سے بالاتر اور عدالت کے حیطۂ اختیار سے باہر قرار دیا گیا ہو تو درحقیقت وہ شخص خدائی کا مدعی ہے۔ جو چاہے فرعون ہو، نمرود ہو، شداد ہو ــــ یہ وہ بدبخت ہیں جنہوں نے زبان سے بھی "خدائی" کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن اگر کوئی بادشاہ، کوئی شہنشاہ، کوئی ڈکٹیٹر، کوئی فوجی آمر چاہے زبان سے خدائی کا مدعی نہ ہو لیکن اگر کوئی "حکمران" قرآن و سنت سے آزاد حاکمیت کا مدعی ہو، خود کو مقتدرِ اعلیٰ سمجھتا ہو تو حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے وہ بھی "خدائی کا مدعی" ہے چاہے وہ زبان سے اس کا دعویٰ نہ کرے۔

آزاد جمہوریت بھی کفر ہے

اسی طرح اگر کسی ملک کے باشندوں کی منتخب کردہ پارلیمنٹ یا اسمبلی 'SOVEREIGNTY' یعنی حاکمیتِ مطلقہ کا دعویٰ (CLAIM) کرتی ہے کہ ہمیں اختیار ہے کہ اکثریت کی آراء سے ہم جو چاہیں قانون بنا دیں، جو چاہیں طے کر دیں تو دراصل یہ بھی اپنی روح (SPIRIT) اور اساس (FOUNDATION) کے اعتبار سے "خدائی کا دعویٰ" ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ایک فرعون، ایک نمرود، ایک شداد ہوتا تھا جو زبان سے بھی خدائی کے دعویدار تھے۔ اب عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے پارلیمنٹ یا اسمبلی نے فرعون، نمرود، شداد کی جگہ لے لی ہے۔ پس یہ

عوامی حاکمیت جس کی تعبیر "جمہوریت" ہے درحقیقت عوامی (POPULAR) فرعونیت ہے۔ یہ عوامی نمرودیت ہے، جس کا نام POPULAR SOVEREIGNTY (عوامی حاکمیت) رکھ دیا گیا ہے۔ اس بات کو بڑے خوبصورت انداز میں علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس سے یوں کہلوایا ہے:

ے ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

یہی کچھ ہوا ہے کہ پہلے کفر کا ایک شخصیت، ایک ذات یا ایک طبقے میں ارتکاز تھا، اب اس کفر کو خدا ناآشنا جمہوریت کا نام دے کر پھیلا دیا گیا ہے ـــ ہے وہی کفر جو پہلے ایک شخص یا ایک طبقہ یا ایک خاندان میں مرتکز ہوتا تھا۔ اب اسے عوام میں بانٹ دیا گیا ہے ـ ہے وہی کفر۔ اقبال کا یہ شعر دوبارہ سنا رہا ہوں۔ چونکہ علامہ نے بڑے بلیغ اسلوب سے اس بات کو واضح کیا ہے:

ے سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ عزّ و جلّ کی ہے، یہ نقطۂ توحید کا دوسرا بدیہی نتیجہ ہے۔

تیسرا لازمہ: ملکیّتِ مطلقہ کی نفی۔ اس کی جگہ تصورِ امانت

نقطۂ توحید کی تیسری "COROLLARY" یعنی اس کا تیسرا بدیہی نتیجہ ہے کہ ملکیّتِ مطلقہ صرف اللہ کی ہے۔ کوئی کسی شے کا مالک نہیں ہے۔ جس کو جو کچھ ملا ہے امانت ہے۔ امانت میں تصرف اصل مالک کی مرضی کے مطابق ہو تو درست ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف تصرف ہے تو خیانت ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اس بات کو نہایت خوبصورت انداز میں ادا کیا ہے:

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالکِ ہر شے خداست

سورۃ الحدید میں اللہ پر اور اس کے رسول پر ـ صلّی اللہ علیہ وسلّم ـ ایمان لانے کی پُرزور دعوت دینے کے بعد فرمایا: وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ ـــ "اور (اللہ کی مرضی کے مطابق اس مال میں سے) خرچ کرو جو اس نے تمہیں دیا ہے اپنا خلیفہ (نائب) بنا کر" ـــ یعنی جو مال تمہارے پاس

ہے تم اس کے خالق و مالک نہیں بلکہ تم مُستخلَف ہو۔ تم صرف اس کے امین ہو۔ لہٰذا اس کے اصل مالک یعنی اللہ کی مرضی کے مطابق اس میں تصرّف کا تمہیں اختیار ہے ۔۔۔ اسی سورۂ مبارکہ میں ارشاد ہوا: وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط "آسمان اور زمین (سب کا) وارث اللہ ہی ہے" ۔۔۔ تم جو مال و اسباب کو اپنی ملکیتِ مطلقہ سمجھ بیٹھے ہو تو یہ تمہارے نفس کا فریب ہے۔ مجازی اور عارضی طور پر تم مالک ہو لیکن بہرحال تم کو ایک دن مرنا ہے اور سب ساز و سامان یہیں چھوڑنا ہے۔ پس تم نے اس کا حقیقی مالک خود کو کیسے سمجھ لیا؟ تمہارا یہ سمجھ بیٹھنا سراسر فریب ہے، دھوکہ ہے، بہت مہلک مغالطہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر ان الفاظِ مبارکہ کا اعادہ ہوا ہے کہ: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط۔ شاید اللہ تعالیٰ کی کوئی دوسری شان اتنی مرتبہ اور اتنی تکرار کے ساتھ نہ آئی ہو ۔۔ ان الفاظ پر گہرائی میں اتر کر غور و تدبّر کیجیے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہو جائے گی کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہے۔ سب کا مالک حقیقی صرف اس کی ذات تبارک و تعالیٰ ہے۔ اس اسلوبِ بیان نے کائنات کی ہر شے کا احاطہ کر لیا۔ انسان بھی اس میں شامل ہے ۔۔ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ ملا ہے، چاہے وہ اموال و اسباب ہوں، صلاحیتیں اور توانائیاں ہوں ان سب کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ انسان کے پاس یہ سب امانت ہیں۔ انسان ان کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ اور مال و دولت کا حصول بھی اسیؐ کی مرضی کے مطابق اور جائز طریق سے ہو۔ پھر اس پر تصرّف بھی اسیؐ کی مرضی کے مطابق ہو اور صرف جائز مدات پر ہو تو یہی حق ہے، یہی صحیح ہے، یہی درست ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ دلیل لائے کہ یہ میری چیز ہے، میں اس کا مالک ہوں، میں جیسے چاہوں استعمال کروں ۔۔ تو یہ قارونیت ہے ۔۔ جیسے علی الاطلاق حاکمیت کا دعویٰ نمرودیت و فرعونیت ہے، ویسے ہی ملکیتِ مطلقہ کا دعویٰ قارونیت ہے ۔۔ قرآن حکیم میں 'قارون' کے کردار کا ذکر کیوں آیا! اس سے جب کہا گیا کہ اللہ نے تجھے اتنی دولت دی ہے، اس سے خیر کے کچھ کام کرو، بھلائی کے کاموں میں اسے خرچ کرو تو اس نے نہایت تکبر سے جواب دیا: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ط ۔۔ "یہ مال مجھے اپنے علم کے طفیل حاصل ہوا ہے" ۔۔ میری ذہانت، میری فطانت، میری سوچ، میری منصوبہ بندی، میری محنت کا یہ نتیجہ اور ثمرہ ہے۔ یہ میرا مال ہے، میں جیسے چاہوں خرچ کروں۔ مجھے نصیحت کرنے والے تم کون ہوتے ہو! ۔۔ (خیال رہے کہ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا) ۔۔ پس جان لیجیے کہ یہی ذہنیت قارونیت ہے۔

یہاں تک کی گفتگو کا خلاصہ: وقت کم ہے لہٰذا میں تفصیلات سے صرفِ نظر کر رہا ہوں۔ ابھی

کچھ میں نے عرض کیا ہے اسے تمہیداً عرض کیا ہے اور میں نے آج کے موضوع پر قدرے مفصل گفتگو کے لئے یہ تین اصول، تین اساسات بیان کی ہیں کہ ہمارے دین کی اصل، اس کی جڑ، اس کی بنیاد ایمان بالتوحید ہے۔ لہٰذا انقلابی عمل نقطۂ توحید اور اس کی تین فروع - تین بدیہی نتائج و ثمرات سے شروع ہوگا۔ یعنی کامل انسانی مساوات نمبر ایک ——— حاکمیتِ انسانی کی کامل نفی، اس کی جگہ تصوّرِ خلافت نمبر دو ——— اور ذاتی اور مطلق ملکیت کے بجائے تصوّرِ امانت نمبر تین ——— نبوی دعوت کا آغاز انذارِ آخرت سے ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی دعوت کامل ایمان بالتوحید اور نقطۂ توحید کی ان تشریحات سے شروع ہوگا جن کو میں نے مختصراً بیان کیا ہے۔

تکبیرِ ربّ ═ انقلابِ نبوی ؐ کا اساسی نعرہ

میں نے آغاز میں سورۃ المدّثّر کی جو تین آیات تلاوت کی تھیں ان میں سے تیسری آیت کو ذہن میں لائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے : وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۔ تکبیر سے مراد زبان سے "اللّٰہُ اَکْبَرْ" کہنا بھی ہے۔ لیکن تکبیر کے لغوی معنی ہیں "کسی چیز کو بڑا کرنا"۔ اس اعتبار سے اس آیت مبارکہ کا معنی و مفہوم ہوگا کہ (اے نبی ؐ) اپنے رب کی کبریائی کا اعلان بھی کرو اور اس کو بالفعل قائم و نافذ بھی کرو۔ جس طرح اللہ کی تکوینی حکومت قائم و دائم ہے۔ اسی طرح دنیا میں انسان کو ارادے اور عمل کی جو آزادی و خود مختاری حاصل ہے اُسے انسان اپنی مرضی سے اس ہدایت کے تابع کردے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے توسط سے بھیجی ہے جس کی آخری کڑی ہیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جس ہدایت کا تاقیامِ قیامت مجموعہ ہے قرآنِ حکیم اور سنّتِ رسول اللہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ——— اس دنیا کے تشریعی نظام میں اللہ تعالیٰ کو SOVEREIGN تسلیم کیا جائے۔ یہ ہے تکبیرِ ربّ کا مفہوم اور یہ بھی دراصل توحید کی انقلابی دعوت ہی کی ایک تعبیر ہے۔

انقلابِ محمدی ؐ کے چھ مراحل ═ تین تمہیدی اور تین تکمیلی

اب اس مسئلہ کی طرف آئیے کہ اس انقلابی عمل کے مراحل کیا ہوں گے! ۔ عملی اقدام کیا ہوگا! اس دعوت کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے مراتب و مدارج کیا ہوں گے!! سیرتِ مطہّرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے میں نے چھ مراحل اخذ کئے ہیں۔ جن میں سے تین مراحل میرے نزدیک ابتدائی

یا تمہیدی ہیں اور تین مراحل تکمیلی ۔ میں پہلے تین ابتدائی یا تمہیدی مراحل آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں
ان کو انگلیوں پر گن کر ذہن نشین کر لیجئے ۔

پہلا مرحلہ = دعوت و تبلیغ

اس کا پہلا مرحلہ ہے دعوت و تبلیغ ــــ نظریۂ توحید کی نشرو اشاعت ــــ دعوت و تبلیغ ایک ہی کام کے دو رُخ ہیں ۔ دعوت کا معنی و مفہوم ہے کسی کام کی طرف بُلانا، پُکارنا ــــ اور تبلیغ کا معنی و مفہوم ہے کسی پیغام کو، کسی دعوت کو دوسروں تک پہنچانا ــــ انہی دونوں کاموں کے لئے دلائل و براہین پیش کرنا ۔ لوگوں کے اذہان و قلوب، فکر و نظر کو مطمئن کرنا ۔ فطرتِ انسانی میں معرفتِ رب کے جو حقائق اور بدیہیات مضمر ہیں ان کو شعور کی سطح پر لانا ۔ اس دعوت و تبلیغ کا اصل آلہ ہے قرآن مجید، فرقان حمید جو اللہ کا پیغام ہے انسانوں کی طرف ۔ جو انسان کو ضلالت و گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر نورِ ہدایت کی طرف لاتا ہے ۔ جو توحید کی انقلابی دعوت کی اساسات کو مبرہن کرتا ہے اور ان کی حقانیت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کرتا ہے : هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ

دوسرا مرحلہ = تنظیم

اس کا دوسرا مرحلہ ہے تنظیم ــــ جو لوگ توحید کی انقلابی دعوت کو قبول کریں ۔ قرآن مجید پر ایمان لے آئیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ ربّ السمٰوٰت والارض کا انسانوں کے نام ہدایت کا پیغام ہے ــــ اس پیغام کو لانے والے کی تصدیق کریں کہ لاریب وہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور اس بات پر یقین رکھیں کہ معاد حق ہے، آخرت حق ہے، بعث بعد الموت حق ہے ۔ حشر و نشر حق ہے ۔ تمام انسان حیاتِ دنیوی کے محاسبہ کے لئے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے ۔ وہ دن شدنی ہے کہ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ــــ تو ان لوگوں کو منظم (ORGANISED) کیا جائے ۔ انہیں بنیانِ مرصوص بنایا جائے چونکہ انقلاب تنظیم کے بغیر آ ہی نہیں سکتا ۔ انقلابی تنظیم کے بغیر فکر پھیل سکتا ہے ۔ وہ خود رو گھاس کی طرح پروان بھی چڑھ سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس روئیدگی میں کوئی نظم نہیں ہوگا ۔ کیفیت یہ ہوگی کہ زمین کہیں اونچی، کہیں نیچی اور کہیں خالی نظر آئے گی ــــ لیکن انقلاب ایک منظم جدوجہد کے ذریعے سے اور اس کے نتیجہ میں آتا ہے ۔ لہٰذا اس کے لئے ایک ایسی جماعت

ہونی ضروری ہے جس کا ڈسپلن (DISCIPLINE) مثالی ہو اور مثالی ڈسپلن کے لئے دنیا میں ایک ہی معیار ہمارے سامنے ہیں جس کو ہم "فوج کا ڈسپلن" (ARMY DISCIPLINE) کے نام سے جانتے ہیں فوجی ڈسپلن کے متعلق یہ بات ایک مسلمہ کے طور پر معروف و مشہور ہے کہ فوج کے ہر سپاہی پر صرف سننے سے حکم کی تعمیل لازم ہو جاتی ہے۔ ایک کمانڈر کا حکم جیسے ہی کانوں تک پہنچ جائے اس حکم کو بجالانا فوجی ڈسپلن کا لازمی تقاضا ہے۔ کوئی حیل و حجت نہیں ہو سکتی۔ کوئی چیز بھی اس میں مداخلت (INTERVENE) نہیں کر سکے گی! — کسی حکم پر کوئی اعتراض وارد نہیں کیا جا سکے گا — یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ اس حکم کی مصلحت اور غرض و غایت کیا ہے!!

البتہ انجمنوں اور اداروں کو اس طور پر چلایا جا سکتا ہے کہ وابستہ لوگوں کی رائے معلوم کی جائے اور اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلے ہوں اور ان پر عمل درآمد ہو۔ سیاسی جماعتیں اور جمعیتیں بھی اس طریق پر چل سکتی ہیں بلکہ چلنی چاہئیں — لیکن دو کاموں میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان میں ان چیزوں کو ACCOMODATE نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کسی انقلابی جماعت میں اور دوسرے فوج میں۔ — فوج کے لئے تو صحیح ترین معیار وہ ہے جس کا نقشہ انگریزی کی مشہور نظم "CHARGE OF THE LIGHT BRIGADE" میں کھینچا گیا ہے۔ فوج کے ایک دستے کو حملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور سب کو نظر آرہا ہے کہ کوئی بڑی غلطی ہو گئی ہے لیکن دستہ حملہ کرتا ہے اور پورا دستہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ نظم سنیئے:

"SOME ONE HAS BLUNDER;
CANNONS TO RIGHT OF THEM;
CANNONS TO LEFT OF THEM;
CANNONS TO FRONT OF THEM;
CANNONS BEHIND THEM"

ہر چہار طرف سے توپوں کے دہانے کھلے ہوئے ہیں۔ چہار سو سے موت ٹپک رہی ہے لیکن چونکہ حملہ کا حکم مل گیا ہے لہٰذا CHARGE کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ڈسپلن کا تقاضا یہی ہے — نظم کے آخر میں آتا ہے کہ:

"THEIR'S NOT TO REASON WHY?
THEIR'S BUT TO DO AND DIE."

فوج میں "کیوں اور کیسے؟" کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہ ہے کہ "سنو اور اطاعت کرو" — 'LISTEN AND OBEY'

قرآن وحدیث اور سمع وطاعت : آپ غور کیجئے کہ قرآن مجید میں کتنی بار حکم آیا ہے کہ : فَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا ! "پس سنو اور اطاعت کرو" اور اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ــ "جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی" ــ شبِ معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ بقرہ کی جن دو آیات کا تحفہ عطا ہوا، ان میں مومنینِ صادقین کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ : وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ " اور انہوں نے کہا : ہم نے حکم سنا اور اطاعت کی ۔ اے رب ہمارے، ہم تجھ سے مغفرت کے طلب گار ہیں اور ہمیں آخر کار تیری ہی طرف پلٹنا ہے" ــ

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس حدیث کو ہم نے بہت عام کیا ہے جس کو امام ترمذیؒ اور امام احمدؒ ابن حنبل نے اپنی اپنی کتبِ احادیث میں روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ ان میں سے پہلے تین حکم آج کی گفتگو سے متعلق ہیں ۔ حضورؐ نے حکم دیا 'جماعت' کا اور 'سمع وطاعت' کا یعنی انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے جماعت یعنی تنظیم لازم ہے ــ اور یہ جماعت ہو 'سمع وطاعت' والی ــ اس کا حال یہ ہو کہ 'LISTEN AND OBEY' ــ "سنو اور اطاعت کرو" ــ یہ ہے وہ تنظیم جو جنابِ محمد نے قائم فرمائی ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ــ

سمع واطاعت کے دو درجے

اس 'سمع وطاعت' کے بھی دو درجے ہیں ۔ اُن کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے ــ

پہلا درجہ : رسول اللہ کی اطاعتِ مطلقہ : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو صاف تھا ۔ چونکہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور جس نے حضورؐ کو اللہ کا رسول مان لیا وہ تو بالکلیہ مطیع ہو گیا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنا کہ آپؐ یہ حکم کیوں دے رہے ہیں ! ایمان کی نفی کر دے گا ۔ آپؐ کے متعلق تو یہ تسلیم کر لیا گیا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، اس کے نمائندے ہیں : وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ــ لہٰذا کسی چون وچرا کی گنجائش ہے ہی نہیں ۔ چون وچرا کی اور ایمان کے لالے پڑے ــ ادھر نبی اور رسولؐ ہیں اور ادھر امتی ہیں ــ امتی ہونے کے رشتہ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سنیں اور اطاعت کریں : وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۔ "کسی مرد مومن اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں

ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جب حکم آجائے پھر بھی وہ سوچیں کہ ان معاملات میں انہیں بھی کوئی اختیار حاصل ہے کہ نہیں!" ـــــ یہ بات ایمان کے بالکل منافی ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت غیر مشروط طور پر اور بلا چون وچرا کرنی ایمان کا لازمہ ہے: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ "اور جو کچھ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں دیں اسے قبول کرو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں اس سے رُک جاؤ" ـــــ اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح حکم آگیا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ "(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کے رب کی قسم، یہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ لوگ اپنے ہر باہمی اختلاف میں آپ کو حَکَم نہ مان لیں، پھر جو بھی فیصلہ آپؐ کر دیں اُسے بے چون وچرا اور خوش دلی سے تسلیم نہ کریں، دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں" ـــــ یہ حکم اطاعتِ رسولؐ کے ضمن میں نصِ قطعی ہے ـــــ پس معلوم ہوا کہ ایمان مرکب ہے' اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا ـــــ یہ دونوں اطاعتیں لازم وملزوم ہیں، لابُدَّ منہٗ ہیں، لاینفک ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جاسکتا ـــــ تمدنی زندگی میں جتنی بھی اور اطاعتیں ہوں گی وہ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر اور ان کے تحت ہوں گی۔ جیسے اولوالامر کی اطاعت، والدین کی اطاعت، اساتذہ کی اطاعت وقس علیٰ ہذا۔ پس معلوم ہوا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مطلق ہے، غیر مشروط ہے، اور اس کی اصل بنیاد ایمان ہے۔

نظامِ بیعت: لیکن سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ سے یہ بات بھی بہت واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر مختلف کاموں کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بیعتیں لی ہیں۔ ان مختلف بیعتوں میں سے ایک بیعت کا بڑے مہتم بالشان طریق پر قرآن مجید میں بھی ذکر آیا ہے اور وہ بیعت، بیعتِ رضوان کے نام سے مشہور ومعروف ہے: لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ "بالتحقیق اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جنہوں نے (اے نبی) آپؐ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کی تھی" ـــــ یہ وہ بیعت ہے جو حدیبیہ کے مقام پر صلح سے قبل مکہ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کئے جانے کی خبر ملنے پر حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے کے لئے حضورؐ نے

صحابہ کرامؓ سے لی تھی۔ اسی بیعت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا، کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ — "(اے نبیؐ) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ تھا" — میں یہ بات دعوے سے کہا کرتا ہوں کہ جو چودہ سو صحابہ کرامؓ مدینہ سے حضورؐ کی معیت میں حدیبیہ پہنچے تھے، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ اگر نبی اکرمؐ بیعت نہ لیتے — جسے احادیث میں بیعت علی الموت بھی کہا گیا ہے — تو وہ پیٹھ دکھا دیتا — ! وہاں اُلٹا معاملہ تھا۔ اس موقع پر جو صلح ہوئی ہے اُسے صحابہ کرامؓ کی طبیعت گوارا نہیں کر رہی تھی۔ اُن کے خون کھول رہے تھے، ان کی تلواریں نیام سے نکلنے کے لئے بے تاب تھیں۔ اُن کے دل ذوقِ شہادت سے مچل رہے تھے۔

قابلِ غور بات: اس بیعت کے ضمن میں انتہائی قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اس موقع پر بیعت کیوں لی! صحابہ کرامؓ کے تو ایمان کا تقاضا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابرو کے اشارے پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیں — میرا استنباط یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیعت اس لئے لی کہ ما بعد والوں کے لئے اپنی سنّت چھوڑ جائیں۔

حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے مختلف کاموں کے لئے جو مختلف بیعتیں لی ہیں، ان کی حکمت بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اجتماعیت کے قیام کے لئے بیعت کی سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مسلمانوں کے سامنے موجود رہے۔ جب کبھی ایسا وقت آجائے کہ اسلام بحیثیتِ دین قائم و نافذ نہ رہے۔ یعنی مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی اور ان کی حکومت میں دین کے احکام، دین کے اوامر و نواہی، دین کی حدود و تعزیرات اور ایمان باللہ توحید کے تین لوازم، تین COROLLARIES، تین تشریحات یعنی انسانی سطح پر کامل مساوات — انسان کی حاکمیتِ مطلقہ کی کامل نفی، اس کی جگہ نظریۂ خلافت اور ملکیتِ مطلقہ کی جگہ نظریۂ امانت — فی الواقع اور بالقوہ رائج اور نافذ نہ ہوں۔ تو جو لوگ اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائگی کے لئے کمربستہ ہوں، ان کی ہیئتِ اجتماعیہ بیعت کے اصول پر وجود میں آئے اور قائم ہو۔

ایک متفق علیہ حدیث: اپنے اس استنباط کو مؤکد کرنے کے لئے میں آپ کے سامنے ایک متفق علیہ حدیث پیش کرتا ہوں — اہل سُنّت کا یہ متفقہ مؤقف ہے کہ جس حدیث پر ہمارے چوٹی کے دو محدثین یعنی امام بخاری اور امام مسلم رحمہا اللہ کا اتفاق ہو، احادیث میں اس سے بلند کسی حدیث کے پختہ ہونے کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ یقینی ہونے کے اعتبار سے ایسی حدیث قرآن مجید کے

ہم وزن مانی جاتی ہے۔ صحیح بخاری وصحیح مسلم میں حضرتِ عبادۃ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت آئی ہے:

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ: قَالَ بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلَى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلَى أَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ وَعَلَى أَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ أَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔

"انہوں نے (حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے) کہا۔ ہم نے بیعت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر کہ سنیں گے اور مانیں گے چاہے تنگی ہو چاہے آسانی (مشکل ہو یا آسان) چاہے (طبیعت میں) نشاط و انبساط ہو چاہے طبیعت پر جبر کرنا پڑے۔ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے اور اس بات پر کہ جو لوگ صاحبِ امر ہوں گے ہم ان سے کبھی جھگڑا نہیں کریں گے اور اس بات پر کہ ہم اللہ کے معاملہ میں حق کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں اور ہم ہرگز نہیں ڈریں گے کسی ملامت گر کی ملامت سے"۔

یہ بیعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اہلِ یثرب (مدینہ والوں) سے لی تھی جو وادیٔ عقبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر مشرف باسلام ہو کر دولتِ ایمان سے شادکام ہوتے تھے۔ سیرتِ مطہرہ میں اسے "بیعتِ عقبہ ثانیہ" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے — میں کہا کرتا ہوں کہ اس بیعت کے الفاظ میں اس ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے پورا دستور و آئین موجود ہے جو اقامتِ دین، تکبیرِ ربّ، اظہارِ دین الحق اور اعلائے کلمۃ اللہ یعنی موجودہ دور کی اصطلاح کے مطابق اسلامی انقلاب کے لئے وجود میں آئے اور قائم ہو۔

غزوۂ احزاب میں صحابہؓ کا ایک ترانہ

آپ کو معلوم ہے کہ ۵ھ میں قریش نے عرب کے مختلف قبائل اور یہود کے بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ کے لئے کوچ کیا تھا تاکہ شمعِ توحید کو بجھا دیں — توحید کی انقلابی دعوت و تبلیغ اور جہاد و قتال کی تحریک کا خاتمہ کر دیں۔ عرب کی تاریخ میں اتنا بڑا لشکر شاید ہی کبھی مجتمع ہوا ہو۔ اس میں اس وقت کے قریباً تمام ہی جنگجو قبائل شامل تھے۔ قریش اور یہود تو آتشِ انتقام سے بھی جل رہے تھے۔ ان میں بڑا جوش و خروش تھا — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خبر ملی کہ یہ لشکرِ جرار مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آ رہا ہے تو آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مدینہ کے دفاع کے لئے اُس رُخ پر کہ جس طرف کوئی قدرتی

آڑ نہیں تھی اور جس سمت سے اس لشکر کے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا قوی امکان تھا، خندق کھودنے کا فیصلہ فرمایا۔ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا میرا جو بھی حقیر مطالعہ ہے اس کی بنیاد پر میری رائے یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ذاتی طور پر سب سے سخت دن "یوم طائف" گزرا ہے اور اہلِ ایمان پر بحیثیت جماعت سب سے سخت اور شدید ایام "غزوۂ احزاب" کے گزرے ہیں۔ سخت سردی کا موسم تھا اور مدینہ کی زمین سخت سنگلاخ تھی۔ اس موقع پر جب صحابہ کرامؓ نبی اکرمؐ کی قیادت میں خندق کھود رہے تھے اور کدالیں چلا رہے تھے تو حال یہ تھا کہ کئی کئی دن فاقے میں گزرتے تھے۔ پیٹوں پر پتھر بندھے ہوتے تھے کہ خالی پیٹ کے باعث کہیں کمر دُہری نہ ہو جائے۔ اس شدید مشقت کو آسان کرنے کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جرأتِ مومنانہ اور ہمتِ مردانہ کے ساتھ کدالیں چلاتے وقت کورس کے انداز میں کہتے جاتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃ

"اے اللہ! آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے، آخرت کا
عیش اصل عیش ہے۔"

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں فرماتے تھے:

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ

"(اے اللہ) پس مغفرت اور بخشش فرما دے انصار و مہاجرین
کی (اس) جماعت کی۔"

صحابہ کرامؓ ترانہ کے طور پر یہ شعر بھی کثرت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی 'صحیح بخاری' میں روایت کرکے اُسے ہمیشہ ہمیش کے لئے محفوظ کر دیا ہے کہ:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

"ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے بیعت کی ہے محمد (صلی اللہ
علیہ وسلم) سے کہ ہم جہاد کرتے رہیں گے ہمیشہ ہمیش (یعنی
جب تک جسم و جان کا رشتہ باقی ہے)۔"

یہ دوسرا مرحلہ ہے تنظیم۔ یہ ہے حزب اللہ کی شان۔ یہ ہے صحابہ کرامؓ کی جماعت کی اعلیٰ ترین خصوصیت جس کی بنیاد بیعت ہے۔

داعیٔ انقلاب کا تاریخی ارشاد: آگے بڑھنے سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ تاریخی ارشاد بھی سن لیجیے جو حضورؐ نے ستائیس دن کے محاصرے کے بعد اس لشکرِ جرّار کے اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت کے باعث ناکام و خاسر ہو کر منتشر ہونے کے بعد فرمایا تھا کہ:

لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ

"اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے!"

میرے نزدیک سورۃ الصف اسی موقع پر نازل ہوئی ہے جس میں یہ آیت مبارکہ موجود ہے:

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"اور (اے مسلمانو!) ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے یعنی اللہ کی مدد — تو وہ آیا چاہتی ہے اور اب فتح دور نہیں ہے (وہ تمہارے قدموں کو چومنے والی ہے) اور (اے نبیؐ!) اہلِ ایمان کو بشارت سنا دیجیے!"

ایک اہم اصول: تنظیم کے متعلق یہ اہم اصول بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ انقلاب کے لئے سمع و طاعت والی تنظیم لازم ہے۔ لابدّ منہ ہے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ ہجوم (MOB) یا متحدہ محاذ یا قومی اتحاد یا کسی سیاسی جماعت یا جماعتوں کی کسی انتخابی مہم سے اسلامی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ ان ذرائع سے یا تو منفی کام ہو سکتے ہیں، جس پر پاکستان کی ماضی قریب کی تاریخ شاہد ہے۔ یا حکمرانوں کے ہاتھ بدل سکتے ہیں۔ کاروبارِ حکومت میں کچھ اصلاحات بھی کی جا سکتی ہیں۔ لیکن جس چیز کا نام اسلامی انقلاب ہے جو رائج الوقت نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر توحید پر مبنی نظامِ عدل و قسط قائم و نافذ کرتا ہے، وہ برپا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو ایسی تنظیم لازم ہے جو اقامتِ دین کے لئے سمع و طاعت کی بیعت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔

سمع و طاعت کا دوسرا درجہ: البتہ ایک اہم فرق کو ذہن نشین کر لیجئے۔ وہ یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مطلق ہے۔ اس لئے کہ رسول ہی تو درحقیقت اللہ کا نمائندہ ہے۔ لہٰذا رسولؐ کی اطاعت غیر مشروط ہے۔ البتہ بعد کے دور میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی تنظیم یا جماعت کے امیر کی اطاعت مشروط ہو گی بالمعروف کے ضابطہ اور قاعدہ کے ساتھ — مقیّد ہو گی الکتٰب والسنّۃ سے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کا جو دائرہ ہے اس کے اندر اندر ہر حکم کی اطاعت ہو گی۔ اس سے باہر ہو تو "لا سمعَ ولا طاعۃَ" ہے۔ اس کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اٹل ضابطہ و قانون طے فرما دیا ہے کہ:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ

"کسی مخلوق کی (ایسی) اطاعت نہیں ہوگی جس سے خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔"

صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اس سے مستثنیٰ ہے چونکہ فرمانِ الٰہی ہے جو میں شاید پہلے بھی آپ حضرات کو سنا چکا ہوں کہ: وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔

تیسرا مرحلہ ــــ تربیت و تزکیہ

اس کا تیسرا مرحلہ ہے تربیت و تزکیہ ـــ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے جو اس کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے:

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اسی بات کو اقبال کے مرشدِ معنوی اکبر الٰہ آبادی نے نہایت سادہ لیکن دل نشین انداز میں یوں ادا کیا ہے

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

آپ اگر ریت اور بالو کے گولے بنا کر شیشے پر ماریں گے تو شیشے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ریت بکھر جائے گی اگولا کھیل کھیل ہو جائے گا۔ اسی ریت کو آگ میں تپا کر اس کا روڑا بنا کر شیشے پر ماریئے تو کچھ نہ کچھ نتیجہ برآمد ہوگا۔ پختہ نہ ہو تو بے کار ہے۔ اسی لفظ پختہ کو اقبال فارسی کے ایک شعر میں لائے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے چوٹی کے اشعار میں سے ایک ہے ـــ علامہ مرحوم نے 'اسلامی انقلاب' کے فلسفے کو دو مصرعوں میں سمو دیا ہے۔

با نشۂ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

پہلے ریاضت ہے، مشقت ہے۔ تعبدی امور کی بجا آوری ہے۔ اپنا تزکیہ ہے۔ اپنی تربیت ہے۔ روحانی اور اخلاقی منازل کو طے کرنا ہے ـــ توحید پر ایمان، رسالت پر ایمان اور بعث بعد الموت پر ایمان کو دل و دماغ، فکر و نظر اور شعور و ادراک کی سطحوں پر نقش کالحجر بنانا ہے۔ قرآن حکیم کو اپنا امام و ہادی اور سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اپنا راہ نما و رہبر قرار دینا ہے۔ ان تمام کاموں کو علامہ نے پہلے مصرعے میں 'نشۂ درویشی' سے تعبیر کیا ـــ دوسرے مرحلے میں انقلاب کا فلسفہ

بیان کرتے ہیں کہ ان مراحل سے گزر کر جب پختہ ہو جاؤ تو اپنے آپ کو 'سلطنتِ جم' پر دے مارو۔ یہاں 'سلطنتِ جم' سے علامہ کی مراد ہے ہر نظامِ طاغوت اور ہر نظامِ باطل ۔۔۔ علامہ اس شعر کی وساطت سے مسلمانوں کو سبق دے رہے ہیں کہ ذاتی تربیت، ذاتی تزکیہ، ذاتی اصلاح کا اصل مقصود و مطلوب اس کا حقیقی ہدف ہر طاغوتی اور ہر باطل قوت اور نظام سے تصادم اور ٹکراؤ ہے ۔۔۔ یہ نہ ہو کہ ہمیشہ کے لئے خانقاہی نظام ہی وجود میں آجائے ۔ اسی پر کفایت کرلی جائے ۔ کسی خانقاہ میں بیٹھے اپنے آپ کو رگڑتے اور مانجھتے ہی رہو اور یہ بات یاد ہی نہ رہے کہ میدان میں آکر باطل کو للکارنا ہے، طاغوت سے پنجہ آزمائی کرنی ہے، دینِ حق کے غلبہ کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہے ۔ یہ وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کے مقام پر ایک بندے کو فائز کرتا ہے : اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ ۔۔۔ علامہ نے اسی بات کو یوں ادا کیا ہے :

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

تزکیہ و تربیت کا اصل مقصود ہے کہ خود کو تیار کرکے آگے کام کرنا ہے ۔ یہ قوت فراہم کرکے اسلامی انقلاب لانا ہے ۔۔۔ بغیر تیاری کے ٹکرانا بھی غلط اور ساری عمر تیاری میں لگے رہنا، اگلا قدم نہ اٹھانا بلکہ اس کا نگاہوں سے اوجھل ہو جانا بھی غلط ۔ دونوں کام یکساں غلط ۔ جیسے وضو ہی کرتے رہ جانا ۔ نماز پڑھنے کا موقع ہی نہ آنے دینا ۔ ۔۔۔ اسی کو اقبال نے مثبت انداز میں کہا ہے اس شعر میں جو ابھی میں نے آپ کو سنایا کہ ؎

بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن ۔۔۔ چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

نوعیتِ تربیت : اس تربیت کے بارے میں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ ہر انقلاب کی مناسبت سے تربیت کی ضرورت ہوگی ۔ تربیت کی نوعیت اس نظام کے اعتبار سے معین ہوگی جو آپ قائم کرنا چاہتے ہیں ۔ اگر اشتراکی انقلاب لانا ہو تو روحانی اور اخلاقی تربیت میں وقت ضائع کرنا حماقت قرار پائے گی چونکہ اس انقلاب میں روحانی و اخلاقی اقدار (VALUES) سرے سے موجود ہی نہیں ہیں لہٰذا اشتراکی انقلاب کے علمبرداروں کو تقوے کا خوگر بنانا اور ان سے وہ ریاضتیں کرانا جو اسلامی انقلاب کیلئے ناگزیر اور لابدمنہ ہیں، اس انقلاب کے فلسفے کی رُو سے وقت کا زیاں ہے ۔ ان کو یہ بتانا کہ عصمت و عفت اور پاک دامنی ایک اعلیٰ و ارفع قدر ہے، حماقت ہے ۔ ان کا نظریہ تو یہ ہے کہ کامریڈ مرد اور کامریڈ عورتیں جس طرح چاہیں اس جذبے کی تسکین کریں ۔ بلکہ شادی بیاہ تو مصیبت ہوگی،

گھر گرہستی تو وبالِ جان ہے۔ اس میں پھنس گئے تو انقلابی کہاں رہ جائیں گے! لہٰذا وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ البتہ انقلاب آجائے تو کسی ایک سے وابستہ ہونے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے ___ یہ بات پلے باندھ لیجئے کہ ہر کام کا اپنا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ یہ بالکل سیدھی سادی منطق ہے۔ اس لئے اشتراکی کارکنوں کے لئے روحانیت اور اخلاق ایک بے قدر شے ہے۔ ان کے نزدیک اس کے معیارات بدلتے رہتے ہیں اور ان کے نزدیک ان کو مستقل اقدار قرار دینا بورژوائی ہتھکنڈا اور سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ جبکہ اسلام میں INSTITUTION OF MARRIAGE کو "اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ" قرار دیا گیا ہے۔ اور یہاں تک فرما دیا گیا ہے : وَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔ "اور جس کسی کو میری سنّت میں سے کوئی سنّت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں" (فرمانِ رسول)۔ اگر روحانیت، اخلاق اور عصمت کا معاملہ نہیں ہے تو اسلامی انقلاب کی طرف پیش قدمی کا کیا سوال!

مطلوبہ اوصاف : اسلامی انقلاب کے کارکنوں میں تو وہ کیفیت مطلوب ہے جس کی مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں تصویر کشی کی تھی ایرانی جاسوسوں نے ___ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے دورِ خلافت میں جب ایران کے ساتھ جنگیں ہو رہی تھیں تو رستم سپہ سالارِ افواجِ ایرانی نے کچھ جاسوس بھیجے کہ ذرا ان مسلمانوں کی فوج کے حالات دیکھ کر آؤ کہ ان کے حوصلوں کی کیفیت کیا ہے! ان جاسوسوں نے آکر جو رپورٹ دی ہے اس کا ایک جملہ میری پوری بات کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ جاسوسوں نے مسلمانوں کی فوج کا نقشہ ان الفاظ میں بیان کیا :

هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ

"(وہ عجیب لوگ ہیں) وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار ہیں"۔

دنیا میں پہلے راہب بھی تھے، شہسوار بھی تھے۔ لیکن دونوں علاحدہ علاحدہ تھے جو رات کا راہب وہ دن میں بھی راہب ___ اور جو دن میں شہسوار ہے اس کی رات کسی اور رنگ میں گزرتی تھی۔ جہاں کسی فوج کا پڑاؤ ہو جائے وہاں آس پاس کی کسی عورت کی عصمت محفوظ رہ سکتی تھی؟ وہاں شراب نوشیوں، عیاشیوں اور رنگ رلیوں کے سوا اور کسی چیز کا بازار گرم ہو سکتا تھا؟ ___ اس زمانے میں بھی فوجوں کا کم و بیش یہی حال ہے ___ اُس دور میں سلطنتِ کسریٰ اور سلطنتِ روما کی لاکھوں کی تعداد میں STANDING ARMIES ہوا کرتی تھیں۔ پس دنیا میں راہب بھی تھے اور فوجیں بھی تھیں۔ لیکن ان دونوں متضاد کیفیات کا شخصیتوں میں یکجا (COMBINE) کر دینا۔ یہ ہے کمال دنیا

کے عظیم ترین انقلابی داعی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تزکیۂ نفس کا ۔ دشمن کے جاسوس بھی گواہی دے رہے ہیں کہ ' ھُمْ رُھْبَانٌ بِاللَّیْلِ وَ فُرْسَانٌ بِالنَّھَارِ ۔ جہاں ان کی فوجوں کا پڑاؤ ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ راہب خانہ ہے ۔ کوئی سجدے میں پڑا ہے اور بارگاہِ رب میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہا ہے ۔ سجدہ گاہ آنسوؤں سے بھیگ گئی ہے ۔ کوئی ہاتھ باندھے حالتِ قیام اپنے خالق و مالک کے حضور کھڑا ہے اور گڑگڑا رہا ہے ۔ اُس کے آنسوؤں سے جھڑی سے داڑھی تر ہو گئی ہے ۔ کہیں شراب نوشی نہیں، کہیں کوئی عیاشی نہیں، کوئی بدمعاشی نہیں، کسی قسم کے رنگ رلیاں نہیں ۔ فوجوں کا کیمپ راہب خانے کا نقشہ پیش کر رہا ہے ـــــ اور یہی لوگ دن میں جب گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہیں، ہاتھوں میں تلواریں ہیں، نیزے ہیں اور دشمن کی فوجوں پر بجلیوں کی طرح لپکتے ہیں، تلواریں کوندتی ہیں اور ایک ایک سپاہی بیسیوں دشمنوں پر بھاری پڑتا ہے اور ان کی ہمت و جرأت سے دشمن مبہوت و مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے ۔

اجتماعِ ضدّین : غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی بات مسٹر ہارٹ نے ایک دوسرے اسلوب سے کہی ہے ۔ ظاہر بات ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ۔ پھر پھل کو آپ درخت کے حوالے سے جانتے ہیں ۔ درخت آم کا ہے تو آم لگے گا ۔ درخت نیم کا ہے تو اس میں نبولی لگے گی ۔ اس جوہر کو جو جناب محمد میں تھا، صلی اللہ علیہ وسلم ـــ مسٹر ہارٹ نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے :

''HE IS THE ONLY PERSON SUPREMELY SUCCESSFUL

IN BOTH THE RELIGIOUS AND THE SECULAR FIELDS.''

یہی اجتماعِ ضدّین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اصحاب میں ہے، رضوان اللہ علیہم اجمعین ۔۔ جس کو ایرانی جاسوسوں نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ ' ھُمْ رُھْبَانٌ بِاللَّیْلِ وَ فُرْسَانٌ بِالنَّھَارِ ۔

پس یہ ہیں تین ابتدائی یا تمہیدی مراحل ـــ ان میں سے کسی میں بھی کچا پن رہ جائے تو ظاہر بات ہے کہ اگلا جو قدم بھی اٹھے گا اس میں ناکامی ہو گی ۔ یہ ہر انقلاب کی اوّلین اساسی و بنیادی شرائط ہیں ۔ اگر نظریے کی صحیح تعبیر نہیں ہوتی ہے تو محض ایک ' دعظ ' ہے ۔ اس کے نتیجہ میں انقلابی عمل شروع ہو گا ہی نہیں ۔ اگر سمع و طاعت والی تنظیم وجود میں نہیں آئی ہے تو انقلابی عمل آگے نہیں بڑھ سکے گا ۔ تربیت نہیں ہوئی ہے، سیرت و کردار کی پختگی نہیں ہے تو کسی نہ کسی مرحلہ میں یہ تنظیم کچے ریت کے گولے

کی طرح بکھر جائے گی۔ یہ ہیں تین ابتدائی یا تمہیدی مراحل۔ پہلا انقلابی نظریہ اور اس کی دعوت و تبلیغ۔ دوسرا قبول کرنے والوں کی تعلیم اور تیسرا ان کی تربیت ۔

ایک ضروری وضاحت: دنیا کے جو دو انقلابات مشہور ہیں یعنی انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس — تو ان انقلابات کی اساسات چند ذہین و فطین انسانوں کے غور و فکر پر قائم اور مبنی ہیں۔ اسی لئے ان کو 'نظریہ' یا IDEALOGY کہنا درست ہے۔ جب کہ اسلام معاذ اللہ کسی انسان کے فکر اور اس کے غور و خوض کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ دینُ اللہ ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ؕ یہ خالق و مالکِ ارض و سماوات کا نازل کردہ کامل نظامِ حیات ہے جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی وساطت سے نوعِ انسانی کو دیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد کوئی انسانی نظریہ (IDEALOGY) نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقی اساس ایمان باللہ ہے۔ اس کا عمل میں ظہور عبادتِ رب ہے۔ یعنی پوری زندگی کو انسان اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اسی کی پرستش کے لئے وقف کر دے۔ جیسے سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ اقدس کے تعارف کے لئے فرماتا ہے: اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ "میں ہی اللہ (معبودِ برحق) ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں (کوئی بندگی اور پرستش کے لائق نہیں) پس صرف میری ہی عبادت کیا کرو۔" اور سورۂ بقرہ میں فرمایا: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ۔ "اے لوگو! بندگی اور پرستش کرو اپنے رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو جو تم سے پہلے تھے"۔ سورۂ اخلاص میں داعیٔ انقلاب کو حکم ہوا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اللّٰهُ الصَّمَدُ " (اے نبی! لوگوں سے) کہدیجئے کہ وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ سب سے بے نیاز (اور وہی سب کا پشت پناہ) ہے"۔ دورانِ تقریر میں اگر میں نے دینِ اسلام کے لئے 'نظریہ' یا IDEALOGY کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ بغرضِ ابلاغ و تفہیم استعمال کیا ہے۔ درحقیقت ہمارا دین منزل من اللہ ہے۔

(جاری ہے)

عَنِ الحَارِثِ الاشعری، قَالَ، قَالَ رسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

"اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ

بِالجَمَاعَةِ والسَّمْعِ والطَّاعَةِ والهِجْرَةِ والجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

قافلۂ انقلابِ اسلامی، منزل بمنزل

الاخوان المسلمون

قاضی ظفر الحق

تحریک کا پس منظر......

تحریکوں کا مطالعہ کرنے والا کوئی عام اور ادنیٰ قاری بھی اس کلیہ سے نا آشنا نہیں رہ سکتا کہ تحریکیں حالاتِ زمانہ کے ردِ عمل میں ابھرتی اور پھر ان ہی کا شکار ہو جاتی یا انہیں بدل دیتی ہیں۔ یہ قاعدہ اتنا عام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تحریکیں بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دی جا سکتیں۔ چنانچہ حالاتِ زمانہ کی ابتری اور نوعِ انسانی کا اخلاقی دیوالیہ پن ہی رحمتِ الٰہی کو جوش میں لاتا اور اس طرح نبوت کے اجراء کا سبب بنتا تھا۔ البتہ نبوی اور غیر نبوی تحریک میں ایک نہایت واضح اور اثرات کے اعتبار سے بڑا عظیم فرق یہ ہوتا ہے کہ نبوی تحریک اس خطرہ سے بالکل محفوظ ہوتی تھی کہ نبی خود ردِ عمل کی نفسیات کا شکار ہو جائے یا اس کی تحریک میں ابتداء ہی سے عدمِ توازن کی خطرناک بیماری پائی جائے، جبکہ کسی غیر نبی کا ردِ عمل کی نفسیات اور اس کی تحریک کا عدمِ توازن سے محفوظ رہنا نہایت مشکل بلکہ اکثر ناممکن ہوتا ہے۔

چنانچہ کسی تحریک کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس پس منظر کا تفصیلی جائزہ لیا جائے، جس میں وہ تحریک جنم پذیر ہوئی ہے۔ ان عوامل کا بغور مطالعہ کیا جائے، جو اس پر اثر انداز ہوئے اور جنہوں نے اس کے پروان چڑھنے میں کوئی مثبت یا منفی کردار ادا کیا۔ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس کی آفرینش اور ارتقاء کے دوران آس پاس کا ماحول کیسا رہا اور اس کے بانیوں کی شخصیات کو بھی اس ضمن میں خصوصی مطالعہ کا حقدار سمجھنا چاہیئے۔

بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی کے مصر پر ایک نظر

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو مصر بھی دیگر اسلامی خطوں کی طرح ایک غلام اور محکوم ملک تھا۔ برطانیہ عظمیٰ کے پنجے مصر کے ناتواں جسم میں گہرائی تک گڑے ہوئے تھے اور مکار و سفاک انگریز حسب معمول اس کا سیاسی و معاشی استحصال کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بسنے والے مسلم معاشرہ کا تعلیمی اور معاشرتی و اخلاقی قتل عام کر رہا تھا۔ انگریز حکمرانوں کی شدید خواہش تھی کہ مصری قوم اسلام سے اپنا رشتہ ناطہ توڑ کر تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بھی مغرب کی مکمل غلامی اختیار کر لے۔ چنانچہ ایک طرف تو ہر وہ گلا گھونٹ دیا جاتا تھا' جس میں سے آزادی کا نعرہ نکلے۔ ہر وہ تحریک کچل دی جاتی تھی' جو آزادی کا نام لے کر چلے۔ اور دوسری طرف عیسائی مبلّغین نے مصر پہ یلغار عام کر رکھی تھی' جنہیں سرکاری سطح پر زبردست سرپرستی حاصل تھی۔ آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ نسواں کے دلفریب نعروں کے پس پردہ اباحیت' لادینیت' عریانی و فحاشی اور ریب و تشکیک اور غلامی کی فضیلت جیسے گمراہ کن ابلیسی منصوبوں پر کام ہو رہا تھا۔ مسلّمہ اسلامی قدروں کو پامال کرنے کی رغبت دلائی جا رہی تھی اور مسلمانوں کی ساری پستی کا واحد سبب (معاذ اللہ) اسلام کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔

برطانوی دورِ اقتدار میں جدید نظامِ تعلیم سے اسلامی اصولوں کو اس طرح بے دخل کر دیا گیا تھا کہ اسلام خود اپنے بیٹوں کے لئے اجنبی بن گیا تھا۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کا زرّیں مغربی اصول مصر میں بھی اپنے شگوفے کھلا رہا تھا اور انگریز حکومت مصر میں اقلیتوں کی نہایت ڈھٹائی سے سرپرستی کر رہی اور انہیں مسلمانوں پر مسلط کر رہی تھی۔ مصری قوم میں فراعنۂ مصر کی اولاد ہونے کا فخر ابھارا جا رہا تھا اور قبطی فینیقی اور عرب و ترک کی منافرت پروان چڑھائی جا رہی تھی۔

مصر کے سوچنے سمجھنے والے ذہن بھی اسی طرح جس طرح کہ ہندوستان کے مسلمان ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ کے بعد دستوری ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے' ۱۸۸۳ء کی اعرابی پاشا کی ناکام بغاوت کے بعد مسلح جدوجہد کا خیال ترک کر بیٹھے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں دستوری ذرائع سے مصر کی آزادی کا پرچم اور نعرہ لے کر ایک طرف مصطفیٰ کامل کی "الحزب الوطنی" میدان میں آئی تو دوسری طرف مفتی محمد عبدہٗ کی "الحزب الوطنی الحر" بھی میدان میں اتر آئی' جس کی قیادت لطفی السید کے پاس تھی اور ایک تیسرا گروہ مصری وطنیت کی

علمبرداری کرتے ہوئے ۱۹۰۷ء میں "حزب الأمۃ" کے نام سے وجود میں آیا، جس کی تاسیس کا سہرا محمود سلیمان پاشا کے سر ہے۔

یہ تین گروہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اصلاً دو بنتے ہیں یعنی مصطفیٰ کامل کی الحرب الوطنی جو مصر کی آزادی اور اس کے اسلامی کردار کی بحالی کے ساتھ ساتھ ایک ملتِ واحدہ کا حصہ ہونے پر یقین رکھتی تھی اِس پر جذبات اور جوش کا غلبہ تھا۔ جبکہ دوسرا گروہ یعنی الحرب الوطنی الحراور حزب الامۃ جو مصر پر انگریز کے قبضہ کو نعمتِ خداوندی قرار دیتا تھا اور مصر کو مغربیت میں بالکل رنگ دینا چاہتا تھا اور اس کے عربی یا اسلامی کردار سے نفور تھا۔ اس گروہ نے دلیل اور دھیما پن اپنا شعار بنالیا تھا اور اس لئے نوجوانوں میں اس کا اثرونفوذ دن بدن بڑھتا جارہا تھا۔ یہ دراصل اسلامی قومیت اور مصری قومیت کی دو تحریکیں تھیں، جن کے مابین انگریز اور مقامی قبطی عیسائی درپردہ نفرت کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ یہ نفرت کی آگ اس وقت نہایت بلند ہو گئی، جب ۱۹۰۹ء میں پطرس غالی مصر کا وزیراعظم بنا اور اس نے پے درپے ایسے اقدام کئے جنہوں نے اہالیانِ مصر کا دل پارہ پارہ کر دیا چنانچہ الحرب الوطنی کے ایک کارکن نے ۱۹۱۱ء میں پطرس کو گولی مار کے ہلاک کر دیا، جس کے نتیجہ میں مصر ایک بڑی خانہ جنگی کا شکار ہو گیا اور اخبارات سے نکل کر جنگ گلی کوچوں میں پھیل گئی۔

اس خانہ جنگی نے مصری قوم پر بڑے گہرے اثرات ڈالے چنانچہ مصری معاشرہ میں پائے جانے والے نسلی ولسانی اور قدیم وجدید تعلیم یافتہ طبقات میں وسیع خلیج اور اونچی دیوار حائل ہو گئی۔

آزاد مصر

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جب امریکی صدر ولسن نے چھوٹی قوموں کے حق خود اختیاری کا اعلان کیا تو مصر میں بھی آزادی کا مطالبہ زور پکڑ گیا چنانچہ سعد زغلول پاشا کی سرکردگی میں ایک وفد ۱۹۱۸ء میں تشکیل دیا گیا، جس نے امن کانفرنس پیرس اور لندن میں مصر کا معاملہ پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا یہ وفد "وفد المصری" کے نام سے مشہور ہوا۔ اسے لندن جانے کی اجازت نہ ملی بلکہ سعد زغلول کو مالٹا میں نظربند کر دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی، جسے گو بہت سختی سے کچل دیا گیا مگر مصر کے حالات اتنے دگرگوں ہو گئے اور سعد زغلول کی وفد پارٹی کا برطانوی اشیاء سے مقاطعہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ حکومتِ

برطانیہ نے سعد زغلول اور دیگر وفدی رہنماؤں کو گرفتار کر کے جزیرۂ سچلس بھیج دیا مگر اس تحریک کا زور کم نہ ہوا اور بالآخر برطانیہ نے یک طرفہ طور پر ۱۹۲۲ء میں مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ سعد زغلول وطن لوٹے اور ۱۹۲۳ء میں انتخابات جیت کر ان کی وفد پارٹی نے حکومت بنائی اور وہ خود وزیر اعظم بنے جبکہ ملک کی آئینی سربراہی شاہ فواد کے پاس تھی۔

مصر اگرچہ آزاد ہو چکا تھا مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے برطانوی اقتدار کی بہت سی لعنتوں کا وراثتاً امین بھی بن چکا تھا۔ چنانچہ تحقیق و اجتہاد کے نام پر شعراء اور ادیبوں کا ایک گروہ اسلام سے نوجوان نسل کو برگشتہ کر رہا تھا اور انہیں مغرب کی نقالی کے فضائل سے روشناس کرا رہا تھا تو ایک دوسرا گروہ ان میں نسلی و لسانی تفریق ابھار کر انہیں امتِ مسلمہ اور عالم عربی سے کاٹ رہا تھا۔ آزادیٔ صحافت کا نعرہ اگر یہ گل کھلا رہا تھا تو شخصی آزادی کا حسین خواب گھر گھر، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں شراب خانوں' جوا خانوں' بازارِ گناہ اور ریس کورسوں اور کلبوں کی صورت میں اپنی تعبیر حاصل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ آزادیٔ نسواں کا فتنہ' (جس کی قیادت اولاً قاسم امین کے ہاتھ میں تھی پھر سعد زغلول کی بیوی صفیہ زغلول اور ہدی شعراوی کے ہاتھ میں آ گئی) 'اس زور سے اٹھا کہ ہر باضمیر آدمی چیخ کے رہ گیا۔ مصری عورت کے ہاتھ اور چہرہ ہی نہیں سینہ اور پنڈلیاں بھی عریاں اور بے حجاب ہو گئیں۔ یہ طوفان بھی اخبارات اور خواتین کے اجتماعات کی مدد سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ داستانِ الم کا ایک باب اور بھی ہے' جس میں قدیم عربی کے خاتمہ کی کوششیں اور اسلامی علوم کے محافظ و امین طبقہ کی پستی و بدحالی اور غربت و اجنبیت کا دل فگار عنوان سرِ لوح ثبت نظر آتا ہے۔

طٰہٰ حسین اور اس کی ذریت کی یہ بھرپور کوشش تھی کہ قرآن اور حدیث سے مسلمان کا ناطہ توڑنے کے لئے اس کو قدیم عربی لٹریچر سے محروم کر دیا جائے اور عربی زبان کے اصول اس طرح بدل دیئے جائیں کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہ جا سکے۔ طٰہٰ کی "فی الشعر الجاھلی" اسی تمنا کا ثمر ہے۔

اس کے علاوہ دین کے عالموں کو ذلیل و رسوا کرنے اور انہیں ترقی کی راہ کا روڑا ثابت کرنے کی ایک مسلسل تحریک زبان و قلم سے جاری تھی' جس کا مقصد مصر کے اجتماعی معاملات سے اسلام اور اسلامی اصولوں کی بے دخلی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

یہ وہ حالات تھے' جن میں بیسویں صدی کے ایک عظیم داعی نے جنم لیا اور عربوں میں ایک بے مثل تحریک بپا کر کے اسلام کا عالمِ عربی میں مستقبل محفوظ کر دیا۔ گو کہ آج بھی

کشاکش جاری ہے اور ظلم و ستم کی چکی مظلوموں کو نہایت قوت سے پیس رہی ہے، مگر لسانِ نبوی کی اٹل بشارت فتح و نصرت کی جاں فزا منزل دکھا چکی ہے۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

سپیدۂ سحر کی نمود

کچھ داعیٔ تحریک کے بارے میں

ظلمت کدۂ مصر میں جب گناہ اور عصیان اور اپنے رب سے دوری و مہجوری کی گھٹاٹوپ تاریکیاں ایک کے اوپر ایک چڑھی چلی آرہی تھیں تو یکایک روشنی کے متلاشی اور فسق و فجور سے نالاں پسے ہوئے اور دبکے ہوئے اہل اللہ کی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں مقبولیت و توجہ کی مستحق قرار پا گئیں اور محمودیہ کی بستی میں امام و خطیب اور متقی و مصنف باپ کے گھر مصر کا چاند طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روشن جبین کا اجالا تاریکیوں کے لئے ہلاکت کا پیامبر بن گیا۔

خاندان...... امام حسن البنّاء کا خاندان درویش صفت اور متدین افراد کا گھرانہ تھا۔ امام صاحب کے والد احمد عبدالرحمٰن البنّاء، جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل عالم اور ایک بے نفس انسان تھے۔ احمد عبدالرحمٰن کے والد عبدالرحمٰن ایک گاؤں شمشیرہ کے ساکن تھے اور ان کے پاس زمین کا کافی حصہ موجود تھا۔ احمد جب جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کرتے تھے تو اسی زمانہ میں ان کے بھائی محمد زمین کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد جب زمین کے محلِ نزاع بننے کا اندیشہ پیدا ہوا تو احمد فوراً اپنے بھائی کے حق میں کل زمین سے دستبردار ہو گئے اور محمودیہ چلے آئے۔ شیخ احمد اپنی روزی گھڑی سازی کے ذریعہ کماتے اور فارغ اوقات میں فقہ و حدیث کے مطالعہ میں منہمک ہو جاتے یا پھر آس پاس بسنے والے فلاحین (کاشتکاروں) کو قرآن حکیم سے روشناس کراتے۔ ان کے اسی تقویٰ، لِلّٰہیت اور علم دوستی کا نتیجہ تھا کہ محمودیہ کی جامع مسجد میں باصرار امامت و خطابت کی ذمہ داریاں انہیں سونپی گئیں۔ احمد عبدالرحمٰن البناء نے دو شادیاں کیں، جن میں سے پہلی بیوی سے سات اولادیں یعنی حسن البناء، عبدالرحمٰن البناء، فاطمہ، محمد البناء، عبدالباسط البناء، جمال البناء اور فوزیہ پیدا ہوئیں۔ جبکہ دوسری بیوی کی ایک ہی اولاد یعنی فریدہ ہوئی۔ آپ کی کئی تصانیف آپ کی شہرت کو دائمی بناتی ہیں۔

مختصر سوانح ...... حسن البنّاء شہید اکتوبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت محمودیہ میں آپ کے والد اور آپ کے مشفق استاذ اور والد کے گہرے دوست' استاذ محمد زہران رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسۃ الرشاد الدینیۃ میں' ان کے پاک ہاتھوں میں ہوئی۔ حسن البنّاء نے قرآن حفظ کیا پھر فقہ' حدیث اور تفسیر کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پرائمری اور مڈل کا امتحان پاس کیا۔ شہید استاذ نے دَمنہور ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں ۱۴ سال کی عمر میں داخلہ لیا اور سہ سالہ کورس مکمل کر کے قاہرہ کے دار العلوم (بعدہٗ قاہرہ یونیورسٹی) میں ایڈمشن لے لیا۔ اب ان کا خاندان بھی قاہرہ آگیا۔ پھر استاذ نے ۱۹۲۷ء میں دار العلوم سے معلّمی کا ڈپلومہ لیا اور محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ استاذ شہید کو اسماعیلیہ میں معلّمی کے فرائض سونپ دیئے گئے۔ چنانچہ استاذ دن میں بچوں کی اسلامی تربیت اور رات میں ان کے والدین کی صحیح مشورت اور صراطِ مستقیم کی طرف لوگوں کو بلانے کے لئے یکسو ہو گئے۔ اسماعیلیہ ہی میں انہیں الاخوان المسلمون کی تاسیس کا لافانی شرف حاصل ہوا۔ چھ سال اسماعیلیہ میں دعوت و تنظیم کا اساسی کام کرنے کے بعد' استاذ قاہرہ منتقل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے دعوتی مصروفیات کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے کارِ معلّمی ترک کر دیا اور فنا فی الدّعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گئے۔

الاخوان المسلمون کی تاسیس مارچ ۱۹۲۸ء کو اسماعیلیہ میں ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چھ افراد کا یہ قافلہ چھ ہزار افراد کے لشکر میں بدل گیا۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جب امام قاہرہ منتقل ہوئے تو تنظیم کی شاخیں پورے ملک میں قائم ہو چکی تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں حسن البنّاء نے تمام اسلامی ممالک کو نظامِ اجتماعی میں کلی اور اسلامی تبدیلی برپا کرنے کی دعوت دی اِس سلسلہ میں ان کی تحریریں بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں اخوان نے انگریزی استعمار کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ ۱۹۴۶ء میں ہی انہوں نے "الاخوان" نامی روزنامہ جاری کیا اور امام شہید کو تاحیات سربراہ بنا کر ان سے بیعت کی۔ الاخوان المسلمون کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مصری معاشرہ کے تیزی سے دینی رجحان اختیار کرنے نے انگریزوں اور یہودیوں کی راتوں کی نیندیں حرام کر دیں' جس کے نتیجہ میں انہوں نے مصری حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ الاخوان المسلمون کو غیر قانونی قرار دے دے۔ مصری حکومت اس دباؤ کا سامنا نہ کر سکی اور عین اس وقت جب اخوانی رضا کار فلسطین میں یہودیوں کو ناکوں چنے چبوا رہے تھے' مصری حکومت نے پیچھے سے وار کر کے ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اخوان کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ املاک ضبط کر لیں' کارکن

جیلوں میں ڈال دیئے اور بالآخر ۱۲ار فروری ۱۹۴۹ء کو وہ چراغ بھی گل کر دیا' جس کی روشنی ان کی تاریکیوں کے لئے پیام موت بن رہی تھی۔ رِمنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا۔

امام البناء نے اسماعیلیہ کے زمانۂ قیام میں ہی اپنا گھر آباد کر لیا تھا اور اسماعیلیہ کے ایک اہل اللہ گھرانہ میں نکاح کیا تھا۔ وہ خاتون ایسی پیکرِ صدق و وفا اور صابر و شاکر وجود تھیں کہ حسن البناء شہید کے لئے ان کا انتخاب ایک آسمانی فیصلہ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ البناء کی چھ اولادیں ہوئی ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں۔ لڑکیوں کے نام سناء' وفا' رجا' ہاجرہ اور استشہاد ہیں۔ استشہاد کی پیدائش باپ کی شہادت کے دن کی ہے اسی نسبت سے اس کا نام استشہاد رکھا گیا۔ لڑکے کا نام سیف الاسلام ہے اور صورت و سیرت ہی نہیں مصائب کے منجدھار میں پھنسے ہونے کا ترکہ بھی اس نے وافر پایا ہے۔

حسن البناء کی شخصیت کا ارتقاء...... حسن البناء کے خاندان کے تذکرہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ان کے والد نہایت متقی و متدیّن عالم تھے۔ انہوں نے باوجود تنگ دستی اور عسرت کے محمودیہ کی جامع مسجد کی امامت اور خطابت کی ذمہ داریاں فی سبیل اللہ ادا کیں۔ وہ حدیث اور دیگر علومِ اسلامیہ کے ماہر تھے اور ان کی کتابوں میں امام احمدؒ کی مسند کی فقہی ترتیب اور پھر اس کی نہایت عالمانہ اور فاضلانہ شرح' جس نے مصر سے باہر بھی اہل علم کے حلقوں سے تحسین وصول کی' شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کے لئے ایک گھریلو نصاب مرتب کیا تھا' جس میں صرف و نحو' فقہ' اصولِ فقہ' حدیث اور سیرۃ کے علاوہ عمدہ تفسیری مواد بھی شامل تھا۔ وہ یہ نصاب اپنے بچوں کو زبانی یاد کرواتے اور اس طرح ان کی تعلیم و تربیت غیر محسوس طور پر ان کے بچوں کے باطن میں تقویٰ اور پاکیزگی کے جوہر بناتی چلی جاتی تھی۔ آپ کے والد کا قول تھا کہ "من حفظ المتون حاز الفنون" جس نے متن حفظ کر لیا وہ فن پر حاوی ہو گیا چنانچہ وہ حفظ پر نہایت توجہ دیتے تھے۔ اس چیز نے بعد میں خطیب اور واعظ حسن البنّاء کی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

علم و تقویٰ سے مملو گھر کی اس پاکیزہ فضا سے پیدا ہونے والے اثرات و جذبات پر شیخ محمد زہران علیہ الرحمتہ کے قرب و نگہداشت نے وہ کام کیا جو کہ سونے پر سہاگہ کرتا ہے۔ شیخ زہران اپنے ذہین اور پاک نفس شاگرد سے نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے اور کتب

عشق کے معروف دستور کے مطابق امام البناء کو زیادہ سے زیادہ اپنی صحبت میں مصروف رکھتے۔ شیخ زہران نابینا تھے مگر صرف سر کی آنکھوں سے ان کا قلب مومنانہ بصیرت کا خزینہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہونہار طالب علم کی صفات کو خوب جان بوجھ لیا تھا اور وہ دن رات ان ملکوتی صفات کی تجلی میں اضافہ کے لئے کوشاں رہتے۔ چنانچہ حسن البناء ان کے ساتھ اکابر کی علمی محافل میں کانوں اور مدرسہ میں عصا اور کتب خانہ میں آنکھوں کی حیثیت سے موجود رہتے۔ استاذ و شاگرد کے اس تعلقِ خاطر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب شیخ زہران مدرسۃ الرشاد الدینیۃ کی نظامت سے فارغ ہوئے تو شاگرد کو اس مدرسہ کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑنے لگے اور انہوں نے والد گرامی سے صاف صاف اس مدرسہ میں جانے سے انکار کر دیا۔ حسن البنّاء نے شیخ زہران سے کونسی لافانی دولت حاصل کی یہ انہی کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں:

"میرا یہ بھی اندازہ ہے کہ میں نے روحانی جذبہ کے ساتھ ساتھ استاذ رحمہ اللہ سے ذوقِ تحقیق اور کثرتِ مطالعہ کا شوق بھی اخذ کیا ہے"۔

("حسن البناء کی ڈائری" مترجم خلیل حامدی)

حسن البنّاء شہید کی عبقری شخصیت کو بچپن میں ہی ہم دو انجمنوں کا روحِ رواں دیکھتے ہیں۔ پہلی انجمن مدرسہ رشاد کے ایک خلیق و کریم استاذ احمد افندی عبدالخالق کی مجوزہ تھی، جس کا کام طلبا کے اخلاق کی اصلاح کرنا اور انہیں نظمِ مدرسہ اور فرائضِ دینی کی پابندی پر آمادہ کرنا تھا۔ حسن البنّاء کے بچپن میں اس انجمن کی تشکیل نے، جواں عمری میں برپا کی گئی تحریک کے لئے، ایک اساسی اینٹ فراہم کی اور حسن البناء اعلیٰ اخلاقیات کے پیکر و داعی بن گئے۔ اس انجمن کی افادیت کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نوعیت کی انجمن، اصلاحِ اخلاق کے معاملہ میں وہ نتائج پیدا کر سکتی ہے، جو بیسیوں نظری وعظوں سے بھی پیدا نہیں ہو سکتے"۔

(حوالہ مذکورہ بالا)

دوسری انجمن جمعیت منع المحرمات تھی، جس کا کام مدرسہ کی حدود سے باہر بسنے والوں کو غیر شرعی اور نامناسب کاموں سے روکنا تھا۔ وہ یہ کام خطوں کے ذریعہ کرتے تھے اور اس کام کا پھیلاؤ اور نظم اتنی مضبوطی حاصل کر گیا کہ لوگ کھلے عام منکرات کے صدور سے اجتناب کرنے لگے اور اس بات سے خوفزدہ رہنے لگے کہ کب انہیں سرزنش آمیز خط موصول ہو جائے۔

غرض حسن البنّاء کی شعور کی پختگی سے پہلے ہی مشیّتِ ایزدی وہ سامان مہیا کر چکی تھی جو کہ ایک عظیم داعی اور قائد کی زادِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

روحانی تربیت...... شیخ حسن البناء کی روح میں درد و غم اور الٰہیت و لِلّٰهیت اور گرمی و جوش و خروش محمودیہ کے ایک صوفی گروہ سلسلۂ حصافیہ کا پیدا کردہ تھا۔ اس سلسلہ کے لوگ اسکول سے ملحقہ مسجد صغیر میں بعداز نماز عشاء جمع ہو جاتے اور اللہ کے ذکر میں غرق ہو جاتے۔ شیخ کو ان کے اس شبینہ پروگرامِ ذکر و فکر نے بہت اپیل کیا اور وہ اس میں باقاعدگی سے شامل ہونے لگے ان صوفیوں کی وسیع الظرفی 'تواضع اور متلاطم روحانیت نے حسن البناء کے ننھے سے دل کو اپنی مٹھی میں لے لیا اور حسن البناء حصافی شیخ کے دیدار کے لئے بے تاب رہنے لگے۔ وہ ان کا خاص وظیفہ باقاعدگی سے پڑھنے لگے اور ایک حصافی بزرگ شیخ ابو محمد شوشہ کی معیت میں باقاعدہ قبرستان حاضری کی سنت ادا کرنے لگے۔ اس چیز نے انہیں نہایت رقیق القلب بنا دیا اور وہ ساری ساری رات آہ و فغاں اور نالہ و شیون میں گزارنے لگے۔ شیخ کا عبادت' تلاوت اور ذکر میں استغراق بھی بہت بڑھ گیا۔ بایں ہمہ شیخ نے اس سلسلہ کے اخوان کو جمع کر کے "انجمن حصافیہ خیریہ" بھی بنا ڈالی جس کے تین مقاصد تھے۔ اخلاقِ حسنہ کی دعوت' نہی عن المنکر اور عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روک تھام۔ شیخ کی شخصیت میں روحانیت اور دعوت الی اللہ کے عناصر کو پختہ کرنے میں سلسلۂ حصافیہ کے بانی کی سیرت پر مبنی ایک کتاب "المنهل الصّافی فی مناقب حسنين الحصافی" کا بھی بڑا دخل ہے۔ جسے انہوں نے دسیوں مرتبہ پڑھا اور ہر دفعہ ایک نیا اثر اور تازہ جذبہ حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں شمولیت اور اس کے بانی کی سیرت کے بارے میں انہوں نے اپنی ڈائری میں تفصیل سے لکھا ہے اور بہت سے پر اثر واقعات نقل کئے ہیں۔

عناصرِ خمسہ...... جیسے اردو زبان اپنے عناصرِ خمسہ کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتی تھی' ایسے ہی مستقبل کے حسن البناء کی شخصیت بھی اپنے عناصرِ خمسہ کے بغیر وہ ارتقاء حاصل نہ کر سکتی' جو اسے حاصل ہوا۔ یہ عناصر خمسہ گھر' مدرسہ رشاد' انجمن اصلاح اخلاق' انجمن انسدادِ محرمات اور سلسلۂ حصافیہ شاذلیہ ہیں۔ گھر جہاں انہوں نے توکل' استغناء' فقر سے محبت اور علم سے دوستی سیکھی اور ان کا سخن دلنواز ہوا۔ مدرسہ رشاد جہاں انہوں نے کثرتِ مطالعہ' ذوقِ تحقیق اور فکرِ رسا حاصل کی اور ان کی نگہ بلند ہو گئی۔ جمعیت اخلاقِ ادبیہ جس نے انہیں اعلیٰ

اخلاق کی قدر و قیمت سکھائی، جمعیت منع المحرمات جہاں انہوں نے منکرات سے نفرت اور انہیں مٹانے کی تربیت حاصل کی اور سلسلۂ حصافیہ جس میں شمولیت نے ان میں عشقِ الٰہی کی آگ روشن کی، جذبۂ خیر عطا کیا، دلِ دردمند اور جان پر سوز کا تحفہ دیا۔ بلاشبہ ہر فرد کو قدرت اپنے ہاتھوں اپنے کام کے لئے تیار کرتی ہے اور حسن البناء کو اس نے خصوصیت سے تیار کیا۔ چنانچہ ان کے متعلقین کے تاثرات پر مبنی کتاب "الامام الشہیدؒ" کا ایک ایک صفحہ اس پر شاہد ہے۔

کونڑ محاذ پر چھ دن

خواجہ عبدالباری، منگورہ سوات

عام مشاہدے کی بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے عموماً رات کو سونے سے پیشتر بزرگوں سے قصے کہانیاں سننے کیلئے بہت بے تاب ہوتے ہیں اور اس کیلئے خصوصی فرمائشیں کرتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ کہانی سنانے کی دعوت دے دو بچوں کے جھرمٹ آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے اور نہایت شوق سے ہمہ تن گوش ہو کر آپ کو سننے کیلئے بے قرار ہوں گے۔ یہ ایک مستقل اور پائیدار فطری جذبہ ہے جو بچپن سے انسان کے ذہن میں ودیعت کیا گیا ہے اور بڑھاپے تک رہتا ہے۔ بڑے بوڑھے ٹی وی پر ڈرامہ دیکھتے ہیں۔ فلموں اور سٹیج ڈراموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ناول، منفرد آپ بیتیوں اور معاشرے کے انوکھے واقعات ایک دوسرے کو نہایت ذوق شوق سے سنتے سناتے ہیں اور حظ اٹھاتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جنگ عظیم دوم جب ختم ہوئی تو اپنے بزرگوں سے ہم جنگ کے واقعات نہایت انہماک سے سنتے تھے۔ اس جنگ میں اگرچہ جرمن قوم اور ہٹلر نے ہزیمت اٹھائی تھی اور ان کو آج تک مطعون کیا جارہا ہے، لیکن اس وقت ان کے کارناموں، جنگی مہارت، ٹیکنیکی صلاحیت اور بہادری اور شجاعت کے لازوال اور دل دہلا دینے والے واقعات نے اقوامِ عالم کو گرویدہ بنالیا تھا اور اب بھی ان کی مہمات کی کہانیاں ہمارے اکثر شعراء کے کلام میں محفوظ ہیں۔

۱۹۸۲ء جب مجھے سابق امیر جماعت اسلامی صوبہ سرحد مولانا غلام حقانی مرحوم و مغفور کی معیت میں برطانیہ کے دورے پر جانے کا اتفاق ہوا، ایک دن ہم لندن میں سینٹ پال کا گرجا گھر دیکھنے گئے۔ یہ ایک تاریخی گرجا گھر ہے۔ شاہی خاندان کی شادیاں عموماً اس میں ہوتی ہیں، وہاں پر ہم نے دیکھا کہ قومی مشاہیر اور بڑے بڑے جرنیلوں کے مجسمے نصب ہیں، جن کے نیچے ان کے نام، وہ کارنامے اور مہمات جو انہوں نے سرانجام دیئے، وہ مقامات جہاں انہوں نے یہ کارنامے اور مہمات سر کیں غرضیکہ یہ ساری تفاصیل دے دی گئی تھیں۔ یہ واقعات پڑھ کر انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ ابنِ آدم اتنی معرکتہ الآرا مہمات سر کر سکتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں کہ حضرتِ انسان ان مہماتی قسم کے واقعات میں اتنی زبردست دلچسپی لیتا ہے؟ اس کا نہایت سادہ اور

حقیقت پر مبنی جواب ہمیں قرآن کریم کی سورۃ البلد کی آیت نمبر ۴ میں ملتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے "در حقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے"۔ اس کی تفسیر میں مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں:

"انسان کے مشقت میں پیدا کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مزے کرنے اور چین کی بانسری بجانے کیلئے پیدا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے لئے یہ دنیا محنت، مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اس حالت سے گذرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شہر مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا۔ اس شہر مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کیلئے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں، حتیٰ کہ یہاں جنگل کے جانوروں کیلئے امان ہے مگر ان کے لئے نہیں ہے اور ہر انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کی آخری سانس تک اس بات پر گواہ ہے کہ اس کو قدم قدم پر تکلیف، مشقت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کو تم بڑی سے بڑی قابلِ رشک حالت میں دیکھتے ہو وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو ہر وقت اس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مرجائے یا اس کا اسقاط ہو جائے۔ زچگی کے وقت اس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ پیدا ہوا تو اتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے پڑے ہی سسک سسک کر مرجاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گرا پڑتا تھا۔ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیرات سے اس کو گزرنا پڑا کہ کوئی تغیر بھی غلط سمت میں ہو جاتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ اور ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اس اندیشے سے اس کو چین نصیب نہیں ہے کہ کہیں اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو جائے۔ وہ اگر فاتحِ عالم بھی ہے تو کسی وقت اس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اس کے اپنے سپہ سالاروں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے۔ وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کس طرح اس کی حفاظت کرے۔ غرض کوئی شخص بھی بے غل و غش چین کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہے کیونکہ انسان پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے"۔

اب آیئے ایک اور زاویئے سے اس حقیقت کو دیکھتے ہیں، نوزائیدہ بچے کو آپ لٹا دیں تو وہ آرام سے کبھی نہیں لیٹے گا، بلکہ جولاہے کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں دونوں مسلسل حرکت کریں گے، ایک پل کیلئے بھی وہ خود آرام نہیں کر سکتا بلکہ اس کو آرام دلانے کیلئے اسے باندھنا پڑے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان دنیا میں حرکت اور جدّوجہد کیلئے پیدا ہوا ہے، محنت اور مشقت کیلئے پیدا ہوا ہے۔ محنت کرے گا تو صحت مند بھی رہے گا اور دنیا میں زندگی بھی عزت و وقار سے بسر کرے گا اور آخرت کی فلاح

بھی نصیب ہوگی، لیکن یہاں ایک بات پیش نظر رہے کہ اخروی فوز و فلاح اور کامیابی کا دارومدار محنت و مشقت اور جدوجہد کو صرف مثبت چینل پر متحرک کرنے پر ہے، اگر اس کو منفی چینل پر حرکت دی گئی تو یہ اسی حساب سے دنیوی تباہی اور اخروی ناکامی پر منتج ہوگی۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اول الذکر کو جہاد فی سبیل اللہ اور مؤخر الذکر کو جہاد فی سبیل الطاغوت کا نام دیا گیا ہے۔

مثبت جدوجہد کے نتیجہ میں ایک عظیم کردار جنم لیتا ہے اور وہی عظیم کردار، جو عوام الناس کے بس کا روگ نہیں ہوتا بلکہ صرف اولوالعزم انسان ہی وہ ادا کرتے ہیں۔ قصوں کہانیوں اور واقعات میں حسن، نکھار اور دلکشی پیدا کرتا ہے، چونکہ فطری طور پر ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی واقعہ یا کہانی میں جو مہم جویانہ کردار ادا کیا گیا ہے، اسے وہ خود ادا کرے اور یہ بات وہ اپنی فطرت کے عین قریب محسوس کرتا ہے، لہٰذا ان واقعات میں وہ حد سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ خود بھی ایسا ہی کردار بنے۔ اس مہم جوئی، کارنامہ آرائی، مشنری جدوجہد اور سخت کوشی کو دینی اصطلاح میں "جہاد فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں، عبادات میں، جہاد فی سبیل اللہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایمان سرے سے معتبر ہی نہیں ہے، جس میں جہاد فی اللہ کی طرف پیش رفت نہ ہو۔ سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہیں کیا اور اپنی جانوں اور اموال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں"۔ اسی طرح تمام سورۃ التوبہ، جہاد کے احکام سے مزین ہے۔ قرآن کریم نے جہاد کے احکام پر اتنا زور دیا ہے کہ اس کے بغیر ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا، چنانچہ منافق وہ لوگ کہلائے جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کو ترک کیا ورنہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ لوگ مسجد نبوی میں حضورؐ کی امامت میں پانچوں وقت حاضر ہوتے تھے، بلکہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے کہ جب حضورؐ خطبہ کیلئے منبر پر تشریف لے جاتے تو وہ اٹھ کر لوگوں کو تلقین کرتا کہ اے لوگو! یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کے ارشادات غور سے سنو۔ لیکن غزوۂ احد میں ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ یہ اپنے تین سو ساتھیوں سمیت واپس ہو گیا، اور غزوۂ احد میں شمولیت سے انکار کر گیا۔

جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں جو مہمات قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے سر کیں، پوری تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن عصر حاضر میں جو کارہائے نمایاں افغان مجاہدین ادا کر رہے ہیں اور اسلامی تاریخ کا جو تابندہ و درخشندہ باب وہ رقم کر رہے ہیں، قرونِ اولیٰ کے بعد اسلامی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

افغانستان کے متعلق علامہ اقبال نے اپنے کلام میں یوں تو بہت کچھ کہا ہے لیکن فارسی کا ایک شعر، جو انہوں نے آج سے کم از کم ساٹھ ستر سال پیشتر کہا ہوگا اور جس میں انہوں نے اس خطے میں افغان ملت کی اہمیت اجاگر کی ہے، مستقبل کی پیش گوئی کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی پیش گوئی اب حال کا روپ دھار چکی ہے۔ علامہ نے فرمایا۔

آسیایک پیکرِ آب وگِل است
ملتِ افغاں در آں پیکر دل است
از فسادِ اُو فسادِ آسیا
از کشادِ اُو کشادِ آسیا

ایشیا آب وگِل کا ایک پیکر ہے جس میں افغان ملت' دل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں فساد اٹھے گا تو سارے ایشیا میں فساد پھیل جائے گا' اس میں امن اور آشتی کی فضا ہو گی تو سارے ایشیا میں امن اور استحکام ہو گا۔

افغان ملت کی خصوصی حیثیت اس بات سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پچھلے دنوں معاہدۂ جنیوا سے قبل ایک خبر میں وزیر اعظم برطانیہ مسز تھیچر نے ایک بیان دیا تھا کہ ہم نے اپنے سابقہ تجربات کی بناء پر روس کو منع کیا تھا کہ افغانستان میں مداخلت سے باز رہے لیکن جب تک خود روسیوں نے ٹھوکر نہیں کھائی تھی' یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی' لیکن اب وہ سمجھ گئے ہیں۔

---

۲۶ جولائی ۱۹۸۸ء یعنی عید الاضحیٰ کے دوسرے دن ہم نے چھ دن کیلئے کونٹر کے محاذ پر عملی جہاد میں حصہ لیا اگرچہ ہمارے دورانِ قیام کوئی خاص معرکہ تو نہیں ہوا اور نہ ہی آمنے سامنے لڑائی ہوئی' لیکن جو کچھ ہم نے وہاں دیکھا اور سنا اس کی روداد پیشِ خدمت ہے۔

میرے ساتھ سوات سے چھ دوست اور بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ ہمارے ایک ساتھی جناب فضلِ واحد صاحب چونکہ اوائل سے ہی افغانستان کے جہاد میں شریک رہے ہیں' وہ تقریباً ہر محاذ پر رہ چکے ہیں' لہٰذا ان کو ہم نے اپنا امیر منتخب کیا کہ وہ جہاد کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہیں' چنانچہ جتنا بھی اسلحہ یہاں استعمال ہوتا ہے ان کو استعمال کرنے اور دیگر تیکنیکی امور پر ان کو عبور حاصل ہے' انصار بھائیوں میں افغانستان کے جہاد میں ان کی شمولیت السابقون الاولون کے زمرے میں آتی ہے۔

جناب فضل واحد کی امارت میں ہم صبح چھ بجے منگورہ سے بذریعہ فلائنگ کوچ تیمر گرہ (دیر) کیلئے روانہ ہوئے۔ احیاء العلوم تیمر گرہ جو جماعت اسلامی کا ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے' سے سلیپنگ بیگ اور دیگر ضروری سامان لے کر ایک پک اپ میں ناوگئی پہنچے۔ یہ باجوڑ ایجنسی کا آخری قصبہ ہے اس سے آگے مہمند ایجنسی شروع ہو جاتی ہے۔ ناوگئی سے ایک ٹویوٹا پک اپ ناوا پاس کیلئے کرایہ پر لی اور عباس غونڈ پہنچے۔ عباس خونڈ کونٹر کے محاذ کیلئے حزب اسلامی کا ڈپو ہے۔ یہ حضرت عباسؓ کے نام سے منسوب ہے' یہاں سے مجاہدین مسلح ہو کر محاذ پر جاتے ہیں' ہمیں وہاں پر ایک ایک رائفل اور دو صد راؤنڈ کی ایک ایک پٹی دی گئی۔ پیٹیاں ہم نے کمر سے باندھ لیں اب ہم مکمل مجاہد نظر آنے لگے تھے۔ عباس غونڈ میں ہی ایک ایک کپ چائے پی کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ بارہ بجے ہم ناوا پاس کنڈو پہنچے۔ یہ پاک افغان بارڈر ہے' ناوا پاس اس طرح ہے جس طرح چترال اور دیر کے درمیان لواری

ٹاپ۔ فرق محض اس قدر ہے کہ یہ لواری ٹاپ سے نسبتاً کم بلند ہے۔ چوٹی پر پاکستانی چوکی ہے جس پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ یہاں ایف سی کا ایک میجر متعین ہوتا ہے۔ زنجیر پار کر کے افغان علاقہ میں داخل ہوئے اور وہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چائے پی اور پھر آگے بڑھ گئے۔ اب پیدل راستہ تھا۔ قرار گاہ (محاذ کا مرکز) آدھ گھنٹے کے فاصلہ پر تھی۔ قرار گاہ کے کمانڈر (مقامی زبان میں قومندان) انجینئر ظریف خاں سے چونکہ بارڈر پر ملاقات ہوئی تھی اس لئے قرار گاہ تک وہ ہمارے ساتھ رہے۔ دن کے بارہ بج رہے تھے' چنانچہ انجینئر صاحب نے نماز تہہ خانے میں پڑھنے کو کہا۔ یہ تہہ خانے حملوں سے بچاؤ کیلئے سخت چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں جس میں بیک وقت تقریباً ساٹھ ستر افراد با جماعت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ تہہ خانے کے عقب میں اندھیرا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس سے نکلنے کا دوسرا راستہ ہے۔ ہم اپنی ٹارچ کی روشنی میں اندھیرے کو چیرتے دوسری طرف نکل گئے۔ یہ گویا 'EMERGENCY EXIT' یعنی ہنگامی اخراج کا راستہ تھا۔ ظہر کی نماز مجاہدین بھائیوں کے ساتھ ادا کر کے ہم نے کھانا کھایا، جو نہایت سادہ یعنی باسی روٹی اور دال چنے کے شوربے پر مشتمل تھا، لیکن اس کا مزا' بس مت پوچھئے۔ دین کی سربلندی کیلئے مجاہدین وقت گزاری کا معاملہ کر رہے تھے۔ ان کی قربانیاں انشاء اللہ جلد رنگ لائیں گی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو جناب فضل واحد نے ہمیں اسلحہ کے استعمال اور دیگر تیکنیکی امور کی تربیت دی۔۔ کچھ دیر آرام کیا اور پھر قرار گاہ سے متصل گھاٹی میں ایک میٹھے ٹھنڈے چشمہ سے وضو کر کے مجاہدین کے ساتھ نماز عصر ادا کی' نماز یہاں قصر ادا کی جاتی ہے۔ نماز کے بعد مولانا زاہدی صاحب نے دس پندرہ منٹ کیلئے سورۃ آل عمران کی آخری آیت کا درس دیا، جو نہایت جامع اور مؤثر تھا۔ مولانا زاہدی صاحب جو مولانا گوہر رحمٰن صاحب کے شاگرد ہیں اور حدیث کا دورہ بھی انہی کے دارالعلوم تفہیم القرآن میں کیا ہے۔ ایک ہاتھ سے معذور' انتہائی پرہیزگار انسان ہیں اور جہاد کے قابل مشیروں میں شمار ہوتے ہیں۔ مغرب کی نماز تک ہم اسی مسجد میں بیٹھے رہے۔ چھت کے بغیر یہ مسجد تہہ خانے کے سامنے چبوترے پر گھاس پھوس سے بنائی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ کا خوبصورت نقشہ سامنے آتا ہے۔ مجاہد بھائیوں سے تعارفی اور معلوماتی گفتگو کے دوران جہاد وال کے ایسے واقعات سنے کہ ایمان تازہ ہو گیا۔ بھائی فضل واحد نے ہتھیاروں سے متعلق کچھ مزید قیمتی معلومات بھی بہم پہنچائیں اور نمازِ مغرب کے بعد مجھے مجاہد بھائیوں سے خطاب کا حکم ملا۔ میں نے سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ میں جہاد و قتال کی جامع ترین آیت کو موضوعِ سخن بنایا جسے مجاہد بھائیوں نے بغور سنا۔ خطاب کے بعد ہمیں سادہ چاول کی لذیذ خوراک سے نوازا گیا۔ نمازِ عشاء تک مجاہد بھائیوں کی محفل میں مولانا زاہدی صاحب سے جہاد کے روح پرور واقعات سنتے رہے' اور پھر تہہ خانے میں میٹھی سہانی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

۲۷ جولائی کا آغاز نمازِ فجر کے بعد ایک مجاہد بھائی کے دلنشین درسِ قرآن سے ہوا۔ دودھ ملے قہوہ اور باسی روٹی کے ناشتہ کے بعد "آرڈر آف دی ڈے" کا انتظار کرتے رہے' چنانچہ جلد ہی ہمیں

قرار گاہ سے خطِ دوم پر جانے کا حکم ملا۔ خطِ دوم ——————— مجاہدین کی خفیہ اصطلاح ہے۔ اس موضع میں اس محاذ کے کمانڈر قاری فدا محمد صاحب قیام پذیر ہیں۔ وحدت سے موسوم مخابراتی نام کے اس مقام کی مسافت قرار گاہ سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔ FORWARD LINE یعنی خطِ اول دشمن کی چوکیوں کے عین سامنے ہے۔ یہاں ایک چوٹی ہے جسے OBSERVATION POINT یعنی ترصد کہتے ہیں۔ اسی سے دشمن کی حرکات پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ لفظ ترصد غالباً رصد گاہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہاں ایک کیمپ (موضع) ہے اور یہاں کے تمام مواضعات قاری فدا محمد صاحب کی زیرِ کمان خدمات انجام دیتے ہیں۔

اگلے مورچوں کیلئے روانگی سے پیشتر ہم نے گھنٹہ بھر اپنے زنگ آلود اسلحہ کی خوب صفائی کی۔ انتہائی دشوار گزار سلسلۂ کوہ کوئی دو گھنٹے میں طے کر کے ہم خطِ دوم پر جا پہنچے۔ یہ موضع بھی ترصد کے عین سامنے نسبتاً کم بلند چوٹی پر واقع ہے۔ قاری فدا محمد صاحب نے سو گز آگے پیش قدمی فرما کر ہماری عزت افزائی کی۔ قاری صاحب کے مجاہدانہ کارنامے ہم پہلے بھی سن چکے تھے، لیکن اب بالمشافہ ملاقات میں ان کا طرزِ عمل بھی خوب سے خوب تر پایا۔ قاری صاحب پشتو زبان نہایت دھیمے لہجہ میں اور لفظوں کو الگ الگ کر کے بولتے ہیں۔ ان کے ہر لفظ سے خلوص، حلاوت و عزیمت ٹپکتی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

خطِ دوم (وحدت) پر ہم نے تقریباً ہر قسم کا اسلحہ موجود پایا خصوصاً بیم یک (BEAM ONE) جس سے میدان سے میدان کیلئے میزائل داغا جاتا ہے۔ یہاں کی ہر بلندی پر گن فِٹ ہے۔ یہاں چونکہ چشمہ نہیں ہے، لہٰذا خچروں پر پانی لایا جاتا ہے۔ قلتِ آب کی وجہ سے پانی کا محتاط استعمال صرف کھانے پکانے اور پینے کیلئے ہوتا ہے، وضو کی بجائے تیمم کی سنت جاری ہے۔

بعد از نمازِ عصر قاری فدا محمد صاحب نے سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ کو موضوعِ درس بنایا۔ دروس تو ہم نے بہت سنے تھے لیکن اس کوہستانی سلسلہ میں محاذ پر جو کیف طاری ہوا اس کا صرف تصور ہی ممکن ہے۔ پھر قاری صاحب کی زبانِ سیف سے جو بیک وقت حافظِ قرآن، قاری، سپاہی اور مجاہدین کے نڈر کمانڈر ہیں۔ یہ روسیوں کو آمنے سامنے دعوتِ مبارزت دیتے رہے انہیں واصلِ جہنم کیا اور خود بھی گھائل ہوئے۔ یقیناً قاری صاحب نے کونٹر محاذ پر جرأت و شجاعت کی انمٹ داستان کو جنم دیا ہے اور ان کا نام تاریخِ کنٹر میں جگمگاتا رہے گا۔ قاری صاحب کے کارنامے ہم کہیں اگلے صفحات میں بیان کریں گے۔ آیئے ذرا اس محاذ کا نظارہ کریں جس پہ ہم موجود ہیں۔

درس کے بعد ٹہلتے ٹہلتے ہم ترصد موضع جا پہنچے یہ موضع ہمارے پڑاؤ کے سامنے نسبتاً بلند چوٹی پہ واقع ہے۔ اس لئے کونٹر کی تمام تر وادی سامنے بکھری نظر آتی ہے۔ وادی کے درمیان میں دریائے کنٹر کی روانی بہت دلکش لگتی ہے یہیں سے مجاہدین دشمن کی چوکیوں پر نگاہِ غضب رکھتے ہیں۔ مشہور قصبہ

سرکنو کو بھی دور سے دیکھا۔ چونکہ جنگ سے پہلے تجارت کے لئے یہ قصبہ شہرت رکھتا ہے یہیں سے مال چمر کنڈ' دیر باجوڑ ہوتا ہوا سوات' بٹ خیلہ اور سخاکوٹ کی منڈیوں میں پہنچتا تھا، اور میں بھی بغرضِ تجارت ۱۹۴۹ء سے اس علاقہ سے وابستہ رہا ہوں 'اس لئے یہ نام اجنبی ہرگز نہیں ہے۔ چمر کنڈ پاک افغان سرحد پر وہ مشہور گاؤں ہے جہاں مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید بریلوی نے قیام فرمایا تھا۔

یہی قصبہ سرکنو قاری فدا محمد صاحب کا آبائی قصبہ ہے۔ قاری صاحب نے دو سال پیشتر کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا تھا کہ "ہمارا ایک عزیز جو خاد کارکن تھا قصبہ کے دفاع پہ مامور تھا۔ اچانک ایک روز مخابرے (WIRELESS) پہ اس سے رابطہ قائم ہو گیا۔ عزیز نے پوچھا۔ قاری صاحب کیا حال ہے اور کچھ دنوں سے آپ کے راکٹ کیوں خاموش ہیں۔ میں نے جواب دیا وقت کی بات ہے۔ چند روز بعد ہی وہی مکان جس میں میرے یہ عزیز مقیم تھے ہمارے آپریشن کے دوران دستی بم کی زد میں آگیا۔ اس کے جسم کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ پاس ہی دوسرے عزیز بھی موجود تھے جنہوں نے ملامت کی اور جواباً میں نے بھی نہایت سخت الفاظ میں انہیں سرزنش کی"۔ اپنے نظریہ میں ان کی پختگی کا ایک اور واقعہ ایک مجاہد نے یوں بیان کیا کہ "ایک ادھیڑ عمر شخص زخمی حالت میں اوندھا پڑا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا' میں نے سیدھا کیا تو سامنے میرا ہی چچا تھا۔ اگرچہ وہ خلقی تھا' لیکن میرے والد کی مشابہت کے باعث مجھے بہت رحم آیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ چچا! اس کفر سے توبہ کر لو۔ کلمہ پڑھ لو اور اپنی جان طاغوت کے لئے مت دو۔ میں تجھے پاکستان لے جا کر ماہر معالج کو دکھاؤں گا اور انشاءاللہ آپ تندرست ہو جائیں گے۔ اس نے آہ سرد بھرتے ہوئے آہستہ سے کہا' انقلاب میں گیارہ سال گزار دیئے ہیں' اب آخری سانس کلمہ سے اپنی زباں کیوں ناپاک کروں۔ غصہ میں مَیں بے قابو ہو گیا اور کلاشن کوف کے ریپیڈ فائر سے اس کا سر اور گندی زبان ٹکڑے ٹکڑے کر دی"۔ حق اور باطل کی رزم آرائی ازل سے جاری ہے اور رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ابو جہل کو جب دو ننھے مجاہدین نے میدانِ بدر میں پچھاڑا اور اس کی گردن کاٹنے لگے تو ابو جہل نے فخریہ کہا کہ ذرا نیچے سے کاٹنا تاکہ نیزے پہ لٹکی ہوئی معلوم ہو کہ یہ کسی سردار کی گردن ہے۔ درحقیقت جہادِ افغانستان نے مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق پھر یاد دلایا ہے۔ کاش یہ دوبارہ کبھی فراموش نہ کر سکیں۔

بات ہو رہی تھی قاری صاحب کے آبائی قصبہ سرکنو کی۔ یہ دریائے کنڑ کے اِس طرف واقع ہے، اُس پار نو آباد گاؤں ہے۔ دریا پر نو آباد سے موسوم انتہائی مضبوط فولادی پل ہے۔ اور کچھ دوسرے گاؤں چغر سرائے 'اسد آباد' نارنگ 'پشت' دونئی اور بیلہ دریا کی دونوں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ تادمِ تحریر یہ علاقہ مجاہدین کی زد میں تھا لیکن کل کی خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ مجاہدین نے اس تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اب قاری صاحب اپنے ہی قصبہ میں پہنچ کر تمام علاقہ کی قیادت کر رہے ہیں۔

ہماری یہاں آمد سے پہلے سنا ہے کہ پشت قصبہ پر مجاہدین کے سلفی گروپ نے بھرپور حملہ کیا تھا لیکن منصوبہ بندی کے فقدان سے وہ قبضہ نہ کر سکے۔ اس لڑائی میں تقریباً چار صد سے زائد کابل فوجی ہلاک ہوئے تھے اور شہداء کی تعداد بھی بیس کے لگ بھگ تھی۔ خطِ دوم پر ہم نے مجاہدین کے اداس چہرے دیکھے کیونکہ انہیں شہداء کی لاشیں واپس نہیں ملی تھیں۔ لیکن جب انہیں لاشیں مل گئیں تو وہ پھر سے پرسکون تھے۔

اذانِ مغرب تک ہم ترصد کی چوٹی سے درختوں کی آڑ میں چھپ کر تمام علاقے کا منظر دیکھتے رہے۔ گاڑی تو در کنار انسان اور حیوان نما کوئی چیز بھی حرکت میں نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ مویشی تو مجاہدین بطور مالِ غنیمت ہانک لاتے ہیں اور پھر ایک گائے کے عوض افغان گورنمنٹ سے پچاس ہزار افغانی وصول کرتے ہیں۔ نو آباد پل کے قریب دو ٹینک نظر بھی آئے تو وہ مجاہدین کی راکٹ باری سے فوراً دبک گئے۔ نمازِ مغرب کے لئے ہم واپس پڑاؤ پر آ گئے۔ کھانا کھایا اور مجاہدین سے محوِ گفتگو رہے۔ نمازِ عشاء کے بعد مولانا زاہدی صاحب کا درسِ قرآن تھا مگر میں پہرے کی ڈیوٹی کے لئے اپنے مسکنِ فرض پہ جا کھڑا ہوا۔

اگلے روز ایک ضعیف العمر مجاہد میر اکبر کی رہبری میں خطِ اوّل کے لئے روانہ ہوئے۔ پرخطر دشوار گزار راستے کو بناتے سنوارتے ہم سوئے منزل رواں تھے۔ دورانِ سفر میر اکبر اپنے دلیر شہید صاحبزادے اولس خاں کی داستانِ شہادت سناتے رہے۔ اس نے موضع کے سامنے جہاں سفید بیراغ لہرا رہا تھا اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہیں روسیوں نے اسے گھیرے میں لے کر شہید کیا۔ میرا نڈر بے باک دلیر بیٹا انٹی ایئر کرافٹ گن (ANTI AIR CRAFT GUN) کا ماہر تھا اور اسے نشان زد کیا جا چکا تھا۔ اسلام کا یہ سپوت نرغے میں آکر کچھ زیادہ ہی دلیر ہو جاتا تھا۔ اس سمے پہ گھاٹیاں ٹینکوں سے اٹی ہوئی تھیں اور فضا میں ان کی مدد ہیلی کاپٹر کر رہے تھے۔ میرے اولس خاں کے مورچے کے آس پاس آگ برس رہی تھی اور میرا سرفروش شیر زیکویک سے ہر طرف دشمنوں کی لاشوں کے انبار لگا رہا تھا۔ آخر وہ سینے پہ ایک گولی کھا کر خدائے برتر کے ہاں کامران و کامیاب ہوا مگر روسیوں کو ایسا سبق دیا کہ وہ پھر کبھی اس علاقہ کی طرف رخ نہ کر سکے۔ میر اکبر خود بھی نڈر مجاہد تھا اس لئے اپنے زخمی دل کو پشتو اشعار میں سمو کر اپنا اور ہمارا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد ایک پہاڑی پہ ڈھلوان نما میدان نظر آیا جس میں بمباری سے جلے ہوئے درختوں کے جھنڈ دکھائی دیئے۔ میر اکبر نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہیں ہمارے کمانڈر قاری فدا محمد صاحب نے روسیوں کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا تھا۔ اس معرکہ کی داستاں ہمیں قاری صاحب نے کچھ یوں سنائی تھی۔ "اُن دنوں خطِ دوم کی ترصد پر روسیوں کا قبضہ تھا۔ اوپر چوکی پر روسی قابض تھے اور نیچے میدان ہیلی کاپٹروں سے بھرا پڑا تھا۔ ہم درخت کی آڑ میں بے حس و حرکت سکتے کے عالم میں پڑے تھے ـــــــــ ایسے مواقع پر بڑے بھائی کی شہادت نیز دوسرے عزیزوں کی یاد سے میرے اعصاب مفلوج ہو جاتے ہیں۔

س وقت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ کھلی آنکھوں ہم ان کو ہیلی کاپٹروں سے اتر کر اپنی
طرف بڑھتے دیکھ رہے تھے لیکن میں تو جیسے سحرزدہ ہو گیا تھا۔ اپنے ساتھی کو ہدایت تو کیا دیتا خود ہی ہلنے
سے قاصر تھا۔ مشین بھی تھی اور اس میں سو گولیوں سے بھرا ڈبہ بھی...... اس صبر آزما کشمکش میں میرے
مجاہد ساتھی نے کلاشن کوف کا منہ کھول دیا۔ پہاڑوں میں گولیوں کی گونج سے میں بیدار ہوا اور پھر تو میں
نے نصف دائرے کی شکل میں مشین کو گھمانا شروع کر دیا۔ پلاسٹک کے مجسموں کی مانند روسی گر رہے
تھے۔ ان میں ایسی بھگدڑ مچی کہ سنبھل ہی نہ سکے۔ تقریباً پنتالیس روسی کھیت رہے اور زخمیوں کی تعداد
کا ہمیں پتہ نہ چل سکا۔ مغرب کی اذانیں ہو چکی ہوں گی خطرناک صورت حال کا تقاضا بھی یہی تھا،
چنانچہ ہم درختوں کی آڑ میں بخیر و عافیت اپنے مورچے میں واپس پہنچ گئے۔ روسیوں نے وہ رات ترصد کی
چوٹی پر بسر کی کچھ ہیلی کاپٹر لاشوں کو لے جانے کے لئے رکے رہے۔ روسیوں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ لاشوں
کو گلنے سڑنے سے بچانے کے لئے پیٹ چاک کر کے خالی کر دیتے ہیں تب روس واپس بھیجتے ہیں"۔

قاری صاحب کی مختصر داستانِ شجاعت کے بعد آیئے ہم سفر پہ رواں رہیں۔ یہ راستہ دو گھنٹے میں طے
کرنے کے بعد ہم آخری چوکی پہ پہنچے جسے مجاہدین خطِ اول کا نام دیتے ہیں۔ یعنی وہ مورچہ جو عین دشمن
کے سامنے ہو۔ اگرچہ کل بھی ہم نے خطِ دوم سے اس علاقے کو بغور دیکھا تھا لیکن آج ہم دشمن کی
چوکیوں کے بالکل قریب تھے اور قاری صاحب کا آبائی قصبہ سرکنو مجاہدین کی براہِ راست زد میں تھا۔

خطِ اول کے کمانڈر (قومندان) دوست محمد خاں ہیں' جو ہمیں نہایت اخلاص و محبت سے ایک
درخت کی چھاؤں میں لے گئے' قہوہ پلایا اور جہاد کے امور پہ روشنی ڈالتے رہے۔ جناب دوست محمد
خاں نے ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ حالتِ جنگ میں بھی کبھی کبھار دونوں فریقین اپنے اپنے ہاں گانے
بجانے کی محفل سجاتے ہیں۔ چونکہ ایک ہی علاقہ سے متعلق ہیں اس لئے استہزائیہ انداز میں ایک
دوسرے پر روسی امریکی ایجنٹ ہونے کا فتویٰ تھوپتے رہتے ہیں۔ دورانِ گفتگو ایک مجاہد غلام سرور نے
دریائے کونٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا "اس جزیرہ کو بیلا کہتے ہیں یہیں پر ہماری
اپنی زمینیں تھیں' ندی کنارے چارپائی پر بیٹھے ہم مویشیوں کا خالص دودھ اور مکئی کی روٹی
(جوارے) مل جل کر بڑی رغبت سے کھایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے شہتوت کے درختوں کی گھنی
چھاؤں میں جو مزا آتا وہ ناقابلِ فراموش ہے"۔ اگرچہ مجاہدین سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن
قلتِ وقت اور دو گھنٹے کی مزید مسافت کا تصور ہمیں لے اٹھا خچروں کی نقل و حرکت کے لئے راستہ بناتے'
جنگلی میووں سے لطف اندوز ہوتے ہم بالآخر عصر سے قبل ہی اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہاں آ کر میدان
گرم پایا۔ خطِ اول سے پیغام ملا تھا کہ نو آباد پل کے قریب دشمن کے ٹینک حرکت میں ہیں۔ وہیں سے
جمعیت کے موضع کو نشانہ بنایا جا رہا تھا تقریباً سات گولے تو ہمارے سروں سے گزرتے ہوئے جمعیت
کے ٹھکانے کے نزدیک پھٹے لیکن نقصان ہرگز نہ ہوا جمعیت کا موضع ہماری قیام گاہ کے سامنے چوٹی پر

واقع تھا یہ ایک طویل پہاڑی سلسلہ ہے۔ اب جو مجاہدین نے بیم ایک (BEAM ONE) سے میزائل برسانے شروع کئے تو پورے علاقے میں تباہی مچادی۔ موقع غنیمت جان کر فضل واحد صاحب اور میں نے بھی ایک ایک میزائل داغا۔ نشانہ درست رہا اور ہمیں قلبی سکون ملا۔ تمام میزائل پل کے نزدیک آر پار برس رہے تھے چنانچہ جلد ہی بزدل دشمن کے ٹینک خاموش ہو گئے۔ ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ عید کے فوراً بعد حملے (عملیات) شروع ہوں گے اسی لئے ہم نے جہاد میں شرکت کا چھ روزہ پروگرام ترتیب دیا تھا لیکن ہماری بد نصیبی کہ اس دوران کوئی خاص معرکہ پیش نہ آیا یہ حملے کیوں نہ ہوئے اس کا علم صرف بالائی سطح پر کمانڈروں ہی کو ہوتا ہے۔ ڈیوٹی تو ہماری خطِ دوم پر ہی تھی، لیکن چونکہ فرصت ہی فرصت تھی اس لئے ہم نے ظہر تک ترصد پر متعین مجاہدوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے قاری صاحب سے اجازت طلب کی اور انہوں نے ہمیں بخوشی اجازت دے دی۔

آدھ گھنٹہ بعد ہم ترصد کی چوٹی پر تھے جہاں ایم ایم ۸۲ توپ نصب تھی۔ جسے وہ اپنی زبان میں "ہشتاد ودو" کہتے ہیں۔ چونکہ یہ چوٹی دشمن کی تیز دوربین سے بخوبی نظر آتی ہے اس لئے بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ بے احتیاطی میں کئی مجاہدین جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ مجاہدین کا کہنا تھا کہ یہ کافر آجکل ہم سے چھیڑ چھاڑ سے گریز کرتے ہیں لیکن مہمان نوازی کا تقاضا ہے کہ ہم محتاط رہیں۔ اگرچہ کونٹر افغانستان کے دیگر محاذوں مثلاً پکتیا' پنج شیر' قندھار' ہرات' بدخشاں' لوگر' بریکوٹ اور غزنی سے مختصر ہے بلکہ عشر عشیر بھی نہیں تاہم یہاں پہنچ کر ایک عظیم معرکہ آرائی کے نشانات ملتے ہیں یہاں تقریباً سبھی پہاڑ عرفات اور منیٰ کی پہاڑیوں کی طرح سامان سے اٹے پڑے ہیں۔ پلاسٹک' ٹین کے خالی ڈبے' کیپسول' چھوٹے بڑے کارتوسوں کے خول' بموں کے ٹکڑے' جنگی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کے ڈھانچے غرضیکہ انسان کی حیات و موت کا ہر مواد یہاں موجود رہا ہے۔ ترصد کی مسجد سے نیچے پہاڑ کاٹ کر انتہائی محفوظ مورچہ بنایا گیا ہے قرار گاہ کی طرح یہاں بھی غار نما تہہ خانہ ہے، جو کسی بھی ہنگامی حالت میں کار آمد ہے۔

بارہ بجے تک ہم ترصد میں مجاہدین سے محوِ گفتگو رہے اور پھر نمازِ ظہر کے لئے اپنی قیام گاہ کو چل دیئے۔ کھانے کے بعد سونے کا ارادہ کیا لیکن گرمی اور مکھیوں نے نیند اڑا دی۔ رات کو پہرہ ہوتا تھا، اس لئے دن کو آرام کی خواہش بس خواہش ہی ہوتی۔

قاری فدا محمد صاحب سے ہماری ملاقات تو انتہائی خوشگوار رہی تھی لیکن شاید انہیں راس نہیں آئی وہ اچانک صاحبِ فراش ہوئے۔ میں نے نبض سے اندازہ لگایا کہ حرارت ۱۰۳° درجہ تو ضرور ہوگی۔ یہاں تو ابتدائی طبی امداد کا بھی انتظام نہیں ہے۔ متعلقہ شعبہ کے تحریکی بھائیوں سے استدعا کروں گا کہ وہ میڈیکل ایڈ کا خاطر خواہ بندوبست فرمائیں اور گاہے گاہے وہاں اپنی طبی خدمات پیش کریں، کیونکہ محاذِ جنگ انتہائی تندرستی کا متقاضی ہے۔

اگلے روز نمازِ فجر کے لئے بہ سبب نقاہت قاری صاحب نے مجھے امام بنایا اور اصرار کیا کہ درس

قرآن بھی دوں۔ میں نے سورۃ الصف کی ابتدائی تین آیات پر روشنی ڈالی۔ ویسے مجاہدین کو درسِ قرآن دینا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ کہاں یہ میدانِ کارزار کے مجاہد اور کہاں ہم زبانی جمع خرچ کے بندے۔ لیکن ان سے خطاب کو میں نے باعثِ سعادت جانا اور ثواب لوٹا۔ درس کے بعد اپنی قیام گاہ پر باسی نان اور بغیر دودھ کی چائے کا ناشتہ کیا۔ ایسی لذتیں محاذِ جنگ پہ ہی نصیب ہوتی ہیں۔

پانچویں روز کا آغاز قاری صاحب کی جامع دعا سے ہوا جو انہوں نے نماز فجر کی دوسری رکعت میں رکوع اور سجدہ کے درمیان پڑھی۔ (قاری صاحب اب قدرے تندرست تھے) یہی قنوت نازلہ رمضان المبارک میں حرم پاک میں دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ لیکن ان کوہساروں میں جو سوز و گداز اور کیف و سرور محسوس کیا اسے الفاظ کا روپ دینا ممکن ہی نہیں۔ گھنٹوں اس کا کیف قلب پہ طاری رہا۔ مجاہدین کے لئے ہچکیوں کے درمیان آمین کہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہنگامی صورتِ حال اور میدان جہاد میں معرکہ آرائی کے دوران قنوتِ نازلہ کا پڑھنا سنتِ رسولؐ ہے۔ قاری صاحب نے روسی لیڈروں، افغانی حکمرانوں اور تمام اعدائے دین میں سے ایک ایک کا نام لے کر بددعا کی۔ مجھے احساس ہوا کہ دین کے جوہر تو میدانِ جہاد ہی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ نیز فہمِ دین بھی جہاد کا مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے جہاد کو چوٹی کا عمل قرار دیا ہے۔ میدان جہاد میں شدت سے احساس دامن گیر رہتا ہے کہ بندگی، تزکیۂ نفس اور عبادات کے تمام اصول و فروعات معاونینِ جہاد و قتال ہیں اگر ان کا رخ جہاد کی جانب نہ ہو تو سراسر ضلالت و گمراہی ہے، ایسی گمراہی جس کا احساس و ادراک بھی انسان کو نہیں ہوتا بقول علامہ اقبال۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

عید کے موقع پر ہم نے مجاہدین کی حالتِ زار سے متاثر ہو کر گائے ذبح کر کے اور اسے پکوا کر تینوں مورچوں تک پہنچانے کا پروگرام بنایا تھا۔ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لئے حزبِ اسلامی کے چند اکابرین بھی رات تک پہنچ چکے تھے۔ گمانِ غالب تھا کہ شاید علاقے میں پیش قدمی کا پروگرام لے کر آئے ہوں۔ اس لئے بھی ہم نے یہ موقع غنیمت جانا۔ تمام مجاہدین و اکابرینِ حزبِ اسلامی کو ہماری طرف سے دعوت دی گئی۔ دوپہر کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ اکابرین رخصت ہو گئے اور قاری صاحب بھی ضروری کام سے قرار گاہ چلے گئے۔ ہم چونکہ چشمہ پر غسل کے لئے چلے گئے تھے واپسی پر معلوم ہوا کہ قاری صاحب نے پیغام دیا ہے کہ آئندہ کا پروگرام معلوم نہیں ہے اس لئے اگر آپ واپس جانا چاہیں تو کل مجھے قرار گاہ میں ملتے جائیں۔

اگلے ہی روز واپس جانے کا پروگرام ٹھہرا' محاذ پر اپنے اس قیام کو سعادت جان کر بعد از عصر میں نے درسِ قرآن دیا۔ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۵ کا انتخاب کیا اور مقدور بھر جہاد فی سبیل اللہ' اس کی اہمیت' طریقۂ کار اور فوائد کو اجاگر کیا۔ رب کریم ہماری ان ادنیٰ کاوشوں کو قبول فرمائے۔

اگلے روز علی الصبح نماز فجر کے بعد ہم نے قرار گاہ کا قصد کیا۔ میرے بزرگ بھائی کے دورانِ سفر پاؤں زخمی ہو گئے تھے' مجاہدین نے سرحد تک ان کے لئے خچر کا بندوبست کر دیا تھا چنانچہ وہ سیدھے ناواپاس روانہ ہو گئے۔ لیکن ہم حسب پیغام قاری صاحب سے ملنے قرار گاہ پہنچے۔ مخابرے (WIRELESS) پر ہماری روانگی کی اطلاع انہیں مل چکی تھی اس لئے منتظر بیٹھے تھے۔ قاری اور انجینئر ظریف صاحب نے ہمیں الوداعی قہوہ پلا کر بڑی محبتوں سے رخصت کیا۔ ناواپاس پہنچے تو وہاں بھائی بشیر صاحب بھی موجود تھے۔ یہیں سے ایک ڈاٹسن پک اپ کے ذریعہ عباس غونڈ پہنچے' جہادی وردیاں ان کے حوالہ کیں اور تیمر گرہ چل دیئے۔ احیاء العلوم تیمر گرہ میں سلیپنگ بیگ واپس کر دیئے' جناب رئیس احیاء العلوم یوسف صاحب نے ظہرانے سے شاد کام کیا۔ جناب یوسف صاحب رموزِ جہاد پہ خاصی دسترس رکھتے ہیں' ان سے اور دیگر مجاہدین سے مختلف محاذوں کے متعلق مفید گفتگو ہوتی رہی۔ چار بجے ہم نے یوسف صاحب اور مجاہدین سے اجازت طلب کی اور سوات کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس طرح ہمارا یہ روح پرور' تجربات سے پُر' ایمان افروز' مقدس اور انوکھا سفر اختتام پذیر ہوا۔

قارئین حضرات! اگرچہ ہمارا یہ سفر ختم ہو چکا ہے لیکن حق و باطل کی رزم آرائی ہنوز جاری ہے اور انشاء اللہ بہت جلد افغانستان میں خالص اسلامی مملکت قائم ہو گی۔ آمین۔

مکالمہ

دسمبر ۸۸ء میں منعقدہ محاضراتِ قرآنی (کراچی) میں

امیر تنظیم اسلامی اور مدیر تکبیر کی "گفت و گو"

جسے کیسٹ سے من و عن نقل کیا گیا ہے

صلاح الدین صاحب...... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! سب سے پہلے تو میں سامعین کی طرف سے 'اپنی طرف سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اسلامی ریاست اور سیاست کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی اور اس کا ایک مکمل تصور سامنے رکھا..... لیکن جیسا کہ ہر تقریر اور گفتگو کے دوران کچھ سوالات ذہن میں اٹھتے ہیں جو تھوڑی سی مزید وضاحت چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے چار پانچ سوالات نوٹ کئے ہیں جس سے وہ الجھن رفع ہونے میں مدد ملے گی..... (ڈاکٹر صاحب کی آواز..... انشاء اللہ) جو میں نے اور شاید دوسرے لوگوں نے محسوس کیا ہے۔

پہلی بات یہ کہ جو بنیادی آیت حدودِ اطاعت کے سلسلے میں آپ نے تلاوت فرمائی۔ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ" ایک تو یہ کہ اس میں یہ اطاعت الگ الگ ہے یا یہ ایک مربوط سلسلہ ہے کہ جو شخص اولی الامر منکم 'میں سے اللہ کی اطاعت کرنے والا ہو' رسول کی اطاعت کرنے والا ہو گا اس کی اطاعت کی جائے گی اگر وہ ان سے بالکل ہٹ کر خود اپنی اطاعت کروانا چاہے 'خواہ وہ مسلمانوں ہی میں سے ہو اور پہلی دو اطاعتوں کی کوئی اس کے اندر اور علامت نہ پائی جاتی ہو' اللہ کی اطاعت کی اور رسول کی اطاعت کی بلکہ اس کے اندر بغاوت یا گریز کی ساری علامات موجود ہوں تو کس درجے میں ہمیں اس کی اطاعت کرنا چاہئے اور کہاں اس کی اطاعت ساقط ہو جاتی ہے ایک وضاحت تو یہ درکار ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... اصولی طور پر تو اس کو RESIST کرنا لازم ہے مسلمانوں کے لئے..... اب RESISTANCE کی کیا کیا شکلیں ہوں' آیا وہ کوئی مسلح بغاوت ہو یا AGITATION ہو' اس لئے کہ "DEMOCRATIC PROCESS" کسی معاشرے میں جاری ہو تو اسی کو اختیار کیا جائے پھر یہ حالات پر بھی DEPEND کرے گا کہ جس نوع اور درجے کا انحراف اس پر بھی اس کا دارومدار ہو گا

چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ کفر بواح کا حکم ہو تو "لاطاعة لمخلوق فی معصیته الخالق" اور "لاسمع و لاطاعه" پر عمل ہو گا یعنی نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنا ہے البتہ خروج' بغاوت اور مسلح اقدام کی جو شرائط ہیں' وہ ایک طویل معاملہ ہو جائے گا اس لئے کہ فقہا کے مابین اس میں اختلاف ہے اور مجھے امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کی رائے سے اتفاق ہے کہ مسلمان فاسق و فاجر حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت بھی جائز ہے لیکن اس کی شرائط بڑی سخت ہیں یعنی اتنی طاقت حاصل کی جا چکی ہو کہ کامیابی بظاہر احوال یقینی نظر آئے یہ نہیں کہ چند لوگوں کو کھڑا کیا' ایک ہنگامہ برپا کیا اور انہیں مروا دیا یہ نہیں...... بلکہ اس کے لئے وہی REVOLUTIONARY PROCESS لازم ہو جائے گا جو میں بیان کرتا رہتا ہوں اور جو انشاء اللہ چار جنوری کو پھر سامنے آئے گا' مختصراً یہ کہ پہلے آپ کو جمعیت فراہم کرنا ہو گی' منظم جمعیت ہو ان کے اندر قوت ہو ان کی تعداد کافی ہو وغیرہ وغیرہ' بہرحال یہ تو ہیں ان کی TECHNICAL DETAILS۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک مسلمان پر لازم ہے منکرات کو RESIST کرنا اور یہ RESISTANCE نہی عن المنکر کے ان تینوں مدارج کے ساتھ ہو گی یعنی "بالید' باللسان اور بالقلب" اور بالقلب جو ہے وہ سب سے ادنیٰ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ "ذٰلک اضعف الایمان" اور "لیس وراء ذٰلک من الایمان حبة خردل" گویا اگر طاقت حاصل ہو جائے اور اس کی شرائط پوری ہو جائیں تو نہی عن المنکر ہاتھ سے یعنی قوت کے ساتھ ضروری ہے!۔

صلاح الدین صاحب...... اسی میں ایک شرط یہ بھی عائد کی جاتی ہے کہ کم سے کم وہ نماز قائم کرتا رہے...... اگر وہ تارک صلوٰۃ ہو تو پھر اسی سلسلہ میں..........

ڈاکٹر صاحب...... نہیں...... میں اس موضوع پر مزید میں نہیں جاؤں گا۔ نہ میں اس کے لئے PREPARED ہوں اور نہ ہی یہ اس وقت کا موضوع ہے۔

صلاح الدین صاحب...... جی بہتر' اگلا سوال یہ ہے کہ شوریٰ کے سلسلے میں آپ کی رائے سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ 'EVOLUTIONARY PROCESS' کے ذریعے اور وہ جو انفرادی قیادت تھی یعنی بادشاہت یا قبائلی سردار سے منتقل ہوتے ہوتے وہ اب ایک اجتماعی صورت میں سامنے آئی ہے...... لیکن یہاں ایک سوال اور جو پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے فقہا نے جہاں شوریٰ کا ذکر کیا ہے کہ وہ COLLECTIVE ادارہ ہے اور اسے DECISION MAKING کا کام کرنا چاہئے اور ڈیموکریسی میں تو درحقیقت انتظامیہ اور مقننہ تو اپنی جگہ ہے لیکن انتظامیہ بھی اس کے رکن ہونے کی وجہ سے انتظامیہ ہے وہ اس کا ایک PART ہے۔ سوال یہ ہے کہ مستشار کی بھی کچھ شرائط عائد کی گئی ہیں (یا نہیں؟) آپ نے حقوق کی بات کی کہ اگر حضرت ابو بکرؓ اور عبداللہ ابن ابی ایک باپ کے بیٹے ہوتے تو وراثت

سان تقسیم ہوتی' مسئلہ وراثت اور حقوق کی یکسانیت کا نہیں' اہلیت کا ہے مثلاً ہر شہری اس بات کا حق
کھتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے سرمائے سے ہسپتال قائم کرے لیکن ہسپتال قائم کرنے کے بعد وہ اس
ت کا پابند ہے کہ کم از کم اس (شخص) کو ڈاکٹر (کی حیثیت سے) رکھے جس کے پاس ڈاکٹری کی
یادی سند موجود ہو' ہر شہری کو ہم اس کے اندر بطور ڈاکٹر شریک نہیں کر سکتے اس طریقے سے شوریٰ کے
دارے میں جانے والے لوگوں کے بارے میں مسلمانوں کو یہ اطمینان ہونا چاہئے کہ وہ قرآن و سنت
کے تحت چونکہ قانون سازی کرنے جا رہے ہیں اس لئے اس کے اندر کم از کم امیدواری کی شرائط ضرور
ونی چاہئیں اور آپ نے خود بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ خلافت راشدہ تو ان شخصیات کی وجہ
سے ہے اگر وہ شخصیات نہ ہوتیں تو نظام نہ چلتا...... تو سوال یہ ہے کہ ہم اگر خلافت راشدہ کی وہ شخصیات
نہیں لا سکتے تو کیا شرائط کو بالکل معطل یا ساقط کر دیں یا کہیں نہ کہیں اس کا کوئی لحاظ رکھا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب...... میرا یہ خیال ہے کہ یہ POST- REVOLUTIONARY PROCESS کی بات ہے اور
اس وقت شرائط بھی متعین کی جا سکتی ہیں جیسے میں تجویز کر رہا ہوں کہ ووٹر کی عمر چالیس سال کر دی
جائے۔ ایسے ہی REVOLUTION کے بعد جو رائے عامہ ہو گی وہ جب قبول کرے گی ان شرائط کو تو وہ
شرائط بھی عائد ہو جائیں گی لیکن فقہائی بحثوں کا حوالہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے حالات کے ساتھ
REFERENCE نہیں رکھتا یہ اس دور کی بات ہے جبکہ اسٹیٹ کے یہ تین آرگن یعنی مقننہ' انتظامیہ
اور عدلیہ علیحدہ علیحدہ DEFINED نہیں تھے اب جیوڈیشری کا جو ایک مقام معین ہو چکا ہے اور دستور
بالاتر دستاویز کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا ہیڈ آف دی اسٹیٹ حتیٰ کہ خود پارلیمنٹ
سب اسی دستور ہی کے تحت کام کرتے ہیں اور دستور میں ترمیم کو بہت ہی مشکل اور محال بنا دیا جاتا ہے
تاکہ وہ موم کی ناک نہ بن جائے بلکہ اس کے ساتھ ایک دوام اور تسلسل ریاست کے امور کا برقرار رہے
اس اعتبار سے اس وقت وہ مضرتیں اس میں نہیں رہیں گی...... اور ظاہر ہے کہ اسلامی ریاست میں
جیوڈیشری کے لئے شرائط لگائی جا سکتی ہیں کہ جج کون ہوں گے ان کے لئے لازمی تعلیم کا کیا معیار ہو گا۔
لیکن واضح رہے کہ وہ ایک علماء بورڈ کی حیثیت سے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی حیثیت منصفوں
(TUDGES) کی ہو گی...... (صلاح الدین صاحب کی آواز...... صحیح) میرے نزدیک ان تین
ORGANS کی تعیین در حقیقت کہ PROCESS OF EVOLUTION کا وہ ثمرہ ہیں جو بہت ہی عمدگی
کے ساتھ ان مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

صلاح الدین صاحب...... آپ نے ایک اصطلاح کی بہت خوبصورت وضاحت کی ہے۔ THEO-DE-
MOCRACY تھیوڈیموکریسی کہ اسلامی ریاست ڈیموکریسی بھی ہے اور ساتھ ساتھ اس میں
مذہب بھی شامل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان شرائط کو ساقط کر دیا جائے مثلاً حضرت عمرؓ نے چھ

افراد کا انتخاب ان کی اہلیت کی بنیاد پر کیا تھا کہ ان میں سے جس کو چاہو کرو..... اگر وہ آزاد چھوڑ دیتے تو لوگ اس کا لحاظ کئے بغیر کسی کو بھی منتخب کر سکتے تھے۔ یہی وہ بات ہے کہ THEO-DEMOCRACY کی اصل SPIRIT کو اس طرح انہوں نے MAINTAIN کیا کہ لوگوں کو انتخاب کا اختیار بھی دے دیا اور یہ اہتمام بھی کیا کہ کہیں ایسے کو منتخب نہ کر دیں جو یہ ضروری شرائط پوری نہ کرتے ہوں۔ تو آج اگر ہم اپنی پارلیمینٹ کو تھیوڈیموکریسی کی اسی شرط اور سپرٹ کے ساتھ رکھنا چاہیں تو یہ THEO کی شرط کیسے پوری ہو گی جب تک کہ مستشار کی وہ شرائط اس کے اندر عائد نہیں کی جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب..... آپ نے میری ایک بات پر شاید توجہ نہیں کی کہ میں نے عرض کیا تھا کہ حضورؐ نے کوئی شرط نہیں لگائی تھی، کوئی بورڈ نہیں بنایا تھا، کوئی نامزدگی نہیں کی تھی، تو حضرت عمرؓ کی سنّت سے پہلے تو حضورؐ کی سنّت موجود ہے۔ یہ میرے نزدیک ایک بہت بڑا VOTE OF CONFIDENCE تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تربیت دیئے ہوئے صحابہ کرامؓ کے حق میں ظاہر کیا ہے کہ آپؐ کو پورا اعتماد تھا کہ بغیر کسی ایسے DIRECTIVE اور تعیّن کے امت صحیح فیصلہ کرے گی..... اس اعتبار سے میرے نزدیک یہ چاروں راستے کھلے ہیں، میں نے اس لئے کہا تھا کہ کوئی راستہ معین نہیں ہے یہ طریقہ بھی درحقیقت "اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ" کے تحت طے ہو جائے گا..... اور COLLECTIVE رائے عامہ جب اسلام کے حق میں جب اپنے آپ کو ASSERT کرے گی تو پھر یہ ساری چیزیں اسلام کے مطابق ہو جائیں گی۔

صلاح الدین صاحب..... لیکن ڈاکٹر صاحب! ایسا بھی نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی منشاء کے اظہار کا کوئی اشارہ.........

ڈاکٹر صاحب..... اصل میں اس طرح بحث پھر لمبی ہو جائے گی اور اس میں شیعہ سُنّی کی بحث بھی آ جائے گی۔

صلاح الدین صاحب..... نہیں شیعہ سُنّی کی بحث قطعاً نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے......... (ملی جلی گفتگو)

ڈاکٹر صاحب..... دیکھئے یہاں کا فارمیٹ (FORMAT) یہ ہے کہ آپ حضرات کو سوالات کرنا ہیں، کسی ایک مسئلے کے اوپر لمبی بحث نہیں ہو سکتی۔

صلاح الدین صاحب..... میں تو بحث کر ہی نہیں رہا۔ میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ حضورؐ نے اشارہ ضرور کر دیا تھا کہ میرے مصلے پر نماز پڑھانے کے لئے کون آدمی زیادہ اہل ہے..... یہ اشارہ جو ہے کم از کم ایک امامت کے لئے یا خلافت کے لئے یا آپ کے بعد کے لئے، کسی منصب کے لئے ہمیں ایک.........

ڈاکٹر صاحب...... لیکن یہ اشارہ اتنا خفی تھا کہ انصار کی سمجھ میں نہیں آیا! (حاضرین کی آواز میں واہ واہ......)

ابھی آپ سمجھئے بات کو کہ وہ اشارہ اتنا خفی تھا کہ انصار کی سمجھ میں نہیں آیا..... انصار تقیفہ بنی ساعدہ میں جمع تھے اور فیصلہ کر رہے تھے اور وہاں پر تو بیعت ہونے ہی والی تھی حضرت سعد ابن عبادہؓ کے ہاتھ پر۔

صلاح الدین صاحب...... لیکن پھر WITHDRAW کر لیا انہوں نے' ودڈرا کر لیا انہوں نے..... عورت کی سربراہی کے بارے میں آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سلسلے میں میری صرف ایک گذارش ہے۔ میرے سامنے میثاق کا وہ خصوصی شمارہ ہے جس میں "اسلام میں عورت کا مقام" کے عنوان سے آپ نے بڑی تفصیل سے اسی موضوع پر بحث کی ہے۔ مسئلہ صرف عورت یا مرد کا نہیں ہے 'مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے جو ستر' حجاب اور عورت کی ذمہ داری اور اس کے مقام سے بحثیں کی ہیں آخر بینظیر بھٹو صاحبہ جو وزیر اعظم ہیں ان سے مستثنیٰ کس بنیاد پر قرار دی جا رہی ہیں اس سے قطع نظر کہ منصب کیا ہے۔ یعنی معاشرے میں ان کا مقام آپ کی ان ساری تشریحات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگر نہیں رکھتا تو اس سے استثنا کا کیا جواز ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... ان کے ساتھ مطابقت بیگم عفیفہ ممدوٹ کی کتنی ہے؟ (حاضرین کی واہ واہ کی آوازیں.....)

صلاح الدین صاحب..... ان کی بھی نہیں ہے..... (حاضرین کی آوازیں جاری ہیں..........)

ڈاکٹر صاحب..... سوال یہ ہے کہ یہ سارا کام جو کیا دھرا ہے ہم سب کا ہے 'ہم سب ہی اس میں مجرم ہیں اور برابر کے شریک ہیں۔

صلاح الدین صاحب..... آپ شریعت کی ترجمانی کریں۔

ڈاکٹر صاحب..... وہ میں کر رہا ہوں کہ یہ اسلام کے خلاف ہے..... میں نے کہا ہے اور وضاحت سے کہا ہے 'میری تقریر چھپی ہے' میثاق میں چھپی ہے 'ندا میں چھپ چکی ہے!..... چلئے..............

صلاح الدین صاحب..... تو گویا اگر کوئی عورت منصب وزارت پر ہو جائے تو اس کے بعد..........

ڈاکٹر صاحب..... میں نے تو ابھی اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ میں تو عورت کو اسمبلی کا ممبر بھی بنانے کو بھی تیار نہیں۔

صلاح الدین صاحب..... ایک اور بات' آپ نے مثال دی ہے کہ علماء کو سرے سے..... میرا خیال ہے' یہ میری تجویز بھی ہے اور میں آپ سے پوچھنا بھی چاہتا ہوں کہ یہ بات صحیح ہے کہ اہل دین کے کرنے کا کام اصلاً تو وہی ہے جس کی طرف آپ نے نشاندہی کی ہے لیکن ساتھ ساتھ کیا یہ قدغن بھی لگائی

جا سکتی ہے کہ علماء کو سرے سے اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے یا اس کی گنجائش موجود ہے کہ وہ بھی CANDIDATE بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب...... عجیب بات ہے! آپ نے شاید میری تقریر سنی نہیں، میں نے تو کہا ہے کہ وہ اس میں حصہ لے سکتے ہیں، وضاحت سے کہا ہے میں نے، بالواسطہ بھی وہ اس کے اوپر اثرانداز ہو سکتے ہیں اور بلاواسطہ حصہ بھی لے سکتے ہیں۔ اب بھی لے رہے ہیں، مفتی محمود صاحب نے بھٹو صاحب کو شکست دی تھی، نورانی میاں صاحب کا میں نے تذکرہ کیا تھا...... تو کیوں یہ شبہ آپ کو ہوا......؟

صلاح الدین صاحب...... اچھا! اسی طریقے سے آپ نے مثالیں دی تھیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کی، وہیں بالکل متصل ایک مثال اور ہے قاضی ابو یوسفؒ کی...... قاضی ابو یوسف صاحب نے وہ منصب قبول کر لیا جس منصب کو حضرت ابو حنیفہؒ نے مسترد کر دیا تھا اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کتاب جو حضرت امام ابو حنیفہؒ نے مرتب کی تھی وہ قاضی ابو یوسف کی اس قوت نافذہ کی وجہ سے مملکت میں ایک وسیع دائرے کے اندر نافذ ہو گئی...... تو یہ معاملہ صرف اورنگ زیب عالمگیر پر نہیں بلکہ اس سے پہلے وہیں ہمارے سامنے ایک مثال موجود ہے...... اگر وہ شورٰی دین کا علم نہ رکھنے والوں کے پاس ہو کردار کے لحاظ سے منکرات زدہ لوگوں کے پاس ہو اور کردار کی جو بنیادی شرائط اسلام نے نافذ کی ہیں، ان سب سے وہ بالکل خالی اور حارب ہو تو پھر اس کے نفاذ اور تشریعی قوانین جو بننے ہیں قرآن و سنت سے اس کا کتنا امکان باقی ہے۔

ڈاکٹر صاحب...... دیکھئے! میں عرض کروں گا کہ اس میں جو قاضی ابو یوسفؒ کا طرز عمل امام اعظم ابو حنیفہؒ کے طرز عمل سے مختلف ہے تو اس ضمن میں میری توجیہ وہی ہے جو امیر معاویہؓ کے طرز عمل اور حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ چاروں کے طرز عمل میں ہے یعنی انہوں نے اپنے بیٹے کو نامزد کیا اور اس کے لئے بیعت ولی عہدی لی ...... تاہم میں سمجھتا ہوں کہ میرا ایمان نہیں قائم رہے گا اگر ایک لمحے کے لئے بھی میں حضرت امیر معاویہؓ کی نیت پر حملہ کروں...... میرے نزدیک انہوں نے وقت کے حالات کا تقاضا یہی سمجھا کہ بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ گیا ہے اور کبار صحابہ کی جماعت اب رخصت ہو گئی ہے، اب اس وقت جو معاشرہ ہے، اس کی شیرازہ بندی کے لئے یہ اقدام ضروری ہے...... گویا ایک قدم نیچے اترے ہیں وہ...... چنانچہ پوری اُمت مانتی ہے کہ ان کے دور حکومت اور نظام کا وہ مقام نہیں ہے جو حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کا ہے۔ یہی

لے معلوم نہیں صلاح الدین صاحب نے کس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اور 'قوت نافذہ' کے قاضی ابو یوسفؒ کے ہاتھ میں ہونا چہ معنی دارد!

ق ہے میرے نزدیک کہ قاضی ابو یوسفؒ نے بھی وقت کا یہ تقاضا سمجھا اور اسی کو اختیار کر لیا..... اس
ت تک وہ فقہ اس طرح مرتب شکل میں بھی نہیں تھی جس شکل میں کہ فتاویٰ عالمگیری مرتب ہوئے
ں ' اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں..... اسی لئے ان میں ایک بنیادی نوعیت کا فرق بھی ہے اور
ِرے یہ کہ میرے نزدیک اعلیٰ تر مقام وہی ہے جو حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔ البتہ جو
ضی صاحب نے قبول کیا وہ میں سمجھتا ہوں کہ RULE OF NECESSITY کے تحت انہوں نے اس
ت حالات کے لئے انسب سمجھ کر قبول کر لیا' لیکن ہے وہ درجے میں کم تر!

صلاح الدین صاحب..... ہاں یہ بات صحیح ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... الحمدللہ............

صلاح الدین صاحب..... لیکن جو میں عرض کرنا چاہ رہا تھا وہ یہ کہ قوت نافذہ کی وجہ سے وہ بہر حال
ؤثر ہو کر نافذ ہو گیا..... اسی طریقے سے آج کی پارلیمنٹ میں بھی اگر اہل دین کی اکثریت ہو اور
ستشار کی جو شرائط ہیں وہ پیش نظر رکھی جائیں تو اس کے نافذ ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب..... یہ تو بہت بڑا "اگر" ہے یہ ہو جائے تو اسلام آ جائے گا بس............!

بقیہ: تذکرہ و تبصرہ

ہمارا چھوٹا سا قافلہ یعنی راقم الحروف خود' میری اہلیہ 'میری سب سے چھوٹی بچی اور اس کا بچہ یعنی میرا نواسہ ' اور رفقائے گرامی قمر سعید قریشی اور مولانا فیض الرحمٰن صاحب جمعرات ۵ر جنوری کی رات کو جدہ پہنچے اور چونکہ اس بار ویزا صرف دو ہفتے کا ملا تھا اور زیادہ وقت ہم مکہ مکرمہ میں بسر کرنا چاہتے تھے' لہٰذا ایئرپورٹ سے سیدھے حرم شریف پہنچے اور دونوں باہمت رفقاء نے تو شبِ جمعہ ہی میں تہجد کے وقت مناسکِ عمرہ مکمل کر لئے...... میں نے اور خواتین نے جمعہ کی صبح یہ سعادت حاصل کی۔ علاوہ ازیں اس بار کسی تصنیف و تالیف کا پروگرام بھی نہیں تھا بلکہ خواہش یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ سعادت قربِ بیت اللہ کی حاصل کی جائے۔ خصوصاً حرم کی با جماعت نماز کوئی نہ چھوٹے' لہٰذا ہم نے ایک خاصے گراں معاوضے پر ایک فلیٹ (شقہ) حرم کے بہت قریب حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ابھی وہاں ڈھائی دن ہی گزرے تھے کہ ایک نئے کرم فرما فاروق چشتی صاحب جن سے غائبانہ تعارف رفیق گرامی زین العابدین صاحب (کراچی) کی وساطت سے ہو چکا تھا لیکن ذاتی ملاقات پہلی ہی تھی' کشاں کشاں اپنے "دولت خانے" پر لے گئے۔ اور الحمد للہ کہ یہ بھی حرم سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ اور اپنے قیام مکہ مکرمہ کے بقیہ آٹھ دن ہم جملہ اعتبارات سے' بالکلیّہ ان کے "مہمان" رہے...... اور انہوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

یہ ساری تفصیل بے مقصد بیان نہیں ہوئی' اس کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ "تکبیر" کا ۱۲ر جنوری والا شمارہ سعودی عرب میں غالباً ۷ر یا ۸ر جنوری ہی کو پہنچ گیا تھا۔ اور ہم نے متعدد حضرات سے حرم ہی میں موعودہ مضمون کا تذکرہ بھی سنا اور اس کے ضمن میں چہ میگوئیاں بھی کانوں میں پڑیں لیکن دل میں ارادہ یہی رہا کہ اسے سرزمین حرم میں پڑھ کر طبیعت کو منغّض نہیں کروں گا۔ مبادا یہاں کی سعادتوں اور برکتوں میں کمی آ جائے...... پاکستان کا قصہ پاکستان واپس جا کر ہی نبیڑا جانا بہتر ہے............ لیکن جب ہمارے میزبان فاروق چشتی صاحب نے اصرار کیا کہ اس پر ایک نظر ضرور ڈال لیں تو میں انکار نہ کر سکا...... اور اب جو میں نے اس پر سرسری نظر ڈالی تو واقعہ یہ ہے کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ایک بار تو زمین اور آسمان سب گھومتے ہوئے محسوس ہوئے...... اس لئے کہ مدیر "تکبیر" کے

ساتھ میرے حسن ظن کے تمام شیشے چکنا چور ہو کر رہ گئے..... اور میں حیران و ششدر رہ گیا کہ
ظاہراً اتنے متین اور متدین شخص نے میری کردار کشی کی کوشش میں جملہ "معروف"
ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ غلط بیانی اور تہمت و افترا کے تمام "منکر" ہتھکنڈے بھی استعمال
کر ڈالے!۔ گویا ؎

"ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا"

ابتدائی چند صفحات پڑھ کر جب میں نے بقیہ کے ضمن میں چشتی صاحب سے معذرت کر لی کہ
پورا مضمون میں پاکستان واپس جا کر ہی پڑھوں گا تو شاید انہوں نے میرے دل کی یہ بات بھانپ
لی کہ میں اس تحریر کے ضمن میں "قالوا سلٰماً" پر عمل کروں گا اور کوئی جواب نہیں دوں گا
تو انہوں نے بار بار اصرار کر کے مجھ سے یہ وعدہ حاصل کر ہی لیا کہ میں اس کا مفصل جواب تحریر
کروں گا..... یہی وجہ ہے کہ میں یہ مفصل تحریر مجبوراً سپرد قلم کر رہا ہوں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ
میری اپنی طبیعت اس پر نہ پہلے آمادہ تھی نہ اب ہے!

اس سلسلے میں اس سے قبل کہ راقم خود کچھ عرض کرے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ
محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کا وہ خط ہدیۂ قارئین کر دیا جائے جو انہوں نے ۱۴ر جنوری ۸۹ء
کو محترم صلاح الدین صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔

واضح رہے کہ شیخ صاحب موصوف میرے نوجوان ساتھیوں (یا
"عقیدت مندوں") میں سے نہیں بلکہ بزرگ معاونین میں سے ہیں جو اس وقت عمر کی
آٹھویں دہائی طے کر رہے ہیں۔ وہ "قوم پنجابی سوداگراں دہلی" کے معزز اور معروف فرد اور
جماعت اسلامی کے سابقون الاولون میں سے ہیں۔ خود صحافت سے ان کا نہایت قدیم رشتہ
ہے۔ چنانچہ دہلی میں انہوں نے ایک ہفت روزہ "الجمیل و یکلی" کے نام سے جاری کیا
تھا جس میں روزنامہ "جنگ" کے مالک و مدیر میر خلیل الرحمٰن ان کے جونیئر کی حیثیت سے
شریک تھے۔ بعد ازاں وہ طویل عرصے تک ماہنامہ "سوداگر" کراچی کی ادارت کے فرائض
سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۲ء سے وہ میرے تقریباً ہمہ وقت اور ہمہ تن ساتھی اور رفیق
کار..... بلکہ مشیر اور سرپرست ہیں! کچھ عرصے سے وہ عارضہ قلب (ANGINA) میں
مبتلا ہیں۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ میرے ساتھ عمرے کی سعادت سے بہرہ مند ہوں۔

لیکن عین وقت پر تکلیف کے عود کر آنے کے باعث سفر ملتوی کرنا پڑا...... چنانچہ وہ دو ہفتے کی تاخیر سے روانہ ہو سکے' نتیجتاً وہ ۱۹ر جنوری کی رات کو جدہ پہنچے..... جبکہ میری واپسی ۲۰ر کو ہو گئی!......... ان سطور کی تحریر کے وقت تک وہ ارض مقدس ہی میں ہیں' اللہ کرے کہ وہ عمرہ اور زیارتِ مسجد نبویؐ کی سعادتوں سے باحسن وجوہ بہرہ مند ہو کر بخیر و عافیت وطن واپس آئیں۔ اور راقم الحروف اور تنظیم اسلامی تادیر ان کے مشفقانہ تعاون سے مستفید ہوں۔ (مزید واضح رہے کہ جدہ کی ملاقات میں انہوں نے اپنے اس خط کا کوئی ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ اور میری نظر سے اس کی نقل پاکستان واپس آ کر ہی گزری!) شیخ صاحب موصوف کا خط درج ذیل ہے۔

باسمہ تعالیٰ سبحانہ

۱۴ر جنوری ۱۹۸۹ء

مکرمی و محترمی' السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

۳ر جنوری ۸۹ء کی شب کو انجائینا کا پرانا مرض عود کر آیا چنانچہ اپنے معالج کی ہدایت پر تمام سرگرمیوں سے دست کش ہو کر BED REST کر رہا ہوں۔ اسی دوران آپ کے مؤقر ہفت روزہ تکبیر کا شمارہ بابت ۶ر تا ۱۲ر جنوری ۸۹ء نظر سے گزرا..... اس شمارے میں آپ کے مضمون جس کا آپ نے عنوان "پاسباں مل گئے کعبے سے صنم خانے کو" مقرر کیا ہے اور اس کی وضاحت کے لئے ذیلی عنوان "عورت کی سربراہی اور اقبالؒ کے نظریۂ اجتہاد پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ارشادات کا ایک جائزہ" رقم فرمایا ہے۔ اس کا بغور مطالعہ کیا۔

امر واقعہ یہ ہے آپ کی اس تحریر کے مطالعہ سے راقم کو دلی صدمہ پہنچا۔ جس کے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ اس دورِ فتن میں گنتی کے جن چند صحافیوں کو بعض اختلافات آرا کے باوصف راقم حق گو' اصول پسند اور خدا ترس صحافی سمجھتا چلا آ رہا ہے ان میں آپ کا ایک اونچا مقام راقم کے شعور و ادراک میں قائم ہے لیکن آپ کے اس مضمون سے یہ حسن ظن مجروح ہوا ہے۔

دوسرا یہ کہ عورت کی سربراہی کے متعلق آپ نے ڈاکٹر صاحب سے جو مؤقف منسوب کیا' وہ واقعہ کے بالکل خلاف ہی نہیں بلکہ صریح طور پر بہتان کی

قبیل کا معاملہ ہے۔ آپ کو اگر اس سے اختلاف ہے تو اس کا آپ کو پورا پورا حق ہے اس پر تنقید کی بھی آپ کو کامل آزادی ہے لیکن خدارا دنیادار صحافیوں کی طرح کسی قائل کے قول کو بالکل غلط معنی پہنا کر اور اس کی بات میں اپنا مفہوم ڈال کر تنقید و تنقیص کا رویہ اختیار کرنے سے اجتناب کیجئے۔ قومی اسمبلی کے انتخابات کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے جن خیالات 'اپنی جن آرا اور اپنے جس مؤقف کا جمعہ کے خطابات میں اظہار کیا ہے' ان تمام خطبات کی صحیح صحیح تلخیص "ہفت روزہ ندا" اور ماہنامہ میثاق کے دسمبر ۸۸ء اور جنوری ۸۹ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ (میثاق کے دونوں شمارے اس عریضہ کے ساتھ ارسال خدمت ہیں)۔ آپ جیسے ذمہ دار اور باخبر صحافی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ آپ نے ان کا مطالعہ نہ کیا ہو گا۔ اگر مطالعہ کے بعد آپ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ "پاسباں مل گئے کعبے سے صنم خانے کو" تو یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے اور آپ کو حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھنے کی سعادت سے بہرہ مند فرمائے۔ لیکن اگر آپ نے ان کا مطالعہ کئے بغیر محض اخبارات کی ادھوری اور غلط سلط رپورٹنگ پر بھروسہ کر کے یہ رائے قائم کی ہے تو مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ آپ نے خود پر ظلم کیا ہے اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد پر بھی..... موصوف پر یہ ظلم تو انشاء اللہ ان کے حق میں اجر و ثواب بن جائے گا لیکن آپ نے خود پر جو ظلم کیا ہے میری رائے میں اس کا مواخذہ ہو کر رہے گا۔ الا یہ کہ آپ صدق دل سے اس پر توبہ فرمائیں اور اس رائے سے علیٰ رءوس الاشہاد رجوع فرمائیں۔

مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تواصی بالحق میں تکلفات سے کام نہ لے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ سطور خالص نصح کے جذبے کے تحت رقم کی گئی ہیں۔ مزاج کے خلاف کوئی بات محسوس ہو اور اس سے کسی نوع کا تکدر قلب میں پیدا ہو تو اس کے لئے عفو کا طالب ہوں۔

والسلام مع الاکرام

خاکسار جمیل الرحمٰن عفی عنہ

پ۔ ن

آپ نے اس مضمون میں اپنے سوالات اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات کا جو حوالہ دیا ہے' اس کے متعلق نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ اس میں بھی احتیاط کا دامن آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بین السطور آپ کی ناراضگی اور برہمی واضح طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ آپ نے جو تانا بانا تیار کیا ہے' وہ اپنے notes اور یادداشت سے تیار کیا ہے۔ لیکن ہمارے پاس تو ان سوالات و جوابات کا ٹیپ میں ایک ایک لفظ محفوظ ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں اور اس کو شائع کرنے کے ارادہ کا اشارہ فرمائیں تو آپ کے سوالات اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات حرف بحرف اور لفظ بلفظ ٹیپ سے نقل کر کے آپ کو ارسال کئے جاسکتے ہیں۔

نیاز کیش

جمیل الرحمٰن عفی عنہ

بشرف نظر جناب محترم محمد صلاح الدین صاحب مدظلہ

مدیر اعلیٰ ہفت روزہ تکبیر۔ کراچی۔

((نوٹ) خط کو دوبارہ صاف لکھنے کا موقع نہیں مل سکا لہٰذا مسودہ ہی ارسال خدمت ہے)

رفیق مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کا یہ خط پڑھتے ہی میں نے ایسے محسوس کیا جیسے میرے ذہن سے ایک بھاری بوجھ ایک دم اتر گیا ہو۔ اس لئے کہ ایک تو ع "متفق گردید رائے بو علی با رائے من!" کے مصداق یہ اطمینان ہوا کہ صلاح الدین صاحب کی تحریر پر ان کا تاثر بھی بعینہٖ وہی تھا جو میرا تھا .... اور دوسرے یہ کہ اگرچہ میں نے فاروق چشتی صاحب اور بعض دوسرے احباب سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں "تکبیر" کے مضمون کا جواب ضرور دوں گا لیکن میں اپنی "کوتاہ قلمی" کے پیش نظر سخت پریشان تھا کہ محاضرات قرآنی میں میری تقریر کے بعد جو طویل "گفت و گو" اور ردوقدح صلاح الدین صاحب سے ہوئی تھی اس کے ضمن میں صحیح صورت واقعہ کی تفاصیل کیسے بیان کروں گا۔ مجھے اپنے "گاودی پن" کا اعتراف ہے کہ میرا ذہن اس پورے پروگرام کی آڈیو اور وڈیو ریکارڈنگ کی طرف منتقل ہی نہیں ہوا۔ بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کے خط سے اس معاملے کے آسان ترین حل کی طرف رہنمائی ہو

لی......... فجزاہ اللہ احسن الجزاء!!

چنانچہ اب ان کی طویل تحریر کا جو حصہ میری تقریر کے بعد کے سوال جواب سے متعلق ہے 'اس کے ضمن میں تو بحمداللہ ع "تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی" کے مصداق اس پر اکتفا کی جارہی ہے کہ اس پوری گفتگو کو لفظ بلفظ (صرف 'کا' 'کے' 'کی اور ہے یا تھا کی تصحیح کے ساتھ) شائع کیا جارہا ہے۔ تاکہ قارئین خود ہی اس واقعاتی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو پہلے بیان کیا جاچکا ہے 'اس کا "تکبیر" کی تحریر سے مقابلہ و موازنہ کر کے رائے قائم کرلیں!

البتہ اس تحریر کے اول و آخر کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنی ضروری ہیں۔

چنانچہ تمہیدی حصے سے متعلق عرض ہے کہ۔

۱۔ "اس بار محاضرات قرآنی کا یہ پروگرام لاہور کی بجائے کراچی میں" نہیں ہوا۔ بلکہ اس سال کا ریگولر پروگرام 'جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے 'وہ تھا جو مارچ ۸۸ء میں لاہور میں منعقد ہوچکا تھا اور جس میں دوسرے مقررین کی طرح خود صلاح الدین صاحب نے بھی "مفصل" اظہار خیال فرمایا تھا۔

۲۔ کراچی کے اس اضافی پروگرام کا FORMAT پہلے سے طے تھا اور اگر صلاح الدین صاحب نے اس کے علم کے باوجود اس میں شرکت کا ایثارِ عظیم گوارا کیا تھا تو بعد میں اس پر "ONE MAN SHOW" کی پھبتی چست کرنا ان کے مقام اور مرتبہ سے بہت فرو ہے۔

۳۔ میری تقریر کی تحسین و ستائش کے لئے مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کرنے کے فوراً بعد "ایک عاجزانہ اور خیر خواہانہ درخواست" کے منافقانہ الفاظ کے ساتھ میری ذات پرستی اور عامیانہ نفسیات کے حوالے سے جارحانہ حملہ ایک نہایت رکیک حرکت ہے! جو گٹر جرنلزم کے بازار کی تو نہایت پسندیدہ شئے ہوسکتی ہے 'کسی سنجیدہ اور متین 'اور بالخصوص متدین صحافی اور دانشور کو ہرگز زیب نہیں دیتی!

ذرا فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) ملاحظہ ہو 'کہ ایک جانب "تقریر" کے بارے میں تو ارشاد ہوتا ہے۔

> "ڈاکٹر صاحب کا لیکچر بلاشبہ بڑا ہمہ جہتی اور سیر حاصل تھا۔ اللہ نے انہیں اظہار و استحضار کی بھرپور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کے کلام کی روانی اور زبان و بیان کی سحر انگیزی تقریر کی طوالت کے باوجود سامعین کی توجہ اور دلچسپی میں کوئی

ضعف واضمحلال نہیں آنے دیتی۔ سامعین سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر داد و تحسین کی مدھم آوازوں اور دعائیہ کلمات کے ساتھ سنی گئی!"

لیکن اس کے فوراً بعد "مقرر" کی "تحلیل نفسی" ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"مجھے سابقہ تجربات کی طرح اس بار بھی مسلسل یہ احساس ہوتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے مرعوبیت اور ان پر سبقت کی خواہش کے الجھاؤ سے ہنوز اپنے ذہن کو فارغ نہیں کر سکے ہیں۔ وہ مولانا مودودیؒ کے دائرۂ فکر سے باہر نکل کر اپنی ایک منفرد فکری و نظریاتی شناخت قائم کرنے کی کشمکش سے نجات نہیں پا سکے۔ ان کے اندر آج بھی مولانا مودودیؒ بولتے دکھائی دیتے ہیں مگر اس طرح جیسے ان کے گلے پر بار بار ہاتھ رکھ کر کوئی اپنی آواز اونچی کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ڈاکٹر صاحب جتنی جلد اس ذہنی کیفیت سے شفایاب ہو سکیں' ان کے حق میں بہتر ہے۔ یہ ایک عاجزانہ اور خیر خواہانہ درخواست ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف!"

اس "معصومانہ" حملہ کا ترکی بہ ترکی جواب 'اور "عطائے تو بہ لقائے تو!" کے مصداق اس تحریر کا اسی عامیانہ نفسیات کی اصطلاحات میں تجزیہ تو یہ بنتا ہے کہ اس کا محرر ایک شدید مرعوبیت اور گہرے احساس کمتری سے بچاؤ کی کوئی اور سبیل نہ پا کر گالی دینے ہی میں نفسیاتی آسودگی تلاش کر رہا ہے 'لیکن ہم اس سے صرف نظر کرتے ہوئے پوری سنجیدگی کے ساتھ جاننا چاہتے ہیں کہ محترم صلاح الدین صاحب کا مشورہ ہے کیا؟

مثلاً کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم بھی ان احسان فراموش لوگوں کے مانند ہو جائیں جو ان لوگوں کا نام تک لینا پسند نہیں کرتے 'جن سے انہوں نے کسی بھی اعتبار سے اکتسابِ فیض کیا ہو' بلکہ اپنے نیاز مندوں کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ جو علم یا فہم انہیں حاصل ہے وہ یا تو وہ رحم مادر ہی سے لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے یا براہ راست ان ہی پر آسمان سے نازل ہوا ہے...... یا کم از کم یہ کہ کُل کا کُل "طبع زاد" ہے؟...... یہ طور و انداز جنہیں پسند ہو انہیں مبارک 'ان سطور کا راقم اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ وہ اس خبط میں ہر گز مبتلا نہیں ہے۔ بلکہ اس نے تو آج سے ۳۳ سال قبل بھی (۱۹۵۶ء میں) جماعت اسلامی کے فکری قائدین

بالخصوص مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے بارے میں صراحت کے ساتھ لکھ دیا تھا کہ:۔

"میں نے جماعت اسلامی کی گود میں آنکھ کھولی ہے۔ اور جس طرح ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے بھی ان حضرات کی آنکھوں سے دیکھنا' ان کے کانوں سے سننا' ان کے دماغوں سے سوچنا' اور ان کی زبانوں سے بولنا سیکھا ہے۔" (تحریک جماعت اسلامی صفحہ ۲۱)

اور پھر اس کے پورے بیس برس بعد (۱۹۷۶ء میں) جب اپنے فہم و فکر قرآنی کے "ابعادِ اربعہ" یا اپنے اکتساب فیض کے سلاسل اربعہ کا ذکر کیا تو اس میں بھی دو "شیخین" (حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) اور دو "ڈاکٹرین" (ڈاکٹر اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم) کے ساتھ ساتھ پورے اہتمام کے ساتھ ذکر کیا تھا مولانا فراہیؒ اور ان کے شاگرد رشید مولانا اصلاحی' اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور ان کے معنوی خلیفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا!............ اور اب بھی اس کے باوجود کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں سے راقم کو نہ صرف یہ کہ بعض معاملات میں شدید اختلاف ہے بلکہ ان کے بعض نظریات کو وہ انتہا درجہ کی گمراہی سمجھتا ہے' ان سے ابتدائی کسب فیض کا ڈنکے کی چوٹ اقرار کرتا ہے..... اور فی الواقع ان دونوں کے لئے احسان مندی کے جذبات اپنے دل میں موجود پاتا ہے! اور راقم کا مزاج بحمد اللہ یہ ہے کہ اگر دوران تحریر و تقریر کوئی ایسا نکتہ نوک قلم یا نوک زبان پر آجاتا ہے جو اصلاً کسی اور صاحب علم و دانش نے بیان کیا ہو تو اگر وقت کی انتہائی تنگی مانع ہو جائے تو دوسری بات ہے' ورنہ وہ اصل نکتہ ور کا حوالہ دیئے بغیر گزر جانے کو "حق بحقدار رسید" کے منافی اور ایک نوع کا علمی سرقہ اور خیانت گردانتا ہے!

اگر یہ نہیں تو کیا صلاح الدین صاحب کا مشورہ یہ ہے کہ ہمیں مولانا مودودی کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرنا چاہئے اور ان کو ہر معاملے میں حرفِ آخر یا عقلِ کل تسلیم کر لینا چاہئے۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہو تو جو جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں' جو نہیں جانتے وہ بھی کان کھول کر سن لیں کہ یہ معاملہ ہم مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی تو کیا علامہ اقبال کے ساتھ بھی کرنے کو تیار نہیں' جنہیں ہم عہد حاضر میں فکر اسلامی کی تجدید اور تعمیر جدید کے اعتبار سے عظیم ترین شخصیت سمجھتے ہیں اور جن کے آگے دوسرے سب مفکرین و مصنفین ہمیں بونے نظر آتے ہیں' اور ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ خود علامہ مرحوم اپنے مشہور

مانہ "خطبات" کے دیباچہ میں فرما گئے ہیں کہ :۔

"عین ممکن ہے کہ جوں جوں علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کشادہ ہوں، ان خطبات میں پیش کئے گئے خیالات سے بہتر اور محکم تر خیالات سامنے آئیں"۔

بہرحال، ہمیں یقین ہے کہ محمد صلاح الدین صاحب کو اپنی "عاجزانہ اور خیر خواہانہ درخواست" کی یہ دونوں تعبیریں قبول نہیں ہوں گی........... تو پھر اب یا تو وہ خود ہی بتائیں کہ اگر وہ واقعتاً کوئی مخلصانہ مشورہ دینا چاہتے ہیں تو وہ کیا ہے..... اور یا پھر تسلیم کرلیں کہ اس سے اصل مقصود محض گالی دینا تھا!

اس "تیکھی" تمہید کے بعد مدیر "تکبیر" نے چند سطور میں میری "دو گھنٹے کی تقریر کا خلاصہ" درج کیا ہے، جس میں اس کے علاوہ کہ انتہائی اختصار کے باعث بہت سے اہم نکات کا چھوٹ جانا فطری اور قابل فہم ہے، غلط بیانی کی کوئی شعوری کوشش نظر نہیں آتی۔ البتہ دو باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔

ایک یہ کہ چونکہ "عورت کی سربراہی" کا مسئلہ اس وقت ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا لہٰذا انہیں میری اس بات کا ذکر بطور خاص کرنا چاہئے تھا کہ میں نے تو خواتین کے پارلیمنٹ کے ممبر بننے کو بھی اسلام کے مزاج کے منافی اور کتاب و سنت کی تعلیمات کے خلاف قرار دیا تھا اور اس سلسلے میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کا صراحتاً ذکر کرتے ہوئے اس مسئلے میں ان کی "سفارش" سے بھی اظہار براءت کیا تھا۔

دوسرے یہ کہ "اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ" کے مسئلے میں میری رائے کے ضمن میں وہ واقعتاً اور دیانتاً مغالطے میں مبتلا اور خلط مبحث کا شکار نظر آتے ہیں۔ تاہم اس پر گفتگو بعد میں ہوگی!

اس کے بعد آتا ہے مدیر "تکبیر" کی تحریر کا اصل اور "سلگتا ہوا" حصہ، یعنی میرے اور ان کے مابین سوال جواب کی روداد جس کے ضمن میں بات خود مغالطے میں مبتلا ہونے کے باعث غیر ارادی اور غیر شعوری مغالطہ آمیزی سے بڑھ کر غلط بیانی اور بہتان طرازی کے ذریعے کردار کشی کی ارادی اور شعوری کوشش تک جا پہنچی ہے!

ہم نے یہ الفاظ نہایت درد اور کرب کے ساتھ لکھے ہیں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ ہم نے

اس معاملے پر محمد صلاح الدین صاحب کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتے ہوئے اور انہیں اس بات کا بھرپور الاؤنس دیتے ہوئے غور کیا ہے کہ خود ان کے بقول کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں سامعین کی جانب سے جو قہقہے ان کی باتوں پر بلند ہوئے ان میں اپنی تضحیک محسوس کرنے کی بنا پر ان کے حواس بجانہ رہے ہوں اور جو جوابات میں نے ان کے سوالات کے دیئے اس وقت وہ انہیں سمجھ نہ پائے ہوں...... لیکن ایسے تمام عوامل کو مدنظر رکھنے کے باوجود ہمیں ان کی تحریر نیک نیتی کی حدود سے متجاوز نظر آتی ہے۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ کسی اور سبب سے (جس کا علم حتمی طور پر اللہ ہی کو ہے) ان کے دل میں ہمارے بارے میں بغض و عداوت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ۔ "حبک الشی یعمیک و یصم" یعنی تمہارا کسی چیز سے محبت کرنا تمہیں اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے اسی طرح ہماری عداوت نے انہیں ہمارے بارے میں اندھا اور بہرا بنا دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

اس معاملے میں تفصیل میں جانے کی تو اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ، جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ہم اسی شمارے میں اس مکالمے کی لفظ بلفظ روداد شائع کر رہے ہیں، جسے بھی تفصیلات درکار ہوں وہ خود تقابلی مطالعہ کر سکتا ہے۔ (کاش کہ صلاح الدین صاحب نے بھی اپنی اس تحریر سے قبل اس مکالمے کا ویڈیو دیکھ لیا ہوتا یا کم از کم آڈیو ہی سن لیا ہوتا!)......... البتہ اس پوری بحث کی تان کمال فصاحت و بلاغت کے ساتھ جن الفاظ پر ٹوٹی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہدیہ قارئین کر دیئے جائیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"حقیقت یہ ہے کہ اہل دین کو قانون ساز اداروں سے دور رکھنے، ان اداروں کے جو "شوریٰ" کہلاتے ہیں اور قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کے پابند ہیں، ارکان کو علم و کردار کی جملہ شرائط سے مستثنیٰ قرار دینے، اور دو قدم آگے بڑھ کر عورت کو اسلامی ریاست یا حکومت کی سربراہی کا اہل ٹھہرانے اور اس کے لئے ستر و حجاب و دائرۂ کار کی تمام حدود ساقط کر دینے والا مؤقف ایسا ہے جو ہم جیسے واجبی علم اور محدود دینی شعور رکھنے والوں سے ہضم نہیں ہوتا۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی علمی وجاہت، ان کے فہم قرآن و سنت اور ذاتی زندگی میں دین سے ان کے لگاؤ کی کیفیت کو دیکھتے ہیں اور پھر ان کے ارشادات عالیہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو آنکھوں پر وہی کیفیت گزرتی ہے جو چکا چوند روشنی سے اچانک اندھیرے میں جانے یا اندھیرے سے نکل کر تیز روشنی میں آجانے سے طاری ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب

کے مزاج میں بلا کی تندی اور تیزی ہے۔ کسی سمت چلتے ہیں تو پیر صرف ایکسیلیٹر پر رکھتے ہیں' بریک بالکل استعمال نہیں کرتے' دائیں بائیں یا سامنے کے شیشے میں گاڑی کے پیچھے کا منظر بھی نہیں دیکھتے' لوگ پکارتے رہ جاتے ہیں' مگر وہ فراٹے بھرتے' ناک کی سیدھ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے سرگرم سفر رہتے ہیں۔ انہیں "الھدیٰ" پروگرام کے آخری دنوں میں اور اس کی بندش کے موقع پر خواتین کے مسئلہ پر جس رفتار سے ایک سمت میں چلتے دیکھا تھا' اب اسی رفتار سے بالکل الٹی سمت میں چلتے دیکھ رہے ہیں۔ توازن اور اعتدال ان کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا۔ وہ واقعی نہ سیاسی آدمی ہیں' نہ انتخابی۔ خالص انقلابی آدمی ہیں اور کم از کم اپنی ذات کی حد تک ہر وقت حالت انقلاب میں رہتے ہیں۔ اللہ نے انہیں اسٹیم کی طرح علم سے بھر دیا ہے تو اس سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ ان کے اندر ایک ایسا ریگولیٹر بھی مہیا فرمادے' جو اس اسٹیم کو حالت اعتدال پر رکھنے میں ان کی مدد کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ خود اپنے آپ پر رحم فرمائیں اور اپنی ماضی کی تحریروں کو اپنے موجودہ مؤقف کی وجہ سے ہماری نگاہوں میں بے وقعت نہ بنائیں"۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اپنی اس تحریر میں مدیر "تکبیر" نے جس "تندی و تیزی"______ "آندھی اور طوفان" کی سی برق رفتاری' اور آگے پیچھے' یمین و یسار' اور خطا و صواب سے لاپرواہی کا نقشہ کھینچا ہے' اس سے قطع نظر کہ وہ راقم کی شخصیت پر راست آتا ہے یا نہیں' ان کی اپنی اس بگٹٹ قلم کاری اور خامہ فرسائی پر ضرور منطبق ہوتا ہے..... اور انہوں نے میری ہجو ملیح اور کردار کشی میں اپنی جملہ صحافیانہ صلاحیتوں اور اظہار و بیان کی تمام استعدادات کے ساتھ افتراء اور بہتان سے بھی گریز نہیں کیا۔

اس لئے کہ انہوں نے میرے خلاف اپنے اس قلمی جہاد کی بنیاد جن تین الزامات پر استوار کی ہے ان میں سے ایک کے بارے میں تو میں یہ گمان کر سکتا ہوں کہ انہوں نے میرا مؤقف صحیح طور پر سمجھا نہ ہو اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں' لیکن بقیہ دو تو بدیہی طور پر خالص افتراء اور بہتان پر مبنی ہیں! اور ان کے ضمن میں ان کی بدنیتی اظہر من الشمس ہے!

نیک نیتی کے ساتھ مغالطہ صرف اس معاملے میں ہو سکتا ہے کہ میں اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ کے انتخاب کیلئے رائے دینے کا حق' اور اس کے لئے امیدواری کی اہلیت کی

اساسی شرط صرف "اسلام" کو سمجھتا ہوں۔ گویا کہ میرے نزدیک اسلامی ریاست میں ووٹ کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے، خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت اور خواہ متقی ہو خواہ فاسق وفاجر، اسی طرح پارلیمینٹ کی رکنیت کی اساسی شرط بھی صرف اسلام ہے، اگرچہ میرے نزدیک خواتین کی اس میں شرکت اسلام کی معاشرتی اور سماجی تعلیمات کی روح کے منافی ہے...... تاہم اس معاملے میں بھی مدیر "تکبیر" کی نیک نیتی صرف اسی اساس پر تسلیم کی جاسکتی ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ وہ مجلس کے خاص حالات میں (جن کی اصل ذمہ داری خود ان ہی پر عائد ہوتی ہے) اتنے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ میری وضاحتوں پر کان ہی نہ دھر سکے! اس لئے کہ میں نے وضاحت کر دی تھی کہ اضافی شرائط کے ضمن میں جیسے ووٹر کی عمر کا معاملہ ہے، جو مختلف جمہوری ممالک میں مختلف ہے اسی طرح تعلیم اور کردار کی اضافی شرائط بھی عائد کی جا سکتی ہیں...... لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہو گا جمہور کی رضامندی سے! (اس لئے کہ دستور مملکت جمہور کی رضامندی ہی سے بن سکتا ہے!)

اسی طرح یہ الزام کہ میں "اہل دین کو قانون ساز اداروں سے دور" رکھنا چاہتا ہوں ایک صریح بہتان ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کے آخری سوال کے جواب میں میں نے شدید حیرت اور تعجب کے ساتھ پوری وضاحت سے ان کے اس الزام سے برأت کا اظہار کر دیا تھا۔ اس معاملے میں ان کی بدنیتی اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اس آخری سوال اور اس کے جواب کا ذکر تک نہیں کیا، حالانکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اپنی مخبوط الحواسی میں وہ میرا جواب نہ سن پائے ہوں تب بھی انہیں اپنا سوال تو یاد رہنا چاہئے تھا۔ اور اگر انہوں نے اپنے ایک ایسے سوال کا ذکر (مغالطہ آمیز انداز میں) کر دیا ہے جو ان کے دل ہی میں رہ گیا تھا اور بالفعل پوچھا نہ جاسکا تھا تو جو سوال بالفعل پوچھا گیا تھا اس کا ذکر تو بدرجہ اولیٰ لازم ہے! الا یہ کہ "دیوانہ بکار خویش ہشیار" کے مصداق اس میں کوئی خاص مصلحت پیش نظر ہو۔

(کاش کہ صلاح الدین صاحب اپنا وہ "اَن پوچھا" سوال پوچھ ہی لیتے...... یعنی یہ کہ "اگر ایوان کی دو تہائی اکثریت آئین تبدیل کر ڈالے تو کیا صورت بنے گی؟" ...... اس لئے کہ اس صورت میں مجھے اس اہم نکتے کی وضاحت کا موقع مل جاتا کہ یہی تو علماء کرام، رجال دین اور خدام ملت کے کرنے کا اصل کام ہے کہ عوامی سطح پر ایسی مؤثر وفعال اور جاق وچوبند رائے عامہ اولاً پیدا کریں اور پھر مسلسل برقرار رکھیں جو دستور مملکت میں قرآن وسنت کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی ثبت کرائے اور اسے قائم رکھے۔ باقی رہا علماء کرام کا خود

پارلیمنٹ کا انتخاب لڑ کر اس میں شریک ہونا تو یہ ہرگز اب بھی حرام نہیں..... اور اسلامی ریاست کے بالفعل قیام کے بعد تو فطری اور لازمی طور پر ہو گا ہی! واضح رہے کہ یہ مسئلہ اصلاً اسلامی ریاست کے قیام کے لائحہ عمل اور طریق کار سے متعلق ہے۔ جو اس وقت تو زیر بحث نہیں تھا البتہ میں نے ان محاضرات کے دوران بار بار اعلان کیا تھا کہ اس موضوع پر میں اپنا نقطہ نظر اسی مقام پر ۴ر جنوری ۸۹ء کو پیش کروں گا..... میرے نزدیک اس وقت ہم عملاً جس مرحلے میں ہیں یعنی "اسلامی نظام کے قیام کی کوشش" اس کے لئے کرنے کا اصل کام مقدّم الذکر ہے، جس کیلئے ایک انقلابی جدوجہد درکار ہے، اگرچہ حرام مؤخرالذکر بھی نہیں ہے اور جو لوگ نیک نیتی سے اسی کو مفید مطلب سمجھتے ہوئے اس میں جان و مال صرف کر رہے ہیں انشاء اللہ العزیز وہ بھی عنداللہ ماجور ہوں گے۔)

رہی تیسری بات..... یعنی "عورت کو اسلامی ریاست اور حکومت کی سربراہی کا اہل ٹھہرانے اور اس کے لئے ستر و حجاب اور دائرہ کار کی تمام حدود ساقط کر دینے" کا الزام تو اس پر تو بے ساختہ سورۂ مریم کے آخر میں وارد شدہ الفاظ مبارکہ نوک قلم پر آ گئے ہیں۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ○ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ○ (آیات ۸۹، ۹۰) ترجمہ۔ "یہ تو تم نے بہت ہی سنگین بات کہہ دی ہے۔ اس سے تو قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو جائیں!" ..... حیرت ہوتی ہے کہ ایک ماہ سے بھی کم عرصہ قبل اپنی ایک تحریر میں دو مرتبہ یہ شہادت دینے کے بعد کہ میں عورت کی سربراہی کو "منکر" سمجھتا ہوں لیکن موجودہ حالات میں قومی و ملکی مصلحتوں کے پیش نظر دوسرے بہت سے منکرات کی طرح اسے بھی مجبوراً صرف گوارا کرنے کا قائل ہوں ــــ اور خود بھی اسی مؤقف کی تائید کرنے کے بعد ــــ مدیر تکبیر کی نظر سے میرا وہ کون سا فتویٰ گزرا ہے جس کی بناء پر انہوں نے اتنا بڑا الزام لگا دیا اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس افتراء اور کذب صریح پر سب و شتم کے بگٹٹ گھوڑے دوڑانے میں اپنی طلاقت لسانی اور شوخ بیانی کی پوری صلاحیت و استعداد صرف کر دی۔ ملک میں مذہبی صحافت کے "میر کارواں" کی اس "جسارت" پر ناطقہ سربگریباں ہے کہ ع "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!" کی شاباش دی جائے یا ع "چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!" کا ماتم کیا جائے!

مدیر تکبیر کو اگر موت کا کچھ بھی خیال ہے، اور بعث بعدالموت اور محاسبہ اخروی پر کسی

بھی درجے میں ایمان ہے تو ان کے لئے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھی استغفار کریں اور ان سطور کے عاجز راقم سے بھی علیٰ رءوس الاشہاد معافی مانگیں۔ اس پر وہ اللہ تعالیٰ کو بھی تواب اور رحیم پائیں گے...... اور ان شاء اللہ اس ناچیز کو بھی اپنا پہلے ہی جیسا نیاز مند پائیں گے...... ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ

رہا مستقبل کی اسلامی ریاست میں قانون سازی کے حدود و قیود اور اس کے ضمن میں اجتہاد کا مسئلہ...... تو یہ میدان صحافتی انداز کی قلم کاری کے جوہر دکھانے کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ موضوع بہت سنجیدہ سوچ بچار اور بحث و تمحیص کا متقاضی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس پر بڑے سائز کے ڈھائی صفحات پر پھیلی ہوئی طویل تحریر کے ذریعے مدیر "تکبیر" نے اسے الجھایا ہی ہے سلجھایا نہیں۔ بلکہ "فاش تر گویم" کے مطابق صحیح تربات تو یہ ہے کہ وہ اصل مسئلے کو سمجھے ہی نہیں تو سلجھائیں گے کیا۔

اس معاملے میں بحث چونکہ علامہ اقبال مرحوم کے معرکۃ الآرا اور شہرۂ آفاق "خطبات" کے گرد گھومتی ہے' لہٰذا اصل مسئلے پر گفتگو سے قبل مناسب ہے کہ وضاحت کر دی جائے کہ راقم کو اس معاملے میں کسی سنی سنائی سند کی احتیاج نہیں ہے' میری اپنی ذاتی رائے' جو میں نے آج سے ۱۲ سال قبل اپنی اس تحریر میں ظاہر کی تھی جو اب "اسلام کی نشاۃ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام" کے نام سے شائع ہوتی ہے اور جسے راقم اپنی پوری عملی جدوجہد کے ضمن میں اساسی دستاویز قرار دیتا ہے' حسب ذیل ہے۔

> "آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصہ تو اگرچہ بہت محل نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی!"

(واضح رہے کہ "خطبات" کے اس حصے کو بھی راقم نے صرف فکر انگیز مانا ہے' حرف آخر یا منزہ عن الخطاء' نہیں' اس لئے کہ ان کے متکلمانہ مباحث کے بھی بعض نکات سے راقم کو شدید اختلاف ہے...... اگرچہ اس سب کے باوصف راقم علامہ مرحوم کو عہد حاضر

میں تجدید فکر اسلامی کے میدان کی عظیم ترین شخصیت' اور ان کے "خطبات" کو تاحال اس موضوع پر اہم ترین کتاب مانتا ہے۔)

تاہم "اجتہاد بذریعہ پارلیمینٹ" کے مسئلے پر علامہ مرحوم کی رائے کو راقم صدفی صد درست سمجھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ع "سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست!" کے مصداق کم فہم لوگ اسے الجھا کر رکھ دیں۔

اس معاملے میں خلط مبحث دو جدا بحثوں کو گڈمڈ کر دینے سے ہوتا ہے۔ ایک بحث ہے اجتہاد کے اصول' اس کے حدود و قیود' اور اس کی اہلیت کے لوازم و شرائط کی' اور دوسری بحث ہے ایک جدید اسلامی ریاست میں قوت نافذہ کی کہ وہ کس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ میرے ۲۰ر دسمبر ۸۸ء کے محاضرہ کے موضوع سے متعلق بحث دوسری تھی نہ کہ پہلی!! اور یہ تو ہرگز باور نہیں کیا جاسکتا کہ مدیر "تکبیر" ان دونوں کے فرق کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب کوئی شخص مخالفت برائے مخالفت کا فیصلہ ہی کر لے تو عقل عمومی (COMMON SENSE) بھی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے!

اب یہ بات تو علم سیاسیات کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ بادشاہت (MONARCHY) میں یہ قوتِ نافذہ ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے' تھیاکریسی (THEOCRACY) میں یہ اختیار ایک مذہبی طبقے کو حاصل ہوتا ہے اور جمہوریت (DEMOCRACY) میں عوام کے نمائندوں کو! لیکن اصل سوال یہ ہے کہ عہد حاضر کی اسلامی ریاست اگر دین اور جمہوریت کے امتزاج سے وجود میں آئے گی' جیسے کہ خود صلاح الدین صاحب نے اتفاق کیا ہے کہ وہ ایک "THEO-DEMOCRACY" ہے تو قانون سازی اور تنفیذ قانون کا اختیار کس کے ہاتھ میں ہوگا؟...... اصل میں اس سوال کا جواب ہے جو علامہ اقبال مرحوم نے دیا ہے کہ یہ اختیار پارلیمینٹ کو حاصل ہوگا۔ اور یہ بات صدفی صد درست ہے!

اس پر ذہن میں اشکالات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ جدید اسلامی ریاست کے دوسرے اعضاء (ORGANS) اور ان کے عمل دخل کے بارے میں ذہن واضح نہیں ہیں۔ اور اگر محترم صلاح الدین صاحب ایک خاص ذہن لے کر محاضرات میں شریک نہ ہوتے تو انھیں جملہ اشکالات کا حل مل جاتا۔ لیکن ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

اب یہاں ہمارے لئے اپنی سوا دو گھنٹے کی پوری تقریر نقل کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن

زیر بحث موضوع سے متعلق چند بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔

۔ عہد حاضر کی اسلامی ریاست صرف اس وقت قائم ہو سکے گی جب کسی ملک کے رہنے والوں میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا زبردست داعیہ پیدا ہو جائے اور یہ داعیہ اپنے آپ کو ایک مؤثر رائے عامہ کی صورت میں، خواہ بطریق انتخاب خواہ بطریق انقلاب، بروئے کار لے آئے یعنی بالفعل ASSERT کرائے اور تسلیم کرا لے!

۱۔ اس کا عملی آغاز اس طرح ہو گا کہ مملکت کے دستور اساسی میں غیر مشروط طور پر اور بلا استثنا طے کر دیا جائے گا کہ "یہاں کوئی قانون سازی قرآن اور سنت کے منافی نہیں کی جا سکتی!"

۳۔ ملک کی مقننہ اور انتظامیہ کو دستور کا پابند رکھنے کی ذمہ داری عدلیہ کی ہوتی ہے، لہٰذا جس طرح ملک کی عدالت ہائے عالیہ دستور میں طے شدہ حقوق شہریت کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہیں اور شہریوں کو انتظامیہ کی دستبرد سے بچاتی ہیں، اسی طرح مقننہ کو قانون سازی سے متعلق اس دفعہ کا پابند رکھنا بھی اسی کی ذمہ داری ہو گی..... اور اگر کسی شہری کو گمان ہو کہ مقننہ نے کسی معاملے میں اس دفعہ کی خلاف ورزی کی ہے اور قرآن و سنت کی حدود سے تجاوز کیا ہے تو اسے حق حاصل ہو گا کہ عدالت کا کنڈا کھٹکھٹائے..... اور عدالت کو اختیار ہو گا کہ اگر یہ بات درست ثابت ہو تو ایسے کسی بھی قانون کو غیر مؤثر قرار دے دے! اس بات کی وضاحت کی حاجت نہیں ہے کہ عدالت میں اپنے مؤقف کے حق میں دلائل پیش کرنے کا حق ہر شہری کو حاصل ہو گا۔ عام اس سے کہ وہ عالم ہو یا عامی! (رہی یہ استثنائی مگر امکانی صورت حال کہ کسی وقت مقننہ اور انتظامیہ باہمی تعاون سے دو تہائی یا تین چوتھائی اکثریت سے اس دفعہ کو منسوخ کر دیں..... یا عدلیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے اس کی کوئی من مانی تاویل کر کے اسے غیر مؤثر کر دیں تو یہ صورت ایک "جوابی انقلاب" (COUNTER REVOLUTION) کی ہو گی جس کے مقابلے کے لئے عوام کی عدالت ہی سے رجوع کیا جائے گا..... اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا کہ دوبارہ رائے عامہ کے مؤثر اظہار کی کوئی مناسب صورت اختیار کی جائے!)

۴۔ رہا نئے پیش آمدہ مسائل و معاملات کے ضمن میں اجتہاد تو اس کے اصول و حدود، اور شرائط و لوازم کو تعلیم و تلقین کے ذریعے تو عام کیا جائے گا۔ لیکن آزادانہ غور و فکر اور اظہار رائے پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہو گی۔ ارباب علم و فہم اور اصحاب دانش و بینش کا فرض ہو گا کہ اجتہاد کے ضمن میں جملہ حدود و قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے پوری کد و کاوش کریں..... البتہ یہ بات

کہ کونسا اجتہاد قانون ملکی کی شکل اختیار کر کے نافذالعمل ہو گا' اس کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ جس کے سر پر یہ تلوار بہرحال لٹکی رہے گی کہ اگر اس کا اختیار کردہ "اجتہاد" قرآن و سنت کے نصوص کے خلاف ثابت ہوا تو وہ کالعدم ہو جائے گا اور اس کی ساری محنت رائیگاں جائے گی۔

۵۔ اس پورے خاکے میں 'جس کے جملہ اجزاء لازمی بھی ہیں اور باہم دگر ایک حیاتیاتی اکائی کے مانند مربوط بھی' علماء دین اور حامیان شرع متین 'اور دوسرے خدّام و فدائیان دین کے کرنے کے کام چار ہیں۔ (ا) اسلام کے حق میں ایک مضبوط' فعال اور مؤثر رائے عامہ کو بروئے کار لانا...... اور اسے برقرار رکھنا۔ (ب) عوام میں کتاب و سنت کے صحیح فہم کو ایک مؤثر حد تک برقرار رکھنا تاکہ وہ مادر پدر آزاد مفکرین اور خود ساختہ متجددین و مجتہدین کے گمراہ کن افکار و نظریات سے متأثر نہ ہوں۔ (ج) عدالتوں کو نزاعی معاملات میں کتاب و سنت کے مطابق صحیح فیصلوں تک پہنچنے میں بھرپور (اور بلا معاوضہ) مدد دینا...... اور (د) خود پارلیمنٹ میں بھی شریک ہونا اور عدلیہ میں بھی شامل ہونا۔ (لیکن ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ میں ان کی شمولیت کا دارومدار ووٹوں پر ہو گا...... اور عدلیہ میں شرکت کا انحصار اہلیت پر!)

دراصل یہ اسی بالفعل (DE FACTO) قوت نافذہ اور بالحق (DE-JURE) کتاب و سنت کی پابندی کی علیحدہ علیحدہ وضاحت کی کوشش تھی جس کے ضمن میں راقم نے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے طرزِ عمل '...... اور پھر اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے زیر ہدایت مرتب ہونے والے فتاویٰ کا ذکر کیا تھا...... جس میں مدیر "تکبیر" نے خواہ مخواہ قاضی ابو یوسفؒ کا ذکر چھیڑ کر کج بحثی کی صورت پیدا کر دی۔ اس مسئلے کو ذرا کھول کر بیان کیا جائے تو بات یوں سامنے آئے گی :-

۱۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران ایک شدید جانگسل انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں جب اسلامی ریاست وجود میں آئی تو چونکہ حاکم حقیقی یعنی اللہ جل جلالہ کے نمائندے (گویا کتاب و سنت کے ترجمان مطلق) بھی آپؐ ہی تھے اور قوت نافذہ بھی بالکلیہ آپؐ ہی کے دست مبارک میں تھی۔ لہٰذا کوئی الجھن سرے سے موجود ہی نہ تھی!

۲۔ خلافت راشدہ کے دوران بھی دین و مذہب اور ریاست و سیاست کی یہ وحدتِ کاملہ اس طرح برقرار رہی کہ ایک جانب خلیفہ راشدؓ بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف کی بنیاد پر قوت نافذہ پر پوری طرح متصرف ہوتے تھے تو دوسری جانب خود وہ اور جملہ اربابِ حل و عقد اور تمام

اصحابِ شوریٰ مجتہدین مطلق کے مقام پر فائز تھے! رضی اللہ تعالی عنہم وارضاہم اجمعین!

۳- اصل مسئلہ دور ملوکیت میں پیدا ہوا کہ حکومت کی اساس قبائلی عصبیت پر قائم ہوتی تھی اور قوت نافذہ کسی خلیفہ یا ملک یا سلطان کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو درجہ اجتہاد کے نہ اہل تھے نہ مدّعی...... بلکہ اس کے مقر اور معترف تھے کہ اس کے اہل دوسرے ائمہ یا علماء ہیں۔ اس دور کے اول و آخر کی چند مثالیں تو میں نے دی تھیں' ایک مثال بطرز استفہام انکاری مدیر "تکبیر" نے پیش فرمائی تھی...... ان کے معاملے کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لیا جائے

(ا) امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کو نہ صرف یہ کہ قضا کا عہدہ پیش کیا گیا بلکہ ان پر اس کو قبول کرنے کے لئے شدید دباؤ ڈالا گیا۔ حتی کہ قید و بند کی صعوبتوں کی نوبت بھی آگئی لیکن وہ انکار پر مصر رہے...... اس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ وہ اس حکومت ہی کو صحیح نہ سمجھتے ہوں۔ بنابریں اس کے ساتھ کسی بھی صورت میں تعاون نہ کرنا چاہتے ہوں۔ (جس کے قوی شواہد موجود ہیں) دوسرے یہ کہ فرطِ تقویٰ اور شدّت خشیت کی بنا پر وہ اُس ذمّہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کند چھری سے ذبح کئے جانے سے تعبیر کیا تھا...... اور تیسرے یہ کہ ان کی رائے یہ ہو کہ ابھی فقہ اسلامی کی تدوین کے کام کا آغاز ہے' اور ضرورت ہے کہ آزادانہ غور و فکر اور اظہار رائے کی فضا بہ تمام و کمال قائم رہے۔ جبکہ قضا کا عہدہ قبول کرنے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ ان کے ذاتی اجتہادات عدالتی نظائر کی حیثیت سے مستقل اور دائمی قانون کی صورت اختیار کر لیں۔ میرے نزدیک یہ آخری احتمال سب سے زیادہ قرین قیاس ہے...... واللہ اعلم بالصواب!!

(ب) امام مالکؒ نے تو اپنے اجتہادات کو کتابی صورت بھی دے دی تھی (مؤطا امام مالکؒ) اور حکومت وقت کی پیشکش یہ تھی کہ اسے کتابِ قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے' انہوں نے بھی اسے رد کر دیا اور شدید ترین تعذیب کو برداشت کرنے کو ترجیح دی۔ ان کے معاملے میں بھی متذکرہ بالا تین احتمالات میں سے اول و آخر دونوں کا پورا امکان موجود ہے!

(ج) البتہ قاضی ابو یوسفؒ نے قضا کا عہدہ قبول کر لیا۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کوئی وقتی (لیکن دینی و ملی نہ کہ ذاتی) مصلحت ملحوظ رکھی ہو...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک چونکہ تدوین فقہ اسلامی کا ابتدائی کام مکمل ہو چکا تھا' لہٰذا تیسرا احتمال یا تو سرے سے باقی نہیں رہا تھا یا اس کی شدت میں کمی آگئی تھی!

(د) اورنگ زیب عالمگیرؒ بھی "شہنشاہ" تھے اور بہ یثت حاکمہ اور قوت نافذہ پر بہ تمام و کمال متصرف'...... اور وہ چونکہ سُنّی اور حنفی تھے لہٰذا انہوں نے حنفی علماء میں سے جن کے علم و فہم دین اور تقویٰ و تدین پر انہیں اعتماد تھا ان کا بورڈ تشکیل دے دیا...... اور اس طرح فتاوائے عالمگیری' مرتب ہو گئے جنہیں بادشاہِ وقت نے نافذ کر دیا!

۴۔ عہد حاضر میں ایک حقیقی اسلامی ریاست کا نقشہ تو ان پانچ اصولوں پر استوار ہو گا جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اب یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کب اور کس خطے کے مسلمانوں کو اس کی توفیق ارزانی فرماتا ہے کہ وہ اس کے لئے "منہج انقلاب نبویؐ" کے خطوط پر انقلابی جدوجہد برپا کر سکیں...... فی الوقت سعودی عرب میں جو نظام قائم ہے اس کی اساس دین اور سیاست کی وحدت نہیں' ثنویت پر قائم ہوئی تھی۔ اس لئے یہ حکومت آل سعود اور آل شیخ (محمد ابن عبدالوہابؒ) کی مشترکہ جدوجہد سے قائم ہوئی تھی اور اس میں یہ باہمی تقسیم طے ہو گئی تھی کہ حکومت بالکلیہ آل سعود کے ہاتھ میں رہے گی اور مذہبی معاملات آل شیخ کے حوالے رہیں گے! (اب اس پر آل شیخ کی اجارہ داری ختم ہو چکی ہے اور امور شرعیہ شاہی خاندان کے معتمد علیہ علماء کے حوالے ہیں)...... یہی صورت حال خلیج کی ان بعض امارات میں ہے جہاں مذہبی مزاج کے حامل لوگ برسر اقتدار ہیں...... رہا ایران تو وہاں "اسلامی انقلاب" کے بعد جو نظام قائم ہوا ہے اس میں مذہب اور سیاست یکجا تو ہو گئے ہیں لیکن بہ طریق تھیا کریسی!! جس کے لئے اہل تشیع کے تصور امامت معصومہ میں تو نیابت کے اجتہادی اضافے کی اساس پر گنجائش نکالی جا سکتی ہے لیکن اہل سنت کے تصور خلافت کے ساتھ اس کی کوئی پیوند کاری ممکن نہیں!...... گویا معاملہ وہی ہے جو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ۔

"نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!"

رہا پاکستان' تو یہاں آغاز تو نہایت صحیح رخ پر ہوا تھا' یعنی دستور ساز اسمبلی پر عوامی مطالبے کا دباؤ ڈال کر' جس میں اس وقت کے جملہ فعال مذہبی عناصر کی مساعی شامل تھیں' اس کی زبان سے "قرارداد مقاصد" کا کلمہ شہادت ادا کرا لیا گیا...... لیکن افسوس کہ اس کے بعد مذہبی جماعتوں نے خود انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں اتر کر ایک جانب اسلام کو نزاعی مسئلے بلکہ انتخابی نعرے کی حیثیت دے دی اور دوسری جانب خود باہم دست و گریبان ہو کر ایک دوسرے کو NEUTRALISE کر دیا...... چنانچہ رفتہ رفتہ وہ سب کی سب غیر مؤثر ہو کر رہ گئیں۔

اور ان کی حقیقی اور واقعی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ مختلف اور متحارب لادینی قوتوں کی باہمی کشمکش اور سیاسی محاذ آرائی میں پاسنگ یا ضمیمہ کا کام دیں..... یا وقتاً فوقتاً متحدہ سیاسی مہموں کے غبارے میں مذہبی جذبہ کی ہوا بھرنے کی خدمت سرانجام دیں..... نتیجۃً آج ملک و قوم اس کیفیت سے دوچار ہیں ع "کہ رہوارِ یقین ما بصحرائے گماں گم شد!" ......

فاعتبروا یااولی الابصار!!

جب گفتگو اس مقام تک پہنچ ہی گئی ہے تو لگے ہاتھوں اس اہم نکتے کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ بحالات موجودہ اسلام کے سیاسی اور ریاستی نظام کے موضوع پر گفتگو میں ایک خلط مبحث اس بنا پر بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اصولی بحث کرتے کرتے لوگ اچانک اس کا جوں کا توں انطباق موجود الوقت حالات پر کرنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ کہاں ہمارا موجودہ مسلمان معاشرہ اور کہاں اسلامی ریاست' ع "چہ نسبت خاک را با عالم پاک!" ...... اس خلط مبحث کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی بحث وقتی سیاسی محاذ آرائیوں اور چپقلشوں کے خارزار میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے جس سے مدیر "تکبیر" اس وقت شدت کے ساتھ دوچار ہیں!...... یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ہے کہ اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کی پوری گفتگو فی الوقت صرف علمی و نظری نوعیت کی ہے' جس کا ذہنی حقائق و واقعات کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں!...... ان سطور کے راقم کو اس بات پر تو ایمان بھی حاصل ہے اور یقین بھی کہ پورے کرہ ارضی پر ایک عالمی اور مثالی اسلامی ریاست قائم ہو کر رہے گی۔ اور ایک گمان (یا خوش فہمی؟) یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز مملکت خداداد پاکستان ہی سے ہو گا...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ ابھی ہم اس سے بہت دور ہیں اور ایک طویل جدوجہد اور جانگسل محنت و مشقت بلکہ آگ اور خون کے بہت سے دریا راستے میں حائل ہیں! اور بڑے ہی دل گردے کے مالک اور ہمت و عزیمت کے پیکر مجسم ہوں گے وہ لوگ جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس کے لئے کمر ہمت کس لیں!...... اسلامی ریاست کے قیام کے آرزومندوں اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے خواہشمندوں کو جان لینا چاہئے کہ فی الوقت اصل ضرورت ایسے صاحب عزیمت لوگوں کی تلاش اور انہیں کسی مضبوط تنظیمی ڈھانچے کی صورت میں بنیان مرصوص بنانے کی ہے۔

"نہیں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
مری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک "من لم یشکر الناس لا یشکر اللہ" کی رُو سے سخت ناشکری ہوگی اگر اُن احباب اور بزرگوں کا تذکرہ نہ کر دیا جائے جنہوں نے اس بار حرمین شریفین میں راقم الحروف کا اعزاز و اکرام فرمایا، اور مہمان نوازی کی۔

مکہ مکرمہ کی صد سالہ قدیم درسگاہ مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا محمد مسعود شمیم صاحب نے جس محبت کے ساتھ راقم کا خیر مقدم کیا اور مدرسہ کے تمام شعبوں کا معائنہ کرایا۔ اور متعدد بیش قیمت کتابیں ہدیہ فرمائیں، اس کا دل پر بہت اثر ہے۔ اس پر مستزاد مدرسہ صولتیہ ہی میں تدریسی خدمات سرانجام دینے والے نوجوان عالم دین مولانا سیف الرحمٰن صاحب نے جو حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی مدظلہٗ کے اعزّہ میں سے ہیں اپنے مکان پر پر تکلف دعوتِ طعام کا اہتمام فرمایا جہاں مدرسہ کے بعض دوسرے اساتذہ کے علاوہ پاکستان سے عمرہ وغیرہ کے لیے آنے والے متعدد علماء کرام سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔

اسی طرح مولانا محمد خیر محمد حجازی نے بھی، جو اپنے حرم پاک کے دروس کے لیے مشہور ہیں اور شیخ مکی کے مختصر نام سے معروف ہیں، بہت محبت اور اصرار کے ساتھ کھانے کی دعوت دی اور ناچیز کا اعزاز و اکرام فرمایا۔

مولانا اختر ہاشمی صاحب کی محبت اور شفقت نے بھی دل پر بہت اثر کیا۔ وہ ہمارے استقبال کے لیے ہمارے پہنچنے سے قبل ہی ریاض سے جدہ پہنچ گئے تھے اور پھر اس کے باوجود کہ مکہ مکرمہ میں ان کے بہت سے احباب کے علاوہ قریبی اعزّہ بھی موجود ہیں وہ مسلسل ہمارے ہی ساتھ رہے ——— اور اس طرح اُن کے ساتھ بہت سے علمی و سیاسی موضوعات پر مفید مذاکرہ رہا ——— اسی طرح خواجہ امان اللہ صاحب نے بھی بہت کرم فرمایا کہ صرف ملاقات کے لیے ریاض سے مکہ مکرمہ تشریف لائے اور دو تین روز تک کافی وقت ساتھ گزارا۔

الریاض اور الواسع کے رفقاءِ تنظیم اسلامی کی ہمت تو قابل رشک ہے۔ بیس بائیس حضرات پر مشتمل اس قافلے نے جمعرات کی سہ پہر کو الریاض سے سفر کا آغاز کیا۔ تقریباً بارہ گھنٹے کے سخت

والے سفر کے بعد رات کے پچھلے پہر مناسکِ عمرہ سے فراغت حاصل کی، پھر
جمعہ ——— اور بعد از نماز جمعہ دو طویل نشستوں میں میرے ساتھ شامل رہے
ہی کی شام کو اس نیت کے ساتھ واپس روانہ ہو گئے کہ ہفتہ کی صبح کو اپنے
حاضر ہونا ہے ——— ! ان سب کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے ———
ن سب کی ہمت و عزیمت پر ان کی خدمت میں ہدیۂ سلام پیش کرتا ہوں۔
اب فاروق چشتی کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ ان کی مہمان نوازی کا نقش راقم کے

ادیر قائم رہے گا۔
ینہ منورہ میں چودھری محمد جمیل صاحب نے جس محبت و شفقت کا اظہار فرمایا۔ اس کا
اظ میں ممکن نہیں۔ چودھری صاحب کراچی کے فردوس ہوٹل کے حوالے سے ایک
مخیر شخصیت ہیں سپاکستان میں ایک خاتون کے سربراہِ حکومت بن جانے سے وہ بہت
ہیں، اور اسی بنا پر 'ہجرت' کی نیت سے مدینہ منورہ میں ڈیرا جمایا ہے ———

اللہ کو منظور !!۔
جدہ کے احباب میں سے محمد اصغر حبیب، فیض اللہ ملک اور سید افتخار الدین اور
دوسرے رفقاءِ تنظیم کے ذکر کی تو کوئی احتیاج نہیں اس لیے کہ وہ میرے اپنے
بازو' ——— اور حقیقی بھائیوں اور بیٹوں کی مانند ہیں ——— البتہ محترم یحییٰ
شکور منشی صاحب کا ذکر لازم ہے کہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنا ایک آراستہ
'شقہ' ہمارے حوالے کیے رکھا ——— اور ہمیں ہر طرح سے آرام پہنچانے کی کوشش کی
اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اُن کے خلوص و اخلاص اور محبت و شفقت کی بھرپور
عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

جدہ میں ایک مفصل ملاقات برنی برادران سے بھی ہوئی جن کا ذکر ایک خاص اعتبار
ضروری ہے۔ یہ دونوں بھائی، ڈاکٹر شجاعت حسین برنی، اور ڈاکٹر فرحت حسین برنی،
ی تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں رکھنے کے ساتھ ساتھ (ڈاکٹر شجاعت معالجہ امراضِ نفسیاتی

ہیں ڈاکٹریٹ کے حامل ہیں اور ڈاکٹر فرحت انجینئر مگر ہیں، نہایت نیک طبیعت اور گہرے مذہبی مزاج کے حامل ہیں، —— اور دونوں ہی نے نہایت قلیل مدت میں قرآن مجید کے ساتھ گہرے شغف کے علاوہ درس قرآن کی عمدہ صلاحیت حاصل کر لی ہے!

ان میں سے فرحت صاحب کی جماعتِ اسلامی کی تحریک کے ساتھ وابستگی نہایت گہری اور جذباتی ہے، —— اور وہ غالباً اس وقت جماعت کے جدہ کے حلقے کے سربراہ ہیں!

انہوں نے اثناءِ گفتگو میں نہایت حسرت کے ساتھ کہا کہ آپ کو جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا! اور جب میں نے عرض کیا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ خود علیحدہ نہیں ہوتے تھے —— بلکہ ہمیں جبراً علیحدہ کیا گیا تھا۔ اور حالات ایسے پیدا کر دیئے گئے تھے کہ اگر ہم جماعت سے علیحدہ نہ ہوتے تو ہماری معنوی موت واقع ہو جاتی، اس لیے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ (فروری ۱۹۵۷ء) میں طے یہ پایا تھا کہ جو لوگ جماعت کی موجودہ پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوں وہ اپنی رائے کا اظہار نہ تحریری طور پر کر سکتے ہیں —— نہ زبانی طور پر، —— انہیں صرف جماعت کے کل پاکستان اجتماعِ ارکان میں اظہار رائے کا حق حاصل ہوگا —— اس کے علاوہ نہ وہ جماعت کے مقامی یا حلقہ وار اجتماعات میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے نہ ارکانِ جماعت سے نجی گفتگوؤں میں! —— اور ارکان کے کل پاکستان اجتماع کے بارے نہ یہ یقینی ہوتا ہے کہ وہ کتنے وقفے کے بعد ہو سکے گا۔ نہ ہی اس میں کسی اختلافی نقطۂ نظر کو تفصیلاً پیش کرنے کا موقع یا محل ہوتا ہے! ——

گویا جماعت اسلامی میں اظہار رائے کی آزادی ہاتھی کے ان دانتوں کے مانند ہے جو دیکھنے میں تو بہت بڑے بڑے نظر آتے ہیں لیکن کھانے کے کام نہیں آ سکتے!!

اس پر جس حیرت اور تعجب کا اظہار برنی صاحب نے کیا اس پر خیال آیا کہ جماعتِ اسلامی کی تاریخ کے اس گمشدہ باب کو اب منظرِ عام پر لے ہی آنا چاہیے جو ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۸ء کے واقعات پر مشتمل ہے اور جس کا ایک اہم حصہ راقم نے بائیس سال قبل ۶۶-۱۹۶۵ء میں 'نقضِ غزل' کے عنوان سے تحریر بھی کر دیا تھا اس لیے کہ اس کے بغیر جماعت کے بہی خواہوں پر ہمارا موقف صحیح طور پر واضح نہیں ہو سکتا —— اور ویسے بھی ان حوادث پر اب تیس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے —— اور اتنے عرصے کے بعد تو دنیا میں حساس ترین دستاویزات کو بھی شائع

کر دیا جاتا ہے ـــــ تاکہ حقائق و واقعات کا علم صفحۂ ہستی سے بالکل گم ہی نہ ہو جاتے اور بعد میں آنے والے لوگ ماضی کے حوادث کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکیں اور مستقبل کے بارے میں صحیح فیصلے کر سکیں ـــــ اس پر یہ بھی یاد آیا کہ یہ فیصلہ ہم نے تقریباً ایک سال قبل کر بھی لیا تھا لیکن پھر دوسری مصروفیات مانع ہوتی رہیں۔

بہرحال اب قارئین 'میثاق' نوٹ فرمالیں کہ 'میثاق' کی آئندہ اشاعت بابت مارچ ۸۹ء میں 'نقضِ غزل' کی وہ پانچ قسطیں یکجا شائع کر دی جائیں گی جو ۷۶ـ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھیں اور انشاء اللہ اپریل کے پرچے میں اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔ واللہ الموفق والمستعان!

حدیثِ رسولؐ

وعن

عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ

قَالَ: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم
عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ
فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ
وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ
وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا
وَاَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ، اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ
مِّنَ اللّٰہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ،
وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا، لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ
لَوْمَةَ لَآئِمٍ (بخاری ومسلم)

مفہوم: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ:

ہم ہر حالت میں اللہ اور رسول اور اُن لوگوں کی جن کو امیر مقرر کیا گیا ہو بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی اور خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اُس صورت میں بھی جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اُس وقت ہمارے پاس دلیل ہو گی کہ ہم اُس کی بات نہ مانیں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

نزلہ و زکام
جوشینا سے آرام
پیچیدہ نباتات کے نہایت موثر کافی و شافی
اجزا حاصل کرنا کمالِ فن ہے' دوا سازی کی عظمت ہے۔ ہمدرد میں ماہرینِ فن
اس عظمت اور خدمت میں ہمہ دم اور ہمہ جہت مصروف ہیں۔
ہمدرد کی فنی محنت اور دوا سازی
کی صلاحیت کا ایک مظہر ہے
جوشینا
نزلہ و زکام۔ جوشینا سے آرام
کھانسی اور سینے کی جکڑن کا موثر علاج
ہمدرد
خدمت خلق روح اخلاق ہے
ADARTS
JOS-1/88

رفقاء واحباب نوٹ فرمالیں

امسال مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

سالانہ محاضراتِ قرآنی

ان شاء اللہ العزیز لاہور میں ۲۴ تا ۲۸ مارچ ۸۹ء

اور

تنظیمِ اسلامی کا

چودھواں سالانہ اجتماع

لاہور ہی میں ۲۹ ، اور ۳۰ ، مارچ کو منعقد ہوگا

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (المائدہ)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۸
شمارہ: ۳
رجب ۱۴۰۹ھ
مارچ ۱۹۸۹ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر
اقتدار احمد
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات	۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا	۶- امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ	۹- امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ	۱۲- امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ۔ ماڈل ٹاؤن فیروز پور روڈ۔ لاہور (پاکستان)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

ان شاء اللہ تنظیمِ اسلامی پاکستان کا چودھواں[۱۴]

سالانہ اجتماع

۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء — گارڈن ٹاؤن لاہور کے ماڈل ٹاؤن بلاک میں واقع

قرآن آڈیٹوریم

میں منعقد ہوگا۔ تنظیم کے رفقاء و احباب ۲۸ اور ۲۹ مارچ کی درمیانی شب کو لاہور ضرور پہنچ جائیں۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر ۲۸ مارچ کو ۵ بجے شام تا ۱۲ بجے شب استقبالیہ کیمپ قائم رہے گا۔ بعد میں آنے والے حضرات کو خود قرآن آڈیٹوریم یا قرآن اکیڈمی پہنچنا ہوگا۔ شرکاء اجتماع موسم کے مطابق بستر کے علاوہ ایک ایک پلیٹ اور چائے کے لیے ایک ایک کپ یا چھوٹا مگ ضرور ساتھ لائیں۔

رفقاءِ تنظیم نوٹ فرمالیں کہ سالانہ اجتماع میں شرکت لازمی ہے!

مزید برآں ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۹ء

ایک نہایت مفید تعلیمی و تربیتی پروگرام جاری رہے گا

مقامی تنظیموں کے امراء اور نقباء اور وہ رفقاء جنہوں نے مبتدی تربیتی نصاب کی تکمیل کرلی ہے اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کی حتی الامکان کوشش کریں اور اس کے لیے جمعرات ۲۳ مارچ کی دوپہر تک لازماً قرآن اکیڈمی پہنچ جائیں

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و مددگار ہو

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

ڈاکٹر اسرار احمد

الحمدللہ کہ محترم صلاح الدین صاحب نے ہمارے گزشتہ ماہ کے "تذکرہ وتبصرہ" کے 'جوابِ آں غزل' کے لئے اپنے مؤقر جریدے (تکبیر ۲۳ر فروری ۸۹ء) کے ساڑھے سات سے زائد صفحات وقف کرنے کے باوجود عہد جدید کی اسلامی ریاست اوراس میں قانون سازی کے ضمن میں اجتہاد کے موضوع پر ایک حرف نہیں لکھا...... حالانکہ اس سے قبل اس موضوع پر ان کی خامہ فرسائی ڈھائی صفحات پر پھیلی ہوئی تھی اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب اور حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کے نام اپنے جو خطوط انہوں نے حالیہ شمارے میں شائع کئے ہیں ان میں بھی انہوں نے راقم پر "علامہ اقبال کی فکر" کو "مسخ کرنے کی کوشش" کا الزام عائد کیا ہے......!

اس کا سبب بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اس معاملے میں راقم کی وضاحت سے راقم الحروف اور علامہ اقبال مرحوم دونوں کے بارے میں ان کی غلط فہمی بھی رفع ہو گئی ہے اور وقت کے اس اہم ترین مسئلے کے بارے میں ان کی ذہنی الجھن بھی حل ہو گئی ہے۔

...... اس سلسلے میں اگر وہ واضح اعتراف بھی کر لیتے تو اس میں ہرگز کوئی سُبکی والی بات نہ تھی، بلکہ اس سے ان کا اخلاقی تشخص مزید مستحکم ہوتا...... اور اہم تر بات یہ ہے کہ ان کی تحریر کے ایک نہایت وسیع حلقے میں شائع ہونے کے باعث جو شکوک و شبہات اور خاص طور پر علامہ اقبال مرحوم ایسی محترم شخصیت سے جو سُوءِ ظن بہت سے لوگوں کے قلوب و اذہان میں پیدا ہوا اس کے ازالے کی صورت بن جاتی! ...... ہمیں امید ہے کہ 'مدیر تکبیر' معاملے کے اس پہلو پر ضرور غور فرمائیں گے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ہم یہ گزارش بھی کریں گے کہ وہ ہماری تحریر کا وہ حصہ اپنے مؤقر جریدے میں بمن و عن شائع کر دیں جو اس

موضوع سے متعلق ہے! اس سے "ان شاء اللہ العزیز" عہدِ جدید کی اسلامی ریاست کے بارے میں بہت سے ذہنوں کی الجھنیں دور ہو جائیں گی...... واللہ اعلم!!

اس سے پہلے کہ "عالم من وتو" کی "گفت و گو" کا آغاز کیا جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسی افہام و تفہیم کی فضا میں اُن دو تین علمی و فکری مغالطوں کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے جو ان کی تازہ تحریر میں نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں:

(۱) ان میں اولین اور اہم ترین معاملہ وہ ہے جس پر ان کی تحریر کا اختتام ہوا ہے اور جس پر انہوں نے نہایت متحدّیانہ (CHALLENGING) انداز میں اس عاجز و ناچیز کو تحریری یا تقریری مباحثے اور مناظرے کی دعوت دی ہے! یعنی "اسلامی ریاست میں شوریٰ کی رکنیت" کے ضمن میں علم اور کردار کی شرائط کا مسئلہ!

اس ضمن میں، صلاح الدین صاحب برا نہ مانیں، ہمیں تو معاملہ "آ پڑوسن جنگ کریں!" والا نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس مسئلے میں ہمارے اور اُن کے مابین کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ چنانچہ اگر وہ گزشتہ ماہ کے 'میثاق' کے صفحہ ۸۳ پر یہ چار سطور دوبارہ پڑھ لیں کہ:

> "میں نے وضاحت کر دی تھی کہ اضافی شرائط کے ضمن میں جیسے ووٹر کی عمر کا معاملہ ہے جو مختلف جمہوری ممالک میں مختلف ہے، اسی طرح تعلیم اور کردار کی اضافی شرائط بھی عائد کی جا سکتی ہیں...... لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہو گا جمہور کی رضامندی سے! (اس لئے کہ دستورِ مملکت جمہور کی رضامندی ہی سے بن سکتا ہے!)

اور اس کے ساتھ ساتھ صفحہ ۹۱ کی ان سطور پر بھی نگاہ ڈال لیں کہ:

> "بحالات موجودہ اسلام کے سیاسی اور ریاستی نظام کے موضوع پر گفتگو میں ایک خلط مبحث اس بنا پر بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اصولی بحث کرتے کرتے لوگ اچانک اس کا جوں کا توں انطباق موجود الوقت حالات پر کرنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ کہاں ہمارا موجودہ مسلمان معاشرہ اور کہاں اسلامی ریاست ؏ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک!"...... اس خلط مبحث کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی بحث وقتی سیاسی محاذ آرائیوں اور چپقلشوں کے خارزار میں الجھ کر

رہ جاتی ہے اور وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے جس سے مدیر "تکبیر" اس وقت شدت کے ساتھ دوچار ہیں!......"

تو ان شاء اللہ العزیز وہ خود ہی محسوس کرلیں گے کہ اس موضوع پر وقت و قوت اور قلم و قرطاس کا ضیاع لاحاصل ہے!

البتہ عام قارئین کے افادہ کے لئے اس معاملے میں دو باتوں کی وضاحت مناسب ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ عہد حاضر کی اسلامی ریاست ایک THEO-DEMOCRACY یعنی مذہب اور جمہوریت کا "امتزاج" ہوگی (یہ بات اتنے واضح الفاظ میں اولاً مولانا مودودی مرحوم نے فرمائی تھی، اور اس پر نہ صرف یہ کہ میرا اور صلاح الدین صاحب کا اتفاق ہے بلکہ ہمارا گمان ہے کہ کوئی باشعور انسان اس سے اختلاف نہیں کرے گا۔) تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس میں توحید کے لازمی منطقی تقاضے یعنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کے ساتھ ساتھ (اور یقیناً اس کے تابع!) کسی نہ کسی درجہ میں جمہوریت کے اصل الاصول یعنی "حاکمیتِ عوام" کا عمل دخل بھی ہو...... یہاں حاکمیت عوام کی اصطلاح ہم نے جان بوجھ کر استعمال کی ہے تاکہ لوگ چونک جائیں اور ذہن پوری طرح بیدار کر کے غور کریں۔

اس "حاکمیت عوام" کی اساس زندگی کے لائحہ عمل کے بارے میں انتخاب و اختیار کی وہ آزادی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عطا فرمائی ہے۔

اس آزادی و اختیار کا اولین ظہور "اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا" کے مطابق شکر و کفر اور اسلام و انکار کے مابین کسی روش کے انتخاب کی صورت میں ہوتا ہے جسے "لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ" کے الفاظ مبارکہ کے ذریعے نہایت مؤکد کر دیا گیا ہے! (یہاں اخروی جزاء و سزا اور عقوبت و ثواب کے علاوہ کسی اسلامی ریاست کے مسلمان شہری کے مرتد ہو جانے کے معاملے کو بھی علیحدہ رکھا جائے اس لئے کہ وہ ایک استثنائی معاملہ ہے اور جداگانہ فنی بحث کا متقاضی ہے!)

پھر جس طرح کسی فرد کے مسلمان یا کافر ہونے کا دارومدار اس کے انفرادی فیصلے یا انتخاب و اختیار پر ہے اسی طرح کسی ملک کے "اسلامی ریاست" کی صورت اختیار کرنے کا انحصار بھی اس کے شہریوں کے اجتماعی فیصلے اور مجموعی ارادے (COLLECTIVE WILL) پر ہے۔ جو یا بصورت انقلاب ظہور پذیر ہوتا ہے یا بذریعۂ انتخاب! ان میں سے پہلی صورت میں ایک منظم اقلیت اپنی محنت و مشقت اور قربانی و ایثار کے بل پر فیصلہ کن حد تک غالب ہو جاتی

ہے‘ جبکہ دوسری صورت میں فیصلے کا دارومدار رائے دہندگان کی عددی اکثریت پر ہوتا ہے!

اسلامی ریاست کے قیام کے فیصلے کے بعد بھی ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ عوام کے ارادہ و اختیار کی آزادی کلیتہً سلب ہو جائے بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی "حاکمیت مطلقہ" اور عوام کی "حاکمیت محدودہ" کے مابین ایک حسین امتزاج قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی جس طرح ایک فردِ مسلم مباحات کے دائرے میں آزاد ہے کہ مختلف مباح چیزوں میں سے جسے چاہے اختیار کر لے اسی طرح اسلامی ریاست میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح احکام یا بالفاظ دیگر کتاب و سنت کے نصوص کی حدود کے اندر اندر جملہ ملکی و مملکتی‘ قانونی و دستوری‘ اور مالی و انتظامی معاملات میں جمہور کو "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کے مطابق کامل آزادی حاصل رہتی ہے۔ جس کے ضمن میں تمدنی ارتقاء کے اعلیٰ ترین ثمرات اور جمہوریت کی بلند ترین اقدار کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ اور جمہور کی محدود حاکمیت کے مابین تناسب و توازن کی بہترین تعبیر اس حدیث نبویؐ کی مدد سے کی جا سکتی ہے کہ:

"مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ فِى اٰخِيَّتِهٖ" ...... یعنی بندۂ مومن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو کسی کھونٹے سے بندھا ہوا ہو۔ یعنی مسلمان بے لگام اور بگٹٹ یا مادر پدر آزاد نہیں ہوتا بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا "پابند" ہوتا ہے۔ اسی تشبیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے فرض کیجئے کہ ایک وسیع و عریض میدان میں آپ یہ بھی چاہتے ہوں کہ گھوڑے کو چرنے چگنے اور اپنے پاؤں کھولنے کی آزادی حاصل رہے لیکن ساتھ ہی یہ احتیاط بھی کرنا چاہیں کہ کہیں وہ بھاگ ہی نہ جائے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ اسے ایک بہت لمبی رسّی کے ساتھ کسی کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ اب فرض کیجئے کہ وہ رسّی سو گز لمبی ہے تو اس کھونٹے کے گرد سو گز نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آ جائے گا جس میں وہ گھوڑا کاملتہً آزاد ہو گا کہ جس رخ پر چاہے چلا جائے‘ اور خواہ کھڑا رہے خواہ لوٹ لگائے‘ لیکن کسی بھی سمت میں اس دائرے سے باہر نکلنا اس کے لئے ممکن نہ ہو گا۔ ایک مسلمان کی انفرادی زندگی ہو یا عہد جدید کی اسلامی ریاست کا دستوری ڈھانچہ دونوں میں اس دائرے کی حیثیت تو حاصل ہے "حدود اللہ" یعنی کتاب و سنت کے واضح احکامات کو‘ ...... گویا یہ دائرہ مظہر ہے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کا‘ اور اس دائرے کے اندر اندر عملداری ہے "حاکمیتِ عوام" یا "سلطانئ جمہور" کی! جس میں جملہ اصولی رہنمائیوں اور تمام تر اخلاقی تعلیمات کے باوصف آخری

تجزیے میں فیصلہ کن عمل دخل حاصل ہو گا رائے دہندگان کی کثرتِ رائے کو۔

چنانچہ اگر کسی مسلمان ملک کے شہری اپنے نمائندوں کی اکثریت کی رائے سے یہ طے کر لیں کہ یہاں پارلیمینٹ کی ممبری کا استحقاق ہی نہیں ووٹ کا بنیادی حق بھی صرف اُس شخص کو حاصل ہو گا جو نہ صرف یہ کہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے شریعت اسلامی میں قبولیتِ شہادت کے کم از کم معیار پر پورا اترتا ہو' بلکہ دین کے علم کی بھی ایک کم از کم معین مقدار کی تحصیل کر لے تو اس پر کسی بڑے سے بڑے جمہوریت پسند کو بھی کسی اعتراض کا حق حاصل نہ ہو گا۔

(بنابریں پاکستان کے موجودہ دستور کے آرٹیکل ٦٢ اور ٦٣ کے حوالے سے محترم صلاح الدین صاحب کو پورا حق حاصل ہے کہ عدالت کا کنڈا کھٹکھٹائیں...... بلکہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ' خود اپنے الفاظ کے مطابق "مطلق العنان حکمران سے ساڑھے گیارہ سالہ راہ و رسم" کے ذریعے کچھ مزید شرائط مثلاً کسی خاتون کے صدر مملکت یا سربراہ حکومت بننے پر پابندی بھی عائد کرا لیتے! تا کہ موجودہ پریشان کن صورت حال پیدا ہی نہ ہوتی......!)

اس سلسلے کی دوسری ضروری اور اہم وضاحت یہ ہے کہ جب مدیر 'تکبیر' یہ فرماتے ہیں کہ "اسلامی جمہوریہ میں شوریٰ (پارلیمینٹ) کی رکنیت کے لئے مستشار (رکن شوریٰ) کی جو بنیادی شرائط آج تک متفق علیہ چلی آ رہی ہیں" تو اس سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ شاید مسلمانوں کی پوری تاریخ کے دوران "قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کرنے اور اولی الامر (کابینہ) کا تقرر کرنے والی شوریٰ" کے انتخاب میں شرکت کے لئے "امیدواروں کی شرائطِ اہلیت" بالفعل نافذ رہی ہیں' جبکہ واقعتہً خلافت راشدہ کے عہدِ زرّیں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی پوری پونے چودہ سو سالہ تاریخ میں نہ کبھی کسی پارلیمینٹ کا وجود رہا ہے نہ شوریٰ کا! اور حکومت و مملکت کا پورا ڈھانچہ یا قبائلی عصبیت پر قائم رہا ہے یا جاگیرداری نظام پر' ہاں عدلیہ کا وجود ضرور رہا ہے اور اس میں "تقرری" کے ضمن میں حکمران کی ذاتی پسند و ناپسند کے ساتھ ساتھ مناسب لحاظ اہلیت اور قابلیت کا بھی رہا ہے!...... مزید بر آں خلافت راشدہ کے دوران بھی شوریٰ کے انتخاب کا مرحلہ کبھی پیش نہیں آیا کہ "امیدواروں کی شرائطِ اہلیت" کا سوال عملاً پیدا ہوتا اس لئے کہ وہاں تو ایک طویل اور جانگسل انقلابی جدوجہد کے دوران سبقت و مسابقت' ایثار و قربانی' اور سرفروشی و جانفشانی کی بنیاد پر لوگوں کے مابین ایک درجہ بندی از خود ہو گئی تھی کہ یہ حضرات "السابقون الاوّلون" میں سے ہیں" یہ "اصحاب بدر" ہیں' یہ "اصحابُ الشجرہ" ہیں' رضی اللہ تعالیٰ عنہم و ارضاھم

اجمعین!..... گویا وہاں نہ 'امیدواری' تھی نہ انتخاب' تو شرائط امیدواری کا ذکر چہ معنی دارد!! —

محترم صلاح الدین صاحب سے مخلصانہ درخواست ہے کہ وہ اِس حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں کہ ایک 'جمہوریہ' (REPUBLIC) کا خواب تو نوعِ انسانی نے یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لگ بھگ ایک ہزار سال قبل افلاطون کی چشمِ تصور کے ذریعے دیکھ لیا تھا. لیکن جیسے ایچ جی ویلز نے کہا ہے کہ "انسانی حریّت' اخوّت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ پہلی بار قائم کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے۔"

اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ ایک حقیقی جمہوریہ تاریخ انسانی میں پہلی بار قائم ہوئی تھی نبی اکرمؐ کے دستِ مبارک سے خلافت راشدہ کی صورت میں' اور اس کے خاتمے کے بعد ایک لادین جمہوریت کا ظہور ہوا اب سے دو سو سال قبل یورپ میں' رہی "اسلامی جمہوریہ" تو اس کے لئے تو مادرِ گیتی چشم براہ ہے کہ دوبارہ[1] کب اور کہاں جلوہ آرا ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں بھی اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک بار پھر پڑھ لئے جائیں راقم کے درج ذیل الفاظ :-

"ان سطور کے راقم کو اس بات پر تو ایمان بھی حاصل ہے اور یقین بھی کہ پورے کرۂ ارضی پر ایک عالمی اور مثالی اسلامی ریاست قائم ہو کر رہے گی۔ اور ایک گمان (یا خوش فہمی؟) یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز مملکت خداداد پاکستان ہی سے ہو گا...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ ابھی ہم اس سے بہت دور ہیں اور ایک طویل جدوجہد اور جانگسل محنت و مشقت بلکہ آگ اور خون کے بہت سے دریا راستے میں حائل ہیں! اور بڑے ہی دل گردے کے مالک اور ہمّت و عزیمت کے پیکر مجسم ہوں گے وہ لوگ جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس کے لئے کمر ہمّت کس لیں!...... اسلامی ریاست کے قیام کے آرزومندوں اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے خواہشمندوں کو جان لینا چاہئے کہ فی الوقت اصل ضرورت ایسے صاحبِ عزیمت لوگوں کی تلاش اور انہیں کسی مضبوط تنظیمی ڈھانچے کی صورت

---

[1] جامیؔ کی نعت کا مشہور شعر ہے۔

مشرّف گرچہ شد جامیؔ زلطفش — خدایا آں کرم بارِ دگر کن!

میں بنیان مرصوص بنانے کی ہے۔

میں کہ مری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

(میثاق فروری ۸۹ء صفحہ ۹۱)

---

(۲) محترم صلاح الدین صاحب کی حالیہ تحریر کا دوسرا بڑا مغالطہ نظامِ بیعت سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں اوّلاً تو، اگر اس پر "مگس کو باغ میں جانے نہ دینا۔ کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا!" کی پھبتی نہ چُست کی جائے، تو یہ عرض کروں گا کہ محترم صلاح الدین صاحب نے مجھ پر نادانستہ طور پر کفر کا فتویٰ لگا دیا ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے میری اور تنظیمِ اسلامی کی جانب "غیر مشروط سمع وطاعت" کو منسوب کر کے (واضح رہے کہ یہ الفاظ دوہرے واوین میں درج کئے گئے ہیں) "کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ○" کے مصداق بہت بڑا افتراء اور عظیم تہمت تراشی کی ہے!...... اگرچہ یہ سب کچھ ہوا ہے کچھ اسلامی اصطلاحات سے ناواقفیت کی بنا پر اور کچھ اُسی کیفیت کے زیرِ اثر جس کا ذکر اُس حدیث نبویؐ میں ہے جس کا حوالہ گزشتہ ماہ کے 'تذکرہ و تبصرہ' میں آچکا ہے...... یعنی "تمہارا کسی چیز سے محبت کرنا تمہیں اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے!"

ورنہ یہ بات یقیناً محترم صلاح الدین صاحب کے علم سے باہر نہیں ہو سکتی کہ اسلام کے اساسی عقیدے یعنی توحید کی رُو سے مطلق اور غیر مشروط اطاعت صرف اللہ تعالیٰ یا اس کے نمائندے کی حیثیت سے اس کے کسی نبی یا رسول ہی کی ہو سکتی ہے، اور "غیر مشروط سمع و طاعت" کی بیعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کی نہیں کی جا سکتی، اور اگر کی جائے تو جو ایسی بیعت کرے وہ بھی، اور جس کی بیعت کی جائے وہ بھی کفر کے مرتکب ہوں گے۔ اس لئے کہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جس شخص سے یہ بیعت کی گئی اسے یا تو 'اَرْبَابٌ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ' میں شامل کر لیا گیا ہے یا بصورتِ دیگر نبی یا رسول تسلیم کر لیا گیا ہے! اعاذنا اللہ من ذالک!...... بہرحال مدیر 'تکبیر' اور ان ہی کے مانند مغالطوں میں مبتلا دوسرے حضرات نوٹ فرمالیں کہ تنظیمِ اسلامی "بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف" یعنی کتاب و سُنّت کے نصوص کے اس دائرے کے اندر اندر سمع وطاعت کے معاہدے پر قائم کی گئی ہے

جس کی مفصل وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

اس پیچ در پیچ مغالطے کی دوسری کڑی یہ ہے کہ "فلسفۂ بیعت آزادیٔ اظہار ا
آزادیٔ اختلافِ رائے کو لوہے کے دانتوں سے پکڑ لیتی (یعنی لیتا) ہے"...... یہاں مد
'بکمبیر' کی 'نادانستگی' کے جوہر کچھ مزید نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ ان ۔
اس 'مطلق العنان' بیان...... یعنی 'CATEGORICAL STATEMENT' کی زد ع "ناوک ۔
تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!" کے مصداق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشد
رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر بھی پڑ رہی ہے۔ محترم صلاح الدین صاحب ذرا ہوش ۔
ناخن لیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت تو غیر مشروط تھی اس کے باوجود ان کے ع
سعادت میں رائے اور اظہار کی ایسی آزادی تھی جیسی نہ کبھی پہلے رہی تھی نہ بعد میں آج تک
سامنے آ سکی ہے۔ اسی طرح خلافتِ راشدہ کا نظامِ حکومت بھی اگرچہ "بیعتِ سمع وطاعت
المعروف" پر مبنی تھا، لیکن ان کے دور میں کامل آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار پر مست
دوسرے امراء و عاملین ہی نہیں خود خلیفۂ راشد اور امیر المومنین پر ذاتی تنقیدوں تک کی
آزادی تھی!...... گویا کسی نظم جماعت یا ہیئتِ تنظیمی کا مغرب سے درآمد شدہ دستوری
جمہوری اساس پر قائم ہونا یا بیعت کے مسنون و ماثور طریقے پر مبنی ہونا ایک جداگانہ بحث
ہے...... اور آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کا معاملہ بالکل جدا ہے!! اور یہ عین ممکن ہے
کسی دستوری (اور ظاہری طور پر جمہوری) جماعت میں 'آزادیٔ اظہارِ رائے' کو پور۔
قانونی اور دستوری انداز ہی میں پابندِ سلاسل کر دیا جائے اور آزادانہ تبادلۂ خیال کو (نجویٰ
قرآنی اصطلاح کی غلط اور خود ساختہ تعبیر کے حوالے سے) ممنوع قرار دے کر نیم واقف'
ناواقف یا مغالطوں میں مبتلا (MISINFORMED) لوگوں کی "کثرتِ رائے" کی بنیاد پر جمہوریہ
کا ڈھنڈورا پیٹا جائے...... اور اس کے بالکل برعکس یہ بھی عین ممکن ہے کہ شخصی بیعت کی بنیاد
قائم ہونے والی اجتماعیت میں اظہارِ رائے اور تنقید کی کھلی آزادی ہو۔ اور آزادانہ بحث
مباحثے اور تبادلۂ خیال کی فضا بدرجۂ اتم قائم رکھی جائے۔ اگرچہ آخری فیصلہ ع "بندوا
کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" کے مصداق ووٹوں کی گنتی سے نہ کیا جائے بلکہ پوری بحث
تمحیص کے بعد فیصلہ اُس شخص پر چھوڑ دیا جائے جس سے بیعت کی گئی ہو! چنانچہ اس کا ایک
ناقابلِ تردید ثبوت تو وہ ہے جو اوپر پیش ہو چکا...... یعنی دورِ خلافتِ راشدہ کا ماحول...... اور ایک

دوسراجیتاجاگتاثبوت، جو اس کے مقابلے میں تو یقیناً نہایت حقیر اور ادنیٰ ہے لیکن موجودالوقت احوال وظروف کے اعتبار سے نہایت اہم اور نمایاں ہے، وہ بحمداللہ تنظیم اسلامی کی صورت میں موجود ہے! شرط صرف یہ ہے کہ خالی الذھن ہوکر، اور قریب آکر مشاہدہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ اسی آزادیٔ اظہار رائے کا مظہر ہے کہ ہمارے بعض "مقربین" نے ہمارے کسی موقف پر اپنی " ذہنی ہل چل" کا اظہار صلاح الدین صاحب کے سامنے کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی۔ اور متعدد رفقاء تنظیم نے نہایت تیز و تند تنقید یں کراچی ہی کے اجتماع کے دوران خود مجھ پر اور مدیر 'ندا' پر کیں ـــــ مزید برآں تنظیم کے ایک رفیق، زبیر عمر صدیقی صاحب کی میری بعض آراء سے اختلاف پر مشتمل تحریر ہفت روزہ 'ندا' میں شائع ہوئی ہے۔)

اور اگرچہ یہ بحث محترم صلاح الدین صاحب سے تو براہ راست متعلق ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی جماعت یا تنظیم میں شامل ہونے کے سرے سے قائل ہی نہیں (مبادا کبھی اس سے نکلنا پڑ جائے!) تاہم چونکہ انہوں نے ہمارے 'تذکرہ و تبصرہ' کے اس حصے سے متعلق بحث بھی چھیڑ دی ہے جس میں "تجھ سے تو کچھ کلام نہیں.....!" کے مصداق ان سے خطاب ہی نہ تھا، لہٰذا اس کی کسی قدر 'وضاحت' ضروری ہو گئی ہے جس سے، ان شاء اللہ العزیز، اقامتِ دین کے لئے قائم ہونے والی جماعت کے نظم کی نوعیت کے اہم لیکن مشکل مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے تمام لوگوں کو فائدہ ہوگا۔

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ محترم صلاح الدین صاحب نے کس اصول کی بنیاد پر اور کس مقصد کے تحت ہمارے ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد کہ " جماعتِ اسلامی میں اظہارِ رائے کی آزادی ہاتھی کے اُن دانتوں کے مانند ہے جو دیکھنے میں تو بہت بڑے نظر آتے ہیں لیکن کھانے کے کام نہیں آسکتے!" اس کے بعد کی پوری سولہ سطروں کا اقتباس تو درج فرما دیا لیکن پہلے کی وہ سات سطریں درج نہ کیں جن میں اس رائے کی دلیل پیش کی گئی تھی۔ یعنی:

"اس لئے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ (فروری 1957ء) میں طے یہ پایا تھا کہ جو لوگ جماعت کی موجودہ پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوں وہ اپنی رائے کا اظہار نہ

تحریری طور پر کر سکتے ہیں...... نہ زبانی طور پر '...... انہیں صرف جماعت کے کُل پاکستان اجتماعِ ارکان میں اظہارِ رائے کا حق حاصل ہو گا...... اس کے علاوہ نہ وہ جماعت کے مقامی یا حلقہ وار اجتماعات میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے نہ ارکان جماعت سے نجی گفتگوؤں میں!...... اور ارکان کے کُل پاکستان اجتماع کے بارے میں نہ یہ یقینی ہوتا ہے کہ وہ کتنے وقفے کے بعد ہو سکے گا...... نہ ہی اس میں کسی اختلافی نقطۂ نظر کو تفصیلاً پیش کرنے کا موقع یا محل ہوتا ہے!" ......

بہرصورت، اس موضوع پر دو اعتبارات سے گفتگو مناسب ہے۔ یعنی ایک اصولی اعتبار سے اور دوسرے واقعاتی اعتبار سے!

1۔ اصولی اعتبار سے راقم الحروف کی رائے اب بھی وہی ہے جس کا تحریری اور اعلانیہ اظہار سترہ سال قبل مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کے موقع پر اس کے مجوزہ دستور کے مسودہ کے ساتھ ضروری وضاحت کے طور پر کیا گیا تھا...... و ھو ھٰذا :

"دوسرا اعتراض جو اس جمہوریت نواز بلکہ جمہوریت پرست دور میں انجمن کے مجوزہ خاکے کے بارے میں پیدا ہونا لازمی ہے یہ ہے کہ اس میں صدر مؤسس کی حیثیت تحکمانہ ہی نہیں آمرانہ ہے۔ اس ضمن میں ہم اس اعتراف میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے نزدیک کسی دینی خدمت خصوصاً احیائی کوشش کے لئے جو بھی انجمن یا ادارہ وجود میں آئے یا جماعت یا تنظیم قائم ہو اس کا نظم اسی نوعیت کا ہونا چاہئے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اس طرح کی کسی بھی کوشش کا آغاز بالعموم اسی طرح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرد کے دل میں اس کام کے لئے ایک شدید داعیہ بھی پیدا فرما دیتا ہے اور اس سلسلے میں موجود الوقت ظروف و احوال کی مناسبت سے اسے کسی خاص طریقِ کار اور منہج عمل کے لئے انشراحِ صدر بھی عطا فرما دیتا ہے' تب یہ فرد اس کام کو لے کر اٹھتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف بلاتا ہے اور صلائے عام دیتا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ؟"[1] چنانچہ جن لوگوں کو اس کے خیالات سے اتفاق اور خود اس پر شخصی اعتبار سے فی الجملہ اعتماد ہوتا ہے وہ اس کے

---

[1] سورۂ صف آیت نمبر 14 "کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں!"

گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اسے آپ سے آپ ان لوگوں کی رہنمائی کا منصب حاصل ہو جاتا ہے۔

اب صاف اور سیدھی سی صورت یہی ہے کہ اس حقیقت کو خود بھی قبول کیا جائے اور اسی کا اعلانِ عام بھی ہو تاکہ جو بھی آئے اس صورت کو ذہناً قبول کر کے آئے اور بصورتِ دیگر اپنے لئے کوئی اور راہ تجویز کرے۔ یہی وجہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی تاریخ کے دوران میں جو احیائی کوششیں ہوئیں ان سب کا کم از کم 'تحریکِ شہیدین' کے زمانے تک تو نظم یہی رہا ہے کہ ایک شخص بحیثیتِ داعی اٹھتا ہے اور جو لوگ اس کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ آپ سے آپ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ نہ کوئی شرائطِ رکنیت ہوتی ہیں نہ فارم داخلہ' نہ کہیں "پانچ سالہ" انتخاب کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے نہ ہی 'امیر' اور 'شوریٰ' کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لئے پیچ در پیچ فارمولے ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی استعفیٰ یا 'اخراج' کے لئے کوئی ضابطہ بنایا جاتا ہے۔ بلکہ ایک شخص اپنے ذاتی احساسِ فرض کے تحت کام کا آغاز کر دیتا ہے۔ پھر جس جس کو اس کے خیالات سے اتفاق اور اس کی ذات پر اعتماد ہوتا ہے اس کا ساتھ دیتا رہتا ہے اور جونہی یہ دونوں —— یا ان میں سے کوئی ایک بات موجود نہیں رہتی اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا ہے اور خواہ مخواہ "هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ"[1] کے قسم کے قضیے کھڑے کرنے میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ وہ داعی اگر واقعی مخلص ہے اور خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے اور "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا"[2] کا مصداق بننے کا شوقین نہیں تو اس کے لئے لازم ہے کہ جماعت میں شورائیت کا ماحول قائم رکھے۔ تاکہ اطمینان و اعتماد کی فضا برقرار رہے۔

ہم اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمارا ذہن بالکل

---

[1] سورۂ آلِ عمران آیت نمبر 154 "اختیارات میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں!"

[2] سورۂ نحل آیت نمبر 92 "اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے مضبوطی کے ساتھ کاتے ہوئے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا!"

یکسو ہے۔ ہم نے مجوزہ انجمن کے لئے قواعد و ضوابط کا یہ تھوڑا سا کھکھیڑ بھی صرف اس لئے مول لیا ہے کہ ایک تو یہ جماعت نہیں انجمن ہے اور دوسرے اس کی لامحالہ کچھ جائیداد بھی ہوگی جس کی تولیت کا معاملہ خالص قانونی ہے' ورنہ اگر خدا نے چاہا اور کسی ہمہ گیر دعوت کے آغاز کی توفیق بارگاہِ ربّ العزت سے ارزانی ہو گئی تو اس کا معاملہ انشاء اللہ خالصتاً اس نہج پر ہوگا جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے تعلیم و تعلمِ قرآن کے جس کام کا علم اٹھایا ہے اس کی ابتداء بھی اسی فطری نہج پر ہوئی تھی کہ ایک شخص کے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا اور اسے کامل انشراح ہو گیا کہ فی الوقت "کرنے کا اصل کام" یہی ہے (کہ جا ایں جا است!) چنانچہ اس نے تن تنہا سفر کا آغاز کر دیا۔ تا آنکہ اب صورت یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کی نصرت پر کمرِ ہمت کس لی ہے۔ اس فطری صورتِ حال کو صرف موجود الوقت رجحانات کے دباؤ کے تحت 'جمہوری' رنگ دینا نہ صرف یہ کہ ایک خواہ مخواہ کا تکلّف اور تصنّع ہے بلکہ خدشہ یہ ہے کہ اس طرح تمام وقت قواعد و ضوابط کی خانہ پُری اور حدود و اختیارات کی رسّہ کشی کے نذر ہو کے رہ جائے گا اور کام کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ بنابریں ہم نے وہی راستہ اختیار کیا ہے جو مطابقِ واقعہ بھی ہے اور کام کی مقدار اور رفتار کے اعتبار سے موزوں تر بھی! اللہ تعالیٰ ہمیں خلوص و اخلاص کی دولت عطا فرمائے اور ہمیں اپنے دین کی بالعموم اور اپنی کتابِ عزیز کی بالخصوص خدمت کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ خاکسار اسرار احمد۔"

الحمد للہ کہ ہمیں اپنی اس رائے کی صحت پر جس قدر اعتماد اس وقت تھا اس سے کم از کم دہ چند انشراح اب حاصل ہے..... اس لئے کہ ہمارے نزدیک :

(ا) یہی طریقہ معقول اور منطقی بھی ہے' اور

(ب) سادہ اور فطری بھی'...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

(ج) مسنون و ماثور بھی ہے...... (بلکہ 'منصوص' بھی!)

اس سلسلے میں' ظاہر ہے کہ' ایسے لوگوں سے تو کوئی بحث ہی نہیں ہے جو (1) یا تو اقامتِ دین اور غلبۂ اسلام کی جدّوجہد کو دینی فریضہ ہی نہیں سمجھتے..... یا (2) اس جنّت الحمقاء

کا ہی ہیں کہ یہ کام محض تصنیف و تالیف یا تعلیم و تلقین یا دعوت و تبلیغ سے ہو جائے گا اور اس کے لئے نہ کوئی انقلابی جدوجہد درکار ہے نہ کسی منظم ہیئت اجتماعیہ کے قیام کی ضرورت '...... یا (3) صرف آزاد صحافت ہی کو نہ صرف پیشے بلکہ اپنے جملہ قومی و ملی 'اور دینی و مذہبی فرائض کی ادائیگی کے کافی و خود مکتفی ذریعے کی حیثیت سے اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ہر وہ باشعور شخص جو اقامت دین کی جدوجہد کو دینی فرائض میں شامل سمجھ کر اس کے لئے لازمی انقلابی جدوجہد کے منطقی تقاضوں پر غور کرے گا وہ لامحالہ اسی نتیجے پر پہنچے گا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

واقعاتی اعتبار سے فی الوقت چند بار بار کی دہرائی ہوئی باتوں کی جانب صرف اشارہ کافی ہو گا:-

(1) بیسویں صدی عیسوی میں برِ عظیم پاک و ہند میں تحریکِ اسلامی کے داعیِ اول تھے امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم جنہوں نے 1913ء میں بیعت کی بنیاد پر "حزب اللہ" قائم کی۔ (یہ دوسری بات ہے کہ 1920ء میں بعض اسباب کی بنا پر انہوں نے اپنا رخ تبدیل کیا جن کی تفصیل کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے)

(2) ان کے معنوی خلیفہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم بھی اصلاً اسی کے قائل تھے جو ان کے اس خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے مارچ 1941ء میں جماعت اسلامی کی تاسیس سے چھ ماہ قبل تحریر فرمایا تھا۔ (اور جو متعدد بار "میثاق" میں شائع کیا جا چکا ہے اور اس شمارے میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔)

(3) البتہ جماعتِ اسلامی کی تاسیس کے موقع پر بعض اسباب کی بنا پر (جن کی تفصیل میں جانا اس وقت ضروری نہیں ہے۔) مولانا مودودی نے جماعت کے لئے عملاً ایک دستوری ہیئت اختیار کی۔ لیکن اُن کا مستقل موقف ہمیشہ یہ رہا کہ امیرِ جماعت کو شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں حقِ استرداد (ویٹو) حاصل ہونا چاہئے جس کو اگر بالفعل اختیار کر لیا جاتا تو صورت 'دستوری بیعت' ہی کی بن جاتی...... لیکن مولانا امین احسن اصلاحی کی شدید مخالفت و مزاحمت کے باعث ایسا نہ ہوا بلکہ عملاً صورت یہ رہی کہ دستوری اور قانونی طور پر تو جماعت میں امیرِ جماعت اور شوریٰ کے مابین اختیارات کی تقسیم کے لئے پیچ در پیچ قسم کا آئین بنا رہا لیکن عملاً مولانا مودودی جماعت کی پالیسی کو اپنی صوابدید کے مطابق چلاتے رہے جس پر شوریٰ کو اکثر و بیشتر صرف اس لئے صاد کرنا پڑتا تھا کہ امیرِ جماعت پبلک

میں ایک موقف اختیار کر چکے ہیں۔

(4) جماعت کی پوری تاریخ میں صرف ایک بار (دسمبر 56ء میں) جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے موقف پر اصرار کیا...... تو یہی بات "نقضِ غزل" یعنی جماعت کی پوری عمارت میں ایک زبردست توڑ پھوڑ کا سبب بن گئی۔ جس کے حقائق و واقعات کو افادۂ عوام کے لئے منظرِ عام پر لانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ (اگرچہ گزشتہ پرچے کے اعلان کے مطابق اسے 'میثاق' میں بالاقساط نہیں شائع کیا جا رہا بلکہ عنقریب یکجا کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ تاکہ وہ تلخ بلکہ 'گھناؤنے' واقعات صرف ان ہی لوگوں کے علم میں آئیں جو علمی اور تحقیقی دلچسپی رکھتے ہوں۔ اور ان کی روشنی میں 'اقامتِ دین کے لئے قائم ہونے والی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی' کے مسئلے میں آئندہ کے لئے رہنمائی اخذ کرنا چاہیں۔)

(5) فروری 1957ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں مولانا مودودی نے ارکان جماعت سے جو بالواسطہ اختیار (MANDATE) حاصل کیا تھا اسے بروئے کار لاتے ہوئے جب انہوں نے دستورِ جماعت میں ترمیم کی۔ اور دسمبر 1957ء یا جنوری 1958ء میں کوٹ شیر سنگھ کے اجتماعِ شوریٰ میں اس موضوع پر اپنی اصل اور قدیم رائے کو ایک مفصل اور مدلل تقریر کی صورت میں پیش کیا تو مولانا اصلاحی خاموشی کے ساتھ اس اجلاس سے اٹھے اور سیدھے لاہور آ گئے...... اور جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفاء دے دیا۔ اس پر جو خط کتابت ان کے اور مولانا مودودی کے مابین ہوئی وہ ہفت روزہ 'ندا' میں شائع ہو گئی ہے جس میں عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھنے والے لوگوں کے لئے رہنمائی کا بہت سا سامان موجود ہے۔ فاعتبروا یااولی الابصار!

اس مرحلے پر راقم ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کر دینا چاہتا ہے کہ اگرچہ وہ بحمد اللہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہے جو ہر معاملے میں مولانا مودودی مرحوم کو حرفِ آخر قرار دیتے ہوں...... بلکہ اس کا شمار مولانا مرحوم کے شدید ترین ناقدین میں ہوتا ہے...... تاہم اس معاملے میں اسے ان کی رائے سے صد فی صد اتفاق ہے۔ بلکہ اسے شدید رنج ہے کہ چونکہ جماعت اسلامی نے ــــــــ جماعت کی رودادوں کی طباعت کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔ لہٰذا مولانا مودودی مرحوم کی کوٹ شیر سنگھ والی تقریر بھی تاریخ کے اوراق میں گم ہو کر رہ گئی۔ ورنہ اس میں اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لئے قائم ہونے والی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کو غور و فکر کا بہت سا مواد ملتا...... (قطع نظر اس سے کہ کوئی مولانا کی رائے

سے اتفاق کرتا یا اختلاف!)

راقم نے چونکہ اپریل 57ء ہی میں جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی لہٰذا اسے تو اس تقریر تک براہِ راست رسائی حاصل نہ تھی' تاہم اس کا جو لبّ لباب مختلف واسطوں اور ذریعوں سے اس تک پہنچا اس کا حاصل یہ ہے کہ 'حکومت اور مملکت کی سطح پر مطلوبہ جمہوریت اور شورائیت کا معاملہ جدا ہے..... اور جماعت اور تحریک' بالخصوص انقلابی تحریک' جس نوعیت اور طرز کی جمہوریت اور شورائیت کی متقاضی ہے اس کا معاملہ علیحدہ ہے۔ چنانچہ ان دونوں کے مابین بہت سے دوسرے مابہ الاختلاف امور کے علاوہ ایک اہم فرق یہ ہے کہ 'حکومت' کی عملداری (JURISDICTION) ایک علاقے پر ہوتی ہے اور اس میں رہنے والے سب لوگ اس میں لامحالہ شریک ہوتے ہیں جبکہ 'جماعت' کی کوئی علاقائی عملداری نہیں ہوتی اور کوئی انسان جب چاہے کسی جماعت میں شامل اور جب چاہے اس سے علیحدہ ہو سکتا ہے' لہٰذا ان دونوں میں خلطِ مبحث درست نہیں ہے!' ...... راقم کو یقین کی حد تک وثوق حاصل ہے کہ مولانا مرحوم کی تقریر کا مرکزی خیال (THEME) یہی تھا...... تاہم اکتیس بتیس سال قبل کی 'شنید' میں غلطی کا احتمال موجود ہے..... اور راقم کی درخواست جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے یہ ہے کہ اگر یہ علمی امانت کہیں دستیاب ہو سکتی ہو تو اسے ضرور شائع کر دیا جائے...... بہر حال راقم کو مولانا مرحوم کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے...... اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے اس بندۂ ضعیف کو اتنی ہمت عطا فرمائی کہ اس نے جیسے ہی تنظیم کی جانب پہلا قدم بڑھایا اور انجمن قائم کی' اپنی اس رائے کو ڈنکے کی چوٹ بیان کر دیا۔ اور اس میں ہر گز کوئی جھجک محسوس نہ کی!...... اور یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ آج تک نہ انجمن میں کوئی اکھیڑ پچھاڑ ہوئی ہے' نہ تنظیم ہی میں کوئی زلزلہ آیا ہے۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ!"

اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی جماعت اور نظامِ بیعت کا معاملہ تو' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے محترم صلاح الدین صاحب سے متعلق ہے ہی نہیں۔ (اگرچہ ہماری دعا ہے کہ یہ صورتِ حال بدل جائے اور وہ بھی اقامتِ دین کے لئے اجتماعی اور منظم جدوجہد کی اہمیت و مشروعیت کے پورے شعور و ادراک کے ساتھ اس مقصد کے لئے کسی چلتے ہوئے قافلے کو تلاش کریں یا پھر خود کوئی قافلہ ترتیب دینے کی کوشش کریں۔ وَمَا ذالک

علیٰ اللہ بعزیز!)۔ انہوں نے خواہ مخواہ ہم سے حقِ اختلاف طلب کرتے ہوئے یہ بحث چھیڑ دی کہ میں نے کوئی تم سے بیعت تو نہیں کی ہوئی ہے کہ تم سے اختلاف نہ کروں' جس کی وجہ سے ہمیں اس وقت اس مسئلے پر بحث کرنا پڑی۔ اللہ کرے کہ ہماری ان مفصل گزارشات سے ان کا یہ مغالطہ رفع ہو جائے کہ بیعت سے حقِ اختلاف' یارائے اور اس کے اظہار کی آزادی سلب نہیں ہوتی۔ تاہم ان سے تو اصل گزارش یہ ہے کہ آپ سے یہ حقِ اختلاف چھین کون سکتا ہے؟ یا ہم نے کب اس کی کوشش کی؟..... لیکن کیا اس حقِ اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ صریح کذب و افتراء اور بے بنیاد الزام تراشی اور بہتان طرازی پر بھی گرفت نہ کی جائے؟؟

محترم صلاح الدین صاحب! یہ انداز و اسلوب کہ مخاطب کی اصل بات کا تو جواب ہی نہ دیا جائے اور غیر متعلق باتوں پر صفحے کے صفحے سیاہ کر کے قارئین کے ذہن کو تھکا اور الجھا دیا جائے بے اصول اور دنیا دار صحافت کا تو شاہکار ہو سکتا ہے..... لیکن "ایں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را!"

اسی طرح ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں ایک خاص علاقے سے منسوب مصنوعی آداب اور رکھ رکھاؤ سے مناسبت نہیں ہے ———— اس لئے کہ اگرچہ ہمارا خمیر تو اسی علاقے کی مٹی سے اٹھا تھا جہاں سے خود آں محترم کا لیکن اب ہمیں پنجاب کے مرکز میں رہتے چالیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے' لہٰذا ہم بات صاف اور ڈنکے کی چوٹ کرنے کے عادی ہیں' خواہ دوسرے اسے 'لٹھ مار' انداز ہی قرار دیں..... چنانچہ ہم اس اعتراف کے ساتھ کہ ہم نے سخت زبان استعمال کی' اس نوع کی معذرت کرنے کو تیار نہیں کہ 'بات تو میں نے صدفی صد ٹھیک ہی کہی تھی لیکن اگر آپ کو (گویا اپنی کم ظرفی کے باعث) اس سے تکلیف پہنچی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں!' ..... بلکہ ہمیں اصرار ہے کہ ہمیں اس سخت کلامی کا اخلاقی اور شرعی حق حاصل ہے" بفحوائے الفاظ قرآنی۔ "لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (سورۃ النساء۔ 148) اور "وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۞ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ....." (سورۃ الشوریٰ آیات 41 - 42) اور ہمارا موقف یہ ہے کہ ہم پر ظلم ہوا ہے' ہماری عزت پر حملہ کیا گیا ہے' اور ہم پر بہتان طرازی کی گئی ہے!

صلاح الدین صاحب نے اگر اجتہاد کی بحث سے 'غض بصر' کیا تو یہ قابلِ فہم بھی ہے

اور ایک پہلو سے خوش آئند بھی۔ لیکن ہم نے ان پر جو فردِ جرم عائد کی ہے اس بنے صرف
کسی طرح درست نہیں ہے ..... اس لئے کہ ہم نے ان پر الزام یہ عائد کیا تھا کہ:

"انہوں نے میری ہجو ملیح اور کردار کُشی میں اپنی جملہ صحافیانہ صلاحیتوں اور اظہار
وبیان کی تمام استعدادات کے ساتھ افتراء اور بہتان سے بھی گریز نہیں کیا۔"

اور اس کی وضاحت میں جو کچھ تحریر کیا تھا اسے غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے دوبارہ پیش
کیا جارہا ہے۔ (پوری عبارت کے لئے دیکھئے 'میثاق' فروری 89ء صفحہ 82 تا 84)

"انہوں نے میرے خلاف اپنے اس قلمی جہاد کی بنیاد جن تین الزامات پر
استوار کی ہے ان میں سے ایک کے بارے میں تو میں یہ گمان کر سکتا ہوں کہ انہوں
نے میرا موقف صحیح طور پر سمجھا نہ ہو اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہوں، لیکن بقیہ دو تو
بدیہی طور پر خالص افتراء اور بہتان پر مبنی ہیں! اور ان کے ضمن میں ان کی بدنیتی
اظہر من الشمس ہے!

نیک نیتی کے ساتھ مغالطہ صرف اس معاملے میں ہو سکتا ہے کہ میں
اسلامی ریاست میں پارلیمینٹ کے انتخاب کے لئے رائے دینے کا حق' اور اس
کے لئے امیدواری کی اہلیت کی اساسی شرط صرف "اسلام" کو سمجھتا ہوں......
تاہم اس معاملے میں بھی مدیر 'تکبیر' کی نیک نیتی صرف اسی اساس پر تسلیم کی جا
سکتی ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ وہ مجلس کے خاص حالات میں..... میری وضاحتوں
پر کان ہی نہ دھر سکے! اس لئے کہ میں نے وضاحت کر دی تھی کہ اضافی شرائط
کے ضمن میں جیسے ووٹر کی عمر کا معاملہ ہے' جو مختلف جمہوری ممالک میں مختلف ہے
اسی طرح تعلیم اور کردار کی اضافی شرائط بھی عائد کی جا سکتی ہیں......

اسی طرح یہ الزام کہ میں "اہلِ دین کو قانون ساز اداروں سے دور" رکھنا
چاہتا ہوں ایک صریح بہتان ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کے آخری سوال کے جواب میں
میں نے شدید حیرت اور تعجب کے ساتھ پوری وضاحت سے ان کے اس الزام
سے براءت کا اظہار کر دیا تھا......

رہی تیسری بات...... یعنی "عورت کو اسلامی ریاست اور حکومت کی
سربراہی کا اہل ٹھہرانے اور اس کے لئے ستر و حجاب اور دائرہ کار کی تمام حدود

ساقط کر دینے" کا الزام تو اس پر تو بے ساختہ سورۂ مریم کے آخر میں وارد شدہ الفاظِ مبارکہ نوکِ قلم پر آگئے ہیں۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝
حیرت ہوتی ہے کہ ایک ماہ سے بھی کم عرصہ قبل اپنی ایک تحریر میں دو مرتبہ یہ شہادت دینے کے بعد کہ میں عورت کی سربراہی کو "منکر" سمجھتا ہوں لیکن موجودہ حالات میں قومی و ملکی مصلحتوں کے پیشِ نظر دوسرے بہت سے منکرات کی طرح اسے بھی مجبوراً صرف گوارا کرنے کا قائل ہوں..... اور خود بھی اسی موقف کی تائید کرنے کے بعد..... مدیر تکبیر کی نظر سے میرا وہ کون سا فتویٰ گزرا ہے جس کی بناء پر انہوں نے اتنا بڑا الزام لگا دیا اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس افتراء اور کذبِ صریح پر سبّ و شتم کے بگٹٹ گھوڑے دوڑانے میں اپنی طلاقتِ لسانی اور شوخ بیانی کی پوری صلاحیت و استعداد صرف کر دی۔"

ہماری اس "فردِ جرم" کے جواب میں صلاح الدین صاحب کے لئے واحد معقول روش یہ تھی کہ یا تو اس کی تردید کرتے..... اور اپنے تینوں الزامات کے ثبوت فراہم کرتے ورنہ شرافت کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کر کے وہ طرزِ عمل اختیار کرتے جو ہم نے تجویز کیا تھا یعنی:

"ان کے لئے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھی استغفار کریں اور ان سطور کے عاجز راقم سے بھی علیٰ رءوس الاشہاد معافی مانگیں۔ اس پر وہ اللہ تعالیٰ کو بھی تواب اور رحیم پائیں گے..... اور ان شاء اللہ اس ناچیز کو بھی اپنا پہلے ہی جیسا نیاز مند پائیں گے..... ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ"

لیکن انہوں نے نہ پہلا طرزِ عمل اختیار کیا نہ دوسرا' بلکہ گفتگو کو غیر متعلق گوشوں میں الجھا کر بالآخر معذرت طلب بھی کی تھی تو اسی انداز کی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے..... یعنی:

"ڈاکٹر صاحب کے جذبات و احساسات کو جو ٹھیس میری تحریر سے پہنچی ہے اس پر مکرر معذرت' ہزار بار معذرت' اور اللہ سے مغفرت و اصلاح کی عاجزانہ دعا..... مگر میں اپنے علمی موقف پر قائم ہوں' اس پر کسی معذرت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا!"

اس پر ہماری گزارش یہ ہے کہ جناب! آپ کا علمی موقف آپ کو مبارک' ہم دعا کرتے

کہ اگر اس میں کوئی غلطی ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر متنبہ ہونے اور اصلاح کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اگر وہ صحیح ہے تو وہ تم آپ کو اس پر استقامت عطا فرمائے..... رہا آپ کے ساتھ علمی مباحثہ و مناظرہ تو اس کا اہل ہم نے اپنے آپ کو تو کبھی سمجھا ہی نہیں، تکلف برطرف، آپ کے علم و فہم کا معاملہ بھی "سخن فہمیٔ عالمِ بالا معلوم شد!" کا نقشہ پیش کر رہا ہے..... ہمارا اور آپ کا معاملہ ایک سیدھے سادھے مقدمہ کا ہے اور اس کے بارے میں صحیح روش وہی ہے جو اوپر دوبارہ عرض کر دی گئی یعنی یا چناں کن یا چنیں! بصورتِ دیگر ہم سے اس قسم کی سخن سازی کی توقع نہ رکھئے کہ :

> "ڈاکٹر صاحب سے قلب و ذہن کا رشتہ عقیدت و محبت کی جس سطح پر پہلے تھا، خدا گواہ ہے، میثاق کے مطالعہ کے بعد بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ میں نے اپنی طبیعت میں نہ کوئی انقباض محسوس کیا نہ تکدّر!" ......
>
> "میں انشاء اللہ آئندہ بھی ان سے محبت و تعاون کا وہی رشتہ برقرار رکھوں گا، جو ماضی میں ان سے رہا ہے۔"

اور اس کے بعد آپ نے جو فرمایا ہے کہ "گریز یا التفات خود ان پر منحصر ہے۔" تو ہمارا جواب صاف سن لیجئے کہ اگر آپ اپنی غلطی پر واقعی دلی پشیمانی کے ساتھ (جس کا جج مظلوم ہوتا ہے نہ کہ ظالم) ایک لفظ میں معذرت خواہ ہوں گے تو ہم "التفات" کیا معنی سر کے بل آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے..... اور اگر آپ اپنی اسی روش پر قائم رہے جو آپ کی اب تک کی تحریروں میں سامنے آئی ہے تو ہم "گریز" ہی نہیں "اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ" پر عمل کرنے پر مجبور ہوں گے۔!

اور جناب مدیر تجبیر کے علاوہ قارئینِ میثاق، بھی نوٹ فرما لیں کہ اگر تجبیر کی جانب سے آئندہ بھی اسی انداز پر بات بڑھانے کی کوشش ہوئی تو ہماری جانب سے آج کی معروضات آخری ہونگی ـــــ اب قارئین خود ہی اپنی سمجھ بوجھ سے کام لیں! ہماری جانب سے سرِ دست جواب! ہو گند دخاخت!

مدیر 'تکبیر' محترم صلاح الدین صاحب سے ہماری براہِ راست گفتگو اصولاً تو اس مقام پر ختم ہو جاتی ہے' تاہم چونکہ انہوں نے ہمارے سابقہ 'تذکرہ و تبصرہ' کو بجا طور پر 'پوسٹ مارٹم' سے تعبیر کیا ہے' لہٰذا ہم اپنی طبیعت پر جبر کر کے ان کی حالیہ تحریر کے بعض 'تسامحات' کی نشاندہی بھی کیے دیتے ہیں۔

1۔ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے خط اور اس کے جواب کے ضمن میں مدیر 'تکبیر' کی تحریر سے یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہم نے جان بوجھ کر نہ ان کا جواب شائع کیا اور نہ انہیں ٹیپ فراہم کیا' ان کا ارشاد ہے: "جواب میں نے 22 ر جنوری کو انہیں دستی طور پر پہنچا دیا تھا۔ میرا جواب کسی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکا!" ...... اور "مجھے افسوس ہے کہ محترم جمیل الرحمٰن صاحب میری درخواست کے باوجود ٹیپ مجھے فراہم نہ کر سکے!" ...... حالانکہ یہ واقعات اتفاقاً لیکن تفصیلاً 'تذکرہ و تبصرہ' میں درج کر دیئے گئے تھے کہ شیخ صاحب موصوف 19 ر کو بغرضِ عمرہ حجاز روانہ ہو چکے تھے ...... اور "ان سطور (گزشتہ تذکرہ و تبصرہ) کی تحریر کے وقت تک وہ ارضِ مقدس ہی میں مقیم ہیں!" .... اب سوال یہ ہے کہ مدیر 'تکبیر' کا جواب' اور ٹیپ کی فرمائش ہمارے علم میں آتی تو کیسے؟ اور ان کا خط "شرفِ اشاعت" پاتا تو کس طرح؟ پھر کیا محترم مدیر 'تکبیر' کی تنظیمِ اسلامی کراچی کے کسی بھی رفیق سے اتنی بھی شناسائی نہیں کہ وہ فون کر کے ٹیپ طلب فرما لیتے؟ (برادرم قاضی عبدالقادر صاحب سے تو ان کی بہت پرانی راہ و رسم ہے ہی' سید سراج الحق صاحب امیر تنظیم اسلامی کراچی و صدر انجمن خدام القرآن سندھ کا ذکر خود 'تکبیر' کی اس تحریر میں موجود ہے!) اب ع "کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!"

2۔ ارشاد ہوا ہے: "جو سوا دو گھنٹے کی تقریر کے بعد اپنے ہی مدعو کردہ سوال کنندگان کو مجموعی طور پر 15 منٹ بھی دینے کو تیار نہیں!" حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تقریر کے بعد سوال جواب نصف گھنٹے پر محیط تھے ..... اور صرف مدیر 'تکبیر' نے 14 منٹ لئے تھے!

3۔ مدیر 'تکبیر' کے باقاعدہ سونے کی روایت ہم نے چشم دید گواہوں کے حوالے سے پیش کی تھی۔ میری تو ان کی جانب پیٹھ تھی۔ وہ فرمائیں گے تو بعض گواہوں کے نام بھی پیش کر دیئے جائیں گے!

4۔ ارشاد ہوا ہے: "میں الحمد للہ نہ دل گرفتگی میں کبھی مبتلا ہوتا ہوں نہ ......" ...... مدیر 'تکبیر' کا یہ 'تکبّر' ان ہی کو مبارک ہو۔ ہم نے تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب بھی پڑھا ہے: "وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ" ترجمہ۔ "ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں ان سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے" اور ہمیں تسلیم ہے کہ ہمیں تو مدیر 'تکبیر' کی اس کردار کشی کی مہم سے بہت تکلیف پہنچی ہے جو انہوں نے ہمارے خلاف شروع کی ہے!

رہا ہمارا اور مولانا مودودی مرحوم کا حالیہ یا سابقہ تعلق' اور ایک طرف جانب ہمارے اور جماعت اسلامی اور اس کی موجودہ قیادت اور دوسری جانب ہمارے اور سابقہ وابستگان و رہنمایان جماعت کے 'دو طرفہ تعلقات' کا معاملہ تو اس سے مدیر 'تکبیر' کو کیا غرض؟ ______ انہیں تو اس پر فخر ہے کہ ہم "جہاں سے نکلے انہوں نے "وہاں قدم ہی نہیں رکھا" ...... تو انہیں کیا پتہ کہ ؏ "لذتِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تانہ چشی!" کے مصداق اس وصل و فراق میں کیا لذت ہے! ______ ہم انہیں بالکل معذور سمجھتے ہیں اگر وہ ہمارے اور مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے تعلق کے ضمن میں ہماری اُن قلبی کیفیات کا اندازہ نہ کر پائیں جن کے اظہار و بیان کے لئے ہم نے مختلف مواقع پر ان اشعار کا سہارا لیا ہے کہ:

؎ گزشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی!

؎ میں کہ مری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!

؎ تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے یہ نسبت اور محکم ہو گئی!

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے گزشتہ ماہ کے 'تذکرہ و تبصرہ' کا وہ آخری حصہ بھی درج کر دیں جو مضمون کے بے حد طویل ہو جانے کے باعث روک لیا گیا تھا اور جس کی معنویت اور ضرورت و اہمیت اب مزید نکھر کر سامنے آئے گی۔ وھو ھذا:

" یہ تحریر اگرچہ بہت زیادہ طوالت اختیار کر گئی ہے لیکن اس کے خاتمے سے قبل ہم

سوال کا جواب دینا اشد ضروری ہے جو اکثر و بیشتر قارئین کے ذہنوں میں لازماً پیدا ہو گا۔ یعنی یہ کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کے تحت محترم صلاح الدین صاحب نے میرے خلاف اس "صلیبی جنگ" کا آغاز کیا اور اس کے سلسلے میں اتنا نیچے اتر آئے کہ افترا اور بہتان سے بھی دریغ نہ کیا؟ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ وہ ایک عام صحافی نہیں' ملک کی مذہبی صحافت کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں (بلکہ فی الوقت انہیں سالارِ اول قرار دیا جائے تو بھی غلط نہ ہو گا) ۔ پھر وہ ایک معروف دانشور اور منجھے ہوئے مصنف و مقرر بھی ہیں۔ مزید بر آں وہ گہرے مذہبی مزاج کے حامل بھی ہیں اور اسلام اور پاکستان دونوں کے ساتھ ان کی وابستگی اور کمٹ منٹ کی گہرائی و گیرائی دونوں مسلم ہیں! پھر ان تمام بلندیوں کے ساتھ یہ پستی آخر کس بنا پر؟...... اس سوال کے جواب کے ضمن میں یہ تو اس سے قبل عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ اس کا حتمی اور یقینی علم سوائے عالم الغیب والشہادۃ کے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا تاہم قرائن و شواہد کی بنیاد پر ایک اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے بھی بحمد اللہ کسی فنی تحلیلِ نفسی کی کوئی حاجت نہیں..... ذرا سا تاریخی اور واقعاتی پس منظر میں جھانکنا کافی ہو گا۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے اور ان کے درمیان ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہم دونوں کا حالیہ یا سابقہ..... اور باضابطہ یا بے ضابطہ تعلق تحریک جماعتِ اسلامی سے ہے۔ اور ہم دونوں کے ذہن اور مزاج کی تشکیل میں جماعتِ اسلامی کا بڑا حصہ ہے.......... صرف اس فرق کے ساتھ کہ میں نے تحریک اسلامی سے اُس وقت اثر قبول کیا جب اس پر انقلابی رنگ غالب تھا..... اور ان کے ذہن و مزاج کی صورت گری اس وقت ہوئی جب جماعت پر سیاسی رنگ فیصلہ کن حد تک غالب آ چکا تھا۔

چنانچہ میں نے تحریکِ اسلامی سے جو اساسی اور اہم ترین سبق سیکھا وہ یہ ہے کہ اگرچہ اسلام کا اولین تقاضا تو ہر مسلمان سے یہی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بے چون و چرا اطاعت کو اپنی حیاتِ دنیوی کا دستور و لائحہ عمل اور عبادتِ ربّ کو اپنی زندگی کا اصل حاصل قرار دے..... لیکن اس پر بس نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد اتنا ہی شدید تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلام کی شہادت و اقامت کی جدوجہد میں تن' من' دھن' لگا دے اور اس کے لازمی تقاضے کے طور پر اس مقصد کے لئے قائم ہونے والی کسی جماعت میں اُس کے نظم کی پابندی کو دل و جان سے قبول کرتے ہوئے شمولیت اختیار کرے! یہی وجہ ہے کہ جب میں دس سال تک اسلامی جمعیتِ طلبہ اور جماعتِ اسلامی کے نظم سے وابستہ رہنے کے بعد طریق کار کے اختلاف کی بناء

پر علیحدہ ہوا تو کئی سال لاہور' لائلپور' رحیم یار خاں' رحیم آباد' سکھر اور کراچی میں بعض بزرگوں کے کوچوں کا طواف کرتا رہا کہ کسی طرح ان میں سے کوئی کمرِ ہمت کس لے اور ایک نئی اجتماعیت کی بنیاد رکھ دے..... اور جب ان سب سے مایوسی ہوئی تو تن تنہا ایک نئی تعمیر کے لئے سامان جمع کرنے میں لگ گیا اور بالآخر تنظیم اسلامی کے نام سے' ایک قافلہ تشکیل دے لیا........ اور اپنی صوابدید کے مطابق اُسی انقلابی راستے پر از سرِ نو سفر کا آغاز کر دیا جس سے انحراف کا الزام لگا کر ہم سب نے جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی۔

اس کے بالکل برعکس معاملہ رہا محترم محمد صلاح الدین کا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ وہ ایک طویل عرصے تک جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ ' جسارت ' کراچی کے چیف ایڈیٹر رہے اور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ' خواص اور عوام سب کے نزدیک جماعت کے ' رہنماؤں ' میں شمار ہوتے رہے انہوں نے اس کی رکنیت کبھی اختیار نہیں کی۔ اور اس کے ڈسپلن کی پابندی کو اپنے مرتبہ و مقام سے فروتر سمجھا۔ (ایک روایت کے مطابق مولانا مودودی مرحوم نے انہیں یہ پیشکش بھی کی تھی کہ ہم آپ کو رکنیت کی امیدواری کے طویل اور صبر آزما مراحل سے نہیں گزاریں گے بلکہ آپ درخواست دیں تو فوراً ہی رکن بنا لئے جائیں گے ' لیکن انہوں نے اسے بھی قبول نہیں کیا)

لیکن افسوس کہ اس آزادی اور آزاد خیالی کے باوجود انہوں نے جماعت اسلامی کے سیاسی فکر اور مزاج کو دلی آمادگی کے ساتھ قبول اور اختیار کر لیا اور اس کے ایجاد کردہ مخصوص پروپیگنڈہ تکنیک میں مہارتِ تامّہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ایک خاص وصف کو تو اپنی شخصیت میں اس طرح جذب کر لیا کہ وہ اُن کی طبیعتِ ثانیہ بن گیا..... اور وہ یہ کہ ہر دور میں کسی خاص شخصیت یا گروہ کو تمام خرابیوں کا اصل سبب اور جملہ قومی و ملکی مسائل و مشکلات اور دینی و اخلاقی عوارض کی واحد علتِ العلل قرار دے کر اس پر مسلسل جارحانہ تنقید کی جائے اور اسے عوامی نفرت و ملامت کا ہدف بنا دیا جائے ' اور اس طرح پوری قوم نہ سہی ' کم از کم اپنے کارکنوں کے لسانی و قلمی جہاد کو ایک خاص رخ پر مرتکز رکھا جائے..... تاکہ ایک جانب ان کا لہو گرم رہے اور دوسری جانب انہیں حقائق و واقعات کے وسیع تر تناظر میں مشاہدے کی فرصت ہی نہ ملے!۔

اس غرض کے لئے اولاً بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شخصیت کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن جب وہ قضائے الٰہی سے جلد ہی منظر سے ہٹ گئے تو دوسرے نمبر پر توپوں کا رخ قائدِ ملت

خان لیاقت علی خاں کی جانب پھیر دیا گیا..... لیکن جب وہ بھی دفعتاً منظر سے ہٹا دیئے گئے تو پھر مجبوراً "برسرِاقتدار طبقہ" کی اصطلاح سے کام لیا گیا۔ تاہم یہ ٹارگٹ مبہم تھا جس پر چاندماری میں دقت ہو رہی تھی..... لیکن جلد ہی سابق صدر ایوب خاں نے ساری کمی پوری کر دی اور چونکہ ان کی قوت کا اصل سرچشمہ یعنی فوج تو برسرِعام تنقید کا ہدف نہیں بنائی جا سکتی تھی لہٰذا اب ساری خرابیوں کی جڑ اور گویا بس کی گانٹھ صرف ان کی ذات قرار پائی..... چنانچہ مسلسل گیارہ برس تک قوم کو باور کرایا گیا کہ پاکستان کے جملہ مذہبی و اخلاقی، سماجی و معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، سیاسی و ملی، معاشی و اقتصادی حتیٰ کہ جملہ انتظامی عوارض و امراض کا واحد سبب یہ شخص ہے..... اور جملہ مسائل و مشکلات کا حل صرف اس میں مضمر ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس شخص کو مسندِ اقتدار سے علیحدہ کر دیا جائے..... اگر ایسا ہو جائے تو سب کچھ خود بخود درست ہو جائے گا!..... پھر جب صدر ایوب خاں بھی اقتدار سے علیحدہ ہو گئے اور حالات سدھرنے کی بجائے خراب سے خراب تر ہوتے گئے تو اپنے طرزِ عمل پر نظرثانی کی بجائے ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

کے مصداق فوراً ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کو ٹارگٹ بنا لیا گیا اور پورے سات آٹھ برس تک ان ہی کو تمام خرابیوں کا سبب، تمام بیماریوں کی جڑ، اور جملہ مسائل و مشکلات کی علت العلل قرار دیا جاتا رہا!

اس آخری دور میں جماعت اسلامی کے سب سے بڑے نفسِ ناطقہ محمد صلاح الدین صاحب تھے، اس لئے کہ مولانا مودودی مرحوم ضعیفی اور علالت کے باعث غیر مؤثر اور تحریر و تقریر سے معذور ہو چکے تھے..... اور نئے امیرِ جماعت میاں طفیل محمد صاحب سمیت جماعت کی پوری قیادتِ عظمیٰ میں کوئی قلم کا دھنی اور سیاسی تجزیہ و تبصرہ نگار موجود نہ تھا، لہٰذا اس نئے ٹارگٹ پر گولے برسانے کا کام سب سے زیادہ صلاح الدین صاحب ہی نے کیا۔ اور رفتہ رفتہ صورت یہ بن گئی کہ جو باتیں جماعتی مصلحت اور وقتی سیاسی ضرورت کے تحت بار بار کہنی اور لکھنی پڑ رہی تھیں وہ خود اُن ہی کے تحت الشعور میں اس حد تک رچ بس گئیں کہ بھٹو سے نفرت اور پیپلز پارٹی کی دشمنی ان کے مزاج کا جزوِ لاینفک بن کر رہ گئی۔

صلاح الدین صاحب تو ایک 'فرد' تھے، تنظیمی ڈسپلن سے یکسر آزاد، اور جماعتی و تحریکی مصالح سے قطعاً لاتعلق، لہٰذا انہیں تو ایک خاص سمت میں مسلسل اور بلاتکان اڑان جاری

رکھنے میں کوئی وقت نہ تھی...... لیکن جماعت آخر 'جماعت' تھی' اور اس کے قائدین کو اپنے کارکنوں کو بھی مطمئن کرنا پڑتا تھا...... پھر ربع صدی قبل سے وہ ایک خالص سیاسی جماعت کا رول اختیار کر چکی تھی جس کے لئے کسی 'اصول پرستی' کے کھونٹے سے بندھا رہنا' بالخصوص پاکستان کے معروضی حالات میں' خودکشی کے مترادف ہوتا' لہٰذا اس پر تو ع "کہ صبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں"! - اور...... ع "جب تک شراب آئی کئی دور چل گئے!" کے مصداق کئی دور آئے اور گزر گئے چنانچہ 'سیاست کے میدان میں نہ کوئی دوستی مستقل ہوتی ہے' نہ دشمنی!' کے مطابق پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کے مابین تعلقات میں بھی قُرب و بُعد اور دوستی اور دشمنی کے کئی دور آئے...... نتیجتاً ان کے دوران جماعتِ اسلامی کی قیادت اور محترم صلاح الدین صاحب کے مابین تعلقات میں بھی اتار چڑھاؤ کا عمل جاری رہا۔

۷۷ء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اوّلاً جماعت اسلامی نے ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اور مارشل لاء کی چھتری کے تحت وزارتیں تک قبول کر لیں۔ اس پر کچھ عرصہ تک تو جماعت کے عام کارکنوں پر ایک سرور آمیز اطمینان اور کیف آور اُمید کی کیفیت طاری رہی...... اور وہ کچھ ایسے محسوس کرتے رہے جیسے ع...... "اس موڑ سے آگے منزل ہے' مایوس نہ ہو درا آتا جا!" ......

لیکن جب وزراءِ جماعت بیک بینی و دو گوش ایوانِ اقتدار سے نکال باہر کئے گئے اور جماعت گویا ایک دم آسمان سے زمین پر آرہی تو کارکنوں کو بھی ہوش آیا کہ یہ ہم کس سراب کے دھوکے میں آگئے تھے...... تب ان میں سے بہت سوں کو یہ بھی یاد آیا کہ مسلسل بیس برس تک تو ہم نہ صرف یہ کہ جمہوریت کا راگ الاپتے رہے تھے اور جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگاتے رہے تھے بلکہ بحالیٔ جمہوریت کی جملہ تحریکوں میں ہراول دستے کی حیثیت سے شریک رہے تھے...... اب یہ ایک فوجی آمر کے ساتھ تعاون کیسا؟

سب جانتے ہیں کہ اس مرحلے پر جماعت کی قیادت دو ٹکڑیوں میں منقسم ہو گئی تھی...... ایک 'تصور پسند' (IDEALIST) ٹکڑی جو از سرِنو بحالیٔ جمہوریت کی تحریک میں مؤثر کردار ادا کرنے کی خواہشمند تھی'...... اور دوسری 'حقیقت پسند' (REALIST) ٹکڑی جس کے موقف کی ترجمانی راقم الحروف کو حسن اتفاق ہی سے نہیں' بالحسنِ اتفاق براہِ راست

جماعت کے ایک نائب امیر چودھری رحمت الٰہی صاحب کی زبانی سننے کا شرف حاصل ہوا[1] یعنی: "بحالیٔ جمہوریت کی بار بار کی تحریکوں کا یہ تلخ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ محنت اور مشقت سب سے بڑھ کر جماعت اور اس کے کارکن کرتے ہیں لیکن نتائج و ثمرات میں سے ہمیں کوئی حصہ نہیں ملتا...... اور پورے کا پورا فائدہ کوئی اور فرد یا گروپ یا جماعت لے اڑتی ہے۔ لہٰذا اب ہم اس قسم کی کسی تحریک میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں!" (روایت بالمعنیٰ)

یہ حقیقت بھی جملہ سیاسی کارکنوں کے علم میں ہے کہ اوّل الذکر رائے کی وکالت ضیاء الحق صاحب کے پورے دورِ حکومت میں جماعت کی کراچی کی قیادت کرتی رہی جس کے ایک نمایاں فرد یعنی پروفیسر غفور احمد صاحب جس درجہ شدید ذہنی دباؤ سے دوچار رہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ وہ کراچی میں تیورا کر گرے اور زخمی ہو گئے اور جب ان سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو انہوں نے کچھ اس قسم کا جواب دیا کہ "موجودہ حالات میں انسان کو چکر نہیں آئے گا تو اور کیا ہو گا؟" ...... جبکہ مؤخر الذکر موقف کی وکالت پنجاب گروپ کرتا تھا جن کے سب سے بڑے ترجمان تو غالباً چودھری رحمت الٰہی صاحب ہی تھے...... تاہم چونکہ امیرِ جماعت میاں طفیل محمد صاحب کے دل میں ضیاء الحق صاحب کے لئے کچھ زیادہ ہی نرم گوشہ موجود تھا لہٰذا فیصلہ کن بالادستی اسی گروپ کو حاصل رہی۔ نتیجتاً جماعت عُرفِ عام میں مارشل لاء کی "بی ٹیم" قرار پائی اور اس کا سیاسی اور جمہوری گراف بہت نیچے چلا گیا۔

ادھر محترم صلاح الدین صاحب پیپلز پارٹی کے اعتبار سے نفسیاتی طور پر اس کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے جسے جدید سائکولوجی میں 'FIXATION' اور 'OBSESSION' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس خاص جماعت سے بُغض و عداوت کے معاملے میں پورے ملک میں ان کا مدِمقابل یا 'برابر کی چوٹ' صرف ایک ہی شخص تھا...... یعنی اوّلاً چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعد ازاں صدر پاکستان، جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم...... چنانچہ اس صورت حال کے دو فطری اور منطقی نتائج

---

[1] وسط ۱۹۸۱ء میں بلومنگٹن 'انڈیانا' یو ایس اے' میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے سالانہ کنونشن کے موقع پر!

بر آمد ہوئے، ایکؔ یہ کہ رفتہ رفتہ وہ جنرل صاحب سے 'اور جنرل صاحب ان سے قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے.....   ...... اور دوسرؔے یہ کہ چونکہ بدقسمتی سے روزنامہ 'جسارت' کراچی سے شائع ہوتا تھا اور اس کی انتظامیہ پر جماعت کی کراچی کی قیادت کو بالادستی حاصل تھی اور اس میں، جیسے کے پہلے عرض کیا جاچکا ہے' سیاسی مزاج کے حامل بلکہ باضابطہ 'جمہوریت پسندوں' کا غلبہ تھا' لہٰذا انہیں چاروناچار 'جسارت' سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ البتہ انہوں نے علیحدگی سے قبل 'گویا پیش دستی کے طور پر' پیپلز پارٹی کے خلاف طویل سلسلۂ مضامین قلمبند فرماکر......اور اولاً اسے 'جسارت' میں قسطوار شائع کرکے اور بعدازاں پمفلٹ کی صورت میں لاکھوں کی تعداد میں پورے ملک میں پھیلا کر اپنے ذہن کی چھاپ جماعت اسلامی کے عام کارکنوں کی اکثریت کے ذہنوں پر قائم کردی۔

اور اس کا 'نقد' فائدہ انہیں اس صورت میں حاصل ہوگیا کہ جب روزنامہ 'جسارت' سے علیحدہ ہوکر انہوں نے ہفت روزہ 'تکبیر' جاری کیا تو جماعت اسلامی کے اندرونِ ملک اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر بیرونِ ملک حلقوں نے ان کے ساتھ نہایت فراخدلانہ تعاون کیا..... نتیجتاً...... ایکؔ جانب اس کی مالی اساس نہایت مضبوط ہوگئی اور دوسرؔی جانب جماعت اسلامی کے کارکنوں کے ذہنوں تک صلاح الدین صاحب کو وہ رسائی حاصل ہوگئی جو جماعت کی چوٹی کی قیادت' حتیٰ کہ اس کے امیر اور مرکزی شوریٰ تک کو حاصل نہیں! چنانچہ اپنی اس 'صلاحیت' کو انہوں نے متعدد مواقع پر جماعت کے رخ پر اثرانداز ہونے کے لئے 'ریموٹ کنٹرول' (REMOTE CONTROL) کے طور پر استعمال کیا۔

مارچ ۱۹۸۹ء میں 'تکبیر' اپنی زندگی کے پانچ سال مکمل کرلے گا۔ اس عرصے کے دوران جماعت اسلامی کی قیادت سے محترم صلاح الدین صاحب کے تعلقات میں دوؔبار بحرانی کیفیت پیدا ہوئی۔

اولاً..... اب سے تین چار سال قبل' جب انہوں نے جماعت کے سیاسی سوچ اور جمہوری مزاج کے حامل قائدین پر تنقید اور طنزوطعن کا سلسلہ شروع کیا اور جماعت کی ایک اہم شخصیت جناب خرم جاہ مراد نے اس کا سختی سے نوٹس لیا۔ نتیجتاً طویل اور تلخ 'جواب مضمون' کا سلسلہ چل نکلا.....اور صورت وہی بن رہی تھی کہ بقول شخصے "بات چل نکلی ہے' اب دیکھیں کہاں تک پہنچے!"...... لیکن چونکہ خرم صاحب نے اپنی مخلصانہ سادہ لوحی میں بعض 'ناگفتنی' باتیں بھی کہہ ڈالیں لہٰذا 'تکبیر' کو اپنی اخلاقی حیثیت کو مزید مستحکم کرنے کا موقع

مل گیا۔ اور بالآخر پانی کو جماعت کی جانب مرتا دیکھ کر امیر جماعت میاں طفیل محمد صاحب کو ذاتی مداخلت کے ذریعے صلح صفائی کرانی پڑی۔ (یادش بخیر! وہی دن تھے جب 'تکبیر' نے اس خاکسار کی جانب پہلی بار التفات فرمایا تھا اور راقم کا طویل انٹرویو آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا۔)

ثانیاً...... جنرل ضیاء الحق مرحوم کے آخری ایّام میں جب جماعتِ اسلامی کی امارت کی تبدیلی کے معابعد اس کی پالیسی میں بھی تبدیلی آئی'...... اور محترم قاضی حسین احمد صاحب کے انقلابی مزاج ...... اور زعماءِ کراچی کے سیاسی و جمہوری مزاج کے 'امتزاج' کے نتیجے میں جماعت اسلامی نے ضیاء الحق صاحب کی مخالفت شروع کی اور تحریکِ بحالیٔ جمہوریت (MRD) کی جانب پیش قدمی کا آغاز کیا۔ اور وہ عمل شروع ہوا جو کراچی میں اسلامی جمعیت طلبہ کی ایک بڑی ریلی میں راؤ رشید صاحب کے خطاب سے شروع ہو کر یہاں تک پہنچا کہ ایک جانب جماعت نے ضیاء الحق صاحب کے ترکش کے آخری تیر یعنی "نفاذِ شریعت آرڈیننس" کو "انسدادِ شریعت آرڈیننس" قرار دے ڈالا...... اور دوسری جانب جماعت نے پیپلز پارٹی کے ساتھ براہِ راست سلسلہ جنبانی شروع کر دیا اور نوبت بایں جا رسید کہ محترم پروفیسر غفور احمد صاحب محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ سے ملاقات کے لئے ۷۰۔ کلفٹن تک جا پہنچے...... تو فطری طور پر یہ صورتِ حال محترم صلاح الدین صاحب پر بہت شاق گزری' اور انہوں نے پینترے بدل بدل کر جماعت اسلامی پر حملے شروع کئے۔ یہاں تک کہ انہیں جماعت اسلامی کی ۱۹۵۱ء کی انتخابی پالیسی بھی یاد آگئی جسے مرحوم ہوئے لگ بھگ چار دھائیاں بیت چکی تھیں اور جو عرصہ ہوا کہ "میرؔ کے دین و مذہب" کی مصداقِ کامل بن چکی تھی! نتیجتاً اس دور میں 'تکبیر' اور جماعت کے مابین بُعد ہی نہیں نفرت و عداوت انتہا کو پہنچ گئی۔ چنانچہ بھرے جلسوں میں مدیر 'تکبیر' کی بھی لعن طعن اور سب و شتم سے تواضع ہوئی اور روایتی انداز میں 'تکبیر' کے پرچے بھی نذر آتش کئے گئے!

البتہ جب اگست ۸۸ء میں حادثۂ بہاولپور کے بعد پاکستان کی سیاست کے نئے دور کا آغاز ہوا' اور تابڑ توڑ عدالتی فیصلوں نے نومبر ۸۸ء کے الیکشن کو یقینی بنا دیا۔ چنانچہ سیاست کی نئی بساط بچھی اور صبح و شام کے اکھیڑ پچھاڑ نے نئی صف بندیوں کو جنم دیا...... اور کسی 'غیبی اشارے' کے تحت جماعت اسلامی نے حیرت انگیز طور پر 'اباؤٹ ٹرن' کیا اور ضیاء الحق مرحوم کے سیاسی جانشین میاں نواز شریف صاحب سے تعلق استوار کر لیا تو 'تکبیر'

اور جماعت کے تعلقات کے ضمن میں بھی فوراً ہی ع "آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!" کی کیفیت پیدا ہو گئی...... جو تا حال جاری ہے...... رہا مستقبل تو اس کا علم سوائے عالم الغیب والشّہادۃ کے اور کسی کو حاصل نہیں! ؎

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

الغرض' یہ ہے وہ تاریخی وواقعاتی اور ذہنی ونفسیاتی پس منظر جس میں محترم صلاح الدین صاحب نے راقم الحروف کے خلاف اُس صلیبی جنگ کا آغاز کیا ہے' جس میں وہ تمام حدوں کو پھلانگ گئے ہیں۔ انہیں صحیح یا غلط (اس کی وضاحت آئندہ کسی موقع پر ہی ہو سکے گی) یہ گمان ہو گیا ہے کہ میں پیپلز پارٹی کا حامی اور طرفدار ہوں' اور ظاہر ہے کہ یہ وہ جرم ہے جسے وہ کسی صورت معاف نہیں کر سکتے! اور اس معاملے میں جب انہوں نے جماعت اسلامی ایسی منظم اور ملک گیر ہی نہیں 'عالمگیر' جماعت سے براہ راست ٹکّر لینے میں جھجک محسوس نہ کی تو ظاہر بات ہے کہ ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم تو کسی شمار قطار میں ہے ہی نہیں!

بہر حال راقم کو یقین ہے کہ' جلد یا بدیر' جیسے ہی ان پر حقائق واضح ہو جائیں گے انہیں اُس ظلم اور زیادتی کا بھی پورا احساس ہو جائے گا جو انہوں نے اپنے اِس دیرینہ نیاز مند پر روا رکھی ہے!......"

ہماری یہ تحریر' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ایک ماہ قبل کی ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ یہ 'میثاق' کے گذشتہ شمارے میں شامل ہونے سے رہ گئی اور اس وقت ہدیہ قارئین ہو رہی ہے جب محترم صلاح الدین صاحب کی اپنی تحریروں سے ثابت ہو گیا ہے کہ اصل مسئلہ "عورت کی سربراہی" کا نہیں بلکہ ع "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں۔ وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے!" کے مصداق پیپلز پارٹی کا ہے...... اور جماعت اسلامی کے ساتھ بھی ان کا دوبار سر پھٹول ہوا تو اس کا سبب بھی صلاح الدین صاحب کے اپنے الفاظ میں یہ تھا کہ انہوں نے "جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی میں مفاہمت کی پینگیں بڑھتی دیکھیں"...... اور اب اس خاکسار کے خلاف جو صلیبی جنگ انہوں نے شروع کی ہے اس کی وجہ بھی ان کے خیال میں' یہ ہے کہ :

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ اپنی دینی بصیرت اور اخلاقی اقدار سے گہری وابستگی کے باوجود پیپلز پارٹی ڈاکٹر صاحب کی ایک پسندیدہ سیاسی جماعت ہے۔ وہ دوسری تمام جماعتوں پر اسے ترجیح دیتے رہے ہیں۔ اسی کو وفاق کی سلامتی اور بقاء کا ضامن سمجھتے رہے ہیں اور اس معاملے میں وہ اس کی فکری، نظریاتی اور سیرتی خامیوں سے مسلسل صرف نظر کرتے رہے ہیں......"

اس ضمن میں صلاح الدین صاحب سے تو صرف دو مختصر باتیں عرض کرنی ہیں، ایک یہ کہ اگر آپ کے نزدیک "اصل مسئلہ" یہ تھا تو آپ کو براہ راست اسی کو موضوع تحریر بنانا چاہئے تھے اور اسی کے ضمن میں ع "کچھ ہم سے کہا ہوتا...... کچھ ہم سے سنا ہوتا!" پر عمل کرنا چاہئے تھا۔ یہ ہیرا پھیری والا انداز مسلمان کو زیب نہیں دیتا......... دوسرے یہ کہ کئی سال سے آپ ہمارے کرم فرماؤں میں شامل ہیں۔ متعدد بار محاضرات قرآنی میں شمولیت کے علاوہ آپ نے اکثر جب محترم مجیب الرحمٰن شامی کے یہاں قیام پذیر ہونے کے باعث نماز فجر قرآن اکیڈمی کی مسجد میں ادا کی تو میری درخواست کو شرف قبول عطا فرماتے ہوئے میرے ساتھ چائے نوش فرمائی اور طویل نشستیں اور گفتگوئیں رہیں تو ان کے دوران آپ نے کبھی اپنے ایک 'گمراہ بھائی' کا حق نصح و خیر خواہی کیوں ادا نہ کیا اور اس موضوع پر کیوں بات نہ کی کہ ہم بھی اپنا موقف تفصیلاً آپ کے سامنے رکھ سکتے!

تاہم اس موضوع پر کچھ وضاحتیں ہم "میثاق" کے عام قارئین اور تنظیم اسلامی کے عام وابستگان اور خیر خواہ حضرات کے علاوہ خاص طور پر اپنے ان "نیازمندوں بلکہ مقربین" کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتے ہیں جو بقول صلاح الدین صاحب اس مسئلے کی بنا پر "ذہنی ہلچل" میں مبتلا ہیں۔

اولاً......... یہ کہ بحمد اللہ گزشتہ ۲۳ برس سے ہماری جملہ صلاحیتیں اور قوتیں اور تمام اوقات اقامت دین اور غلبہ اسلام کے مقصدِ عظیم کے خاطر ایک جانب قرآن کے انقلابی فکر، اور دین کی انقلابی دعوت کی نشر و اشاعت اور دوسری جانب ایک انقلابی جدوجہد کے لئے مردانِ کار کی فراہمی اور تنظیم و تربیت کے لئے وقف ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کا مظہر ہیں انجمن خدام القرآن، قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج.. اور مؤخر الذکر کا عنوان ہے تنظیمِ اسلامی!

ثانیاً......... چونکہ انقلاب کہیں خلا میں نہیں بلکہ کسی خطۂ زمین ہی میں آتا ہے اور

ہماری جدوجہد کا اوّلین ہدف پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے' لہٰذا یہاں کے معروضی حالات سے ہم لاتعلق نہیں رہ سکتے..... اور ہمارے ساتھیوں اور کارکنوں کے لئے یہاں کے سماجی و معاشرتی' معاشی و اقتصادی اور قومی و سیاسی مسائل اور ان کے تاریخی پس منظر اور اسباب و علل کا گہرا شعور اور صحیح فہم و ادراک بہت ضروری ہے..... تاکہ ان کے حل کے ضمن میں اسلام کی صحیح رہنمائی کو سمجھا بھی جاسکے اور عوام الناس کے سامنے پیش بھی کیا جاسکے !..... یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف اپنی تحریروں اور تقریروں میں ملکی و سیاسی حالات پر تبصرے بھی کرتا رہا اور مشورے بھی دیتا رہا..... اور بعض مواقع پر اس نے نہایت تفصیلی سیاسی تجزیئے بھی سپرد قلم کیئے !۔

ثالثاً .... جس طرح مغربی تہذیب کے زیر اثر جو سائنسی اور ٹیکنیکی ترقی ہوئی وہ بجائے خود غلط نہیں ہے' بلکہ اس میں خرابی اس سے پیدا ہوئی کہ اس کے ساتھ نہ صرف یہ کہ متوازن و متناسب اخلاقی و روحانی ترقی نہیں ہوئی بلکہ الٹا تنزل ہوا' .... اسی طرح مغرب میں سیاست و معیشت کے میدان میں جو سماجی ارتقاء ہوا ہے اور انسان نے "حرّیت' اخوت اور مساوات" کی اعلیٰ اقدار تک رسائی کی جو کوشش کی ہے وہ بھی سراسر غلط نہیں ہے.......... بلکہ اس کی مجموعی سمت صحیح اور مطابقِ اسلام ہے' تاہم اس کے ساتھ بھی وہی حادثہ ہوا ہے جسے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ ۔

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ !

(اس تیسری بات کے ضمن میں "فکرِ اقبالؒ" کے حوالے سے ہماری مفصل رائے بحمداللہ اس خطبہ میں آگئی ہے جو ۲۱ر اپریل ۸۶ء کو "یومِ اقبالؒ" کی تقریب میں پڑھا گیا تھا.. اور انشاء اللہ جلد کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا)۔

رابعاً......... پاکستان کے موجود الوقت ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی ظروف و احوال میں جو تحریک 'سیاسی حقوق' کے حصول کے لئے چلائی جائے گی وہ کامیابی کی صورت میں لامحالہ 'لادین جمہوریت' پر منتج ہوگی' اور جو تحریک معاشی عدل کے عنوان سے چلائی جائے گی وہ بصورت کامیابی ملحدانہ سوشلزم کو جنم دے گی۔

بنابریں..... ہم نے آج تک نہ 'عملی سیاست' کے میدان میں قدم رکھا' نہ ہی 'بحالی جمہوریت' کی کسی تحریک میں حصہ لیا۔ بلکہ

"کارِ خود کُن کارِ بیگانہ مکُن...... بر زمینِ دیگرے خانہ مکُن!" کے
مصداق وقتی سیاست کے ضمن میں تبصروں اور مشوروں اور معاشی و سیاسی
حقوق کے ضمن میں اخلاقی تائید پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی تمام مساعی کو عملاً
اپنے "اصل کام" یعنی اسلامی انقلاب کے لئے ذہنی و فکری رہنمائی'
اخلاقی و عملی پیش قدمی اور دعوتی اور تنظیمی سرگرمیوں پر مرتکز رکھا!۔

خامساً .... پاکستان کے معروضی حالات میں "مارشل لاء" بدترین سمِ قاتل کی
حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اسی نے اصل پاکستان کو دولخت کیا تھا' اور اسی سے شدید اندیشہ تھا کہ بچا
کھچا پاکستان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اس معاملے میں ہم سے اختلاف کیا جا سکتا ہے
لیکن ہماری احساس کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۱۹۸۲ء میں سابق صدر
پاکستان' جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے نام خط میں راقم نے لکھ دیا تھا کہ :

"مجھے شدید اندیشہ ہے کہ مستقبل کا مؤرخ یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے
نام سے وقت کی جو عظیم ترین مملکت قائم ہوئی تھی اسے پہلے تو دولخت کیا تھا ایک
شرابی اور زانی ٹولے نے' اور پھر اس کے مزید حصے بخرے ہونے — یعنی —
(BALKANISATION) کا عمل ایک ایسے شخص کے ہاتھوں سرانجام پایا جو نمازی اور
پرہیزگار تھا......"

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہی عرض کیا تھا کہ خدارا سیاسی
عمل کو نہ روکئے...... پھر اوائل ۸۲ء میں مرحومہ شوریٰ کے اجلاس میں عرض کیا تھا کہ اگر
انتخابات کے انعقاد سے پاکستان کو کوئی گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے تو ہمیں اعتماد میں لے کر اس کے
دلائل و شواہد ہمارے سامنے رکھ دیئے جائیں' خواہ اس کے لئے بالکل اسی طرح کا "بند
اجلاس" (CLOSE-DOOR SESSION) منعقد کر لیا جائے جیسا خارجہ پالیسی پر
بحث کے لئے کیا گیا تھا تاکہ اگر ہم قائل ہو جائیں تو عوام کو بھی قائل کرنے کی کوشش کریں'
بصورت دیگر میرے نزدیک انتخابات کا التوا خودکشی کے مترادف ہے............ اور پھر وسط
۸۲ء کے بعد سے تو راقم نے مسلسل مارشل لاء یا نیم مارشل لاء کے تسلسل کے خلاف اور بھرپور
سیاسی و جمہوری عمل کی کامل بحالی کے حق میں مقدور بھر "جہاد باللسان" کیا۔ تاہم عملاً نہ
ایم آر ڈی میں شمولیت اختیار کی' نہ پیپلز پارٹی سے "پینگیں بڑھائیں"! یہ دوسری بات ہے

کہ چونکہ اس دور میں بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کا جزو اعظم پاکستان پیپلز پارٹی تھی لہٰذا ہماری جمہوریت اور انتخابات کی اس تائید کو ہمارے بہت سے مخلص کرم فرماؤں نے بھی پیپلز پارٹی کی حمایت قرار دیا۔

سادساً.......... بہاولپور کے حادثۂ فاجعہ یا اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت کے تحت جب پاکستان میں بحالی جمہوریت کا مرحلہ آیا اور انتخابات کے انعقاد کی توقع ہوئی تو پیپلز پارٹی کے لئے صرف اس ایک 'کلمۂ خیر' کے سوا کہ "اس نے گیارہ سال تک جبر و ابتلاء کا مقابلہ کر کے اپنا ایک عوامی اور سیاسی پارٹی ہونا ثابت کر دیا ہے" ...... کوئی اور تائیدی کلمہ کبھی نہ زبان سے نکلا' نہ قلم سے...... !! اس کے برعکس زوردار مشورہ اس کا دیا گیا کہ مسلم لیگ کو مضبوط بنایا جائے اور وہ جملہ عناصر جو پاکستان میں نظام مصطفیٰؐ کے قیام کے لئے انتخابی عمل پر اعتماد کرتے ہوں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ رہے ہم خود' تو چونکہ اقامت دین یا غلبہ دین کے لئے انتخابی عمل کو غیر مفید ہی نہیں مضر سمجھتے ہیں' لہٰذا ہم اس اکھاڑے میں داخل نہیں ہو سکتے' البتہ پارٹیوں کے بارے میں ہمیں۔ "غالب نہ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض...... ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے!" کے مصداق نہ پی پی پی سے کوئی غرض ہے نہ آئی جے آئی سے بلکہ کل غرض ہے صرف اور صرف جمہوریت سے! اب اگر ع "اس پہ بھی ہم سے گلہ ہے کہ وفادار نہیں!" ... تو ع "کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا"۔

اس ضمن میں راقم اسی شمارے میں اپنے ۷۰۔ ۱۹۶۹ء کے بعض سیاسی تجزیوں سے کچھ اقتباسات شائع کر رہا ہے جس میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو' بھٹوازم اور "جمہوریت' سوشلزم اور اسلام" کے بارے میں راقم کی آراء سامنے آجائیں گی.......... ہر انصاف پسند شخص اگر ان کے ساتھ ان حقائق کو بھی پیش نظر رکھے تو اسے ہمارے مندرجہ بالا موقف کی صحت کے بارے میں کوئی شک نہ رہے گا کہ اس کے باوجود کہ بھٹو صاحب پانچ برس تک پاکستان میں "کوسِ لمن الملک" بجاتے رہے' راقم نے ان کا قرب حاصل کرنا تو کجا ان سے کبھی ملاقات تک نہ کی.......... بلکہ ۱۹۷۰ء کی الیکشن مہم کے دوران تو ان کی دو تقریروں میں ان کی صورت دیکھنے میں آئی بھی تھی ان پانچ سالوں کے دوران تو ان کی شکل بھی کبھی نہ دیکھی!..... حتیٰ کہ ان کے دور میں جب لاہور ٹیلی ویژن نے اصرار کیا کہ ٹی وی پر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے بارے میں اپنی رائے پیش کروں تو اس کے باوجود کہ بعض ایسے علماء نے بھی اس

کارِ ثواب میں حصہ لیا جن کی میرے دل میں قدر و منزلت ہے (مثلاً جماعت اسلامی کے سابقون الاولون میں سے مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی مرحوم) خود میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں 'حُبّ ِعلیؓ' کا قائل ہوں 'بغضِ معاویہؓ' کا نہیں! (یہاں اگر قارئین چاہیں تو "تعرف الاشیاء باضدادھا" کے مطابق فوری تقابل اور موازنے کے لئے یاد تازہ فرمالیں ان صاحب کی جو ایک وقت میں جماعت اسلامی کے کم از کم لاہور اور پنجاب کی حد تک نمایاں ترین لیڈر بن گئے تھے' پھر وہ پہنچے سابق صدر ایوب خان کی خدمت میں' پھر جب ان کا سنگھاسن ڈولنے لگا تو انہوں نے پینگیں بڑھائیں شیخ مجیب الرحمٰن سے' اور جب شیخ صاحب موصوف نے مغربی پاکستان کو اپنے سیاسی نقشے سے خارج کر دیا تو وہ جا حاضر ہوئے بھٹو صاحب کی خدمت میں' اور جب ان کو پھانسی دے دی گئی تو انہوں نے راہ رسم پیدا کی مرحوم ضیاء الحق صاحب سے!...... آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!)

بہرحال ہمارے جملہ موافقین اور مخالفین ہمارے اس موقف کو اچھی طرح سمجھ لیں' پھر اگر اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اسے دلائل کے ساتھ واضح کریں اور اگر وہ صحیح ہے تو اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اس پر استقامت عطا فرمائے...... رہی ہماری "رائے" کا معاملہ تو وہ بحمد اللہ تائید و تحسین' یا تردید و مخالفت حتیٰ کہ سبّ و شتم' اور ان کے ضمن میں اقلیت و اکثریت سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے! اور ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم' بلا شائبہ فخر و تعلّی' عرض کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف اپنے رب اور اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے اور الحمد للہ کہ اگر اس کا ضمیر کسی بات پر مطمئن ہو تو پھر معاملہ وہی ہوتا ہے کہ ؎

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہے مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!

محترم صلاح الدین صاحب نے راقم کی 'تحلیلِ نفسی' کے ضمن میں جو مزید وضاحت کی ہے اور "مولانا مودودیؒ کی فکر اور ان کی تنظیم سے" ہماری جس "طویل اور مسلسل لڑائی" اور "ذہنی کشمکش" ...... اور "متبادل قائد اور متبادل تنظیم کے تصوّرات" کا حوالہ دیا ہے...... اس کے ضمن میں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین کے سامنے اپنا موقف اختصار کے ساتھ شق وار انداز میں رکھ دیا جائے۔

(اتفاق سے ان ہی دنوں ایک مجلسی گفتگو میں یہ بات اس طرح سامنے آئی تو سب نے محسوس

کیا کہ چند جملوں میں ایک طویل بحث بہت خوبصورتی سے سمٹ آئی ہے)۔

۱۔ قبل از تقسیم ہند' مولانا مودودی مرحوم کے فکر' موقف اور طرز عمل' خصوصاً ان کے تصور دین اور تصور فرائض دینی کو' میں مجموعی اعتبار سے صحیح اور درست سمجھتا ہوں...... اور سوائے دو باتوں کے قبل تقسیم کی جماعت اسلامی سے ہمارا کوئی اہم اختلاف نہیں ہے یعنی ایک یہ کہ مولانا کے مزاج میں انتہا پسندی تھی جس کے زیر اثر انہوں نے جس چیز سے اختلاف کیا اسے کفر قرار دے کر چھوڑا۔ اور دوسرے یہ کہ مروجہ تصوف سے بیزاری کے باعث وہ ایمان کے باطنی ثمرات اور روحانی و نفسیاتی کیفیات کی جانب کماحقہ توجہ نہ دے سکے! چنانچہ بحیثیت مجموعی جماعت کے لوگوں میں اس پہلو سے شدید کمی رہی!۔

۲۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد انہوں نے دو اقدام کئے۔ جن میں سے ایک کو میں صد فیصد درست سمجھتا ہوں اور دوسرے کو اتنا ہی غلط اور مہلک! درست اقدام تھا ایک پریشر گروپ کی حیثیت سے دستوری مطالبے کی مہم چلا کر دستور ساز اسمبلی سے "قرارداد مقاصد" کا پاس کرا لینا۔ جس میں انہیں جملہ مذہبی عناصر کی تائید اور امداد حاصل رہی...... اور غلط اور مہلک اقدام تھا انتخابات کے اکھاڑے میں داخل ہو کر نہ صرف اپنی مخالفت میں جملہ سیاسی اور مذہبی عناصر کو جمع کر دینا...... بلکہ خود اسلام کو بھی ایک متنازعہ معاملہ اور گویا "الیکشن ایشوء" بنا دینا!۔

۳۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے آغاز پر جو طرز عمل اختیار کیا گیا وہ بھی پچاس فیصد درست تھا اور پچاس فیصد غلط۔ اس کا صحیح جزو تھا جمہوریت کی تائید اور آمریت کی مخالفت...... اور غلط جزو تھا خود بحالی جمہوریت کی تحریکوں میں عملاً شرکت! جس کا نتیجہ بالفعل وہی نکلا جو اوپر چوہدری رحمت الٰہی صاحب کی ۸۱ء کی ایک گفتگو کے حوالے سے بیان ہو چکا ہے۔

۴۔ رہے مولانا مودودی مرحوم کے علمی افکار اور نظریات تو ان کے ضمن میں چونکہ مولانا مرحوم نے ہزارہا صفحات تحریر فرمائے لہٰذا ان کے بے شمار علمی نظریات میں سے بہت سوں سے اتفاق ہے تو بہت سوں سے اختلاف بھی ہے تاہم مجموعی طور پر راقم کی رائے یہ ہے کہ...........

(ا) اسلام کے تصور عبادتِ ربّ' اور بندۂ مومن کے فرائضِ دینی کے بارے میں ان کے نظریات مجموعی طور پر درست ہیں' (ب) اسی طرح "اسلام کے نظام حیات" کے بارے میں بھی ان کی تعبیر و تشریح بہت حد تک درست ہے' بالخصوص اسلام کے معاشرتی اور سیاسی نظام کے بارے میں ان کی تشریحات بہت قیمتی ہیں' البتہ معاشی نظام کے بارے میں ان کی سوچ بعض اعتبارات سے (خصوصاً زمینداری اور مزارعت کے باب میں) اصولی طور پر غلط بھی

ہے' اور وقت کے تقاضوں کے اعتبار سے بہت ناقص بھی۔ (ج) البتہ ان کے دو علمی نظریات' جن کا ظہور بحمد اللہ ہمارے جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد ہوا (خواہ اس کے جراثیم ان کے فکر میں ابتدا سے موجود رہے ہوں!) نہایت گمراہ کن ہیں: ایک نظریہ حکمت عملی جس کی بروقت بیخ کنی ان کے دیرینہ رفیق کار مولانا امین احسن اصلاحی نے حق رفاقت ادا کرتے ہوئے باحسن وجوہ کر دی تھی...... اور دوسرے مشاجراتِ صحابہؓ کے ضمن میں ان کا نقطۂ نظر اور بعض اکابر صحابہؓ خصوصاً خلیفہ راشد' ذوالنورین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ان کی جارحانہ تنقید جو ان کی تالیف "خلافت وملوکیت" میں سامنے آئی اور جس پر اہل سنت کے جملہ حلقوں کی جانب سے بجا طور پر شدید ردِ عمل ظاہر ہوا۔

۵۔ رہا مولانا مودودی کا فلسفۂ 'نظمِ جماعت' اور ان کا تصورِ "شورائیت" تو اسے بھی ہم علمی طور پر درست اور تحریکی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ سمجھتے ہیں...... اور ہمارا اعتراض مولانا مرحوم پر صرف یہ ہے کہ انہیں اپنی رائے کا ابتدا ہی میں برملا اظہار کر دینا چاہئے تھا...... اور اس کے ضمن میں کسی دباؤ میں آکر مصالحت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ دراصل یہ اسی ابتدائی غلطی کے تلخ ثمرات تھے جو ۱۹۵۵ء سے ۵۸ء تک نہایت بھیانک انداز میں ظاہر ہوئے! جن سے ان کے بعض نہایت قریبی اور دیرینہ رفقاء کو بھی شدید صدمہ پہنچا...... اور خود ان کی شخصیت بھی شدید مجروح ہوئی!

الغرض ؏ "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" ____________ اس پر چاہیں تو اتنا اضافہ اور کرلیں کہ ہمارے نزدیک غلطی سے مبرّا اور خطاؤں سے معصوم صرف انبیاء کرام ہوتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے اختتام اور رسالت کی تکمیل کے بعد اب اقامتِ دین کی جدوجہد خطا اور نسیان کے پُتلوں ہی کے ہاتھوں ہو گی! (الانسان مرکب من الخطاء والنسیان)...... اور اس سلسلے میں "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کی بجائے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ پہلی کوششوں کے تسلسل کو جاری رکھا جائے اور سابقہ کوششوں پر تنقیدی نگاہ ڈال کر ان کی غلطیوں کو دُور اور ان کی کوتاہیوں کی تلافی کرتے ہوئے 'گویا کچھ منفی اور کچھ جمع کرتے ہوئے' از سرِ نو کمرِ ہمت کسی جائے اور نئے مسافروں کی تلاش کے ساتھ ساتھ "کھوئے ہوؤں کی جستجو" بھی جاری رکھی جائے..........

اور اپنی بساط کے مطابق بفضلہٖ تعالیٰ وبتوفیقہٖ اسی کی کوشش راقم اور اس کے ساتھی کر رہے ہیں' اس دعا کے ساتھ کہ۔

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو -

میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر! !

اب اس کا اختیار ؏ "جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے" کے مصداق ہر شخص کو حاصل ہے کہ خواہ اسے خلوص اور احساس فرض پر مبنی قرار دے' خواہ "ذہنی کشمکش"...... اور "متبادل قائد" بننے کی خواہش کا مظہر قرار دے۔

(۲)

کئی سال سے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ راقم کے دورس قرآن اور تقریروں اور خطابات اور ان کے سلسلے میں اندرون ملک اور بیرون ملک سفروں اور دوروں کی کثرت کے باعث تحریر کا کام بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ جس کے باعث تحریکی تقاضے مجروح ہو رہے ہیں' چنانچہ کئی بار فیصلہ کیا گیا کہ اب لسانی جہاد کم اور قلمی جہاد زیادہ کیا جائے اور خاص طور پر سفر بہت کم کر دیئے جائیں۔ لیکن بوجوہ اس پر عمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ اب سے چھ سات ماہ قبل راقم نے پہلے اپنے طور پر اس کا حتمی فیصلہ کیا۔ پھر تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت کے سامنے رکھا تو سب نے اس کی پرزور تائید کی...... چنانچہ فیصلہ کر لیا گیا کہ......

اولاً...... آئندہ اصولی طور پر راقم کے خطابات صرف تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے ہوں گے اور وہ بھی ناگزیر حد تک...... اور دعوتی دوروں کا سلسلہ بہت کم کر دیا جائے گا۔

ثانیاً...... لاہور کے خطاب جمعہ' اور ہفتہ وار درس قرآن کے علاوہ میرے جملہ پروگرام ایک کمیٹی طے کرے گی جس میں ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان' ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن و تنظیم اسلامی بیرون پاکستان' معتمد تنظیم اور ناظم مکتبہ شامل ہوں گے۔ میں ازخود کسی دعوت کو قبول نہیں کروں گا۔

ثالثاً...... میں صبح کے اوقات میں ملاقات سے استثنائی صورتوں کے علاوہ معذور ہوں گا۔ ملاقات کی ایک عمومی نشست' ان شاء اللہ پابندی کے ساتھ' جمعتہ المبارک اور ہفتہ کے دن کے سوا' روزانہ عصر تا مغرب قرآن اکیڈمی کی مسجد ہی میں منعقد ہو گی' علیحدہ ملاقات' وقت طے کر کے' ان ہی ایام میں صرف مغرب اور عشاء کے مابین ہو سکے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان فیصلوں پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے...... اور جس طرح اس نے اس بندہ ناچیز کی زبان کو اپنی کتاب مبین کی دعوت و تبلیغ اور اس کے فلسفہ و حکمت کے بیان کے لئے کھول دیا اسی طرح اس کے قلم کو بھی حق کے بیان و اعلان کی توفیق عطا فرمائے...... اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ - آمین

حدیثِ رسول ﷺ

وعن

عُبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ

قال: بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علی السمع والطاعۃ

فی العسر والیسر

والمنشط والمکرہ

وعلی اثرۃ علینا

وان لا ننازع الامر اھلہ، الا ان تروا کفرا بواحا عندکم

من اللہ فیہ برھان،

وعلی ان نقول بالحق اینما کنا، لا نخاف فی اللہ

لومۃ لائم (بخاری ومسلم)

مفہوم: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ:

ہم ہر حالت میں اللہ اور رسول اور اُن لوگوں کی جن کو امیر مقرر کیا گیا ہو بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی اور خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اُس صورت میں بھی جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اُس وقت ہمارے پاس دلیل ہوگی کہ ہم اُس کی بات نہ مانیں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور بھٹو ازم

★

جمہوریت، سوشلزم اور اسلام

★

اور

پاکستان کی مذہبی سیاست

★

کے بارے میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ۷۰-۱۹۶۹ء کی تحریروں کے اقتباسات

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور بھٹو ازم

(۱)

نقطۂ آغاز

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے اثرات

اور پاکستانی سیاست میں دائیں اور بائیں بازوؤں کی کشمکش

(’میثاق‘، جنوری ۶۹ء کے ’تذکرہ و تبصرہ‘ سے دو اقتباس)

۔ ۶۵ء کی پاک و ہند جنگ بلاشبہ گزشتہ صدارتی انتخابات کے بعد کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ملک کے بقاء و دفاع اور خاص طور پر اس کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے ہی، ملک کی داخلی سیاست پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس سترہ روزہ جنگ کے اسباب و علل سے تو سرے سے کوئی بحث ہی نہیں، اس کے تمام عواقب و نتائج کا استقصاء بھی مطلوب نہیں، البتہ ان میں سے چند ایسے امور کا تذکرہ ناگزیر ہے جن کا براہ راست تعلق ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال سے ہے۔

○ ...... ان میں سے اہم ترین امر تو یہ ہے کہ اس جنگ کے جو نتائج بر آمد ہوئے ان کی بنا پر صدر ایوب کی سیاسی حیثیت کو شدید دھکا لگا اور ان کا جو ستارہ ایشیا کے ایک عظیم رہنما یا بالفاظ دیگر ایشیائی ڈیگال کی حیثیت میں عروج کی جانب حرکت کر رہا تھا مائل بہ زوال ہو گیا۔

○ ...... دوسرے یہ کہ پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی جو چند سال قبل سے مسلسل ایک خاص رخ پر بڑھتی چلی جا رہی تھی ایک انتہا پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رک گئی بلکہ واپس قدیم سمت میں گردش کرنے لگی...... اور بظاہر احوال بھی اس میں کم از کم اعتدال کا رنگ نمایاں ہو گیا۔

○ ...... تیسرے یہ کہ مسلم قومیت کا جو جذبہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنا تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی سرد پڑ گیا تھا۔ اس جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ

پھر بیدار ہوا بلکہ ایک بار پھر اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا۔ اگرچہ اس کا یہ زور شور
(TE) اب کی بار بھی عارضی ہی ثابت ہوا۔ اور جنگ کے بعد جلد ہی یہ جذبہ پھر سرد پڑتا
گیا۔
ستان کی خارجہ حکمتِ عملی اور پاکستان قومیت دونوں کے اعتبار سے پاکستان کی
یاسیات میں جو مدّ اس جنگ کے دوران آیا تھا' صدر ایوب کو تو اپنی مخصوص
ہ دارانہ حیثیت کی مجبوریوں کی بنا پر اسے ایک خاص حد تک لے جانے کے بعد
پس جذر کی جانب لوٹنا پڑا...... لیکن ان کے ایک اپنے تربیت دادہ نوجوان ساتھی
نے مدّ سے جذر کی جانب رجوع سے انکار کر دیا اور وہ اسی مقام پر کھڑا رہ گیا۔ نتیجتاً
س نے اس مدّ کے لئے علامتی حیثیت اختیار کر لی...... بس یہیں سے مسٹر ذوالفقار
لی بھٹو کی اصل ذاتی سیاسی زندگی اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بالکل نئے
اب کا آغاز ہو گیا!!

(ماخوذ رمیثاق، جنوری ۱۹۶۹ء)

(ا)

سوشلسٹ ذہن اور بائیں بازو کے رجحانات مشرقی پاکستان کی حد تک تو کم از کم اتنے ہی
م' ہیں جتنا خود پاکستان، لیکن مغربی پاکستان میں یہ رجحانات زیادہ تر ۶۵ء کی جنگ کے
رے ہیں اور گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں' اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ
ت تیزی کے ساتھ پھیلے بھی ہیں اور مختلف تنظیمی ہیئتوں کی شکل میں نمودار بھی ہوئے
س کا ایک سبب ملک کی معیشت میں 'صنعتی انقلاب' کے اثرات بھی ہیں' جن سے
ہ استحصالی نظامِ معیشت کی گھناؤنی صورت کھل کر سامنے آرہی ہے۔ تعلیم یافتہ
ں میں بڑھتی ہوئی بیکاری سے بھی ان رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ
گزشتہ پانچ چھ سال کی خارجہ پالیسی نے بھی، جس کے مدّ و جذر کے جانب ہم اوپر اشارہ کر
ہیں ان رجحانات کو تقویت دی ہے...... غرض کہ مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ہمارے
یں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی قوت کی
ت اختیار کر لی ہے۔
مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان

میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن ان کے اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تاحال سامنے نہیں آئی' تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (NUCLEUS) ہو گا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

(ماخوذ: میثاق، جنوری ۱۹۶۹ء)

—— (iii) ——

"عوام کی زندگی جس طرح دن بدن اجیرن ہوتی چلی جا رہی ہے اس کی بنا پر عوام تو "عمر دیوانہ را ہوئے بس است!" کے مصداق بس اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی ذرا ہمت اور جرأت سے کام لے کر ایک بار کوئی زور دار نعرہ لگا دے۔

اور جہاں تک ہمت و جرأت کا تعلق ہے مسٹر بھٹو تو ماضی قریب ہی میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان میں چاہے اور کسی چیز کی کتنی بھی کمی کیوں نہ ہو' ہمت و جرأت کی ہرگز کوئی کمی نہیں ــــ رہے مولانا بھاشانی تو ان کا بھی پورا سیاسی کیریئر جرأت اور ہمت کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے ــ!!

بنابریں پاکستان کے سوشلسٹ عناصر کی جانب سے کسی انقلابی اقدام کا امکان خارج از بحث نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ بحالاتِ موجودہ بہت متوقع ہے!!!

لیکن اگر ایسا ہو گیا تو ــــ ایک طرف تو اس کا نتیجہ ہمارے نزدیک ایک بہت بڑے خون خرابے کی صورت میں ظاہر ہو گا جو مغربی پاکستان میں تو چاہے زیادہ ہولناک نہ ہو' مشرقی پاکستان میں بالکل انڈونیشیا کے پیمانے پر ہو گا جس کے نتیجے میں پاکستان کا وجود تک سخت خطرے سے دوچار ہو سکتا ہے ــــ اور دوسری طرف ایسے کسی اقدام سے ہمارے نزدیک بحالاتِ موجودہ سوشلسٹ عناصر کی کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہیں اس لئے کہ ان کا مقابلہ بیک وقت دو طاقتوں سے ہو گا۔ ایک طرف حکومتِ وقت ہو گی اور وہ بھی سیاسی نہیں فوجی جو امن و امان کو برقرار رکھنے کے فرض کو ادا کرے گی اور دوسری طرف مخالف سیاسی قوتیں ہوں گی جن کو اس

طرح آپ سے آپ گویا حکومت کا کور بھی حاصل ہو جائے گا ـــــ اور پاکستان کے سوشلسٹ عناصر ابھی اتنے طاقت ور بہر حال نہیں ہیں کہ ایسی دو طرفہ جنگ لڑ کر بھی کامیاب ہو جائیں۔ لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا معروف کردار اختیار کر کے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کریں ـــــ اور اس طرح ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں۔"

(ماخوذ 'میثاق' فروری مارچ ۱۹۷۰ء)

(۲)

انقلابی کے بجائے سیاسی رُخ

اور تحریکِ پاکستان کی اصل رُوحِ باطنی' کی وراثت

('میثاق' مارچ ۱۹۶۹ء اور جون جولائی ۱۹۷۰ء سے دو اقتباس)

"صدر ایوب کی گفت و شنید کی دعوت نے پوری ڈی۔ اے۔ سی کو بالکل اچانک آلیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تو وہ غریب شش و پنج میں مبتلا رہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ صدر ایوب تو ایک فرد تھے' انہوں نے ایک رُخ پر چلتے چلتے اچانک اباؤٹ ٹرن کر لیا لیکن ایک تحریک کی رواں دواں گاڑی کو تو بریک لگاتے لگاتے بھی آخر وقت لگتا ہے۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی واقعی اور حقیقی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ایک قیادت عوامی تحریک کو بریک لگا کر نیچے اترے اُدھر دوسری قیادت اس کے انجن کو دوبارہ سٹارٹ کر کے لے کر چلتی بنے۔ تیسری طرف یہ معاملہ بھی صاف تھا کہ اب یہ عوامی تحریک اگر مزید آگے بڑھی تو اس کا روکنا مشکل تر ہو جائے گا اور پھر اس کا تمام تر فائدہ بائیں بازو کے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔

یہ اسباب وعوامل تھے جن کی بنا پر وہ عمل اندرونی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ لیکن ظاہری اعتبار سے بڑی تدریج اور مدھم چال کے ساتھ شروع ہوا جسے اب مسٹر بھٹو بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (CIVILIAN COUP DE TAT) سے تعبیر کر رہے ہیں۔

مفاہمت اور مصالحت کا یہ عمل بنیادی طور پر تین لیگوں ہی کے مابین ہوا ہے اور اگر کوئی "عبوری قومی حکومت" وجود میں آئی جس کا امکان بالکل خارج از بحث نہیں تو وہ اصلاً ان لیگ ہائے ثلاثہ ہی پر مشتمل ہو گی۔

اس عمل کی مخالفت ومزاحمت بھی جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا، بائیں بازو کے انتہا پسند لوگوں ہی کی جانب سے ہوئی۔ مسٹر بھٹو چونکہ ابھی کوئی مستحکم تنظیم نہیں رکھتے اور بدلتے ہوئے حالات نے گویا کم از کم وقتی طور پر تو ان کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے۔ لہٰذا انہیں محض منفعلانہ مخالفت (PASSIVE RESISTANCE) پر اکتفا کرنا پڑا۔"

(ماخوذ 'میثاق' مارچ ۶۹ء)

(ii)

"ہمارے یہاں بھی خیر اسی میں ہے کہ یہ بات بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کر لی جائے کہ جملہ معاملات و مسائل کا حل معروف سیاسی و جمہوری طریقوں پر ہو گا۔ اور سب کو یہ حق حاصل ہو گا کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر کے اختیار و اقتدار حاصل کرنے اور مسندِ حکومت پر قبضہ جمانے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی میدان کی پابندیوں کو حتی الامکان ختم کر دیا جائے اور جذبہ و فکر کے اثر و نفوذ کی تمام راہوں کو حتی الامکان سب کے لئے یکساں کھول دیا جائے۔ تاکہ کہیں کسی زیرِ زمین سرگرمی یا انقلابی طریق کار کی ضرورت کا احساس ہی پیدا نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر بھٹو کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر سے بھی پابندی اٹھالی جانی چاہئے...... یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جذبہ و فکر کی راہوں کو کبھی مسدود نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ان کے ایک جانب بند باندھیں گے تو وہ دوسری جانب بہ نکلیں گے۔ ہمارے حالیہ تجربے سے تو یہ بات بالکل ہی ثابت ہو گئی ہے کہ کسی فکر کو پابند و پا بجولاں کرنا ممکن نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر ہمارے یہاں پابندی عائد رہی۔ لیکن کمیونسٹ انقلاب ہمارے نصفِ بہتر خطّے کے عین دروازوں تک پہنچ گیا تھا...... ! فکر کا مقابلہ جوابی فکر ہی سے کیا جا سکتا ہے اور معاملات و مسائل

کا حل ان کا مردانہ وار مواجہہ (FACE) کرنے ہی سے ممکن ہے۔ مصنوعی پابندیوں اور فراری ذہنیت سے کوئی معرکہ سر نہیں کیا جا سکتا!

ایک دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ ملکی سیاست کے میدان میں مذہب کا نام نہایت احتیاط کے ساتھ اور بالکل ناگزیر حد تک ہی لیا جانا چاہئے۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا بالعموم مذہبی اعتبار سے جو حال ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے اور خود عوام کی ایک عظیم اکثریت میں بنیادی اخلاقی و روحانی اقدار جس سطح پر ہیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ تو جب مذہب اس وقت نہ ہمارے فکر میں سرایت کئے ہوئے ہے نہ جذبے میں تو آخر سیاست کے میدان میں اس کی کارفرمائی کیسے ہوگی؟ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ دین و مذہب کے اعتبار سے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں اور شیخ مجیب الرحمان اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مابین کون سا فرق و تفاوت ہے؟...... بلکہ عجیب تر صورت یہ ہے کہ پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے داعیٔ اعظم مولانا بھاشانی تو علمائے دیوبند کے صحبت یافتہ اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ اور نظامِ اسلام پارٹی کے متعدد اہم کارکنوں کے ملی و قومی جذبہ و اخلاص کے معترف ہونے کے باوجود ذاتی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ وہ جمعے کی نماز پڑھنے کے بھی روادار نہیں!...... مقصود کسی کی تنقیص نہیں بلکہ صرف اس امر کی وضاحت ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب بالکل بنیاد سے تعمیرِ جدید کا محتاج ہے اور احیاءِ اسلام کی آرزو رکھنے والے لوگوں کو پہلے فکر کے میدان میں اسلامی انقلاب اور عوامی سطح پر اسلام کی مخصوص اخلاقی و رُوحانی اقدار کی از سرِ نو ترویج کا کٹھن اور صبر آزما کام کرنا ہوگا۔ موجود الوقت حالات میں سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ لگانا اور سیاسی و معاشی مسائل میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل لوگوں پر کفر و الحاد کے فتوے چسپاں کرنا بالآخر خود دین و مذہب کے لئے مضر ثابت ہوگا۔"

(ماخوذ 'میثاق' مارچ ۱۹۷۹ء)

———(۱۱)———

" مسٹر بھٹو کے بارے میں ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ وہ خود بھی 'انقلابی' سے زیادہ 'سیاسی' مزاج رکھتے ہیں اور ان کی تحریک بھی 'نظریاتی' سے زیادہ 'قومی' رنگ کی حامل ہے...... لہٰذا انہیں تو خالص انتخابی رنگ اختیار کرنے میں کسی دقت کے پیش آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہیں زیادہ سے زیادہ یہ کرنا پڑا کہ انہوں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے جماعتی نظم میں چند "پریشاں روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ ..." نوجوانوں کو خارج کر کے اصل اہمیت

صاحبِ حیثیت اور ذی وجاہت لوگوں کو دے دی..... اور خود بھی زیادہ گرما گرم اور اشتعال انگیز باتیں کہنی بند کر دیں..... (اگرچہ عوام کے جذبات اور ان کی دلچسپی کے اعتبار سے جو کمی اس طرح واقع ہو سکتی تھی اس کو بعض دوسرے FIRE BRAND مقررین کی شعلہ نوائی سے پورا کرنا پڑا!) حد یہ ہے کہ سابق صدر ایوب خاں کے فیلڈ مارشل کے منصب کی بحالی ایسے اقدام پر بھی وہ مہر بلب رہے۔ ع

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"

ویسے بھی صوبہ سندھ کی حد تک تو ان کی جماعت یا جمعیت پہلے ہی سے عوام سے زیادہ وڈیروں کے سہارے قائم تھی اب یہ رنگ مزید پختہ ہو گیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی باہمی سیاست میں مسٹر بھٹو آنے والے انتخابات میں کھوڑو اور قاضی فضل اللہ گروپ کا بھرپور مقابلہ کریں گے اور کیا عجب کہ انہیں شکست دینے میں بھی کامیاب جائیں!"

"بہرحال بھٹو اور بھاشانی کے سیاسی و انتخابی لائن اختیار کر لینے سے پاکستان کے سر سے کسی فوری دھماکہ خیز انقلاب کا خطرہ ٹل گیا ہے اور سارا کھیل خالص سیاسی نوعیت کا رہ گیا ہے ۔ فَلِلّٰہِ الْحمد!!

ان تین چار ماہ کے دوران میں اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی پاکستان میں پورے زور شور سے اور مشرقی پاکستان میں کسی قدر کم قوت کے ساتھ 'تحریک پاکستان' کا گویا از سر نو احیاء ہو گیا ہے چنانچہ ایک طرف مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور نظریۂ ملی کا راگ خوب الاپا جا رہا ہے۔ دوسری طرف "نظریۂ پاکستان" کی دہائی دی جا رہی ہے اور اس کے تحفظ کے لئے سرمایہ داروں کی تجوریوں کے منہ کھل گئے ہیں اور تیسری طرف اسلام 'اسلام' کا شور مچ رہا ہے اور بہت سے خوش گمان لوگوں کی آنکھوں میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی امیدوں کے سوکھے چمن میں یکبارگی بہار کی آمد کے خیال سے چمک پیدا ہو گئی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ اس تازہ احیاءِ شدہ "تحریک پاکستان" کے دل صد پارہ کے کچھ ٹکڑے کسی کے قبضے میں ہیں اور کچھ کسی دوسرے کے ہاتھ..... چنانچہ ایک طرف تحریک پاکستان کی 'مذہبی رومانویت' ہے جس پر کم از کم تا حال بلا شرکت غیرے پوری مضبوطی کے ساتھ جماعت اسلامی قابض ہے اور اس میں وہ کسی کو بھی شریک کرنے کو تیار نہیں حتیٰ کہ ار

کے اصل وارثین میں سے ایک گروہ جو علماء دیوبند کے تھانوی و عثمانی حلقوں پر مشتمل ہے نہ صرف پورا زور صرف کرنے بلکہ چھینا جھپٹی کرنے کے باوجود جماعت اسلامی کو اس 'قبضہ غاصبانہ' سے بے دخل کرنے میں ناکام ہو رہا ہے اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کی طرف سے اس سلسلے کی مزید کارروائی کے سدِّباب کے لئے غالباً جماعت اسلامی متحدہ اسلامی محاذ کے قیام کے لئے گفت و شنید تک سے احتراز کرے گی حال ہی میں تحریک پاکستان کی مذہبیت کی وراثت کا دعویدار ایک دوسرا گروپ البتہ ایسا سامنے آیا ہے جو چاہے جماعت اسلامی کو اس 'قبضہ غاصبانہ' سے کُلّی طور پر بے دخل نہ کر سکے۔ بہرحال اس میں سے قابل لحاظ حصہ ضرور بٹوا لے گا' ہمارا اشارہ بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ کی اس کانفرنس کی جانب ہے جو حال ہی میں "دار السلام" ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بڑی شان اور آن بان کے ساتھ منعقد ہوئی ہے اور جس میں متعدد مقرّرین نے جماعتِ اسلامی پر شدید لے دے کی ہے۔

دوسری طرف اس 'مذہبی رومانویت' کے بالکل برعکس تحریک پاکستان کے اصل اور اساسی محرّک یعنی ہندوؤں کے سیاسی' تہذیبی اور معاشی تسلط کے خوف اور اس سے بچاؤ کے جذبے کی وراثت ہے جس پر اتفاقاً ہی سہی بہرحال کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک کلیۃً مسٹر ذوالفقار علی بھٹو قابض ہو گئے ہیں۔ تحریک پاکستان کا یہ اصل 'باطن' اس وقت دو صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ایک ہندوستان دشمنی اور دوسرے عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد' ان میں سے مقدّم الذکر کی علامت (SYMBOL) تو مسٹر بھٹو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہی میں بن گئے تھے اور مؤخر الذکر کی علامت وہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر بن گئے اور چونکہ ایک طرف یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تحریکِ پاکستان کے اساسی محرکات میں اصل فیصلہ کن حیثیت معاشی عوامل ہی کو حاصل تھی اور دوسری طرف اس حقیقت کا انکار بھی شدید قسم کی ڈھٹائی کے بغیر ممکن نہیں کہ اسلامی سوشلزم کا تصور "مصوّر پاکستان" علامہ اقبال کے یہاں تو پورے زور شور کے ساتھ موجود ہے ہی خود "خالق پاکستان" مسٹر محمد علی جناح اور ان کے دست راست خان لیاقت علی خاں کے یہاں بھی بصراحت مذکور ہے لہٰذا چاہے یہ کسی کو برا لگے چاہے بھلا' بہرحال واقعہ یہی ہے کہ تحریکِ پاکستان کی اصل 'روحِ باطنی' کے وارث مسٹر بھٹو ہیں (اگرچہ مغربی پاکستان میں ہندوستان دشمنی کی راہ سے خان عبدالقیوم خاں اور مشرقی پاکستان میں اُس خطّے کے معاشی حقوق کی

بازیافت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمان بھی تحریک پاکستان کے اس جزو کی وراثت میں کسی حد تک شریک قرار دیئے جاسکتے ہیں)۔

تیسری طرف تحریک پاکستان کے اس 'جسد خارجی' کی وراثت کا مسئلہ ہے جو نواب زادوں' جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے مرکّب تھا اور دین ومذہب کے باب میں زیادہ سے زیادہ "لبرل اسلام" کا قائل تھا اور اگرچہ مسلم لیگ بطور ایک وحدت کے تو کبھی کی مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکی تاہم اس کے جسدِ خاکی کی اجزاء ابھی موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری جماعت زبردستی تحریکِ پاکستان کی وراثت پر تنہا قابض ہو جائے اور مسلم لیگ کی واحد جانشین بن بیٹھے' اس لئے کہ بظاہر احوال تو تحریکِ پاکستان کی وراثت کے اصل مدعی وہ ہیں نہ کہ کوئی اور! (مسلم لیگ کے 'باقیات الصالحات' ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان کی وراثت کے دعوے داروں میں فی الوقت مدّعی اعظم کی حیثیت بلاشبہ مسٹر ممتاز محمد خاں دولتانہ اور ان کے ساتھیوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ اگرچہ کچھ دوسرے گروپوں کا دعویٰ بھی اس بات میں بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا)۔

قصہ مختصر یہ کہ .... اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں تحریکِ پاکستان کے احیاء کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے لیکن چونکہ تحریکِ پاکستان کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اور ع

"اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے"

کے مصداق اس کی وراثت کے مدعی بہت سے ہیں' لہٰذا چاہے۔ "تحفظِ نظریۂ پاکستان" کے نام پر بھیک کسی ایک جماعت ہی کو زیادہ مل جائے' انتخابات کے میدان میں تحریکِ پاکستان کے اس حالیہ احیاء کے ثمرات بہت سی سیاسی جماعتوں کے مابین تقسیم ہوں گے اور کوئی ایک جماعت چاہے وہ کوئی سی بھی ہو ان سے بلا شرکتِ غیرے متمتّع نہیں ہو سکتی! ...!!

(ماخوذ 'میثاق' جون جولائی ۱۹۷۰ء)

(میثاق، جنوری، فروری، اور مارچ ۱۹۶۹ء کے اداریوں سے اقتباسات)

اصل نوعیتِ مسئلہ "ہمارے نزدیک اس وقت ملک کی داخلی سیاست کے اصل بنیادی مسائل دو ہیں۔ ایک یہ کہ سیاسی اختیارات جو مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عوام کے بجائے نوکر شاہی کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔ وہ اختیار و اقتدار کے اصل مالکوں یعنی جمہور کو منتقل کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ دولت اور خصوصاً ذرائع پیداوار جو عوام الناس کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بن گئے ہیں انہیں پوری قوم میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے گویا کہ پہلی 'سلطانیٔ جمہور' کے نظام کے واقعی اور حقیقی نفاذ کی کوشش ہے اور دوسری "دورِ سرمایہ داری" کے منحوس اثرات اور نقوشِ کہن کو مٹانے کی سعی و جہد ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی کوششیں درست بھی ہیں اور مبارک بھی! اور ملک کے ہر ذی شعور شہری کا فرض ہے کہ وہ ان میں اپنی اپنی صلاحیت، استعداد اور قوتِ کار کے مطابق حصہ لے۔ اسلام کے نزدیک یہ دونوں ہی مقاصد محمود ہیں۔ اسلام ایک طرف اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بندگانِ خدا کی گردنوں پر کوئی ایک فرد یا کچھ افراد یا کوئی مخصوص طبقہ خدائی کا تخت جما کر بیٹھے...... اور دوسری طرف عدل و انصاف پر بھی انتہائی زور

دیتا ہے۔ چنانچہ "وَ اُمِرتَ لا عدِلَ بَینَکُم"[1] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ہے اور "لِیَقُومَ النَّاسُ بالقِسطِ"[2] کتابِ الٰہی کا مقصد نزول ہے اور "دُولَۃً بین الاَغنیاءِ مِنکُم"[3] کی کوئی صورت اسلام کے نزدیک کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں۔

لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اس وقت ان دونوں ہی میں شدید افراط وتفریط سے کام لیا جارہا ہے۔ دائیں بازو کے اہلِ سیاست نے صرف پہلے کام پر نگاہوں کو مرکوز کر دیا ہے اور دوسرے معاملے کے ضمن میں وہ 'وعدۂ فردا' سے آگے قدم بڑھانے کو تیار نہیں اور مزید بدقسمتی یہ کہ 'سلطانیٔ جمہور' کے ذیل میں بھی ان کے سارے تصورات یورپ کے مبنی بر الحاد فکر سے مستعار لئے ہوئے ہیں دوسری طرف بائیں بازو کے حامی لوگوں نے اپنی اصل توجہ دوسرے کام پر مرکوز کر دی ہے اور 'عدلِ اجتماعی' کے لئے نظام بھی ان کے پیشِ نظر خدا تعالیٰ کا عطا کردہ نہیں' مارکس' لینن اور ماؤزے تنگ کا وضع کردہ ہے !!

اس صورت حال میں ہر اُس شخص کے لئے جو اوّل و آخر صرف مسلمان ہو اور جس کے نزدیک دین ومذہب ہر چیز پر مقدّم ہوں ایک اہم لمحۂ فکریہ ہے ایسے سب لوگوں کو خواہ وہ موجودہ سیاسی سرگرمی میں کسی حیثیت سے شریک ہوں' خواہ کسی خالص غیر سیاسی کام میں مصروف ہوں اس صورت حال کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے مدِّ نظر دین کے احیاء اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے مناسب لائحۂ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہو جانا چاہئے۔

"یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!"

(ماخوذ از "تذکرہ وتبصرہ میثاق جنوری ۱۹۶۹ء")

---

[1] سورۃ شوریٰ۔ رکوع ۱' ترجمہ "اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین انصاف کروں!"

[2] سورۃ حدید۔ رکوع ۳' ترجمہ "تاکہ لوگ عدل وانصاف کے نظام پر قائم رہیں!"

[3] سورۃ حشر۔ رکوع ۱' ترجمہ "(سرمایہ) کا الٹ پھیر اہلِ ثروت ہی کے مابین!"

خواہ مخواہ کا بپتسمہ اور فتووں کا تکلّف حال ہی میں جمعیت علمائے اسلام کی پاکستان میں نشأۃِ ثانیہ کے اصل معمار مولانا غلام غوث ہزاروی کے ایک بیان پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ بحث زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی ہے کہ آیا سوشلزم کا اسلام کے ساتھ پیوند لگ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گذشتہ شمارے میں جمعیت کے بارے میں جو تفصیلی رائے پیش کی تھی، مولانا غلام غوث صاحب کے اس بیان سے اس کے اہم ترین جزو کی تصدیق ہو گئی۔ مولانا کے اس بیان کا اصل تعاقب حلقۂ دیوبند ہی کے ان علماء کی جانب سے ہوا ہے جنہوں نے ماضی میں تحریکِ مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ ان حضرات کی ہمارے دل میں واقعتاً بڑی عزت ہے لیکن انہوں نے سوشلزم کو اسلام کی عین ضد اور جمہوریت کو عینِ اسلام ثابت کرنے کے لئے جس قسم کے دلائل دیئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگوں کی جانب سے اور ایسی بچگانہ باتیں۔[1]

> اسلام بلاشبہ اپنی ذات میں ایک مکمل نظام ہے اور اساسی عقائد و نظریات سے لے کر حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی تفصیلی تشکیل تک اس کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے جو کسی دوسرے نظریئے یا نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا۔

---

[1] اس میدان میں اول اول تو مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے دعووں ہی پر اکتفا کی، دلائل کوئی نہ دیئے...... اس کے بعد جب ایک موقع پر اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے داعیٔ اعظم اور دورِ جدید میں اسلام کے مفکّرِ اعلیٰ نے جمہوریت کے عینِ اسلام ہونے کے لئے یہ دلیل ارشاد فرمائی کہ "ہماری فقہ کی کتابوں میں جمہور کی اصطلاح کا بکثرت استعمال ہوا ہے!" تب تو واقعہ یہ ہے کہ "ناطقہ سر بگریباں" ہو کر رہ گیا...... کہ اب کوئی کیا کہے اور کیا لکھے...... اس لئے کہ کہنے سننے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی...... البتہ اس قدر گزارش کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ حضرت! اگر اسی اصول پر کسی نے یہ دلیل دے دی کہ چونکہ ہماری فقہ کی تمام کتابوں میں "شراکت" پر مستقل باب موجود ہیں للہذا "اشتراکیت" بالکل درست اور ازروئے اسلام بالکل جائز ہے تو کس بھاؤ تلے گی؟"

چنانچہ نہ اس کے کسی جزو کا پیوند کسی اور نظام کو لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور نظام کے کسی جزو کی پیوند کاری اس کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس بنا پر کہ اس کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے کے بعض اجزاء جمہوریت کے بعض اجزاء سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں' اس کا تعلق جمہوریت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے تو یقیناً اس کے معاشی نظامِ عدل و قسط کے بھی بعض اجزا سوشلزم کے بعض اجزاء سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس بنا پر اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ بھی ممکن ہے۔ بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خلافتِ راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں اختیارات کا جس قدر ارتکاز تھا اس سے مشابہت کی بنا پر آمریت کا رشتہ بھی اسلام کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے! اسلامی نظامِ معیشت و حکومت کا عروج یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلافت کا زمانہ تھا اور اس میں جہاں جمہوریتِ کاملہ کے ایسے مظاہر دیکھنے میں آتے تھے کہ ایک عام مسلمان ان کو بر سرِ منبر ٹوک دیتا تھا وہاں ان کے سفرِ بیت المقدس میں سوشلزم کی بلند ترین منزل کی شان بھی موجود ہے۔

ویسے ہمارے نزدیک ان دونوں ہی کے ساتھ اسلام کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا نرا تکلّف ہے۔ ہمارے ہاں نہ حامیانِ جمہوریت' جمہوریت کے داعی اس لئے بنے ہیں کہ انہیں اسلام کی بارگاہ سے اس کا حکم ملا ہے اور نہ ہی سوشلزم کے حامی اس کی جانب اس لئے جھکے ہیں کہ انہیں اسلام کا تقاضا یہی معلوم ہوا..... یہ سب کچھ تو تاریخ کے ایک عام بہاؤ کے تحت ہو رہا ہے جو گذشتہ دو تین صدیوں سے خالصتاً غیر مذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے اور جس میں مذہب سے سرے سے کوئی بحث (REFRENCE) ہی نہیں حامیانِ دین و مذہب کی اس عام بہاؤ کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کو بپتسمہ دینے کی کوشش بالکل خواہ مخواہ ہے!

موٹی سی بات ہے کہ فکر و فلسفے کے اعتبار سے موجودہ پوری دنیا کا امام تا حال یورپ ہے۔ اور جو خالص بے خدا و مادّہ پرستانہ تہذیب وہاں سے اٹھی تھی وہ تا حال پورے کرۂ ارضی پر حکمران ہے' وہاں کے ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کی

کو کھ سے خالص تاریخی عوامل کے زیر اثر جو جمہوری نظام بر آمد ہوا تھا اس نے اولاً سیاسی شعبۂ زندگی میں جمہوریت (DEMOCRACY) کی صورت اختیار کی۔ جس کے مختلف ممالک میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے۔ اسی جمہوریت نے بعد میں معاشی نظام میں آزاد معیشت کی راہ سے سرمایہ داری (CAPITALISM) کی کریہہ صورت اختیار کر لی جس کا ردِّ عمل سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا' جو در حقیقت نظریہ و فکر کے اعتبار سے اسی قدیم لادینی مادہ پرستانہ سلسلۂ فکر کی اگلی منطقی کڑی اور نظام کے اعتبار سے سرمایہ داری کا قدرتی ردِّ عمل ہے۔ اس ردِّ عمل کے بھی مختلف ملکوں میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے اور اس میں مادر پدر آزاد معیشت کی تباہ کاریوں کی روک تھام میں انسان نے ایک دوسری انتہا پر پہنچ کر فرد کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اسے اجتماعیت کے کاملۃً بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس صورت میں بھی انسان اپنے اوپر کسی اور بالاتر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا سوشلزم کے تمام ایڈیشن بھی چاہے وہ روسی ہوں یا چینی مدّعی جمہوریت ہی کے ہیں..... چنانچہ اس وقت عالمی کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ملک بھی "عوامی جمہوریۂ چین" ہی کہلاتا ہے !!

سیاسی و معاشی نظاموں کے انقلابات کا یہ سلسلہ اوّلاً تو صدی ڈیڑھ صدی میں تکمیل کو پہنچا تھا لیکن اب دنیا کے تمام تر زیرِ ترقی ممالک میں یہ داستان بڑی تیزی کے ساتھ دوہرائی جا رہی ہے اور یہ حالات کا ایک خالصتاً اپنا رخ ہے جو کسی مرحلے پر بھی دین و مذہب سے کوئی فتویٰ طلب نہیں کرتا۔ مفتیانِ دین و مذہب خواہ مخواہ اس کے مختلف موڑوں پر اپنے دار الافتاء سے فتوے صادر کرنے کا تکلّف کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور نیم پس ماندہ ملک ہے اور اس میں بسنے والے عوام بھی ایک نیم خوابیدہ و نیم بیدار قوم ہیں۔ اس نیمے دروں و نیمے بروں حالت میں جتنے دوسرے ممالک مبتلا ہیں' عام اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم' جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہی یہاں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے... اور ہوتا رہے گا۔ جب تک کہ دین و مذہب اس معاشرے میں واقعتاً ایک مؤثر عامل کی حیثیت اختیار نہ کر لیں..... جس کے امکانات بحالاتِ موجودہ دُور دُور تک نظر نہیں آتے!!

ہمارے اس وقت کے جملہ اجتماعی مسائل کی اصل صورت یہ ہے کہ :

۱۔ آج سے اکیس سال قبل آزادی کی صورت میں دفعۃً جو سیاسی حقوق و اختیارات ہمارے ہاتھ آئے ہم بحیثیت قوم اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے اور چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ یہ حقوق و اختیارات عوام کے ہاتھوں تک کبھی پہنچے ہی نہیں' بیچ ہی میں کچھ جاگیرداروں (FEUDAL LORDS) اور کچھ سابق حکمرانوں کی تربیت دادہ سروسز (SERVICES) نے انہیں اچک لیا۔ خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ عوام اس کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا رفتہ رفتہ یہ اختیارات پہلے چند پیشہ ور سیاست دانوں اور پھر ان کے بھی نا اہل ثابت ہو جانے پر کلیتہً سروسز کو منتقل ہو گئے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور اس کا ردِ عمل عوامی جمہوریت کی بحالی یا از سرِ نو قیام کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

۲۔ آزادی کے وقت ہمارا ملک ایک خالص زرعی ملک تھا۔ اور ان اکیس سالوں کے دوران رفتہ رفتہ صنعت نے ترقی کی تا آنکہ اب ہم ایک نیم زرعی و نیم صنعتی ملک بن چکے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سارا کام مغرب سے مستعار لئے ہوئے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے تحت ہوا ہے۔ لہٰذا ہمارے یہاں بھی سرمایہ داری اپنی کریہہ ترین صورت میں ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ ملک کی زرعی دولت پر جو اجارہ داری پہلے سے قائم تھی اس میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملک کی پوری صنعت و تجارت پر بھی چند خاندانوں کا قبضہ ہو گیا ہے اس کے ردِ عمل کے طور پر یہاں بھی وہی کچھ سوچا جا رہا ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں سوچا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ تقسیمِ دولت اور ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کے پورے نظام کو بیخ و بن سے اکھیڑ ڈالا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں ردِ عمل تاریخ کے متذکرہ بالا عمومی بہاؤ ہی کے اجزاء ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں......!!

لیکن چونکہ اتفاقاً ہمارے ملک کے عوام کو مذہب سے ایک جذباتی سا تعلق بھی ہے لہٰذا اس غریب کا نام خواہ مخواہ اچھالا جاتا ہے۔ خود تحریکِ پاکستان کے دوران بھی جس کے اصل اساسی عوامل معاشرتی و معاشی تھے' اس کا نام زور شور سے لیا گیا اور پاکستان کا مطلب ہی "لا الٰہ الا اللہ" بتایا گیا جس کی حقیقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ربع صدی گزر جانے کے باوجود اس غریب اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نام نشان یہاں نظر آتا ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ بلکہ ہمارے اندازے کے مطابق اس سے بھی کم...... اور اب

بھی مختلف عمرانی نظریات کے حامل لوگ خواہ مخواہ اس کا نام بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں!

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء)

———(iii)———

شریعتِ اسلامی میں دستوری اور معاشی مسائل کے حل کے لئے وسیع گنجائشیں موجود ہیں

سوچنا چاہئے کہ اس وقت جو مسائل بالعموم ملک اور قوم کے سامنے ہیں ان میں سے آخر کون سے مسئلے کا کوئی خاص تعلق دین و مذہب سے ہے؟ طرزِ حکومت وحدانی ہو یا وفاقی' جمہوریت صدارتی ہو یا پارلیمانی' انتخابات بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ' مغربی پاکستان ایک صوبہ رہے یا دوبارہ متعدد صوبوں میں منقسم ہو جائے' جس طرح ان تمام مسائل میں اسلام کا کوئی ایک منصوص حکم نہیں ہے بلکہ حالات و ضروریات کے اعتبار سے مناسب صورتیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش ہے کہ زمین کا بندوبست کن بنیادوں پر ہو اور بڑی بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت برقرار رکھی جائے یا انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مزارعت کا مسئلہ ہمارے یہاں سلف سے متنازعہ فیہ چلا آ رہا ہے اور حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے کی بجائے پوری ملّتِ اسلامی کی اجتماعی ملکیت قرار دے کر ایک اہم اجتہاد فرمایا تھا جس پر پوری امت کا اجماع بھی ہو گیا تھا لہٰذا ان مسائل میں دلیل کی بنیاد پر کوئی ایک یا دوسرا موقف تو اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اپنی کسی رائے کو اسلام کا حتمی فیصلہ قرار دے کر بقیہ آراء کو کفر و الحاد قرار دے دینا یقیناً زیادتی اور حدود سے تجاوز ہے۔ ہماری رائے میں بالکل صحیح کہا ہے مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مسائل و معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان کے حل کی مخلصانہ کوشش کی جائے نہ یہ کہ جو بھی ذرا عام روش سے ہٹ کر بات کرے اس کے خلاف کفر و الحاد کے فتووں کی توپیں داغنی شروع کر دی جائیں......!!

پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کے علمبردار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اب پھر بس قبل از مارشل لاء

کی سی جمہوریت ملک میں دوبارہ قائم ہو سکتی ہے اور بالکل اسی طرح کے سے حالات لوٹ کر آسکتے ہیں تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس ملک میں اب حقیقی عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور جمہور اب صرف اس بات پر کبھی قانع نہ ہوں گے کہ ان کو 'ووٹ' کی صورت میں سرمایہ داروں سے کچھ 'نوٹ' حاصل کرنے کا ایک کاغذی ساحق مل جائے بلکہ وہ اپنے تمام سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس صورتِ حال میں اگر کسی نے مذہب کو ان کے خلاف دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ مذہب کے ساتھ عوام کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہو جائے گا اور مذہب سے بیزاری کی عام رو چل نکلے گی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہوشمند لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق مارچ ۱۹۶۹ء)

پاکستان کی مذہبی سیاست
کی بے بسی اور بے راہروی
اور
کرنے کا اصل کام

(تذکرہ وتبصرہ 'میثاق' فروری ۶۹ء واکتوبر ۷۰ء سے اقتباس)

—— (۱) ——

جماعتِ اسلامی کی مذہبی سیاست کی بے بسی اور کرنے کا اصل کام:

جمعیت علماء اسلام کا ذکر تو اس وقت رہنے دیجئے اس لئے کہ وہ پاکستان کی موجودہ سیاست کے میدان میں فی الحال نووارد ہے اور ابھی اس کی سیاست کے خطوط بالکل مبہم ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ این اے پی اور پی پی پی کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور کبھی پی ڈی ایم سے اشتراک کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک پلڑے میں وزن ڈالتی ہے کبھی دوسرے میں......!

البتہ جماعت اسلامی اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ اسے پاکستان کی سیاسیات میں برسرِ عمل ہوئے پورے اکیس سال بھی ہو چکے ہیں اور اس پورے عرصے میں وہ اس امر کی مدّعی بھی رہی

ہے کہ اس کا اصل مقصد احیائے اسلام اور اقامتِ دین ہے!

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پورے سفر کے دوران اس کی دینی ومذہبی حیثیت اگر کوئی تھی بھی تو کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی بجائے خود متذکرہ بالا تاریخی بہاؤ کے رخ پر بہہ نکلی ہے.....! اور اب چاہے ایک مضبوط اور منظم گروہ کی حیثیت سے ملکی سیاست کے میدان میں اس نے اپنا کوئی وقار قائم کر بھی لیا ہو۔ دینی ومذہبی حیثیت سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی !

پاکستانی سیاست کے افق پر اوّل اوّل جماعتِ اسلامی بڑے اعتماد اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تحریکِ پاکستان ہی کے جذباتی پس منظر کو اجاگر کر کے اور "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الّا اللہ" کے خالص مسلم لیگی نعرے کو اپنا کر 'اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے نام پر پردہ انقلابِ قیادت کی مہم تنہا اپنے بازو کے بل پر بہت جلد سر کر لے گی۔ چنانچہ اُس وقت اگر کسی اور نے اس کو تعاون واشتراک کی پیش کش بھی کی تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔

لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں اور تنہا اپنے زورِ بازو سے کام نہیں چل سکے گا تو جماعت نے مذہب ہی کے نام پر علماء اور مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک عرصے تک جماعتِ اسلامی کی مذہبی سیاست "علماء کے متحدہ و متفقہ مطالبات" کی بنیاد پر چلتی رہی۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر محسوس ہوا کہ چڑھائی بہت سخت ہے اور گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ایک قدم اور نیچے اتر کر خالص "جمہوریت" کے نعرے پر سیاست کی نئی بساط بچھائی گئی جس پر تا حال سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے.....!! اور جس کا مظہرِ کمال یہ ہے کہ "ڈی اے سی" جس میں پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے دونوں مذہبی پہلوان اس وقت مجتمع ہیں' اس کے مطالبات اور متفقہ نکات میں غریب اسلام کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں!

خدا شاہد ہے کہ ہمارے پیشِ نظر کسی جماعت کی تنقیص ہر گز نہیں۔ ان گزارشات سے ہمارا مقصد صرف اپنی اس رائے کی وضاحت ہے کہ موجودہ سیاست کا دین ومذہب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور وقت کا جو دھارا خالص غیر مذہبی ولادینی رخ پر بہہ رہا ہے اس کی مختلف لہروں کی باہمی آویزش میں اسلام کا نام استعمال کرنا اور خاص طور پر اسے موجودہ بوسیدہ'

گلے سڑے اور ظالمانہ و استحصالی نظامِ معیشت کا پشت پناہ بنا کر کھڑا کر دینا اسلام کی دوستی نہیں اس کے ساتھ دشمنی ہے۔ تاریخ کے رخ کا جو "ڈان" ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے' اس کا رخ مذہب کی جانب موڑنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے فلسفہ و فکر کے میدان میں انقلاب برپا کیا جائے اور روحانی اقدار کا از سرِ نو احیاء ہو۔ ایمان و یقین کی روشنی دنیا میں پھیلے اور اخلاق و اعمال میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جب یہ انقلاب کسی انسانی معاشرے میں ایک معتدبہ حد تک رونما ہو چکے گا تب کہیں جا کر اس کا امکان پیدا ہو گا کہ اس کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو۔ اور وہاں خدا پرستانہ نظامِ زندگی پوری شان کے ساتھ جلوہ آرا ہو سکے...... ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ ان اعتبارات سے دین و مذہب کی روح سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا جن کا اصل تعلق اسلام اور صرف اسلام سے ہو اور جن کی زندگیوں کا مقصود صرف اور صرف احیائے اسلام و اقامتِ دین ہو' موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ یہ کہ اگر علمی و فکری کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو تعلیم و تعلّمِ قرآن کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیں اور کتاب اللہ کے علم و حکمت کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہو جائیں۔ اس لئے کہ ایمان و یقین کے احیاء کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں...... اور اگر علمی کام سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو معاشرے کے کونوں کھدروں میں بیٹھ جائیں اور خلوص و اخلاص کی قوتوں کو بروئے کار لا کر عوام النّاس میں دینی و روحانی اقدار کی از سرِ نو ترویج کی کوشش کریں۔

ہم تحریکِ پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا۔ لیکن پاکستان کے معجز نما ظہور...... اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفّظ و بقا کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور پورے عالمِ ارضی میں غلبۂ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے اور اسی بنا پر ہمیں اس کا بقا و وجود بھی عزیز ہے اور اس میں انتشار اور انارکی کسی صورت گوارا نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس مبارک انقلاب کی ابتداء سیاسی میدان سے نہیں بلکہ علم و فکر اور فلسفہ و حکمت کے میدان سے ہو گی۔ اور ایک علمی و تعلیمی انقلاب کے سوا اس کی کوئی راہ موجود نہیں..... اس میدان میں بالکل ابتدائی اور کمیت کے اعتبار سے نہایت حقیر کوشش کئے چلے جانا بھی چاہے اس کے کوئی محسوس نتائج سامنے نہ آئیں۔ ہمارے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ سیاسی میدان میں

بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شرکت کی جائے۔ لیکن بجائے اس کے رخ کو دین ومذہب کے جانب موڑنے کے خود اس کی رو میں بہہ جایا جائے!۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے !!

اللہ تعالیٰ ہمیں مسلمان جینے اور ایمان پر مرنے کی سعادت نصیب فرمائے.... آمین!

(ماخوذ از "تذکرہ وتبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء)

(۲)

عُلمائے کرام اور جماعتِ اسلامی کی مذہبی سیاست کا تاریخی جائزہ

پاکستان کے سیاسی حالات نے اواخر ۱۹۶۸ء سے جو پلٹا کھانا شروع کیا تھا اس کی تیزی اور تندی کو تو اگرچہ سابق صدر ایوب اور حالیہ صدر یحییٰ کی حکمت عملی نے بہت حد تک روک دیا تاہم وہ تبدیلی اندر ہی اندر دھیمی چال اور مدھم آواز کے ساتھ مسلسل جاری ہے اور اس کے اثرات صرف سیاسی میدان ہی تک محدود نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اس سے تدریجاً متاثر ہو رہا ہے' حتیٰ کہ صرف دو پونے دو سال میں حالات اس قدر بدل چکے ہیں کہ پہلی بہت سی باتیں بالکل بھولی بسری یادیں معلوم ہوتی ہیں . اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دو سالوں میں ہم کم از کم بیس سال کی مسافت قطع کر آئے ہیں۔

دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر . صرف "مذہبی سیاست" کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اواخر ۱۹۶۸ء سے ماقبل اور مابعد کے حالات میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ اور اس کے مقدمات ومبادی اور صغریٰ کبریٰ سمیت ساری منطق تبدیل ہو گئی ہے۔

پاکستان کے پہلے اکیس سالوں کے دوران میں ہماری مذہبی سیاست میں کامل اتحاد اور اتفاق کا سماں بندھا رہا اور مولانا مودودی' مولانا تھانوی یہاں تک کہ مفتی محمود اور مولانا ہزاروی ا۔ ..ایک ہی راگ الاپتے اور ایک ہی منطق کے چپوؤں سے مذہبی سیاست کی ناؤ

ا۔ غور فرمائیے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کس قدر عجیب نظر آتا ہے کہ کبھی کسی مرحلے پر مولانا مودودی اور مولانا ہزاروی ایک ہی کشتی میں سوار رہے ہیں اور دونوں کی حکمت عملی ایک ہی رہی ہے!

کہتے رہے۔
اس منطق کا صغریٰ کبریٰ یہ تھا کہ ..... (۱) پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے اور (۲) پاکستان کے عوام کی ایک عظیم اکثریت (نو سو ننانوے فی ہزار کی حد تک!) اسلام ہی کی فدائی اور شیدائی ہے اور اسلامی قانون و دستور ہی کا نفاذ چاہتی ہے .. (۳) صرف ایک "بر سرِ اقتدار طبقہ" ہے جو قوم کے اس ارادے کی راہ میں مزاحم ہے۔ اور ملک کو دستوری اعتبار سے لادینیت اور تہذیبی و اخلاقی اعتبار سے بے حیائی اور اباحیت پرستی کی راہ پر چلانا چاہتا ہے (۴) لہٰذا ساری اجتماعی جدوجہد کا رخ ان "ارباب اقتدار" اور اس "بر سرِ اقتدار طبقے" کے خلاف ہونا چاہئے۔ اور نہ تو قوم کو ان سے بدظن کرنے کی کوشش میں کوئی کمی رہنے دینی چاہئے اور نہ ہی ان کے خلاف بے چینی اور بے اطمینانی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے چوکنا چاہئے۔
چنانچہ ان پورے اکیس سالوں کے دوران ہماری تمام مذہبی قوتیں چاہے وہ جماعتیں تھیں یا جمعیتیں ایک ہی ہدف پر حملے کرتی رہیں اور تحریر و تقریر کا سارا گولہ بارود ایک ہی نشانے پر صرف ہوتا رہا یہ دوسری بات تھی کہ یہ قلعہ تھا خالص ہوائی۔ اس لئے کہ نہ تو کبھی "اربابِ اقتدار" اور "بر سرِ اقتدار طبقہ" کی واضح تعریف کی جا سکی اور نہ ہی اس کا حدود اربعہ متعین کیا جا سکا
عوام کے بارے میں چونکہ متذکرہ بالا صغریٰ کبریٰ کی رُو سے یہ بات طے شدہ تھی کہ وہ تو اسلام کے فدائی اور شیدائی ہیں ہی لہٰذا ان کے ذہن و فکر کی تطہیر اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کا سوال منطقی طور پر خارج از بحث رہا۔ اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ ان کی طرف سے خطاب کا رخ بالکل پھر گیا۔ گویا ان سے تو کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کہنا تو جو بھی کچھ تھا وہ ان کے انگوٹھوں، دستخطوں اور قرار دادوں کے بل پر "اربابِ اقتدار" سے تھا!
اس سیاست کا عظیم ترین شاہکار ۱۹۵۳ء کی "انٹی قادیانی موومنٹ" تھی جو شروع تو اگرچہ مجلسِ احرارِ اسلام اور جمعیت علمائے ہند کے باقیات الصالحات نے کی تھی لیکن جس میں بعد میں اضطراراً جماعت اسلامی کو بھی اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت شریک ہونا پڑا . اس موومنٹ کا نقد نتیجہ (NET RESULT) یہ نکلا کہ "ارباب اقتدار" کے طبقے سے نسبتاً مخلص اور دیندار عناصر کو دیس نکالا مل گیا اور ملکی سیاست کی باگ ڈور زیادہ شاطر اور عیار لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی اور پھر وہ افراتفری مچی جس کے نتیجے میں بالآخر فوجی حکومت قائم ہو کر رہی۔

دورِ ایوبی کے اواخر میں مذہبی سیاست نے پھر طاقت پکڑنی شروع کی اور اس بار اس نے دو کامیاب چھاپے مارے۔ ایک اوائل ۱۹۶۷ء میں عید الفطر کے موقع پر اور دوسرے اواخر ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر فضل الر حمان کے خلاف ایجی ٹیشن برپا کر کے۔ ان دونوں مواقع پر بھی ملک کے تمام مذہبی عناصر بالکل متحدّ تھے اور بالکل ایسا سماں بندھ گیا تھا کہ ایک طرف حکومت اور برسرِاقتدار طبقہ ہے اور دوسری طرف تمام علماء اور رجالِ دین۔ گویا یہ پاکستان کی مذہبی سیاست کی متذکرہ بالا منطق کا نقطۂ عروج تھا !!

لیکن افسوس کہ مذہبی سیاست کے اس عروج کو ع "خوش درخسید ولے شعلۂ مستعجل بود!" کے مصداق نہایت مختصر عمر ملی اور اواخر ۱۹۶۸ء سے ملکی سیاست ایک بالکل ہی نیا موڑ مڑ گئی۔

اس نئے موڑ کے یوں تو متعدد پہلو ہیں لیکن مذہبی سیاست جس پہلو سے سب سے زیادہ متأثر ہوئی وہ یہ ہے کہ چونکہ ایک طرف سیاسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری طرف موجودہ فوجی حکومت نے کسی مستقل حکومت کی شکل اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی اور کم از کم تا حال اس نے ایک خالص عبوری اور CARE-TAKER قسم کی حکومت کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ لہٰذا "اربابِ اقتدار" اور "برسرِاقتدار طبقہ" ایسی اصطلاحات بے معنی ہو کر رہ گئیں اور اس طرح گویا وہ "ہوائی قلعہ" فضا میں تحلیل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جس پر تمام مذہبی جماعتیں مُتحد اور متفق ہو کر حملے کیا کرتی تھیں

نتیجتاً ایک جانب وہ اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہو گیا جس کی بنیاد حبِّ علیؓ کی مثبت اساس کے بجائے بُغضِ معاویہؓ کی منفی بنیاد پر قائم تھی چنانچہ دو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور مذہبی جماعتیں یعنی جماعتِ اسلامی اور جمعیتِ علماء اسلام ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئیں۔ اور دوسری طرف تصادم کا میدان بدل گیا اور مقابلہ "رجالِ دین" اور "اربابِ اقتدار" کے مابین نہ رہا بلکہ اس نے عوامی سطح پر مختلف جماعتوں اور گروہوں کے مابین تصادم کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں اصل جتھہ بندی دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے تحت ہو رہی ہے اور اصل وزن انہی دو پلڑوں میں ہے اور مذہبی جماعتیں پاسنگ کی حیثیت سے ان دونوں اطراف میں بلاواسطہ یا بالواسطہ وزن ڈالنے پر مجبور ہو رہی ہیں!

خالص نظریاتی اعتبار سے تو پاکستانی سیاست کے موجودہ عبوری دور کو جلد ہی ختم ہو جانا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ آئندہ سال کے وسط تک انتخابات اور دستور سازی وغیرہ کے تمام مراحل طے ہو کر عوام کی نمائندہ حکومت کو قائم ہو جانا چاہئے .... لیکن عملاً جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ متذکرہ بالا مراحل میں سے ہر مرحلہ نہایت کٹھن ہے اور دستور سازی کی گھاٹی تو تقریباً ناقابل عبور ہی ہے...... بنابریں موجودہ عبوری دور مستقل نہیں تو کم از کم "عارضی مستقل" ضرور ہے'..... اور چاہے کسی کو پسند ہو یا ناپسند جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاصی طویل مدت تک پاکستان میں عوامی کشمکش ہی کا سلسلہ چلتا رہے گا اور "چار و ناچار" فوج ہی کو پاکستان کی سول ایڈمنسٹریشن کی نگرانی بھی کرنی ہوگی۔ گویا "برسرِاقتدار طبقہ" کا تصور اب ایک طویل عرصے تک مفقود رہے گا اور مذہبی جماعتوں کے اتحاد و اتفاق کی یہ منفی اساس دوبارہ وجود میں نہ آسکے گی!

تاہم کارکنوں کے لہو کو گرم رکھنا ایک ناگزیر جماعتی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایک ایسا ہدف بھی لازم ہے جس پر کارکن مسلسل جھپٹ کر پلٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے رہیں۔ چنانچہ اب کی بار ایک جمعیت علمائے اسلام کو چھوڑ کر بقیہ تمام مذہبی جماعتوں نے اپنی مسلسل چاند ماری کے لئے "سوشلزم" کا ہدف منتخب کیا ہے اور تمام مذہبی جماعتوں کے شعلہ بیان مقررین اپنا زور خطابت اسی ایک محاذ پر صرف کر رہے ہیں اور اگرچہ مختلف مذہبی جماعتوں کو کئی مختلف سیاسی جماعتوں سے علانیہ یا درپردہ سازباز کی بنا پر یہ آپس میں ہرگز متحد نہیں بلکہ اندر ہی اندر ایک دوسرے کی کاٹ میں مصروف ہیں' تاہم کم از کم ظاہری اعتبار سے ان سب کا مشترک ہدف "سوشلزم" ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ " برسرِاقتدار" طبقہ کی طرح یہ تازہ ہدف بھی ہے خالص ہوائی' اس لئے کہ ذرا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں سوشلزم کے علمبردار ہیں کون لوگ؟ جماعتِ اسلامی اور پی ڈی پی تو ہوئیں اصلی اور ٹھیٹھ اسلام پسند' تینوں لیگیں بھی اور چاہے جو کچھ بھی ہوں سوشلسٹ بہر حال نہیں' رہے مسٹر بھٹو تو خود وہ اگرچہ "اسلامی سوشلزم" کا راگ الاپتے ہیں لیکن ان کے تمام سیاسی مخالفین سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہرگز نہیں ہیں بلکہ یا تو سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں یا صرف ایک فاشسٹ نیشنلسٹ...... لے دے کے دو نیپیں (NAPS) رہ جاتی ہیں' جنہیں

سوشلسٹ کہا جاسکتا ہے۔ تو اول تو ان کا حلقۂ اثر ہے ہی کتنا کہ اس قدر شور و ہنگامہ اٹھانے کی ضرورت پڑ گئی پھر ان میں سے بھی ولی خاں گروپ بنیادی طور پر نیشنلسٹ ہے نہ کہ سوشلسٹ۔

ہاں ایک حقیقت ایسی ہے جسے مانے بغیر چارہ نہیں اور وہ یہ کہ اس ملک کے پڑھے لکھے طبقے... اور خاص طور پر ان میں سے بھی ذہین تر عنصر میں سوشلسٹ خیالات قابل لحاظ حد تک موجود ہیں اور نوجوان نسل کا خاصہ قابل لحاظ حصّہ ذہنی اور فکری طور پر اس رو میں بہہ گیا ہے.... اور ان دونوں طبقات میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے مخلص انقلابی کارکنوں کی بھی موجود ہے جو اپنے پیشِ نظر انقلاب کے لیے کبھی ایک اور کبھی دوسرے سیاسی گروہ میں شامل ہو کر کام کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یہ لوگ اس ملک میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تاہم اپنے جوش اور جذبۂ کار اور مخصوص انقلابی تیکنیک کے اعتبار سے یقیناً قابلِ لحاظ ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں بھی دو باتیں سوچنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ لوگ آخر آئے کہاں سے ہیں' ظاہر ہے کہ نہ روس سے در آمد ہوئے ہیں نہ چین سے بلکہ اسی سرزمین کی پیداوار اور اسی قوم کے افراد ہیں اور خاص طور پر ان کی اصل قوت یعنی نوجوان نسل تو ہے بھی قیام پاکستان کے بعد معرضِ وجود میں آنے والی' تو پھر ان میں اس ذہنی بے راہ روی کے پیدا ہونے کی ذمہ داری کس پر ہے اور کیا یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر ان لوگوں پر عائد نہیں ہوتی جو بزعمِ خویش اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی علمبرداری فرماتے رہے لیکن جنہوں نے تمام زور "برسرِاقتدار طبقہ" پر تنقید کرنے میں ضائع کر دیا اور قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کا سارا سرمایہ صرف سیاسی جدّوجہد کے نذر کر دیا اور تعلیم و تربیت کے کام سے یکسر نگاہیں پھیر لیں۔ چنانچہ نہ قوم کی ذہنی و فکری رہنمائی ہو سکی نہ اخلاقی و عملی تربیت' اور صورت یہ ہو گئی کہ نوجوان نسل میں سے جو جتنا زیادہ ذہین تھا اتنی ہی زیادہ تیزی سے الحاد و مادہ پرستی کی جانب جھکتا چلا گیا پھر اگر آج یہ نسل خالص مادہ پرستی کی عینک سے معاملات کو دیکھتی ہے تو آخر قصور کس کا ہے؟ دوسرے مذہبی طبقات کو تو چھوڑیئے کہ سب ہی کا خیال ہے کہ ان میں جدید نسل کی ذہنی رہنمائی کی صلاحیت موجود نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے پاکستان کے تیئس سالوں کے دوران کیا کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک کو اتنی طویل مہلتِ کار کا مل جانا بڑی ہی غیر معمولی خوش قسمتی شمار کی جاسکتی ہے۔ اور تاریخ اس جماعت کا یقیناً شدید محاسبہ کرے گی جسے اتنی مہلت ملی لیکن اس نے اپنے آپ کو دور از کار معاملات میں الجھائے رکھا اور سیاسی مہمیں تو چلائیں لیکن نہ ذہن و فکر کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اور نہ اخلاق و کردار کی وادیوں میں کوئی تبدیلی پیدا کی چنانچہ اب اپنی ہی "غفلتوں کی شاخسانوں" سے دوچار ہے!

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے جیسی کہ آج کل مذہبی طبقات کی طرف سے "سوشلزم" کے مقابلے میں کی جارہی ہے کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اس لئے کہ یہ تو شاید ممکن ہو کہ اس طرح ان سیاسی جماعتوں کی پیش قدمی کو آپ کچھ دیر کے لئے روک دیں جو اپنی حصولِ اقتدار کی جنگ میں پیٹ کے نعرے کو اچھال رہی ہیں لیکن اس کی ہرگز کوئی امید نہیں کی جاسکتی کہ اس طریقے پر کسی ایک ذہن کو بھی بدلا جاسکے اور کسی ایک شخص کے فکر کے رخ کو بھی تبدیل کیا جاسکے۔ گویا یہ سارا "جہاد" ان لوگوں کے خلاف تو شاید کسی حد تک نتیجہ خیز ثابت ہو سکے جنہیں "PSEUDO SOCIALIST" کہا جاتا ہے، لیکن جو لوگ حقیقتہً سوشلسٹ ہیں اور جن کی زندگی کا مقصد ہی سوشلسٹ اور کمیونسٹ انقلاب برپا کرنا ہے اور جو واقعتاً موجودہ انقلابی رو کی ذہنی و فکری رہنمائی کر رہے ہیں ان کے خلاف یہ ساری مہم قطعاً لاحاصل اور بے کار محض ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز کی نعرہ بازی سے ایسے لوگ اپنے موقف پر مزید جازم اور اپنے نقطہ نظر میں مزید پختہ ہوتے چلے جارہے ہیں اور دین و مذہب کا رہا سہا اخلاقی وقار بھی خاک میں ملتا چلا جارہا ہے۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہماری اس بار بار کی مرثیہ خوانی کا حاصل کچھ بھی نہیں اس لئے کہ ملکی سیاست کے میدان میں برسرِ کار مذہبی جماعتوں کے لئے اب طریق کار کی تبدیلی قطعاً ناممکن ہے۔ ان کی ایک بڑی تعداد تو جو کچھ کر رہی ہے اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ جن سے توقع ہو سکتی تھی وہ خود ہی اپنی غلط منطق کے صغریٰ کبریٰ کے جال میں اس درجہ پھنس چکے ہیں کہ اب اس سے ان کا رہائی پانا ممکن نہیں رہا۔ بنابریں اکثر گمان ہوتا ہے کہ ہماری ساری قیل و قال بیکار اور سعی لاحاصل ہے۔

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کیا واقعی اتنے بڑے ملک اور اتنی عظیم قوم میں چند لوگ بھی ایسے

نہیں جو وقتی طور پر سیاست کے اتار چڑھاؤ سے صرفِ نظر کر کے دین و مذہب کی بنیادی اقدار کے احیاء کے لئے بالکل بنیادی اور اساسی کام میں منہمک ہو سکیں .. تو دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ غالباً ساری کی ساری کمی ہمارے اپنے جذب دروں کی 'اور اصل کوتاہی ہمارے بیانِ مطلب اور ادائے مدّعا کی ہے اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بارگاہِ ایزدی میں درخواست کی جائے کہ " ربِّ اشرح لی صدری و یسّرلی امری و احلل عقدۃً من لِسانی یفقھوا قولی !"

ہمارے اسی باطنی اضطراب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بار بار خیال آتا ہے کہ "میثاق" کو بند کر دیا جائے تاکہ سیاسی میدان سے بالکل لاتعلق ہونے کے باوجود محض اس کے صفحات میں جو سیاسی تبصرے کبھی کبھی آجاتے ہیں ان کا سلسلہ بھی بند ہو جائے اور ہم اپنی صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو کامل یکسوئی کے ساتھ صرف علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلّمِ قرآن میں کھپا دیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو گا۔

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

(ماخوذ "میثاق" اکتوبر ۷۰ء)

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت

کے ضمن میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے پر ادارۂ "تکبیر" کراچی کا محاکمہ اور ڈاکٹر صاحب کی وضاحت

۱۔ ہفت روزہ تکبیر، کراچی بابت ۲۱ تا ۲۷ فروری ۸۶ء کے ادارتی نوٹ کا عکس

طریقہ بیعت، ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودیؒ

بانیٔ جماعتِ اسلامی کا اصل موقف ان کے مکاتیب کی روشنی میں

تکبیر کے گزشتہ شمارے میں تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر صاحب نے بیعت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ مولانا مودودیؒ بھی نظامِ بیعت کے حامی تھے اور اس معاملہ میں ان کی فکر بالکل وہی تھی جو آج میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تشکیلِ جماعت سے ۴ ماہ قبل مولانا کی جانب سے حیدرآباد دکن کے محمد یونس صاحب کے نام مارچ ۱۹۴۱ء میں لکھے جانے والے ایک خط کا حوالہ دیا تھا۔ اس خط کے مکمل متن کا جائزہ لیا گیا تو ریکارڈ پر تشکیلِ جماعت سے ٹھیک ۱۰ ماہ بعد ۲۸ جون ۱۹۴۲ء کو انہی محمد یونس صاحب کے نام مسئلہ بیعت ہی پر مولانا محترم کا ایک دوسرا خط بھی موجود پایا گیا جس میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب شخصی بیعت کے داعی ہیں جبکہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ ہے کہ "بیعت کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو بلکہ اسلام کی طرف منسوب ہو تاکہ شخصِ خاص سے وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ جائے۔" ان کے نزدیک "اطاعت نظم کی ہونی چاہیے نہ کہ کسی شخصِ خاص کی۔"

ہم قارئین کی رہنمائی اور دلچسپی کے لئے مولانا مودودیؒ کے ان دونوں خطوط کا متن شائع کر رہے ہیں تاکہ وہ بیعت کے مسئلہ پر مولانا مودودیؒ کے نقطۂ نظر سے پوری طرح باخبر ہو سکیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور مولانا مودودیؒ کے نقطۂ نظر کا فرق ان پر واضح ہو جائے گا اور اس سلسلہ میں کسی غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ رہے

۲۔ مولانا مودودی مرحوم کے خطوط (غیر متعلق حصے حذف کر دیئے گئے ہیں

لاہور

مارچ ۱۹۴۱ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہو رہا ہو۔ جیسے بیعت رضوان تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہل مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ اس مہم میں آپ کے ساتھ جان فروشی کریں گے۔

۲۔ دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت تھی جو بالعموم اس شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبی کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبی کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقۂ نبوی کا صحیح علم بھی رکھتا ہو، اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً کوئی دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

۳۔ تیسری بیعت وہ ہے جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع ہے، اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ "من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ" اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں سے مراد تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

صوفیائے کرام میں جو بیعت رائج رہی ہے وہ دوسری قسم کی ہے اور وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے اگر کوئی شخص دین کا علم حاصل کرے اور احکام کو سمجھ کر ان کی پیروی کرنے کی کوشش کرے بغیر اس کے کہ کسی روحانی مربی کی بیعت اس کی گردن میں ہو، تو وہ نہ کوئی گناہ کرتا ہے نہ آخرت میں اس سے کوئی بازپرس اس امر کی ہوگی کہ اس نے کسی پیر کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑا۔ البتہ اگر کوئی دیندار، متبع شریعت، صاحبِ اخلاقِ فاضلہ شخص اس کو مل جائے جس کی زندگی کو دیکھ کر اسے یقین ہو جائے کہ فی الواقع وہ جانشینِ پیغمبر ہونے کا شرف رکھتا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لینا فائدہ سے خالی نہیں ہے بشرطیکہ بیعت کرنے والا خود بھی دین کا علم رکھتا ہو اور اپنے شیخ کا اندھا مقلد نہ ہو اور شیخ سے بشری کمزوری کی بناء پر اگر شریعت کے خلاف کچھ باتیں سرزد ہو جائیں تو مرید عقیدت مندی میں ان غلط باتوں میں بھی شیخ کی پیروی کرتا نہ چلا جائے۔ رہی موجودہ زمانہ کی پیری مریدی جس میں اصلاح و ارشاد کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا بلکہ بزرگوں کی گدیوں پر بیٹھ کر ان کے نالائق، بے علم، بداعمال جانشین اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بناتے ہیں اور لوگوں کو اس دھوکہ میں ڈالتے ہیں کہ بس ہمارا ہاتھ پکڑ لینے کے بعد تمہارے لئے جنت واجب ہو جائے گی اور مریدوں سے اس طرح نذرانے وصول کرتے ہیں کہ گویا کہ وہ زمیندار ہیں اور اپنی اسامیوں سے لگان وصول کر رہے ہیں تو ایسی پیری مریدی کا واجب ہونا تو درکنار یہ جائز بھی نہیں ہے یہ تو ایک معصیت

ہے۔ بلکہ میرے نزدیک اس کا شمار کبائر میں ہے۔ میں ان
پیروں کو بدترین مجرم اور ان کے مریدوں کو سخت گمراہ سمجھتا
ہوں۔ اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو میں بجبر اس گمراہی
کو روک دیتا۔

اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن
دونوں ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک تعلق رکھتی ہیں۔

اعتقاد نام ہے اس رائے یا خیال کا جس پر آدمی پختگی کے
ساتھ قائم ہو۔ اور اس رائے یا خیال کے مطابق کام کرنے کا
نام عمل ہے۔ ان دونوں کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ
دونوں مل کر ایک زندگی بناتے ہیں اور صحیح اعتقاد اور
عمل میں مطابقت کا نام ہی اسلامی زندگی ہے۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

لاہور
۲۸ جون ۱۹۴۲ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کی غلط فہمی
کسی حد تک رفع ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ ایک چیز تو طریقہ
بیعت و ارشاد کی روح ہے اور دوسری چیز وہ خالص
ہیئت و شکل ہے جس میں یہ طریقہ صدیوں سے متوارث
چلا آ رہا ہے۔ جہاں تک اس کی اصلی روح کا تعلق ہے
وہ بالکل برحق صحیح اور پاک ہے مگر جہاں تک اس کی
ہیئت و شکل کا تعلق ہے وہ گمراہ کرنے والے پیروں
اور جاہل مریدوں کے غلط طرز عمل کی وجہ سے اس قدر
انحطاط کی شکار ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے
خراب لوازم اس قدر خلط ملط ہو گئے ہیں کہ اصل روح
نہ صرف یہ کہ اس کے اندر باقی نہیں رہی بلکہ جہاں نیک
نیت لوگ اس ہیئت و شکل میں کوئی صحیح خدمت
بھی کرتے ہیں وہاں بھی بہت جلد ہی اس کے خراب
لوازم عود کر آتے ہیں۔ اس بنا پر میری یہ رائے ہے کہ
پیری مریدی کی وہ خاص شکل بدل دی جائے اور اس
کے بجائے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں
سلسلہ بیعت و ارشاد کی اصل روح تو موجود ہو مگر وہ خراب
لوازم اور اختلافات نہ ہوں۔ میں نے بہت غور و خوض
کے بعد جو صورت تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اولاً ہاتھ
میں ہاتھ دے کر بیعت نہ لی جائے بلکہ صرف زبانی عہد
لیا جائے۔ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں
سے لیا کرتے تھے۔ ثانیاً سلسلہ کسی شخص کی طرف منسوب
نہ ہو۔ بلکہ "اسلام" کی طرف منسوب ہو تاکہ شخص خاص کی
وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ سکے۔
ثالثاً تزکیۂ نفس اور اجرائے احکام اور اقامت نظم و
انضباط وغیرہ کا کام جس شخص کے ہاتھ میں ہو وہ
اس کی ذاتی حیثیت میں نہ ہو بلکہ جماعت کا سردار
ہونے کی حیثیت میں ہو۔ حتیٰ کہ جب ایک شخص سرداری سے ہٹ جائے اور
دوسرا شخص اس کی جگہ آئے تو لوگوں کی اطاعت و وابستگی
بھی پہلے شخص سے ہٹ کر دوسرے شخص کی طرف منتقل
ہو جائے۔ نہ یہ کہ لوگ اسی شخص خاص کے گرویدہ رہیں
جس کے ہاتھ پر ابتداً انہوں نے عہد کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں
خلفائے راشدین کے دور کی تنظیم سے میں نے اخذ کی
ہیں۔ ان کے مبارک دور میں اسلامی جماعت اسلام کی طرف
منسوب تھی نہ کہ صدیق رضی یا فاروق رضی یا عثمان رضی یا علی رضی اللہ
عنہم کی طرف۔ اسی طرح لوگوں کی وابستگی شخص صدیق رضی
یا شخص فاروق رضی سے نہ تھی بلکہ امیر المومنین سے تھی جو بھی
وقت کا امیر ہو۔ اور اطاعت نظام کی تھی نہ کہ شخص خاص کی۔

آپ نے "جماعت اسلامی" میں اپنے آپ کو تیسرے
درجہ کی ممبری کے لیے پیش کیا ہے اللہ آپ کو درجہ دوم
بلکہ درجہ اول تک ترقی کرنے کی توفیق بخشے . . . .

خاکسار
ابوالاعلیٰ مودودی

۲۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی وضاحت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی مدیر "تکبیر" السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

"تکبیر" کی اشاعت بابت ۲۱ تا ۲۷ر فروری ۸۶ء میں "بیعت" سے متعلق میرے انٹرویو میں وارد شدہ ایک رائے کا محاکمہ مولانا مودودی مرحوم کے دو خطوط کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں یہ چند سطور پیش خدمت ہیں، جن کی حیثیت ایک جانب "ذاتی وضاحت" کی ہے اور دوسری جانب ایک واقعاتی تحقیق کی۔ امید ہے آپ ان کی اشاعت کے لئے گنجائش نکال لیں گے۔

میرا تنظیم اسلامی کے لئے "بیعت" کے نظام کو اختیار کرنا ہرگز اس دلیل پر مبنی نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم اس کے قائل تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے علم میں مولانا کا موقف تو اتفاقاً آج سے صرف تین چار سال قبل حیدر آباد دکن کے مولانا محمد یونس مرحوم کے نام مولانا مرحوم کے کتابی شکل میں شائع شدہ خطوط کے ذریعے آیا۔ جبکہ میرا یہ ذہن کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ "بیعت جہاد" اور "بیعت سمع وطاعت فی المعروف" کی اساس پر قائم ہونا چاہئے، جماعت سے علیحدہ ہونے کے دو سال بعد ہی اوائل ۱۹۵۹ء میں بن چکا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ میری ذاتی رائے تھی جسے میں اپنے بزرگوں پر کسی طرح مسلط نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا جب ۱۹۶۷ء میں رحیم یار خان میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے بعض حضرات کا اجتماع ہوا اور اُس میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہو گیا اور اس کے لئے تنظیمی ڈھانچہ طے کرنے کے لئے سات افراد پر مشتمل ایک مجلس مقرر کر دی گئی تو اگرچہ میں بھی اُن سات میں کا "ساتواں" تھا لیکن مجھے ہرگز یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ اس تنظیم کی اساس بیعت پر ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اُن سات افراد میں ہر اعتبار سے اوّلین اور اہم ترین شخصیت مولانا امین احسن اصلاحی کی تھی جن کے مزاج سے میں بخوبی واقف تھا تاہم میں چونکہ دوسرے مروجہ طریق ہائے تنظیم کو بھی حرام نہیں بلکہ مباحات میں سے سمجھتا ہوں لہٰذا میں ذہناً اس کے لئے بالکل تیار تھا کہ نظام خواہ کوئی بھی ہو اگر اقامتِ دین کے لئے

طریق کار درست ہو تو لازماً شریک ہوں گا۔ ...... یہ دوسری بات ہے کہ یہ بیل منڈھے تو کیا
پڑھتی سرے سے اُپج ہی نہ سکی‘ ...... اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں میں نے تنظیم اسلامی کے قیام کا
فیصلہ کیا تو اس کے لئے قرار دادِ تاسیس بھی وہی رکھی جس پر ۱۹۶۷ء میں اتفاق ہوا تھا اور نظامِ
جماعت کے معاملے کو بھی کھلا (OPEN) رکھا کہ تین سال تک میری حیثیت صرف داعی
(CONVENOR) کی ہوگی ..... اور اس عرصے کے دوران جو حضرات قرار دادِ تاسیس پر اتفاق
کرتے ہوئے جمع ہو جائیں گے وہ باہمی مشورے سے مستقل نظام طے کریں گے! ...... لیکن
جب اڑھائی سال انتظار کے بعد بھی بزرگوں میں سے کسی نے پیش قدمی نہیں فرمائی تو بالآخر میں
نے جولائی ۱۹۷۷ء میں ساتھیوں کے سامنے اپنا ذہن کھول کر رکھا۔ نتیجتاً "بیعت" ہی کو
تنظیم کی مستقل اساس کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔

اس کے بعد جب ۸۳۔ ۱۹۸۲ء میں "خطوط کے چراغ" نامی کتاب حیدر آباد دکن
سے آئی اور اُس سے معلوم ہوا کہ مارچ ۱۹۴۱ء کے خط میں مولانا مودودی مرحوم نے بالکل وہی
بات فرمائی تھی جس کا میں قائل ہوں تو اس پر فطری طور پر مجھے خوشی بھی ہوئی کہ ع "متفق
گردید رائے بو علی با رائے من!" اور اپنی بات پر مزید اطمینان بھی ہوا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا
موقف مولانا مرحوم کی رائے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے مطالعہ کے مطابق قرآن حکیم اور سنّت و سیرتِ
رسولؐ کی محکم اساسات اور امّت کے طویل تعامل پر قائم ہے!۔

البتہ جہاں تک علمی اعتبار سے مولانا مودودی مرحوم کے موقف کی تحقیق کا سوال ہے تو
جو خطوط آپ نے شائع کئے ہیں ان میں حسب ذیل امور پر معروضی طور پر توجہ کی ضرورت
ہے ......

(۱) ...... مولانا مرحوم کا مارچ ۱۹۴۱ء والا خط نہایت واضح ہے‘ ...... اس میں انہوں نے
بیعت کی بظاہر تین لیکن حقیقتاً چار اقسام بیان کی ہیں‘ ایکؔ خاص مواقع پر خاص کاموں کے
لئے کی جانے والی بیعت۔ (۲) ...... بیعتِ ارشاد و سلوک اور (۳) ...... بیعتِ نظم و
جماعت‘ اس آخری بیعت کے ضمن میں دُو بار مولانا نے "امیر یا امام" کے الفاظ التزاماً
استعمال کئے ہیں جن سے (جیسا کہ بعض دیگر شواہد سے ثابت ہو گا جن کا ذکر بعد میں آئے
گا) اس کی دو قسمیں بنتی ہیں یعنی ایکؔ یہ کہ اگر صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو اُس کے سربراہ سے
بیعت اور دوسری اس صورت میں کہ صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو اُس کے لئے جدوجہد
کرنے والی جماعت کے امیر سے بیعت!۔

(۲)...... اس کے بعد مولانا نے دوسری قسم کی بیعت یعنی بیعتِ ارشاد و سلوک کے بارے میں یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے...... اور پھر اس میں دورِ حاضر میں جو خرابیاں در آئی ہیں اُن پر شدید تنقید بھی کی ہے...... مجھے اس وقت اس سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہے کہ مولانا کی یہ آراء کس حد تک صحیح ہیں اور کس حد تک غلط...... یا کس حد تک واقعیت پسندی پر مبنی ہیں اور کس حد تک انتہا پسندی کی مظہر!...... اس لئے کہ میری ساری گفتگو مولانا کی بیان کردہ تیسری قسم کی بیعت سے ہے' جسے میں نے مزید دو اقسام میں منقسم قرار دیا ہے۔

(۳)...... اب آیئے مولانا مرحوم کے ۲۸ر جون ۱۹۴۲ء کے خط کی جانب تو اس میں اوّلاً مولانا نے پیری مریدی والی بیعت پر دوبارہ اُسی انداز کی بھرپور تنقید کی ہے...... اور ثانیاً اس میں بعض اصلاحات تجویز کی ہیں لیکن اُن کے ضمن میں جو مثالیں دی ہیں وہ کل کی کل خلافت راشدہ سے متعلق ہیں۔ گویا حکومت والی بیعت کا ذکر تو موجود ہے لیکن جماعت والی بیعت کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا...... ثالثاً ...... خلفائے راشدین کی بیعت کے ضمن میں بھی اس حقیقت اور واقعے سے صرفِ نظر کرنا مناسب سمجھا ہے کہ وہاں ہر بار نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی اور سابق خلیفہ کی بیعت از خود نئے خلیفہ کو منتقل نہیں ہو جاتی تھی۔ رابعاً...... اس ضمن میں ہاتھ میں ہاتھ نہ لینے کے سلسلے میں خواتین کی بیعت کا ذکر کیا ہے لیکن مصافحہ کی حد تک جائے بغیر دونوں طرف سے ہاتھ بڑھانے...... یا ایک برتن میں پانی ڈال کر اُس میں ایک جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دستِ مبارک کو ڈالنا اور دوسری جانب بیعت کرنے والی خاتون یا خواتین کے ہاتھ ڈالنے کا تذکرہ تک نہیں کیا...... (حالانکہ تفہیم القرآن جلد پنجم میں سورۃ الممتحنۃ کے ذیل میں یہ ساری باتیں بیان ہوئی ہیں!)

(۴)...... ان دونوں خطوط کے مابین جو فرق و تفاوت ہے اس کی حقیقت تک رسائی کے لئے اس واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس عرصے کے دوران میں جماعت اسلامی بالفعل قائم ہو چکی تھی اور مولانا مودودی اس کے امیر قرار پا چکے تھے...... لیکن اُس کی روداد یا دستور میں 'بیعت' کی کسی قسم کا ذکر...... یا اُس کی کسی اصلاح یافتہ شکل کا حوالہ تو در کنار سرے سے 'بیعت' کا لفظ ہی کہیں استعمال نہیں ہوا!...... سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟...... راقم کا موقف یہ ہے کہ ایسا اس لئے ہوا کہ کسی سبب سے مولانا قیامِ جماعت کے وقت نظمِ جماعت کے ضمن میں اپنے اصل ذہن اور فکر کو بروئے کار نہیں لا سکے!...... چنانچہ ان

کی یہی ذہنی الجھن اس غلط بحث کا سبب بنی ہے جو جون ۴۲ء والے خط میں نظر آرہا ہے!۔
(۵) ...... رہا یہ سوال کہ وہ سبب کیا تھا جس کے باعث مولانا مرحوم اپنے اصل ذہن و فکر کو بروئے کار نہیں لاسکے تو اس کا جواب اس حقیقت کے حوالے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ مولانا ہمیشہ اس کے قائل رہے کہ جماعت اسلامی کے امیر کو ویٹو کا اختیار حاصل ہونا چاہئے۔ چنانچہ ۴۶ء کے اجتماع الٰہ آباد کے موقع پر اس مسئلے پر شدید بحث ہوئی اور اس مسئلے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی مخالفت کے باعث اس درجہ تلخی پیدا ہو گئی کہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ یہ اکٹھ قائم نہیں رہے گا اور جماعت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ بعض حضرات پر (بشمول مولانا مسعود عالم ندویؒ) گریہ بھی طاری ہو گیا تھا...... بہرحال اُس وقت مولانا نے مصلحت اس میں سمجھی کہ جماعت کے ٹوٹنے کے خطرے کو مول نہ لیا جائے اور کوئی صورت مصالحت کی نکال لی جائے۔ اس لئے کہ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا علی میاں سمیت بہت سے علماء تو جماعت سے پہلے ہی علیحدہ ہو چکے تھے اب مولانا اصلاحی اور بعض دوسرے علماء کی علیحدگی سے جماعت کی دینی حیثیت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا...... چنانچہ ایک نہایت پیچ در پیچ فارمولا وضع کیا گیا۔ جس کی حیثیت خالص نظری رہی۔ اس طرح وہ بحران تو ٹل گیا لیکن چونکہ اس طرح انسان کا ذہن اور مزاج تو نہیں بدل سکتا لہٰذا مولانا کا طرزِ عمل مسلسل یہ رہا کہ وہ جب بھی کوئی نیا قدم اٹھانا چاہتے تھے اپنی صوابدید کے مطابق اُس کا آغاز کسی جلسۂ عام سے کر دیتے تھے اور بعد میں مجلس شوریٰ اس مخمصے میں گرفتار ہو کر رہ جاتی تھی کہ اب امیر جماعت کے اقدام سے براءت کیسے کرے!...... تا آنکہ ۵۷۔ ۵۶ء کا بحران آیا اور اُس موقع پر مولانا نے ماچھی گوٹھ میں منعقدہ اجتماعِ ارکان میں فرمایا کہ میری راہ کی بعض مشکلات ایسی ہیں جن کی بناء پر میں امارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر انہیں دور کر دیا جائے تو البتہ میں یہ ذمہ داری سنبھال سکتا ہوں۔ اور وہ وجوہات ایسی ہیں کہ میں انہیں تمام ارکان کے سامنے نہیں رکھنا چاہتا لہٰذا ہر حلقے سے دو دو افراد کا انتخاب عمل میں لایا جائے تاکہ میں اُن کے سامنے اپنی مشکل بیان کر سکوں...... اُس اجتماعِ نمائندگان کے سامنے مولانا نے اس دستوری پیچیدگی کو بیان کیا اور دستورِ جماعت میں ترامیم کرالیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی اُن منتخب حضرات میں شامل نہیں تھے البتہ مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہو گئے تھے چنانچہ ان کے سامنے یہ معاملہ پہلی بار کوٹ شیر سنگھ میں منعقدہ اجتماعِ مجلسِ شوریٰ میں آیا۔ چنانچہ وہ اسی وقت اٹھ کر روانہ ہو گئے اور لاہور پہنچ کر انہوں نے جماعت کی رکنیت سے استعفاء دے دیا...... اور بعد میں جو تلخ خط و کتابت مولانا مرحوم اور مولانا

اصلاحی کے مابین ہوئی اُس میں انہوں نے یہ الفاظ بھی لکھے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ میں بلّی کو مار چکا ہوں مجھے کیا معلوم تھا کہ اُسے آپ نے تھیلے میں چھپا لیا تھا...... اور اب اپنے "خلوتیانِ راز" کے سامنے اُسے تھیلے سے نکال باہر کیا ہے!...... کوٹ شیر سنگھ کے اجتماع میں مولانا مودودی مرحوم نے جو تقریر کی تھی اُس کا لبّ لباب یہ تھا کہ جمہوریت یا شورائیت کے تقاضے حکومت اور ریاست کی سطح پر کچھ اور ہوتے ہیں اور تحریک اور جماعت کی سطح پر کچھ اور! مولانا کے ۱۹۵۰ء کے اِن الفاظ کا تعلق مارچ ۱۹۴۱ء کے خط میں مستعمل الفاظ "امیر یا امام" سے جڑتا ہے...... اور یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے............ کہ مولانا کا ذہن اصلاً یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے امیر کے پاس ویٹو کا حق ہونا چاہئے...... اور اس کے ساتھیوں کو اُس سے "سمع و طاعت فی المعروف" کے تعلق میں منسلک ہونا چاہئے...... اور مشورہ و مشاورت کو اصلاً ساتھیوں کا 'حق' نہیں بلکہ امیر کی ضرورت اور ساتھیوں کا 'فرض' قرار دینا چاہئے...... البتہ معروف کے دائرے کے اندر اندر کسی بھی مشورے کو قبول یا ردّ کر دینے کا اختیار 'امیر' کے پاس ہونا چاہئے......

میں اس موقف کو نہ صرف کتاب و سنّت کے نصوص اور امّت کے مسلسل تعامل بلکہ اقامتِ دین کی انقلابی جدوجہد کے تنظیمی تقاضوں کی مصلحتوں کے اعتبار سے بھی صدفی صد درست سمجھتا ہوں...... اور اس کا اعلان بھی میں نے تحریری صورت میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کے موقع پر جولائی ۱۹۷۲ء میں کر دیا تھا...... دس سال بعد ۸۲ء میں جب مولانا کا مارچ ر ۴۱ء والا خط پڑھنے میں آیا تو اُس سے راقم کو یقین ہو گیا کہ مولانا مرحوم کا ذہن بھی یہی تھا جسے وہ اپنے بعض با اثر ساتھیوں کی مخالفت کی بنا پر پورے طور پر بروئے کار نہ لا سکے۔ بہرحال کسی کو اس اندازِ فکر سے اتفاق ہو یا اختلاف...... ہمارا اخلاقی فرض یہ ہے کہ حقائق و واقعات کو اُن کے اصل تناظر میں رکھ کر اُن کا حتی الامکان معروضی مطالعہ کریں...... اور کسی کو بھلا لگے یا برا، جو حقائق بھی سامنے آئیں اُن کے علی الاعلان اظہار سے دریغ نہ کریں......

فقط والسلام'

لاہور...... ۲ر مارچ ۸۶ء

خاکسار............ اسرار احمد عفی عنہ

(نوٹ: افسوس کہ تکبیر نے راقم کی یہ وضاحت پوری شائع نہیں کی۔ بلکہ اس کا صرف خلاصہ شائع کیا۔)

مولانا محمد منظور نعمانی

قربِ الٰہی کے دو راستے [1]

اہل ایمان کے لئے تقرب الی اللہ اور دینی و روحانی ترقی کے دو طریقے اور دو راستے ہیں جو ہمیشہ سے کھلے ہوئے ہیں اور بندگانِ خدا ہر زمانہ میں کم و بیش ان ہی پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچتے رہے ہیں۔

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی ہی اصلاح و ترقی اور اپنے ہی نفس کے تزکیہ و تحلیہ میں زیادہ سے زیادہ ساعی رہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی اور معصیات و مکروہات سے اپنے نفس کی حفاظت کا بیش از بیش اہتمام کرتے ہوئے جس قدر بھی ممکن ہو نفلی عبادات و قربات روزہ و نماز اور ذکر و فکر وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہے۔ بعض ائمہ محققین کی اصطلاح کے مطابق اس طریقہ کو "قرب بالنوافل" کہا جاسکتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی اور معصیات و مکروہات سے پرہیز گاری کا اہتمام کرتے ہوئے اور اوقات میں گنجائش کے مطابق نفلی عبادات و قربات اور ذکر و فکر میں بھی خاص اشغال رکھتے ہوئے اپنا زیادہ وقت اخلاص نیت کے ساتھ (یعنی محض رضاء الٰہی اور اجر اخروی کو مطمح نظر بنا کر) دوسرے بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت، تعلیم و تربیت اور تبلیغ و نصیحت جیسے کاموں میں اور اعلاء کلمۃ الحق و احیاء شریعت کی کوششوں میں صرف کیا جائے۔

اس طریقہ کو "قرب بالفرائض" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور اگرچہ اسلام کے قرونِ اولیٰ میں سالکینِ راہ رضا اور طالبین قرب مولیٰ کیلئے یہی عام شاہراہ تھی۔ لیکن بعد کے زمانوں میں کچھ خاص اسباب کی وجہ سے اس راہ پر چلنے والوں کی کثرت نہیں رہی بلکہ معاملہ معکوس ہو گیا۔ یعنی اہل سلوک کے مختلف حلقوں میں زیادہ تر پہلے ہی طریقہ کو اختیار کیا گیا اور اس سے بھی بڑا اور افسوسناک ذہنی تغیر یہ ہوا کہ بہت سے خانقاہی دائروں میں سلوک الی اللہ اور تقرب خداوندی کو صرف اسی پہلے طریقہ (قرب بالنوافل) ہی میں منحصر بھی سمجھا جانے لگا۔ اور

---

[1] اس مضمون کے سلسلے میں ایک اہم نوٹ مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں

ان لوگوں کے خیال میں روحانی و دینی کمال صرف قرب بالنوافل ہی کا نام رہ گیا۔

مختلف زمانوں میں مصلحین و مجددین نے اس غلط خیالی کو محسوس کر کے اس کی اصلاح کی کوششیں بھی کیں لیکن پھر بھی بہت سے خاص و عام حلقوں میں یہ غلط فہمی اب تک چلی آرہی ہے...... [1] جس کا افسوسناک اور نہایت مضرت رساں نتیجہ یہ ہے کہ امت کی عمومی تعلیم وتربیت، اصلاح ودعوت اور اقامت دین واحیاء شریعت کا وہ اہم بنیادی کام جو دینی نظام کے لئے گویا ریڑھ کی ہڈی ہے اور دین کی سرسبزی وشادابی جس پر موقوف ہے اور بلاشبہ جس کا اجر اور درجہ بھی اللہ کے نزدیک صرف نفلی عبادات وقربات اور ذکر وفکر میں مشغول رہنے سے بہت زیادہ ہے۔ آج ان عام وخاص حلقوں میں وہ ایک عمومی قسم کا اور معمولی درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے اور دینی وروحانی ترقی کے طالب اور قرب خداوندی کے جویا اپنے اس سفر میں اور اس مقصد کے لئے اس راہ سے چلنے اور اپنے اوقات اور اپنی ہمتوں کو اس رخ پر لگانے کا ارادہ بھی نہیں کرتے جس کی وجہ سے یہ میدان اصحاب ہمت وعزیمت سے خالی اور یہ بازار سرد پڑا ہوا ہے حالانکہ "شہسواروں" کی تگ وتاز کیلئے اصل جولا نگاہ اور "شاہ بازوں" کی پرواز کے لئے اصل فضا یہی تھی۔

یہ کیوں ہے؟ اور یہ عام وخاص حلقے اس غلط فہمی اور غلط عملی میں کیوں مبتلا ہوئے اور کیوں اب تک مبتلا ہیں؟ اگرچہ یہ سوال اور اس کا جواب آج کے ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم اصل مدعا ہی کو سلجھانے کی خاطر اس بارہ میں اتنا عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک عوام الناس کی غلط فہمی کا تعلق ہے سو اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ پہلے طریقہ (قرب بالنوافل) میں چونکہ سالک عوام کی دنیا سے الگ تھلگ رہ کر ہمہ تن عبادت اور ذکر وفکر میں مشغول رہتا ہے اور مشاغل دنیوی میں پھنسے ہوئے عوام اس طرز زندگی کو بے حد مشکل اور انتہائی درجہ کا غیر معمولی کام سمجھتے ہیں اور اس طرح کی مشکل اور غیر معمولی باتوں ہی سے متاثر ہونا اور ان کی خاص اہمیت و وقعت سمجھنا چونکہ عام انسانوں کا مزاج ہے اس لئے یہ بے چارے اسی طریق کو

---

[1] گزشتہ صدیوں میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اور ان کے بعد ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء نے اس غلطی کی اصلاح کی طرف خاص اور مستقل توجہ فرمائی جیسا کہ "مکتوبات امام ربانی" اور "صراط مستقیم" کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔

قربِ الٰہی اور خدارسی کا خاص الخاص راستہ سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس طریق پر چلنے والوں سے خوارق وکشوف وغیرہ کا ظہور بھی نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے بھی خیال عام اسی طریق کو خدارسی کا خاص راستہ اور اسی طرزِ زندگی کو سب سے بڑا دینی وروحانی کمال سمجھتا ہے۔
رہے اس خیال کے خواص یعنی خود اہلِ سلوک کے وہ حلقے جو اس غلطی میں مبتلا ہیں اور سلوک الی اللہ کو اسی طریق میں منحصر سمجھتے ہیں۔ سو اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ جن میں سے ایک عمومی اور اس جگہ قابلِ ذکر وجہ یہ بھی ہے کہ اس طریق (قرب بالنّوافل) میں یکسوئی کے ساتھ کثرتِ ذکر وفکر سے سالک کے باطن میں ایک گونہ لطافتُ نورانیت اور مَلاءِ اعلیٰ سے ایک طرح کی خاص مناسبت وموانست پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے اندر کچھ آثار وانوار محسوس کرنے لگتا ہے اور بسا اوقات خاص "احوال وکیفیات" اور "مشاہدات وتجلیات" کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے۔ اور دوسرے طریقہ (قرب بالفرائض) میں چونکہ عوام کے ساتھ بھی اختلاط رہتا ہے اور احوال وکیفیات کا ورود اس میں اس طرح سے عموماً نہیں ہوتا۔ یا بہت کم ہوتا ہے۔ بہرحال پہلے ہی طریقہ کے ساتھ بہت سے اہلِ سلوک کی خصوصی دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے۔

حالانکہ یہ "احوال وکیفیات" اور "مشاہدات وتجلیات" اس فن کے اکابر وائمہ کے نزدیک کوئی خاص مقصدی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا درجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ مبتدیانِ راہِ سلوک کی ہمت افزائی کی جاتی ہے تاکہ شوق وطلب برابر ترقی پذیر رہے اور سعی وجہد کا قدم آگے بڑھتا رہے۔
حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مشہور خلیفہ ملا یار محمد بدخشی کو ایک مکتوب میں انہی "مشاہدات وتجلیات" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

شیخ اجلّ امامِ ربّانی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی فرمودہ اند تلک خیالات تربّی بہا اطفال الطریقہ
"شیخ اجل امامِ ربانی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی نے فرمایا ہے کہ یہ خیالی چیزیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ مکتبِ طریقت کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے"۔

اور ایک دوسرے مکتوب میں جو ملا حاجی محمد لاہوری کے نام ہے ارقام فرماتے ہیں:
احوال ومواجید وعلوم ومعارف کہ صوفیہ را در اثنائے راہ دست میدہند نہ از مقاصد

اندبل اوھام وخیالات تر .ئی .بہا اطفال الطریقۃ[1]

(مکتوب نمبر۳۶)

"جواحوال ومواجید اور علوم ومعارف صوفیہ پر اثناء سلوک میں وارد ہوتے ہیں وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ اوھام وخیالات کے قبیل کی چیزیں ہیں جن کے ذریعہ مکتب طریقت کے بچوں کو تربیت دی جاتی ہے۔"

بہرحال یہ انوار وتجلیات اور یہ احوال وکیفیات جن کا ورود "قرب بالنوافل" کے راستہ سے چلنے والے بہت سے سالکوں پر ہوتا ہے اگرچہ وسیلۂ تربیت اور ذریعۂ ترقی ہونے کی حیثیت سے قابلِ شکر انعاماتِ الٰہیہ ہیں، تاہم نہ یہ خود مقصود ومطلوب ہیں اور نہ ایسی دولت ہیں جس کے لئے "قرب بالفرائض" کا راستہ چھوڑ کر "قرب بالنوافل" ہی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

حضرت امام ربانیؒ ایک مکتوب میں خاص اپنے متعلق ارقام فرماتے ہیں۔

"ایں فقیراز نقد وقت خود می نویسد کہ مدتہا از علوم ومعارف واز احوال ومقامات در رنگ ابر نیساں ریختند وکارے کہ باید کرد بعنایت اللہ سبحانہ کردند۔ والحال آرزوئے نہ ماندہ است الا آں کہ احیائے سنت از سننِ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات نمودہ آید واحوال ومواجید ارباب ذوق را مسلم باشد"

(مکتوب ۳۷ جلد ۱)

"یہ فقیر خود اپنی حالت لکھتا ہے کہ مدتوں علوم ومعارف اور احوال ومقامات ابرِ نیساں کی طرح برسے اور ان کا جو نتیجہ نکلنا چاہئے تھا اللہ تعالیٰ کی عنایت سے وہ

---

[1] حضرت مجددؒ کی ان عبارات کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ "احوالُ کیفیات" اور "مشاہدات وتجلیات" شیطانی قسم کے وساوس واوھام ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے (جیسا کہ خود حضرت مجدد ہی نے اسی مکتوب میں آگے چل کر وضاحت فرمائی ہے) یہ بھی ایک درجہ میں انعامات الٰہیہ ہیں اور سالک کو ان سے بہت کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ان سے ہمت افزائی ہی کا کام لیا جائے۔ اور سالک انہی کو مقصود ومنتہا سمجھ کر ان میں پھنس کر نہ رہ جائے۔

پورا ہوا اور اب اس کے سوا کوئی ارمان اور آرزو نہیں رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے کسی سنت کا احیاء کیا جائے اور اس کو رواج دیا جائے اور احوال و مواجید اربابِ ذوق کو مبارک ہوں۔"

قرب بالفرائض کی ترجیح و فضیلت کے وجوہ.......... "قرب بالفرائض" کے طریقہ اور اس سلسلہ کے مشاغل (مثلاً خدا فراموش انسانوں میں تبلیغ و دعوت، جاہلوں ناواقفوں کی تعلیم و تربیت اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کے لئے جدّوجہد وغیرہ) کو "قرب بالنوافل" کے طریقہ کے مقابلہ میں ترجیح و فضیلت کی یہ وجہ تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے خاص مشاغل و وظائف ہیں۔ اور حضرات انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) خاص انہی کاموں کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ پس اپنی قوتوں اور اپنی ہمتوں کو انہی کے طریقے پر اخلاص و احتساب کے ساتھ ان کاموں میں لگانا، اور اسی جدّوجہد کو اپنا خاص وظیفۂ حیات بنالینا ان مقدّس و برگزیدہ ہستیوں کی خاص نیابت بلکہ ایک طرح سے ان کی رفاقت اور ان کے مقصد، ان کی فکر اور ان کے درد میں شرکت ہے اور ایک غیر نبی کے لئے اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں اس طریقہ کا فیض متعدّی ہے کہ اس راہ کا چلنے والا اپنی اصلاح و تکمیل کے ساتھ ساتھ اور سینکڑوں ہزاروں بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت کا بھی ذریعہ بنتا ہے اور اس واسطے صحیح حدیث......

من دلّ علی خیر فلہ مثل اجر فاعلہ۔ (مسلم)

"جو شخص کسی آدمی کو کسی نیکی کی طرف راہ نمائی کرے تو اس شخص کو اس نیکی کے کرنے والے ہی کے برابر الگ ثواب ملے گا۔"

کے مطابق سینکڑوں ہزاروں انسانوں کے بے حساب و بے شمار اعمالِ خیر کے بھی اجر کا مستحق ہوتا ہے۔

نیز یہاں یہ بھی نکتہ خاص طور سے ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ "قرب بالنوافل" کے طریق میں زیادہ سے زیادہ محنت و مجاہدہ کرنے والے اپنے گنے چنے فرائض کے علاوہ صرف اپنی نفلی عبادات و قربات ہی کا سرمایہ جمع کر سکتے ہیں۔ لیکن "قرب بالفرائض" کی راہ پر چلنے والے چونکہ سینکڑوں انسانوں کو ان کے بنیادی فرائض کی تبلیغ و تلقین کرتے اور تعلیم دیتے ہیں اس

لئے ان کے حساب میں اپنے ذاتی فرائض و نوافل کے علاوہ ان سینکڑوں آدمیوں کے فرائض (اور نوافل) کا بھی اجر لکھا جاتا ہے۔ اور یہ معلوم و مسلّم حقیقت ہے کہ فرائض کا اجر نوافل سے بدرجہا زیادہ ہے اور نفسِ ایمان و اسلام کا درجہ تو یقیناً فرائض و نوافل سب سے زیادہ ہے۔
پس اللہ کا جو بندہ "قرب بالفرائض" کی راہ اختیار کر کے خدا اور رسولؐ سے بیگانہ اور حقیقتِ ایمان و اسلام سے نا آشنا قسم کے جاہلوں اور غافلوں میں تبلیغ کر کے اور ان کو تعلیم و تربیت دے کے دین سے آشنا کرتا ہے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں ان لوگوں کے نفس ایمان و اسلام کا اجر بھی لکھا جاتا ہے۔ بے شک اللہ کے سوا کوئی نہیں، جو اس اجر بے حساب کا حساب بھی لگا سکے۔

نیز "قرب بالنوافل" کے طریق میں صرف اپنی زندگی تک ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جہاں موت نے روح کو جسم سے لگ کیا اور سلسلۂ عمل ختم ہوا۔ ترقی بھی ختم ہو جاتی ہے مگر "قرب بالفرائض" کی راہ میں جب تک اس کے دینی و علمی فیض کا سلسلہ جاری رہے (خواہ وہ واسطہ در واسطہ کی شکل میں قیامت تک ہی جاری رہے) برابر اعمال نامہ میں اندراج ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے درجات میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح وارد ہوئی ہے۔

اور قطع نظر ان تفصیلات سے، سب سے اہم بات وہی ہے جو پہلے عرض کی گئی ہے کہ "قرب بالفرائض" کا یہ راستہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے خواص اصحاب دعوا ریّین کا راستہ ہے۔ اور اس کے مشاغل (تعلیم و تعلّم، دعوت و تبلیغ، اصلاح و ارشاد، اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کی کوشش وغیرہ) ان حضرات کے خاص مشاغل ہیں۔ پس اس طریق کو اختیار کرنے والے اور ان کاموں کو سنبھالنے والے بلاشبہ تمام حضرات انبیاء علیہم السلام کے اور خصوصاً حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی خلفاء ہیں۔ اگرچہ سیاسی نظام اور سیاسی طاقت والی خلافتِ ظاہرہ ان کے پاس نہیں ہے۔ لیکن اصل امانتِ نبوی کی حفاظت اور تبلیغ و دعوت اور ماننے والوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ارشاد کا کام بھی بلاشبہ ایک طرح کی خلافتِ نبوّت ہی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ مقصدی اہمیت اس کو زیادہ حاصل ہے۔ اور بروجہ احسن اور وسیع پیمانہ پر انہی مقاصد کی تکمیل کے لئے "خلافت ظاہرہ" مقصود ہوتی ہے۔

نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی غیر سیاسی خلافت (حضرت شاہ ولی اللہ کی اصطلاح کے مطابق "خلافتِ باطنہ") اگر ایک مرکز اور نظام کے ساتھ

ہو تو "خلافتِ ظاہرہ" تک بھی پہنچا دیتی ہے۔ "استخلاف فی الارض"
اور "تمکینِ دینی" کا انعام انہی فرائض اور انہی خدمات کی انجام دہی پر
مرتّب ہوتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور یہی اس کی سنّتِ ازلیہ ہے
بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ "خلافتِ نبوت" کے قیام کا صحیح راستہ
صرف یہی ہے اور اس طریقہ اور اس ترتیب کو چھوڑ کر دوسرے طریقوں
پر جدّوجہد کرنے سے اگرچہ "اپنی حکومت قائم کی جا سکتی ہے لیکن خلافتِ
نبوت قائم نہیں ہو سکتی۔ والتفصیل لا یسعہ المقام

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ عرض کرنا یہی تھا کہ "قرب بالفرائض" کی شان بہت علی وارفع ہے اور اس کے مشاغل، تبلیغ و دعوت، تعلیم و تربیت، اصلاح و ارشاد اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کے لئے جدّوجہد وغیرہ کا درجہ اور اجر نفلی عبادات و قربات اور ذکر و فکر ہی میں مشغول و منہمک رہنے سے یقیناً بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً اس دور میں تو اس طریقہ اور ان مشاغل کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ یہ زمانہ ہی عوامی تحریکات اور عمومی و جمہوری دعوتوں کا ہے اور مختلف مادی اور لادینی تحریکیں بے حد تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی عوام کو اپنی طرف جذب کرتی جا رہی ہیں۔ ایسے وقت میں بھی اگر دین کی دعوت، دینی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ارشاد کی جدوجہد وسیع پیمانے پر اور عوامی تحریک کے رنگ میں نہیں کی گئی اور اللہ کے وفادار اور اس کی رضا کے طلب گار بندے خدمتِ دین کے اس عمومی میدان میں نہ اترے تو دین کی امانت کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

امام ابو اسحاق اسفرائینی کا پرجوش اور ولولہ انگیز پیغام رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ ان کے زمانے میں جب عام مسلمانوں کا دین و ایمان بعض خاص گمراہانہ فتنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تو آپ اپنے عہد کے بعض ان اکابر و مشائخ کے پاس پہنچے جو دنیا و مافیہا سے یکسو ہو کر پہاڑوں کے غاروں میں عبادت و مجاہدہ میں مصروف تھے اور کہا (اللہ اکبر کیسے درد سے کہا)......

اکلة الحشیش انتم ههنا و امّة محمد صلّی اللّٰه علیه وسلّم فی الفتن۔

"جنگل کی سوکھی گھاس پر گزارہ کرنے والو! تم یہاں ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی امت گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہے۔"

الغرض یہ کام یعنی مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت اور جاہلوں ناواقفوں کی دینی تعلیم و تربیت اور غافلوں ' نا آشناؤں کو تبلیغ و دعوت کا کام اگرچہ ہر وقت اور ہر حال میں بہت بڑا اور بہت اہم کام ہے اور جیسا کہ تفصیل سے اوپر عرض کیا گیا۔ عنداللہ اس کا درجہ بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور امتیوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کمال اور ترقی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ بقول حضرت مجددؒ۔

"ہیچ کمالے برتبہ دعوت و تبلیغ نہ رسد۔

فان احب عباد الله الی الله من حبب الله الی عباده و حبب عباد الله الی الله و هو الداعی و المبلغ "

(مکتوبات امام ربانی مکتوب ۵۷' ج ۲)

"کوئی کمال دعوت و تبلیغ کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اللہ کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کو اس کے بندوں کا محبوب بنادے اور بندوں کو اللہ کا محبوب بنادے۔ اور وہ داعی اور مبلّغ ہوتا ہے۔"

لیکن بالخصوص ایسے زمانے میں کہ چاروں طرف سے مادیت اور لادینیت کے بادل امنڈ رہے ہوں اور دین سے غفلت و جہالت اور خدا فراموشی کی گھٹائیں نہایت تیزی سے دنیا پر چھائے چلی جارہی ہیں۔ سو ایسے وقت میں تو ان کاموں کی قدر و قیمت اللہ کے یہاں بے حساب بڑھ جاتی ہے۔ حضرت مجددؒ ہی نے کیسی اچھی تمثیل میں فرمایا ہے۔

"مثلاً سپاہیان در وقت غلبہ دشمناں و استیلاء مخالفاں اگر اندک تردد می کنند آں قدر نمایاں میشود و اعتبار مے گردد کہ در وقت امن اضعاف آں در خیز اعتبار نمی آید۔"

(مکتوب نمبر ۴۴)

"مثلاً جو سپاہی دشمن کے غلبہ اور مخالفین کے چڑھ آنے کے نازک وقت میں تھوڑی سی بھی وفادارانہ جدوجہد کرتے ہیں وہ ایسا اعتماد اور امتیاز حاصل کر لیتے ہیں کہ عام امن و سکون کے وقت کئی گنا جانفشانی بھی کریں تو وہ اعتماد و اعتبار پیدا نہیں ہوتا۔"

الحاصل ہر زمانہ میں خاص کر ہمارے اس دور میں دینی و روحانی ترقی اور قربِ الٰہی و رضائے خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ اور شاہراہ "قرب بالفرائض" ہی کا طریقہ ہے اور اس کے مشاغل مثلاً دعوت و تبلیغ' اصلاح و تعلیم اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کے لئے جدوجہد کا درجہ اور اجر یکسوئی کے ساتھ نفلی عبادات اور ذکر و مراقبہ ہی میں منہمک و مشغول رہنے سے

بہت زیادہ ہے۔ لیکن "قرب بالفرائض" کی ان مشاغل کی یہ امتیازی حیثیت اور "قرب بالنوافل" کے مقابلہ میں ان کی یہ عظمت اور فوقیت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کاموں میں اشتغال اخلاص واحتساب اور خشیت وانابت کی صفت کے ساتھ ہو اگر یہ نہیں ہے تو پھر ساری دوڑ دھوپ اور جدّوجہد ایک بے روح عامیانہ تحریک یا ایک پیشہ اور حرفہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (اعاذنا اللہ من ذٰلک) اور ان اوصاف (اخلاص واحتساب) کے حاصل ہونے کا عام آزمودہ اور عادتی ذریعہ ان اوصاف والوں کی صحبت ورفاقت اور تنہائیوں کے اوقات میں ذکر وفکر کی کثرت ہے۔ ان دونوں چیزوں کے اہتمام کے بغیر اخلاص واحسان جیسی کیفیات کا پیدا ہونا اگرچہ عقلاً ناممکن نہیں لیکن عادتاً دشوار اور اہلِ تجربہ کی شہادت کے مطابق شاذ ضرور ہے۔

ضروری استدراک...... اوپر کی سطروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ "قرب بالنوافل" کے طریقہ کو ہم غلط یا غیر شرعی یا غیر فرضی سمجھتے ہیں، ہرگز نہیں! حاشا، ہزار بار حاشا۔ ہماری گزارش کا مدّعا تو صرف یہ ہے کہ "قرب بالفرائض" کا راستہ قابلِ ترجیح اور افضل ہے اور خصوصاً ہمارے اس زمانہ کے حالات اور دینی ضروریات کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے بندے اس طریق کو اختیار کریں اور اپنی ہمتوں کو اسی رخ پر لگائیں۔

نیز ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ فی زماننا ماحول کے عمومی فساد کی وجہ سے اکثر طبیعتوں کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ کچھ مدّت یک سوئی کے ساتھ ذکر وفکر کے بغیر ان پر اخلاص واحسان کا رنگ بھی نہیں چڑھتا سو ایسے حضرات کے لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ تیاری کے طور پر کچھ دنوں اسی طریق پر چلیں لیکن مطمح نظر دین کی خدمت ونصرت ہی کے مشاغل کو بنائیں۔ اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کا اس سے بہتر مصرف اور کوئی نہیں۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عوامی دعوت وتبلیغ اور عوامی تعلیم وتربیت کا یہ کام جس کی طرف اس مضمون میں میں نے خصوصیت کے ساتھ دعوت دی ہے۔ اس سے ہماری مراد خاص متعارف وعظ گوئی نہیں ہے جس کے لئے علمِ دین کی ایک خاصی مقدار ضروری ہے۔ بلکہ حقیقتِ دین سے ناآشنا طبقوں میں دین کا صحیح شعور پیدا کرنا اور کم از کم دین کی بنیادی باتوں کی ان کو تعلیم وتلقین کرنا اور اس درجہ کی عملی اصلاح کی کوشش کرنا اس سلسلہ کا ابتدائی کام ہے جس میں ہر مسلمان اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ نہ کچھ حصہ لے سکتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ خود بھی تعلیم وتربیت حاصل کر سکتا ہے۔

اب ہم اس مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔

عن الحسن مرسلا سئل رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم عن رجلین کانا فی بنی اسرائیل احدھما کان عالما یصلّی المکتوبۃ ثم یجلس فیعلّم الناس الخیر والاخر یصوم النھار و یقوم اللّیل ایّھما افضل؟

قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم فضل ھذا العالم الذی یصلّی المکتوبۃ ثم یجلس فیعلّم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النھار و یقوم اللّیل کفضلی علیٰ ادنا کم

رواہ الدارمی (مشکوٰۃ)

"حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کی بابت سوال کیا جن میں سے ایک دین کا جاننے والا تھا اس کا طریقہ یہ تھا کہ فرض نماز پڑھتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی باتیں بتاتا اور سکھاتا اور دوسرا ہمیشہ دن کو روزے رکھتا اور رات بھر نوافل پڑھتا (حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص جو فرائض ادا کرتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی باتیں بتاتا اور سکھاتا تھا۔ اس قائم اللیل صائم النّہار عابد کے مقابلہ میں ایسی فضیلت رکھتا ہے جیسی کہ تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔"

ملحوظ رہے کہ حضورؐ کے جواب میں جو تمثیل ہے یہ مقدارِ فضیلت میں نہیں ہے بلکہ فضیلت کی نوعیت میں تمثیل و تشبیہ ہے۔

نوٹ

عجیب حسن اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا موضوع ہی پر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یکم مئی ۸۱ء کو تنظیم اسلامی کے پچھلے سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک مفصل خطاب ارشاد فرمایا تھا جسے بعد ازاں "قرب الٰہی کے دو مراتب تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل" کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ قارئین محسوس کریں گے کہ حکمتِ دینی کے اس اہم موضوع پر دونوں بزرگوں کے خیالات میں کامل ہم آہنگی موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خطاب میں اگر دعوتی و تحریکی رنگ غالب تھا تو مولانا منظور نعمانی کا مقالہ ان کے رسوخ فی العلم کا آئینہ دار ہے۔ مولانا نعمانی کا یہ مقالہ ہم ماہنامہ "الحق" کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

ایک عظیم دعا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوتے تو یہ دعا کرتے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ
وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ وَقَوْلُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ
وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ
اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْ لِيْ
مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ
الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ ——— (رواہ البخاری ومسلم)

(اے میرے اللہ! ساری حمد و ستائش تیرے ہی لیے ہے اور تو ہی اس کا مستحق ہے، تو ہی قائم رکھنے والا ہے زمین و آسمان کا اور ان سب چیزوں کا جو ان میں ہیں (یعنی سارے عالمِ علوی اور سفلی کا وجود تیرے ہی ارادہ سے قائم ہے) مولا! ساری حمد و ستائش کا تو ہی مستحق ہے، تو ہی نور ہے زمین و آسمان کا اور ان سب کا جو زمین و آسمان میں ہیں (یعنی سارے عالم میں جہاں بھی نور کی کوئی کرن ہے وہ تیرے ہی نور سے ہے) اور ساری حمد و ستائش تیرے ہی لیے ہے، تو فرماں روا ہے زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کا جو زمین و آسمان میں ہے، ساری حمد و ستائش تیرے ہی لیے سزاوار ہے، تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے، مرنے کے بعد تیرے حضور حاضری اور تیری ملاقات حق ہے اور تیرا فرمان حق ہے اور جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے اور سارے نبی برحق ہیں اور محمدؐ بھی برحق ہیں اور قیامت کا آنا برحق ہے۔ اے اللہ! میں نے اپنے کو تیرے سپرد کر دیا اور میں تجھ پر ایمان لایا اور میں نے تیرا سہارا پکڑ لیا اور پورا بھروسہ تجھ پر کر لیا اور اپنا رخ تیری طرف کر دیا اور (مخالفینِ حق سے) تیری ہی مدد سے میری ٹکر ہے اور میں نے اپنا مقدمہ فیصلے کے لیے تیری ہی بارگاہ میں پیش کر دیا ہے، پس اے میرے اللہ! بخش دے میرے وہ سب قصور جو مجھ سے پہلے سرزد ہوئے اور جو پیچھے ہوئے اور جو میں نے پوشیدہ کیے اور جو علانیہ کیے اور جن کے بارے میں تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، تو جسے چاہے آگے بڑھانے والا ہے اور جسے چاہے پیچھے ڈال دینے والا ہے، تیرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، صرف تو ہی معبود برحق ہے۔

بلاتبصرہ

وسط فروری ۸۹ء میں پاکستان کے قومی سطح کے اخبارات میں اختصار کے ساتھ لیکن روزنامہ 'آغاز' کراچی ـــــ اور روزنامہ 'مرکز' اسلام آباد میں تفصیل کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ جس کے بارے میں ہفت روزہ 'ندا' کے شمارہ بابت ۲۸ر فروری میں مختصر اور شمارہ بابت ۷ر مارچ میں تفصیلی رپورٹ شائع ہو چکی ہے ـــــ چونکہ قارئین 'میثاق' کا حلقہ 'ندا' کے مقابلے میں وسیع تر ہے' لہٰذا دائیں جانب تو روزنامہ 'آغاز' کراچی کی اشاعت بابت ۱۸ر فروری ۱۹۸۹ء کی چھ کالمی جلی سرخی کا عکس شائع کیا جا رہا ہے' اور بائیں جانب روزنامہ 'مرکز' اسلام آباد کی اشاعت بابت ۱۸ر فروری ۱۹۸۹ء کی خبر کا مکمل متن شائع کیا جا رہا ہے:

مزید برآں ہفت روزہ 'ندا' کی رپورٹ کا آخری حصہ بھی ہدیۂ قارئین ہے ـــــ وَھُوَ ھٰذا:

دریں اثناء اس جامع منصوبہ کی تیاری کے فوراً بعد پاکستان کی سراغ رساں ایجنسیوں کو اس کا علم ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کے تمام ہوائی اڈوں پر امیگریشن حکام کو چوکنا کر دیا گیا۔ تاہم ملزم رانا مقبول احمد اپنے مشن کی تکمیل کے لئے گزشتہ روز الصبح پونے تین بجے کینیڈین پاسپورٹ پر کینیڈا سے کراچی پہنچا۔ جہاں سے پون دس بجے صبح جب پی آئی اے کی پرواز نمبر پی کے ۳۰۰ کے ذریعے اسلام آباد پہنچا تو یہاں پر پہلے سے تیار امیگریشن کے عملے نے اسے گرفتار کر کے ایئرپورٹ پولیس کے حوالے کر دیا۔ ابتدائی تفتیش کے بعد

ملزم کو لاہور کلب میں پولیس انٹیلی جنس بیورو اور سپیشل برانچ کے ماہرین پر مشتمل خصوصی ٹیم ملزم کے خلاف تحقیقات کرے گی۔ ادھر علماء دین کے قتل کے لئے بھیجے جانے والے گروہ کے دوسرے ارکان کی گرفتاری کے لئے پولیس اور خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آگئی ہیں۔ ملزم رانا مقبول احمد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اسے اپنا مشن ایک ماہ کے اندر مکمل کر کے واپس کینیڈا جانا تھا۔ اور پاکستان میں قیام کے دوران اس کی بعض اہم شخصیات کے علاوہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے دہشت گرد تنظیم سے آتشیں اسلحہ یا دھماکہ خیز مادہ حاصل کرنا تھا۔ لیکن بروقت یہ راز فاش ہو جانے سے اس گروہ کا مشن پورا نہ ہو سکا اور ملک ایک سنگین بحران کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ ادھر ان ذرائع کا کہنا ہے کہ اس گروہ کی گرفتاری کے بعد علامہ عارف الحسینی کے قاتلوں کا سراغ ملنے میں آسانی ہوگی۔

روزنامہ 'مرکز' اسلام آباد کی چھ کالمی سرخی یہ تھی:

"قادیانی اور یہودی لابی نے ملک کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انارکی اور افراتفری پھیلانے کے لیے تربیت یافتہ گروہ پاکستان بھیج دیئے۔"

"دہشت گردی اور قتل و غارت کا منصوبہ ناکام!"

"ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا طاہر القادری اور ممتاز علمائے کرام کو قتل کرنے کی سازش پکڑی گئی، گروہ کا سرغنہ گرفتار!"

اور مفصل خبر کا 'عکس' حسبِ ذیل ہے:

اسلام آباد (مانیٹرنگ ڈیسک/خلیل احمد سے) سراغ رساں ایجنسیوں نے یہودیوں اور قادیانیوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی جانب سے دو علمائے دین ڈاکٹر اسرار احمد اور علامہ طاہر القادری کو قتل کرا کے ملک میں انتشار پھیلانے کی بھیانک سازش کا سراغ لگاتے ہوئے اس مقصد کے لیے پاکستان بھیجے جانے والے ایک پاکستانی نژاد کینیڈین کو اسلام آباد کے ہوائی اڈے سے گرفتار کر لیا جبکہ دہشت گردوں کے اس گروہ کے باقی ارکان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں یہ گروہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ایک سپر پاور سے دہشت گردی کی چھ ماہ کی خصوصی تربیت مکمل کر کے پاکستان آیا ہے ملزم کو ابتدائی تفتیش کے بعد مزید تحقیقات کے لیے لاہور بھیج دیا گیا ہے جہاں خفیہ ایجنسیوں اور پولیس ماہرین پر مشتمل خصوصی ٹیم تحقیقات کرے گی دہشت گرد تنظیم کے ان ارکان کے مختلف بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی سازش کا انکشاف ہو گیا ان ذرائع کے مطابق پاکستان کی نامور دینی شخصیات ڈاکٹر اسرار احمد، علامہ طاہر القادری، مرزائیت کے خلاف تحریک میں پیش پیش تھے اور بین الاقوامی

حضرت صلعم کے خلاف قادیانیوں کی ہر سازش کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں جس سے قادیانیوں کے مشن کو نقصان پہنچ رہا تھا ان ذرائع کے مطابق قادیانیوں کی بین الاقوامی تنظیم نے ان دونوں علمائے دین اور بعض دوسری دینی شخصیات کو راستے سے ہٹانے کے لیے کینیڈا اور امریکہ میں یہودی لابی سے رابطہ قائم کیا پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد اور علامہ طاہر القادری کے علاوہ بعض اہم مذہبی شخصیات کو قتل کرا کے ملک میں وسیع پیمانے پر انتشار پھیلانے اور اپنے مخصوص مفادات حاصل کرنے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا اور شاتم رسول سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف ملک میں پھیلی ہوئی غم و غصے کی لہر کو وسیع تر انتشار میں تبدیل کرنے کے لیے سازش کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ایک دہشت گرد گروہ تشکیل دیا گیا جس کے ارکان نے مختلف مراحل میں ایک سپر طاقت میں چھ ماہ کی خصوصی تربیت حاصل کی رانا مقبول احمد ولد ... کو خاص طور پر گروہ کا سرغنہ مقرر کیا گیا اور ان ارکان کو باری باری پاکستان بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا گیا

دوسرا ملزم رانا مقبول احمد ولد محمد [illegible] لاہور کا
رہنے والا ہے اور آج کل مستقل طور پر کینیڈا میں مقیم ہے
دریں اثناء اس جاسوسی منصوبہ کی تیاری کے دوران پاکستانی سراغ
رساں ایجنسیوں کو اس کا علم ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کے تمام
ہوائی اڈوں پر امیگریشن حکام کو چوکنا کر دیا گیا۔ تاہم ملزم رانا مقبول
احمد اپنے مشن کی تکمیل کے لیے گزشتہ روز الصبح پونے تین بجے
کینیڈین پاسپورٹ پر کینیڈا سے کراچی پہنچا۔ جہاں سے وہ پونے
دس بجے صبح جب پی آئی اے کی پرواز نمبر پی کے ۳۰۰ کے ذریعے
اسلام آباد پہنچا تو یہاں پہلے سے تیار امیگریشن کے عملے نے اسے
گرفتار کرکے ائیرپورٹ پولیس کے حوالے کر دیا۔ ابتدائی تفتیش
کے مطابق ملزم کراچی سے جب ... میں پولیس انٹیلیجنس بیورو اور
سپیشل برانچ کے ماہرین پر مشتمل خصوصی ٹیم ملزم کے خلاف تحقیقات
کرے گی۔ ادھر حکمرانوں کے قتل کے لیے بھیجے جانے والے
گروہ کے دوسرے ارکان کی گرفتاری کے لیے پولیس اور خفیہ
ایجنسیاں حرکت میں آگئی ہیں۔ ملزم رانا مقبول احمد کے بارے
میں معلوم ہوا ہے کہ اسے اپنا مشن ایک ماہ کے اندر مکمل کرکے
واپس کینیڈا جانا تھا۔ اور پاکستان میں قیام کے دوران اس کی
بعض اہم شخصیات کے علاوہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے دہشت
گرد تنظیم سے آتشیں اسلحہ یا دھماکہ خیز مادہ حاصل کرنا تھا۔
لیکن بروقت یہ راز فاش ہو جانے سے اس گروہ کا مشن پورا
نہ ہو سکا اور ملک ایک سنگین بحران کا شکار ہونے سے بچ گیا۔
ادھر ان ذرائع کا کہنا ہے کہ اس گروہ کی گرفتاری کے بعد علامہ
عارف الحسینی کے قاتلوں کا سراغ ملنے میں آسانی ہوگی۔

نزلہ وزکام
جوشینا سے آرام
پیچیدہ نباتات کے نہایت موثر، کافی وشافی
اجزا حاصل کرنا کمالِ فن ہے، دواسازی کی عظمت ہے۔ ہمدرد میں ماہرینِ فن
اس عظمت اور خدمت میں ہمہ دم اور ہمہ جہت مصروف ہیں۔
ہمدرد کی فنی محنت اور دواسازی
کی صلاحیت کا ایک مظہر ہے
جوشینا
نزلہ وزکام۔ جوشینا سے آرام
ہمدرد
ADARTS

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۸
شمارہ: ۴
رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
اپریل ۱۹۸۹ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا۔ ۶۔ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔ ۹۔ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔ ۱۲۔ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ۔ ماڈل ٹاؤن فیروز پور روڈ۔ لاہور (پاکستان)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

xxxxxxxxxx

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

تنظیم اسلامی کے رفقاء و احباب اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے وابستگان و متوسلین بخوبی آگاہ ہیں کہ مارچ کا مہینہ تنظیم و انجمن کے دعوتی و تنظیمی اجتماعات کے اعتبار سے بہت بھرپور گزرا کہ ہر دو اداروں کے سالانہ اجتماعات بھی اسی ماہ کے دوران منعقد ہوئے اور اضافی طور پر بعض دعوتی و تحریکی اور تعلیمی و تربیتی پروگرام بھی، جو الحمدللہ کہ نہایت بھرپور اور کامیاب رہے، اسی عرصے میں ترتیب دیئے گئے۔ بالخصوص اس ماہ کا آخری عشرہ امیر تنظیم اسلامی اور انجمن تنظیم کے ذمہ دار حضرات کے لیے اتنا مصروف کن اور مشقت آمیز تھا کہ اللہ کی خصوصی تائید و توفیق اگر شاملِ حال نہ ہوتی تو ان اجتماعات کا اس طور سے انعقاد ہرگز ممکن نہ تھا۔ اس دوران منعقد ہونے والے پروگراموں کی کچھ تفصیلات آپ کو انہی صفحات میں امیر تنظیم اسلامی کی ایک تحریر میں جو تذکرہ و تبصرہ کے عنوان سے اس شمارے میں شامل ہے، اور بعض تفاصیل "رپورتاژ" کے زیر عنوان مضمون میں مل جائیں گی، تاہم اس حوالے سے ان سطور میں محض یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ 'میثاق' کی اشاعت پر ان مصروفیات کا ایک منفی اثر یہ مترتب ہوا ہے کہ اپریل کا شمارہ خاصی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے جس کے لیے قارئین سے معذرت طلب کرنے کو ہم اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے ہیں۔

امیر تنظیم اسلامی کے دس خطبات پر مشتمل کتاب "منہج انقلاب نبوی" آج سے پونے دو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ یہ کتاب "اسلامی انقلاب: کیا ہے، کیوں اور کیسے؟" نامی مجوزہ کتاب کے قائم مقام کے طور پر شائع ہوئی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ "استحکام پاکستان" نامی کتاب کی تالیف کے بعد امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ارادہ "اسلامی انقلاب: کیا ہے، کیوں اور کیسے؟" کے موضوع پر ایک کتاب تالیف کرنے کا تھا۔ اپنے اس عزم کا اظہار انہوں نے "استحکام پاکستان" کی آخری سطور میں کر بھی دیا تھا۔ قارئین کے علم میں ہے کہ اسی غرض سے امیر محترم نے

حرمین شریفین کے لیے تشدّدِ رحال بھی فرمایا تھا لیکن انہی دنوں سندھ کے اندرونی حالات کا بگاڑ اپنی بدترین شکل میں کراچی کے خونی فسادات کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ چنانچہ اس صورتِ حال کا امیرِ تنظیم اسلامی کے ذہن و قلب پر اتنا شدید اثر تھا کہ اسلامی انقلاب پر کتاب لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو تمہید ہی میں بات مسئلہ سندھ کی جانب مڑ گئی اور یہ موضوع اتنا طوالت اختیار کر گیا کہ "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" کے نام سے ایک مکمل اور نہایت مفید کتاب تو وجود میں آگئی لیکن "اسلامی انقلاب" کی تالیف کا معاملہ عارضی طور پر تعطل میں پڑ گیا۔ لیکن پھر جب یہ عارضی تعطل بھی بوجوہ طول پکڑتا نظر آنے لگا اور دوسری جانب "اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں اور کیسے؟" کے لیے رفقاء و احباب کا تقاضا شدت پکڑنے لگا تو فیصلہ کیا گیا کہ "اسلامی انقلاب کا نبوی طریق کار" کے موضوع پر اُن خطاباتِ جمعہ کو یکجا کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے جو ۸۶ء اور ۸۷ء کے دوران سلسلہ وار "میثاق" میں شائع کیے گئے تھے۔ چنانچہ اُن خطابات کو فوری نظرِ ثانی اور مناسب ابواب بندی کے بعد "منہج انقلابِ نبوی" کے نام سے جون ۸۷ء میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ یہ کتاب بہت حد تک "اسلامی انقلاب: کیا، کیوں اور کیسے؟" کی کمی کو پورا کرتی تھی لیکن ایک بحث اس میں تشنہ تھی اور وہ یہ کہ اسلامی انقلاب کے نبوی طریق کار کا اطلاق دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کے طریق پر کس طور سے ہوگا۔ حالات کی تبدیلی سے منہجِ عمل میں کس قدر تبدیلی واقع ہوگی؟ انقلاب کے کون سے مراحل ہیں سیرتِ نبوی سے اخذ کرنے ہوں گے اور کن مراحل کے معاملے میں اجتہاد سے کام لینا ہوگا؟ تاہم اس تمام تر کمی اور تشنگی کے باوجود اپنی افادیت اور اثر انگیزی کے لحاظ سے یہ کتاب ہماری توقعات سے کہیں بہتر ثابت ہوئی اور عوام الناس کے ساتھ ساتھ اہلِ علم و دانش حضرات کے طبقے میں بھی اسے یکساں قبولِ عام حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ ڈیڑھ سال کے مختصر عرصے میں کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ حال ہی میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا ہے اور اس میں اس کمی کی تلافی بھی کر دی گئی ہے جو پہلے ایڈیشن میں محسوس کی گئی تھی۔ چنانچہ "دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کے لیے صحیح طریق کار" کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کے ایک خطاب کو ٹیپ سے اُتار کر نئے ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے اور اس طرح اب یہ کتاب امیرِ تنظیم اسلامی کے گیارہ خطابات پر مشتمل ہے۔ اس معاملے کا اہم پہلو یہ ہے کہ اگرچہ مذکورہ بالا

خطاب بھی ڈیڑھ سال قبل 'میثاق' میں قسط وار شائع ہو چکا ہے لیکن اب کتاب میں شامل کرنے کے
مرحلے پر خود امیر محترم نے اس میں خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اس کی نظر ثانی کے لیے
وقت نکالا بلکہ اپنے قلم سے اسے ضروری اصلاح و ترمیم کے مرحلے سے بھی گزار دیا ہے، جس کے
باعث اس کی افادیت اور اثر پذیری میں نمایاں اضافہ ہو چکا ہے۔ ہمارے وہ رفقاء و احباب جو
'منہج انقلاب نبوی' کا پہلا ایڈیشن خرید چکے ہیں، نوٹ فرما لیں کہ اُن کی سہولت کے لیے یہ
نظر ثانی شدہ اضافی باب جو کتاب کے تازہ ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے، آئندہ ماہ 'میثاق' میں شائع
کر دیا جائے گا اور اس طرح کتاب کے پچھلے ایڈیشن میں جو کمی رہ گئی تھی اس کی تلافی 'میثاق' کے
آئندہ شمارے سے ہو جائے گی (ان شاء اللہ)

اور آخر میں ہمیں قارئین کو وہ اطلاع بھی دینی ہے جس کے بارے میں ہمیں اندازہ ہے کہ
قارئین کے لیے خوش کن نہ ہوگی۔ کاغذ کی روز افزوں گرانی کا معاملہ واقفانِ حال سے پوشیدہ
نہیں ہے اور کاغذ کی لاگت ہی دراصل پرچے کی COST کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔
اس صورتِ حال کا ایک سادہ سا حل تو وہ ہے جس پر ہم ماضی میں عمل پیرا رہے ہیں کہ جب اخراجات
کا بار ناقابلِ برداشت ہو جاتے تو پرچے کی قیمت میں اضافہ کر دیا جاتے۔ اس مرتبہ ایک مختلف حل
ہمارے پیشِ نظر ہے، اور ہمیں یقین ہے کہ پرچے کی قیمت بڑھانے کے مقابلے میں قارئین اسے
پسند فرمائیں گے، وہ یہ کہ پرچے کی موجودہ قیمت کو برقرار رکھتے ہوئے پرچے کے صفحات میں معمولی
سی کمی کے ذریعے اخراجات کو معین حدود کے اندر لایا جائے۔ یہ تجویز کئی ماہ سے ہمارے
پیشِ نظر تھی اور ہم پچھلے دو ماہ سے اس کے مطابق پرچے کی پلاننگ کی کوشش میں تھے لیکن
ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی اہم مضمون اپنی طوالت کے باعث ہمارے اس ارادے کی راہ میں حائل ہو
جاتا تھا۔ تاہم زیرِ نظر شمارہ تازہ پالیسی کے مطابق ۹۶ کی بجائے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور
آئندہ کے لیے بھی ارادہ یہی ہے کہ پرچہ ۸۰ صفحات سے بڑھنے نہ پائے۔

السعی مِنّا والاتمام من اللہ

ـــــ ڈاکٹر اسرار احمد ـــــ

الحمدللہ کہ ۲۳؍ سے ۳۱؍ مارچ ۱۹۸۹ء تک تنظیم اسلامی اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی جملہ سالانہ تقریبات بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں ـــــ چنانچہ :

۱۔ تنظیمِ اسلامی کا چودھواں سالانہ اجتماع بھی بفضلہ تعالیٰ نہایت بھرپور انداز میں منعقد ہوا،

۲۔ اسی طرح انجمن کا سترھواں سالانہ اجلاسِ عام بھی پہلی بار پورے اہتمام اور آب و تاب کے ساتھ زیرِ تعمیر قرآن آڈیٹوریم میں منعقد ہوا،

۳۔ ۲۴ تا ۲۸؍ مارچ مسلسل پانچ دن، روزانہ بعد نمازِ مغرب، جناح ہال، شارع قائدِ اعظم، میں انجمن کے زیرِ اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی کا سلسلہ جاری رہا۔ جس میں شرکاء کی تعداد اور صرف ذوق و شوق ہی نہیں، جوش و خروش نے ۷۳ء تا ۷۶ء کی قرآن کانفرنسوں کی یاد تازہ کر دی۔

۴۔ نیز ان ہی ایام میں صبح کے اوقات میں قرآن اکیڈمی میں تنظیمِ اسلامی کے اُن رفقاء کیلئے توسیعی خطبات (EXTENSION LECTURES) کا سلسلہ جاری رہا جنہوں نے تربیت اور مطالعہ کے ابتدائی نصاب کی تکمیل کر لی تھی۔ ان میں روزانہ تقریباً ڈھائی صد رفقاء کی دو گھنٹے کی نشست راقم الحروف کے ساتھ رہی اور دو ہی گھنٹے کی رفیقِ مکرم سراج الحق سید کے ساتھ،

۵۔ مزید برآں، اس پورے پروگرام کے اوّل و آخر یعنی ۲۳ کی شام اور ۳۱؍ کی صبح کو تنظیم کی مرکزی مجلسِ مشاورت کے اجلاس ہوئے!

الغرض اس 'عشرۂ تقریبات' کے دوران ماڈل ٹاؤن میں واقع قرآن اکیڈمی اور جامع القرآن، نیوگارڈن ٹاؤن میں واقع قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم اور شارعِ قائدِ اعظم پر

واقع جناح ہال اور اس کے گرد و نواح میں خوب گہما گہمی اور جشن کا سماں رہا ____ اور جملہ شرکا نے اپنے اپنے ظرف کی وسعت اور داخلی کیفیات کی مناسبت سے مقدور بھر حظّ و کیف حاصل کیا۔ چنانچہ جہاں سب نے کم از کم ع "بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔!" کا سا اطمینان محسوس کیا' وہاں بہت سوں نے بھی "قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں!" کے مصداق رُوح میں تازہ بالیدگی، اور قلب میں نئے انبساط کے ساتھ ساتھ، نورِ ایمان میں نئی تابندگی' اور جذبۂ جہاد میں حرارتِ تازہ کا اضافہ محسوس کیا۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ!

اِن نُو دنوں کے دوران خود راقم الحروف پر کام کا جس قدر دباؤ رہا' اُس کا اندازہ ایک نگاہِ بازگشت کے ذریعے کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ستّاون برس کی عمر اور صحت کی ناقابلِ رشک کیفیت میں اتنی شدید مشقّت کیسے برداشت ہوگئی۔ ان 'تقریبات' کی جو مختصر رپورٹ چوہدری غلام محمد صاحب کے قلم سے اس شمارے میں شامل کی جا رہی ہے اُس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ایام میں راقم کی مصروفیت کا کیا عالم رہا۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہا طبیعت اللہ کی توفیق و تائید' اور قوتِ ارادی کے بل پر قائم رہی' لیکن بالآخر اس کا جو طبعی نتیجہ نکلنا چاہئے تھا وہ نکل کر رہا اور جمعہ ۲۱ مارچ کی صبح کو طبیعت ایک دم ڈھیر ہو گئی۔ چنانچہ کراچی کے رفیق تنظیم زین العابدین صاحب نے گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا کہ: "اب آپ چند دن کامل آرام کریں۔ اس لئے کہ اس وقت آپ کا چہرہ 'SULLEN FACE' کا نقشہ پیش کر رہا ہے!" اور واقعتہً اُس وقت میری کیفیت یہ تھی کہ محسوس ہوتا تھا کہ محض ہاتھ یا پاؤں کی معمولی سی حرکت کے لئے بھی خصوصی قوّتِ ارادی کو بروئے کار لانا ضروری ہے ____ لیکن اس حال میں بھی ایک وعدہ سر پر سوار تھا۔ اس لئے کہ فیصل آباد کے رفقاء نے ۲۱ کی شام کو ڈسٹرکٹ کونسل ہال' فیصل آباد میں ماہانہ درس کا وعدہ لے لیا تھا۔ اور اب وہ اس کے ایفاء پر مُصر تھے' چونکہ پہلے ہی مسلسل دو ماہ کا ناغہ ہو چکا تھا____ ____ لہٰذا جیسے بھی بن پڑا' نمازِ جمعہ کے فوراً بعد فیصل آباد جاتا ہوا جہاں بعد مغرب دو

گھنٹے کا درس ہوا جس میں پوری سورۂ قیامہ بیان ہوئی اور پھر راتوں رات واپسی بھی ہوئی!
(اگرچہ اس سفر کے لیے ایک خصوصی تکلیف عزیزم سعید اسعد سلمہٗ کو دینی پڑی جو اپنی نئی اے
آرام دہ گاڑی میں دو گھنٹے چودہ منٹ میں قرآن اکیڈمی لاہور سے برادرم ڈاکٹر عبد السمیع کے
مکان واقع پیپلز کالونی، فیصل آباد لے گئے، اور بحمد اللہ ایک گھنٹہ انسٹھ منٹ میں ڈسٹرکٹ
کونسل ہال فیصل آباد سے قرآن اکیڈمی لے آئے! جہاں راقم نصف شب کے لگ بھگ
"بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَعَلَيْهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا" کا ورد کرتے ہوئے اُن عزیز کی گاڑی
سے اُترا۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ!)

اس 'عشرۂ تقریبات' سے متصلاً قبل تقریباً ایک ہفتہ راقم نے 'حکمتِ قرآن'
کی اشاعتِ خصوصی بابت مارچ و اپریل ۸۹ء کی تیاری کے ضمن میں شدید محنت کی اور
لگ بھگ ۶۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ایک طویل تحریر میں اللہ تعالیٰ کے اُس فضل و کرم اور تائید و
تیسیر کا تفصیلاً ذکر کیا جس کے نتیجے میں اس 'دعوتِ رجوع الی القرآن' کا غلغلہ بلند ہو سکا جس
کے اہم عنوانات ہیں حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن، اور سلسلۂ مطبوعاتِ قرآن اکیڈمی، قرآن
کانفرنسیں، قرآنی تربیت گاہیں اور محاضراتِ قرآنی، اور درسِ قرآن اور فکرِ قرآنی کے اہم اور اساسی
موضوعات پر خطبات کے لاتعداد آڈیو اور ویڈیو کیسٹ، اور جس کے اہم سنگ ہائے میل
ہیں اولاً انجمن خدام القرآن، پھر قرآن اکیڈمی اور جامع القرآن، اور بالآخر قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم!
(اور جس کا سلسلہ، اگر اللہ نے چاہا تو منتج ہوگا 'جامعۃ القرآن' یعنی قرآن یونیورسٹی کے قیام پر!)
اس طویل تحریر کی تسوید کے دوران راقم کے ذہن و شعور پر غلبہ رہا سورۃ الضحیٰ کی آخری
آیتِ مبارکہ "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کا۔ چنانچہ ان ہی الفاظِ مبارکہ کو اُس کا
عنوان قرار دیا گیا۔ (امید واثق ہے کہ 'میثاق' کے تمام قارئین 'حکمتِ قرآن' بھی
ضرور پڑھتے ہوں گے۔ تاہم اگر اس میں کوئی استثناء ہو تو ایسے حضرات کی خدمت میں
تاکیداً عرض ہے کہ اس اشاعتِ خصوصی کو ضرور نظر سے گزار لیں!)
'عشرۂ تقریبات' کے دوران راقم کے ذہن و شعور پر بحمد اللہ، سورۃ فتح کے دو

الفاظِ مبارکہ چھائے رہے جن میں اسلامی دعوت اور تحریک کو ایک اچھی ہوئی کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی :

"کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ"

ترجمہ : "جیسے کھیتی کہ نکالا اس نے اپنا پٹھا، پھر اس کی کمر مضبوط کی، پھر وہ گدرائی اور پھر کھڑی ہوگئی اپنی نال پر، دل موہ لیتی ہے کاشت کاروں کا، تاکہ اُن (کی خوشی) کے ذریعے کافروں کے دلوں کو جلائے !

اس لئے کہ نمازوں کے اوقات میں جامع القرآن کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال، محاضرات قرآنی کے دوران پورے پانچ دن جناح ہال کی یہ کیفیت کہ محاورۃً نہیں واقعۃً تل دھرنے کو جگہ نہ ملے، اور انجمن کے اجلاسِ عام میں زیرِ تعمیر قرآن آڈیٹوریم (جسے فی الوقت چھت نہ ہونے کی بنا پر اوپن ایئر آڈیٹوریم کہا جا سکتا ہے) کا لبالب پُر ہونا یقیناً ایسے مناظر تھے جن سے اس بوڑھے کسان کو حقیقی قلبی مسرت حاصل ہوتی رہی جس نے اپنی عمرِ عزیز کے ساڑھے تیئیس سال اور ان کے دوران جسم و جان کی بہتر اور بیشتر توانائیوں کو اس کھیتی کی تخم ریزی اور آبیاری کے نذر کر دیا تھا! چنانچہ اس کے رُوئیں رُوئیں سے اللہ تعالےٰ کے لئے تشکر و امتنان کے جذبات پھوٹتے رہے اور قلب کی گہرائیوں سے حمدِ باری تعالےٰ کے نغمے اُبلتے رہے کہ اُس کے لئے : "وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى" کا معاملہ کلیۃً آخرت ہی پر نہیں رکھا گیا ــــ بلکہ اُس کی رُوح پرور اور وجد آفریں جھلکیاں اس دنیا میں بھی دکھادی جاتی ہیں! ؎ "اِک بندۂ عاصی کی اور اتنی مداراتیں !"

اِسی کیفیت میں اچانک ایک روز ذہن منتقل ہوا محترم پروفیسر عبدالغفور احمد کے اُن ریمارکس کی جانب جو اُن کے ایک حالیہ انٹرویو ('چٹان' بابت ۷ فروری ۱۹۸۹ء) میں اس عاجز و ناچیز کے بارے میں وارد ہوئے ہیں ــــ یعنی :

"ڈاکٹر صاحب بڑے محترم ہیں ہمارے لئے، میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے علمی

حیثیت سے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے اور مجھے اس بات کا شرف حاصل ہے کہ میں
۱۹۵۷ء سے ان سے استفادہ کرتا رہا ہوں لیکن بات یہ ہے کہ آرام کرسی پر بیٹھ کر آدمی بہت
اچھی اچھی باتیں کر سکتا ہے۔ مجھے تقریر آتی تو میں بھی بہت اچھی تقریر کر لیتا کہ کیسے کرنا چاہیئے یوں
کرنا چاہیئے، یوں کرنا چاہیئے یہ کرنا چاہیئے وہ کرنا چاہیئے باہر بیٹھ کر یہ کہنا کہ فلاں آدمی اس
طرح سے نہیں کھیلا اسے اس طرح کھیلنا چاہیئے ایسے کرتا یہ کرتا وہ کرتا ہم تو یہ کہتے ہیں
وہ آدمی جو باہر بیٹھنے والا ہو ناقد کی حیثیت سے ہو اور تنقید کرنا اسے آتی ہو وہ بہت
اچھی اچھی باتیں کر سکتا ہے لیکن جب ایک آدمی میدان میں اترتا ہے تو اسے پھر حقائق
کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ کیا کرے! ہم تو ڈاکٹر صاحب سے کہتے ہیں کہ آرام کرسی پر بیٹھ کر
تقریریں کرنے کے بجائے میدانِ عمل میں اتریں اور کام کریں۔ جماعتِ اسلامی صرف ایک
پارٹی رہ گئی ہے جس پر تنقید کرتے رہیں کہ اس نے یہ کر دیا اس نے وہ کر دیا۔ میدان
سے باہر بیٹھ کر تو وہ بہت اچھی تنقید کر سکتے ہیں۔ میں بھی اگر کرسی پر بیٹھ کر جھولتا رہوں
اور سارے اخبارات دیکھنے کے بعد ہر پارٹی پر تنقیدی لگاوٹ لگاتا رہوں تو بھئی! بہت
اچھی تنقید کر سکتا ہوں۔ صفحے کے صفحے بھر کر دے سکتا ہوں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ
نے بہت صلاحیتیں دی ہے لیکن وہ ایسے کام میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں۔ اسلام ایک
"آرام کرسی کا مذہب" نہیں ہے۔ اسلام مذہب ہے جدوجہد کا۔ جس میدان میں وہ
چاہتے ہیں جدوجہد کریں۔ وہ جدوجہد شروع کر دیں۔ وہ چاہتے ہیں جمہوریت کے
تو میدان میں جمہوریت کے لئے نکلیں میں تو ان کے رسالے نہیں پڑھتا ہوں۔ میں نے
ان سے بہت استفادہ کر لیا ہے اب مجھے موقع نہیں ملتا میری مجبوری ہے کہ میں
پوری طرح نہیں پڑھ پاتا لیکن میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ دیکھیں کہ ان دو
آدمیوں میں بہت فرق ہے۔ ایک وہ جو میدان میں کام کر رہا ہو اور ایک وہ آدمی
جو میدان سے باہر بیٹھا ہوا کھلاڑیوں کو دیکھ رہا ہے کہ کس نے کہاں فاؤل کیا کس نے
کہاں اچھا کیا۔ یہ ان کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ تو انہوں نے بہت کر لیا ہے جس کو وہ
سمجھتے ہیں کہ وہ بہتر ہیں وہ بجائے اس کے کھلاڑیوں پر تنقید کریں میدانِ عمل میں نکلیں۔

اگر پروفیسر صاحب موصوف کی یہ ترجمانی درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے نزدیک "تالوں میں تال بھوپال تال، باقی سب تلیاں" کے مصداق 'کام' تو صرف سیاسی تحریکوں میں شمولیت اور انتخابی سیاست کے کھیل میں شرکت ہے، باقی سب کام تو دل کے بہلاوے ہیں یا وقت گذاری کے مشغلے! ـــ اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک مولانا مودودی مرحوم نے ۱۹۳۳ء سے (جب انہوں نے 'ترجمان القرآن' جاری کیا) ۱۹۵۱ء تک (جب پہلی بار الیکشن میں حصّہ لیا) پورے اٹھارہ سال قطعاً کوئی کام نہیں کیا بلکہ یہ عرصہ یا تو آرام کرسی پر جھولتے ہوئے گذار دیا ـــ یا پھر "ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے!" کے مصداق ساحل پر بیٹھ کر طوفان کا نظارہ کرنے میں بسر کر دیا! ـــ اس لئے کہ اس طویل عرصے کے دوران، ظاہر ہے کہ انہوں نے نہ کبھی کسی انتخاب میں حصہ لیا (حتیٰ کہ ۱۹۴۶ء کے فیصلہ کن انتخابات کے موقع پر بھی قوم کا ساتھ نہ دیا) نہ کسی سیاسی تحریک میں شمولیت اختیار کی (یہاں تک کہ تحریکِ آزادی میں بھی کوئی حصّہ نہیں لیا) ـــ بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو اپنے فہم کے مطابق ایک خالص اسلامی تحریک کے لیے فکری طور پر میدان ہموار کرنے اور مردانِ کار کی تلاش اور انہیں کسی جماعتی نظم میں منسلک کرنے میں کھپا دیا!

اور واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ کسی چلتے ہوئے قافلے میں شریک ہو گئے ہوں انہیں یہ اندازہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی نئی جمعیت کی فراہمی اور نئے قافلے کی تشکیل کے لئے کیسی جانگسل محنت اور مشقّت کی ضرورت ہوتی ہے، اور بلاشبہ انسانی معاشرے میں اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ مشکل اور صبر آزما کام کوئی نہیں!

ـــ لہٰذا پروفیسر صاحب کی خدمت میں "پیر شو بآموز!" کے مصداق یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ کبھی اس پر غور فرمائیں کہ جس جماعت کی نائب امارت کے ہوائی گھوڑے پر سوار وہ نہ صرف ملک کے طول و عرض بلکہ کرۂ ارضی کے شرق و غرب میں اُڑے پھرتے ہیں وہ آن کی طرح مولانا مودودی کو بھی کہیں سے بنی بنائی نہیں مل گئی تھی بلکہ اس کے لئے آنمرحوم نے سالہا سال تک دن کا چین اور راتوں کا سکون حرام کیا تھا۔ اور ہر دوسرے کام سے مجتنب اور یکسو ہو کر

اپنی ساری توجہ اور سعی و جہد کو صرف اسی ایک کام پر مرکوز کیا تھا، تب وہ چھوٹا سا قافلہ تشکیل پایا تھا اور وہ مختصر سی جمعیت فراہم ہوئی تھی ــــ جس کی نائب امارتوں کی تعداد موجودہ حکومتوں کے وزیروں اور مشیروں کی تعداد کے مانند بڑھتی چلی جا رہی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ خود اپنی ایک ابتدائی غلطی اور بعد ازاں بعض دوسرے غلط اقدامات کے باعث جب مولانا مودودی کو ۵۸-۱۹۵۷ء میں اپنے بہترین ساتھیوں کی رفاقت سے محروم ہونا پڑا تو پھر انہیں جن لوگوں پر کلی انحصار کرنا پڑا ان کی "کرم نوازیوں" کا تذکرہ اگر اُن کے صاحبزادوں، بالخصوص ڈاکٹر سید احمد فاروق سے سنا جائے تب تو بے اختیار اقبال کا یہ شعر یاد آجاتا ہے کہ ؎

گِلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے،
کسی بُت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"!

اور اگر اتنا تکلف، نہ بھی کیا جائے تب بھی آنمرحوم کی اپنے جماعتی جانشینوں سے یہ بیزاری تو اظہر من الشمس ہے ہی کہ جب منصورہ کی صورت میں اُس جماعت کا شاندار 'ہیڈکوارٹر' تیار ہوا جس کی بنیادوں میں انہوں نے اپنی ہڈیوں کا چورا اپنے خون کے گارے سے چُنا تھا تو نہ زندہ مودودی نے خود وہاں منتقل ہونا گوارا کیا، نہ اُن کی وفات پر اُن کے ورثاء نے ان کے جسدِ خاکی کو وہاں دفن کرنے کی اجازت دی! اگرچہ آج بھی اُن کے فکر کی بالخصوص عالمِ عرب میں مقبولیت کے طفیل، جماعت کے امراء و نائبین اُن کے اسی دَور کی محنت کی کمائی کھا رہے ہیں جب وہ اپنے بند کمرے میں میز کرسی پر بیٹھ کر ہمہ تن اور ہمہ وقت تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے! فاعتبروا یا اولی الابصار!

ان سطور کے احقر راقم پر اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم کا ایک مظہر، جس کا ذکر " وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ " کی تعمیل کی تکمیل کے لئے ضروری ہے، یہ ہے کہ اگرچہ اُس کی محنت کے نتائج کا ظہور بہت ہی سست رفتاری سے ہوا ہے، (جس پر غیر تو پھبتیاں چُست کرتے ہی ہیں، اپنے بھی تشویش کا اظہار کرتے رہتے ہیں) تاہم "سہج پکے سو میٹھا ہو" کے مصداق بحمداللہ گذشتہ ساڑھے تئیس سال کے دوران اس کی پیش رفت، خواہ اس کی رفتار

روائتی کھوسے والی ہی رہی ہو' بہر حال مستقل اور مسلسل بھی رہی ہے' اور یکساں اور ہموار بھی!۔ چنانچہ ایک بالکل فطری تدریج سے ایک فرد کی مساعی کے نتیجے میں اولاً ایک 'ادارہ' (انجمن خدام القرآن) اور پھر اسی کی کوکھ سے ایک 'جماعت' (تنظیمِ اسلامی) وجود میں آئی' اور الحمدللہ اِس پورے سفر کے دوران نہ کبھی کوئی دھماکہ خیز اختلاف سامنے آیا۔ نہ کبھی کسی بڑے پیمانے پر 'علیحدگی' ہوئی' اور بفضلہٖ تعالےٰ گذشتہ چودہ سالوں سے انجمن اور تنظیم باہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کامل توافق وتعاون کے ساتھ جانبِ منزل رواں دواں ہیں۔

اس سلسلے میں خاص طور پر ۳۰ مارچ کی شام کو قرآن آڈیٹوریم جو منظر پیش کر رہا تھا اس سے میرا ذہن کوثر نیازی صاحب کے ایک شعر کی جانب منتقل ہو گیا' جو کوثر صاحب کے تحریکی دَور کے بہت سے دوسرے اشعار کے مانند مجھے بہت پسند ہے۔ یہ شعر انہوں نے اپنی شادی' خانہ آبادی کے فوراً بعد نظر بند ہو جانے پر جیل میں کہا تھا ؎

"کوثرؔ شبیہِ یار ہے اشکوں کے درمیاں
یا چاند آ گیا ہے ستاروں کی گود میں!"

مجھے اُس روز واقعتہً ایسے محسوس ہوا کہ جیسے تنظیمِ اسلامی انجمن خدام القرآن کی گود میں ہو۔ اس لئے کہ انجمن کا بغیر چھت کا آڈیٹوریم بالکل ایک کھلی گود کے مانند نظر آ رہا تھا ـــــ اور اس میں جو لوگ جمع تھے اُن کی عظیم اکثریت تنظیم سے وابستہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ اجلاس کے صدر سید سراج الحق صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں بالفعل یہ کہہ بھی دیا کہ "اگر کچھ لوگوں کے ذہنوں میں انجمن اور تنظیم کے مابین کوئی خیالی فصیل حائل ہے تو اسے آج گر جانا چاہیئے!"

اس ضمن میں راقم اپنے آپ پر " اِنَّ فَضْلَہٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا " کا جو انعکاس (خواہ لاکھ میں ایک' بلکہ کروڑ میں ایک کی نسبت ہی سے سہی!) محسوس کرتا ہے اس کے احساس وشعور کی پوری شدت اس وقت اجاگر ہوتی ہے جب راقم اپنے حالات کا موازنہ مولانا مودودی کے حالات سے کرتا ہے۔ اس لئے کہ جہاں تک ذاتی صلاحیتوں اور استعدادات کا تعلق ہے مولانا مرحوم سے مجھے کوئی نسبت حاصل نہیں' اُن کا دینی علم بھی کم از کم مجھ سے تو بہت زیادہ تھا' پھر وسعتِ مطالعہ میں بھی وہ بہت آگے تھے' پھر پابندیٔ اوقات کے ساتھ مسلسل محنت ومشقت کا مادہ ان میں بے پناہ تھا' ـــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تحریر وانشاء کی

صلاحیت تو انہوں نے بدرجۂ اتم حاصل کی تھی، یہاں تک کہ جیسے حفیظ جالندھری مرحوم نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ ؎ "کیا پابندِ نَے نالے کو میں نے ۔ یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری!" اُسی طرح احسان دانش ایسے نقاد نے خود مجھ سے یہ الفاظ کہے تھے کہ "مولانا مودودی ایک خاص طرزِ انشاء کے مُوجد ہیں!" ــــــ لیکن اس سب کے باوصف انہیں جن نامساعد اور ناموافق حالات کا سامنا رہا اور اپنے کام کے ضمن میں انہیں جو پے بہ پے دھچکے لگتے رہے اور صدموں سے دوچار ہونا پڑا اُس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اوّلاً ــــــ پنجاب میں اُن کی آمد ایک 'مہمان' کی حیثیت سے ہوئی، اور میزبان بھی وہ نہیں تھا جس نے بلایا تھا یعنی علامہ اقبال مرحوم بلکہ ان کا عقیدت مند جسے مولانا مودودی سے خود کوئی ذاتی مناسبت نہیں تھی۔ پھر یہ کہ اصل 'داعی' بہت جلد داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔ چنانچہ میزبان اور مہمان میں مسلسل چپقلش رہی۔ یہاں تک کہ ایک بار مولانا کو بستر البوریا سمیٹ کر 'ادارۂ دارالاسلام' کو خیرباد کہہ کر لاہور آجانا پڑا ــــــ اور جماعتِ اسلامی کی تشکیل کا مرحلہ یہیں طے پایا۔ اور اگرچہ بعد میں پھر صلح صفائی ہو گئی اور پھر قیامِ پاکستان تک جماعت کا مرکز وہیں قائم رہا، تاہم باہمی چپقلش کی کوفت مسلسل برقرار رہی ــــــ ثانیاً ــــــ قیام جماعت کے دو ہی سال بعد ایک انتہائی دھماکہ خیز اختلاف پیدا ہوا اور ارکانِ جماعت کی ایک تہائی تعداد نے علیحدگی اختیار کر لی (جن میں مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی ایسے اکابر بھی شامل تھے) ــــــ ثالثاً ــــــ قیامِ جماعت کے لگ بھگ پندرہ سال بعد پھر ایک زبردست خلفشار رونما ہوا ــــــ اور اس بار عام ارکان کی تو اگرچہ بہت قلیل تعداد نے علیحدگی اختیار کی لیکن پندرہ سالوں میں جماعت اسلامی پاکستان کی قیادت کی جو دوسری صف، تیار ہوئی تھی وہ تقریباً کُل کی کُل 'صاف' ہو گئی (واضح رہے کہ راقم خود کو دوسری تو کیا تیسری یا چوتھی صف میں بھی شامل نہیں سمجھتا، اُس کی حیثیت اُس وقت تک صرف عام اور 'نووارد' نوجوان کارکن کی تھی!) ــــــ ادران پر جب راقم اضافہ کرتا ہے مولانا کی حیاتِ مستعار کے آخری دَور کی درماندگی و دل شکستگی کا تو بے اختیار قلب کی گہرائیوں سے شکر و حمد کے سوتے اُبلنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تاحال

اس قسم کے "دھچکوں" اور صدموں سے محفوظ و مصئون رکھا ہے اور اگرچہ کبھی کبھی ساتھیوں کی "کم کوشی" کا شکوہ بھی دل میں پیدا ہو جاتا ہے، اور اکثر و بیشتر خود اپنی بے بضاعتی وکم مائگی اور اقامتِ دین ایسے عظیم کام کی مناسبت سے جو صلاحیتیں لازماً درکار ہیں اُن کے اعتبار سے اپنی تہی دستی اور تہی دامنی کے احساس سے طبیعت پر "قبض" کی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے، تاہم یہ اطمینان ضرور حاصل ہے کہ "راہی" بھی "کم کوش" تو ہیں "بے ذوق" نہیں، اور رفتار بھی کم تو ہے مایوس کن نہیں ــــ بلکہ بحمد اللہ 'SLOW' ہونے کے ساتھ 'STEADY' بھی ہے، ــــ رہا اقامتِ دین کی جدوجہد میں بالفعل کامیابی سے ہم کنار ہو جانا تو اُس کی ہمیں کوئی 'چنتا' ہے ہی نہیں۔ اس لئے ہمارے لئے تو کامیابی کے اعتبار سے ع "یا تن رسد بہ جاناں، یا جاں ز تن برآید" دونوں ہی بالکل برابر اور یکساں اور قرآن حکیم کے مبارک الفاظ میں "اِحْدَی الْحُسْنَیَیْن" کے مترادف ہیں! (سورۂ توبہ، آیت ۵۲) اور ہمارے اطمینان کے لئے سورۂ نساء کی آیت ۱۰۰ کے یہ الفاظِ مبارکہ تو نصِ صریح کا درجہ رکھتے ہی ہیں:

"وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ!"

ترجمہ: "جو اپنے گھر سے نکل کھڑا ہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب ہجرت کی نیت سے تو اگر اسے (راہ ہی میں) موت نے آلیا تب بھی اُس کا اجر و ثواب اللہ کے ذمہ ہو گیا!"

درج ذیل حدیث بھی خواہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہی ہو ہماری حوصلہ افزائی کا وافر سامان لئے ہوئے ہے (اسے امام دارمیؒ نے حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً روایت کیا ہے!)

"مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْاِسْلَامَ فَبَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَّاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ"

ترجمہ: "جس شخص کو موت آگئی اس حال میں کہ وہ احیاءِ اسلام کی نیت سے علم حاصل کر رہا

تھا تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے مابین صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا!"
اور تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!" کے مصداق خواہ مولانا امین احسن اصلاحی خود بھول گئے ہوں،
ہمیں تو وہ "تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو۔ مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے!"
کے مصداق ابھی تک اچھی طرح یاد ہیں مولانا کے یہ الفاظ کہ:

"پھر اگر ہم نے اس جدوجہد میں بازی پالی تو فھو المراد اور اگر دوسری بات ہوئی
تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ایسا ہے جس میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں ہے
اس میں اوّل قدم بھی منزل ہے اور آخر بھی، ناکامی کا اس کوچہ میں گزر ہی نہیں ہے
اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے۔ پھر اگر تیز سواری
مل گئی تو فبہا۔ یہ نہ سہی تو چھکڑے ملیں گے۔ انہی سے سفر ہوگا۔ یہ بھی نہیں تو دو پاؤں سے
موجود ہیں۔ ان سے چلیں گے۔ پاؤں بھی نہ رہیں تو آنکھیں تو ہیں۔ ان سے
نشانِ منزل دیکھیں گے، آنکھیں بھی اگر بے نور ہو جائیں تو دل کی تو آنکھ تو ہے
جس کی بصارت کو کوئی سلب نہیں کر سکتا بشرطیکہ ایمان موجود ہو......"

ماخوذ از 'دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات'

بہر حال جس طرح سورۂ لقمان کی آیت ۲۷ میں فرمایا گیا ہے کہ "اگر کل روئے زمین
کے درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر، مزید سات سمندروں سمیت، روشنائی بن جائیں تب
بھی اللہ کے کلمات حیطۂ تحریر میں نہیں لائے جا سکتے!" اسی طرح ہمارا واقعی احساس یہ
ہے کہ اگر ہمارے بدن کا ایک ایک رُواں اور جسم کا ایک ایک ریشہ ترانۂ حمد و شکر الاپنے
لگے تب بھی اللہ کے اس احسان کے شکر کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا کہ اس تعالیٰ نے ہمیں راہِ
حق کی ہدایت مرحمت فرمائی اور پھر اس پر استقامت بھی عطا کی! اور اب اُسی سے استدعا
ہے کہ

"رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ
لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ! ——— امین یا ربّ العلمین!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۱۲ نشست ۵۸

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۵)

الحمد للہ و کفٰی والصلوۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی -
اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم - بسم اللہ الرحمن الرحیم
یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ○
صدق اللہ مولانا العظیم

"اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی شکل میں تقسیم کیا تاکہ باہم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خداترس اور پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کچھ) جاننے والا ہے (اور) باخبر ہے"۔

معزز حاضرین اور محترم ناظرین...... یہ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر تیرہ ہے۔ جس کی تلاوت اور رواں ترجمہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ میں نے اس سورۂ مبارکہ کے بالکل آغاز میں یہ عرض کیا تھا کہ اس سورہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ درمیانی حصے میں مسلمانوں کے باہمی اتحاد و یگانگت اور اخوت و محبت کے ضمن میں آٹھ احکام

آئے ہیں، جبکہ پہلے اور آخری حصے میں اجتماعیاتِ انسانیہ کے بہت اہم مضامین زیرِ بحث آئے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پہلے حصے میں اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ، خواہ وہ ریاست کی صورت میں ہو خواہ معاشرہ کی شکل میں ہو، اس کی دو اساسات کا ذکر تھا...... ایک دستوری اور قانونی اساس کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کے دائرے کے اندر اندر رہو، اس سے تجاوز نہ کرو...... اور دوسری ایک قلبی اور جذباتی بنیاد، یعنی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی شخصیت سے مضبوط تعلقِ خاطر، آپؐ سے انتہائی درجے کی قلبی محبت، آپؐ کا ادب و احترام اور آپؐ پر بحیثیتِ رسول پختہ ایمان۔

اس آخری حصے میں انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق پھر نہایت اہم باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ آج جو آیت زیرِ مطالعہ ہے اس کے ضمن میں سب سے پہلے تو یہ بات نوٹ کیجئے کہ یہاں خطاب کا انداز بدل گیا۔ یہاں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے بجائے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ آیا، جبکہ اس سے پہلے اس سورہ میں پانچ مرتبہ خطاب کے لئے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ وہاں خطاب صرف اہلِ ایمان سے تھا۔ یہاں جو خطاب کے الفاظ بدل گئے ہیں تو وہ یوں ہی نہیں بدلے بلکہ اس لئے بدلے ہیں کہ اس آیت کا جو مضمون ہے وہ ایک آفاقی حقیقت (UNIVERSAL TRUTH) اور تمام انسانوں کے مابین ایک قدرِ مشترک ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے ہوں، گورے ہوں یا کالے ہوں، مسلمان ہوں یا یہودی، عیسائی، بدھ، ہندو، سکھ اور پارسی ہوں، یا مشرک اور دہریئے ہوں۔ تمام انسانوں کے درمیان دو چیزیں مشترک ہیں جنہیں اس آیۂ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ خطاب فرمایا گیا۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ یعنی 'اے بنی نوع انسان'...... 'اے لوگو!' اب وہ دو مشترک چیزیں بیان فرمائی جا رہی ہیں۔ پہلی چیز ہے اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ "ہم نے تم سب کو پیدا کیا"...... بنی نوع انسان کے دو یا چار خالق نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ گوروں کو پیدا کرنے والا کوئی گورا خدا ہو اور کالوں کا خالق کوئی کالا خدا ہو۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ایسا بھی نہیں ہے کہ مشرق کے رہنے والوں کا خالق کوئی اور ہو اور مغرب والوں کو پیدا کرنے والا کوئی اور ہو۔ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ مشرق و مغرب سب کا اللہ ہی مالک ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ مسلمان کا خالق کوئی اور خدا ہو اور غیر مسلم کا خالق کوئی اور خدا ہو بلکہ سب کا خالق صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے۔ جیسا کہ ہم سورۃ التغابن میں پڑھ آئے ہیں کہ: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط۔ "وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تم سب کو پیدا

کیا۔ پھر تم میں کوئی کافر ہے اور کوئی تم میں مومن ہے"...... یوں سمجھئے کہ یہاں وحدتِ خالق اور وحدتِ الٰہ بیان ہوئی۔ یہ وہ مشترک قدر ہے جو تمام نوعِ انسانی کو ایک رشتے میں منسلک کرتی ہے۔ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ "ہم نے تم سب کو پیدا کیا" یہ پہلی قدرِ مشترک کا بیان ہوا۔ دوسری قدرِ مشترک کیا ہے! وہ ہے: مِنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی...... "ایک مرد اور ایک عورت سے"۔ یہ وحدتِ آدم اور وحدتِ حوا کا ذکر ہوا۔ تمہاری نسلیں کتنی ہی مختلف ہیں، تمہاری رنگتیں کتنی ہی جدا ہیں، تمہارے نقوش، تمہاری شکلیں، تمہاری شباہتیں کتنی ہی مختلف ہیں، تمہاری زبانیں کتنی ہی جدا ہیں، لیکن تم سب اصل میں ایک ہی نسل ہو، تم سب کے سب آدم اور حوا کی اولاد ہو۔ پس یہ دو مشترک قدریں ہیں جو تمام نوعِ انسانی کو ایک وحدت کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں اور چونکہ یہ دو چیزیں وہ ہیں جو تمام انسانوں سے متعلق ہیں، لہٰذا یہاں خطاب یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ سے ہوا۔

اس کے بعد ایک بڑی اہم حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ قوموں اور قبیلوں کی جو تقسیم بالفعل موجود ہے وہ بھی ہماری پیدا کردہ ہے۔ یعنی یہ تقسیم بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں بڑا افراط و تفریط کا معاملہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم کبھی جوش و جذبہ میں آکر اس تقسیم و تفریق کی بالکل نفی کر دیتے ہیں، جبکہ قرآن مجید اس کو تسلیم کر رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قومی خصائص بھی ہوتے ہیں، قبیلوں کی بھی اپنی چند خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں واقعی اور فطری ہیں۔ زبانوں کا فرق ہے تو وہ حقیقی ہے۔ اسی طریقہ سے شکل و شباہت کا فرق ہے، چہروں کے نقوش جدا ہیں، رنگتوں میں فرق ہے۔ کوئی گورا ہے، کوئی کالا ہے، کوئی گندمی اور زرد رُو ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ ایک شخص کو دیکھتے ہی ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ چینی ہے یا حبشی ہے۔ وقِس علی ھذا ......

اُس شخص سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس سے آپ نے کچھ پوچھا نہیں اور صرف ظاہری رنگ اور نقوش سے پہچانتے ہی آپ نے اس کا سارا جغرافیائی پس منظر بھی جان لیا اور اس کا پورا تاریخی پس منظر بھی آپ کو معلوم ہو گیا۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت تعارف کیلئے ہیں، پہچان کیلئے ہیں، چنانچہ فرمایا گیا وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط...... "اور ہم نے بنائیں تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو"...... آپ خود سوچئے کہ اگر تمام انسان ایک رنگت کے ہوتے، تمام انسانوں کے نقوش ایک جیسے ہوتے تو کتنی یکسانیت (MONOTONY) ہوتی اور یہ کس قدر اکتاہٹ (BORING) والی کیفیت اور کتنی

بیزار کن صورت ہوتی۔ اس اختلاف اور فرق وتفاوت میں حُسن ہے۔ ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!

تو اس تقسیم وتفریق اور اختلاف میں جو بہتری کا پہلو ہے اُسے سامنے رکھا جانا چاہئے۔ ورنہ سوچئے کہ کتنا پریشان کن معاملہ ہوتا اور کیسے پہچانتے کہ یہ کون ہے! بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جڑواں اور ہم شکل بھائیوں یا بہنوں کے معاملے میں بڑے مغالطے ہوتے ہیں اور بہت سے لطیفے وجود میں آتے ہیں۔ ان کے مابین تمیز وامتیاز بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ فرق وتفاوت اور یہ اختلاف وامتیاز بالکل فطری (NATURAL) ہے اور اس کا ایک مقصد ہے۔ اس کا ایک بڑا تمدنی فائدہ یہ ہے کہ لِتَعَارَفُوْا "تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو"۔ اس کی نفی کرنا اسلام کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ البتہ اس کی بنیاد پر انسانوں میں اونچ نیچ کا تصوّر قائم کرنا کہ فلاں نسل اعلیٰ ہے اور فلاں ادنیٰ، نوعِ انسانی کا فلاں طبقہ بڑھیا ہے اور فلاں گھٹیا...... یہ ہے بالکل غلط نظریہ اور سراسر غلط تصوّر۔ یہ انسانوں کے درمیان فساد، نفرت اور عداوت پیدا کرنے والا تصور ونظریہ ہے۔ یہ اونچ نیچ اور اعلیٰ وادنیٰ کی تقسیم اس فطری فرق وتفاوت کا بالکل غلط استعمال ہے، جسے قرآن حکیم تسلیم کر رہا ہے کہ: وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا "اور ہم نے تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنائے تاکہ تم باہم ایک دوسرے کو پہچانو" ــــــــ لیکن ایک بنائے شرف، بنائے عزّت بھی اللہ نے رکھی ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ...... جان لو کہ اللہ کے نزدیک تو تمہارے مابین اونچ نیچ کا معاملہ صرف ایک بنیاد پر ہے اور وہ بنیاد رنگ نہیں ہے، خون نہیں ہے، نسل نہیں ہے، وطن نہیں ہے، زبان نہیں ہے، شکل وصورت نہیں ہے، قومیت نہیں ہے، بلکہ وہ بنیاد ہے تقویٰ، خداترسی، پرہیزگاری، نکوکاری، اعلیٰ سیرت وکردار، اعلیٰ اخلاق اور احسن معاملات۔ اللہ کے نزدیک کوئی اونچا ہے تو ان اوصاف کی بنیاد پر اور کوئی نیچا ہے تو ان کے فقدان کی بناء پر۔ اونچ نیچ اور شرافت ورذالت کیلئے اس کے سوا اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔

اب اس آیت کے آخری حصے پر نگاہوں کو مرتکز کیجئے۔ فرمایا جارہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○ "اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، باخبر ہے" ...... ان الفاظ کے ذریعہ سے اس وسوسے کا سدِباب کر دیا گیا کہ تقویٰ تو دل میں ہوتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم، ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص بہروپیا ہو، متقیوں جیسی صورت وشکل بنالے اور لباس پہن لے، نیز محض ریاء وسُمعہ

کیلئے ظاہری طور پر خوش خلقی اور حسنِ سیرت و کردار کا ملمع چڑھا رہے تو ٹھیک ہے کوئی شخص اس طرح بہروپ اور سوانگ کے ذریعہ سے دنیا میں اپنا کوئی رعب گانٹھ بھی لے تو وہ اللہ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اللہ علیم ہے، خبیر ہے۔ وہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے! کون واقعتاً خداترس ہے اور کون صرف دکھاوے کے لئے متقی بنا ہوا ہے! جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خَشْيَةُ اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَ الْعَلَانِيَةِ اصل تقویٰ وہ ہے جو خلوت میں بھی ہو جلوت میں بھی ہو۔ اگر صورت یہ ہو کہ ع چوں بخلوت می روند را کارِ دیگری کنند۔ تو پھر یہ بہروپ ہے، تقویٰ نہیں ہے۔ پس اگر تمہارا اپنے رب کے ساتھ تعلق ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ رب تو علیم ہے، خبیر ہے اور اس تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ وہ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ اور وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ "اگر تم اپنے جی کی بات ظاہر کرو گے یا اس کو چھپاؤ گے، اس کا وہ (اللہ) تم سے حساب لے لے گا"۔

اب اس پوری آیت کے بارے میں یہ بات نوٹ کیجئے کہ اس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رخ تو اس مضمون کی طرف ہے جو پچھلے سبق میں آچکا ہے کہ استہزاء اور تمسخر نہ کرو، کسی کا مذاق نہ اڑاؤ، فقرے چست نہ کرو، کسی کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو، کسی کے برے نام نہ رکھو، کسی کی ٹوہ میں نہ لگو، خواہ مخواہ کی بدگمانی سے بچو، کسی کی غیبت نہ کرو، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ باہمی اخوت ہو، محبت ہو، ہمدردی اور دمسازی ہو۔ تو اس کے لئے جو اصول اس آیت میں سامنے آیا بڑی بنیادی اہمیت کا حامل ہے...... حقارت کیوں ہوتی ہے! اپنے آپ کو بڑھیا سمجھنے کی وجہ سے۔ کوئی اپنے آپ کو اعلیٰ نسل کا سمجھتا ہے تو وہ ہر دوسرے کو ادنیٰ نسل کا سمجھے گا۔ اگر کسی کو اپنے کسی خلقی وصف پر...... جیسے رنگت یا اچھی شکل و صورت۔ کوئی غرور پیدا ہو رہا ہے تو وہ ان وجوہ کی بناء پر دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، اور ان کا تمسخر و استہزا کرے گا، حالانکہ یہ تمام چیزیں اختیاری نہیں ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں...... لہٰذا اس آیت میں اس اصل مرض کی جڑ کاٹ دی گئی، غرور کی علت پر تیشہ چلا دیا گیا کہ میں بڑا ہوں، میں اعلیٰ ہوں، میں اونچا ہوں۔ یہی وہ پندار ہے جو دوسرے کو حقیر اور ادنیٰ سمجھنے اور اس کا استہزا و تمسخر کرنے پر ایک دنی الطبع شخص کو آمادہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں یہ حقیقت بیان کر دی گئی کہ تمام انسان، انسان ہونے کے ناطے ایک ہیں۔ ان کا خالق بھی ایک اور ان کا جدِ امجد بھی ایک ہے۔

اسی بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا تھا:

لیس لعربی علی عجمی فضل ولا لعجمی علی عربی فضل ولا لاسود علی احمر فضل ولا لاحمر علی اسود فضل الا بالتقوی   کلکم بنو آدم وآدم من تراب

"نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت ہے اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت ہے۔ بنائے فضیلت صرف تقویٰ ہے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے تخلیق ہوئے تھے۔"

اس آیتِ مبارکہ کا دوسرا رخ اس اعتبار سے ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر دنیا میں انسانوں کی تقسیم دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ ایک افقی (HORIZONTAL) تقسیم ہے اور ایک عمودی (VERTICAL) تقسیم ہے۔ افقی تقسیم یہ ہے کہ کوئی اونچا ہے، کوئی اس سے بھی اونچا ہے، کوئی اعلیٰ ہے، کوئی ادنیٰ ہے۔ یہ تو ہے درجوں کا تفاوت۔ اور عمودی تقسیم جس سے معاشرے ایک دوسرے سے الگ تھلگ (ISOLATE) ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اور سوسائٹی ہے، وہ اور سوسائٹی۔ یہ جرمن سوسائٹی ہے، وہ انگلش سوسائٹی۔ یہ فلاں ریاست ہے اور وہ فلاں ریاست۔ یہ فلاں قومیت ہے، وہ فلاں قومیت...... تو یہ دو تقسیمیں ہیں۔ دنیا میں عام طور پر پہلی تقسیم نسل، رنگ، خون اور وطن کی بنیاد پر ہے۔ اسلام نے تو اس کی بالکلیہ جڑ کاٹ دی کہ یہ اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کی رنگ، نسل، خون اور وطن کی بنیاد پر تقسیم اپنی اصل کے اعتبار سے فساد ہے، فتنہ ہے، انسانیت کی توہین و تذلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرف و عزت اور اکرام و اعزاز کا معیار اعلیٰ سیرت و کردار، حسنِ اخلاق، حسن معاملات، نکوکاری، پرہیزگاری اور خدا ترسی یعنی تقویٰ ہے۔

اب ہے دوسری عمودی تقسیم...... اور یہ تقسیم اسلام بھی کرتا ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ بہرحال علیحدہ مشخّص ہے ایک غیر اسلامی معاشرے سے۔ ایک اسلامی ریاست ممیّز (DEMARKATE) ہوتی ہے ایک غیر اسلامی ریاست سے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ عمودی تقسیم کس بنیاد پر ہے! تو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس تقسیم کی بنیاد نہ نسل ہے، نہ رنگ ہے، نہ خون ہے، نہ قوم و وطن ہے اور نہ ہی زبان ہے۔ یہ بنیاد ہے نظریہ، عقیدہ، خیالات اور اصول...... یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننے والے ہیں، یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہیں۔ یہ بعث بعد الموت، حشر و نشر، جنت و دوزخ اور محاسبۂ اخروی کو ان تفاصیل کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں، جن کی خبر دی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز، قرآن

مجید میں اور جن کی خبر دی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات وفرمودات گرامی میں..... اسلام کی اصطلاح میں اس تسلیم ویقین کا نام ایمان ہے۔

حاصلِ گفتگو یہ نکلا کہ اسلام نے اس چیز کی کلی نفی کر دی جو افقی (HORIZONTAL) اور عمودی (VERTICAL) دونوں سطحوں پر نوعِ انسانی کو تقسیم کر رہی تھی۔ اسلام میں جو افقی تقسیم ہے وہ ہے تقویٰ یعنی نکوکاری' خدا ترسی اور پرہیزگاری کی بنیاد پر..... اور عمودی تقسیم یعنی اسلامی معاشرہ غیر اسلامی معاشرہ سے علیحدہ اور ممیز ہو گا' وہ ہو گا نظریہ و عقیدہ یعنی ایمان کی بنیاد پر..... پھر یہ بات پیش نظر رکھئے کہ کوئی انسان اپنی چمڑی کی رنگت بدل نہیں سکتا۔ وہ چاہے سو برس سے امریکہ میں رہ رہا ہو' وہ کالا ہی ہے۔ للٰہذا ایک ملک میں رہنے کے باوجود کالوں کا معاشرہ علیحدہ ہو گا' گوروں کا معاشرہ علیحدہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص انگلش نسل سے ہے تو وہ جرمن نسل کا شمار نہیں ہو سکتا۔ یہ حدود تو وہ ہیں جن کو انسان CROSS نہیں کر سکتا' ان کو پھلانگ نہیں سکتا۔ یہ رکاوٹیں (BARRIERS) مستقل ہیں۔ جبکہ نظریئے اور خیالات کے BARRIERS تو آناً فاناً ختم ہو جاتے ہیں۔ آج کوئی شخص کلمہ شہادت ادا کرتا ہے تو فی الفور وہ مسلمان معاشرے کا باعزّت فرد بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو خواہ ہندو سوسائٹی میں شودر ہو' اچھوت ہو' جس کا ہندو معاشرے کے اندر سڑک کے درمیان سے گزرنا بھی ممنوع ہو اور اس کے کانوں میں اگر وید کے اشلوک پڑ جائیں چاہے اس کی نادانستگی میں پڑے ہوں تو ہندو دھرم کی رو سے اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالنا لازم ہو جائے۔ لیکن آج اگر وہ کلمہ پڑھ لے تو وہ سیدزادے کے ساتھ' شیخ الاسلام کے ساتھ' بڑے سے بڑے مسلمان کے ساتھ بھی کاندھے سے کاندھا ملا کر مسجد میں نماز میں کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ نومسلم ہر مسلمان کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھا سکتا ہے اور ایک ہی برتن سے پانی پی سکتا ہے' جبکہ پیدائشی شودر ہندو دھرم میں ہمیشہ ہمیش کے لئے اچھوت اور ناپاک رہتا ہے چاہے وہ تعلیم میں' کردار میں' اخلاق میں پیدائشی برہمن سے کتنا ہی ترقی یافتہ ہو..... ایمان کی تقسیم وہ نہیں ہے کہ جو مستقل بالذات ہو۔ یہ تقسیم تو وہ ہے کہ انسان جب چاہے اس رکاوٹ (BARRIER) کو عبور کرے اور اسلامی معاشرے میں شامل ہو جائے۔

اس سلسلے میں ایک اہم بات میں یہ عرض کروں گا کہ اس آیتِ مبارکہ کی جدید دنیا کے اعتبار سے خاص اہمیت ہے۔ دیکھئے جدید دنیا میں بین الاقوامی اور عالمی سطح پر ایک عجیب DILEMMA' ایک عقدۂ لاینحل پیدا ہو گیا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے فاصلے قریباً ختم کر دیئے ہیں۔ اب پوری دنیا کی حیثیت ایسی ہے جیسے کسی زمانہ میں ایک شہر ہوتا تھا اور اس کے محلے ہوتے

تھے۔ ذرائع ابلاغ و مواصلات اتنے ترقی کر گئے ہیں کہ فاصلے قریباً معدوم کے درجے میں آ گئے ہیں۔ کوئی EVENT کوئی واقعہ امریکہ میں ہو رہا ہو' اسے آپ ٹیلی ویژن پر براہِ راست یہاں بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ لیکن ظاہر اور خارج میں یہ فاصلے اتنے کم ہو جانے کے باوصف دلوں کے فاصلوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دل پھٹے ہوئے ہیں۔ کوئی قدرِ مشترک موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ میں رہنے والا کالا اور گورا علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان کے دلوں کو جوڑنے والا کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید دور کی مادیت اور الحاد نے یہ دونوں بنیادیں منہدم کر دی ہیں۔ نہ وحدتِ خالق و الٰہ باقی رہی' نہ وحدتِ آدم و حوا باقی رہی۔ کوئی تیسری چیز ہے ہی نہیں جو انہیں جوڑ سکے۔ ایک انگریز کو ایک جرمن کے ساتھ کون سی چیز جوڑے! ایک چینی کو روسی کے ساتھ کون سی چیز ہے جو جوڑ سکے! ایک جاپانی اور ایک ماریطانیہ کے رہنے والے کے مابین کون سی قدرِ مشترک ہے جو ان کو ایک رشتہ میں منسلک کر سکے!! یہ ہے وہ DILEMMA جس سے آج کی دنیا دوچار ہے' جبکہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ نوعِ انسانی ایک وحدت بنے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اس کی شدید ضرورت ہے کہ نیشنل اسٹیٹس ختم ہو جائیں اور ایک عالمی اسٹیٹ قائم ہو۔ ورنہ نوعِ انسانی ہلاکت کے سخت خطرے سے دوچار ہے۔ اگر کہیں حادثاتی طور پر عالمی جنگ شروع ہو گئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا انجام ہو گا! شاید یہ نوعِ انسانی کی اجتماعی خودکشی بن جائے۔ لیکن اس خطرے کے ادراک و شعور اور اس کے تدارک کے احساس کے باوجود دلوں کو قریب لانے والی انسان کی اپنی سوچ کسی مضبوط' پائیدار اور ٹھوس بنیاد تلاش اور فراہم کرنے میں تاحال ناکام و قاصر رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد پہلا تجربہ لیگ آف نیشنز کا کیا گیا اور وہ ناکام ہوا۔ اس لئے کہ جب فکر میں کوئی بنیاد نہیں' دلوں میں جگہ نہیں تو محض ساتھ بیٹھنے اور اپنے اپنے مفادات کی راگنی راگنے اور ان کے تحفظات کے لئے جائز و ناجائز طور پر اس نام نہاد عالمی ادارے کو استعمال کرنے سے مسائل تو حل نہیں ہو جائیں گے' بلکہ وہ تو مزید الجھیں گے اور ان کے نتائج پہلے سے بھی زیادہ خطرناک نکلیں گے' جیسا کہ بیس برس بعد ہی دوسری عظیم ترین جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کی صورت میں نکلے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ ؎

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

لیگ آف نیشنز کی ناکامی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تنظیم اقوام متحدہ (UNO) اور اس کی قائم کردہ سلامتی کونسل کا جو تجربہ ہوا ہے، وہ بھی لیگ آف نیشنز سے بہتر ہونے کے بجائے اس سے کہیں زیادہ ناکام ثابت ہوا ہے۔ اسرائیل اور چند دوسرے ممالک جس طریقے سے ان اداروں کے متفقہ فیصلوں کو بھی DEFY کرتے ہیں اور ٹھوکر مار دیتے ہیں، ان سے پوچھنے اور ان کے خلاف کوئی مؤثر اقدام کرنے کے لئے نہ سلامتی کونسل آمادہ ہے اور نہ UNO کا پورا ادارہ...... عالمی سطح پر یہ جو ناکامیاں (FAILURES) ہیں اور یہ جو پیچیدگیاں ہیں، ان کا سبب یہی ہے کہ وہ فکر موجود نہیں ہے جو انسان کو انسان کے قریب لا سکے۔ نوعِ انسانی کی یہی ضرورت ہے جو یہ آیتِ مبارکہ پوری کر رہی ہے۔ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط......

اب میں کیا مرثیہ کہوں اور کیا ماتم کروں کہ جن کے پاس یہ دولت ہے، اُن کے اپنے افلاس کا حال یہ ہے کہ وہ خود ہی منقسم ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

ہم پر ویسٹرن امپیریلزم کا جو سب سے بڑا کاری وار ہوا ہے وہ یہ ہے کہ علاقائی نیشنلزم کے ہلاکت خیز جراثیم انہوں نے ہمارے اندر بھی پیدا کر دیئے۔ مثال کے طور پر عربوں کے حالِ زار پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ ویسٹرن امپیریلزم نے عربوں میں علاقائی اور وطنی زہر کے جرثومے اس طور پر INJECT کئے ہیں کہ مصریوں کے لئے اب یہ بات بنائے فخر ہے کہ وہ مصری ہیں۔ شامیوں کے لئے بنائے فخریہ نعرہ بن گیا کہ وہ شامی ہیں۔ یہی حال عراق، سعودی عرب اور یمن کا ہے۔ وقس علی ھذا...... ایک قوم، ایک زبان بولنے والے، اکثر و بیشتر نسل ایک، عظیم ترین اکثریت کا دین ایک، لیکن علاقائی نیشنلزم (TERRITORI-AL NATIONALISM) کی جو تنگ گھاٹیاں بنا کر یورپی استعمار نے ان کو چھوڑا تھا تو وہ اس سے نکل نہیں پا رہے اور یہی ہماری ذلت و رسوائی اور نکبت و مسکنت کا اصل سبب ہے۔ کاش! ہم مسلمان خود اپنے معالجہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس آیتِ مبارکہ کو اپنے لئے روشنی کا ایک مینار بنا لیں۔ پہلے ہم خود وحدتِ الٰہ و وحدتِ آدم یعنی وحدتِ انسانی ہی کی بنیاد پر ایک ملت بن جائیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

ہم اگر دنیا کو یہ نقشہ دکھلا دیں تو بقیہ نوعِ انسانی کو بھی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

آج اسی ایک آیتِ مبارکہ کے بیان پر اکتفا کیجئے۔ آج کے بیان کے ضمن میں کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال...... ڈاکٹر صاحب! مسلمان سب سے زیادہ علاقائی اور وطنی قومیت اور تقسیم کا شکار رہے ہیں۔ اس کا آپ نے تجزیہ تو کیا لیکن اس پر روشنی نہیں ڈالی کہ اس کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب...... مجھے آپ کی اس بات سے اختلاف ہے کہ اس تقسیم کے سب سے زیادہ مسلمان شکار رہے ہیں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے اور نہ ایسا کوئی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ہمارے یہاں تو وحدتِ ملت اتنی مضبوط رہی ہے کہ تاریخ انسانی میں کسی اور قوم اور کسی اور ملت کے اندر اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس وقت ہمارے یہاں جو تفرقے اور تقسیمیں ہیں وہ تو ماضی قریب میں یورپی استعمار کی ریشہ دوانیوں کا شاخسانہ ہے۔ ورنہ صورتِ حال یہ رہی ہے کہ اگرچہ ممالک جدا جدا ہوتے تھے کہ یہ صفوی حکومت ہے' یہ مغلیہ حکومت ہے' یہ افغانستان کی حکومت ہے۔ یہاں سے سلطنتِ عثمانیہ کی سرحدیں شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن ان سب کی حیثیت ADMINISTRATIVE UNIONS کی تھی۔ ایک مسلمان ہر مسلم ملک کا شہری شمار ہوتا تھا۔ کسی سے پوچھا نہیں جاتا تھا کہ تمہاری نیشنلٹی کیا ہے اور تمہارے پاس پاسپورٹ کہاں کا ہے! تمام عالم اسلام کی شہریت ہر مسلمان کو حاصل تھی۔ یہ تو جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو کے دوران عرض کیا تھا کہ ویسٹرن امپیریلزم نے ہم پر جو کاری وار لگائے ہیں یہ اس کا شاخسانہ ہے اور اس کا سلسلہ انیسویں صدی کے نصف سے شروع ہوا اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں انتہاء کو پہنچا۔ پہلی جنگ عظیم میں عربوں کی عربیت کو بھڑکا کر ترکوں کے خلاف بغاوت کرائی گئی۔ اس کے بعد عربوں سے جو وعدے کئے گئے تھے ان کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ تمام معاہدے ریت کے گھروندوں کی طرح بکھیر دیئے گئے اور عربوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ ویسٹرن استعمار کے یہ ہتھکنڈے اور یہ سازشیں تاحال جاری ہیں کہ عرب متحد نہ ہونے پائیں۔ یہ اسی کے زخم ہیں جو تاحال ہمارے جسدِ ملی میں رس رہے ہیں۔ ہمیں ان زخموں کو

بھرنا ہو گا۔ اس کا اصل سبب ہے اپنے دین سے دوری 'قرآن مجید سے بُعد' تعلق مع اللہ میں ضعف 'ایمان بالآخرت میں اضمحلال۔ اگر ہم اللہ سے اپنا تعلق مضبوط کریں گے۔ حبل اللہ یعنی قرآن مجید کو مضبوطی سے تھامیں گے 'نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو اختیار کریں گے تو قریب سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہمارے لئے بمنزلہ مرکز ہے۔ حضورؐ کے اتباع کو ہم جتنا لازم کرتے چلے جائیں گے اتنا ہی مرکز سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ ملت مسلمہ کے موجودہ انتشار کا اصل سبب دین سے دوری 'قرآن حکیم سے بُعد اور اللہ تعالیٰ سے تعلق میں ضعف ہے لہٰذا اس کا علاج اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو مضبوط بنانا ہے اور اس حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنا ہے اور ؏ "بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست" کے مصداق خود کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں تک پہنچانا ہے۔

حضرات! آج بہت اہم باتیں سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۳ کے مطالعے اور اس پر تدبر کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے ہمارے ذہنوں اور ہمارے دلوں کو کھول دے اور ہمیں اس بات کی توفیق دے کہ ہم پہلے مسلمانوں کے اندر اس تعلیم کا ایک نمونہ عملاً پیش کریں تاکہ پھر پوری نوعِ انسانی کے لئے رہنمائی اور ہدایت کا چراغ روشن کر سکیں۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

خطاب جمعہ
ڈاکٹر اسرار احمد
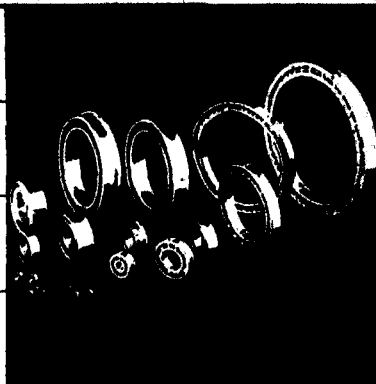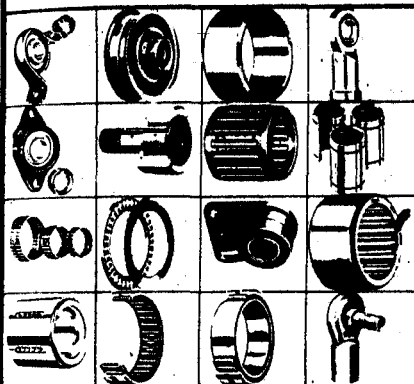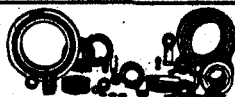
ملکی و بیرونی حالات کا ایک جائزہ

اور

بھارت کی ثقافتی یلغار کے سدِّباب کا قرآنی طریقہ

خطبہ مسنونہ ' سورۃ العلق کی ابتدائی آٹھ آیات کی تلاوت اور ادعیہ مسنونہ و ماثورہ کے بعد فرمایا:

حضرات! میری آج کی گفتگو کی ترتیب اس طرح ہوگی کہ میں ابتداء میں ملک کے سیاسی حالات کے متعلق چند امور پر اظہارِ خیال کروں گا اور پھر آخر میں سورۃ العلق کی اُن ابتدائی آٹھ آیات کے حوالے سے کچھ گفتگو ہوگی ' جن کے بارے میں پچھلے جمعہ کو الحمدللہ بڑی مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ آج کی یہ دونوں گفتگوئیں مل کر گزشتہ جمعہ کی گفتگو کا تکملہ و تتمّہ بنیں گی اور انشاء اللہ ان میں آپ کو باہمی ربط نظر آئے گا۔

ملکی حالات کا جائزہ

ملکی حالات کے بارے میں ظاہر بات ہے کہ ہمیں پہلے اپنے اندرونی معاملات کا جائزہ لینا ہے اس لئے کہ ہر باشعور شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ حالات پھر بڑی تیزی کے ساتھ مخدوش ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ الیکشن کی گہما گہمی کے بعد ایک تھوڑی مدت کا وقفہ ایسا آیا تھا کہ ایک امید افزا صورت نظر آئی تھی۔ یقیناً اب بھی بعض پہلوؤں سے جمہوریت کی بحالی کے کچھ اچھے اثرات برقرار بھی ہیں ' جن کی طرف میں آگے چل کر اشارہ کروں گا۔ لیکن بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو اس وقت حالات پھر بڑے دگرگوں نظر آرہے ہیں۔ نہ صرف اندرونی و داخلی بلکہ بیرونی بھی۔

بلوچستان ــــــ پُرسکون صورتِ حال

حیران کن بات یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ملک کا جو سب سے زیادہ پرسکون صوبہ ہے' وہ صوبہ بلوچستان ہے۔ وہاں اس وقت تک کوئی بحران (CRISIS) نہیں ہے۔ ایک مخلوط حکومت ہے اور وہ وہاں ہمواری سے چل رہی ہے اگرچہ اس کے بارے میں بھی اندیشہ موجود ہے' چونکہ جے یو آئی اور بی این اے یعنی جمعیت علمائے اسلام (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) اور بلوچستان نیشنل الائنس کے مابین ایک خاص معاملے میں شدید اختلاف ہی نہیں' بلکہ شدید تضاد ہے اور وہ ہے جہاد افغانستان کا معاملہ...... اس معاملہ میں ان دونوں کے درمیان نظریاتی و عملی طور پر کافی بُعد اور تضاد ہے۔ "ہفت روزہ ندا" کے تازہ شمارے (۲۱ مارچ ۸۹ء) میں جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کے ایک ممتاز رہنما اور بلوچستان کی مخلوط کابینہ کے ایک وزیر حافظ حسین احمد صاحب کا ایک مفصل انٹرویو آیا ہے۔ حافظ صاحب حال ہی میں بلوچستان کی سطح پر ایک بہت نمایاں دینی اور سیاسی شخصیت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کے والد ماجد مولانا عرض محمد مرحوم سے جو بلوچستان کی ایک ممتاز دینی شخصیت تھے' میری چند ملاقاتیں ۶۷ء میں رہی ہیں جب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی سرکردگی میں "تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک ہیئتِ اجتماعیہ کے قیام کی کوشش ہوئی تھی اور میں مولانا اصلاحی کا ہم سفر تھا۔ اس وقت تو یہ تنظیم قائم نہیں ہو سکی البتہ بعد میں اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے ۷۵ء میں یہ تنظیم میری دعوت پر تشکیل پائی اور بحمد اللہ اپنی بساط کے مطابق وہ کسی نہ کسی درجے میں پاکستان میں اقامتِ دین کی انقلابی نہج پر جدّوجہد کر رہی ہے تو ۶۷ء میں مولانا عرض محمد مرحوم و مغفور کوئٹہ سے سفر کر کے سکھر صرف اس مجوّزہ تنظیم کے متعلق گفتگو کرنے تشریف لائے تھے۔ مرحوم بہت ہی سنجیدہ' متین اور نہایت ہی وسیع القلب عالم دین تھے۔ حافظ حسین احمد صاحب نے اپنے انٹرویو میں اپنے والد مرحوم کے کاموں کا تعارف تو کرایا ہے لیکن نام بیان نہیں کیا۔ مجھے دو تین دن قبل ہی معلوم ہوا ہے کہ حافظ صاحب مولانا عرض محمد مرحوم کے صاحبزادے ہیں' اس اعتبار سے میں ان سے ایک دلی قرب محسوس کرتا ہوں' اگرچہ تاحال میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال اس انٹرویو میں انہوں نے کہا ہے کہ اگر جہادِ افغانستان کے مسئلہ پر حکومت بلوچستان کی سطح پر کوئی اختلاف ہوا تو ہم ڈٹ کر بگٹی صاحب کا مقابلہ کریں گے اور اپنے موقف پر قائم رہیں گے کہ جہادِ افغانستان صرف افغانستان ہی کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا جہاد ہے اور صرف اسلامی جذبے

کے تحت ہم اس کے حامی ہیں۔ بگتی صاحب سے ہمارا معاہدہ ہے کہ وہ افغان جہاد کی مخالفت نہیں کریں گے' وہاں کے اندرونی معاملات میں روسی اور امریکی دونوں کو عدم مداخلت کا رویہ اختیار کرنے اور روسی فوجوں کی واپسی پر زور دیں گے اور دونوں ملک وہاں کے اندرونی مسئلہ کو افغان نمائندوں پر چھوڑ دیں گے۔ اب بگتی صاحب اس معاہدے پر کس حد تک کار بند رہتے ہیں یہ آگے کا معاملہ ہے۔ چنانچہ ایک یہ خطرہ تو ہے کہ اس ISSUE کا ان دونوں کے اتحاد پر کوئی منفی اثر پڑے...... اللہ کرے ایسا کوئی مرحلہ نہ آئے اور یہ صوبائی حکومت ہمواری سے چلتی رہے۔ رہا افغانستان کا اندرونی مسئلہ تو میں جب آگے بیرونی معاملات پر گفتگو کروں گا تو افغان جہاد جس نازک مرحلہ تک پہنچا ہوا ہے اس کے متعلق قدرے تفصیل سے حالات کا تجزیہ پیش کروں گا۔

سندھ ـــــ تشویش ناک اندیشے

اب صوبہ سندھ کی طرف آیئے تو اگرچہ وہاں بھی ایک مخلوط حکومت ہے لیکن اس مخلوط حکومت کا معاملہ دگرگوں نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ "ندا" کے اسی تازہ شمارے میں ایک تجزیہ شامل ہے کہ وہاں ایم کیو ایم کسی وقت اچانک فیصلہ کر سکتی ہے کہ وہ اس کولیشن کو ختم کر کے حزبِ اختلاف کی صورت اختیار کر لے۔ سندھ کی حد تک اس کولیشن کے ٹوٹنے سے کوئی بڑا بحران پیدا نہیں ہو گا چونکہ پیپلز پارٹی وہاں بہت بڑی اکثریت میں ہے لیکن یہ جو دو متحارب گروہوں یا لسانی قومیتوں کی تقسیم ہے' اس کے اعتبار سے معاملہ در حقیقت مخلوط حکومت کے ٹوٹنے کا نہیں ہو گا بلکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان میں باہمی مفاہمت اور اتحاد کا جو امکان نظر آیا تھا اُسے شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ وہاں قدیم سندھیوں میں جدید سندھیوں یعنی مہاجروں کے خلاف کچھ تو ہماری بے تدبیریوں کے باعث اور کچھ جمہوریت کی گاڑی روک دینے اور پے در پے مارشل لاء کے نفاذ نے ایک شدید احساسِ محرومی پیدا کر دیا ہے جس کے اہداف مہاجر بھی بنتے ہیں اور پنجابی بھی...... پھر انہی بے تدبیریوں کے سبب سے نئے سندھی جو تقسیم کے بعد صوبہ سندھ خاص طور پر کراچی میں آباد ہوئے ہیں وہ اب پانچویں یعنی مہاجر قومیت ہونے کے مدعی ہیں تو ان قدیم اور جدید سندھیوں میں شدید اختلافات ہیں' حتیٰ کہ ان میں کئی بار شدید تصادم بھی ہو چکا ہے یہ چنگاری اب بھی موجود ہے۔ ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ مخلوط حکومت رہے یا نہ رہے' لیکن ان دو گروہوں میں صوبہ کی سطح پر مفاہمت اور بھائی چارے کی فضا برقرار رہے اور مخلوط حکومت کا ٹوٹنا امن و امان کے بگاڑ کا سبب نہ بنے۔

ایم کیوایم کو شکایت ہے کہ اتحاد کا جو معاہدہ ہوا تھا سندھ اور مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی کسی درجے میں بھی رعایت نہیں کی جا رہی ہے۔ اگر خدانخواستہ ان دونوں گروہوں میں محاذ آرائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اس کے نتائج بڑے خوفناک ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ انتہائی منظم ہیں۔ ایم کیوایم کا منظم ہونا تو الیکشن میں ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے قریباً تمام امیدوار اسی اسی اور نوے نوے ہزار ووٹوں کی برتری سے صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے الیکشن جیتے ہیں چنانچہ مفاہمت کے ختم ہونے کے اندیشے کی خبریں انتہائی تشویش ناک ہیں۔

دوسری طرف اندرونِ سندھ سندھی نیشنلزم کے پرستار جو انتہاپسند لوگ ہیں' ان کے متعلق میں نے گذشتہ جمعہ کو عرض کیا تھا کہ انہوں نے الیکشن میں اپنی شکست کو عارضی طور پر قبول کیا تھا۔ وہ اب پورے طور پر جوابی وار کرنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ اس کے بارے میں حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کا ایک اہم مضمون ۸ر مارچ ۸۹ء کے جنگ میں شائع ہوا ہے اور انہوں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ علاقائی قومیت کے علمبردار سندھی انتہاپسند جوابی کارروائی کے لئے زور وشور سے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ میں تو اندرونِ سندھ سندھی انتہاپسند گروہ میں مہاجرین' پنجاب اور نظریۂ پاکستان کے خلاف جو لاوا پک رہا ہے' اس کے متعلق اپنے مشاہدات کے بارے میں "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" نامی کتاب میں تفصیل سے تحریر کر چکا ہوں۔ اب وہاں جو بھی حالات سامنے آ رہے ہیں وہ میرے تجزیہ کی توثیق وتصدیق اور تائید کر رہے ہیں۔ میں آخری درجے میں بات کہہ چکا ہوں اور اب میرے پاس کہنے کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لیکن حافظ محمد موسیٰ بھٹو سندھی ہیں اور دین کے ساتھ ان کی وابستگی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ بہت ہی مذہبی اور صوفی مزاج شخص اور دانشور ہیں۔ جی ایم سید کا جس طرح انہوں نے فکری محاذ پر مقابلہ کیا ہے اور کر رہے ہیں اس پر واقعہ یہ ہے کہ وہ پوری پاکستانی قوم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ مجھ سے تو ان کو کچھ اختلافات ہیں' وہ اپنی جگہ' لیکن ان کی جو خدمات ہیں وہ بڑی قابلِ قدر ہیں۔ انہوں نے جس طرح سندھی نیشنلزم اور خاص طور پر جی ایم سید کے مخالفِ دین نظریات کی نفی کی ہے اور اُسے جس طرح سندھی عوام کے سامنے ننگا کیا ہے کہ یہ صرف ایک قومی وسیاسی لیڈر نہیں ہے' بلکہ یہ شخص تو دین کی جڑیں کھود رہا ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اندرونِ سندھ کے حالات کے پیش نظر یہ بڑی جرائت کا کام ہے جو وہ سندھی نیشنلزم کے گڑھ حیدر آباد میں بیٹھ کر کر رہے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ آپ سب حضرات ان کے اس مضمون کا ضرور مطالعہ کریں' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب میں مسئلہ سندھ کی گمبھیرتا کا بہت کم لوگوں کو اندازہ ہے۔ میں ابھی ہی کوشش

کاہوں کہ پنجاب کے لوگ سندھ کی صحیح صورتحال کو سمجھیں اور اس کے حل کی طرف توجہ
ں۔ اس کے ضمن میں میرے مضامین روزنامہ جنگ میں شائع ہوتے رہے ہیں' پھر ان کی
ں شکل میں اشاعت کا انتظام کیا گیا۔ پھر میں نے "مسئلہ سندھ" پر لاہور میں ایک سیمینار
مد کیا جس میں سندھ کے دانشوروں کو مدعو کیا کہ وہ اپنی شکایات براہِ راست پنجاب کے
شوروں اور عوام کے سامنے رکھیں تاکہ یہاں کے لوگ سوچیں' ان کو اندازہ ہو جائے کہ
ندھ کے حالات کتنے مخدوش ہیں۔ بہرحال یہ دونوں باتیں نہایت تشویش ناک ہیں۔

سرحد ـــــــ نئے گورنر کی تقرری کا مسئلہ

سرحد کی طرف آیئے' وہاں کے متعلق بھی آپ نے اخبارات میں خبریں پڑھ لی ہوں
ں کہ وہاں پی پی پی اور اے این پی میں نئے گورنر کے تقرر کے مسئلہ پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا
ہے' جس کی وجہ سے ان کی مخلوط حکومت کے ٹوٹنے کا شدید اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ اے این پی
کا مطالبہ ہے کہ معاہدے کے مطابق گورنر شپ ہماری پارٹی کو ملنی چاہئے پھر اس پارٹی کی ساری
ہمدردیاں اور دلچسپیاں نجیب حکومت کے ساتھ رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی
بات نہیں ہے۔ افغان مجاہدین کی کامیابیوں سے گیارہ سال تک وہ جس طرح خائف رہے ہیں
اور اب ان پر جو بیت رہی ہے وہ کسے معلوم نہیں! ۔ ان کے تو سارے خواب پریشان ہو گئے
ہیں۔ ان کا پختونستان کا سٹنٹ ختم ہوا۔ سرحد میں سیاسی طور پر ان کا اثر و رسوخ خاصا کم ہوا
ہے اور پختونستان کے مسئلہ پر ان کی گرفت نہایت کمزور ہو چکی ہے۔ حالیہ الیکشن میں یہ قومی
اسمبلی میں بمشکل تین نشستیں حاصل کر پائے ہیں لیکن صوبہ کی سطح پر انہیں کچھ زیادہ سیٹیں مل
گئی ہیں' اس لئے ان کی اہمیت ہے۔ لہٰذا اگر ان کا گورنر کی تقرری کا مطالبہ مانا نہ گیا تو اندیشہ
ہے کہ یہ کولیشن گورنمنٹ ٹوٹ جائے گی۔ ایک دو روز ہی میں اس کا نتیجہ ملک کے سامنے آ
جائے گا۔ ایک خبر اور آئی ہے جس کو صحیح تسلیم کرنے پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ خبر یہ ہے کہ
اگر یہ مخلوط حکومت ٹوٹ جاتی ہے تو آئی جے آئی تیار ہے کہ اے این پی کے ساتھ مل کر مخلوط
حکومت بنا لے۔ اگر یہ خبر کسی درجہ میں بھی صحیح ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ کسی اصول پرستی نام کی
کوئی شے کسی طرف بھی نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ میں اس خبر کو تسلیم
کرنے پر آمادہ نہیں۔ اگرچہ سیاست میں سب کچھ ہوتا ہے اور عام کہاوت یہی ہے کہ سیاست
میں دوستیاں اور دشمنیاں مستقل نہیں ہوتیں' لیکن پھر بھی پی پی پی اور اے این پی کے مابین تو
ایک نقطۂ اشتراک موجود ہے۔ وہ یہ کہ پی پی پی بھی بائیں بازو کی طرف رجحان رکھتی ہے اور

اے این پی تو ہے ہی بائیں بازو کی پارٹی۔ ان میں کوئی نہ کوئی نظریاتی ہم آہنگی موجود ہے لیکن آئی جے آئی اور اے این پی کے مابین کوئی نظریاتی' کوئی اصولی' کوئی مقاصد کی اور پھر افغان جہاد کے معاملہ میں کوئی ہم آہنگی سرے سے موجود ہی نہیں ہے' بلکہ شدید ترین بُعد و اختلاف ہے لیکن خدانخواستہ اگر کہیں یہ معاملہ ہوتا ہے تو گویا بے اصولی اور اقتدار پرستی کے حمام میں اگر کسی نے لنگوٹی بھی باندھ رکھی ہے تو وہ بھی اتر جائے گی اور وہ اس حمام میں مادر زاد برہنہ ہو کر رہ جائے گا۔

پنجاب ـــــ سیاسی شعور اور احساسِ ذمّہ داری میں اضافہ

اب آیئے پنجاب کی طرف...... میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت سب سے زیادہ اطمینان بخش صورتحال پنجاب میں سامنے آئی ہے۔ پنجاب میں یہ جو بہت بڑا واقعہ ہوا ہے' نواز شریف صاحب کے دوبارہ اعتماد کا ووٹ لینے کا' اس کے صحیح مضمرات جلد ہی ہمارے سامنے آئیں گے۔ واقفِ حال لوگ اور اخبار بین حضرات جانتے ہیں کہ یہاں پیپلز پارٹی نے صوبائی اسمبلی کے ارکان کی "وفاداریاں" خریدنے کی کتنے بڑے پیمانے پر کوشش کی ہے یہ بات ایک کھلے راز (OPEN SECRET) کی حیثیت میں ہم سب کے سامنے ہے۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس مذموم حرکت میں جس بری طرح ناکامی ہوئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت صحت مندانہ علامت اور بہت امید افزا صورت ہے۔ اس صورتحال سے میری رائے میں ہمیں دو اہم نتائج اخذ کرنے چاہئیں۔ ایک تو یہ اس سارے جوڑ توڑ میں جس اناڑی پن کا ثبوت دیا گیا ہے' دونوں طرف کی نوجوان قیادت نے جس بھونڈے طریقے سے بڑکیں مارنے اور دعوے کرنے کا معاملہ کیا ہے اور اس معاملے میں پیپلز پارٹی یقیناً بہت آگے گئی ہے' میرے نزدیک یہ سیاسی نابالغی کا مظہر ہے۔ اس لئے کہ مارشل لاء کے تسلسل نے اس قوم کو سیاسی طور پر بالغ ہونے ہی نہیں دیا۔ اس کو یوں سمجھئے جیسے ایک بچہ اس عارضے میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اس کی جسمانی ترقی اور بڑھوتری تو ماہ و سال کی تقویم کے حساب سے ہو رہی ہے اور دس سال عمر ہو گئی ہے' لیکن عادات و سکنات اور ذہنی سطح کے اعتبار سے وہ تین چار سال کی عمر کے بچے سے آگے بڑھ نہیں پا رہا ہے۔ پس واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی قوم بحیثیتِ مجموعی' اور ان میں پنجابی سب سے زیادہ سیاسی شعور' سیاسی بیداری' سیاسی بالیدگی اور سیاسی بلوغت کے اعتبار سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹے صوبوں میں مارشل لاء کے خلاف ایک ردِّعمل رہا ہے۔ ان صوبوں نے اسے کبھی بھی خوش دلی سے قبول نہیں کیا ہے۔ وہ

ردعمل عوامی سطح پر ہوا۔ چنانچہ حقوق کی صدائیں بلند ہوئیں' سیاسی شعور کا اظہار ہوا' چاہے غلط سلط طور طریقوں پر ہوا ہو۔ سیاسی لیڈروں کا ردعمل محرومیوں پر احتجاجی صدائیں بلند کرنے کی صورت میں ہوا۔ اعداد و شمار جمع کیے گئے چاہے وہ بیشتر غلط اور مبالغہ آرائی پر مبنی ہوں لیکن ان کی خوب نشر و اشاعت کی گئی کہ فلاں ڈیم کی تعمیر سے کیا مصیبت آ جائے گی' صوبہ سرحد ڈوب جائے گا اور صوبہ سندھ سوکھ جائے گا۔ فلاں مقام پر فوجی چھاؤنی بنانے سے کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ الغرض چھوٹے صوبوں میں تو محرومیوں کی اور حقوق کی باتیں ہوتی رہیں اور احتجاجی آوازیں اٹھتی رہیں' جمہوریت کی بحالی کے حق میں تنظیمیں بنتی اور صدائے احتجاج بلند کرتی رہیں۔ لہٰذا ان چھوٹے صوبوں میں کچھ سیاسی شعور' کچھ اپنے حقوق کا پاس لحاظ اور ان کی بازیابی کا خیال پروان چڑھا ہے' جبکہ پنجاب میں بڑے صوبے ہونے اور بڑے بھائی ہونے کے اعتبار سے اس سلسلہ میں کوئی آواز نہیں اٹھی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ پنجاب نے مارشل لاء کے تسلسل کے ساتھ سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ پھر تاریخی صورتحال یہ بھی رہی کہ پندرہ بیس سال کے عرصے میں یہاں سے کوئی بڑی سیاسی شخصیت افقِ عام پر ظاہر نہیں ہوئی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ پنجاب نے بڑے ٹیکنو کریٹس' بڑے بیوروکریٹس اور بڑے انٹیلیکچو نیلز دیئے ہیں اور اس صدی کی صرف برعظیم پاک و ہند ہی کی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی سب سے بڑی نابغۂ روزگار شخصیت علامہ اقبال مرحوم پنجاب ہی نے تو دی ہے۔ تو پنجاب نابغہ شخصیات' کاریگر شاہی' نوکر شاہی اور زراعت کے شعبے میں تو کم نہیں رہا لیکن سیاسی میدان میں پنجاب بقیہ صوبوں سے پیچھے رہا ہے...... پھر یہ کہ بقیہ صوبے یہ سمجھتے تھے کہ مارشل لاء کا سب سے زیادہ فائدہ پنجاب کو پہنچ رہا ہے' اس لئے کہ فوج پنجاب کی شمار ہوتی تھی۔ لہٰذا اگر فوج کی حکومت ہے تو چاہے اس سے پنجاب کو کوئی فائدہ پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو' لیکن سمجھا یہی گیا کہ پنجاب کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بہرحال میری رائے یہ ہے کہ مارشل لاء کی وجہ سے' چاہے وہ صدر ایوب صاحب کا ہو' خواہ یحییٰ خاں کا ہو اور چاہے صدر ضیاء الحق مرحوم کے مارشل لاء کا طویل ترین دور ہو' پنجاب سیاسی شعور کی بالیدگی' پختگی اور بلوغت کے معاملہ میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پیچھے رہ گیا ہے۔ بہرحال اس زاویۂ نظر سے دیکھا جائے کہ پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت کی طرف سے پنجاب میں آئی جے آئی کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے جو جائز و ناجائز یلغار اور اراکینِ اسمبلی کی وفاداریوں کو دھن اور دھونس سے خریدنے کی جو کوششیں الیکشن کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھیں' وہ سب ناکام ہوئیں تو یہ ایک خوشگوار علامت ہے کہ اب پنجاب میں بھی سیاسی شعور ترقی کر رہا ہے' اسے بھی اپنے حقوق کی حفاظت

کرنے کا احساس ہو رہا ہے اس میں بھی جمہوری اقدار کی پاسداری کا جذبہ بیدار ہو رہا ہے۔ اگر جمہوری و سیاسی عمل تسلسل کے ساتھ چلتا رہا ہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ انشاء اللہ سیاسی شعور میں روز افزوں پختگی اور ترقی ہوتی چلی جائے گی۔

پنجاب کی موجودہ صورتحال کا دوسرا نتیجہ میں یہ نکالتا ہوں کہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں سیاسی شعور پیدا ہو رہا ہے وہاں صوبے کی اسمبلی کے ارکان میں احساس ذمہ داری بھی بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ حزبِ اقتدار نے وفاق میں برسراقتدار پارٹی کے دباؤ' لالچ اور فاؤل پلے کی جس طرح مزاحمت کی ہے۔ وہ بھی اس بات کی خوشگوار علامت ہے کہ انہوں نے اپنے رائے دہندگان کی توقعات سے بے وفائی نہیں کی ہے۔ انہیں احساس ہو گیا ہے کہ اگر انہوں نے اس موقع پر کمزوری دکھائی تو آئندہ عام انتخابات میں وہ اپنے رائے دہندگان کا مواجہہ نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ ملک کے سیاسی مبصرین اور تجزیہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جہاں دوسرے عوامل ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ ایم پی اے حضرات کو یہ احساس بھی ہو گیا ہے کہ پنجاب کے عوام اب جاگ گئے ہیں اور ہمیں آئندہ ووٹ لینے کے لئے انہی کے پاس جانا ہے اور اب فلور کراسنگ اور وفاداریوں کی فروخت ڈھکی چھپی باتیں نہیں رہیں گی...... بہرحال پنجاب کی صوبائی حکومت کے وزیر اعلیٰ نواز شریف کے خلاف جو آپریشن ناکام ہوا ہے' اس سے میں یہ دو نتیجے نکال رہا ہوں کہ یہ جہاں پنجاب کے نمائندگان میں سیاسی شعور کی پختگی کا مظہر ہے وہاں اُن میں اپنے رائے دہندگان کی آراء کی پاسداری کی بھی علامت ہے اور یہ دونوں علامتیں پاکستان کے سیاسی مستقبل کے اعتبار سے بہت خوش آئند ہیں اگرچہ یہ محض خام خیالی ہے کہ آئی جے آئی کی حکومت کو زیر وزبر کرنے کی اس کوشش کی ناکامی کے بعد یہ سلسلہ رک جائے گا۔ یہ معاملہ تو پھر چلتا نظر آ رہا ہے۔ جس روز آپریشن کی ناکامی کا ڈراپ سین ہوا ہے' اسی روز پیپلز پارٹی کے بعض اہم لیڈروں کے بیانات آ گئے کہ کھیل تو ابھی شروع ہوا ہے اور اس نوع کے بیانات کا سلسلہ تاحال چل رہا ہے اور یہ معاملہ اس طرح آسانی سے ختم ہونے والا نظر نہیں آتا۔ پیپلز پارٹی کے لئے یہ بات قبول کرنا کہ ملک کے سب سے بڑے صوبے میں حزبِ اختلاف کی حکومت قائم رہے بڑا مشکل ہے کیونکہ اس پارٹی کی لیڈر شپ بھی ایسے حضرات کے ہاتھ میں ہے جو سیاسی بلوغت اور سیاسی فہم و شعور کی پختگی کے معاملے میں معیارِ مطلوب سے بہت فروتر ہیں۔ البتہ میری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اس صورتحال کے نتائج کو سمجھ کر اپنے شعور میں محفوظ رکھنا چاہئے کہ بحالاتِ موجودہ ایک طرف یقیناً ہماری سیاسی نابالغی کا مظہر سامنے آیا ہے تو دوسری طرف اب سیاسی اور جمہوری عمل کے شروع ہونے

سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اب اسمبلی میں لوگ بکاؤ مال نہیں رہے۔ لوگوں کی اکثریت میں اپنی ذمہ داری کا احساس اور اپنے نمائندگان کی آراء کی پاسداری کا جذبہ بھی پیدا ہو رہا ہے اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اب عوام اندھے بہرے نہیں رہے ہیں۔ تھالی کا بینگن اور بکاؤ مال بننے کی صورت میں ہمارا سیاسی مستقبل تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

تحریک مسلم لیگ کے احیاء کی ضرورت

ان سب باتوں کے تناظر میں' آج پھر میں اس بات کا اعادہ کر رہا ہوں جو میں نے پچھلے جمعہ کو عرض کی تھی۔ میں نے وہ مشورہ اپنے دلی خلوص کی گہرائیوں کے ساتھ دیا تھا' اُسی کو آج میں پھر جتنی بھی تاکید کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اُسی تاکید کے ساتھ دوہرا رہا ہوں۔ نواز شریف صاحب کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ وزارتِ عُلیا سے مستعفی ہو جائیں۔ اس ملک کے اندر مستقل طور پر جمہوری عمل کے جاری رہنے اور ملک کی سالمیت و بقا کے جو تقاضے ہیں' ان کے اعتبار سے میرا یہ سوچا سمجھا مخلصانہ مشورہ ہے۔ پچھلی مرتبہ میں نے رواروی میں کچھ باتیں عرض کی تھیں اور چونکہ وقت کافی ہو گیا تھا للذا میں اپنی اس رائے کو مدلّل طور پر پیش نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اس مسئلہ پر بعد میں برادر عزیز اقتدار احمد مدیر "ندا" سے تفصیلی تبادلہ خیال کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے میری بات کی صحیح صحیح ترجمانی "ندا" کے تازہ شمارے کے اداریہ میں کر دی ہے۔ اس طویل اداریہ کے مطالعہ سے میرا نقطۂ نظر واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ویسے میں آپ حضرات کے سامنے بھی اپنی رائے کا سبب بیان کر دیتا ہوں۔ میرے نزدیک پاکستان کی سالمیت' اس کی بقاء اور اس کے استحکام کے دو پہلو ہیں..... ایک فوری نوعیت کی صورت سے متعلق ہے اور دوسرا اس کے مستقبل اور مستقل استحکام سے تعلق رکھتا ہے۔ آخر الذکر معاملہ تو اس ملک میں حقیقی اور واقعی اسلامی انقلاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن جس بحران سے ہمارا ملک تیں پینتیس سال سے دوچار چلا آ رہا ہے' میں برابر کہتا رہا ہوں کہ اس سے فوری طور پر نکلنے کے لئے ملک میں جمہوریت ضروری ہے۔ میں کئی سال سے کہہ رہا ہوں کہ ملک میں سیاسی گاڑی چلنی چاہئے' جمہوریت بحال ہونی چاہئے' انتخابات ہونے چاہئیں' ورنہ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت فرمائی اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ الیکشن ہو گئے اور وہ بھی خوش اسلوبی اور بغیر کسی دنگا فساد کے ہو گئے۔ پوری دنیا میں ملک کا وقار اونچا ہو گیا۔ ملک کی عدلیہ نے بھی اپنے بہت سے دھبے دھو دیئے۔

الیکشن کمیشن نے بھی دنیابھر سے سرخروئی حاصل کرلی۔ فوج کے ماتھے پر جو کلنک کاٹیکہ تھا اسے اس نے..... میں سمجھتاہوں کہ..... اسی طرح دھودیا ہے' جس طرح مصری فوج نے اپنے ماتھے پر ۶۷ ء کی جنگ میں لگاہوا کلنک کاٹیکہ ۷۳ ء کی رمضان جنگ میں دھودیا تھا۔ ہمارے عوام اور سیاست دانوں کی طرف سے فوج پر یہ الزام آتا رہا ہے کہ وہ ملک میں جمہوری عمل کے جاری رہنے میں رکاوٹ بنتی رہی ہے۔ توفوج نے صدر ضیاء الحق مرحوم کی اچانک وفات سے ملک میں جو بحرانی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی' اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے' جبکہ اس کا جواز بھی موجود تھا' ملک کے دستور کی پاسداری کرتے ہوئے اقتدار کی گاڑی کو سیاست کی پٹڑی پر چلانے میں اپنا مثبت کردار بھرپور طور پر ادا کر کے اپنے دامن پر بدنامی کا کوئی مزید داغ لگوانے سے احتراز کیا۔ اس اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے.....

لیکن اس جمہوریت کا ایک لازمی تقاضا ہے' جس پر میں کئی بار اظہارِ خیال کرچکا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ تحریک مسلم لیگ کا احیاء لازمی ہے۔ مسلم لیگ جو اس ملک کی ماں ہے' مسلم لیگ کہ جس کے نام میں لفظِ "مسلم" ہے جبکہ پیپلز پارٹی کے نام میں مسلم نہیں ہے' وہ تو 'پاکستان پیپلز پارٹی' ہے' جیسے میں کہتا رہا ہوں کہ پی این اے کا اپنے نام کے اعتبار سے دین سے کوئی تعلق نہیں تھا' وہ تو 'پاکستان نیشنل الائینس' تھا یعنی 'پاکستان قومی اتحاد' ..... بعد میں جب تحریک چلانے اور عوام سے قربانی لینے کا مرحلہ آیا تو اسے "تحریکِ نظامِ مصطفیٰ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ موسوم کیا گیا۔ جس طرح 'پاکستان قومی اتحاد' کے نام کے ساتھ اسلام یا مسلم کا کوئی سابقہ و لاحقہ موجود نہیں تھا' اسی طرح 'پاکستان پیپلز پارٹی' کے نام کے ساتھ اسلام یا مسلم کا کوئی سابقہ و لاحقہ موجود نہیں ہے۔ تو مسلم لیگ پاکستان کی ماں بھی ہے اور سیاسی سطح پر یہی ایک جماعت ہے جو اُس نظریئے کی علمبردار بن کر سامنے آسکتی ہے' جس نظریہ پر پاکستان بنا تھا۔ اسے آپ "دوقومی نظریہ" کی تحریک کہیں' مسلم قومیت کی تحریک کہیں' جو نام بھی دیں' اس کی علمبردار بن کر وہی پارٹی آسکتی ہے جس نے اس تحریک کو غیر منقسم ہندوستان میں برپا کیا تھا۔ اس تناظر میں پاکستان کے مستقبل کے لئے بہت ہی ضروری اور لازمی تقاضا ہے کہ اس تحریک کا احیاء ہو۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس تحریک کے احیاء کا مطلب کیا ہے! عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کوئی جماعت جب حکومت میں آتی ہے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ جماعت تو درحقیقت وہ اُس وقت ہوتی ہے جب وہ عوامی جدّوجہد اور عوامی حمایت سے ابھر کر آرہی ہو' عوامی سطح پر ایک مضبوط درخت کی طرح اس کی جڑیں گہرائی میں قائم ہوں اور اس کی شاخیں دور دور تک

پھیلی ہوئی ہوں۔ حکومت میں پہنچنے کے بعد تو بڑی سے بڑی پارٹی میں زوال آجاتا ہے۔ میں نے یہ بات مدیر "ندا" سے کہی تھی' انہوں نے اپنے تازہ اداریہ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ کانگریس کے ساتھ بھی یہ حادثہ پیش آیا تھا' حالانکہ اس سے زیادہ عوامی جماعت اور کونسی ہوگی۔ لیکن حکومت میں آنے کے بعد وہ زوال سے دوچار ہو رہی تھی۔ ابتداء میں تو کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو جیسی بڑی عظیم شخصیتیں موجود تھیں' جس کی پوری زندگی کانگریس کی خدمت میں لگی ہوئی تھی' لیکن نہرو کے بعد کانگریس میں تیزی کے ساتھ زوال آنا شروع ہوا۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ اس وقت 'کامراج پلان' اختیار کیا گیا کہ چوٹی کے قائدین حکومت کے عہدے چھوڑ کر پارٹی کے عہدے سنبھالیں اور پارٹی کو منظم کریں۔ چنانچہ اس طور پر کانگریس کا دوبارہ احیاء اور اس کی تجدید نو ہوئی۔ اس کے لئے لازمی شرط یہ رکھی گئی کہ حکومت میں شامل لوگوں کے پاس پارٹی کے عہدے نہیں رہیں گے۔ حکومت کے عہدیداروں کو تو یہ پڑی رہتی ہے کہ یہ مینڈک پھدک رہا ہے' اسے سنبھالنا ہے اور وہ رسّی تڑا کر بھاگنا چاہ رہا ہے اسے پکڑنا ہے۔ وہ تو ظاہر بات ہے کہ زیادہ تر اسی مخمصے میں گرفتار رہیں گے۔ خود جوڑ توڑ کریں گے یا جو جوڑ توڑ انکے خلاف ہو رہا ہو اسے روکنے اور اس کا جواب دینے کی فکر کریں گے۔ پھر یہ کہ ملکی اور بین الاقوامی مسائل ان کی دن رات کی توجہ کے متقاضی ہو تے ہیں۔ پارٹی کو صحیح طور پر منظم کرنا اور منظم رکھنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر مسلم لیگ کو متحرک و فعال جماعت بنانا ہے' اسے عوام میں مقبول کر کے ایک عوامی جماعت بنانا ہے تو یہ لازمی ہے کہ پارٹی کے اعلیٰ عہدے ایسے حضرات کے پاس ہوں جو حکومت میں نہ ہوں۔ پیپلز پارٹی کے بارے میں کُل ایک ہی بات میں نے کہی تھی جس کا دوستوں کو شکوہ ہے، کہ گیارہ برس حکومت سے باہر رہ کر اور ایک طرح کے تشدّد کا نشانہ بننے کے باوجود اس پارٹی نے اپنا وجود برقرار رکھا تو اس نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک عوامی پارٹی ہے۔ اس نے QUALIFY کیا ہے کہ اسے ایک عوامی سیاسی پارٹی مانا جائے۔ وہی بات میں آج کہہ رہا ہوں کہ اس وقت پنجاب میں نواز شریف صاحب نے QUALIFY کیا ہے کہ ان میں صلاحیت ہے' استعداد ہے' محنت کا مادہ ہے' فہم و تدبّر ہے۔ یہ تمام صلاحیتیں وہ ہیں جو کسی پارٹی کو منظم کرنے اور اُسے عوامی سطح پر لانے کے لئے درکار ہوتی ہیں اور ملک گیر پیمانے پر کوئی شخص اگر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مسلم لیگ کو از سرِ نو منظم کرلے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخص کُل پاکستان سطح پر ملک کا مقبول ترین لیڈر بن سکتا ہے۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ اس وقت نواز شریف صاحب جن میں یہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں' یہ ذاتی ایثار قبول کرلیں' جیسے کتنے ہی

کانگریسی لیڈروں نے "کامراج پلان" کے تحت بھارت میں کیا تھا۔ نواز شریف صاحب صوبے کی حکومت کو چھوڑ کر اگر مسلم لیگ کو از سرِ نو منظم کرنے اور اُسے عوامی سطح پر ایک مقبول و مضبوط پارٹی بنانے میں اپنی صلاحیتیں لگائیں تو ان کی یہ قربانی نظریۂ پاکستان کے تحفظ اور ملک کے استحکام میں بڑا مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ صوبے میں آئی جے آئی اور اس کے حامیوں کی واضح اکثریت موجود ہے لہٰذا اسی کے کسی باصلاحیت اور معتمد علیہ شخص کو وزارتِ علیا کا منصب سنبھالنے کی ذمہ داری سپرد کر دی جائے کہ وہ اپنی حکومت تشکیل دے۔ اس طرح فوری طور پر وہ کھچاؤ بھی جو اصولی سے زیادہ شخصی بن گیا ہے' کافی حد تک ختم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں بدقسمتی سے شخصی و ذاتی نوعیت کے اختلافات بسا اوقات بڑی گھمبیر صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ بھی ہماری سیاسی نابالغی کا ایک مظہر ہے کہ اختلافات کو ذاتی و شخصی بنا لیا جاتا ہے۔ بہرحال اس طرح یہ کھچاؤ اور TENSION بھی کم ہو سکتا ہے اور نواز شریف صاحب مسلم لیگ کو از سرِ نو منظم کرنے کے لئے ایک نہایت قیمتی سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ مصالح ہیں جن کے پیشِ نظر میں نواز شریف صاحب کو صوبہ کی وزارتِ علیا سے دست کش ہونے کا مشورہ دے رہا ہوں۔

پھر یہ کہ انہوں نے اسمبلی سے بھاری اکثریت سے اعتماد حاصل کر کے ایک بڑی فتح حاصل کر لی ہے۔ اس صورت میں ان کے لئے کہیں کوئی سبکی کی بات نہیں ہے۔ اس صورت حال کے تناظر میں مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔

موسم اچھا' پانی وافر' مٹی بھی زرخیز
جس نے پھر بھی کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان!

تو یہ موسم بہت اچھا ہے' حکومت ان کے پاس ہے' بہت بڑی فتح انہوں نے حاصل کی ہے۔ اس صورت حال میں اگر وہ وزارت سے دست بردار ہوتے ہیں تو یہ ان کے عزت و وقار کو بڑھانے والا اقدام ہو گا اور مسلم لیگی ذہن رکھنے والے اور نظریۂ پاکستان سے محبت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں وہ اپنے لئے قلبی محبت اور بڑی قدر و منزلت کے جذبات پائیں گے' جن کی تا حال پاکستان میں بڑی عظیم اکثریت موجود ہے۔ کمی اگر ہے تو یہ ہے کہ ان کو منظم کرنے اور ان کے جذبات کو زبان دینے والی کوئی باصلاحیت شخصیت موجود نہیں ہے۔ وہ ان سب کے دلوں کو فتح کر لیں گے اور مسلم لیگ کو حقیقی معنوں میں نظریۂ پاکستان کے تحفظ اور استحکام کے لئے فعال و متحرک پارٹی بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور سیاسی میدان میں ہر اس پارٹی کو جلد ہی ناک آؤٹ کر دیں گے جو نظریۂ پاکستان سے کوئی حقیقی و واقعی وابستگی نہیں رکھتی۔

آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ میں نے گزشتہ جمعہ کو یہ بھی عرض کیا تھا کہ نواز شریف صاحب کے پاکستان کے مذہبی و دینی عناصر سے بھی خوشگوار تعلقات ہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ اس وقت واحد خاندان ہے جس کا ربط و تعلق دیو بندی علماء سے بھی ہے اور بریلوی علماء سے بھی۔ تقسیم ہند سے قبل مسلم لیگ میں دونوں مکاتبِ فکر کے علماء شامل ہو گئے تھے۔ دیو بندی حلقے سے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ اور بہت سے نامور علماء' بریلوی مکتب فکر سے مولانا عبد الحامد بدایونی" اور بہت سے نامور علماء اور پیر مانکی شریف" اور بہت سے مشائخ مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے بلکہ آخری دور میں مکتب اہل حدیث کی نامور شخصیت مولانا داؤد غزنوی" بھی مسلم لیگ میں آگئے تھے۔ چنانچہ اِس وقت بھی پاکستان میں علماءِ کرام اور دینی جماعتوں میں سے جو سیاسی مزاج رکھنے والے عناصر موجود ہیں اور جو سیاسی میدان میں کام کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں' چونکہ یہ اجتماعی زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے' اس میں حصّہ لینا کوئی حرام تو نہیں ہے' میں یہ سمجھتا ہوں کہ نواز شریف صاحب ان سب کو کھینچ کر مسلم لیگ میں لا سکتے ہیں۔ متحدہ محاذ یا انتخابی اتحاد کبھی مستحکم حکومت نہیں چلا سکتے۔ یہ تو کسی بھی نازک مرحلے پر ٹوٹ سکتے ہیں۔ جیسے اس وقت تین صوبوں میں مخلوط حکومتوں کے سر پر جو تلوار لٹک رہی ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔ مستحکم حکومت کے لئے اصل چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک مضبوط سیاسی جماعت کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو' جو منظم ہو اور جس کی پشت پر عوام کی اکثریت کی حمایت کی طاقت موجود ہو۔

پس یہ ہیں میرے موقف کے حق میں دلائل اور اس کے متوقّع نتائج جس کے پیش نظر میں یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ اگر نواز شریف صاحب وقتی چیزوں کے بجائے پائیدار اور دُور رس فوائد کو سامنے رکھیں گے تو وہ انشاء اللہ میرے اس مشورے کو بہت صائب پائیں گے اور اسے قابلِ قبول سمجھیں گے...... میں آخری بات کے طور پر دو حوالے دے رہا ہوں۔ ایک حوالہ تو اتنا اونچا ہے' اتنا ارفع و اعلیٰ ہے کہ ان معاملات کے ضمن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی ہچکچا رہا ہوں۔ لیکن ہمارے لئے آئیڈیل اور اسوہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں...... میں صلح حدیبیہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ بظاہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دب کر ایسی شرائط پر صلح فرمائی کہ مسلمانوں کے اذہان و قلوب ان کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ وہ نہایت مضطرب تھے کہ ایسی شرائط پر جو یکطرفہ اور دب کر کی جا رہی ہیں صلح کیوں کی جا رہی ہے۔ حضرت علیؓ بھی کہہ رہے ہیں کہ صلح نامہ سے میں تو آپ" کا نامِ نامی اسمِ گرامی نہیں مٹا سکتا۔ حضرت عمرؓ نہایت اضطراب کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں...... پھر ہم

دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں!..... الغرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "بظاہر"..... (میرے ان الفاظ کو خاص طور پر نوٹ کیجئے)..... دب کر ایسی شرائط پر صلح فرمائی کہ صدیق اکبرؓ کے سوا تمام صحابہ کرامؓ اس پر مضطرب و پریشان تھے..... لیکن آپ کو معلوم ہے کہ حدیبیہ سے مدینہ منورہ کی واپسی کے دوران وحی نازل ہوئی..... اِنَّآ فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ○ ..... اس صلح کو اللہ تعالیٰ نے فتحِ مبین قرار فرمایا..... تو دوررس نتائج اور ہوتے ہیں، فوری باتیں اور ہوتی ہیں..... اور جن لوگوں میں دُور کی سوچ ہو، انہیں درحقیقت دُور کی سوچنی چاہئے اور دوررس بہتر نتائج کے لئے فوری طور پر تھوڑا سا دب جانا پڑے یا وقتی طور پر تھوڑی سی سبکی برداشت کرنی پڑے تو ایک مدبّر قائد کو اس کے لئے آمادہ رہنا چاہئے۔

دوسری مثال میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے لا رہا ہوں..... قیام پاکستان سے قبل حالات ایسے نظر آ رہے تھے کہ انگریز اس بات پر تُلا نظر آ رہا تھا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا تو وہ یکطرفہ طور پر کانگریس کو اقتدار منتقل کر کے اس برِّعظیم سے رخصت ہو جائے گا۔ حالات کی یہ سنگینی تھی جس کے تحت قائداعظم مرحوم نے 'کیبنٹ مشن پلان' منظور کر لیا تھا۔ یہ ان کے لئے بڑا سخت امتحان تھا۔ اس کے صاف معنی تھے کہ "آزاد و خود مختار پاکستان" کے مطالبے سے دست برداری..... ہندو پریس میں خوب تالیاں بجیں، خوب مذاق اڑا کہ بس یہی کچھ دم خم تھا۔! کہاں گیا پاکستان! کیبنٹ مشن پلان کے مطابق تو تین زون بننے تھے اور مرکزی حکومت ایک ہی بنی تھی۔ دس سال کے بعد ہر زون کو اپنے طور پر یہ طے کرنا تھا کہ وہ مرکز کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا علیحدہ ہونا چاہتا ہے۔ اور اس کے فیصلے کا اختیار مرکز کے ہاتھ میں رہنا تھا۔ اور مسٹر جناح نے اسے مان لیا..... آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت قائداعظم کا ذرا سا پیچھے ہٹنا کتنا دوررس ثابت ہوا۔ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ کوئی شکست نہیں تھی بلکہ قائداعظم کی بصیرت کا شاہکار تھا کہ انہوں نے کیبنٹ مشن پلان قبول کر لیا۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے کوئی گھات میں بیٹھا ہوتا ہے۔ جیسے ہی پنڈت نہرو (جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے) کا بیان آیا کہ "دس سال بعد کون کسی کو الگ ہونے دیتا ہے"۔ قائداعظم نے فوراً JUMP کیا اور کیبنٹ مشن پلان کے لئے اپنی منظوری سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی توقف نہیں کیا اور یہ موقع ہی نہیں دیا کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نہرو صاحب کے بیان سے براءت کا اظہار کر سکے۔ چنانچہ کیبنٹ مشن پلان کو سبوتاژ کرنے کی ذمہ داری پنڈت جی کے کھاتے میں گئی اور پھر انگریز کو ملک کی تقسیم کا فارمولا تسلیم کرنا پڑا اور پاکستان کا قیام عمل میں آگیا..... بہرحال میں

نے جو مشورہ گزشتہ جمعہ کو دیا تھا' اسے آج قدرے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

مرکز کو مضبوط اور بااختیار ہونا چاہیے!

اب آیئے وفاقی مرکزی حکومت کے معاملے کی طرف۔ آج ہی کے نوائے وقت میں چودھری پروفیسر عبدالحمید صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ میں اُس کا پورا مطالعہ تو نہیں کر سکا، سرسری طور پر پڑھا ہے۔ چودھری صاحب موصوف میرے کرم فرما بھی ہیں۔ کرم فرما دو اعتبارات سے 'ایک یہ کہ میں انہیں اپنا بزرگ مانتا ہوں لیکن انہوں نے پچھلے دنوں اپنے مضامین میں مجھ پر جو "کرم فرمائیاں" کی ہیں ان میں میرے موقف کی صحیح ترجمانی نہیں ہوئی ہے 'اس کا کچھ گلا شکوہ میرے دل میں ہے۔ لیکن اُن کا آج کا مضمون پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ انہوں نے جس سیاسی تدبّر کی ضرورت ہے 'اس کی بات کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پیپلز پارٹی اس وقت مرکز میں اقتدار میں ہے اور وہ چاہتی ہے کہ مرکز مضبوط ہو۔ اس وقت ہمارے تدبّر کا ثبوت یہ ہو گا کہ ہم اس کے ہاتھوں مرکز کو مضبوط کروالیں۔ اس لئے کہ مرکز ہمیشہ پیپلز پارٹی کے پاس تو نہیں رہے گا۔ یہ کوئی ہمیشہ کی بات تو نہیں ہے۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ میں نے بھی ۱۸ر نومبر ۸۸ء کی تقریر میں عرض کیا تھا کہ قومی اسمبلی کے اس الیکشن کے جو نتائج سامنے آئے ہیں 'ان کے بارے میں یہ نہ سمجھئے کہ یہ کوئی آخری ہار ہے یا آخری جیت ہے۔ اس کے اندر تو نہ معلوم کتنے موڑ آئیں گے! لوگ ناکام بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے اصغر خاں صاحب اور مولانا نورانی میاں جیسے سیاست دانوں کے بیانات آئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ اس رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں نے بھی کہا تھا کہ مڈٹرم الیکشن کی ضرورت شاید بہت جلدی پیش آجائے۔ ورنہ پانچ سال بعد دستور کی رُو سے الیکشن دوبارہ ہوں گے تو یہ کوئی مستقل فتح نہیں، مستقل شکست نہیں۔ کیا پتہ کہ جو آج مرکز میں بیٹھے ہیں وہ آئندہ صرف کسی ایک صوبے میں بیٹھے ہوں اور جو آج صرف ایک صوبے میں بیٹھے ہیں وہ کل مرکز میں ہوں...... لیکن واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی سالمیت کے اعتبار سے مضبوط مرکز ضروری ہے...... پھر آج جو پیپلز پارٹی مرکز میں اقتدار میں ہے 'اس کا اصل BASE سندھ بن گیا ہے جب کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کا اصل BASE پنجاب تھا۔ اس پیپلز پارٹی کے ہاتھوں دستور کی آٹھویں ترمیم میں افہام و تفہیم سے کچھ ردّوبدل کرا کے اگر اس کا یہ نتیجہ نکلے کہ مرکز کو زیادہ اختیار مل جائیں تو پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے یہ ایک سنہری موقع ہے جس

کے بارے میں آپ کے سامنے رکھیں۔ اب جو بیرونی معاملات ہیں ان کی طرف آیئے۔

بیرونِ ملکی حالات پر ایک نظر

افغانستان —— وقتِ دعا ہے

میں دو بڑی سپر پاورز کی پالیٹکس پر تو اس وقت کوئی گفتگو نہیں کروں گا البتہ ہماری سرحدوں کا جو معاملہ ہے اس کے حوالے سے مجھے چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ ہماری سرحد کا سب سے طویل سلسلہ بھارت کے ساتھ اور دوسرے نمبر پر افغانستان کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد تیسرے نمبر پر ایران کے ساتھ ہے جو نسبتاً چھوٹا ہے۔ چین کے ساتھ بھی ھنزہ میں کچھ حصہ مل جاتا ہے۔ لیکن سرحدوں کا اصل اور اہم معاملہ ان دو ممالک یعنی بھارت اور افغانستان کے ساتھ ہے۔ مجھے اوّلاً اپنی شمال مغربی سرحد سے متعلق یعنی افغانستان اور افغان جہاد کے حوالے سے تین باتیں عرض کرنی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے افغان مجاہد بھائیوں کو ایک اور کامیابی حاصل ہوئی کہ سعودی عرب کے بعد اب اسلامی ممالک کی تنظیم (OIC) نے بھی ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور انجینئر گلبدین حکمت یار اس کے حالیہ اجلاس میں افغان حکومت کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے شریک ہوئے ہیں۔ یہ پیش رفت اور کامیابی افغان مجاہدین کی حکومت کو مبارک ہو..... لیکن جلال آباد میں اس وقت جو ہو رہا ہے وہ میرے نزدیک بہت ہی تشویش کی بات ہے۔ اس کے ضمن میں ہم فوری طور پر جو کر سکتے ہیں وہ افغان مجاہدین کی کامیابی کے لئے دعا ہے۔ دعا بہت بڑی شے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِن "دعا مومن کا ہتھیار ہے"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا لا یردّ القضاء الّا بالدّعاء "یعنی کبھی کبھی تقدیر کے جو فیصلے ہوتے ہیں وہ بھی اللہ دعا کی وجہ سے بدل دیتا ہے۔ چنانچہ افغان مجاہدین کی کامیابی کے لئے دعا کی شدید ضرورت ہے۔ محسوس ایسا ہو رہا ہے کہ روس گیا تو ہے لیکن اپنی کٹھ پتلی حکومت کو جس قدر مضبوط اور مسلّح کر کے گیا ہے اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ جلال آباد کے متعلق تو ہمارا خیال تھا کہ اس کی تسخیر ایک دو دن کا معاملہ ہے لیکن وہاں جتنی زبردست مدافعت ہو رہی ہے اس سے تو 'ہنوز دلی دور است' والا معاملہ نظر آتا ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ کابل کا معاملہ تو اور زیادہ مخدوش ہے۔ اس وقت جلال آباد کے

محاذ پر بڑی خون ریز جنگ ہو رہی ہے اور وہاں ہمارے مجاہد بھائیوں کو بھی شدید قربانی دینی پڑ رہی ہے اور ان کے ساتھ باہر کے لوگ بھی جام شہادت نوش کر رہے ہیں۔ پھر روس کی طرف سے وارنسٹوف کا جو بیان آج آیا ہے' وہ ایک بہت بڑی دھمکی ہے۔ اس نوع کے بیان پہلے بھی آتے رہے ہیں لیکن وزیر خارجہ کی طرف سے براہ راست یہ بات کہنا پاکستان کے لئے بھی اور افغان مجاہدین کے لئے بھی بہت نازک (CRITICAL) مرحلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں ہمارے افغان بھائیوں کو اور ہمیں استقامت اور سرخروئی عطا فرمائے اور اس نازک مرحلہ سے بخیر و عافیت گزار دے۔ یہ ہمارے افغان مجاہد بھائیوں کے لئے بڑا صبر آزما مرحلہ ہے' خاص طور پر اس گروپ کے لئے جن کو بنیاد پرست (FUNDAMENTALISTS) کے نام سے گالی دی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ان کی سب سے بڑی تعریف اور مدح ہے۔ مجھے یاد آیا کہ وال سٹریٹ جرنل کا ایک نمائندہ مجھ سے ایک انٹرویو لینے اُس زمانے میں میرے پاس آیا تھا جب خواتین کے دائرۂ کار اور حجاب وغیرہ کے بارے میں میرے دینی موقف کی وجہ سے پاکستان اور بیرون پاکستان میں میری مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا اور مغرب کے ذرائع ابلاغ بھی متوجہ ہوئے تھے۔ اسی کے ضمن میں نیویارک کے رسالے وال سٹریٹ جرنل کا جو نمائندہ میرے پاس آیا تھا' اس نے مجھ سے کہا کہ "کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کو بنیاد پرست (FUNDAMENTALIST) کہا جائے؟" میں نے کہا بالکل کہئے۔ اس لئے کہ ہم تو FUNDAMENTALS ہی کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر ہم جائیں گے کہاں پر؟ اجتہاد نام ہی اس شے کا ہے کہ "KEEPING THE FUNDAMENTALS INTACT"۔ بنیادوں کو اپنی اصل پر قائم اور برقرار رکھیں۔ پھر آگے بڑھیں۔ جیسے قرآن مجید میں درخت کی مثال دی گئی ہے: اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ۔ درخت کی جڑ زمین میں مضبوطی کے ساتھ گڑی ہوئی ہو' پھر اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کریں' کوئی حرج نہیں...... لیکن جڑ ہی اکھاڑ دی جائے تو پھر درخت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ لہٰذا میں نے کہا کہ میں بالکل پسند کروں گا کہ مجھے بنیاد پرست کہا جائے۔ اِسے گالی بنا دیا گیا ہے جبکہ میرے نزدیک یہ قابلِ مدح بات ہے۔ بہرحال ان افغان مجاہدین کے لئے اور پاکستان کے لئے بھی یہ ایک نازک مرحلہ آ گیا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس نازک گھڑی سے ان کو بھی اور ہمیں بھی سرخروئی کے ساتھ نکالے...... "ندا" کے تازہ شمارے میں رپورٹ آئی ہے کہ یاسر عرفات صاحب جو پاکستان تشریف لائے تھے تو وہ درحقیقت روس کی طرف سے افغانستان میں ایک وسیع تر حکومت کی تشکیل کا منصوبہ افغان مجاہدین کی عبوری حکومت سے منظور کرانے کی غرض

سے آئے تھے جس میں ڈاکٹر نجیب کی نمائندگی بھی ہو۔ اسی رپورٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ ایک موقع پر افغان مجاہدین کے نمائندوں اور یاسر عرفات صاحب کے مابین ایک جھڑپ بھی ہو گئی تھی جب طائف میں کوئی اجلاس ہو رہا تھا۔ اس موقع پر یاسر عرفات صاحب نے وہی بات کہی تھی جو چند دوسرے حضرات بھی کہہ رہے تھے کہ یہ تو روس اور امریکہ کی جنگ ہے جسے خواہ مخواہ جہاد کا نام دے دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ روس اور امریکہ کی جنگ بھی تھی۔ لیکن اس کے حوالے سے جہاد کی نفی بالکل غلط بات ہے۔ افغان مجاہدین نے روس کے تسلّط کو روکنے کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں۔ بڑی جرأتِ مؤمنانہ سے روس کی جدید ترین اسلحہ سے لیس فوجوں کا مقابلہ کیا ہے اور اُسے لوہے کے چنے چبوائے ہیں۔ ——— امریکہ نے جب یہ دیکھا کہ افغان مجاہدین میں دم خم ہے اور وہ بڑی دلیری سے روس کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں آہنی دیوار بن گئے ہیں' تب اس نے مجاہدین کی فوجی اور دوسری نوعیت کی امداد کا سلسلہ شروع کیا ہے...... بہر حال یاسر عرفات صاحب یہ تجویز لے کر آئے تھے کہ مجاہدین کی عبوری حکومت نجیب رجیم کے نمائندوں کو بھی حکومت میں شامل کر لیں تو جنگ فوری طور پر بند ہو سکتی ہے۔ اس مسئلہ میں مرکزی حکومت کی پالیسی بہت قابلِ تعریف رہی ہے کہ اس نے اس گفت و شنید میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا' سوائے اس کے کہ افغان مجاہدین کے نمائندوں اور یاسر عرفات صاحب کے مابین ملاقات کا انتظام کر دیا۔ لیکن خود افغان مجاہدین کو کسی درجے میں بھی اس تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ان کا اپنا معاملہ ہے' ان کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ کس قسم کی حکومت بنائیں۔

بھارت ——— نئی خارجہ حکمتِ عملی کی ضرورت

اب آیئے بھارت کی طرف۔ بھارت کے بارے میں میں نے پچھلی تقریر میں کچھ باتیں عرض کی تھیں۔ اس وقت میں تیزی کے ساتھ ان کو دہراؤں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے لئے بھارت کے ساتھ تعلقات کا معاملہ ایک عقدۂ لاینحل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ بھارت کے ساتھ نہ دوستی اچھی ہے' نہ دشمنی! پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے' جبکہ بھارت ایک بہت بڑا ملک ہے۔ پاکستان جب دو خطّوں (مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان) پر مشتمل تھا تب بھی بھارت کے مقابلے میں چھوٹا ملک تھا۔ اب جو پاکستان ہے اس کی تو ظاہر بات ہے کہ بھارت کے ساتھ قریباً ایک اور دس کی نسبت قائم ہو چکی ہے۔ پھر پاکستان دنیا میں وہ دوسرا ملک ہے جسے پیدائشی طور پر دشمنی ملی ہے۔ اسرائیل کو عربوں کی دشمنی

ثی طور پر ملی ہے اور پاکستان کو پیدائش کے ساتھ ہی بھارت کی دشمنی ملی ہے۔ اب اس کے
تھ دوستی اور دشمنی کا جو عقدۂ لاینحل (DILEMMA) رہا ہے اس کی خاصی تفصیل میں
بقہ جمعہ کی تقریر میں بیان کر چکا ہوں۔ اس تناظر میں واقعہ یہ ہے کہ بھارت کی نہ دوستی اچھی
شمنی اچھی۔ لیکن اس دوستی اور دشمنی کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اس
سارا فائدہ سپر پاورز کو پہنچتا ہے۔ خاص طور پر روس کو اتنا فائدہ پہنچا ہے کہ اسے ہم سے کئی گنا
قت کی دوستی مل گئی۔ یہ دوستی اس کو اس وجہ سے ملی کہ ہماری دوستی امریکہ کے ساتھ تھی
ر کسی وقت امریکہ کی خاص نظر عنایت ہم پر ہو جاتی تھی۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی میں اگر
ستان کی طرف پانچ درجے کا جھکاؤ ہو جاتا تو اس کے مقابلے میں بھارت پچاس درجے روس
طرف جھک جاتا۔ تو زیادہ فائدہ تو روس کو پہنچا۔ اور سب سے زیادہ نقصان پاکستان اور
ارت دونوں ملکوں کے عوام کو پہنچا۔ اس لئے کہ دونوں ملکوں کی جتنی بھی پیداواری استعداد
ہے اور جتنے بھی مالی وسائل و ذرائع ہیں' ان کا سب سے بڑا حصہ ہتھیاروں اور دیگر فوجی
ساز و سامان کی خرید پر خرچ ہو رہا ہے۔

بھارت کے ساتھ ہمارا دوستی اور دشمنی کا معاملہ تو اس مغنّیہ کا سا نظر آتا ہے' جسے دلی کی
فتح کے بعد نادر شاہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور وہ بیچاری نہ اپنا گھر چھوڑنا چاہتی تھی' نہ بادشاہ
کی خواہش سے انکار کر سکتی تھی۔ اس نے بادشاہ کے سامنے غزل گائی تھی ع "نے تابِ
وصل دارم نے طاقتِ جدائی" اس پر نادر شاہ مسکرا پڑا اور اس غریب کی جان بخشی ہوئی۔ تو
ہمارا معاملہ بھی یہ ہو گیا ہے کہ بھارت کے ساتھ دوستی میں بھی ہمارا مفاد نہیں اور اس کے ساتھ
دشمنی میں بھی ہمارا نقصان ہے۔ دوستی کرتے ہیں تو سب سے بڑا اندیشہ یہ ہے کہ ایک تو یہ منی
سپر پاور بن کر چھا جائے گا' DOMINATE کرے گا' اور دوسرے یہ کہ ہماری جو بھی بچی
کچھی اقدار ہیں وہ بھی اس دوستی کی نذر ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ بھارت کا جو ثقافتی حملہ ہم
پر ہو گا وہ بہت ہی مؤثر اور زوردار ہو گا۔ جہاں تک بھارت کے ساتھ دوستی کا تعلق ہے وہ تو
حالات کی درستی کے لئے ضروری ہے' لیکن اگر اس دوستی میں ہم چھوٹے بنیں اور وہ بڑا ہو تو یہ
کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔ دوستی ہونی چاہئے لیکن برابری
(EQUALITY) کی بنیاد پر۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ " UNDERSTOOD " ہے اور ایسی
بات ہے جس کو کہنے کی ضرورت بھی نہیں اسلئے کہ دنیا میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے
ملک ہوتے ہیں لیکن یہ کہ جب بین الاقوامی سطح پر آتے ہیں تو ان کی توقیر برابری کی بنیاد پر ہوتی
ہے۔ اگر سارک کا اجلاس ہو رہا ہو تو خواہ راجیو صاحب تشریف لائیں یا کسی چھوٹے سے ملک یا

جزیرہ کا کوئی وزیر اپنے ملک کی نمائندگی کے لئے آئے ان کا پروٹوکول برابر ہوگا۔ تو اس اعتبار سے دنیا کے جو بھی تسلیم شدہ اصول ہیں ان کے مطابق برابری کی بنیاد پر بہتر روابط استوار کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ یہی بات میں نے ضیاء الحق مرحوم کی مجلسِ شوریٰ میں بھی زور دے کر کہی تھی کہ آپ نے پرامن جارحیت (PEACE OFFENSIVE) کی جو پالیسی شروع کی ہے، میں اس کی تائید کرتا ہوں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے 'DIPLO-MATIC MOVE' (سیاسی چال) کے طور پر ہی استعمال نہ کیا جائے بلکہ بلا تاخیر صحیح رخ پر اس پالیسی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

کشمیر کے مسئلے میں بھی کھلے انداز میں ایسی نئی تجاویز سامنے آنی چاہئیں، جو تینوں فریقوں کے لئے قابل قبول ہوں۔ اس لئے کہ یہ ایسا نزاع ہے جو دونوں ملکوں کی باہمی دشمنی کا اہم سبب بھی ہے اور تعلقات کی بہتری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی۔ میں پچھلی تقریر میں یہ بات وضاحت سے کہہ چکا ہوں کہ ہماری جانب سے مقبوضہ کشمیر میں رائے شماری کا مطالبہ اگر ایک وقت میں تسلیم بھی کر لیا گیا تو اس کے نتائج ہمارے حق میں کوئی مفید نہیں ہوں گے، کیونکہ بھارت وہاں بڑی تیزی کے ساتھ آبادی کے تناسب کو تبدیل کر رہا ہے۔ وہاں ہندو آ آ کر آباد ہو رہے ہیں اور ان کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے، جبکہ مسلم آبادی گھٹتی جا رہی ہے۔ ہندو کے پاس پیسہ ہے، وہ وہاں جائیداد خریدتا ہے، کاروبار جماتا ہے اور اس طرح ایک LONG TERM PLANNING کے ساتھ وہاں آبادی کے تناسب کو تبدیل کر رہا ہے۔ جس کے بعد وہ کہے گا کہ آیئے رائے شماری کے ساتھ کرا لیجئے! چنانچہ ہمیں اس صورت حال کے پیش آنے سے پہلے متبادل تجاویز پر بھی غور کرنا چاہئے۔

ثقافتی یلغار کا مقابلہ فکری جارحیت سے

ہندوستان کے ساتھ تعلقات معمول پر آنے سے جہاں تک اس کی ثقافتی یلغار کے خوف کا خطرہ ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا بڑا خوف نہیں ہے۔ یہ ثقافتی یلغار ہم پر اس وقت بھی ہو رہی ہے۔ دونوں طرف سے ثقافتی طائفے اور فنکار جس طرح آتے جاتے ہیں اور ان کی محفلیں جس انداز میں جمتی ہیں اور ان کے فوٹو جس طرح ہمارے اخبارات میں چھپتے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انڈیا کی ویڈیو فلموں کو جس طرح ہمارے ہاں پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور ان کا 'دُور دَرشن' جس شوق سے یہاں دیکھا جاتا ہے، یہ سب اسی ثقافتی و فکری حملے کے مظاہر ہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک دونوں ملکوں کے تعلقات کے معمول پر آنے سے یا ان کے

باشندوں کو آمدورفت کی سہولتیں دینے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہو گا۔ آپ کب تک فصیلوں کے پیچھے دبک کر بیٹھے رہیں گے۔ اب اصل ضرورت اس کی ہے کہ ہم OFFENSIVE ہوں' میدان میں آئیں۔ پچھلی مرتبہ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے پاس ایسے دو ہتھیار ہیں جو ان کے پاس نہیں ہیں۔ ہندوستان کے پاس نہ کوئی نظریہ ہے' نہ کوئی نظام ہے۔ دونوں کے اعتبار سے یہ بالکلیہ مغربی تہذیب' مغربی نظام اور مغربی فلسفے کا تابع محض ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ انگریز کے آنے کے بعد ہندو نے انگریزی تعلیم' انگریزی زبان اور انگریزی کلچر کو کھلے ہاتھوں (OPEN ARMS) کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ اس لئے کہ اس کا کوئی اپنا کلچر رہا ہی نہیں تھا۔ اس کی ایک ہزار برس پرانی تہذیب صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھی۔ انگریز کی آمد اس کے لئے تو محض آقاؤں کی تبدیلی کی حیثیت رکھتی تھی کہ پہلے مسلمان حاکم تھے' اب انگریز آ گئے۔

ہمارا معاملہ ہندوؤں کے برعکس تھا۔ ہم تو تختِ حکومت سے گرا کر زمین پر لائے گئے تھے۔ ہم حاکم سے محکوم بنے تھے۔ لہٰذا ہمارے اندر شدید مزاحمت تھی۔ چنانچہ ہماری قوم کے علماء میں سے فعال ترین طبقہ جس کے پاس امت کی قیادت تھی' اس نے طے کر لیا کہ نہ انگریزی پڑھیں گے' نہ سائنس پڑھیں گے' نہ انگریزی لباس پہنیں گے' نہ کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور نہ چھچہ استعمال کریں گے۔ کسی نے چھچہ استعمال کر لیا اور کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھا لیا تو کہتے تھے کہ کرسٹان ہو گیا ہے۔ سرسید احمد خان کو صرف اس بات کے لئے نامعلوم کتنے پاپڑ بیلنے پڑے کہ خدا کے لئے انگریزی پڑھو' ورنہ تم ہندو سے بہت پیچھے رہ جاؤ گے! اگر تم نے مقابلہ نہ کیا تو نہ تمہیں سرکاری ملازمتیں ملیں گی' نہ تم کوئی معقول پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر سکو گے اور تمہاری حیثیت صرف تلّے داروں کی رہ جائے گی۔ سرسید کو اس کام کے لئے بڑا جہاد کرنا پڑا اور اس مسئلے میں ہماری قوم کے اندر ایک تقسیم ہوئی' جبکہ ہندو قوم نے یکسو ہو کر مغربی تعلیم اور مغربی کلچر کو اپنایا۔ مغربی تہذیب کی بے حیائی کو قبول کرنے میں انہیں کیا جھجک ہو سکتی تھی۔ ان کے ہاں تو یورپ سے زیادہ بے حیائی پہلے سے موجود تھی۔ ان کے تو تہواروں کے اندر بے حیائی بکھری ہوئی ہے۔ ناچ اور راگ رنگ تو ان کے مذہب کا حصہ ہے' ان کے روزمرہ کے معمول میں شامل ہے۔ میں اس سلسلے میں ایک ذاتی مشاہدہ بیان کر رہا ہوں۔ ۷۰ء میں میرا پہلی اور آخری مرتبہ 'مشرقی پاکستان' جانا ہوا۔ 'کھلنا' میں ہمیں ایک ہندو گھرانے کی طرف سے چائے کی دعوت دی گئی۔ ہم وہاں گئے تو حیران رہ گئے کہ چائے کے بعد ہمارے میزبان نے کہا کہ میری بچی ذرا ڈانس کرنا چاہتی ہے۔ گویا ان

کے ہاں یہ مہمانداری کے لوازمات میں سے تھا تو انگریزی مغربی تہذیب سے بھارت کو کوئی مغائرت نہیں تھی' اس نے اسے قبول کیا اور اسی پر چلا جارہا ہے۔ تہذیب کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے یورپ کا نظام بھی قبول کیا اور وہ بدترین سرمایہ دارانہ نظام آج بھی ہندوستان میں چل رہا ہے اور ایک اعتبار سے جان لیجئے کہ اس کے چلتے رہنے کی بڑی وجہ ہندو پاکستان کی آپس کی دشمنی ہے وہاں کی قیادت عوام کو آمادہ کرتی ہے کہ فاقے کرو' بھوکے رہو' ہمیں ہتھیار ضرور بنانے ہیں' جیسے کبھی بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ گھاس کھائیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ اس دلیل پر وہاں کا عام آدمی بھوکا رہنے کے لئے بھی تیار ہے۔ ان پر یہ خوف اب بھی سوار ہے کہ یہ 'مُسلے' جو شمال مغربی سرحد سے ہمیشہ آتے رہے ہیں اور اب پاکستان وہاں موجود ہے' نہ معلوم کب یہ تاریخ کو پھر اسی طریقے سے دہرادیں۔ احمد شاہ ابدالی' محمود غزنوی' بابر اور لودھیوں اور غوریوں کی داستانیں انہیں بھولی نہیں۔ چنانچہ مُسلے کے خوف کی بنیاد پر وہ نظام وہاں قائم ہے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس ایک نظریہ ہے' ایک حکمت ہے' ایک ثقافت اور ایک تہذیب ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نگاہِ دُور بیں سے مغربی تہذیب کا مشاہدہ کر کے اس کے بارے میں کہا تھا۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو' خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو' وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا!

لیکن اب ہندوستان اُسی شاخِ نازک پہ آشیانہ بنائے بیٹھا ہے اور ہماری اصل کوتاہی' بدقسمتی اور حماقت یہ ہے کہ ہم بھی اُسی تہذیب میں اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس جو اصل قوتِ تسخیر تھی' یعنی ہمارا فکر' ہماری ثقافت' ہماری تہذیب اور ہمارا نظام اس کو ہم لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور جان لیجئے کہ اگر آپ مغرب کے اس طریقے کی غلامانہ ذہنیت کے ساتھ پیروی کریں گے تو اس میں آپ ہندوستان کے برابر بھی کبھی نہیں آسکتے' اس سے آگے نکلنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم مغربی تہذیب کی نقالی اور بے حیائی میں ہندوستان کا بالکل مقابلہ نہیں کر سکتے' چاہے ہم کتنے ہی میوزک ۸۹ء لے آئیں اور دوپٹے سروں سے اتارنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا شروع کر دیں۔ ————

———— وہ تو ہم سے بہت آگے ہیں۔ آپ ان کی گرد تک نہیں چھو سکتے۔ لہٰذا مقابلے کا میدان یہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنا میدان اختیار کرنا چاہئے۔ ہمارا اپنا نظریہ ہے' اپنا نظام ہے' اپنی

تہذیب ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے یہ ملک بنایا گیا تھا اس کی طرف پیش قدمی نہیں ہوئی۔ مولانا مودودی صاحب نے ایک بڑا پیارا جملہ لکھا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ دنیا مسلمانوں کے حال پر تعجب کرے گی کہ عصائے موسیٰ ان کی بغل میں تھا لیکن وہ دوسروں کی لکڑیوں اور چھڑیوں کو دیکھ کر کانپ رہے تھے' لرز رہے تھے۔ بڑی پیاری تلمیح ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ کا جادوگروں سے مقابلہ ہوا تھا تو انہوں نے اپنی رسیاں اور چھڑیاں پھینکی تھیں تو وہ سانپ بن گئی تھیں۔ اس پر' بربنائے بشریت' حضرت موسیٰؑ کو تھوڑا سا خوف آیا کہ جو میرے پاس تھا وہی ان کے پاس بھی آ گیا۔ اب یہ کیسے ثابت ہو گا کہ حق یہ ہے اور باطل وہ ہے۔ میرے پاس بھی تو یہی ہے نا کہ میرا عصا سانپ بن جاتا ہے..... اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ موسیٰؑ ڈرتے کیوں ہو؟ اپنا عصا پھینکو تو سہی کہ یہ اس سب کو نگل جائے جو انہوں نے بنایا ہے..... تو مسلمان قوم بھی اپنی بغل میں عصائے موسوی رکھتی ہے۔

علامہ اقبال نے اس قرآن کو عصا کہا ہے ؎

در بغل داری کتابِ زندہ

یہ کتابِ زندہ ہماری بغل میں ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ڈر رہے ہیں' کانپ رہے ہیں ہندوستان کی یلغار سے کہ اس کا کلچر اور تہذیب ہمیں ہڑپ کر جائے گی اور میں حیران ہوتا ہوں کہ اور تو اور' قاضی حسین احمد صاحب اس کا واویلا بلند کر رہے ہیں۔ انہیں تو اعتماد ہونا چاہئے کہ ہمارے پاس اپنا کلچر ہے' ہماری اپنی تہذیب ہے۔ اس عصا کو' خود مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو کر' ڈالیں تو سہی۔ اس کے سامنے ان کے بوسیدہ نظام کی کیا حیثیت ہے۔ وہ بوسیدہ نظام کہ جس کے بارے میں اقبال ساٹھ ستر برس قبل پیشین گوئی کر گئے ہیں کہ یہ شاخ اب ٹوٹنے والی ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا!

تو یہ ہے اصل میں کرنے کا کام! اب میں دو حصوں میں آپ کے سامنے اس کی تفصیل رکھوں گا کہ انڈیا کے ساتھ ہمارا جو PEACE OFFENSIVE (پرامن جارحیت) ہے' اس کے ساتھ ایک CULTURAL OFFENSIVE ہونا چاہئے۔ یہ دنیا میں اصول کے طور پر مانا گیا ہے کہ 'OFFENSE IS THE BEST DEFENSE' یعنی اقدام بہترین دفاع ہے۔ اور وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ ؎ عشق خود ایک سیل ہے' سیل کو لیتا ہے تھام! آپ سیلاب کے آگے بند باندھیں گے تو وہ نہیں رکے گا۔ سیلاب کا مقابلہ جوابی

سیلاب سے ہو گا۔ ایک ثقافتی حملے (CULTURAL INVASION) کا مقابلہ جوابی ثقافتی یلغار ہی سے ہو گا۔ نظام کے مقابلے میں آپ بہتر نظام لیکر آیئے۔ میں نے پچھلی مرتبہ بھی عرض کیا تھا کہ ہندوستان کے بارے میں ایک بات جان لیجئے کہ وہاں ذات پات کی بناء پر اونچ نیچ کا جو نظام تا حال موجود ہے اس ضمن میں ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے ہندوستان پر ایک ہزار یا آٹھ سو برس تک حکومت کی لیکن اس کے ذریعے سے اسلام کو پھیلانے کی کوشش نہیں کی ورنہ یہ ہریجن جو ان کے ہاں اچھوت ہیں ان کو تو ذرا سی محنت سے اسلام کی طرف لا سکتے تھے۔ بلکہ اس دور میں ہریجنوں کے جتنے لیڈر ابھرے ہیں سب کے سب مسلمان ہونے کو تیار تھے۔ جگ جیون رام' امبیت کر مسلمان ہونے کو تیار تھے اور میں حیران ہوا تھا جب پہلی مرتبہ میں مدارس گیا تھا۔ وہاں یہ بات میرے علم میں آئی تھی۔ تامل ناڈو ایک بہت بڑا صوبہ ہے ہندوستان کا' اس وقت تامل قومیت ہندوستان کی بہت بڑی اور مضبوط قومیت ہے۔ اس دور میں تامل کلچر اور تامل تہذیب کا جو احیاء ہوا ہے اور تامل ناڈو کے نام سے جو تامل لینڈ وجود میں آیا ہے تو اس احیائی عمل میں انا دورائی کو ان کے مرکزی لیڈر کی حیثیت حاصل ہے۔ مدارس میں میں نے دیکھا کہ ہر چوک میں جہاں گاندھی کی مورتی ہے وہاں اس کے برابر انا دورائی کی مورتی بھی موجود ہے۔ یعنی جس طرح پورے ہندوستان میں گاندھی کو پوجا جاتا ہے اسی طریقے سے تامل ناڈو میں انا دورائی کی پرستش ہوتی ہے۔ انا دورائی کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ اسے حضورؐ کی سیرت کے ساتھ تو اتنا عشق تھا کہ کہیں میلاد کی محفل کی اطلاع اسے ہوتی فوراً پہنچ جاتا تھا۔ وہ شخص مسلمان ہونے کیلئے تیار تھا لیکن وہی قدیمی شیعہ سنّی مسئلہ اس کے آڑے آیا۔ وہی سبائیت کا ڈالا ہوا فساد' عبداللہ ابن سبا کا وہ خنجر جو آج تک جسدِ امت میں پیوست ہے' انا دورائی کے راستے کا پتھر ثابت ہوا۔

یہی معاملہ ہوا امبیت کر کے ساتھ کہ وہ مسلمان ہونے کو تیار تھا تو وہ حضرات پہنچ گئے کہ صاحب اگر آپ کو مسلمان ہونا ہے تو پھر اصل فرقہ تو ہمارا ہے' اصل اسلام تو یہ ہے۔ تو وہ پریشان ہوا کہ اب میں کس کو قبول کروں اور کس کو چھوڑوں اور یہ چیز اس کے قبولِ اسلام کی راہ کی رکاوٹ بن گئی۔ تامل قوم کے اندر بڑی توانائی ہے اور وہ پوری کی پوری قوم مسلمان ہو سکتی تھی لیکن کسے دوش دیں کہ قصور تو ہمارا اپنا ہے۔ اور یہ وہ کوتاہی ہے جس کے ہم آٹھ سو برس تک مرتکب ہوتے رہے کہ ہریجنوں تک کو مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی جن کے لئے اسلام کی قبولیت کی راہ میں کوئی رکاوٹ موجود نہ تھی۔

ہماری دوسری کوتاہی جس کی جانب میں آج آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں' ہندوؤں کی

اعلیٰ ترین ذات برہمنوں کے معاملے میں تھی۔ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ فلسفہ برہمنوں کے رگ و ریشے میں پیوست ہے۔ ضربِ کلیم میں "ایک فلسفہ زدہ سیدزادہ کے نام" کے عنوان سے علامہ اقبال کی جو نظم ہے 'اس میں وہ فلسفہ زدہ سیدزادے کو تو یہ پیغام دیتے ہیں کہ۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا　　　زناریٔ برگساں نہ ہوتا

لیکن خود اقبال جو خاندانی اعتبار سے کشمیری پنڈت تھے 'اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ۔

ہے فلسفہ میرے آب و گلِ میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

میرے تو خمیر میں فلسفہ موجود ہے۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے میں فلسفہ ہے۔

اقبال اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

ایک جانب اقبال کا تواضع اور انکسار ہے کہ خود کو بے ہنر کہہ رہے ہیں لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کا اعتراف بلکہ دعویٰ بھی ہے کہ میں فلسفے کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تو میں بتانا چاہ رہا ہوں کہ ہندوستان میں پنڈتوں اور برہمنوں ہی کو ہمیشہ حاکموں کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ نہرو فیملی بھی کشمیری پنڈتوں کی فیملی ہے اور شیواجی وغیرہ بھی مہاراشٹر کے پنڈت تھے۔ یہ برہمن اور پنڈت ہی ہمیشہ ہندوستان کی کلچرل قیادت پر بھی قابض رہے ہیں۔ فلسفہ ان لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ لیکن ہماری سب سے بڑی کوتاہی یہ ہوئی کہ ہم اسلام کو فلسفہ و فکر کی سطح پر پیش تو کیا کرتے ہم نے ہندوستان کے جو مقامی فلسفے اور نظریات تھے انہیں سمجھنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہم تو اس گھمنڈ میں رہے کہ ہم حاکم ہیں اور یہ محکوم۔ ان کے پاس کونسا فلسفہ اور نظریہ ہے' یہ ہم نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ہم اس نشے میں تھے کہ اصل شے تو تلوار ہے اور تلوار ہمارے پاس ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم ان کے فلسفے کا مطالعہ کرتے' ان کے ذہن کو پڑھتے' ان کی سوچ کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اس لئے کہ جب تک آپ کسی شخص کی سوچ کو نہ سمجھیں' ابلاغ نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنی بات اس تک نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن اس معاملے میں ہم نے کوتاہی کی انتہا کر دی۔ چند برس پہلے میرا بھارت جانا ہوا تھا۔ مجھے مدارس جانا تھا لیکن راستے میں بمبئی رکنا پڑا۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو دین کی دعوت و تبلیغ کے کام میں سرگرم عمل تھے۔ نیک آدمی ہیں' بمبئی میں قرآن اکیڈمی کے نام سے انہوں نے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ مراٹھی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر

حواشی شائع کر رہے ہیں۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میرا اکرام فرمایا اور اپنے دفتر میں مجھے مدعو کیا۔ ایسے ہی دورانِ گفتگو میں ان سے پوچھ بیٹھا کہ ویدوں کی تعداد کتنی ہے؟ کہنے لگے مجھے تو نہیں معلوم! میں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ کو ویدوں کی تعداد نہیں معلوم؟ آپ نے کبھی وید نہیں پڑھی؟ کہنے لگے نہیں کبھی نہیں پڑھی۔ میں نے کہا آپ ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں اور نہ ان کے ذہن کو آپ جانتے ہیں نہ ان کے فکر اور فلسفہ سے واقف ہیں! ابلاغ کیسے ممکن ہے! ایسے تو ابلاغ کا حق ادا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ابلاغ کا حق تب ادا ہوتا ہے کہ آپ ان کی سوچ کو اور ان کے فکر کو سمجھیں اور پھر کوئی قدرِ مشترک تلاش کر کے وہاں سے اپنی دعوت کا آغاز کریں۔ تب تو آپ کی بات کسی کے ذہن میں اترے گی اور دل میں جگہ بنائے گی۔

قرآن نے ہمیں یہی طریقہ بتایا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ أَنْ لَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا۔

"اے اہل کتاب آؤ کہ ہم اس کلمہ پر جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے مابین مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں"۔

واقعہ یہ ہے کہ جو بات امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے کہی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ شاید وہ دور آ گیا ہے کہ وہ بات ایک مجسم حقیقت بن کر سامنے آئے۔ پاکستان کو اپنے بقاء کے لئے ہندوستان پر فکر کی بلند ترین سطح پر ایک حملہ کرنا ہوگا، ایک یلغار کرنی ہوگی۔ اس لئے کہ 'جارحیت بہترین دفاع ہے' کے اصول پر ہمیں آگے بڑھنا ہوگا اور ہمارے پاس عصائے موسیٰ کے طور پر قرآن موجود ہے۔ اعلیٰ ترین فکر اور بلند ترین نظریہ توحید ہمارے پاس ہے اور ہندوستان میں بھی اعلیٰ سطح پر اپنشد وغیرہ کے جو فلسفے ہیں ان میں توحید ہے۔ ایک تو عوام کا مذہب ہے یعنی بتوں کی پرستش اور ان کے سامنے ڈنڈوت وغیرہ۔ یہ کھلونے ہیں جو انہوں نے عوام کو دے رکھے ہیں۔ ویسے ان کے ہاں بھی توحید موجود ہے۔ میرا اپنا تصور یہ ہے کہ صحفِ ابراہیم کی کچھ نہ کچھ تعلیمات مسخ شدہ شکل میں ان کے ہاں موجود ہیں، اور ہندوستان میں یہ برہما کا لفظ جو ہے یہ درحقیقت ابراہیمؑ ہی کے نام کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ انہوں نے اسے معبود بنا لیا جیسے حضرت مسیحؑ کو عیسائیوں نے اللہ کا بیٹا بنا لیا۔ ظاہر بات ہے کہ اگر قرآن ہمیں نہ بتاتا تو ہم کیسے جانتے کہ وہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ بہرحال آج ہمیں یہ کام کرنا ہے کہ قرآن کے فکر اور نظریئے کو اور اس کے فلسفہ و حکمت کو اعلیٰ علمی سطح پر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے،

اور الا قرب فا لاقرب کے مصداق ہمارا ہمسایہ ہندو اس کا زیادہ مستحق ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم "فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام" خاقانی کے دو اشعار پر ختم کی ہے اور دیکھئے اس میں پیغام کیا دیا ہے۔

دل در سخنِ محمدیؐ بند
اے پورِ علیؓ زِ بُوعلی چند

اے فلسفہ کے پیچھے ٹھوکریں کھانے والے سیدزادے! محمدؐ کی باتوں کی طرف آؤ اور اپنے دل کو اس کے ساتھ لگا چھوڑو۔ اور جان لیجئے کہ قرآن ہی ایک اعتبار سے سخن محمدیؐ ہے' اس لئے کہ امت نے قرآن حکیم زبان محمدیؐ ہی سے تو سیکھا ہے۔ یہ وحی جلی ہے اور حدیثِ رسولؐ وحی خفی ہے۔ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ قرآن حکیم کے بارے میں خود قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ "بیشک یہ قول ہے رسول کریم کا" یہ حضرت جبرائیل کے لئے بھی آیا اور حضورؐ کے لئے بھی' حالانکہ یہ کلام اللہ کا ہے۔ لیکن چونکہ پہلے جبرائیلؑ کی زبان سے محمدؐ کو پہنچا اور پھر محمدؐ کی زبان سے امت کو پہنچا تو یہ "قولِ رسولِ کریم" ہے' "سخنِ محمدیؐ" ہے۔

اے علی کی اولاد' یہ تم بوعلی سینا کے چکر میں کب تک پڑے رہو گے۔ یہ گویا ارسطو اور سقراط کے فلسفے کے لئے استعارہ ہے۔ بوعلی سینا انہی کے پیروکار ہیں۔ تو تم سیدزادے ہو' علیؓ کی اولاد ہو' تم بوعلی سینا کی طرف نہ جاؤ بلکہ علیؓ کے راستے سے ہو کر محمدؐ تک پہنچو۔

چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قایدِ قرشی بہ از بخاری

تمہارے پاس اگر وہ بصارت نہیں ہے جو تمہیں سیدھا راستہ دکھا سکے تو برگساں اور ہیگل کا دامن تھامنے کے بجائے قائد قرشی محمد رسول اللہؐ کا دامن تھامو! اگر آدمی کے پاس ذاتی بصارت نہ ہو تو اس کی مجبوری ہے کہ وہ اپنی لٹھیا کسی کے ہاتھ میں تھمائے۔ تو تمہیں اگر اپنی لٹھیا کسی کو تھمانی ہی ہے تو محمد رسول اللہؐ سے بہتر قائد کہاں سے ملے گا!

اقبال کے اس پیغام پر ان کے مرشد معنوی مولانا رومی کے اس شعر کا اضافہ کر لیجئے۔

چند خوانی حکمتِ یونانیاں
حکمتِ قرآنیاں راہم بخواں

اے مسلمان کب تک یونانیوں کی حکمت پڑھتا رہے گا۔ کب تک افلاطون کے فلسفے

اور ارسطو کی منطق کے چکر میں پڑے رہو گے' آؤ قرآن کی حکمت کو پڑھو!

اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس صدی میں اس اعتبار سے انتہائی خوش نصیب قوم ہیں کہ ایک تو ہمارا یہ ملک اسلام کے نام پر بنا۔ دوسرے یہ کہ یہاں علامہ اقبال دفن ہیں۔ اور یہاں ان کی شاعری اور پیغام کی سب سے بڑی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ہے۔ میں نے اپنے کتابچے "علامہ اقبال اور ہم" میں علامہ اقبال کو رومی ثانی قرار دیا ہے۔ یہ دوسرے رومی ہیں جنہوں نے قرآن کے فلسفے اور حکمت کو محکم دلائل کے ساتھ اور انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور ہمارے لئے کرنے کا کام یہی ہے چونکہ ہم در حقیقت آج حکمتِ قرآنیہ کے سب سے بڑے امین ہیں۔

دُنیا کو حکمتِ قرآنی کی تلوار سے فتح کیجئے

گزشتہ جمعہ میں میں نے سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات پر گفتگو کی تھی۔ ان میں بہت سی بحثیں اور بہت سے تفسیری اشکالات ہیں۔ البتہ ان کا جو اصل خلاصہ اور لبِ لباب ہے وہ علم کی اہمیت اور علم کی عظمت ہے۔ اسلام کے سوا کوئی دین نہیں۔ دین ہے ہی صرف اسلام' باقی تو مذہب ہیں چھوٹے چھوٹے سے اور سارے مذاہب اسلام ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ آدم کون تھے؟ مسلم تھے! دین کیا تھا؟ اسلام تھا! ان کی اولاد نے فساد پیدا کیا تو اس اسلام میں بگاڑ آیا۔ تو یہ سارے مذاہب اسلام ہی کی مسخ شدہ شکلیں ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے بارے میں تو ہم قرآن کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ ان کا دین اسلام ہی تھا' جسے انہوں نے بگاڑ ڈالا' باقی کے بارے میں ہمارے پاس علم نہیں ہے...... تو جو دین آدم سے لے کر ایں دم تک نوعِ انسانی کو عطا کیا گیا اس میں علم کی تاکید عبادت سے ہزار گنا زادہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ساری رات جاگ کر عبادت کرنے سے بہتر ہے کہ ایک گھنٹہ انسان پڑھنے پڑھانے میں لگائے۔ آپ ذرا اس نسبت و تناسب کا اندازہ کیجئے کہ عالم کی دوات کی سیاہی شہید کے خون کے ہم وزن قرار دی گئی ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی 'کتاب العلم' میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من جاء ہ الموت وھو یطلب العلم لیحیی بہ الاسلام فبینہ و بین النبیین درجۃ واحدۃ فی الجنۃ .... "جس شخص کو موت آئی اس حال میں کہ وہ علم حاصل کر رہا تھا تاکہ اسلام کو زندہ کرے تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنت میں صرف ایک درجے کا فرق ہوگا"۔ لیکن یہ نوٹ فرمالیجئے کہ یہ فضیلت اس علم کی ہے جو احیائے اسلام کے لئے حاصل کیا جائے۔ باقی رہا اس علم کا معاملہ جو

تنخواہوں کے لئے، بہتر کیریئرز کے لئے اور نمایاں پوزیشنز کے لئے حاصل کیا جائے تو یہ تو غیر مسلم بھی کر رہے ہیں۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ علم کی دو شاخیں ہیں: علم الابدان اور علم الادیان یہ غالباً ابن خلدون کا قول ہے۔ ویسے میں تو قرآن حکیم کی بنیاد پر علم کی دو اقسام بیان کر چکا ہوں۔ سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع کے شروع میں علم الاشیاء یا علم الابدان کی طرف اشارہ ہے: "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا"۔ اور اسی رکوع کے آخر میں علم ہدایت کا تذکرہ ہے جس کا ذریعہ وحی ربانی ہے: "فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى" اس علم ہدایت کا مرقعِ کامل ہے قرآن حکیم جس پر اس علم کی تکمیل ہو گئی۔

نوعِ انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃٌ للعالمیں

اور یہ جو علم کتاب ہے یہ ابتداً قلم کے ذریعے سے نہیں آیا۔ اب تو قلم کے ذریعے سے پھیل رہا ہے، ہم بھی پھیلا رہے ہیں، مفکرین نے بھی پھیلایا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ قلم کے ذریعے نہیں پہنچا بلکہ آنحضورؐ نے اسے فرشتے کی زبان سے سن کر زبانی یاد کیا ہے۔ سورۃ القیامۃ میں ارشاد ہوا: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ یعنی اے نبیؐ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیجئے کہ اسے جلدی سے یاد کر لیں۔ ہمارے ذمے ہے اسے آپ کے ذہن میں بھی اور آپ کے سینے میں بھی محفوظ رکھنا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ علمِ کتاب زبان کے ذریعے سے پہنچا ہے۔ اور علم بالقلم سے علوم طبیعی مراد ہیں۔ ان کی اس قدر اہمیت ہے کہ تمام مظاہر فطرت کو قرآن مجید میں آیات خداوندی قرار دیا گیا ہے اور ان کے مطالعے کی دعوت دی گئی ہے۔

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

کائنات کی تخلیق میں غور کرو، توہمات سے نکل کر حقائق کو سمجھو اور حقائق کی گہرائیوں کے اندر غوطہ زنی کرو۔ سورۃ القلم کے آغاز میں قلم کی قسم کھائی گئی: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ○

جب اس طبیعی علم کی یہ اہمیت اور یہ مقام و مرتبہ ہے تو علم کتاب کی اہمیت کس قدر زیادہ ہوگی۔ یہ علم رحمان کی رحمانیت کا مظہر ہے: اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ..... یہ علم تمام علوم سے بلند و برتر ہے اور اس علم کی بھی کئی سطحیں (LEVELS) ہیں۔ اس کی ایک سطح تو یہ

ہے کہ تجوید سیکھ لیجئے' ناظرہ پڑھنا سیکھ لیجئے۔ ایک یہ ہے کہ ترجمہ سیکھ لیجئے۔ ایک یہ کہ اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کیجئے۔ ؏ قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں !

اس کی حکمت تلاش کیجئے۔ اس بحرِ زخار کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرو اور اس سے فلسفہ و حکمت کے موتی نکال کر دنیا کے سامنے پیش کرو۔ اس میدان میں دنیا کی کوئی قوم تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس قرآن ہی کی طاقت سے تم پوری دنیا کو مسخر کر سکتے ہو۔ بلا تشبیہ عرض کر رہا ہوں' جیسے حضورؐ نے فرمایا تھا، یا ایها النّاس قولوا لا اله الّا اللّٰه تفلحوا۔ اے لوگو' اس کلمے کو قبول کر لو تو کامیابیاں تمہارا مقدر ہوں گی۔ قیصرو کسریٰ کی دولت اور ان کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں آجائیں گی۔ صحیح کہا تھا محمد رسول اللہ نے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور میں پورے تیقّن کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ آج کی دنیا میں اس سے بڑی کوئی قوتِ تسخیر نہیں۔ اس سے بڑی طاقت کسی اور شے کے اندر نہیں۔ اس حکمتِ قرآنی کی تلوار سے دنیا کو فتح کیجئے۔ جیسے اقبال نے کہا ہے۔ ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زاں کہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

لیکن یہ یاد رکھئے کہ قرآن کی تلوار سے کام لینے کے لئے پہلے اپنا پتہ مارنا پڑتا ہے۔ پہلے بیٹھ کر قرآن سیکھنا پڑتا ہے۔ خوشنما کیریئرز چھوڑنے پڑتے ہیں اور زندگی کی آسائشوں سے منہ موڑنا پڑتا ہے۔ یہ دیکھو گے کہ میرے ساتھی آگے نکلتے جا رہے ہیں' بنگلے بنتے جا رہے ہیں' کاریں آ رہی ہیں لیکن ہم بیٹھے ہیں قرآن کو پڑھنے اور پڑھانے' سیکھنے اور سکھانے میں۔ اگر یہ حوصلہ اور ولولہ ہے تو یہی ہے کرنے کا اصل کام! میں نے ۶۷ء میں کتابچہ لکھا تھا "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام"۔ اور یہی وہ کام ہے جس کے لئے مرکزی انجمن خدام القرآن اور قرآن اکیڈمی قائم کی تھی۔ اسی کام کے لئے قرآن اکیڈمی میں پہلے فیلوشپ اسکیم چلائی اور پھر دو سالہ کورس شروع کئے۔ ان کورسز میں گریجویٹس کے علاوہ ایم ایس سی' ایم بی بی ایس' بی ڈی ایس اور سول انجینئرز نے بھی توفیق الٰہی سے علمِ دین کی تحصیل کی۔ اور اسی سلسلے کی ایک کڑی قرآن کالج ہے۔ میں نے ہمیشہ ان تعلیمی سکیموں کے لئے افراد کا مطالبہ کیا ہے۔ اس مسجد میں بھی بارہا پکار لگائی ہے کہ اپنے بچوں کو اس کام میں لگایئے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہاں سے کوئی RESPONSE نہیں ملا۔ بہرحال میں ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔

الحمد للہ کہ میں اسی کام میں لگاہوا ہوں اور مجھے اپنی باقی زندگی بھی اسی میں لگانی ہے۔ اس کے سوا میرے لئے اس دنیا میں کوئی AMBITION نہیں ہے۔ بچپن میں حفیظ جالندھری کا ایک شعر پڑھا تھا۔

کیا فردوسیؒ مرحوم نے ایران کو زندہ
خدا توفیق دے تو میں کروں اسلام کو زندہ

حفیظ نے اس شعر میں "شاہنامۂ اسلام" لکھنے کی غرض وغایت بیان کی تھی۔ اسی وقت سے دل میں یہ امید تھی کہ ع خدا توفیق دے تو میں کروں قرآن کو زندہ۔ اس لئے کہ اس قرآن سے ہماری نسبت مرچکی تھی' اسے زندہ کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے زندگی کے ساڑھے تئیس برس اسی کام کے اندر گزار دیئے اور میں پورا مطمئن ہوں کہ میں نے اللہ کے فضل وکرم سے زندگی کے بہتر اور بیشتر حصے اس کتاب کے سیکھنے سکھانے میں صرف کئے ہیں۔ لیکن سمجھ لیجئے کہ یہ صرف مذہبی کام نہیں ہے۔ میرے لئے یہی قومی کام ہے' یہی کام اس ملک کے استحکام کا ضامن ہے' اسی سے آپ ہندوستان سے بلکہ پوری دنیا سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔

آج دعوتِ قرآنی کو محض اعتقادی سطح (DOGMATIC LEVEL) پر نہیں بلکہ دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے اعلیٰ اقوام کے ہندو اسلام قبول کرلیں گے۔ یہ کام اگرچہ ساری دنیا میں کرنے کا ہے لیکن میں ہندوستان کا ذکر خاص طور پر اس لئے کر رہا ہوں کہ ایک تو ہندوستان ہمارا قریب ترین ملک ہے۔ پھر یہ ہمارا سب سے بڑا پیدائشی دشمن ہے جس سے ہمیں اپنے آپ کو بچانا بھی ہے۔ یہ بات بھی نوٹ کیجئے کہ ہندوستان وہ ملک ہے جہاں پندرہ کروڑ مسلمان آباد ہیں جو ہندو کے لئے لوہے کے چنے ثابت ہوئے ہیں۔ انہیں کوئی چبا نہیں سکا ہے۔ انہوں نے اپنے پرسنل لاء بورڈ کے اندر بڑی عظیم کامیابی حاصل کر کے دکھادی ہے اور ہندوؤں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ بات ثابت کر کے دکھادی ہے کہ انکے عائلی قوانین کے اندر کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمان مرجائے گا لیکن اپنے دین ومذہب میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونے دے گا۔ پھر ایک عملی حقیقت یہ بھی ہے کہ ہمارے پاس وہ اردو زبان ہے جو پورے ہندوستان کے کونے کونے میں سمجھی جاتی ہے۔ اور ہندوستان کی زمین قرآن فہمی کے لئے بڑی زرخیز ہے۔ ہم اردو زبان کو یہاں دعوت قرآنی کا ذریعہ بناسکتے ہیں۔ کبھی کسی نے بڑی صحیح بات کہی تھی کہ قرآن نازل ہوا حجاز میں' اسکو پڑھنے کا حق ادا کیا مصریوں نے...... قراءت میں واقعتاً مصریوں سے آگے کوئی نہیں نکل سکتا...... اور اسکو لکھنے کا حق ادا کیا ترکوں

نے۔ قرآنی حکمت کا عظیم ترین مرکز ترکی ہی ہے...... اور اسکو سمجھنے کا حق ادا کیا ہندیوں نے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حکمت قرآنی کو سمجھنے کیلئے ' ذہنِ ہندی ' بہت زرخیز ثابت ہو سکتا ہے۔ اور ہند میں حکمت قرآنی کا سب سے بڑا رازدان اقبال ہوا ہے۔

میں آپ کو اسی کام کی دعوت دے رہا ہوں جس کو میں نے اپنے لئے پسند کیا اور جس میں اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں کھپائیں۔ قرآن اکیڈمی کے بعد اب قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم زیر تعمیر ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ارادہ ہے کہ اس آڈیٹوریم میں ابتداء سے اختتام تک پورے قرآن حکیم کا درس ریکارڈ کروادوں اور اس طرح وہ ویڈیوز اور آڈیوز کے اندر محفوظ ہو جائے۔ میں مفسّر نہیں ہوں 'اپنے آپ کو تفسیر لکھنے کا اہل نہیں سمجھتا' البتہ اللہ تعالیٰ نے تفہیم کی صلاحیت دی ہے۔ اس کی توفیق سے جدید تعلیمیافتہ لوگوں کے ذہنوں تک اللہ کا یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر پورے قرآن حکیم کا سلسلہ وار درس ریکارڈ ہو جائے تو امید ہے کہ یہ آنے والی نسلوں کے لئے مفید ثابت ہو گا۔ اور اگر ہماری قسمت میں یہ نہیں ہے کہ ہم قرآن اور اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں تو شاید اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو اس کی توفیق عطا فرما دے۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے

اس بار مرکزی انجمن خدام القرآن کا سالانہ اجلاس اسی زیر تعمیر قرآن آڈیٹوریم میں ہو گا۔ اس میں آپ حضرات زیادہ سے زیادہ شرکت کیجئے۔ مزید بر آں جمعہ ۲۴؍ مارچ کی شام سے انجمن کے زیر اہتمام جناح ہال لاہور میں پانچ دن متواتر "محاضراتِ قرآنی" ہوں گے۔ ان محاضرات کا مجموعی عنوان ہے "اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی" ...... اسلام کے فکرو فلسفہ کے علاوہ اس کا دیا ہوا نظام عدل اجتماعی آج انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اقبال کی اسی نظم "فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام" میں اقبال کی عظمت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے دستورِ حیات کی طلب ہے

یعنی انسان تو بھٹک رہا ہے 'ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ وہ ایک نظام کو آزماتا ہے 'اس سے مایوس ہوتا ہے تو اسے پھینک کر دوسری طرف جاتا ہے۔ نوع انسانی اسی طرح ایک انتہا سے دوسری انتہا تک افراط و تفریط کے دھکے کھا رہی ہے۔ اس لئے کہ آدم کو ثبات (STABILITY) کی طلب ہے۔ اسے TRANQUILLITY کی ضرورت ہے۔ اسے ایسا امن اور اطمینان کا ماحول

درکار ہے جس میں ہر شخص سکون کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکے' انہیں DEVELOP کر سکے۔ اللہ کے ساتھ لو لگانے کے لئے بھی سکون و اطمینان کی ضرورت ہے۔ یہ جو کسی نے کہا ہے صدفی صد صحیح کہا ہے ؂

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اگر معاشی نظام غلط ہے تو لوگ ڈھور ڈنگر بن کر رہ جائیں گے۔ انہیں اللہ سے لو لگانے کی فرصت کہاں ہوگی! جسے دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے کمر توڑ دینے والی مشقت کرنا پڑتی ہو' جو آٹھ آٹھ اور دس دس گھنٹے اینٹیں ڈھو کر اپنے بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی فراہم کرتا ہو' آپ سمجھتے ہیں کہ وہ رات اللہ کے حضور قیام و سجود میں بسر کرے گا اور دن کو روزہ رکھے گا؟ حدیث نبویؐ ہے کہ یکاد الفقر ان یکون کفرا یعنی قریب ہے کہ تنگدستی کفر میں تبدیل ہو جائے۔ چنانچہ آج انسان کی اصل ضرورت ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کی ہے۔ اور اسلام کا نظام عدل اجتماعی معاشرتی' معاشی اور سیاسی سطح پر بہترین اور متوازن ترین نظام ہے۔ آج دنیا کو اس کی ضرورت ہے تاکہ انسان TRANQUILLITY کے اندر، سکون و اطمینان سے اپنی باطنی استعدادات اور صلاحیتیں بھی بروئے کار لا سکے۔ اسی نظم میں اقبال نے کہا ہے ؂

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِ محمدؐ و براہیمؑ!

دینِ اسلام کا مقصد در حقیقت زندگی کے راستے کو سیدھا کرنا ہے۔ نوعِ انسانی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ دین اسے صراط مستقیم دیتا ہے...... اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ...... دین زندگی گزارنے کا سیدھا راستہ عطا کرتا ہے' جسے قرآن میں کہیں صراط مستقیم' کہیں صراط السوی اور کہیں سواء السبیل کہا گیا ہے۔ یہی دین حقیقتِ محمدی اور حقیقتِ براہیمی ہے۔
اس شعر کے بعد اقبال خاقانی کے دو اشعار پر اپنی نظم ختم کرتے ہیں

"دل در سخنِ محمدی بند اے پورِ علیؓ ز بو علی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری قایدِ قرشی بہ از بخاری"

آج کی گفتگو کا سورۃ العلق کے ساتھ ربط و تعلق

اب آج کی اس گفتگو کے ساتھ سورۃ العلق کی ابتدائی آیات کا ربط بھی جوڑ لیجئے۔ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات علم کی اہمیت سے متعلق ہیں۔ آغاز ہی ہوا ہے لفظ 'اقرأ' کے

ساتھ 'پھر تیسری آیت کے آغاز میں بھی اس لفظ کو مکرر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ تعلیم و تعلم کو دین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ احادیث مبارکہ میں علم کی فضیلت کو جس انداز میں نمایاں کیا گیا ہے اُس کا حوالہ اسی گفتگو میں دیا جا چکا ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام اور اس کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کے تعلیمی منصوبے دراصل اسی علمی کام کی جانب پیش رفت کی ایک کوشش ہے۔ واضح رہے کہ یہاں علمی کام سے مراد تعلیم و تعلم کا وہ کام ہے جو حدیث مبارکہ کے الفاظ " لیحیی بہ الاسلام " کا کسی درجے میں مصداق بن سکے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ایسے دسیوں بیسیوں نہیں سینکڑوں ادارے وجود میں آئیں اور وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر قرآن و سنت کی رہنمائی کو پیش کیا جائے لیکن ظاہر بات ہے کہ ہم اپنے وسائل اور اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے اللہ کے ہاں مکلف ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ اس کام کی ضرورت کا احساس دینی ذوق رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں اجاگر کیا جائے اور اپنی بساط کی حد تک علمی ادارہ قائم کر کے صحیح خطوط کی نشاندہی کر دی جائے۔ اللہ کی رحمت سے ہمیں قوی امید ہے کہ پھر چراغ سے چراغ جلیں گے اور وقت کی اس اہم ترین ضرورت کے پورا ہونے کا سامان فراہم ہو گا۔

سورۃ العلق کی چھٹی ساتویں اور آٹھویں آیت میں دراصل اس اہم حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ انسان طغیانی ' سرکشی اور اپنے حدود سے تجاوز پر جو ہر دم آمادہ رہتا ہے تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے پوچھنے اور پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ کوئی بالادست قوت اسے ایسی نظر نہیں آتی جو اسے ظلم و تعدی سے روک سکے ' وہ اپنے تئیں خود کو مستغنی سمجھتا ہے۔ اس صورت حال کا اصل علاج تو یہی ہے کہ آخرت کا یقین دلوں میں راسخ ہو ' جوابدہی کا احساس انسان کے عمل پر غالب آ جائے۔ اور ظلم و طغیانی سے روکنے والی قوت خود انسان کے اندر پیدا ہو۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ ایمان و یقین کی یہ کیفیت تو ہر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ معاشرے میں سرکشی و طغیانی کو روکنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے خارجی طور پر یہ اہتمام فرمایا ہے کہ انبیاء و رسل کے ذریعے وہ نظام عدل اجتماعی نوع انسانی کو عطا فرمایا جو معاشرے میں عدل و قسط کے قیام کا ضامن ہے۔ وہ نظام کہ جس میں نہ کسی کی حق تلفی ہوتی ہو اور نہ کوئی اپنے جائز حق سے زائد وصول کر سکے۔ افسوس ہے کہ اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی آج دنیا کے کسی بھی خطے میں قائم و نافذ نہیں ہے۔ اور مزید افسوس اس بات پر ہے کہ نہ صرف یہ کہ فرائض دینی کا تصور محض نماز ' روزہ ' حج اور زکوٰۃ تک محدود ہو گیا ہے اور اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام کی ضرورت یعنی اقامت دین کی فرضیت کا احساس

مسلمانوں میں باقی نہیں رہا بلکہ سرے سے اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا خیال ہی محو ہو چکا ہے اور اسلام کا یہ دمکتا ہوا گوشہ خود مسلمانوں کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہے۔ تنظیم اسلامی کا قیام دراصل دین اسلام کے غلبہ و سربلندی اور اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام ہی کی ایک کوشش ہے۔ ہم نے اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر اس راہ پر قدم رکھ دیا ہے' اپنی امکانی حد تک ہماری کوشش ہے کہ اس اہم دینی فریضے کی انجام دہی کے لئے وہی لائحہ عمل اختیار کریں جو سیرت مطہرہ کے مطالعے سے سامنے آتا ہے۔ خلوص دل کے ساتھ اس راہ کے صحیح خطوط کو اجاگر کرنا اور ان خطوط کے مطابق اپنی جدوجہد کو ممکنہ حد تک آگے بڑھانا ہماری ذمہ داری ہے' نتائج کا معاملہ کلی طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا یہی ہے کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک خدمت قرآنی کے اسی کام کو کرنے اور اقامت دین کی اسی جدوجہد میں اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کی توفیق دیئے رکھے۔ اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولكم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

رپورتاژ

قرانِ السّعدین

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سترھویں سالانہ اجلاس اور تنظیم اسلامی کے چودھویں سالانہ اجتماع کی رُوداد

اسلام کے انقلابی فکر کی حامل تحریک کا ایک قافلہ اپنے چودھویں پڑاؤ پر پہنچا تو ایک جشن کا ساسماں تھا۔ مسبب الاسباب نے اگر اس کا سامان کر دیا تو احسان شناسی اور شکر گزاری کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جائے جس نے اپنے بندے اور اسلام کے کروڑوں نام لیواؤں میں سے ایک عام کلمہ گو کے دل میں احساس فرض کی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنا دیا جو کسی ادعا کے بغیر اور "انی من المسلمین" کہتے ہوئے اللہ کے بندوں کو ان کے رب کی طرف بلاتا رہا۔ تنظیم اسلامی فرد واحد کی پکار پر جمع ہونے والوں کی انقلابی جماعت ہے جو سالہا سال اپنی ذات میں انجمن تھا۔ بندگان خدا کے تعاون کے احسان کا زیر بار ہوئے بغیر محض توفیق و تائید الٰہی سے تن تنہا رجوع الی القرآن کا آوازہ بلند کرنے کے بعد اسے اعوان و انصار میسر آئے تو انہیں انجمن خدام القرآن کی لڑی میں پرو یا لیکن یہ اس کی منزل نہ تھی۔ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس فی الحقیقت تیاری کا ایک مرحلہ تھا جس میں فرائض دینی کا شعور ہدایت کے اصل سرچشمے 'قرآن مجید سے پختہ کیا گیا۔ اسی نرسری سے تنظیم اسلامی کو پودوں کی وہ پہلی کھیپ ملی جنہیں زمین میں جڑ پکڑے چودہ سال ہو گئے ہیں۔ اس نرسری کی اہمیت اب بھی کم نہیں ہوئی بلکہ اس میں توسیع کا عمل جاری ہے۔ اب تو اس میں قرآن مجید کی انقلابی دعوت کے بیج بونے سے کام شروع ہوتا ہے۔ قرآن کالج کو بجا طور پر تخم ریزی کا مرحلہ 'قرآن اکیڈمی کو سرسری اور محاضرات قرآنی کو (جن کا شکوہ اولین سالوں میں قرآن کانفرنسوں کے عنوان سے ذہنوں میں محفوظ ہے) خود ساختہ نظریات کے جنگل میں فکر قرآنی کے اس شجر طیبہ کی رونمائی قرار دیا جا سکتا ہے جس کی جڑیں قرآنی تمثیل کے مطابق مضبوطی سے زمین کی گہرائی میں اتری ہوئی اور شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔

مارچ ۱۹۸۹ء کے آخری ہفتے لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سترہویں سالانہ جلسے اور تنظیم اسلامی کے چودھویں سالانہ اجتماع کا قران السعدین ہوا تو انجمن کے محاضرات قرآنی اور تنظیم کی مرکزی تربیت گاہ کے مربوط پروگرام نے اس موقعہ کی افادیت کو چار چاند لگا دیئے۔ تنظیم اسلامی کے انقلابی فکر کا محور قرآن مجید اور اسوۂ رسول ہے اور انجمن خدام القرآن دعوت رجوع الی القرآن کی نقیب۔ انجمن کے کوئے یار سے نکل کر ان ذہنوں کو جنہیں حکمت قرآنی نے جلا بخشی ہو' راہ میں کوئی مقام جچتا ہی نہیں' وہ سوئے دار جانے کے لئے تنظیم اسلامی کا رخ کرتے اور اس وقت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے میں مشغول رہتے ہیں جب اللہ کا دین ان سے ہجرت و جہاد کا مطالبہ کرے گا۔ ہجرت و جہاد تو اسی لمحے زندگی کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں جس لمحے مسلمان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے لیکن پہلے مرحلہ میں کشمکش اپنے نفس سے' گھر کے اندر اور قریبی معاشرتی دائرے میں برپا ہوتی ہے' تاہم وہ مراحل بھی درپیش ہو کر رہیں گے جب نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلنا ہو گا۔ ان سے مفر ممکن نہیں کہ منزل کے نشانات یہی تو ہیں۔ یوں انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی میں باہم وہی تعلق ہے جو عزم سفر اور خود سفر میں پایا جاتا ہے۔

تنظیم اسلامی کے چودھویں سالانہ اجتماع کے سلسلہ میں یہ طے ہوا تھا کہ ۲۹' ۳۰ر مارچ ۸۹ء کو قرآن آڈیٹوریم کی زیر تعمیر عمارت میں اس کا انعقاد ہو۔ یہ بھی طے ہوا کہ اس سے متصلاً قبل ایک شش روزہ تربیت گاہ ۲۳ر مارچ سے ۲۸ر مارچ ۸۹ء جاری رہے۔ جس میں ایسے تمام رفقاء شریک ہوں جو ابتدائی تربیتی نصاب یعنی رفیق مبتدی کے لئے مجوزہ لٹریچر کا مطالعہ اور استماع کیسٹس مکمل کر چکے ہوں۔ گزشتہ سال کے دوران رفقائے تنظیم کے مابین درجہ بندی قائم کرنے کیلئے جو منصوبہ بنایا گیا' تربیتی تنظیمی نصاب برائے رفیق مبتدی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ اسی کی تکمیل اور آئندہ مرحلہ کی طرف پیش قدمی کیلئے اس تربیت گاہ میں شرکت ضروری تھی۔ اس بات کا بھی شدت سے احساس موجود تھا کہ رفقائے تنظیم اسلامی نے جہاں اپنے داعی اور امیر کے پیش کردہ دین کے ہمہ گیر تصور اور فرائض دینی سے متعلق فکر کو انشراح صدر کے ساتھ قبول کیا ہے اور اس کو سمجھنے سمجھانے میں دل و جان سے مصروف ہیں وہاں بعض کو موصوف کے عمرانی فکر اور اس کی بناء پر ملکی اور سیاسی امور سے متعلق آراء اور تجزیوں کو سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ اس ضمن میں افہام و تفہیم کیلئے مختلف سطح پر محنت کی جاتی رہی ہے' تاہم اس تربیت گاہ کا اصل موضوع اور عنوان ہی یہ مقصد قرار پایا۔ کہ امیر و مامورین کے درمیان پائی جانے والی اس خلیج کو پر کیا جائے۔ امیر تنظیم' ڈاکٹر اسرار احمد

صاحب کی خواہش تھی کہ ان کی دعوت پر لبیک کہنے والے ان حالات کا ادراک بھی رکھتے ہوں
ن سے پاکستان دوچار ہے۔ بنیادی طور پر ان کا دائرہ کار پاکستان ہے جس میں نظریات اور
یاسی محرکات کی کتنی ہی موجیں اٹھتی رہتی ہیں' اسلام کی انقلابی دعوت مروجہ سیاست میں
وث ہوئے بغیر بھی جن سے آنکھیں دوچار کرنے پر مجبور ہے۔ حسن اتفاق سے مرکزی انجمن
خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام سالانہ محاضرات قرآنی کا انعقاد بھی انہی ایام میں طے ہوا تھا
وران مجالس کا مجموعی عنوان بھی اسلام کا نظام عدل اجتماعی تھا۔ سماجی معاشرتی معاشی اور سیاسی
میدان میں نظام عدل وقسط کے قیام کے موضوعات پر جناب امیر تنظیم اسلامی کے مفصل
خطابات کا پروگرام تھا اور ان کی مزید تشریح و تفہیم کیلئے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ موضوع کی مناسبت
سے اصحاب علم و فضل کو شرکت کی دعوت دی جائے گی تاکہ ان کی جانب سے استفسارات کے
جواب میں متعلقہ موضوعات کے مزید گوشے نکھر کر سامنے آجائیں۔ محاضرات قرآنی کی یہ
مجالس بھی تنظیم اسلامی کی تربیت گاہ کا ایک حصہ شمار ہوئیں۔

الحمد للہ پروگرام کے مطابق مختلف مقامات سے رفقائے تنظیم اسلامی ۲۳ر مارچ قبل
دوپہر ہی قرآن اکیڈمی لاہور میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ لاہور کے اکثر رفقاء انتظامات میں
مشغول رہے۔ دیگر احباب و رفقاء کیلئے باہم ملاقات اور تبادلہ خیالات کا بہترین موقع تھا۔
اس روز شام کے اوقات میں جناب امیر محترم کے دو خطابات کے وڈیو کیسٹس دکھانے کا
اہتمام کیا گیا۔ مجلس مشاورت کے اراکین بعض اہم امور پر غور اور فیصلہ کیلئے مجلس مشاورت
کے ایک ہنگامی اجلاس میں جمع رہے۔ دوسرے روز ۲۴ر مارچ جمعۃ المبارک کی مصروفیات
تھیں اور احباب و رفقاء نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں امیر محترم کا خطاب جمعہ سنا۔
باغ جناح کے پر فضا ماحول میں واقع مسجد دارالسلام میں پچھلے دنوں جمعہ کے پر ہجوم اجتماعات میں
جناب امیر محترم نے تیسویں پارہ کے آخرے حصہ کی سورتوں کے مضامین کی تشریح و تفہیم کا
سلسلہ شروع کیا ہوا تھا اور اس جمعہ سورہ علق کا بیان جاری تھا۔ انہوں نے اس حوالہ سے علم
کی فضیلت بیان کی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی روشنی میں عبادت اور علم
کے درمیان نسبت و تناسب کا تذکرہ فرمایا۔ آپ نے حضور اکرمؐ کی بیان کردہ دو مثالوں کا
تذکرہ کیا کہ علم اور نفلی عبادت میں وہی نسبت ہے جو ماہ کامل اور عام ستاروں میں ہے۔
مزید بر آں حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ علم کی فضیلت اسی نسبت سے ہے جو نسبت مجھے (حضورؐ)
آپ (صحابہ کرامؓ) میں سے کسی ادنی پر فضیلت ہے۔ گویا علم کی فضیلت بے اندازہ
و بے حساب ہے۔ جناب امیر محترم کا یہ خطاب جمعہ اس پہلو سے محاضرات قرآنی' تربیت گاہ

اور سالانہ اجتماع کی تقریبات کیلئے بہت عمدہ تمہید بن گیا' علم کے بارے مفصل گفتگو اس خطاب جمعہ میں ہو گئی اور انسانی زندگی کے عملی پہلو میں توازن و اعتدال محاضرات کی مجالس کا خاص موضوع تھا۔

محاضرات قرآنی کی پانچ روزہ مجالس ۲۴ر مارچ تا ۲۸ر مارچ ۸۹ء روزانہ بعد نماز مغرب تابعد عشاء جناح ہال لاہور میں منعقد ہوئیں۔ رفقائے تنظیم اسلامی کے علاوہ شائقین علم کی ایک کثیر تعداد ان محافل میں شرکت کرتی رہی۔ ابتداء ہی میں ہال کھچا کھچ بھر جاتا اور ہال میں اضافی نشستوں اور اسٹیج و درمیانی جگہوں پر بیٹھنے کیلئے دریوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ ملحقہ گیلریوں میں بھی ہجوم کی کیفیت رہی۔ امیر محترم نے روزانہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے خطاب میں جامعیت کے ساتھ موضوع کو سمیٹا اور بعدازاں کم و بیش اتنا ہی وقت سوال و جواب کیلئے وقف تھا۔ موضوع کی مناسبت سے اصحاب علم و فضل اور ماہرین کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ الحمدللہ ان کی جانب سے استفسارات کے جوابات میں موضوع زیر بحث کے کئی گوشے واضح ہوئے اور اختصار کی وجہ سے اگر کوئی خلا رہ گیا تھا تو اس کی بھی تلافی ہوئی۔ محاضرات کے پہلے روز کا موضوع "اسلام میں عدل و قسط کی اہمیت" تھا۔ محترم امیر تنظیم اسلامی نے انسانی زندگی کے عملی پہلو اور ان کی ضمن میں اعلیٰ اقدار کا مفصل تذکرہ فرمایا۔ انفرادی سطح پر انبیائے کرام کی شخصیتوں میں اخلاقیات انسانی کے عمدہ نمونے نوع انسانی کی متاع تھیں' لیکن سیرت محمدیؐ کا تکمیلی پہلو یہ تھا کہ جملہ مکارم اخلاق ایک جامعیت اور توازن کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ میں موجود تھے اور آپ کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ اجتماعیات انسانی کی بہترین اقدار کو اعتدال و توازن کے ساتھ جمع کر کے ایک نظام اجتماعی کی صورت میں بالفعل نافذ کر دیا نوع انسانی کا اجتماعی ضمیر حریت و مساوات کی و اخوت کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ جن میں عدم توازن کی وجہ سے نوع انسانی نے بہت ٹھوکریں کھائیں۔ اسلام نے اجتماعیت کی مختلف سطحوں میں اعتدال و توازن اور عدل و قسط کی کیفیت کس طرح قائم کی' محاضرات قرآنی کی آئندہ تین روز کی نشستوں میں ان پر بھرپور بحث ہوئی۔ خاندان اور معاشرہ کی سطح پر حقوق و فرائض میں توازن پر اسلام کی رہنمائی ۲۵ر مارچ کی نشست کا موضوع تھی۔ اسلام کے معاشی نظام کے ضمن میں جو اہداف متعین کئے گئے ہیں اور جن اقدار کو بڑھانا مقصود ہے' ان کے متعلق ۲۶ر مارچ کی مجلس میں بحث ہوئی۔ سیاسی نظام پر ۲۷ر مارچ کو گفتگو ہوئی۔ امیر محترم نے بتایا کہ تمدنی ارتقاء کو اسلامی اصولوں کے مطابق اس نظام میں سمویا جا سکتا ہے کیونکہ اگرچہ دو ٹوک احکام نہیں ہیں لیکن حدود متعین ہیں۔ اصول عطا کر دیئے گئے ہیں۔ محاضرات قرآنی

کے آخری روز ۲۸؍ مارچ کی نشست کا موضوع "نظامِ عدل وقسط کے قیام کا نبوی طریق کار" تھا۔ جناب امیر تنظیم اسلامی نے پرہجوم محفل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے ماخوذ انقلابی طریقہ کار کے تمام مراحل کا تذکرہ فرمایا اور واضح کیا کہ اسلام کے نظام عدل واجتماعی کے قیام کیلئے صرف وہی کوشش بار آور ہو سکتی ہے جس کی بنیاد وہ منہج انقلاب ہو جس کے خدوخال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ میں دستیاب ہیں۔ محاضرات قرآنی کی یہ محفلیں تنظیم اسلامی کی تربیت گاہ کے شام کے پروگرام تھیں اور الحمدللہ رفقائے تنظیم نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔

محاضرات کی ان مجالس میں مستفسرین کے طور پر جن اصحاب علم وفضل کو دعوت دی گئی تھی، ان میں سے اکثر نے پوری دل جمعی کے ساتھ مقرر کو سنا اور گواہی دی کہ اسلام کے نظام زندگی کو پیش کرنے کا ایک موثر اسلوب ان کے سامنے آیا ہے۔ ان میں سے جن کا تعلق جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تھا، انہوں نے ایک خوشگوار حیرت کا اظہار بھی کیا۔ دین کی "فرسودہ باتیں" مولوی نظر آنے والے ایک شخص کی زبانی انہیں نئی نئی سی لگیں۔ جدید اصطلاحات میں "مذہب" کی برکات کا بیان کب انہوں نے سنا تھا اور اس طرف قبل ازیں ان کی توجہ شاید ہوئی نہ تھی کہ اسلام میں نماز روزہ سے بڑھ کر بھی کوئی خوبی ہے۔

تربیت گاہ کی صبح کی نشستیں چار روز ۲۵؍ مارچ تا ۲۸؍ مارچ صبح ساڑھے آٹھ بجے تا نماز ظہر منعقد ہوئیں۔ جن میں ڈھائی سو کے لگ بھگ ساتھی قلم اور کاپیاں ساتھ لے کر طالب علمانہ انداز میں شریک ہوئے۔ ماحول بھی کلاس روم کا سا تھا۔ ان کے دو حصے تھے۔ نصف اول میں امیر تنظیم اسلامی اپنی سوچ اور فکر کے بعض پہلو رفقاء کے سامنے رکھتے رہے اور ان کی بعض تحریروں کا اجتماعی مطالعہ بھی ہوا۔ نصف آخر میں جناب سراج الحق سید صاحب نے اپنے وضع کردہ مخصوص طریق تعلیم کے مطابق تنظیم اسلامی سے متعلق بعض کورسز سے رفقاء کو گذارا۔ ۲۵؍ مارچ صبح امیر محترم نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ "میری سوچ اور فکر کا ایک حصہ ٹھیٹھ دینی اور کتاب وسنت کی روشنی میں واضح ہے، یعنی دین کیا ہے اور فرائض دینی کا جامع تصور کیا؟ اس کے لئے قرآنی مجید کا ایک منتخب نصاب تیار کیا گیا اور ابتدائی دس بارہ سال تو صرف اسی کی تفہیم وتبیین میں صرف ہوئے۔ الحمدللہ رفقائے تنظیم اسلامی نے اس کو سمجھا ہے، ذہناً اور قلباً اس کو قبول کیا ہے اور جو لوگ میرے دست وبازو بنے ہیں وہ اسے خوش اسلوبی سے آگے پہنچانے اور پھیلانے کی استعداد بھی پیدا کر چکے ہیں۔ میری سوچ کا دوسرا حصہ میرے عمرانی فکر (SOCIAL THOUGHT) سے متعلق ہے۔

امیر تنظیم نے بتایا کہ اس اعتبار سے میں ترقی پسند (PROGRESSIVE) ہوں۔ میں پچھلے کئی سال سے اپنی اس سوچ کو واضح انداز میں بیان کرتا رہا ہوں۔ اس تربیت گاہ اور محاضرات قرآنی میں اسی سے متعلق گفتگو پیش نظر ہے۔ میری سوچ اور فکر کے اس حصہ کو اگرچہ بیشتر رفقاء نے ذہناً قبول کیا ہے' لیکن ان کی تفہیم میں بھی وہ گہرائی اور گیرائی نہیں جو مطلوب ہے' تاہم اس عمرانی فکر کے عملی نتائج اور ملکی و سیاسی صورتحال پر اس کے انطباق کو رفقاء کی معتدبہ تعداد سمجھ نہیں سکی' چنانچہ وہ میرے سیاسی تبصروں اور تجزیوں کے ضمن میں پریشانی اور الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ موصوف نے اپنے عمرانی فکر کی بھرپور وضاحت فرمائی تاکہ رفقاء اس کو شعوری طور پر سوچ سمجھ کر قبول کریں اور انشراح صدر کے ساتھ اس سوچ کے ساتھ چل سکیں۔ محترم امیر تنظیم نے اولاً اس شعبہ فکر کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے علم کی اقسام' ان کے سرچشموں' ہر شعبہ علم کی اہمیت اور باہم ربط و تعلق اور ان کی موجودہ کیفیت کا ایک مفصل اور مکمل خاکہ رفقاء کے سامنے رکھا اور بحث کے نتیجہ کے طور پر یہ بات بتائی کہ خالص سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم تو از خود ترقی پذیر ہے۔ البتہ معروف معنوں میں خالص علم دین زوال پذیر ہے اور دینی مدارس میں بس چل رہا ہے' تاہم علم الکلام مابعد الطبیعات (METAPHYSICS) اور حکمت اصول (ایمانی) کے امتزاج سے ابھرتا ہے' انتہائی اہم ہے کیونکہ اسی سے فکری دھارے جنم لیتے ہیں اور معاشرے کو متاثر کرتے ہیں۔

ہماری تاریخ میں قریباً سات سو سال تک علماء نے اس کا ساتھ دیا' لیکن گذشتہ سات سو سال سے یہ خانے بند ہیں اور اب اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ نیا علم الکلام وجود میں آئے۔

اسی طرح عمرانیات کے میدان میں اسلامی اقتصادیات' اسلامی سماجیات اور اسلامی سیاسیات پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اسلاف نے اس میدان میں جو کچھ کام کیا اسے آگے بڑھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے ان پہلوؤں پر اپنے فکر کے منابع کا تذکرہ فرمایا اور موجودہ حالات پر اس کے انطباق کی وضاحت کیلئے ۲۱ / اپریل ۱۹۸۶ء کو یوم اقبالؒ کے موقع پر مجلس اقبالؒ کے زیر اہتمام اپنے خطبہ کا اجتماعی مطالعہ کروایا۔ تربیت گاہ کی باقی ماندہ نشستوں میں بھی موصوف نے اپنی بعض نئی اور پرانی تحریروں کا اجتماعی مطالعہ کرایا اور ساتھ ساتھ حسب ضرورت وضاحت بھی کی۔

جناب سراج الحق سید نے تربیت گاہ میں تنظیم اسلامی کے تنظیمی ڈھانچہ' ذمہ داریوں' رابطہ کے ذرائع (COMMUNICATION CHANNELS) اور اختلاف رائے کو حل کرنے کے طریقوں پر اپنے مخصوص سائنسی انداز میں رفقاء کو لیکچر دیئے۔ جن میں سلائیڈوں اور

پروجیکٹر کو بھی استعمال کیا۔ انہوں نے مطالعہ کے طریقہ کا جدید اسلوب پیش کیا۔ مقاصد' احتیاطیں اور زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کا انداز وضاحت سے بیان کیا اور "قرآن مجید کے حقوق" کے ابتدائی حصہ کا اجتماعی مطالعہ کروا کے اپنے طریق کار کی عملی وضاحت فرمائی۔ الحمدللہ یہ پروگرام انتہائی مفید رہا۔

تربیت گاہ اور محاضرات قرآنی کے تسلسل میں ہی تنظیم اسلامی کا چودھواں سالانہ اجتماع ۲۹ اور ۳۰ مارچ کو قرآن اکیڈمی میں شروع ہوا۔ یہ قافلہ ابھی دعوت' تنظیم اور تربیت کے مرحلے میں ہے اور اپنے کام کا جائزہ لینے کے لئے اسے کنج تنہائی کی ضرورت تھی۔ ذوق خود نمائی تو تیاری کے مرحلے میں تحریک کیلئے سم قاتل ثابت ہوتا ہے۔ خام مال کو بازار میں لا کر پھینک دیا جائے تو پختگی پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس نہیں رہتا' چنانچہ شرکاء اکیڈمی' قرآن کالج اور زیر تعمیر قرآن آڈیٹوریم کی عمارات میں سمٹ گئے تھے' جبکہ اجتماع کی نشستوں کے لئے اکیڈمی کی مسجد کے وسیع ہال کو استعمال میں لایا گیا۔ رفقاء کے چھوٹے بڑے قافلے ۲۸ مارچ بعد دوپہر آنے شروع ہوئے اور رات گئے تک بیرونی رفقاء کی ایک کثیر تعداد اجتماع گاہ میں پہنچ کر قیام گاہوں کی تنگی کا مداوا دلوں میں ایک دوسرے کو بٹھا کر بڑی خوبی سے کر چکی تھی۔ لاہور کے ساتھیوں کی ایک معقول تعداد چونکہ انتظامی معاملات اور بھاگ دوڑ میں مصروف تھی اور گزشتہ شب محاضرات کی مجلس بھی دس بجے ختم ہو سکی' لہٰذا انہیں یہ رعایت تھی کہ ۲۹ کی صبح پہنچ جائیں۔

اندرون ملک کراچی' حیدر آباد' ٹنڈو الہ یار' نواب شاہ' سکھر' کوئٹہ' صادق آباد' رحیم یار خان' بہاولپور' شجاع آباد' ملتان' وہاڑی' مظفر گڑھ' میانوالی' سرگودھا' جھنگ' فیصل آباد' شیخوپورہ' چکوال' گوجرانوالہ' گجرات' سیالکوٹ' ڈسکہ' لالہ موسیٰ' راولپنڈی' اسلام آباد' پشاور' باجوڑ اور میرپور (آزاد کشمیر) سے چار سو دس (۴۱۰) رفقاء' لاہور سے ۱۶۷ ساتھی اور کینیڈا' امریکہ' لندن' مصر' سعودی عرب اور ابوظہبی سے ۳۳ رفقاء سالانہ اجتماع میں ہمہ وقت مقیم اور شریک رہے۔

اجتماع کی پہلی باقاعدہ نشست کا آغاز ۲۹ مارچ کو صبح نو بجے ہوا۔ حافظ محمد رفیق صاحب نے تلاوت کلام پاک کے بعد ترجمہ بیان کیا۔ اس کے بعد اس نشست میں اندرون پاکستان اور بیرون پاکستان تنظیم اسلامی کی دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے متعلق مختصر رپورٹیں پیش کی گئیں۔ جن میں کارناموں سے زیادہ کوتاہیوں پر زور تھا' افتخار سے زیادہ انکسار کا اظہار تھا اور کارکردگی کے مبالغہ آمیز اعداد و شمار پیش کرنے کی بجائے شعوری کوشش یہ تھی کہ توفیق کی

جتنی کچھ ارزانی میسر آئی اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا جائے۔ اور اسی سے دعا کی جارہی تھی کہ ہمارے احساس فرض کو مہمیز دے تاکہ دین کی خدمت اور اس کے غلبہ کی جدوجہد کے ذریعے ہم اپنی نجات اخروی کا سامان کر سکیں۔ تکبیر رب میں اپنا مال اور اپنی جان کھپانا بندوں کی ضرورت ہے' خود اللہ تعالیٰ تو ایسی کسی خدمت کے محتاج نہیں۔ چائے کے وقفہ کے بعد گیارہ بجے سے رفقاء تنظیم کو اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ تنظیم اسلامی میں مشاورت کے طے شدہ قواعد و ضوابط کے علاوہ سال کے دوران ایک ایسا اجتماع بھی منعقد ہوتا ہے جس میں بلا امتیاز تمام رفقاء کو تنظیمی امور سمیت کسی بھی اہم مسئلہ کے بارے میں اظہار رائے کا موقع دیا جاتا ہے۔ گزشتہ سال کے دوران اس طرح کا اجتماع منعقد نہیں ہو سکا تھا' لہٰذا اس کی تلافی کیلئے سالانہ اجتماع میں اس کا موقع پیدا کیا گیا۔ یہ اظہار خیال شام کی نشستوں میں بھی جاری رہا۔ رفقاء نے مختلف موضوعات پر اپنی رائے پیش کی' ملکی اور سیاسی حالات کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا' امیر محترم کے سیاسی تجزیوں اور تبصروں پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا اور بعض پہلوؤں سے اشکالات بلکہ اعتراضات بھی سامنے آئے۔ بیرون پاکستان کے رفقاء میں سے بھی کئی ساتھیوں نے اپنے مسائل اور ملکی و ملی امور پر رائے دی۔ رفقاء کے اس اظہار خیال سے مقصود یہ تھا کہ رفقاء کے خیالات سے استفادہ کیا جائے اور جہاں ضروری ہو' افہام و تفہیم کی کوشش بھی کی جائے۔ امیر محترم نے رفقاء کی آراء کو سنا اور ضروری امور کے بارے میں اختتامی تقریر میں وضاحتیں فرمائیں۔

۱۰ مارچ کو صبح کی نشست میں اولاً میاں محمد نعیم صاحب نے جو ناظم اعلیٰ تھے اور اب ناظم تربیت مقرر ہوئے ہیں' آئندہ سال کے دوران دعوتی و تربیتی پروگراموں کا مجوزہ نقشہ پیش کیا اور رفقاء کو ضروری ہدایات دیں۔ جناب امیر محترم کی ہدایت پر یہ طے کیا گیا کہ آئندہ تین ماہ کے دوران مبتدی نصاب کے سلسلہ میں ایک ہنگامی پروگرام ترتیب دے کر کوشش کی جائے کہ رفقائے تنظیم کی موجودہ پوری تعداد اس میں سے گزر جائے۔ اس نشست کے بقیہ حصہ میں امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے رفقاء سے مفصل خطاب فرمایا۔ اولاً انہوں نے سورہ نور کی آخری چند آیات اور منتخب احادیث مبارکہ کے حوالہ سے اسلامی نظم جماعت کی تشریح فرمائی اور اس کے بعد جماعت اور تنظیم سازی کے سلسلہ میں بعض بنیادی باتوں کا تذکرہ کیا۔ آپ نے بتایا کہ جماعت بنانا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے اور اسے بیعت کی بنیاد پر استوار کرنا تو سوا مشکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ میری خواہش یہ ہے کہ ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جس میں آزاد اور کھلی فضا موجود رہے۔ تنقید کا بھرپور موقع ہو' لوگ خود سوچیں

سمجھیں اور غور و فکر کے بعد انشراح صدر کے ساتھ پیش قدمی کریں۔ اسی سے ان کی صلاحیتیں بیدار ہوں گی اور کام کی رفتار بڑھے گی۔ اس طرح کی جماعت بنانا جوئے شیر لانا ہے۔ اس کیلئے رفقاء کی تربیت درکار ہے۔ اختلاف رائے اور تنقید کے کچھ آداب و شرائط کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے جن میں اہم ترین بات یہ ہے کہ اختلاف رائے کے باوجود عمل تنظیمی فیصلہ کے مطابق جاری رہے' تاوقتیکہ وہ رفیق اس نظم سے وابستگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ کئی پہلوؤں سے ابھی ہم بہت پیچھے ہیں اور باہم مواخات کی کیفیت بھی توجہ طلب ہے۔

ملکی سیاست کے حوالے سے امیر تنظیم نے فرمایا کہ مروجہ انتخابی سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ تنظیم اسلامی نے سوچ سمجھ کر کیا اور اسی پر قائم ہے۔ ایک اصولی اسلامی انقلابی تحریک گھٹیا سیاست میں ملوث ہونے کا تو سوچ بھی نہیں سکتی لیکن نظری سیاست سے پرہیز کر کے انقلاب برپا کرنے کا خیال تو محال بلکہ جنوں ہے۔ اقامت دین کی جدوجہد میں شریک مسلمانوں کے لئے ملک و قوم کے معاملات میں دلچسپی لئے بغیر اپنے کام کے لئے مواقع پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پاکستانی مسلمانوں کا معاملہ تو خاص ہے۔ اس ملک کے وجود میں آنے اور حالات کی ناسازگاری جس میں قوم کی اپنی نالائقی کا دخل کچھ زیادہ ہی ہے اور دشمنوں کے بغض و عناد کے باوجود اس کے قائم رہنے میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس خطہ زمین سے کوئی خاص کام لینا ہے۔ اس تناظر میں انہوں نے فرمایا کہ سیاسی معاملات میں بروقت رائے ظاہر کرنا اور بے لاگ تجزیئے پیش کرنا ہمارے لئے حب وطن ہی کا تقاضا نہیں' ہمارے تنظیمی مقاصد کے لئے بھی لزوم کا درجہ رکھتا ہے۔ ان سیاسی غلطیوں کی نشاندہی ہمارا فرض ہے جو تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہیں۔ اظہار رائے کے دوران بعض رفقاء کی طرف سے جو اعتراضات اٹھائے گئے تھے ان کے حوالے سے امیر تنظیم نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان مبارک کہ دین تو نام ہی نصیحت و خیر خواہی کا ہے' آخر کس سیاق و سباق میں سمجھا جا رہا ہے؟۔ نصیحت کو تو اکثر لوگ سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے اور نصیحت و خیر خواہی کے حقیقی ضرورتمند کب چل کر آپ کے پاس آتے ہیں کہ ہماری غلطیوں کو چھانٹ پھٹک کر ہمارے سامنے رکھئے اور ہمیں خیر خواہانہ مشورے عنایت کیجئے۔ ملک کے موجودہ حالات کے ضمن میں امیر تنظیم نے مذہبی سیاست کی بے اعتدالی و بے تدبیری' سندھ کی عمومی صورتحال میں نزاکت کے پہلو جہاں برصغیر میں ہی نہیں' پورے جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے اور دوسرے اہم ملکی مسائل کا تذکرہ کیا اور رفقاء کو ہدایت کی کہ وہ تنظیم کے موقف اور اس میں پوشیدہ

حکمت سے آگاہ رہنے کے لئے ان کی تقاریر کے پورے متن اور متعلقہ تحریروں کو باقاعدگی سے زیر مطالعہ رکھیں۔ اس صورت میں انہیں انشاءاللہ کوئی الجھن نہ ہوگی کیونکہ سیاسی مصلحتوں کا لحاظ اور سیاسی فوائد کا حصول بہر حال تنظیم اسلامی کے پیش نظر نہیں۔ یہ الوداعی خطاب تقریباً دو بجے دوپہر ختم ہوا۔

کہا جا سکتا ہے کہ تنظیم اسلامی کا چودھواں سالانہ اجتماع ۳۰ مارچ کو نماز ظہر اور دوپہر کے کھانے کے بعد اختتام کو پہنچ گیا لیکن مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سترہویں سالانہ جلسے کی تقریب کا ذکر کئے بغیر یہ روداد مکمل نہ ہوگی جس کے بعد نماز مغرب منعقد ہونے والے عام اجلاس میں تنظیم اسلامی کے رفقاء نے بھی شرکت کی۔ یہ اجلاس جو زیر تعمیر قرآن آڈیٹوریم کے (فی الحال چھت سے محروم) وسیع ہال میں منعقد ہوا تنظیم کے بزرگ رفیق اور انجمن خدام القرآن سندھ کے صدر جناب سراج الحق سید کے بقول اس اعتبار سے بھی یادگار رہے گا کہ اس میں انجمن اور تنظیم کے درمیان رہی سہی اجنبیت کی دیوار بھی منہدم ہو گئی۔ ان کا علیحدہ علیحدہ تشخص تو برقرار ہے اور رہے گا لیکن ایک ہزار سے زائد شرکاء نے بچشم سر دیکھا اور دلوں کی گہرائی میں محسوس کیا کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ، ایک ہی دعوت کے دو پہلو اور ایک ہی نغمے کے دو ساز ہیں۔ جلسہ کے پروگرام میں تلاوت قرآن پاک، اس کے ترجمہ اور ایک پاکیزہ نعت کے علاوہ جو انجمن کی کسی تقریب میں بھی پہلی بار پیش کی گئی، تنظیم اسلامی کے امیر اور انجمن کے صدر موسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک مختصر لیکن جامع تقریر شامل تھی۔
بھارت کی بالادستی کا خوف قوم کی رگ و پے میں سرایت ہوا جا رہا ہے۔ ہمارے لیڈران کرام ایک طرف سری نگر اور دہلی کے راستے کھل جانے کی نوید سناتے اور لال قلعہ پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کے عزم کا اعلان کرتے ہیں تو دوسری طرف بھارت کی طرف سے ثقافتی یلغار سے لرزہ براندام ہیں۔ چاہتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان فصیلیں اور اونچی کر دی جائیں حالانکہ کسے خبر نہیں کہ بھارتی ثقافت کا حملہ تو فن اور فنکاروں کے ذریعے اور ویڈیو کیسٹ کے راستے قوم کو پہلے ہی فتح کر چکا ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر اسرار احمد کے لئے جن کی روشنی طبع قرآن حکیم کے نور سے مستعار ہے "بھارت کی بالادستی کے سدباب کا قرآنی طریق" ہی موقع کی مناسبت سے موزوں ترین موضوع تھا۔

اس تقریر کا متن تو انشاءاللہ کسی اگلی فرصت میں "میثاق" کی زینت بنے گا۔ خلاصہ یہ تھا کہ جارحیت سب سے موثر دفاع ہوتا ہے۔ ہمارے پاس نام نہاد اور حیاباختہ ثقافت کا مقابلہ کرنے بلکہ بھارت پر چڑھ دوڑنے کے لئے ایک بہت بڑا ہتھیار موجود ہے۔ ہم عصائے موسیٰ

بغل میں رکھ کر ساحروں کی چھڑیوں اور رسیوں سے ڈر رہے ہیں تو اس لئے کہ عصائے موسیٰ کی تاثیر ہمارے حافظہ سے اتر گئی ہے۔ "در بغل داری کتاب زندہ ای" لیکن جزدان میں لپٹا ہوا قرآن تعویذ کا کام تو شاید دے سکے، بھارت کی بالادستی کا مقابلہ کرنے میں مدد نہیں دے سکتا۔ بھارت کی قیادت و سیادت برہمن کے ہاتھ میں ہے جو فلسفہ کی زبان سمجھتا اور حکمت کی کاٹ سے زیر ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید کے فلسفہ و حکمت کو اعلیٰ ترین سطح پر پیش کیا جائے، اردو کو اس کا ذریعہ بنایا جائے جو آج بھی بھارت کے کونے کونے میں سمجھی جاتی ہے اور پندرہ کروڑ بھارتی مسلمانوں کو استعمال کیا جائے تو اونچی ذات کے ہندوؤں کے ذہنوں کی تسخیر کی جا سکتی ہے جن کی اعلیٰ ترین مذہبی کتابوں میں توحید کا تصور مسخ شدہ سہی، موجود ضرور ہے۔ متعصب ہندوؤں کے راشٹریہ سیوک سنگھ کی طرح اگر قرآن مجید کے پیغام کو بھارت میں پہنچانے کے لئے بے غرض چالک (چلانے والے) اور پرچارک (تبلیغ کرنے والے) پیدا کئے جا سکیں تو آر ایس ایس کا منصوبہ کہ "اکھنڈ بھارت" سے اسلام کو بے دخل کر دیا جائے، خاک میں ملا کر پورے برصغیر کو اسلام کا گہوارا بنایا جا سکتا ہے۔ اس کام کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنی اور اپنے اداروں کی خدمات کا ذکر کیا اور کہا کہ "میں آپ سے روپیہ پیسہ نہیں مانگتا، یہ وسائل تو مہیا ہو ہی جاتے ہیں، مجھے آپ کے بچوں کی، نوجوانوں کی ضرورت ہے" انسانم آرزوست "انہیں قرآن کا پرچارک بنانا میرا مشن ہے"۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۸
شمارہ: ۵
شوال المکرم ۱۴۰۹ھ
مئی ۱۹۸۹ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرِ تعاون -/۵۰

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
• یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ - ماڈل ٹاؤن فیروز پور روڈ - لاہور (پاکستان)

ادارۂ تحریر
★
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقامِ اشاعت: ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱ - داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

ان سطور کی تحریر کے وقت تک رمضان المبارک کی مبارک ساعتوں میں سے دو تہائی گزر چکی ہیں اور اس ماہ مبارک کا تیسرا عشرہ جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "عتقٌ من النار" قرار دیا تھا، شروع ہو چکا ہے۔ یہ ماہ مبارک جو آغاز میں ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کو بڑا پُرصعوبت اور طویل المسافت معلوم ہوتا ہے، جب سمٹنے پر آتا ہے تو اتنی سبک روی سے گزر جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ برکتوں والا یہ مہینہ ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ دفعۃً ختم بھی ہو گیا۔ ویسے تو ایک انسان کی پوری زندگی ہی خواہ وہ نوّے اور سو سالوں پر ہی محیط کیوں نہ ہو، مرورِ قیامت انسان کو چند ساعتوں سے زیادہ محسوس نہ ہوگی۔ سورۃ النّٰزعٰت کی آخری آیت میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ۝ ترجمہ: "ایسا لگے گا جس دن دیکھیں گے اُس کو کہ نہیں ٹھہرے تھے دنیا میں مگر ایک شام یا اس کی صبح"۔ لیکن اس کیفیت کا تجربہ ماہ رمضان المبارک کے معاملے میں تو اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ نیکیوں کا یہ موسم بہار ہر سال آتا ہے اور گزر جاتا ہے لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو اس ماہِ مبارک سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لیے پروردگار کی رحمتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اور اپنے لیے مغفرت اور عذابِ جہنم سے رستگاری کا پروانہ حاصل کر کے اس کی مبارک ساعات کو اپنے لیے امر بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں! افسوس ہے اُن لوگوں کی حالت پر اور پھر افسوس ہے اُن کی حالت پر جو یہ مبارک مہینہ پائیں لیکن پورا مہینہ اسی غفلت اور لاابالی پن کی اسی کیفیت میں گزار دیں جو پورا سال اُن پر مسلط رہتی ہے اور یوں اس ماہ مبارک کی برکتوں سے مکمل طور پر محروم اور تہی دامن رہ جائیں

اس آرزو کے باغ میں آیا نہ کوئی پھول اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے

قارئین کرام کے علم میں ہے کہ امیر تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ابوظبی کے احباب کے شدید تقاضے اور اصرار پر اس ماہِ رمضان المبارک میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی غرض سے ۴ اپریل کو ابوظبی تشریف لے گئے تھے۔ الحمد للہ کہ وہاں دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام تسلی بخش طریقے پر جاری ہے۔ ابوظبی کے پاکستانی سنٹر کی خوبصورت مسجد میں جہاں یہ پروگرام ہو رہا ہے، پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد رات بھر کے اس پروگرام میں دلچسپی سے شریک ہو رہی ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ ابوظبی کے کیلنڈر کے مطابق ۲۴ یا ۲۵ رمضان المبارک کو دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل ہو جائے گی اور ۳۰ اپریل کو امیر محترم واپس لاہور تشریف لے آئیں گے۔

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں اس سال بھی پچھلے چند برسوں کی طرح ماہِ رمضان المبارک میں دورۂ

ترجمۃ القرآن کی روایت پورے اہتمام سے نبھائی جا رہی ہے۔ گو حاضری پچھلے سال کے مقابلے میں کم ہے جس کا اصل سبب تو یہی ہے کہ امیر تنظیم اسلامی اس بار یہاں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ثانوی درجے میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس بار رمضان المبارک سے قبل اس پروگرام کی تشہیر مناسب طور پر نہیں کی جا سکی تھی۔ قرآن اکیڈمی میں ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری ہمارے فاضل استاذ پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کے کاندھوں پہ ہے جسے وہ اپنی کبرسنی کے باوصف نہایت خوبی سے نبھا رہے ہیں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزا۔ اس سے قبل ۱۹۸۶ء کے ماہ رمضان میں بھی جب امیر محترم کا دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام کراچی میں تھا، قرآن اکیڈمی کی مسجد میں محترم حافظ احمد یار صاحب ہی نے قرآن حکیم کا ترجمہ کرنے کی ذمہ داری کو نبھایا تھا۔ حالانکہ محترم حافظ صاحب کی طبیعت اُن دنوں پیٹ کی مسلسل خرابی کے باعث بہت ناساز رہتی تھی۔ اس سال الحمد للہ کہ انہیں اس نوع کا کوئی عارضہ لاحق نہیں ہے اور وہ پورے انشراحِ صدر اور طبیعت کی مکمل آمادگی کے ساتھ اس فریضے کو انجام دے رہے ہیں۔ لاہور میں دو اور مقامات پر بھی تنظیم اسلامی کے تحت دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام چل رہا ہے۔ مرکز تنظیم اسلامی گڑھی شاہو میں امیر تنظیم کے دورۂ قرآن کے ویڈیو کیسٹس کے ذریعے اس پروگرام سے استفادہ کیا جا رہا ہے جبکہ نواں کوٹ ملتان روڈ کے علاقے میں محترم رحمت اللہ بٹر صاحب ایک مسجد میں اس پروگرام کو لے کر چل رہے ہیں۔ وہاں نمازیوں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے نماز تراویح پہلے ادا کر لی جاتی ہے اور آخر میں پڑھے گئے پارے کا ترجمہ بیان کیا جاتا ہے۔ کراچی میں ناظم آباد کی اُس مسجد میں جہاں آج سے تین سال قبل محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماہ رمضان المبارک میں قرآن حکیم کے ترجمے کا دورہ کرایا تھا، اس سال محترم حافظ محمد رفیق صاحب ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے ہیں محترم حافظ صاحب اس سے قبل ۱۹۸۷ء میں قرآن اکیڈمی لاہور میں بھی اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھا چکے ہیں۔ دورہ ترجمۂ قرآن کے یہ پروگرام درحقیقت تحریک رجوع الی القرآن ہی کے سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں اور الحمد للہ اس کے بہت مفید اثرات محسوس کیے گئے ہیں۔

حسبِ وعدہ "منہج انقلاب نبوی" کے تازہ ایڈیشن میں شامل شدہ اس باب کو شاملِ میثاق کیا گیا ہے جو اس اہم بحث پر مشتمل ہے کہ نبوی طریق انقلاب کا حالات حاضرہ پر انطباق کیسے ہو گا! اقدام اور مسلح تصادم کے مراحل کی متبادل صورتیں اس دَور میں کون کون سی ہیں؟ رفقاء واحباب کے تقاضے کے پیش نظر بہت جلد اس باب کو الگ کتابچے کی صورت میں بھی شائع کر دیا جائے گا تاکہ اس کے افادے کا دائرہ مزید وسیع ہو سکے اور جن لوگوں کے پاس "منہج انقلاب نبوی" کا پرانا ایڈیشن ہے وہ اس کتابچے کو اس کے ساتھ ملا کر اپنا نسخہ مکمل کر سکیں۔

نبوی طریقِ انقلاب

کا

حالاتِ حاضرہ پر انطباق

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

"منہج انقلابِ نبویؐ" کا ضمیمہ

جسے کتاب کے تازہ ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے

مسلح تصادم
کے اعتبار سے دورِ نبویؐ اور موجودہ حالات میں دو۲ اہم فرق
مسلح بغاوت کی شرعی حیثیت
تمدنی ارتقاء سے پیدا شدہ دو۲ اہم تبدیلیاں
اقدام اور مسلح تصادم کا متبادل
نہی عن المنکر بالید
قرآن حکیم کی اصولی رہنمائی
احادیثِ نبویہ کی تفصیلی وضاحت
خلاصہ مباحث اور تین ممکنہ نتائج

حضرات وخواتین......!

اس مسجد میں جمعہ کی تقاریر کے سلسلہ میں آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے تو ہم نے انقلابِ ایران کے موضوع پر گفتگو کی تھی۔ پھر ہم نے اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج' لوازم کو سمجھنے کیلئے سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعہ سے گفتگو کا آغاز کیا تھا جو دو ڈھائی ماہ تک جاری رہا جس میں ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانی کا جو عظیم ترین اور کامل ترین انقلاب برپا کیا تو اس کے لئے آپؐ نے کیا طریقہ اختیار فرمایا! اور آپؐ کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑا! اس لئے کہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں' اور محبت و عقیدت رکھتے ہیں' ان کی نگاہ میں حضورؐ کا جو مقام ہے وہ تو ہے ہی' لیکن جو لوگ آپؐ پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ آپؐ سے عداوت رکھتے ہیں وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخِ انسانی کا عظیم و کامل ترین انقلاب وہ تھا جو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے برپا کیا۔

میں اپنی سی امکانی کوشش کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ایک مطالعہ اور ایک جائزہ اس انداز میں آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں کہ اسلامی انقلاب کے مراحل اور مدارج نکھر کر سامنے آجائیں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اسی بات کا پھر اعادہ کر رہا ہوں کہ میں نے "فلسفۂ انقلاب" سمجھا ہی سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا

الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ سے ہے۔ میرا واحد ذریعہ معلومات صرف اور صرف سیرتِ طیبہ ہے' بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں اور پورے یقین اور اعتماد سے کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص مجرد انقلابی عمل کو سمجھنا چاہے کہ وہ کیا ہے' .... تو میرے نزدیک کسی بھی حقیقی اور واقعی انقلاب کے طریقِ کار کو جاننے کا واحد ذریعہ (SOURCE) صرف اور صرف سیرت النبی ہے۔ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

میرا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے بلکہ اسے پایۂ ثبوت تک پہنچانے کیلئے میں متعدد شواہد پیش کر سکتا ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ ایک انسانی زندگی تک کے وقفہ (LIFE SPAN) میں 'اور وہ بھی کُل ۲۳ برس میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دینا تاریخ انسانی میں صرف ایک ہی بار ہوا ہے۔ اور یہ ہوا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے 'ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہو اور اسی فرد کے ہاتھوں انقلاب کے تمام مراحل اس طور سے طے پا جائیں کہ لکھوکھا مربع میل کے ایک ملک پر ایک بالکل نیا نظام بالفعل قائم ہو جائے اس کی کوئی اور مثال پوری انسانی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حضراتِ انبیاء ورسل علیہم الصّلوٰۃ والسلام کی تاریخ میں بھی اس کی کوئی مثال ونظیر نہیں ملتی۔ اسی لئے میں نے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ خصوصاً آغازِ وحی سے لے کر اس دنیا سے رحلت فرمانے کا جو قریباً ۲۳ سال کا عرصہ بنتا ہے' اسے قدرے تفصیل سے مرحلہ وار بیان کیا ہے تاکہ اس مختصر عرصہ کی جو ہمہ گیر وہمہ جہت جدوجہد ہے' اس کی روشنی میں ہم یہ بات اچھی طرح جان سکیں کہ ایک حقیقی اور واقعی اسلامی انقلاب کن کن مراحل اور مدارج سے گزرتا ہے اور اس کے لوازم کیا ہوتے ہیں! نیز یہ کہ ہمیں اگر اسلامی انقلاب لانے کی جدوجہد کرنی ہے تو اس کے لئے ہمیں لازماً اصل رہنمائی سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام ہی سے حاصل کرنی ہوگی۔

اب ہمیں گہرے غور وفکر اور نہایت احتیاط کے ساتھ یہ دیکھنا ہو گا کہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی انقلابی جدوجہد کے کن کن مراحل اور امور کو ہمیں جوں کا توں لینا ہو گا اور وہ کون سے مراحل ہیں کہ جن کے بارے میں حضورؐ کی سیرتِ مبارکہ کو من حیث المجموع سامنے رکھ کر ہمیں موجودہ حالات کے پیش نظر استنباط کرنا ہو گا اور کس حد تک اس معاملے میں ہمیں اجتہاد کرنا ہو گا۔ اس مسئلہ پر گفتگو سے قبل آیئے پہلے اس فرق کو سمجھیں جو دو اعتبارات سے دورِ نبویؐ اور آج کے حالات میں واقع ہوا ہے۔

مسلح تصادم کے اعتبار سے
دورِ نبویؐ اور موجودہ حالات میں دو اہم فرق

پہلا فرق...... پہلا واضح ترین اور نمایاں ترین فرق تو یہ واقع ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ ہوئی تھی ایک خالص کافرانہ ومشرکانہ معاشرے میں. . جبکہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق ایک مسلمان معاشرہ سے ہے اور ہمیں اس میں کام کرنا ہے۔ ہمارے ملک ہی کی طرح دوسرے بہت سے مسلم ممالک ہیں جن میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد اسّی فیصد سے زائد ہے اور ان تمام ممالک کے سربراہ اور حکمران بھی مسلمان ہی ہیں۔ رعایا اور حکمرانوں کے کردار' ان کے اخلاق' ان کی سیرت اور دین سے ان کے عملی تعلق کے معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ سب کے سب قانوناً مسلمان ہیں۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کہیں بھی مکمل اسلامی نظام اپنی آئیڈیل صورت میں عملاً قائم ونافذ نہ ہو بلکہ پورا کا پورا لادینی (SECULAR) نظام رائج ہو تب بھی وہ مسلمان معاشرہ کہلائے گا اور اس کے حکمران مسلمان ہی تسلیم کئے جائیں گے۔ پھر حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان معاشروں میں کردار کے اعتبار سے ہر طرح کے طبقات موجود ہیں۔ شرابی' زانی' قمار باز اور کئی اعتبارات سے صرف اسلامی اخلاق وکردار ہی سے نہیں عام انسانی سیرت وکردار سے تہی دست افراد بھی موجود ہیں اور اسلامی نظام کے عملاً نافذ نہ ہونے کے باوجود انہی معاشروں میں کچھ نہ کچھ ایسے مسلمان بھی لازماً موجود ہوں گے جو نمازی' روزے دار' اسلامی شعائر کی پاس داری کرنے والے اور انفرادی سطح پر صالح اور متقی مسلمان ہوں . بہرحال عملاً یہ تمام لوگ قانوناً مسلمان ہیں اور انہیں کلمہ کی ڈھال حاصل ہے۔ لہٰذا ان حالات میں جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی انقلابی دعوت پیش کی اور اس صورت حال میں جس سے ہمارا سابقہ ہے' ایک نہایت نمایاں فرق موجود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جس معاشرے سے مقابلہ تھا' وہ فکری وعملی دونوں اعتبارات سے خالص مشرکانہ اور کافرانہ معاشرہ تھا اور ان کا پورا نظام شرک کی بنیادوں پر استوار اور قائم تھا۔ کچھ سعید روحیں ضرور موجود تھیں جو فکری طور پر مؤحد اور عملی طور پر بت پرستی کی نجاست کی آلودگی سے محفوظ تھیں۔ لیکن غالب اکثریت مشرکین ہی کی تھی۔ چنانچہ پہلا اور بنیادی فرق

یہ ہے کہ جس کو سامنے رکھ کر ہمیں سوچنا ہو گا کہ آیا ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا منہجِ انقلاب جوں کا توں اور بعینہٖ اختیار کریں گے یا اس میں کوئی فرق وتفاوت ہو گا!

دوسرا فرق...... دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا جو تمدنی ارتقا ہوا ہے اس کے اعتبار سے اب کسی بھی ملک میں جو حکومت ہوتی ہے اس کے پاس تمام وسائل ہوتے ہیں' اور تمام قوت ہوتی ہے' پھر ان دونوں کا نہایت منظم ارتکاز ہوتا ہے' جبکہ عوام بالکل نہتے ہو گئے ہیں۔ تو ان دونوں کے مابین فرق وتفاوت اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ جو مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) والا مرحلہ ہے یعنی پہلے سے قائم شدہ باطل نظام سے مسلح تصادم کا معاملہ وہ نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے قریباً ناممکن کے درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ یہ دونوں تبدیلیاں ایسی بنیادی ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ہمیں معروضی طور پر غور کرنا ہے کہ اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کا تہیّہ اور عزم کرتے ہیں تو ان تمام مراحل میں جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدّوجہد اور سعی وکوشش گزری آیا ہمیں بعینہٖ وہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا جو ہمیں سیرتِ مطہرہ میں ملتا ہے یا یہ کہ ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہر مرحلہ پر ہم یہ دیکھیں کہ کس کس پہلو سے ہماری عملی APPROACH (لائحۂ عمل) مختلف ہو گی۔

ایک اہم گزارش...... اس سے قبل کہ میں گفتگو آگے بڑھاؤں آپ سے گزارش کروں گا کہ میری اس گفتگو کو سنتے ہوئے آپ فی الحال شعوری طور پر اپنے ملک یا اپنے حالات کو ذہن سے نکال دیجئے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ پھر گفتگو بڑی گڈمڈ ہو جائے گی اور قدم قدم پر میری گفتگو اور ملک کے تناظر میں ٹکراؤ پیدا ہو گا' بلکہ ابھی تک میری گفتگو میں ایک عمومیت اور تعمیم ہے کہ ہم فرض کر رہے ہیں کہ ایک مسلمان ملک ہے جس میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ چاہے ان کا اخلاق' ان کا اپنا کردار' دین کے ساتھ ان کا اپنا معاملہ اور بحیثیتِ مجموعی اسلام سے ان کا عملی تعلق حوصلہ افزا نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک مایوس کن اور حوصلہ شکن بھی ہے۔ پھر یہ کہ وہاں کے حکمران بھی مسلمان ہی ہیں خواہ وہ عمل کے اعتبار سے مسلمان کہلانے کے مستحق نہ ہوں بلکہ ان کے افعال کے ڈانڈے فسق وفجور سے ملتے ہوں اور خواہ وہ نمازی اور روزے دار ہوں۔ دونوں حالتوں میں وہ ہیں مسلمان.... لیکن اس ملک میں اسلام بالفعل قائم ونافذ نہیں ہیں۔ یا اگر ہے تو بہت ہی سرسری سا اور سطحی سا اور

محض نمائشی۔ اسلامی نظام کا جو اصل الاصول ہے' اس کی جو حقیقی اقدار ہیں' زندگی کے تمام اجتماعی شعبوں پر اس کی جو گرفت ہے ان میں سے کوئی چیز بھی وہاں عملاً موجود نہیں ہے۔ اس صورتحال کو ایک مفروضہ کی حیثیت سے سامنے رکھئے اور سرِدست اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے کہ میں اس وقت پاکستان کی حکومت اور اس کے معاشرہ کو سامنے رکھ کر گفتگو کر رہا ہوں۔ بصورتِ دیگر اس مسئلہ میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں...... ہمیں معاملہ کو اصولاً سمجھنا ہے اور پھر اس اصول کا انشاء اللہ ہم اپنے حالات پر بھی انطباق کریں گے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں یہ احتیاط اور یہ تدریج لازمی ہے۔

گفتگو کی عکسی ترتیب

میں اس ضمن میں آج صبح سوچ رہا تھا کہ اصلاً تو ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ میں نے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے جو چھ مراحل بیان کئے تھے' انطباق کے مسئلہ میں بھی وہی ترتیب اختیار کروں۔ یعنی پہلے اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کروں کہ دعوت کے مرحلہ میں کوئی فرق وتفاوت ہو گا یا نہیں اور اگر ہو گا تو وہ کیا ہو گا... ! پھر تنظیم کے مرحلہ اور اس کے طریق کار میں کوئی فرق وتفاوت ہو گا یا نہیں ہو گا اگر ہو گا تو کیا ہو گا.... !! تربیت کے عمل میں کوئی فرق وتفاوت ہو گا یا نہیں ہو گا.. اگر ہو گا تو کیا ہو گا...... !!! اسی کے ساتھ ہے صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) کا مرحلہ .. جس کے بعد ہے اقدام (ACTIVE RESISTANCE) کا مرحلہ .... گنتی اور ترتیب کے اعتبار سے تو یہ دونوں مرحلے چوتھے اور پانچویں نمبر کے طور پر بیان ہوتے ہیں جبکہ حقیقت کے اعتبار سے صبرِ محض کا مرحلہ پہلے مرحلہ یعنی دعوت کے ساتھ ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ تو سوچنا ہو گا کہ آیا ان کے ضمن میں بھی کسی اجتہادی تبدیلی کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔ اسی طرح آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) کا معاملہ ہے کہ آیا اس میں بھی کوئی فرق وتفاوت ہے یا نہیں ہے' اگر ہے تو وہ کیا ہے؟

لیکن مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے بہت سے احباب اس آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم کے بارے میں اپنے ذہن میں کافی تشویش لئے ہوئے ہیں اور اس کے بارے میں یہ معلوم کرنے میں نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ بے تاب ہیں کہ ایک مسلمان معاشرہ اور

ب مسلمان حکومت میں اس مرحلہ کو کس طور پر طے کیا جائے گا..... لہٰذا میں نے سوچا کہ اُ
تدائی مراحل سے گفتگو کا آغاز کروں گا تو شاید احباب اس کے اندر دلچسپی محسوس نہ کریں
ر اپنی پوری توجہ اس طرف مبذول نہ کر سکیں جو مطلوب ہے چونکہ ان کے اذہان پر تو مسلح
صادم والے مرحلہ کا تسلط زیادہ ہے اور اس کے انطباق (APPLICATION) کو پہلے
انے کے متمنی ہیں۔ لہٰذا میں نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اب اس سلسلۂ بیان میں عکسی
ترتیب سے بات شروع کروں چونکہ جو آخری مراحل ہیں قانونی اعتبار سے سب سے بڑا فرق
نہی میں واقع ہوتا ہے۔ ان کے متعلق ہمیں غور کرنا ہو گا کہ موجودہ حالات میں ان مراحل کو
بور کرنے کی سبیل کیا ہو گی ؟ صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) ہو گا تو کیا ہو گا !!
قدام (ACTIVE RESISTANCE) کی صورت کیا ہو گی ؟ آیا کوئی بغاوت ہو گی ! حکومت کے
خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ کیا جائے گا ! پھر یہ مسلح بغاوت کرنی ہو تو دیکھنا ہو گا کہ آیا شریعت
میں اس کی اجازت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی شرائط کیا ہیں !! اس لئے کہ یہ دین کا مسئلہ
ہے جب ہم دین کے لئے کام کرنے چلے ہیں تو ہمیں اپنے کام کے لئے اجازت دین ہی
سے درکار ہو گی۔ شریعت میں اگر اس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یہ
دروازہ تو بالکل بند ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اجازت ہونے کی صورت میں بحالات
موجودہ وہ ممکن العمل بھی ہے یا نہیں تاہم میرے نزدیک یہ بات دوسرے درجہ کی ہے۔
اس لئے کہ پہلے درجہ میں تو ہمیں دین کا حکم معلوم کرنا ہو گا کہ آیا مسلح تصادم کے ضمن میں
جواز کا کوئی امکان ہے یا نہیں ہے ! پھر اگر جواز کی صورت موجود ہو تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ اس
کے لئے بالفعل بھی کوئی امکان ہے یا نہیں !!

آج کی گفتگو کا موضوع..... میں آج ان دو مسئلوں ہی کو اپنی آج کی گفتگو کا موضوع
بنا رہا ہوں۔ اس طرح ایک عکسی ترتیب سے بات شروع ہو گی۔ مجھے آج یہ بتانا ہے کہ اگر مسلح
بغاوت کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو اس کا متبادل طریق یعنی ALTERNATE PROCEDURE
کیا ہو سکتا ہے ؟ جس کے تحت کسی ملک میں قائم شدہ پورے کا پورا نظام بدلا جا سکے اور اس
نظام کو چلانے والی حکومت کو ہٹایا جا سکے اور اس کی جگہ ایک کامل تبدیلی
(TOTAL CHANGE) لائی جا سکے۔ یعنی نظام کے اعتبار سے بھی اور اس کے چلانے
والے ہاتھوں کے اعتبار سے بھی یہ تبدیلی کامل و مکمل ہو۔

موضوع کی نزاکت...... ان چند تمہیدی باتوں ہی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ بڑا نازک مسئلہ اور بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ لیکن اس دور میں اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کی بظاہر احوال کوئی صورت ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم اس مسئلہ کو تمدنی ارتقا کی روشنی میں حل نہ کر سکیں اور اس کے صحیح متبادل طریقہ (ALTERNATE PROCEDURE) کو تلاش نہ کر سکیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے بھی یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے چونکہ ہمارا اصل ہدف اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے۔ میں پورے صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہوئے کہ مجھے حق بات ہی کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق کے کہنے کی بھی ہمت عطا فرمائے، اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کروں گا۔ ساتھ ہی میں آپ سے بھی استدعا کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے لئے مسلسل یہی دعا کیجئے چونکہ اس قسم کے پیچیدہ اور نازک مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بسا اوقات انسان غیر ارادی طور پر یا بے احتیاطی کے باعث اگر کہیں سخت الفاظ استعمال کر جائے تو بات پیچیدگی اختیار کر سکتی ہے۔ لہٰذا میں آپ حضرات کی دعاؤں کا محتاج ہوں کہ میں بات بھی صحیح بیان کر سکوں اور اس کے لئے میری زبان سے الفاظ بھی صحیح نکلیں اور میں مناسب ترین پیرایۂ بیان میں یہ مسئلہ آپ حضرات کے سامنے رکھ سکوں۔

ان مسائل پر گفتگو کرتے وقت گویا ہم یہ فرض (SUPPOSE) کر رہے ہیں کہ ابتدائی مراحل کسی معاشرہ میں مکمل ہو چکے ہیں یعنی خالص اسلام کی دعوت پر ایک تحریک اٹھی۔ اس کو اس معاشرہ میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسے RESPONSE ملا۔ لوگوں نے شعوری طور پر اس دعوت کو قبول کیا۔ پھر وہ منظم ہوئے اور سمع وطاعت والی ایک تنظیم کا نظام قائم ہو گیا۔ پھر یہ کہ ان کی تعداد بھی اتنی معتدبہ ہو گئی کہ وہ تنظیم اب رائج نظام کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ پھر یہ کہ تنظیم کے کارکنوں کی تربیت بھی ایسی ہو چکی ہے کہ ان کے انفرادی کردار واخلاق اور ان کی سیرت کے اعتبار سے ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ان کے متعلق یہ حسنِ ظن موجود ہے کہ وہ فی الواقع اپنی انفرادی زندگی میں اپنے امکان بھر اسلام عملاً نافذ کر چکے ہیں اور انہوں نے تزکیہ کے مراحل بھی طے کر لئے ہیں اور ان کے دل راہ حق میں قربانیاں دینے کے لئے بے تاب ہیں...... تو یہ ہیں مفروضات (PRE-SUPPOSITIONS) جن پر ہم آگے گفتگو کریں گے اس لئے کہ آخری مرحلہ کی بات ہو رہی ہے۔ یہ بات پیش نظر رکھئے کہ یہ اس مرحلہ کی بات ہے جو کسی انقلابی عمل کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ آج کا مسئلہ نہیں ہے یہ فوری طور

پر عمل کرنے والی بات نہیں ہے۔ ہم اس آخری مرحلہ کو صرف علمی طور پر سمجھ رہے ہیں۔

—— مزید بر آں ہمارا سابقہ ایسے حالات سے ہے کہ ایک مسلمان معاشرہ میں جو ایمان اور عمل دونوں کے اعتبارات سے سخت مضمحل ہو چکا ہے نیز جس میں حکومت کرنے والے بھی مسلمان ہیں۔ خواہ وہ بادشاہ ہوں ' جیسے سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک میں ہیں ' چاہے وہ چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹرز ہوں جیسے ہمارے ملک اور ترکی و انڈونیشیا میں ہیں ! خواہ وہ جمہور کے منتخب نمائندے ہوں جیسے بہت سے ممالک میں جمہوری حکومتیں قائم ہیں...... بہر حال کچھ بھی ہو مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور حکمران بھی مسلمان ہیں۔ ان کی تکفیر نہیں کی گئی ہے۔ اپنی نجی زندگیوں میں وہ کچھ بھی ہوں۔ فاسق و فاجر ہوں ' یا نمازی اور روزہ دار ہوں ' دونوں صورتوں میں وہ مسلمان ہیں...... لیکن اس معاشرہ میں اسلامی نظام قائم نہیں ہے تو اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر صحیح و حقیقی اسلامی نظام کے قیام و نفاذ اور رواج کے لئے آخری اقدام کی صورت کیا ہو گی یا بالفاظ دیگر کیا ہو سکتی ہے جو مسلح تصادم کا بدل (ALTERNATIVE) بن سکے !!

ایک اسلامی تحریک کے اوصاف...... آگے بڑھنے سے قبل بات کی تفہیم کیلئے میں ایک بار پھر ایسی تحریک کے اوصاف گنوا دیتا ہوں جو ٹھیٹھ اسلامی انقلاب برپا کرنے کیلئے کسی معاشرہ میں اٹھی ہو۔ وہ تحریک کسی فرقہ واریت کی بنیاد پر نہ اٹھی ہو۔ وہ محض رائج الوقت نظام کی کسی جزوی اصلاح کیلئے نہ اٹھی ہو۔ وہ صرف کسی انتخابی عمل کے ذریعہ اس نظام کو چلانے والے ہاتھوں کو بدلنے کیلئے میدان میں نہ آئی ہو ' بلکہ اس جماعت کا مقصد خالص اسلامی انقلاب برپا کرنا ہو یعنی معاشرہ میں علمی و عملی دونوں اعتبارات سے توحید کے نفاذ و انعقاد کی جدوجہد ہی اس کا مقصود و مطلوب ہو..... پھر یہ کہ ایک معتد بہ تعداد میں لوگوں نے اسے شعوری طور پر قبول کیا ہو۔ پھر یہ کہ وہ منظم ہو چکے ہوں اور منظم بھی اس درجہ میں کہ "وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو۔ پھر دعوت و تبلیغ کے دوران انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ہو۔ وہ کبھی مشتعل نہ ہوئے ہوں۔ انہوں نے کبھی بھی گالی کا جواب گالی سے نہ دیا ہو..... یعنی وہ ان مراحل سے بڑی حد تک گزر چکے ہوں ' جن کا مطالعہ صبر محض کے عنوان کے تحت ہم سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مکی دور کے حالات کے ضمن میں کر چکے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ

م اجمعین نے سختیاں جھیلی ہیں' استہزاء اور تمسخر برداشت کیا ہے۔ ذہنی وجسمانی
ر جھیلا ہے۔ معاشرہ نے اہل ایمان کا بائیکاٹ کیا ہے۔ شعب بنی ہاشم کی تین سالہ
ں مسلسل محصوری سے سابقہ پیش آیا ہے۔ ایمان لانے والے سعید وصالح نوجوانوں کو ان
ے خاندان والوں نے گھروں سے نکالا ہے۔ ان پر معیشت کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کیا گیا
ہے۔ لیکن وہ ان سب کو جھیلتے اور برداشت کرتے ہوئے توحید کا علم ہاتھ میں لئے توحیدی
لاب اور توحیدی نظام قائم کرنے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں..... کسی ادنیٰ درجہ میں
ی جماعت کے وابستگان میں بھی ان باتوں کی کوئی جھلک نظر آ رہی ہو۔

لہ توحید کی تفسیر...... زبان پر نظامِ توحید جس کی ایک تعبیر اسلامی انقلاب ہے بے ساختہ آ
۔ لیکن اس وقت موقع نہیں ہے کہ میں توحید کے عملی تقاضوں کو بیان کروں اور یہ بتاؤں کہ
ید انسان کی اجتماعی زندگی کے جملہ شعبوں اور گوشوں کو کس طرح اپنی گرفت میں لیتی ہے۔
پر میں تفصیل سے مختلف مواقع پر گفتگو بھی کر چکا ہوں اور "اسلام کا انقلابی منشور" کے
ان سے تنظیم اسلامی کی جانب سے آٹھ صفحات کا پمفلٹ بھی لاکھوں کی تعداد میں شائع
ر بعض بڑے شہروں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ توحید کی بنیاد پر جو نظام
م ہوتا ہے صرف اور صرف وہی نظامِ عدل وقسط کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ یہ نظامِ
ید ہی سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات قائم کرتا ہے۔ نسل' رنگ' زبان' پیشہ اور جنس کی
د پر نہ کوئی بلند واعلیٰ ہوتا ہے نہ کوئی کم تر و پست...... پھر مرد وعورت کے منصفانہ طور پر حقوق
فرائض کو متعین کرتا ہے...... معاشی سطح پر یہ نظام ملک کے ہر شہری کی ناگزیر بنیادی
ریاتِ زندگی کی کفالت کا ذمہ دار ریاست کو قرار دیتا ہے۔ آجر ومستاجر (مزدور
رخانہ دار) کے درمیان عدل وانصاف اور اخوت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ جاگیرداری کی لعنت
امل خاتمہ کرتا ہے...... اس نظامِ توحید میں سیاسی سطح پر حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کی
ہے...... ملک کی پارلیمینٹ یا اسمبلی "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کے اصول پر شریعت
ے دائرے کے اندر رہتے ہوئے دیگر انتظامی وفلاحی امور کے لئے قانون سازی کی مجاز ہوتی
، لیکن وہ اللہ ورسول یعنی کتاب وسنت میں بیان کردہ حدود وتعزیرات میں ایک شوشہ کے
ر بھی تغیر وتبدل کی مجاز نہیں ہوتی...... یہ بات بطور جملہ ہائے معترضہ بیان ہو گئی۔ اب
یۓ اصل موضوع کی طرف......

اقدام کا مرحلہ..... ہم اس مفروضے کو سامنے رکھ کر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک اسلامی تحریک مختلف مراحل سے گزر کر اقدام کے مرحلہ تک آگئی تو بحالات موجودہ اقدام کی صورت کیا ہوگی..... ظاہر ہے کہ اقدام کے بغیر نظام نہیں بدلے گا۔ بیٹھے رہیں گے تو وہ نظام خود بخود تبدیل نہیں ہو گا۔ اسی موقع پر یہ بات بھی گرہ میں باندھ لیجئے کہ محض وعظ و نصیحت سے بھی ہرگز ہرگز کوئی نظام تبدیل نہیں ہوتا..... البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس فاسد نظام میں چند نیک' صالح باکردار اور متقی لوگوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ نظام کی تبدیلی کے لئے اقدام ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں آتا..... تو ہمارے دور میں اگر کوئی اسلامی تحریک ابتدائی مراحل سے گزر کر اقدام کے مرحلہ تک پہنچ جائے تو ایک مسلمان معاشرہ اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف اقدام کی نوعیت اور شکل کیا ہوگی!!..... یہ ہے اصل سوال جس پر غور کرنے اور کسی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے آج کی گفتگو ہو رہی ہے۔

مسلح بغاوت کی شرعی حیثیت

ایک غلط فہمی کا ازالہ..... اس ضمن میں سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض حضرات کے ذہنوں میں جو یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کسی مسلمان حکمران کے خلاف مسلح اقدام کی شریعت میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اگرچہ ہمارے یہاں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے لیکن یہ بھی متفق علیہ بات نہیں ہے کہ کسی بھی حالت اور کسی بھی صورت میں کسی مسلمان حکمران کے خلاف خروج نہیں ہو سکتا یا بغاوت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اگر آپ اس کو تسلیم کر لیں گے تو اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ فساق و فجار کی حکومت کبھی ختم نہیں ہو گی۔ جو فاسق و فاجر ایک بار مسلط ہو گیا تو پھر اس کا یہ تسلط دائمی ہو گا اور سوائے زبانی و کلامی نصیحت کرنے یا خاموش رہنے کے کوئی عملی اقدام کرنے کا حق و اختیار باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ اکثر حالات میں تو زبان پر بھی پہرے بٹھا دیئے جائیں گے کہ تنقید تو کجا' دلسوزی' ہمدردی اور خیر خواہی سے نصیحت کرنے پر بھی زبان بندی کر دی جائے گی۔ ایسی صورت میں ظاہر بات ہے کہ وہ تسلط باقی رہے گا اور کبھی ختم نہیں ہو گا۔

حضرت حسینؓ کا اقدام..... اسی سلسلہ میں' میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اقدام فرمایا اور صرف حضرت حسینؓ ہی نے نہیں فرمایا بلکہ

حضرت عبداللہ بن زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اقدام فرمایا...... تو ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتے کہ ان حضرات گرامیؓ کا اقدام خلافِ شریعت تھا یا وہ کوئی ناجائز کام کر رہے تھے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

اجتہادی خطا .... میں یہ بات بہت پہلے تفصیل سے کہہ چکا ہوں... 'سانحۂ کربلا' کے نام سے میری تقریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے کہ اس مسئلہ میں اختلافِ رائے کی گنجائش ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ اجتہادی مسئلہ تھا۔ اگر حضرت حسین ابن علی اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اقدامات کئے تو یہ ان حضرات کی اجتہادی غلطی تو ہو سکتی ہے۔ اس میں خطا کا امکان ہو سکتا ہے لیکن اسے ناجائز کام یا ہوسِ اقتدار ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا شائبہ بھی دل میں آگیا تو عدالتِ خداوندی میں لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ یہی معاملہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے کے متعلق کہا جائے گا کہ اگر انہوں نے ان حضراتؓ کو اقدام کرنے سے روکا اور یزید کی بیعت کر لی تو یہ ان کی اجتہادی رائے ہے جس میں خطاء کا امکان ہے۔ لیکن اس کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دو انتہاؤں کے درمیان میں ہمارے سَلف و خَلف کے علمائے ربّانی کی رائے یہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گنجائش تو موجود ہے۔ اس لئے کہ اگر دین کے اندر گنجائش کوئی نہ ہو تو کیا حضرت حسین ابن علی اور عبداللہ ابن زبیر اور عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کوئی ایسا کام کر سکتے تھے کہ جس کی دین میں قطعی ممانعت ہو! گویا کہ کسی ناپسندیدہ مسلمان حکومت کے خلاف خروج کی گنجائش ہے تب ہی تو ان دونوں بزرگوں نے اقدامات کئے۔ البتہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس اقدام کے لئے موقع و محل بھی مناسب ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق خالص اجتہاد سے ہے جس میں خطاء و صواب دونوں کا برابر امکان موجود رہتا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لئے میں عرض کروں گا کہ اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے کہ مسلمان حکمران کے خلاف خروج اور بغاوت سرے سے ہو ہی نہیں سکتی۔

حنفی مسلک .... میں تو اس سے بھی آگے کی بات عرض کروں گا کہ ہمارے اس ملک میں بسنے والے سُنّی مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت حنفی المسلک ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف یہی ہے کہ اقدام ہو سکتا ہے اور خروج ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے شرائط بڑی کڑی ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں..... امام صاحب رحمہ اللہ کے حالات زندگی سے معلوم

ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت نفس زکیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید بھی کی تھی اور ان کو مالی اعانت بھی فراہم کی تھی جنہوں نے بنو عباس کی حکومت کے خلاف خروج کیا تھا۔ البتہ امام صاحب نوراللہ مرقدہ بنفسِ نفیس میدان میں نہیں آئے تھے۔ تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں ان باتوں کا ثبوت موجود ہے۔ میں جو بات واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دینی اور شرعی اعتبار سے ایسا معاملہ نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی، کسی صورت میں بھی کسی فاسق و فاجر حکمران کے خلاف خروج یا بغاوت نہ کی جا سکے۔ البتہ فقہائے احناف نے اس کے لئے شرطیں بڑی کڑی لگائیں ہیں۔

کڑی شرائط کیا ہیں.......... ایک شرط تو یہ ہے کہ حکمرانوں کی طرف سے کھلم کھلا اور برملا کسی ایسی بات کا ظہور ہو رہا ہو جو خلافِ اسلام ہے۔ مثلاً اپنے گھر میں بیٹھ کر کوئی شخص شراب پی رہا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ شراب نوشی کی ترویج کر رہا ہو، لوگوں کو اس کے استعمال کی ترغیب و تشویق دے رہا ہو تو معاملہ مختلف ہو جائے گا۔ ایسے حکمران کو معزول کرنے کے لئے قوت فراہم کرنا اور خروج کرنا بالکل جائز اقدام ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے جو لوگ اٹھیں ان کی طاقت اور ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو چکے ہوں کہ وہ یقین رکھتے ہوں کہ ہم تبدیلی برپا کر دیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تھوڑی سی طاقت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیں، جس کا نتیجہ بدامنی ہو گی اور وہ لوگ ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ بلکہ صورت یہ ہونی چاہئے کہ بحالاتِ ظاہریہ یہ امید واثق ہو کہ ہم نظام کو بدل سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کر دیں اور نظام جوں کا توں قائم رہے۔ .. تو یہ ہے اس مسئلہ کی خالص دینی اور شرعی حیثیت۔

ایک قابلِ لحاظ نکتہ.......... لیکن اگلی بات ہے جو میرے نزدیک اہم ترین ہے اور وہ یہ ہے کہ بالفعل یہ صورت پیدا ہو چکی ہے کہ اب خروج و بغاوت کا امکان موجود ہے ہی نہیں۔ چونکہ صورت حال یہ بن چکی ہے کہ اُس زمانہ میں "STANDING ARMIES" (باقاعدہ تنخواہ دار فوجیں) نہیں ہوتی تھیں۔ اگر ہوتی بھی تھیں تو بہت کم۔ ... جبکہ آج کل قریباً ہر حکومت کے پاس لاکھوں کی تعداد میں تربیت یافتہ اور منظم فوجیں ہوتی ہیں۔ اُس دور میں یہ صورت موجود نہیں تھی۔ ثانیاً اُس دور میں جس نوع کا اسلحہ فوجوں کے پاس ہوتا تھا قریباً اُسی نوع کا عوام کے پاس بھی ہوتا تھا۔ اس میں مقدار کا فرق تو ہو سکتا ہے۔ لیکن وہی تلواریں، وہی

ے' وہی تیر' وہی ڈھالیں فوج کے پاس ہیں تو عوام کے پاس بھی ہیں۔ تو اس زمانہ میں ست و تناسب کا کوئی نہ کوئی ایک معاملہ موجود تھا۔ لیکن اب جو تمدن کا ارتقاء ہوا ہے تو یہ ورت باقی نہیں رہی ہے۔ حکومت کے وسائل 'اس کی طاقت 'اس کی فوجیں 'ان کے اسلحہ کے معاملہ کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ اب سرے سے کوئی نسبت و تناسب موجود ہی نہیں ہے۔ حکومت کی افواج نہ معلوم کس کس نوعیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ اسلحہ سے لیس ہیں اور اس رح حکومت ایک قوی ترین ادارہ بن چکی ہے۔ جبکہ عوام قریباً بالکل نہتے ہیں۔ تو یہ فرق و ناوت اتنا عظیم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا..... لہٰذا خروج اور بغاوت بحالاتِ موجودہ قریباً خارج از بحث ہو چکی ہے۔ شرعی اعتبار سے نہیں' حالات کے اعتبار سے اب اس کا کوئی مکان نہیں ہے۔

ایک اہم سوال............ ان تمام تنقیحات کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اس چھٹے مرحلہ کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا! اس کا بدل (ALTERNATE) کیا ہو گا ؟ اس سوال کے براہِ راست جواب سے قبل ضروری ہے کہ دو اہم امور کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

تمدنی ارتقاء سے پیدا شدہ دو اہم تبدیلیاں

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ تمدنی ارتقاء نے یہ شکل پیدا کی ہے کہ حکومت کے پاس قوت اور طاقت بے انتہا ہوتی ہے۔ فوج اس کی پشت پناہ ہوتی ہے..... اسی موقع پر یہ بات بھی پیشِ نظر رکھئے کہ بات پاکستان کی نہیں ہو رہی بلکہ علمی اور اصولی نقطۂ نظر سے ہو رہی ہے۔ آخر یہ مسئلہ شام میں بھی تو درپیش ہے۔ شام میں الاخوان المسلمون نے اسلام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے لیکن مقابلہ کس سے ہے! حافظ الاسد کی حکومت سے 'جس کے پاس فوج ہے جو بے انتہا جدید ترین اسلحہ سے لیس ہے' جس کے پاس ذرائع و وسائل موجود ہیں۔ اور جس کی پشت پر روس جیسی سپر پاور موجود ہے۔ لہٰذا الاخوان المسلمون کچلے جا رہے ہیں اور ان کی مسلح جدوجہد ختم ہو چکی ہے' دم توڑ چکی ہے..... پھر آپ خود سوچئے کہ اسی طرح کا مسئلہ افغانستان میں ہو رہا ہے کہ نہیں!۔ کارمل بظاہر تو مسلمان ہے۔ میں نے آج تک تو نہیں سنا کہ اس کی تکفیر کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ جو افغانی فوج ہے' وہ چاہے ہوتے ہوتے سکڑ گئی ہو' لیکن وہ سب کے سب بہرحال مسلمان تھے اور ہیں۔ مسلمان ماؤں کا دودھ پیئے ہوئے ہیں۔ لیکن

چونکہ فوج کا جدید تصور یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ اقتدار میں ہو یا کسی طرح اقتدار میں آجائے تو فوج اس کا حکم مانے اس کو تحفظ (PROTECTION) دے۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ مجھے تو دکھ ہوتا ہے جب خبریں آتی ہیں کہ اتنے کارمل فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے جبکہ میں جانتا ہوں کہ مجاہدین' اسلام کے لئے' حریت کے لئے اور خدا نا آشنا بلکہ خدا دشمن روسی جارحیت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کامیابی پر خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں دکھ کا یہ پہلو موجود ہے کہ وہ ہلاک ہونے والے بھی تو مسلمان ہیں۔ وہ ایک حکومت کے حکم کے تحت جنگ کر رہے ہیں..... دونوں طرف سے مسلمانوں ہی کا خون بہہ رہا ہے۔ روسی فوج کے لوگ تو کارمل فوج کے مقابلہ میں کم ہی مرے ہوں گے۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کے ہاتھوں مسلمان ہی ہلاک ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ نہیں' کہ آیا ایک فاجر و فاسق حکومت کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت ہے یا نہیں! اگر مسئلہ یہ ہوتا کہ کسی طور پر بھی خروج اور مسلح بغاوت جائز نہیں تو آج ہمارے جو افغانی بھائی کارمل فوجوں سے نبرد آزما ہیں وہ "مجاہدین" کہلانے کے بجائے باغی کہلاتے۔ لہٰذا ہر ملک کے علیحدہ علیحدہ مسائل ہیں اس صورت کے پیش نظر ہمیں پاکستان کے حالات کو ایک طرف رکھ کر اصولی طور پر بات سمجھنی ہوگی..... اب سابقہ سلسلۂ کلام سے تعلق جوڑیئے تو میں عرض کر رہا تھا کہ جہاں تمدنی ارتقاء نے حکومت کے ہاتھ میں بے پناہ قوت فوج کی شکل میں دے دی ہے وہاں اسی تمدنی ارتقاء کی بدولت دو اہم تبدیلیاں اور بھی آئی ہیں۔ دینی مزاج کے ہمارے اکثر لوگ ان تبدیلیوں سے واقف نہیں ہیں چنانچہ جب میں اسلامی انقلاب کے چھٹے مرحلہ کے طور پر مسلح تصادم کی بات کرتا ہوں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں اور میری تنظیم پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کوشاں ہے تو وہ چونک جاتے ہیں کہ ڈاکٹر اسرار تو مسلح بغاوت کی بات کر رہا ہے اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑوانا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ جب سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے فلسفۂ انقلاب اخذ (INFER) کیا جائے گا اور حضورؐ کی سیرتِ مبارکہ کے معروضی مطالعہ سے انقلابِ محمدیؐ کے مراحل و مدارج کے تعین کی کوشش کی جائے گی تو لامحالہ چھٹے اور آخری مرحلہ کے طور پر مسلح تصادم کا ذکر آئے گا..... میں نے اس موضوع پر جب بھی کہیں تقریر کی ہے تو ان متبادل طریقوں کا بھی ذکر کیا ہے جو تمدن کے موجودہ ارتقا نے دنیا کو دیئے ہیں' جن پر میں آج اظہار خیال کر رہا ہوں۔

ریاست اور حکومت کا فرق...... انسانی تمدن کے بتدریج ارتقاء کے نتیجہ میں سب سے اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی ہے کہ آج کے دور میں "ریاست" اور "حکومت" دو علیحدہ علیحدہ چیزیں تسلیم کی جاتی ہیں جبکہ آج سے دو سو سال قبل یہ صورتحال موجود نہیں تھی۔ حکومت ہی کو ہم جانتے تھے۔ 'ریاست' کس چڑیا کا نام ہے! اسے ہم جانتے ہی نہیں تھے۔ ادھر کوئی شخص حکومت کے خلاف کھڑا ہوا ادھر اسے فوراً باغی گردان کر گردن زدنی قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ صورتحال اس دور میں بدل چکی ہے...... اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے...... انسانی فکر اور انسانی تمدن کا جو ارتقاء ہوا ہے اس کے تحت اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ 'ریاست' ایک بالکل علیٰحدہ شے ہے اور حکومت صرف ریاست کے معاملات کو چلانے والا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ کسی ملک کے رہنے والے دستوری اور آئینی طور پر درحقیقت 'ریاست' کے وفادار ہوتے ہیں، حکومت کے نہیں ہوتے۔ حکومت کی اطاعت تو وہ کرتے ہیں لیکن دراصل جس شے کو وفاداری کہا جاتا ہے وہ 'ریاست' کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ پاکستان ایک ریاست ہے۔ اس ریاست کو چلانے والی ایک حکومت ہے جو اس ریاست کا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ یہ حکومت بدلتی بھی رہتی ہے۔ آج کسی کی ہے تو کل اور کی ہے۔ کبھی سول (CIVIL) کی ہے تو کبھی ملٹری (MILITARY) کی، کبھی ایوب صاحب کی تھی کبھی یحییٰ صاحب کی۔ پھر بھٹو صاحب آئے۔ ان کے بعد سے قریباً ساڑھے سات سال سے مسندِ اقتدار پر جنرل ضیاء الحق صاحب متمکن ہیں۔ پس حکومت تو آنی جانی شے ہے۔ جس شے کو دوام ہے، جو چیز تسلسل کی حامل ہے، وہ تو درحقیقت ریاست ہے، لہٰذا کسی بھی ملک کے رہنے والوں کی اصل وفاداری ریاست سے ہوتی ہے، حکومت سے نہیں ہوتی۔

تمدن کے ارتقاء اور فکرِ انسانی کی وسعت کے نتیجہ میں دوسری اہم تبدیلی یہ آئی ہے کہ آج پوری دنیا میں یہ بات مسلّم سمجھی جاتی ہے کہ کسی حکومت کو بدلنے کا حق اس ملک کے رہنے والوں کو حاصل ہے...... کوئی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی مستقل قسم کی حکومت ہے۔ جو بھی کہے گا یہی کہے گا کہ یہ وقتی اور عارضی انتظام ہے۔ حالات خراب ہو گئے تھے۔ انتشار ہو گیا تھا۔ خانہ جنگی کا اندیشہ لاحق تھا۔ لہٰذا فساد کو روکنے کے لئے یہ فوری نوع کا اقدام بطور فوری علاج کیا گیا ہے۔ وقتی طور پر حکومت کے انتظام کو فوج نے سنبھالا ہے۔ ہم اس کو مستقل قائم رکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اسی طریقہ سے کوئی بھی ایسا حکمران جو جمہوری طریقہ سے برسرِ اقتدار آیا ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اب اس کی یا اس کے خاندان کی اس ملک

پر مستقل حکومت رہے گی۔ البتہ جہاں ملوکیت اور بادشاہت (MONARCHY) قائم ہے
وہاں معاملہ تا حال سابق انداز پر چل رہا ہے کہ وہاں خاندانی حکومتیں قائم ہیں۔ وہاں ریاست
حکومت کا کوئی علیحدہ تصور موجود نہیں ہے۔ وہاں کوئی سیاسی جماعت بنانے کی قطعی اجازت
نہیں ہے۔ جہاں جماعت بنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ صاحب کو ہٹانے کی کوئی کوشش
پیشِ نظر ہے۔ تو وہ نظام چند ممالک میں تاہنوز چل رہا ہے اور "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ
انہیں کچھ نہ کہو" کے مصداق فی الحال ان کا معاملہ ایک طرف رکھئے۔ البتہ یہ بات اظہر من
الشمس ہے کہ یہ زیادہ دیر چلنے والا نظام نہیں ہے اس کے گرد جو دیواریں ہیں وہ بہت بوسیدہ ہو
چکی ہیں اور گرا ہی چاہتی ہیں اب کوئی دیر کی بات ہے اس کو ختم ہونا ہی ہونا ہے اور وہ بات ہو کر
رہے گی جو اپنے زوال کے وقت شاہ فاروق نے کہی تھی کہ " دنیا میں صرف پانچ بادشاہ رہ
جائیں گے چار تاش کے ہوں گے اور ایک انگلستان کا ہو گا" ...... اس لئے کہ انگریزوں نے
بادشاہت کو ایک نمائشی اور آرائشی علامت (DECORATION PIECE) کی حیثیت سے اپنے
یہاں سجا کر رکھا ہوا ہے۔ باقی اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے چونکہ روایت پرستی اس
قوم کے مزاج میں رچی بسی ہے لہٰذا وہ روایتی طور پر اس کو نباہ رہے ہیں ورنہ ساری دنیا جانتی ہے
کہ وہاں اصل اقتدار و اختیار پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔

اس نقطۂ نظر سے یہ بات جان لیجئے کہ ساری دنیا مانتی ہے کہ ایک ملک کے رہنے والوں کا
یہ مسلّم حق ہے کہ وہ آئینی و دستوری طور پر حکومت بدل سکتے ہیں۔ مدّت سے قبل نئے
انتخابات کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں...... یہ بالکل استثنائی صورتحال ہے کہ ہنگامی
حالات سے فائدہ اٹھا کر کوئی جنرل بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اقتدار پر قبضہ کر لے اور
رائے دہندگی کے حق کو معطل (SUSPEND) کر دے۔ اب میں اس بحث میں نہیں
جاؤں گا کہ یہ تعطّل جائز ہے کہ ناجائز ہے۔ بہرصورت ہنگامی حالات اور مارشل لاء ایک
عارضی انتظام کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی کوئی مستقل نوعیت کسی بھی متمدن ملک میں آج تک
تسلیم نہیں کی گئی ہے...... بلکہ ایسے حالات میں حکمرانوں سے یہ توقعات وابستہ کی جاتی ہیں کہ
خراب حالات پر جلد از جلد قابو پا کر دستور کے مطابق ملک میں صحت مندانہ انتخابات کرا کے
عوام کے نمائندوں کو اقتدار سونپ دیا جائے۔

یقیناً آپ کو یہ بات معلوم ہو گی کہ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ قابلِ تسلیم
(ACCEPTABLE) بات یہی سمجھی جاتی ہے کہ ملک کے رہنے والوں کو سیاسی جماعتیں بنانے کا

حق حاصل ہے اور ہر پارٹی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ موجود الوقت حکومت کو ہٹانے کے لئے اپنی انتخابی مہم چلائے۔ اس پر دل کھول کر اور تلخ و تند تنقیدیں کرے۔ رائے عامہ کو اپنی پارٹی کے حق میں ہموار کرے تاکہ حکومت اس پارٹی کی قائم ہو سکے۔ زیادہ سے زیادہ پابندی یہ لگائی جاتی ہے کہ سرکاری ملازم کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر اسکی انتخابی جدوجہد میں شرکت نہیں کر سکتے اور انتخاب میں بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ وہ ریاست کے ملازم اور کارکن ہیں۔ ریاست کی طرف سے ان کو کچھ اختیارات ملے ہوئے ہیں اگر وہ کسی سیاسی پارٹی سے عملاً وابستہ ہوں گے تو ان کے ہاتھ میں جو اختیارات ہیں ان کے غلط استعمال کا اندیشہ ہے..... باقی رہا ووٹ دینے کا معاملہ! تو یہ حق ان کا برقرار رہے گا۔ اس پر کہیں کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ عوام کی رائے سے حکومت میں تبدیلی ہو گی اور اس معاملہ میں سرکاری ملازمین ہی نہیں بلکہ فوجیوں کو بھی حق ہو گا کہ اپنی پسندیدہ پارٹی کو ووٹ دیں۔

اس پہلو سے یہ بات جان لیجئے کہ تمدن کا جو ارتقاء ہوا ہے' اس نے یہ متبادل طریقے (ALTERNATE PROCEDURE) عطا کئے ہیں جبکہ اس سے پہلے یہ صورت نہیں تھی۔ ریاست اور حکومت کا تصور گڈمڈ تھا اور حکومت کو ہی ریاست کا مقام بھی حاصل تھا۔ نیز حکومت کو بدلنے کی کوشش کو بغاوت سمجھا جاتا تھا..... جبکہ اب صورتحال بالکل بدل چکی ہے۔ ریاست اور حکومت دو مختلف تصورات ہیں اور کسی بھی ملک کے باشندوں کو آئینی طور پر یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل دیں۔

خلافتِ راشدہ کے نظام کی نوعیت

میں آج صبح جب اس تقریر کے متعلق سوچ رہا تھا تو خلافتِ راشدہ کا نظام بھی زیر غور آیا۔ چونکہ وہ نظامِ حکومت ہمارے نزدیک سب سے زیادہ محترم ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھانے والا نظامِ حکومت خلافتِ راشدہ ہی کا تو ہے۔ لیکن اس احترام و توقیر کے علی الرغم ایک بات جان لیجئے کہ اس کے ساتھ محدودیتیں (LIMITATIONS) موجود تھیں..... ایک تو یہ اس وقت بنیادی طور پر عرب میں ایک قبائلی (TRIBAL) سوسائٹی قائم تھی۔ لہٰذا جہاں ایک قبائلی نظام پہلے سے موجود ہو اس کے اندر اگر صرف سردارانِ قبائل (CHIEFS OF TRIBES) سے مشورہ کر

جائے' ان کی آراء کو معلوم کر لیا جائے تو گویا ہر قبیلہ کے فرد سے مشورہ کا حق ادا ہو گیا۔ دوسری یہ کہ سرداران کی حیثیت اپنے قبیلہ کے نمائندہ کی ہوتی تھی۔ لہٰذا وہاں فہرست رائے دہندگان کی تیاری' بیلٹ اور انتخاب کے کھکھیڑ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں قبائل کے سردار اور بڑے بڑے خاندانوں کے سربراہ اربابِ حل و عقد کہلاتے تھے۔ کسی معاملہ میں ان سے مشورہ ہو گیا تو گویا "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کا تقاضا پورا ہو گیا۔ جبکہ موجودہ دور میں یہ بات نہیں چل سکتی۔ آپ نے دیکھا کہ اس دور کے تقاضے کے تحت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جیسے مطلق العنان کو بھی ریفرنڈم کا ڈرامہ کھیلنا پڑا۔ اس قسم کی کسی صورتحال کا ثبوت آپ کو خلفائے راشدینؓ کے دور میں تو نہیں ملے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اس طرز کا سیاسی نظام جو خلافتِ راشدہ میں قائم تھا' جوں کا توں اس دور میں چل سکتا ہے، ایک مغالطہ ہے...... اس میں حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر ایک ایسا نظام بنانے پر غور کرنا ہو گا جس میں اصول تو ختم نہ ہوں' اصول وہی رہیں لیکن ہمیں تمدن کے ارتقاء کے ساتھ طریق کار کو ہم آہنگ کرنا ہو گا۔

ایک قابلِ غور بات...... حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جب ایک تحریک اٹھی...... اگرچہ میرے نزدیک وہ یہودی سازش تھی۔ شروع ہی سے اس کے عزائم مجرمانہ تھے' اس کے اندر نیک نیتی کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی نظامِ حکومت میں جہاں بدنیتی کے ساتھ یہ معاملہ ہو گیا' وہاں نیک نیتی کے ساتھ بھی تو یہ معاملہ ہو سکتا ہے۔ اس امکان کو آپ خارج از بحث نہیں کر سکتے۔ بالکل نیک نیتی کے ساتھ بھی کسی ملک میں ایسی تحریک اٹھ سکتی ہے کہ موجودہ حکمران ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ انہیں معزول ہونا چاہئے اور ان کی جگہ نئی قیادت کا انتخاب ہونا چاہئے...... اس وقت تک ہمارے یہاں اس مقصد کے لئے کوئی 'CHANNELS' موجود نہیں تھے۔ کوئی راستہ نہیں تھا کہ جن کے ذریعہ سے ایسا اختلافِ رائے سامنے آ سکتا۔ درحقیقت تمدنی ارتقاء نے جو متبادل راستے دیئے ہیں انہی کے ذریعہ اختلافِ رائے بھی سامنے آتا ہے اور صحت مند انداز میں وہ اختلاف حل (RESOLVE) بھی ہو سکتا ہے...... چنانچہ تمدنی اور فکری ارتقاء نے اختلاف کے اظہار اور ان کو حل کرنے کے جو طریقے اور راستے (CHANNELS) کھول دیئے ہیں اب ہمیں انہی کو سامنے رکھ کر اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے لئے کوئی راہ معین کرنی ہو گی۔

بنیادی انسانی حقوق...... تمدنی ارتقاء نے اس بات کو بنیادی انسانی حقوق میں سے ایک حق قرار دیا ہے کہ ایک شخص اپنی جماعت بنائے اور لوگوں کو اپنی بات کا قائل کرے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائے۔ اور وہ یہ کام کھلم کھلا اور برملا کرے یہ اس کا آئینی حق ہے...... زیر زمین جانے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ پرامن طریقہ سے ہر پارٹی کو برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف مہم اور تحریک چلانے کا حق پوری دنیا میں اب تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہمارے سوچنے کا کام...... ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم تمدنی ارتقاء اور اس انقلاب کو سامنے رکھیں جس نے یہ متبادل طریقے (ALTERNATE PROCE-DURES) دنیا کو دیئے ہیں کہ آج یہ امکان موجود ہے کہ حزبِ اختلاف قائم ہو...... جب تک وہ پارٹی بغاوت نہیں کرتی اور پرامن طور طریقے اختیار کرتی ہے، کوئی قانون اس کے خلاف نہیں جائے گا۔ وہ پارٹی تبلیغ کا حق رکھتی ہے۔ اپنے خیالات کی نشرواشاعت کا حق رکھتی ہے۔ جو لوگ اس کے خیالات کو قبول کریں، انہیں جمع کرنے اور منظم کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اسے اپنے طریقِ تنظیم کو اپنی صوابدید کے مطابق اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ اپنے سربراہ کو صدر کہے، امیر کہے، کوئی اور اصطلاح اختیار کرے اسے حق ہے۔ جب تک یہ پارٹی بدامنی کی کوئی صورت پیدا نہ کرے، جب تک وہ فساد پیدا نہ کرے، خانہ جنگی کی صورت پیدا نہ کرے اس وقت تک اس کے وہ تمام حقوق مسلمہ ہیں جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں۔ ان میں سے کوئی حق بھی سلب نہیں کیا جاسکتا۔ الّا یہ کہ ہنگامی صورتحال یا مارشل لاء کا عارضی نظام کچھ عرصہ کے لئے ان کو معطل کر دے...... عارضی شے عارضی کے درجہ میں ہی رہے گی وہ تو ایک استثنائی حالت ہے میں نارمل حالات کی بات کر رہا ہوں جس میں یہ تمام حقوق مسلّم ہیں۔ ان میں سے کسی حکومت کو کوئی حق سلب یا ساقط کرنے کا حق و اختیار حاصل نہیں ہے۔

حالات کا دیانتدارانہ تجزیہ

اب اگر کسی ملک میں خالص اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے ایک جماعت بنتی ہے۔ اگرچہ معاشرہ میں اسلامی شعائر کی پابندی مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی اجازت ہے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ بھٹو صاحب کے دور میں بھی ان شعائر سے روکتا تو کوئی نہیں تھا۔

البتہ یہ فضا بڑی حد تک پیدا ہو گئی تھی کہ بھٹو صاحب کی پارٹی کے اکثر کارکن ان چیزوں کا مذاق اڑانے لگے تھے...... میں جنرل ضیاء الحق صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ آج ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے کہ جس میں ترغیب و تشویق کا عنصر کسی نہ کسی حد تک موجود ہے۔ اب وہ بات نہیں رہی ہے کہ کسی نمازی پر فقرے چست کیے جائیں یا کوئی سرکاری افسر اس بات پر شرمائے کہ وہ اگر کسی فنکشن یا مجلس سے نماز کے لئے اٹھ کر جائے تو لوگ کیا کہیں گے! ماحول میں کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہی سب کچھ ہے......؟ ایک شخص کی رائے ہو سکتی ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے' بلکہ ہم نے اوپر کا غازہ مل دیا ہے' حقیقت کے اعتبار سے یہ کچھ بھی نہیں بدلا۔ محض تصنّع ہے...... اور حقیقت کے عدم وجود اور تصنّع کے ہونے کے باعث عوام کے اندر اسلام سے بددلی پیدا ہو رہی ہے کہ ہمارے شب و روز تو وہی ہیں جو پہلے تھے۔ بلکہ بگاڑ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے...... وہی سرمایہ دار کی حکومت ہے' جاگیردار اور زمیندار کی حکومت ہے' وہی رشوت کا لین دین ہو رہا ہے اور دھڑلے سے ہو رہا ہے بلکہ خود سربراہِ مملکت کے بقول اس کے RATES بہت بڑھ گئے ہیں۔ اسمگلنگ کا کاروبار کھلے بندوں ہو رہا ہے سود کا لین دین جاری ہے۔ منشیات کی اندرونی و بیرونی تجارت کھلے عام ہو رہی ہے۔ بلیک مارکیٹنگ کا دھندا مزید زوروں پر ہے۔ ڈاکہ' چوری' لوٹ مار' قتل و غارت کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اغوا اور عصمت دری کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں' علاقائی قومیتوں کا احساس مزید ابھر رہا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں جلد ہی یہ بہت سے خوفناک عفریتوں کا روپ نہ دھار لے...... استحصالی اور جابرانہ نظام مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ تو ایک طرف حالات کی صحیح تصویر یہ ہے دوسری طرف "اسلام آ رہا ہے۔ اسلام آ رہا ہے" کے فلک شگاف نعرے لگائے جا رہے ہیں' بلند بانگ دعوے کیے جا رہے ہیں۔ حالانکہ آج کے اور دس بارہ سال سے قبل کے معاشرہ کا تقابل کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ سرِ مو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ بحیثیتِ مجموعی حالات روز بروز بد تر سے بدترین ہوتے چلے جا رہے ہیں...... بلکہ ہم نے اس معاشرے پر اوپر کا کچھ غازہ مل کر اور کچھ ظاہری ٹیپ ٹاپ کر کے اسے اسلامی معاشرہ کہہ دیا ہے اور ساری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ تو ان حالات میں ضروری ہے کہ کوئی کھڑا ہو اور وہ برملا یہ حق بات کہے کہ ہمیں اس دھوکے کا پردہ چاک کرنا ہے اور انقلابی طریقِ کار پر عمل کرتے ہوئے اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ صحیح و کامل اسلامی نظام قائم و نافذ کرنا ہے۔ ایسے شخص کا دینی فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی

دعوت دے' اس کے لئے وہ لوگوں کو جمع کرے' انہیں منظم کرے' ان کی تربیت کا انتظام کرے...... جب تک وہ اس موجود و برقرار 'LAW AND ORDER SITUATION' (امنِ عامہ کی صورتحال) کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرتا' جب تک وہ زبان سے بغاوت کا حکم نہیں نکالتا...... اسے یہ کام کرنے کا آئینی و قانونی حق ہے۔ بلکہ یہ اس کے اپنے ایمان کا تقاضا ہے کہ ابتدائی مراحل کو طے کرنے کی سعی وجہد کرے اور انقلاب لانے کے لئے اقدام کرے۔

ان مراحل میں اولاً دعوت کا مرحلہ ہے۔ پھر لوگوں کی تنظیم ہے' پھر ان کی تربیت ہے۔ پھر اس دوران اس پر جو تکلیف آئے اسے جھیلنا ہے اس لئے کہ اسے اپنے اوپر اسلام قائم و نافذ کرنا ہے مثلاً ایک شخص کے کاروبار کی کافی وسیع و عریض بساط بچھی ہوئی تھی' لیکن وہ اگر آج سود کی آمیزش اور آلودگی سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہے تو اس کے کاروبار کی بساط لپٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کے گھر میں رشوت کے ذریعے سے اللّے تللّے ہو رہے تھے' آج وہ طے کرتا ہے کہ میں اب رشوت نہیں لوں گا تو اس کے خاندان کو دونوں وقت سادہ ترین غذا بھی شاید بمشکل ملے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنے ہی گھر میں صحیح صحیح شرعی پردہ نافذ کر دے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی میں نکّو بن کر رہ جائے گا اور اس کے اپنے اعزّا و اقارب اسے دیوانہ اور مجنوں کہنے لگیں گے۔ اس کا مقاطعہ ہو جائے گا۔ عوامی زبان میں اس کا حُقّہ پانی بند ہو جائے گا...... یہ سب تکلیفیں وہ جھیلے' انہیں برداشت کرے۔ ان میں سے کسی بھی مصیبت پر جوابی کارروائی کے متعلق نہ سوچے...... 'RETALIATE' نہ کرے۔ اس میں کہیں جذبات سے مغلوب نہ ہو' مشتعل نہ ہو' کسی کو گالی نہ دے' کوئی ایسا اقدام نہ کرے کہ جس سے امن کا معاملہ درہم برہم ہو۔ یہ ہے اس دور میں ایک سچے مسلمان کی حقیقی تربیت کی کسوٹیاں۔ آج کلمۂ توحید و رسالت پڑھنے پر مار نہیں پڑے گی' مقاطعہ نہیں ہو گا' گھروں سے نکالا نہیں جائے گا۔ مجنوں اور دیوانہ نہیں کہا جائے گا۔ تمسخر اور استہزا نہیں ہو گا اور جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ اس دور میں اگر کوئی شخص ہزار دانے کی تسبیح لے کر سڑک پر کہیں بیٹھ جائے اور بلند آواز سے کلمہ ادا کرے "حق ہو' حق ہو" کے نعرے لگائے تو موجودہ معاشرہ ایسے شخص کی بڑی عزت و توقیر کرے گا۔ اسے پہنچا ہوا بزرگ سمجھے گا۔ اس کی خدمت اپنے لئے سعادت سمجھے گا۔ لیکن کوئی شخص کاروبار کو سود سے پاک رکھے' انکم ٹیکس کی چوری نہ کرے' رشوت لے نہ دے' گھر میں صحیح اسلامی پردہ کو نافذ کرے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ اپنے ہی بیگانے بن جائیں گے اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا وہ اپنے ہی گھر اور

اپنی ہی قریبی سوسائٹی میں تھوبن کر رہ جائے گا اس کا وہ مذاق اڑے گا کہ توبہ ہی بھلی۔
حاصلِ گفتگو یہ نکلا کہ اگر کسی معاشرہ میں انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے مرحلہ وار کام ہو رہا ہے۔ دعوت و تبلیغ کا مرحلہ چل رہا ہے، تنظیم کا مرحلہ چل رہا ہے، تربیت کا مرحلہ چل رہا ہے...... اس سلسلہ میں جن تکالیف و مصائب سے سابقہ پیش آ رہا ہے انہیں جھیلا جا رہا ہے اور آئندہ بھی جھیلنے کا عزم ہے تو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک جماعت بنائی جائے گی۔ اب فرض کیجئے کہ یہ جماعت اتنی مضبوط اور مؤثر ہو گئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہے تو اس اقدام اور تصادم کے مراحل کے موقع پر وہ جماعت کیا کرے گی...... ؟ اس کی نوعیت کیا ہو گی؟ اسی مسئلہ سے بات شروع ہوئی تھی...... تو اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے ہمیں تمدن کی موجودہ ارتقائی صورتحال نے کچھ متبادل طریقے دیئے ہیں...... وہ کیا ہیں؟ اب اس مسئلہ پر گفتگو شروع ہوتی ہے...... آپ سے پوری توجہ مرتکز کرنے کی درخواست ہے۔

میرے نزدیک اب اسلامی انقلاب کے لئے اقدام کا واحد راستہ صرف یہ ہے کہ اگر ایک ایسی تنظیم وجود میں آ جائے جو پہلے چار مراحل...... یعنی دعوت، تنظیم، تربیت، اور صبر محض سے گزر چکی ہو تو وہ رائج الوقت نظام اور اس کو چلانے والے انتظامی ادارے (یعنی حکومت) کے مقابلہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کمر کس لے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر کھڑی ہو جائے اور صرف زبانی و کلامی بات کرنے کے بجائے علی الاعلان یہ کہے کہ اب فلاں فلاں منکر کام ہم ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کام اب ہماری لاشوں پر ہو گا۔ پھر اس پر ڈٹ جائے اور ہر نوع کی مالی و جانی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کرے...... البتہ اس اقدام میں اس بات کا التزام و لحاظ ضروری ہو گا کہ انہی منکرات کو چیلنج کیا جائے جو تمام مسالک کے ماننے والوں کے نزدیک مسلّم ہوں۔ کسی مسئلہ میں اگر کسی کی شاذ رائے ہو کہ وہ منکر ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس پر تو تمام مسالک کے لوگوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر کوئی تحریک ہی برپا کی جا سکتی ہے۔ ہدف اس کام کو بنانا ہو گا جو سب مسلمانوں کے نزدیک منکر ہو، جو سب کے نزدیک حرام ہو مثال کے طور پر بے حیائی، عریانی، تبرجِ جاہلیہ، مرد و عورت کے مخلوط اجتماعات کے سارے طور طریقے، عورت کی بطورِ اشتہار تشہیر اور یومِ پاکستان اور یومِ استقلال کے مواقع پر فوج کے ساتھ اللہ کے آخری نبی حضرت محمدؐ کی معنوی نوجوان بیٹیوں کی سڑکوں پر مردوں کے سامنے سینہ تان کر پریڈ...... یہ سب وہ خلافِ شریعت امور ہیں جن کے منکر ہونے کے بارے

یں تمام مذہبی مکاتبِ فکر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ الغرض میری پختہ رائے یہ ہے کہ
موجودہ دور میں اسلامی انقلابی جماعت منکرات یعنی خلافِ شریعت کاموں کے خلاف
مظاہروں کے ذریعے اقدام کا آغاز کرے گی۔ تمدنی ارتقاء نے ان مظاہروں کی بہت سی
صورتوں سے دنیا کو روشناس کرایا ہے جن میں پکٹنگ یعنی دھرنا مار کر بیٹھنا' احتجاجی طور پر
حکومت کو یا عوام کو کسی کام سے روکنے کے لئے گھیراؤ وغیرہ کرنا بھی شامل ہے۔

اقدام کی لازمی شرائط...... البتہ اس موقع پر ان شرائط کا اعادہ ضروری ہے جن کو
اس اقدام یعنی مظاہروں اور دیگر احتجاجی طور طریقوں کو اختیار کرنے کی صورت میں ملحوظ رکھنا
لازم ہے...... یعنی اپنی طرف سے ہاتھ بالکل نہیں اٹھانا ہے۔ کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہیں کرنی
ہے۔ میں بڑی تفصیل سے مکی دور کی مثالیں پیش کر چکا ہوں۔ قریباً بارہ تیرہ برس تک مکہ مکرمہ
میں صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) کا جو معاملہ رہا ہے کہ ہر قسم کے جور و ستم اور
ظلم و تشدد کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جس پامردی سے برداشت کیا ہے'
اپنی طرف سے جوابی کارروائی تو درکنار مدافعت تک نہیں کی' وہی طرزِ عمل اس اقدام یعنی
مظاہروں' گھیراؤ وغیرہ کے معاملہ میں اس انقلابی جماعت کو اختیار کرنا ہو گا۔ یہ نہیں کہ
احتجاجی جلوس تو ہم نے نکالا تھا لیکن توڑ پھوڑ کوئی اور کر گیا...... یہ بات غلط ہے۔ اگر ایسی انقلابی
جماعت کے اثرات اتنے نہیں ہیں کہ وہ عوام کو پرامن رکھ سکے اور نہ اس کے پاس ایسے
کارکن ہیں جو عوام کو کنٹرول کر سکیں اور ہر نوع کی بدامنی کو قابو میں رکھ سکیں تو ایسی صورت
میں مظاہروں کا اس تنظیم کو حق نہیں ہے۔ اس اقدام کا مرحلہ اسی وقت آئے گا کہ جب اس
انقلابی جماعت کو اپنی امکانی حد تک یہ اندازہ اور معلومات حاصل ہوں کہ ہمارے اپنے زیر اثر
اور ہمارے تربیت یافتہ لوگ اتنے ہیں کہ وہ پرامن طریق پر سڑکوں پر آسکتے ہیں اور مظاہرے کر
سکتے ہیں اور ان کی اخلاقی ساکھ اتنی مضبوط ہے کہ ان کے مظاہروں کے دوران بدامنی کا کوئی
حادثہ نہیں ہو گا۔ اور اگر چند شرپسند لوگ بدامنی پر اتر ہی آئیں تو ان کی تنظیمی طاقت اتنی مضبوط
ہو کہ ان اشرار کی گردنیں وہ دبوچ لیں اس کے بجائے کہ حکومت کی انتظامیہ کو ان کی گردنیں
دبوچنے کی ضرورت پیش آئے' وہ خود ان پر قابو پا کر انہیں حکومت کے حوالے کریں کہ یہ ہم
میں سے نہیں ہیں۔ یہ تخریب کار عناصر ہیں جو اس پرامن اور عدم تشدد کی اسلامی تحریک کو
سبوتاژ اور درہم برہم کرنے کے لئے آگئے ہیں...... اس انقلابی تنظیم کے تربیت یافتہ جلوس نہ
بسوں کو جلائیں گے نہ نیون سائنوں اور ٹریفک سگنلوں کو توڑیں گے نہ ہی وہ کسی نجی یا سرکاری

املاک کو نقصان پہنچائیں گے...... ان جلوسوں اور مظاہروں کا مطالبہ یہ ہو گا کہ فلاں فلاں کام شریعت کی رو سے منکر ہیں، حرام ہیں، ہم ان کو کسی حال میں نہیں ہونے دیں گے۔ حکومت گرفتار کرے تو مظاہرین کوئی مزاحمت نہیں کریں گے۔ لاٹھی چارج کرے تو اسے جھیلیں گے۔ آنسو گیس کے شیل برسائے تو برداشت کریں گے۔ حتیٰ کہ گولیاں برسائے تو خوشی خوشی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔ لیکن نہ پیچھے ہٹیں گے اور نہ اپنے موقف کو چھوڑیں گے۔

میں جب انقلابی طریقِ کار کی بات کرتا ہوں تو بعض حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے کہ میں حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت اور مسلح تصادم کی بات کرتا ہوں۔ بعض حضرات دانستہ یہ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں حالانکہ میں اپنی متعدد تقریروں میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ انقلابی طریق کار کا مطلب لازماً یہ نہیں ہے کہ مسلح بغاوت اور تصادم ہو بلکہ موجودہ دور میں یہ بات قریباً خارج از بحث ہے چونکہ اولاً تو سابقہ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسی حکومت سے ہے جو قانوناً مسلمانوں پر مشتمل ہے ثانیاً یہ کہ حکومت کے پاس باقاعدہ تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس فوج موجود ہے جبکہ عوام الناس نہتے ہیں لہٰذا ان دونوں اعتبارات سے فی زمانہ مسلح تصادم اور بغاوت کے راستے...... معدوم کے درجے میں آتے ہیں چنانچہ اب ہمیں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں وہ طریقہ اختیار کرنا ہو گا جس سے دورِ جدید کے تمدنی ارتقاء نے لوگوں کو واقف کرایا ہے۔ آج عوام عدم تشدد کے اصول پر پرامن اور منظم مظاہروں کے ذریعے اپنے عزم اور اپنی قوت کا اظہار کرتے ہیں اس کے لئے ہمیں قرآن و حدیث سے جو رہنمائی ملتی ہے اسے میں "نہی عن المنکر بالید" سے تعبیر کرتا ہوں۔

قرآن سے رہنمائی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ اس قرآن حکیم کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے'...... یعنی ہر دور میں اس سے انسان کو ہدایت ملتی رہے گی۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں، جیسے جیسے انسانی ذہن اور تمدن کا ارتقاء ہو گا' یہی قرآن انسان کی انگلی پکڑ کر لے چلے گا اور ہر ہر مرحلہ پر یہ ہدایت دے گا...... مطالعۂ قرآن کے دوران ایک مرتبہ اچانک میرا ذہن اس طرف متوجہ ہوا کہ قرآن مجید میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر

اتنا زور کیوں دیا گیا ہے۔ ایک روز میں نے بیٹھ کر قرآن مجید کی ان آیات کی ایک فہرست مرتب کی جن میں اس پر انتہائی زور ہے۔ دعوت کا حکم اتنے زور شور کے ساتھ آپ کو قرآن مجید میں نہیں ملے گا۔ آپ کو اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ...... الخ یا...... وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰہ..... والی آیات مل جائیں گی۔ تبلیغ کا قرآن مجید میں عام مسلمانوں کے لئے حکم ملے گا ہی نہیں۔ وہاں تو تبلیغ کا حکم آیا ہے صرف حضورؐ کے لئے یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ۔ وہ تو نبی اکرمؐ نے اسے تمام اہلِ ایمان کے لئے عام کیا ہے کہ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً "پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت"۔ البتہ قرآن مجید میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر بہت سی آیات ہیں۔

۱..... سورة النحل کی وہ آیت جو آپ حضرات اکثر خطباتِ جمعہ کے آخر میں سنتے ہیں۔ اُس میں اس کام کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے کہ وہ خود یہ کام کرتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَ الْبَغْیِ "اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے"۔ (سورة النحل۔ آیت: ۹۰)

یہاں پر معروف کے تین شعبے بیان ہوئے عدل، احسان اور صلہ رحمی یہ معروف کے تین شعبے ہیں۔ پھر فواحش کی، نامعقول کاموں کی اور سرکشی کی ممانعت بیان ہوئی۔ یہ منکرات کے تین شعبے ہوئے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس کام کی اپنی طرف نسبت فرما رہا ہے کہ وہ خود معروف کا حکم دیتا اور بدی سے روکتا ہے۔

۲..... اب آیئے دوسری آیات کی طرف..... حضرت لقمان کی نصیحتوں میں اس کا بڑے شدّومد سے بیان آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کی نصائح کا قرآن مجید میں ذکر فرما کر ان کو دوام عطا فرما دیا ہے۔ ان نصائح میں یہ بھی ہے۔

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○

"اے میرے پیارے بچے، نماز قائم رکھ اور نیکی کا حکم دے اور بدی سے روک۔ اور اس کام کی انجام دہی میں جو بھی تکلیف و مصیبت آئے اسے جھیل، برداشت کر، صبر کر، اس لئے یہ کام بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے"۔

۳..... سورة الاعراف کی آیت نمبر ۱۵۷ میں نبی اکرمؐ کی جہاں بہت سی شانیں بیان ہوئی ہیں

وہاں یہ بھی ہے یَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ خود حضورؐ کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہؐ معروف کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

۴......بنی اسرائیل پر ایک فردِ قراردادِ جرم تو وہ ہے جو سورۃ البقرۃ کے رکوع پانچ سے چل کر رکوع دس پر ختم ہوتی ہے۔ مزید بر آں مختلف مقامات پر ان پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں ان میں بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق اس لئے بھی بنے کہ انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا......

ان آیات میں یہ بات نوٹ کیجئے گا کہ پورا زور نہی عن المنکر پر ہے۔ یعنی بدی کو نہ روکنا اور اس فریضہ کو ترک کر دینا زیادہ بڑا جرم ہے امر بالمعروف کو چھوڑ دینے کے مقابلہ میں...... اس لئے کہ منکرات ہی وہ شے ہے جس سے معاشرے میں گندگی پھیلتی ہے، جس سے معاشرہ میں فساد متعدی ہو جاتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے اور ماحول اتنا خراب ہو جاتا ہے کہ اس میں امر بالمعروف بے اثر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ آیت ۶۳ میں فرمایا:

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

"کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش (صوفیا) اور علماء ان کو گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے۔ بہت ہی برے عمل ہیں جو وہ کر رہے ہیں"۔

۵......اسی سورہ کی آیت ۷۹ میں فرمایا:

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ یعنی یہ رہبان و احبار وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے یہاں منکر پر عمل ہو رہا تھا تو وہ اس سے منع نہیں کرتے تھے کیا ہی بری روش تھی جس پر وہ چل رہے تھے لہٰذا یہ بھی برابر کے مجرم ہیں اور پاداش میں بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

۶......سورۃ الاعراف میں (آیت نمبر ۱۶۳ سے لے کر ۱۶۶ تک) یہود کے اس قبیلہ کا ذکر ہے جس کا پیشہ ماہی گیری تھا۔ سبت (ہفتہ) کا دن ان کے ہاں صرف اللہ کی عبادت کے لئے مختص تھا اور اس دن ان پر مچھلی کا شکار کرنا حرام تھا۔ ان لوگوں کو حکم عدولی اور نافرمانی کی عادت تھی لہٰذا اللہ کی طرف سے یہ آزمائش آئی کہ ہفتہ کے دن مچھلیاں کنارے پر آکر سطحِ آب پر خوب اٹھکیلیاں کرتی تھیں اور باقی دنوں میں غائب رہتی تھیں۔ ان لوگوں سے صبر نہ ہو سکا۔ صریح حکم الٰہی کے خلاف حیلے کرنے لگے۔ ہفتہ سے ایک دن پہلے (جمعہ کے دن)

کناروں پر دریا کا پانی کاٹ کر حوض بنا لیتے اور جب مچھلیاں ہفتہ کے دن ان کے بنائے ہوئے حوضوں میں آجاتیں تو نکاسی کا راستہ بند کر دیتے اور اگلے دن اتوار کو جا کر پکڑ لاتے۔ تاکہ اس حیلہ کی بناء پر ہفتہ کو شکار کرنے کا الزام ان پر نہ آئے۔ اس حیلہ سازی اور مکاری کے ضمن میں اس قبیلہ کے لوگ تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو یہی حیلہ ساز لوگ تھے جو دھڑلے کے ساتھ اس گناہ میں ملوث تھے۔ دوسرے لوگ وہ تھے جو اگرچہ اس حیلہ سازی اور نافرمانی میں شریک نہیں تھے لیکن ان کو اس سے روکتے بھی نہیں تھے۔ تیسرے وہ لوگ تھے جو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے سے اور اس حیلہ سازی سے منع کرتے تھے۔ یعنی نہی عن المنکر کا فریضہ مسلسل ادا کرتے رہتے تھے۔ اور درمیانی قسم کے لوگ اس مؤخر الذکر گروہ سے کہتے کہ تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو عذاب دے تو وہ جواب میں کہتے: قَالُوْا مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمْ وَ لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ...... "وہ کہتے کہ (ہم اس لئے نصیحت کرتے ہیں کہ) تمہارے رب کے حضور میں معذرت پیش کر سکیں اور اس لئے بھی کہ شاید وہ لوگ تقویٰ کی روش پر آجائیں' نافرمانی اور سرکشی سے باز آجائیں" ...... ان تینوں گروہوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ۔ "ہم نے عذاب سے بچایا ان کو جو روکتے تھے اس برے کام سے" ...... یعنی در حقیقت وہ لوگ نجات کے مستحق بنتے ہیں جو لوگوں کو بدی سے روکنے کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ بدی سے صرف خود رُکے رہنا نجات کے لئے کفایت نہیں کرے گا۔ جو لوگوں کو بدی سے روکتے نہیں ہیں وہ بھی ان لوگوں کے مانند گردانے جاتے ہیں جو بدی میں ملوث ہیں۔ چونکہ گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اس لئے جو روکتے نہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ برابر کے مجرم ہیں جو بدی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اصل میں بچنے والے وہ ہیں جو بدی سے روکنے والے ہیں۔ اس بات کو نبی اکرمؐ نے ایک انتہائی بلیغ تمثیل سے سمجھایا ہے کہ: "ایک جہاز میں کچھ لوگ عرشہ پر سوار ہیں' کچھ لوگ نیچے ہیں یعنی نچلی منزل میں ہیں۔ نیچے والوں کو جب پانی لینا ہوتا ہے تب وہ اوپر آتے ہیں۔ اب جو لوگ عرشہ پر مقیم ہیں ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ پانی برتنوں سے چھلک بھی جاتا ہو گا۔ عرشہ والے ان لوگوں کے اوپر آنے جانے پر ناک بھوں چڑھاتے ہوں گے ...... نیچے والوں نے سوچا کہ اوپر سے پانی لانے کے کام کو چھوڑو ہم ان کو کیوں ناراض کریں۔ ہم تو نیچے جہاز کے پیندے میں سوراخ کر لیتے ہیں' یہیں سے پانی لے لیا کریں گے' اب اگر اوپر والے ان نیچے والوں کا ہاتھ نہیں پکڑ لیتے تو جہاز ڈوبے گا تو

صرف نیچے والے ہی نہیں ڈوبیں گے بلکہ اوپر والے بھی ڈوبیں گے"۔ گویا جو لوگ غلط کام اور بدی سے روکتے نہیں ہیں انجامِ کار کے اعتبار سے وہ ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں جو بدی میں خود ملوث ہیں...... اس مثال سے بھی واضح ہوا کہ اصل میں نہی عن المنکر ہی وہ شے ہے جو انسان کو نجات کا حق دار بناتی ہے۔

۷...... اب آیئے قرآن مجید میں دیکھیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ضمن میں امتِ مُسلمہ کو کیا ہدایات اور احکام ملے ہیں! سورہ آل عمران میں ارشادِ ربانی ہے۔ (آیت نمبر ۱۱۰)

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ

"تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نکالا ہے پوری نوعِ انسانی کے لئے۔ بین الاقوامی سطح پر تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو اور تم اللہ پر اپنا ایمان پختہ رکھو"۔ بحیثیتِ امت یہ ہی تمہاری اجتماعی ڈیوٹی ہے۔

۸...... دوسری آیت وہ ہے کہ جس میں اس صورت حال کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے کہ جب امت خود مریض ہو گئی ہو، جب خود اسے اصلاح کی ضرورت ہو تو ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے۔ !! اس کا حل سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ میں پیش کیا گیا ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○

"اور چاہئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کاموں کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو"۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

اس آیتِ مبارکہ سے ہمیں یہ رہنمائی ملی کہ کچھ لوگ تو ایسے ہوں جو جاگیں، ہوش میں آجائیں۔ وہ مل جل کر ایک امت بنیں۔ یا امت کے اندر ایک امت بنائیں، جماعت کے اندر جماعت کی شکل اختیار کریں۔ ...... بڑی پارٹی تو وہی ہے یعنی امتِ مسلمہ۔ چاہے اس کی عظیم ترین اکثریت بے عمل یا فاسق و فاجر ہو، جو بھی کلمہ گو ہے وہ قانوناً امتِ محمدؐ میں شامل ہے۔ لیکن یہاں ہدایت اور رہنمائی کی جارہی ہے کہ اس بڑی امت میں سے ایک چھوٹی امت تشکیل پائے جو ان لوگوں پر مشتمل ہو جو خود حق پر چلیں اور معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے حق کی دعوت دیں۔ اس آیت کے آخری حصے میں تاکید کا اسلوب اختیار

کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کامیابی صرف ان لوگوں کے لئے ہے اور فلاح صرف وہی لوگ پائیں گے جو اس سہ نکاتی پروگرام یعنی دعوت الی الخیر' امر بالمعروف 'نہی عن المنکر پر عمل کے فرض کی انجام دہی میں تن' من' دھن کی بازی لگا دیں گے۔ اگر ہر شخص کلمہ گو ہونے کے ناطے فلاح کا امیدوار بنا بیٹھا ہے تو اس کی قرآن مجید میں بہر حال ضمانت موجود نہیں ہے۔ یہ ضمانت صرف ان کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ ان فرائض کی انجام دہی کے لئے کمر کس لیں اور تکلیفیں جھیلنے کے لئے تیار ہوں......

۹..... سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۱۲ اس سلسلے کی بڑی عظیم 'اور بڑی دلکش آیت ہے۔ اس آیتِ مبارکہ میں ظاہری و باطنی اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو ایک بندۂ مومن کی سیرت و کردار میں درکار ہیں۔ ان میں تین تین اوصاف کے تین سیٹ (SETS) ہیں ایک طرف ان چھ اوصاف کا بیان ہے جو ایک مومنِ صادق کی زندگی میں انفرادی سطح پر مطلوب ہیں۔ دوسری طرف ایک مسلم معاشرہ کا فرد ہونے کے اعتبار سے ایک بندۂ مومن پر جو اجتماعی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کی ادائیگی کے لئے جو اوصاف چاہئیں وہ بیان ہو گئے۔ وہ بھی تین ہی بیان ہوئے۔ ایک آیت میں نو اوصاف جمع کر دیئے گئے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ

" (یہ مومنین جنہوں نے جنت کے عوض اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے) اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے ہیں؛ عبادت گزار ہیں؛ اس کا شکر ادا کرنے والے 'اس کی ثناء کرنے والے ہیں؛ اس (کے دین) کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے ہیں 'اس کے حضور میں رکوع کرنے والے ہیں، سجدہ کرنے والے ہیں"۔

یہ چھ اوصاف وہ ہیں جو انفرادی ہیں ایک بندۂ مومن کے اپنے لئے ' یہ گویا تربیت و تزکیہ کے مراحل ہیں۔ یہ اوصاف ہیں جنہیں میں علامہ اقبال کے اس مصرع کے حوالے سے بیان کرتا ہوں کہ ع

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

یہ نشۂ درویشی کیا ہے اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ ..... یہ چھ اوصاف اگر حاصل ہو گئے تو علامہ اقبال کے بقول اب تم پختہ ہو گئے۔ اب کیا کرنا ہے؟ ع

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اور اس آیتِ مبارکہ کی رو سے اگلا قدم کیا ہوگا......وہ ہوگا :

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

"نیکی کا حکم دینے والے ہیں۔ بدی سے روکنے والے ہیں اور اللہ کی حدودؐ کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ پس (اے نبیؐ ان) مومنین کو بشارت سنا دیجئے۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے والے کہ اللہ کی حدود کو توڑنے نہیں دیں گے۔ منکرات کو ہم کسی طور پر برداشت نہیں کریں گے۔ ان تین آخری اوصاف میں کلید ہے اس مسئلہ کی کہ ایک مسلمان حکومت میں اسلامی نظام کے قیام اور نفاذ کے لئے جو انقلابی جماعت میدان میں آئے گی وہ اسی بنیاد پر آئے گی کہ صرف امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور تحفظِ حدود اللہ کے لئے پر امن اور عدم تشدد پر مبنی مظاہرے کرے گی' گھیراؤ کرے گی۔ دھرنا مار کر بیٹھے گی اور ترکِ موالات کے تمام طور طریقے اختیار کرے گی۔

۱۰......اسی سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۶۷ اور آیت نمبر ۷۱ میں اہلِ نفاق اور اہلِ ایمان کی روش اور طرزِ عمل کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ آیت نمبر ۶۷ میں منافقین کے رویہ کے متعلق فرمایا:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ.......... (الخ)

"منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے سے ہی ہیں' سب کی ایک ہی روش ہے۔ یہ معاشرہ میں بری باتوں اور برے کاموں کو ترویج دیتے ہیں' ان کی ترغیب دیتے ہیں اور خیر اور نیکی کے کاموں کے فروغ کو روکتے ہیں"۔

اور آیت نمبر ۷۱ میں اہلِ ایمان کے طرزِ عمل کے لئے فرمایا کہ :

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ...... (الخ)

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہوتے ہیں، بھلے اور نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں"۔

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے اس وقت تمام مسلم معاشروں میں جو لوگ مسندِ اقتدار پر براجمان ہیں اور جن کے قبضے میں ملک کا نظامِ تعلیم ذرائع اعلام و ابلاغ اور مملکت کے سارے

وسائل ہیں وہ کن خصوصیات کے حامل ہیں۔ وہ فحاشی کے علمبردار ہیں' بے پردگی اور بے حیائی کے مبلغ ہیں۔ ہر نوع کی اباحیت کو ماننے والے اور اس کے پرچارک ہیں۔ یہی طبقہ ہے جو شریعت کی حدود اور پابندیوں کو توڑنے پھوڑنے کے لئے نہایت منظم طور پر مسلم معاشروں میں مصروفِ عمل ہے۔ اجتماعی زندگی کے تمام شعبے ان کی ترک تازیوں کی جولان گاہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں! قانوناً مسلمان...... لیکن سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۶۷ میں انہیں منافقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک مسلم معاشرہ کے لئے کھلے کافروں' منکروں اور غیر مسلموں سے کہیں زیادہ خطرناک عنصر ان منافقین کا ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ آستین کے سانپ کا رول ادا کرتے ہیں۔

۱۱...... سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۱ میں تمکّن فی الارض یعنی اللہ کی طرف سے حکومت ملنے کے بعد اہلِ ایمان کے بنیادی فرائض بیان فرمائے گئے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ......

"وہ لوگ جنہیں ہم زمین میں تمکّن واقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا نظام قائم کریں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے"۔

یہ آیتِ مبارکہ ایک اسلامی حکومت کے بنیادی واساسی فرائض کے تعین کے لئے نصِ قطعی کے مقام کی حامل آیت ہے۔

۱۲...... نہی عن المنکر کے بارے میں سورہ ہود کی آیت نمبر ۱۱۶ پر بھی غور کر لیجئے۔

"پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم' جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچالیا' ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیئے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں"۔

اس آیت میں سابقہ رسولوں کی امتوں کا بیان ہے کہ جب رسولوں کی امتیں بگڑتی ہیں اور دین کی تعلیمات کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہیں تو ایسی امتوں کو ہلاک کیا جاتا ہے اور صرف ان تھوڑے سے لوگوں کو بچالیا جاتا ہے جو نہی عن الفساد کا فریضہ انجام دیتے رہتے تھے۔

میں نے قرآن حکیم کے مختلف مقامات سے جو متعدد آیات آپ کو سنائی ہیں اس سے یہ بات اظہر من الشّمس کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہمارے دین کے اندر کس قدر اور کتنی عظیم اہمیت کی حامل شے ہے۔ ان آیات پر غور و فکر اور استحضار کے نتیجہ میں مجھے یہ رہنمائی ملی کہ جب امتِ محمدؐ میں دین کے احیاء اور دین کو بتمام و کمال قائم و نافذ کرنے کا مسئلہ آئے گا اور پورے فاسد و استحصالی نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر توحید کی بنیادوں پر پورے نظام کو استوار کرنے کا مرحلہ آئے گا تو درحقیقت اقدام کا یہی راستہ ہو گا کہ ایک منظّم اور تربیت یافتہ اسلامی انقلاب امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تحفظِ حدود اللہ کے لئے پُر امن مظاہروں اور ان تمام طریقوں سے حکومتِ وقت کو مجبور کر دے کہ وہ معروفات کی ترویج کرے، منکرات کو روکے اور ان کا قلع قمع کرے اور حدود اللہ کو نافذ کرے۔ بغاوت کا کوئی راستہ نہیں۔ کسی حکومت کے خلاف کھڑے ہو کر اعلانِ بغاوت کرنے اور قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حکومت کی طالب وہ انقلابی جماعت ہو گی ہی نہیں۔ حقیقی اسلامی جماعت کبھی بھی اقتدار کی طالب بن کر میدان میں نہیں آتی۔ اس کا تو صرف یہ مطالبہ ہو گا کہ جب مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور مسلمان ہی حکمران ہیں تو دین کو صحیح شکل میں قائم و نافذ کرو اور اس کے خلاف جو کچھ ہے اسے ختم کرو۔ نہیں کرتے تو پھر ہم میدان میں موجود ہیں۔ پھر ہمارے سینے حاضر ہیں، گولیاں چلاؤ۔ پھر ہمارے سر حاضر ہیں، لاٹھیاں برساؤ، پھر ہم حاضر ہیں کہ دار و رسن کے حربے ہم پر آزماؤ اس ابتلا اور امتحان میں ڈٹے رہنا ہے، پیچھے نہیں ہٹنا ہے، کھڑے رہنا ہے۔ یہ حکم کیا تھا کہ تمہیں دہکتے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہو تو لیٹ جاؤ، مکہ کی گرم اور سنگلاخ زمین پر تمہیں جانور کی طرح گلے میں رسی ڈال کر پیٹھ کے بل گھسیٹا جا رہا ہو تو اف نہ کرو۔ ہاتھ مت اٹھاؤ۔ تمہیں جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ہے...... یہی میرے نزدیک موجودہ دور میں اسلامی انقلاب کا صحیح راستہ ہے۔ اسی کو میں "صبرِ محض" اور "پُر تحمل مزاحمت" سے تعبیر کرتا ہوں۔

احادیث شریفہ اور فریضہ نہی عن المنکر

قرآن کی طرح احادیثِ رسولؐ میں بھی اس مسئلے پر رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔ صحیح مسلم کی دو حدیثیں پیشِ خدمت ہیں۔ ان پر جب آپ غور کریں گے تو آپ پر منکشف ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کامل رہنمائی دے گئے ہیں ہمیں اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑ گئے...... مکان و زمان کے فرق کو ملحوظ رکھ کر حضورؐ کے ان ارشادات سے مختلف مراحل کے لئے ہدایت و رہنمائی مستنبط اور اخذ کی جا سکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری نیتیں خراب ہوں' عافیت مطلوب ہو' صرف کھانا کمانا پیش نظر ہو' بچوں کی پرورش اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہی زندگی کا مقصود بن گیا ہو تو یہ ہماری محرومی ہے...... لیکن اگر وفاداری ہے اللہ کے ساتھ۔ اگر وفاداری ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جیسے علامہ اقبال مرحوم نے کہا۔ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی وفاداری اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاداری آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ارادہ پیدا ہو جائے تو جمود و تعطل توڑ کر میدان میں آنا پڑے گا۔

پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت ابو سعید الخدریؓ۔ اس روایت میں اختصار و ایجاز ہے۔ وہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من رأى منكم منكرًا فليغيّره بيده و ان لم يستطع فبلسانه
و ان لم يستطع فبقلبه و ذلك اضعف الايمان

"جو کوئی تم میں سے برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ یعنی طاقت سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے برا کہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا جانے اس پر دلی کرب محسوس کرے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے......"

اس کی ہم مضمون دوسری روایت کے آخری ٹکڑے میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل
گویا ان تین حالتوں میں سے اگر کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان موجود نہیں ہے۔

اب خاص طور پر دیکھئے کہ اس حدیث میں امر بالمعروف کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ حکم ہی نہیں دیا گیا...... وہ حکم اپنی جگہ قرآن مجید میں ہے' اس کی نفی مقصود نہیں ہے۔ البتہ اس حدیث میں سارا ذکر نہی عن المنکر کا ہے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا اسلوب دیکھئے فرمایا کہ...... من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ جو شخص بھی تم میں سے منکر کو دیکھے اس پر لازم ہے' واجب ہے' فرض ہے کہ اسے ہاتھ سے روکے اس لئے کہ یہ صیغۂ امر ہے جو وجوب کے لئے آتا ہے۔ فرمایا و ان لم یستطع فبلسانہ اگر طاقت سے روکنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ کہے تو سہی کہ اللہ کے بندو! باز آجاؤ' اس راستہ پر مت جاؤ۔ یہ حرام کا راستہ ہے' یہ اللہ کی نافرمانی کا راستہ ہے۔ یہ شیطان کا راستہ ہے' یہ طاغوت کا راستہ ہے۔ زبان سے کہے۔ و ان لم یستطع ۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اتنا بھی دم نہیں' اتنی بھی استطاعت نہیں ہے۔ یا زبانوں پر تالے ڈال دیئے گئے ہیں تو فبقلبہ ۔ دل میں بدی کے خلاف شدید نفرت تو رکھے۔ اس پر دل میں گھٹن تو محسوس کرے...... "و ذلک اضعف الایمان" اور یہ یعنی صرف دل سے برا جاننا' دل میں برائیوں پر کرب محسوس کرنا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ عربی زبان میں اضعف "SUPERLATIVE DEGREE" ہے۔ اس سے آگے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر دل میں نفرت بھی نہ رہے تو ایمان ہی گیا۔ پھر وہی بات ہو گی جو علامہ اقبال نے کہی ہے کہ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جب یہ احساس بھی ختم ہو گیا تو جان لیجئے کہ دل والا حقیقی ایمان بالکل رخصت ہو گیا!

اس حدیث کے مفہوم کے ضمن میں البتہ ایک احتیاط پیشِ نظر رکھنی اشد ضروری ہے۔ لوگ عام طور پر غور نہیں کرتے۔ اس حدیث میں جو تین مدارج بیان کئے گئے ہیں وہ اس اعتبار سے نہیں ہیں کہ جو شخص نیچے کھڑا ہے وہ نیچے ہی کھڑا رہے جو شخص درمیانی درجہ میں ہے وہ

وہیں رہے۔ بلکہ ایسے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ مسلسل کوشش کرے کہ اگر آج طاقت حاصل نہیں ہے کہ منکر کو طاقت سے روک سکے تو طاقت حاصل کرے۔ وہ جو علامہ نے کہا ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

اگر آپ نہی عن المنکر اعلیٰ اور بلند ترین سطح پر کرنا چاہتے ہیں تو وہ طاقت کے ساتھ ہے۔ اگر طاقت نہیں ہے تو طاقت فراہم کیجئے۔ اس طاقت و قوت کو فراہم کرنے کی سعی وجہد کرنا بھی فرض کے درجہ میں ہو گا۔ لیکن اگر کوشش کے باوجود اتنی جمعیت فراہم نہیں ہو پا رہی کہ منکرات کے خلاف منظم اور پرامن طور پر طاقت کا مظاہرہ کیا جاسکے تو بہرحال اس وقت تک زبان سے منکر کو منکر کہنا اور اس کے خلاف زبان سے جہاد کرنا لازم ہے۔ اگر اس کا بھی امکان نہیں ہے تو دل سے نفرت کرنا لازم ہے۔ لیکن یہ نہیں ہونا چاہئے کہ انسان نچلی منزل پر قانع ہو کر بیٹھ جائے چونکہ یہ وہ نازک ترین مقام ہے کہ اگر ذرا سی بھی چوک ہو گئی اور کسی منکر کے خلاف دل میں نفرت' کراہیت اور کرب کے جذبات پیدا نہیں ہوئے تو ایمان کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہ تو وہ آخری حد ہے کہ جس سے باہر قدم نکلتے ہی انسان ایمان کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اگر کوئی شخص ایمان کی کمزور ترین حد کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس حد سے نکل جانے میں آنکھ جھپکنے سے زیادہ کا وقفہ درمیان میں نہیں آئے گا۔

اس حدیثِ مبارکہ کے اسلوب پر غور و تدبّر سے یہ لازمی تقاضا سامنے آتا ہے کہ منکر کو مٹانا اسے برا کہنا اور اسے برا سمجھ کر اس سے نفرت کرنا ہر مسلمان پر واجب اور فرض ہے۔ سب سے نچلے درجے پر ہرگز قانع نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ لازم ہے کہ طاقت حاصل کرنے اور جمعیت فراہم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشش کی جائے۔ لوگوں کو تیار کیا جائے کہ منکرات کو مٹانے اور بدلنے کے لئے اپنی جانیں تک دینے کے لئے آمادہ ہوں' جب تک طاقت حاصل نہ ہو زبان سے بھی منکر کو منکر کہنے کا عمل جاری رہے۔ صاحبانِ اقتدار کو نرم و گرم طور پر اس طرف متوجہ کیا جاتا رہے۔ اس دوران دل میں منکرات کے خلاف نفرت پروان چڑھتی رہے تاکہ جب ان کو طاقت و قوت کے ساتھ بدلنے کا مرحلہ آئے تو جذبات میں منکرات کے خلاف جوش و خروش کا طوفان موجزن ہو...... ایسا نہ ہو کہ کوئی مسلمان ماحول کے

رنگ میں رنگا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دل کی نفرت کم ہو اور پھر ماحول اس پر چھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کل وہ جس کام کو برا کہہ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا آج وہ خود اس میں ملوث ہو جائے۔

علماءِ بنی اسرائیل کی اسی روش کا تذکرہ حدیث میں ملتا ہے۔ ارشادِ رسالت مآبؐ کا مفہوم یہ ہے کہ یہود کے عالموں کا سب سے بڑا جرم ہی یہ تھا کہ جب ان کے امراء نے غلط کام کرنے شروع کئے تو ابتداء میں تو علماء نے ان کو ٹوکا کہ شریعت کی رُو سے یہ برا اور غلط کام ہے لیکن ان کے ساتھ مجلسی تعلق بھی قائم رکھا۔ ان کے ساتھ کھانا پینا ترک نہیں کیا۔ ان امراء کے دسترخوان کی لذتیں ان کو کھینچ کھینچ کر بلاتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی اسی رنگ میں رنگے گئے، درحقیقت جب تک انسان ایسے لوگوں کے ساتھ مقاطعہ کی روش اختیار نہ کرے، جس کا اقرار دعائے قنوت میں ہم روزانہ کرتے ہیں "نخلع و نترک من یفجرک" اے اللہ جو بھی تیرا نافرمان ہو گا اور فاجر و فاسق ہو گا ہم اس سے قطع تعلق کریں گے، اسے ہم چھوڑ دیں گے، اس کے ساتھ ہم دلی محبت کا کوئی رشتہ استوار نہیں کریں گے اس وقت تک نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں پا سکے گا۔ ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص کسی فاسق کے ساتھ چلتا ہے تاکہ اسے تقویت پہنچائے تو اللہ کے غضب کی وجہ سے عرش کانپنے لگتا ہے"۔

صحیح مسلم کی دوسری حدیث کے راوی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ فقہ جسے آج ہم فقہ حنفی کے نام سے جانتے ہیں سلف میں فقہ ابن مسعودؓ کہلاتی تھی۔ اس لئے کہ اس کے اصل بانی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ تھے جن کا شمار کبارِ صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ وہ کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔ انؓ کے شاگرد کے شاگرد امام ابو حنیفہؒ ہیں۔ اس حدیث میں نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کے مسئلہ کو نہایت تشریح اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

انّ رسولَ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلّم قال: مامن نبیٍّ بعثہ اللہ فی اُمّۃٍ قبلی الّا کان لہ من امتہ حواریّون و اصحابٌ یأخذون بسنّتہ و یقتدون بامرہ ثم انہا تخلف من بعد ہم خلوف یقولون مالا یفعلون، و یفعلون مالا یؤمرون، فمن جاھد ہم بیدہ فھو مؤمن، ومن جاھد ہم بلسانہ فھو مؤمن ومن جاھد ہم بقلبہ فھو مؤمن، لیس وراء ذلک

من الایمان حبة خردل

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے بعد اس کی امت میں اس کے حواریوں اور اصحاب نے اس کی سنت کو قائم نہ کیا ہو اور اس کے احکام کی پیروی نہ کی ہو۔ پھر ان کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جن کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا پس جو ان کے خلاف ہاتھ (قوت) سے جہاد کرے وہ مومن ہے' جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں انہیں برا سمجھے) وہ مومن ہے مگر اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

گویا ایسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ نبی اور اس کے حواریوں اور اصحاب کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ انحطاط' اضمحلال اور زوال شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں تین ادوار ہیں جن کو حضورؐ نے خیرِ قرون سے تعبیر فرمایا ہے یعنی نبی اکرم اور آپؐ کے صحابہؓ کا زمانہ۔ تابعین کا زمانہ اور پھر تبع تابعین کا زمانہ ایسے ادوار کے گزرنے کے بعد انحطاط و اضمحلال اور زوال کی صورت شروع ہوتی ہے۔ بعد میں آنے والوں کے قول و عمل میں تضاد ہوتا تھا۔ کہہ کچھ رہے ہیں کر کچھ رہے ہیں۔ زبان پر اسلام کا اقرار ہے' اس کی مداح سرائی ہے' عمل میں اسلام اور اس کے شعائر سے بغاوت ہے' سرکشی ہے' اعراض ہے' روگردانی ہے۔ پھر ان کے افعال و اعمال ایسے ہوتے تھے جن کا کوئی حکم' جن کی کوئی سند ان کے دین میں موجود نہیں ہوتی تھی۔

حدیث کے آخر میں ایمان کے جو درجات بیان کئے گئے ہیں ان سے اس ناخلف طبقہ کے خلاف اقدام سے جو عموماً مسندِ اقتدار پر متمکن ہوتا ہے نہایت گہرا تعلق ہے اس حصہ سے ہمیں اقدام کے لئے ہدایت و رہنمائی ملتی ہے۔ دل سے جہاد کا مفہوم یہ ہے کہ منکرات اور ان کے فروغ کو دیکھ کر ایک بندۂ مومن دل کی بے کلی میں مبتلا ہو جائے' وہ ہر وقت کڑھے' اس کی نیندیں حرام ہو جائیں۔ وہ اپنی بے بسی پر بے قرار اور مضطرب رہے۔ اس کے دل میں نفرت پروان چڑھتی رہے اور اس کا دل اس وقت کی جلد آمد کے لئے بے چین رہے کہ جس وقت وہ ایک منظم اسلامی انقلابی جماعت کے ساتھ مل کر نہی عن المنکر کے لئے میدان میں آسکے اور اپنے جسم و جان اور مال و منال کی قربانی کا نذرانہ پیش کر سکے۔ یا اگر اس میں صلاحیت و اہلیت ہے تو وہ خود کھڑا ہو اور ایسی انقلابی جماعت قائم کرنے کی سعی و جہد کرے۔

اس حدیث کا آخری حصہ جس کا حوالہ میں حضرت سعید الخدریؓ والی حدیث میں بھی دے چکا ہوں، نہایت لرزا دینے والا ہے۔ اس کو سن کر دن کا چین اور رات کا آرام حرام ہو جانا چاہیئے۔ اس لئے کہ ایسے شخص کے ایمان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفی فرما رہے ہیں جس کا دل بھی منکرات اور ان کے فروغ کو دیکھ کر بے قرار، مضطر اور بیکل نہیں ہوتا۔

ایسے شخص کے بارے میں کونین کے مفتی اعظم حضرت محمدؐ کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔

ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل

"اور جان لو کہ اس کے بعد ایمان رائی کے دانہ کے برابر بھی موجود نہیں ہے"۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ آخرت میں وہ لوگ کس مقام پر کھڑے ہوں گے جو اس دنیا میں قانوناً مسلمان اور مدعیٔ ایمان تھے اور مسندِ اقتدار پر بیٹھے منکرات کو فروغ دے رہے تھے۔ ان مدعیانِ ایمان کا کیا حال ہو گا جو ذرائع ابلاغ پر قابض تھے اور ان کو منکرات کی نشر و اشاعت کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ وہ لوگ کس حالت اور عالم میں ہوں گے جو حکمرانی کے بل بوتے پر منکرات کی سرپرستی کر رہے تھے اور ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کرنے کے باعث بن رہے تھے جس میں معروفات سسک رہے تھے اور منکرات کے فروغ کے باعث معاشرہ سنڈاس بن رہا تھا......

خلاصۂ بحث

میں نے مسلم شریف کی جو دو روایتیں آپ کے سامنے تشریح و توضیح کے ساتھ بیان کی ہیں، انہیں سامنے رکھئے۔ میرے نزدیک ان دونوں احادیث کو ہمارے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کلید کی حیثیت حاصل ہے اب راستہ یہ ہے کہ کسی مسلمان ملک میں دین کو اس کی کامل شکل میں قائم و نافذ کرنے کے لئے کوئی تحریک اٹھے۔ اس تحریک کے وابستگان خود اپنی انفرادی زندگیوں پر دین کو نافذ کر چکے ہوں۔ تربیت اور تزکیہ کے مراحل طے کر چکے ہوں۔ انہوں نے حرام کو بالفعل ترک کیا ہو اور سنت کو انہوں نے عملاً اختیار کیا ہو، پھر یہ لوگ منظم ہوئے ہوں، بنیان مرصوص بن چکے ہوں، یہ کسی تنظیم کے ساتھ منسلک ہو کر اس کے

ڈر اور قائد کے حکم پر ڈسپلن کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکے ہوں'
ع وطاعت کے عادی ہو چکے ہوں...... تو اب یہ لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام
قت کے ساتھ کریں گے! کھڑے ہو جائیں گے اور اعلان کریں گے کہ ہم منکرات کے
م نہیں ہونے دیں گے۔ یہ بات جان لیجئے کہ اپنے مطالبات منوانے کے لئے پرامن طور پر
ت کا مظاہرہ کرنا اب دنیا میں ہر ملک کے رہنے والوں کا تسلیم شدہ حق ہے اگر سیاسی حقوق
ی حصول اور بحالی کے لئے' مہنگائی کے خلاف یا کچھ دیگر قومی مسائل کے حل کے لئے
ظاہرے کئے جاسکتے ہیں' پکٹنگ اور گھیراؤ کیا جاسکتا ہے تو دین نے جن کاموں کو منکرات قرار
یا ہے ان کے خلاف مظاہرے کیوں نہیں کئے جاسکتے! ان کو چیلنج کیوں نہیں کیا جاسکتا! لیکن یہ
ظاہرے پرامن ہوں گے۔ کہیں فساد نہیں ہو گا' کسی کو تکلیف نہیں ہو گی۔ قومی دولت کا
ئی ضیاع نہیں ہو گا۔ اس تنظیم کے وابستگان ساری تکلیفیں اپنے اوپر جھیلنے کے لئے تیار ہوں
گے۔ ساری مصیبتیں خود برداشت کریں گے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر میدان میں نکلیں گے'
ر حکومتِ وقت گولیاں چلائے گی تو اپنے سینے پیش کریں گے۔

اگر یہ معاملہ ہو جائے اور یہ مرحلہ آجائے تو یہ بات جان لیجئے کہ آخر تا کجے۔ اس
سلمان ملک کی مسلمان پولیس کب تک لاٹھیاں برسائے گی اور مسلمان فوج کب تک گولیاں
چلا کر ان نہتے مظاہرین کو مارے گی جو صرف اللہ کے لئے منکرات کے خلاف نکلے ہوں۔ پھر
یہ فوج کتنوں کو مارے گی...... !! یہ بات بھی اچھی طرح جان لیجئے کہ کوئی جابر سے جابر حکمران
ھی ایک حد سے آگے نہیں جاسکتا۔

یران کی مثال............ اس کا سب سے بڑا نمونہ ہمارے سامنے شہنشاہ ایران
کا انجام ہے۔ وہ شاہ ایران جس کے پاس ایشیاء میں سب سے بڑا اسلحہ خانہ تھا' جس کے پاس
ساوک جیسی سفاک پولیس تھی' جس کے مقابلہ کی سفاک پولیس کسی کمیونسٹ ملک میں تو شاید
موجود ہو' باقی دنیا میں اس کے مقابلے کی کوئی پولیس موجود نہیں..... جس طرح کے مظالم اس
ایرانی پولیس نے ڈھائے ہیں اور جس خوفناک قسم کی اذیتیں (TORTURES) اس نے
دی ہیں' اس کی مثال موجودہ دور کے کسی ملک میں مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن شہنشاہ
ایران' جو خود کو "آریہ مہر" کہلواتا تھا جو سائرس ثانی بننے کا خواب دیکھ رہا تھا' اس کی ساری
طاقت' اس کا سارا دبدبہ ان سرفروشوں کی قربانیوں کے آگے خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ

گیاجواس کے خلاف مظاہروں کی صورت میں جان دینے کے لئے سڑکوں پر آگئے تھے اس کی پولیس عاجز آگئی اور فوج نے ان مظاہرین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کو اپنا ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا' حد تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد اسے اپنے وطن میں دفن ہونے کی جگہ بھی نہ مل سکی۔ اس کے دوست ملک نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسی مہلک متعدی مرض میں مبتلا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ جب ایک منظم انقلابی جماعت راہِ حق میں جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائے' تو اسے ملک کے عوام کی اتنی اخلاقی اور عملی حمایت حاصل ہو جاتی ہے کہ پھر اسے کچلنا اور ختم کر دینا آسان نہیں رہتا۔ ایسی جماعت کو بغاوت کا اعلان کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی نہ ہتھیار اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؏

"جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں"

کوئی طاقت ایسے جانبازوں اور سرفروشوں کا راستہ نہیں روک سکتی۔

تین ممکنہ نتائج........... اس طریقِ کار کے تین ممکنہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اگر ان مظاہروں کے نتیجہ میں پسپائی اختیار کرے۔ یعنی منکرات کو ختم کرنا شروع کر دے تو ہمیں اور کیا چاہئے ایک منکر کے بعد دوسرا منکر' دوسرے کے بعد تیسرا منکر۔ اگر ہم ایک ایک کر کے منکرات کو ختم کراتے چلے جائیں تو اسلامی انقلاب آجائے گا۔ تبدیلی برپا ہو جائے گی۔ پورے کا پورا نظام صحیح ہو جائے گا۔ لیکن جب تک نظام مکمل طور پر اسلامی نہیں ہو گا یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

دوسرا یہ کہ حکومتِ وقت اسے اپنی بقاء' اپنی انا اور اپنے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ بنا لے اور طاقت سے اس اسلامی تحریک کو کچلنے کی کوشش کرے...... اس موقع پر ذرا ٹھہر کر حکومت وقت' کی ماہیت و ہیئت کو سمجھ لیجئے کہ وہ کیا ہوتی ہے......! ہر حکومت کسی نہ کسی طبقہ کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کے کسی طاقتور طبقہ کے مفادات کی محافظ بن کر بیٹھی ہوتی ہے' اسلام کا نظامِ عدل وقسط ان طبقات کے لئے پیغام موت لے کر آتا ہے۔ لہٰذا حکومت وقت کسی ایسی تحریک کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتی جس کے کامیاب ہونے کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ استحصالی نظام ختم ہو جائے اور اسلام کا عادلانہ و منصفانہ نظام قائم و نافذ ہو جائے...... لہٰذا وہ ریاست کی پولیس اور فوج کو اس تحریک کو کچلنے کے

لئے بے دریغ استعمال کرے گی۔ لاٹھیاں برسیں گی، آنسو گیس کے شیل پھینکے جائیں گے، گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی، گرفتاریاں ہوں گی، دارورسن کے مراحل آئیں گے۔ لیکن اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان تک دینے پر تیار رہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی! جیلوں میں کتنی گنجائش ہوگی! کتنوں کو پھانسیاں دے گی! کتنوں پر لاٹھی چارج کرے گی! فوج کتنوں کو اپنی گولیوں سے بھونے گی! اگر تحریک کے کارکنوں نے صبرو ثابت قدمی کا ثبوت دیا تو میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی ہم مذہب اور ہم وطن ہیں۔ ہمارے ہی اعزاواقربا ہیں۔ یہ لوگ اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے میدان میں نہیں آئے ہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے نفاذ کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے نکلے ہیں تو آخر ہم کب تک ان کو اپنی گولیوں سے بھونتے چلے جائیں!! نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائے گا اور تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوگی جیسا کہ میں ایران کی مثال بیان کر چکا ہوں کہ شہنشاہ ایران جیسے آمر مطلق کو بھی ایسی صورت حال میں بہ حسرت و یاس ملک کو چھوڑ کر فرار ہونا پڑا...... تو یہ دو ممکنہ صورتیں تو تحریک کی کامیابی کی ہیں۔

ایک تیسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ حکومتِ وقت اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے، تو جن لوگوں نے اس راہ میں جانیں دی ہوں گی ، ان کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجرِ عظیم اور فوزِ کبیر سے نوازے جائیں گے انشاء اللہ العزیز۔ ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں البتہ اس کو بدلنے کی جدوجہد ہم پر فرض ہے مزید برآں انہی جان نثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے انشاء اللہ جلد یا بدیر کوئی نئی انقلابی اسلامی تحریک ابھرے گی جو طاغوتی استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی اور اس طرح وہ وقت آکر رہے گا جس کی خبر الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ پورے کرہ ارض پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا۔

اقول قولی هذا و استغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

PRESTO
FREEZERS
PRESTO
Manufactured By
SALEEM SONS
SALES OFFICE
FACTORY

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۱۲ نشست ۵۹

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۶)

الحمدللّٰہ و کفی و الصلوۃ و السلام علی عبادہ الذین اصطفٰی - اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم - بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (الحجرات - ۱۴)

صدق اللہ العظیم

"یہ بدّو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔ (یعنی ہم نے اطاعت قبول کرلی ہے) اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا' تاہم اگر تم اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال (کے اجر و ثواب) میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے' رحم فرمانے والا ہے"۔

معزز حاضرین اور محترم ناظرین...... یہ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۴ ہے' جس کی آپ

نے تلاوت بھی سماعت فرمائی اور ترجمہ بھی سنا۔ یہ بات نوٹ فرمالیجئے کہ ایک خاص مضمون کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی اہم ترین آیت ہے اور وہ خاص مضمون ہے 'ایمان اور اسلام کا فرق'۔ قرآن مجید میں اکثروبیشتر 'ایمان واسلام' اور 'مومن و مسلم' ہم معنی اور مترادف الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جو مومن ہے وہ مسلمان ہے اور جو مسلمان ہے وہ مومن ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے انگریزی میں ہم کہتے ہیں : 'CALL THE ROSE BY ANY NAME, IT WILL SMELL AS SWEET'

اس لئے کہ ایمان ایک باطنی کیفیت ہے جبکہ اسلام اس کا عالمِ واقعہ میں ظہور ہے۔ اب جس شخص میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ دل میں ایمان بھی ہے، عمل میں اسلام بھی ہے...... اسے آپ چاہے مومن کہیں، چاہے مسلم کہہ لیں، کوئی فرق واقع نہیں ہو گا۔ لیکن یہاں آپ نے ترجمہ سے نوٹ کیا ہو گا کہ اس آیۂ مبارکہ میں ان دونوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل لایا گیا ہے۔ ایک معین گروہ ہے جس کے دعوائے ایمان کی پرزور نفی کی گئی ہے۔ "لَمْ تُؤْمِنُوْا" میں نہایت مؤکد نفی ہے، اسی لئے میں نے ترجمہ میں لفظ 'ہرگز' کا اضافہ کیا تھا کہ "تم ہرگز ایمان نہیں لائے" ...... عربی زبان میں فعل ماضی میں نفی پیدا کرنے کیلئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماضی ہی پر "ما" کا اضافہ ہو جائے، جیسے مَا اٰمَنْتُمْ ...... "تم ایمان نہیں لائے ہو" ...... دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ فعل مضارع پر "لم" داخل کیا جائے۔ یہ تاکید کے لئے ہوتا ہے......

لَمْ تُؤْمِنُوْا "تم ہرگز ایمان نہیں لائے"۔ بات مکمل تھی، لیکن اسے یہ فرما کر مزید مؤکد کیا: وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ...... "اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا" ...... وہ تو صرف تمہاری زبانوں پر ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں ایمان کی تو نفی ہو گئی، نہایت مؤکد نہایت تاکیدی اسلوب سے...... بایں ہمہ ان کا اسلام تسلیم کیا جارہا ہے: وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا "البتہ تم کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، ہم مسلمان ہو گئے ہیں، ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے"۔ اس لئے کہ اسلام کے لفظی معنی ہیں TO GIVE UP RESISTANCE اور TO SURRENDER ۔ مقابلہ ومقاومت اور مخالفت ومزاحمت چھوڑ کر سرِ تسلیم خم کر دینا۔ اسے فارسی میں کہا جائے گا "گردن نہادن"۔ تو فرمایا گیا کہ یہ بدو کہہ سکتے ہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے۔

آگے فرمایا گیا وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا یعنی اگر تم اس اطاعت پر کاربند رہو گے، اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو

تمہارے اعمال قبول کر لئے جائیں گے' ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ تمہارا اسلام تسلیم ہے لیکن اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم ایمان لے آئے ہو تو یہ تمہارا بڑا مغالطہ ہے' اس کی تصحیح کر لو۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ "یقیناً اللہ نہایت بخشنے والا' بہت رحم فرمانے والا ہے"۔ یعنی یہ جو رعایت دی جا رہی ہے کہ قلبی ایمان کے بغیر تمہارے اسلام اور تمہاری اطاعت کو قبول کرنے اور تمہاری مغفرت کرنے' تم پر رحم فرمانے کی بشارت دی جا رہی ہے' وہ اس کی شانِ غفاری و رحیمی کے طفیل ہے۔ اس کی مزید وضاحت میں انشاء اللہ آگے کروں گا۔

اب ہم ذرا دو پہلوؤں سے اس آیت پر غور کریں گے۔ پہلے تو ہم اُس پہلو سے اس آیتِ مبارکہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جسے تاویلِ خاص کہتے ہیں' یعنی قرآن مجید کا جو زمانۂ نزول ہے اور جو حالات پس منظر میں ہیں' ان کے حوالے سے سمجھا جائے کہ وہ کون لوگ تھے جن سے یہ خطاب ہو رہا ہے۔ اس بات کی تفہیم کے لئے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے جو مختلف ادوار ہیں' ذرا ان کو ذہن میں لایئے۔ جب تک حضورؐ مکہ میں تشریف فرما رہے' سب کو معلوم ہے کہ مسلمان کمزور تھے' کفر کا غلبہ تھا' جو شخص اسلام قبول کرتا تھا' اسے ستایا جاتا تھا' طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں اور ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ لہٰذا صرف وہی شخص زبان پر کلمۂ شہادت لاتا تھا' جس کے دل میں یقین کامل پیدا ہو چکا ہوتا تھا۔ اتنا پختہ یقین کہ وہ اس کلمۂ حق کی ادائیگی پر اپنی جان کی قربانی دینے کیلئے ہمہ وقت تیار ہوتا تھا۔ اتنا گہرا یقین کہ وہ اس کلمۂ شہادت کو ادا کرنے پر دنیا کی ہر شے کو تج دینے کیلئے ہر وقت آمادہ ہوتا تھا۔ جب اس درجے میں اُس کے دل میں اللہ پر' اس کی توحید پر' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر اور بعث بعد الموت' حشر و نشر' جزا و سزا پر ایمان جاگزیں ہو جاتا تھا' تب وہ کہتا تھا: اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ...... یعنی وہاں ایمان پہلے تھا اور اسلام بعد میں آیا' لیکن ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تب حالات بدل گئے۔ اب اسلام کے غلبہ کا دور شروع ہوا۔ یثرب جو بعد میں مدینۃ النبی بنا' پہلے ایک 'شہری ریاست' تھی' پھر اس کا غلبہ بڑھتا چلا گیا۔ لہٰذا جیسے جیسے حالات بدلتے چلے گئے اور اسلام ایک غالب قوت کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا ویسے ویسے مکی دَور والی کیفیت بھی بدلتی چلی گئی۔ اب اُن مصائب و شدائد سے سابقہ پیش آنا ختم ہو گیا' جن کا سلسلہ مکہ میں بارہ تیرہ سال جاری رہا تھا۔

اس تبدیل شدہ صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ کچے پکے لوگ بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اب چونکہ کسی تشدد اور جور و تعدی کا کوئی خطرہ موجود نہیں تھا' لہٰذا لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ اوس و خزرج کے پورے کے پورے قبیلے ایمان لے آئے۔ ظاہر بات ہے کہ چشم زدن میں ان کے دلوں میں حقیقی ایمان جاگزین نہیں ہو جاتا تھا' چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ میں منافقین کی ایک جماعت کا ظہور ہونا شروع ہوا۔

پھر فتح مکہ کے بعد صورتحال بالکل بدل گئی۔ اب تو گویا عرب میں سب سے بڑی طاقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ جب قریش شکست کھا چکے اور طائف کے دو مضبوط قبائل ہوازن اور ثقیف بھی مغلوب ہو گئے تو اب عرب میں اور کون تھا جو جناب محمد رسول اللہؐ کے مدِمقابل آتا۔ لہٰذا تمام قبائل عرب میں ایک رو چلی۔ سب نے اپنی اپنی جگہ طے کیا کہ نبی اکرمؐ سے مقابلہ کرنے اور آپؐ کی مزاحمت کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب ہم آپؐ کی پیش قدمی میں مزاحم نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا خود ہی مدینہ چلیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کر لیں...... یہ ہے وہ نقشہ جو آخری پارے کی سورۃ النصر میں آتا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ○ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ○ کبھی یہ عالم تھا کہ مکہ میں مہینوں میں چند لوگ ہی ایمان لائے ہوں گے اور اب یہ منظر ہے کہ ہزاروں افراد کے قبیلے کا وفد دفعۃً آیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا یا بالفاظ دیگر اطاعت تسلیم کر لی۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اس اجتماعی فیصلے کے نتیجے میں ان کے دلوں کی کیفیت بھی چشم زدن میں بدل گئی۔ لہٰذا اب ایسے لوگ بھی وجود میں آ گئے جو مسلم تو ہیں' جنہوں نے اطاعت قبول کر لی ہے' جو کلمۂ شہادت ادا کر رہے ہیں' لیکن 'مومن' ہونا ابھی انہیں حاصل نہیں ہوا۔

یہ بات پیش نظر رکھئے کہ جتنے قبائل بھی ایمان لائے ان میں سب کی کیفیت یہ نہیں تھی۔ البتہ کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی تھے جن سے یہ خطاب ہو رہا ہے۔ اعراب یعنی بدوؤں کے بارے میں سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۹۹ میں یہ وضاحت موجود ہے: وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰہِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ ؕ سَیُدۡخِلُہُمُ اللّٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ○ "اور بدوؤں' بادیہ نشینوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور یوم آخر پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے اور رسول

(صلی اللہ علیہ وسلم) سے دعائیں لینے کا ذریعہ بنانے کے لئے۔ یاد رکھو ان کا خرچ کرنا بے شک موجبِ قربت ہے۔ اللہ ان کو ضرور اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ بے شک اللہ نہایت مغفرت فرمانے والا' بڑا رحم فرمانے والا ہے"...... یہ آیتِ مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سب بدّو ایسے نہیں تھے۔

اب ذرا اس آیتِ مبارکہ پر تاویلِ عام کے اعتبار سے غور کیجئے۔ اب اگر ہم اپنی صورتحال پر غور کریں گے تو ہمیں محسوس ہو گا کہ ہماری عظیم اکثریت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہم نے اپنے انتخاب (CHOICE) سے تو ایمان قبول نہیں کیا۔ ہمیں دولت ایمان سوچ سمجھ کر' اپنے فیصلے سے حاصل نہیں ہوئی' بلکہ ہمیں تو اسلام وراثتاً مل گیا ہے۔ وہاں فتحِ مکہ کے بعد ایک رو چلی تھی کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں ایک نسلی تسلسل ہے' ایک سلسلہ ہے جو نسل کی وجہ سے منتقل ہو رہا ہے۔ تو ہم میں سے بھی اکثر و بیشتر درحقیقت اسی آیت کا مصداق ہیں۔ الا ماشاء اللہ جن کو اللہ تعالیٰ حقیقی و قلبی ایمان وایقان کی دولت نصیب فرمادے۔ اور بہرحال ایسے افراد ہر دور میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں' لیکن اگر ہم اکثریت کو سامنے رکھ کر غور کریں گے تو معاملہ اُسی مقام پر نظر آئے گا کہ اسلام ہے' کلمۂ شہادت ہے' لیکن دلی یقین والی کیفیت شاذ و نادر ہی نظر آئے گی۔ وہ یقین جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی' کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

تو یہ یقین عنقا ہے۔ یہ شے وہ ہے جو شاذ شاذ ہی نظر آتی ہے۔

اب اگر ہم اس صورتحال کو سامنے رکھ کر اس آیت پر مزید غور کریں تو ایک بات ہمارے لئے بڑی امید افزا ہے' نویدِ جانفزا ہے کہ جیسے ان بدّوؤں سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے سینوں میں جھانکو اور تمہیں محسوس ہو کہ وہ یقین والی بات حاصل نہیں ہے تو بھی مایوس نہ ہو..... "اگر تم اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت پر کاربند رہو گے تو ہم تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کریں گے"۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی رعایت ہے۔ غور کیجئے کہ اگر منطقی اور اصولی طور پر بات سمجھی جائے تو وہ یہ ہو گی کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہونا چاہئے' لیکن یہاں رعایت دی جارہی ہے کہ کوئی شخص اپنے دل کو ٹٹولے اور

محسوس کرے کہ یقین والی کیفیت موجود نہیں ہے تو بھی مایوس نہ ہو۔ اس حالت و کیفیت میں بھی اگر تم اطاعت پر کاربند رہو گے' نافرمانیوں سے بچو گے تو ہم تمہارے اعمال قبول کر لیں گے۔ ان میں کوئی کمی اور کٹوتی نہیں کریں گے۔

اب ذرا پھر غور کیجئے کہ آیت کا اختتام اللہ تعالیٰ کی کن صفات پر ہو رہا ہے! فرمایا : اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ "اللہ غفور ہے' رحیم ہے"۔ یہ اس کی شانِ غفاری کا صدقہ اور اس کی شانِ رحیمی کا طفیل ہے کہ وہ تمہارے ساتھ یہ نرمی برت رہا ہے۔ تمہیں یہ رعایت دے رہا ہے کہ اگر ایمانِ حقیقی اور یقینِ قلبی میسّر نہ ہو تب بھی اگر تم اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال قبول کر لئے جائیں گے۔ تمہارے اجر و ثواب میں ذرّہ برابر کوئی کمی اور کٹوتی نہیں ہو گی : لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

البتہ اس میں ایک انتباہ بھی ہے کہ اسے کہیں انسان اپنے لئے ایک کھلا لائسنس نہ سمجھ لے' کھلی چھٹی نہ سمجھ بیٹھے۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ حقیقی ایمان کے حصول کی کوئی کوشش ہی نہ کرے۔ اس لئے کہ از روئے قرآن مغفرت کے لئے کلّی اطاعت مطلوب ہو گی۔ جزوی اطاعت' اطاعت نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعض احکام مان لینا اور بعض احکام کو ترک کر دینا' بعض کو سر آنکھوں پر رکھنا اور بعض کو پاؤں تلے روند دینا' یہ اطاعت نہیں ہے۔ یہ جسارت ہے' یہ ڈھٹائی ہے' یہ گستاخی ہے۔ یہ اللہ کے ساتھ تمسخر و استہزاء ہے۔ وہ جو کہتے ہیں بازی بازی باریش بابا ہم بازی! یہ کھیل تم اللہ کے ساتھ کھیل رہے ہو! یہ مذاق تم اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کر رہے ہو! نماز پڑھنے کا حکم کس کا ہے؟ اللہ کا! وہ تو ہم پڑھیں گے۔ اللہ ہی کا حکم ہے روزہ رکھو' ہم رکھیں گے' اللہ ہی کا حکم ہے کہ رشوت نہ لو' لیکن اُسے ہم نہیں مانیں گے۔ اس کے کیا معنی ہیں! کہ اللہ کے بعض احکام کو تو سر آنکھوں پر رکھا اور بعض کو پاؤں تلے روند دیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ جسارت ہے' ڈھٹائی ہے' اللہ کے جناب میں بہت بڑی گستاخی ہے۔ اس پر سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں جو تنبیہہ کی گئی ہے' اُسے میں آپ حضرات کے سامنے لانا چاہتا ہوں وہاں فرمایا گیا اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ "کیا ہماری کتاب اور شریعت کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے"؟ ——

___ سود کی حرمت بھی تو اسی قرآن میں ہے۔ رشوت لینے اور دینے سے منع بھی تو اسی شریعتِ اسلامی نے کیا ہے' جس میں عباداتِ مفروضہ کا حکم ہے۔ اسی رویّہ کے متعلق فرمایا: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ یہ رویّہ اور یہ وطیرہ اختیار کرنے والوں کیلئے آگے وعید آئی ہے: فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا "پس کوئی سزا نہیں ہے اُس شخص کی جو تم میں سے یہ طرزِ عمل اختیار کرے گا سوائے اس کے کہ اسے دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر دیا جائے"۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ "اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔ اور جان لو کہ اللہ غافل اور بے خبر نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو"۔ تم لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہو' تم لوگوں کی زبانیں بند کر سکتے ہو لیکن اللہ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے۔

تو یہ ہے نہایت زوردار انتباہ...... کسی وقت کوئی خطا ہو جائے' وہ بات اور ہے...... جذبات سے مغلوب ہو کر انسان کوئی غلطی کر بیٹھا' یہ بات اور ہے۔ وہ فوراً رجوع کرے گا' توبہ کرے گا۔ توبہ پر ہماری ان مجالس میں بڑی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ راہ چلتے ہوئے کہیں پھسل کر کیچڑ میں گر جائیں تو وہاں پڑے نہیں رہتے' بجلی کی طرح اٹھتے ہیں۔ یہی معاملہ توبہ کا ہے۔ پاؤں پھسل سکتا ہے' لغزش ہو سکتی ہے۔ انسان کسی معصیت میں' کسی گناہ میں' کسی غلط کام میں ملوث ہو سکتا ہے۔ ماحول کے کچھ وقتی اثرات غالب آ جائیں' کسی وقت نفس میں کوئی طوفان آ گیا ہو' جس کے باعث آپ کے حواس مختل ہو جائیں' آپ جذبات کی شدّت سے مغلوب ہو جائیں اور آپ کوئی غلط کام کر بیٹھیں۔ تو اگر اللہ کا خوف ہے' خدا ترسی ہے' آخرت کا استحضار ہے تو آپ ہوش میں آتے ہی رجوع کریں گے' پلٹیں گے' ندامت اور پشیمانی ہو گی۔ آپ اپنی خطا کا اللہ کے سامنے اقرار کریں گے' سچے دل سے توبہ کریں گے۔ گڑگڑا کر اس سے استغفار کریں گے' اس سے عفو کے طالب ہوں گے تو آپ کے ساتھ معاملہ یہ ہو گا ؂

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

وقتی طور پر خطا کا صدور ہو جانا' کوئی گناہ کر بیٹھنا' کسی معصیت کا ارتکاب ہو جانا' بالکل دوسری بات ہے لیکن کسی معصیت پر مستقل ڈیرہ لگا کر بیٹھ جانا' اپنی زندگی میں کسی حرام کام کو

مستقل طور پر جاری رکھنا' یہ بالکل وہی بات ہے کہ:..... اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ..... اس وطیرے اور رویئے پر جو وعید آئی ہے اس کے تناظر میں آپ نے محسوس کرلیا ہو گا کہ ہم جو یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ ۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

یعنی ہم دنیا میں کیوں ذلیل ہو گئے! کیوں رسوا ہو گئے اور اس ذلّت و رسوائی میں اضافہ کیوں ہوتا چلا جارہا ہے' تو اس کا جواب سورۃ البقرۃ کی اسی آیت میں موجود ہے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ہم نے شریعت اسلامی کے حصے بخرے کر رکھے ہیں کہ ایک کو مانیں گے' ایک کو نہیں مانیں گے۔ اسی گستاخانہ رویئے کی سزا بیان ہوئی:..... خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ "دنیا کی زندگی میں رسوائی' ذلت اور خواری"۔ یہی سزا ہے جو ہمیں مل رہی ہے اور اسی رویّہ کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آخرت کے عذاب کا مستحق بنا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری و رحیمی سے اگر چھٹکارا مل جائے تو بات دوسری ہے۔

اس آیتِ مبارکہ کے بارے میں اب آخری بات نوٹ کیجئے۔ اپنی جگہ پر اس کا یہ مضمون بہت اہم ہے کہ اس میں اسلام اور ایمان کو علیٰحدہ کر دیا گیا..... اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس مضمون کے اعتبار سے یہ آیت قرآن مجید کی چوٹی (CLIMAX) ہے' ذروۃ السنام ہے..... اب سوال یہ ہے کہ سورۃ الحجرات میں مسلمانوں کی حیاتِ ملی کے جو مضامین آرہے ہیں' اُن سے اس کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لئے کہ ہر سورۃ کا جو مرکزی مضمون ہے اس کی تمام آیات اس کے ساتھ مربوط ہوں گی ...... وہ ربط یہ ہے کہ چاہے مسلمانوں کے معاشرے میں شمولیت و شرکت کا معاملہ ہو' چاہے اسلامی ریاست کی شہریت کا معاملہ ہو' ان دونوں کی بنیاد اسلام ہے' ایمان نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تو قانونی معاملہ ہے۔ ایک مسلمان مرد کی شادی ایک مسلمان عورت سے ہو سکتی ہے اور ایک مسلمان عورت کا نکاح صرف ایک مسلمان مرد سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان باپ کی وراثت مسلمان اولاد ہی کو منتقل ہو سکتی ہے۔ یہ خالص قانونی مسئلہ ہے۔ اسلامی ریاست کا شہری مسلمان ہو گا۔ اسلام اس کی بنیاد ہے۔ لہٰذا طے کرنا پڑے گا کہ کون مسلمان ہے' کون نہیں ہے۔ جبکہ جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو وہ ایک باطنی کیفیت ہے' وہ دل میں ہوتا ہے۔ دل میں یقین ہے یا نہیں' اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ آج بھی ہمارے پاس کوئی آلہ اور ذریعہ موجود نہیں ہے کہ جس کی مدد سے ہم یہ طے

کر سکیں کہ کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں ہے۔ لہٰذا دنیا میں مسلمان معاشرے میں کسی کی شرکت و شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد اسلام ہے' ایمان نہیں ہے۔ البتہ آخرت میں ہمارا جو انجام ہونا ہے اس کی بنیاد ایمان ہے...... اور اب سوال پیدا ہو جائے گا کہ حقیقی ایمان کسے کہتے ہیں اور اس کے خصائص کیا ہیں!...... وہ ہے اس سورۂ مبارکہ کی اگلی آیت کا موضوع جسے انشاء اللہ ہم اگلی نشست میں پڑھیں گے۔ آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے ضمن میں کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

○ س...... ڈاکٹر صاحب' آپ نے اس آیت کی روشنی میں اسلام اور ایمان کا فرق واضح فرمایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام اور نفاق میں کیا فرق ہے؟

☆ ج...... اصل میں' میں نے نفاق کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اس آیتِ مبارکہ میں اس کا ذکر نہیں ہے' اس میں اسلام اور ایمان ہی کا ذکر ہے۔ بعض لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے کہ یہاں جن لوگوں سے خطاب ہے' شاید وہ منافق ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے' اس لئے کہ منافق کا تو کوئی بھی عمل قبول نہیں کیا جائے گا۔

لیکن یہاں جن اعراب کا تذکرہ ہے' ان کے اعمال کو قبول کرنے کی سند دی جارہی ہے۔ لہٰذا یہ منافق نہیں ہو سکتے۔ اب اگر آپ چاہیں تو ایک تقسیم اپنے ذہن میں رکھ لیں' وہ بہت مفید ہوگی۔ وہ یہ کہ قانونی سطح پر تو تقسیم ہے صرف ایک' اور وہ ہے مسلم اور غیر مسلم کی۔ کوئی شخص مسلم ہوگا یا غیر مسلم۔ اُسے آپ کافر کہیں گے۔ وہ یہودی ہو' نصرانی ہو' مجوسی ہو' بت پرست ہو' کچھ بھی ہو' اس کے لئے ایک لفظ ہوگا غیر مسلم۔ البتہ جو مسلم ہے' اس کی ایک حالت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دل میں نفاق ہو۔ منافق بھی قانوناً مسلمان ہی شمار ہوتا ہے۔ دوسری کیفیت یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے دل میں ایمان کا نور موجود ہو تو وہ مومنِ صادق ہو گیا۔ ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دل میں نہ تو نفاق ہو اور نہ ایمان ہو۔ دل میں کچھ بھی نہیں ہے' نہ نیت کا فساد' نہ مسلمانوں کو دھوکہ دینا مقصود ہے۔ لیکن ایمانِ حقیقی بھی ابھی دل میں داخل نہیں ہوا۔ یہ کیفیت خلاء کی ہوگی اور یہی کیفیت ہے جو اس آیتِ مبارکہ میں بیان ہوئی۔ ورنہ اگر دل میں نفاق ہو تو اس کا کوئی عمل بھی قبول نہیں ہو سکتا۔ اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح حقیقی ایمان کا ظہور ایک مسلمان کے خارج میں اعمالِ صالحہ یعنی اسلام کی صورت میں ہوتا ہے' اسی طرح اخلاص کے ساتھ کلّی اطاعت پر کاربند اور پابند رہنے

کی صورت میں دل میں حقیقی ایمان کا نور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

○ س..... ڈاکٹر صاحب' یہ فرمائیے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں؟

☆ ج..... محدثین کرامؒ میں سب سے بڑے محدّث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ فقہائے کرامؒ میں سیّد الفقہاء امام اعظم' امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔ امام بخاریؒ اس کے قائل ہیں کہ ایمان بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:..... یزیدوَ ینقص ..... امام ابو حنیفہؒ اس کے قائل ہیں کہ ایمان نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے' وہ فرماتے ہیں:..... لا یزید ولا ینقص ..... ان دونوں حضرات کی آراء میں اس طور پر مطابقت کی جا سکتی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ چونکہ فقیہہ ہیں' للہذا وہ قانونی ایمان کی بات کر رہے ہیں۔ دنیا میں انسان کو جو قانونی تشخّص حاصل ہوتا ہے وہ جامد ہے' وہ نہ گھٹے گا' نہ بڑھے گا۔ اگر ایک شخص کے دو بیٹے ہیں' ایک بہت متقی و صالح ہے' دوسرا فاسق و فاجر ہے' لیکن ہے مسلمان' تو باپ کی وراثت دونوں کو برابر ملے گی۔ یہ نہیں ہو گا کہ متقی و صالح کو زیادہ ملے' تہجد گزار کو زیادہ حصہ ملے اور دوسرے فاسق و فاجر اور بے نمازی کو کم حصہ ملے..... البتہ جو یقین والا ایمان ہے' قلبی ایمان ہے' وہ گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے۔ قلب کی کیفیت ایک جیسی رہتی ہی نہیں' وہ تو الٹتا پلٹتا رہے گا۔ قرآن مجید کی تلاوت کیجئے' ایمان بڑھے گا۔ صاحبِ یقین کی صحبت میں بیٹھئے' یقین میں اضافہ ہو گا..... لغو اور بے ہودہ مشاغل اختیار کیجئے' برے لوگوں کی صحبت میں بیٹھئے' عباداتِ مفروضہ کو ترک کیجئے' لازماً دل والے حقیقی ایمان میں کمی واقع ہو گی۔

حضرات! آج ہم نے اسلام اور ایمان کے فرق کے متعلق بہت اہم مسائل کو سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمانِ حقیقی سے بہرہ مند کرے۔ اسلام بھی بہت بڑی دولت ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں یہ دولت وراثتاً عطا فرما دی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم کا شکر ہم پر واجب ہے اور وہ اس طرح ادا کیا جانا چاہیے کہ ہم پورے اسلام کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنائیں اور اپنے قلوب میں ایمان حقیقی اور یقین قلبی کی شمع روشن کرنے کی شعوری کوشش کرتے رہیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

اَللّٰھُمَّ من احییتہ مِنّا فاحیہٖ علی الاسلام و من توفیتہ منا فتوفہ علی الایمان

و اٰخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیت

داعیِ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک پُر تاثیر اور فکر انگیز خطاب

ترتیب و تسوید (شیخ) جمیل الرحمٰن

(۳)

تین تکمیلی مراحل

سیرتِ مطہرہ سے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام کے جو تین تکمیلی مراحل میں نے اخذ و مستنبط کئے ہیں، انہیں گنتی کے اعتبار سے میں چوتھا، پانچواں اور چھٹا مرحلہ کہتا ہوں وہ ہیں صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) - اقدام (ACTIVE RESISTANCE) اور مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) ـــــ ان میں سے چوتھا مرحلہ یعنی صبرِ محض تو پہلے مرحلہ یعنی دعوت و تبلیغ کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے جس کی وضاحت آگے بیان ہوگی۔ اس موقع پر بغرضِ تفہیم میں اسے علیحدہ بیان کر رہا ہوں۔

ان تینوں مراحل کا ایک جامع عنوان ہے تصادم ـــــ لفظ ثقیل بھی ہے اور میں نے اسے بارعب انداز سے بولا بھی ہے۔ آپ حضرات چونک گئے ہوں گے کہ میں تصادم کی بات کر رہا ہوں ـ لیکن اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انقلاب کے لئے تصادم ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں آسکتا۔ جسے پسند نہ ہو وہ گھر بیٹھے ؎

تپتی راہیں مجھے پکاریں — دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

اب اس بات کو سمجھئے کہ تصادم سے مراد کیا ہے؟ پھر یہ کہ تصادم شروع کون کرتا ہے!!

جان لیجئے کہ تصادم کا آغاز کرنے والے انقلابی ہوا کرتے ہیں ــــ سیرتِ طیبہؐ کے متعلق عام طور پر جو باتیں بیان کی جاتی ہیں، میں ان کے بالکل برعکس باتیں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

تصادم سے مراد: غور کیجئے کہ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت عرب میں ایک نظام قائم ہے۔ صحیح ہے یا غلط۔ اس بات کو نظر انداز کر دیجئے اور دیکھئے کہ لوگ اس نظام کے تحت رہ رہے ہیں اور اس نظام سے مطمئن ہیں ــــ مکّہ کو ام القریٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ جس میں قریش کا قبیلہ آباد ہے۔ مکّہ ہی میں بیت اللہ واقع ہے جو خالص توحید کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ بقول "دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا" ــــ لیکن وہاں بت رکھے ہوتے ہیں ــــ عرب کے لوگ اسے مقدس سمجھتے ہیں پھر خاص کعبۃ اللہ کے اندر طاقچوں میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے ہیں۔ ان بتوں کو پوجا جا رہا ہے۔ ان کی پرستش ہو رہی ہے۔ ان پر چڑھاوے چڑھائے جا رہے ہیں، مزید برآں پورے عرب میں جگہ جگہ استھان ہیں جہاں بتوں کی پوجا ہو رہی ہے ــــ پھر مکّہ میں غلام بھی ہیں جو پس رہے ہیں، لیکن وہ اپنی قسمت پر قانع ہیں۔ کوئی بےچینی نہیں ہے، کوئی ہلچل نہیں ہے، کوئی تحریک نہیں ہے۔ کوئی ردّ عمل نہیں ہے۔ یوں سمجھئے کہ جیسے ایک تالاب میں پانی پُرسکون ہو۔ اب اس تالاب میں اگر کوئی پتھر مارے تو ظاہر ہے کہ پانی میں ہلچل ہوگی! اب ذرا غور کیجئے کہ اس پُرسکون تالاب میں پہلا پتھر کس نے مارا؟ ــــ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ــــ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ، یہ تھا پتھر جو مکّہ کی پُرسکون فضا میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مارا۔ یہ انقلابی نعرہ تھا۔ یہ بغاوت کا نعرہ تھا جو نبی اکرمؐ نے لگا۔ اس کلمۂ توحید سے ان کے اخلاق کی نفی، ان کی معاشرت کی نفی، ان کے مذہب کی نفی، ان کے اعتقادات کی نفی ــ اور ان اعتقادات کی بنیاد پر ان کے رائج الوقت نظام کی کلّی نفی ہو رہی ہے۔

کلمۂ توحید کی جامعیّت اور اس کے اہداف

اب اصل بات سمجھئے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ محض اعتقادی بحث و نزاع تھی۔ یہ محض RELIGIOUS CONTROVERSY تھی۔ یہ بات نہیں تھی بلکہ یہ ان کے نظام کی اور ان کے مفادات کی نفی تھی، اس لئے کہ انہوں نے بیت اللہ کو جو بتوں سے آباد کیا ہوا تھا اور کعبۃ اللہ میں جو تین سو ساٹھ بت رکھ چھوڑے تھے تو یہ یوں ہی نہیں تھا بلکہ اس مشرکانہ نظام سے ان کے معاشی و سیاسی مفادات وابستہ تھے۔ پورے عرب کے "خدا"، ان کے پاس گویا بطور یرغمال رکھے ہوئے تھے۔ تمام قبائل عرب کا سب سے بڑا مذہبی مرکز کعبہ اور اس کے متولی قریش۔ تو اس طرح

قریش کو پورے عرب پر مذہبی فوقیت و سیادت حاصل ہو گئی تھی ــــ عرب جیسا ملک جس کے کثیر تعداد میں قبائل کا پیشہ غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ اس صورت حال میں یہ ممکن نہ تھا کہ ان کی دست برد سے کسی دوسرے قبیلہ کا تجارتی قافلہ بچ کر جاسکے' یہ بہت مشکل تھا۔ لیکن قریش کے قافلوں کی طرف کوئی بھی قبیلہ نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

قریش کی مذہبی و معاشی سیادت کے اسباب: غور کیجئے کہ ایسا کیوں تھا؟ ۔ یہ اس لئے تھا کہ ان کے "خدا" قریش کے پاس رکھے ہوئے ہیں: HOSTA GES ہیں' یرغمالی ہیں۔ پھر دورِ جاہلیت سے عربوں میں ذی الحجہ میں حج کے مناسک کو ادا کرنے کا سلسلہ ایک عظیم مذہبی عبادت کے طور پر رائج و قائم تھا۔ دورانِ سال عمرے کا رواج بھی باقی تھا۔ اور قریش بیت اللہ اور کعبۃ اللہ کے مجاور و متولی تھے۔ ان کو ناراض کر کے حج اور عمرے کی قدیم "عظیم عبادت" کو ادا کرنا ناممکن تھا۔ یہ وجوہ تھیں جن کے باعث قریش کو پورے عرب کے اندر وہ سیاسی و مذہبی قیادت اور معاشی منفعت حاصل تھی کہ ان امور میں پورے عرب میں ان کا کوئی مدِ مقابل ہی نہیں تھا۔ اس دور میں پورے مشرق (EAST) اور مغرب (WEST) کے مابین جو تجارت ہوتی تھی۔ ایک طویل عرصے سے اس کی کڑی اور واسطہ (LINK) قریش بنے چلے آرہے تھے۔ عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ یمن کے ساحل پر جزائر عرب الہند' انڈونیشیا' ملائشیا' ہندوستان کا تجارتی سامان اترتا تھا اور مشرقی یورپ کا تجارتی سامان شام اور فلسطین کے ساحلوں پر اترتا تھا۔ ان ساحلوں کے درمیان تجارت کی کڑی (LINK) تھے قریش۔ ان کے قافلے اِدھر یمن کے ساحل سے سامان خرید کر اُدھر شام و فلسطین کے ساحلوں تک پہنچاتے۔ پھر وہاں سے یورپ کا سامان خرید کر اِدھر یمن کے ساحل پر لا کر فروخت کرتے تھے[1]۔ اس طرح پورے عرب میں معاشی طور پر قریش کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جس کے سبب سے وہ نہایت امیر و کبیر تھے اور بہت عیش و آرام نیز امن و سکون میں بھی تھے۔ ان کے تجارتی قافلوں کو تحفظ کی ضمانت اسی بنیاد پر حاصل تھی کہ عرب کے تمام قبائل کے "آلِهَه" ان کے پاس کعبہ شریف میں بطور یرغمال رکھے ہوئے تھے۔ پھر حج و عمرہ کے مناسک کے مقامات پر ان کا تسلط تھا۔ ان کی اجازت اور مرضی کے بغیر ان کی ادائیگی ناممکن تھی۔

---

[1] اسی کی طرف اشارہ ہے قرآن مجید کی سورۃ القریش میں : لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝ (مرتب)

معاشی خوشحالی کا ایک اور سبب: مزید برآں قریش کی آسودہ حالی کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ عرب کے تمام قبائل حج، عمرہ اور زیارت کے لئے جب بھی مکہ آتے تھے تو ان بتوں پر چڑھاوے چڑھاتے جو بیت اللہ اور کعبۃ اللہ میں رکھے ہوتے تھے۔ غور کیجئے کہ آخر وہ چڑھاوے کہاں جاتے تھے! ظاہر ہے کہ ان بتوں کے پیٹ میں جانے سے تو رہے!! یہ چڑھاوے حسب مراتب قریش کے چودھریوں اور سرداروں میں تقسیم ہوتے تھے۔ لہٰذا اس مشرکانہ نظام کی بدولت ان کی معیشت بہت مضبوط تھی۔

روزِ روشن کی طرح عیاں بات: اب آپ خود ہی نتیجہ نکال لیجئے کہ اس پورے مشرکانہ نظام کے خلاف نعرۂ بغاوت ' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ '، کس نے بلند کیا! پُرسکون تالاب میں پہلا پتھر کس نے مارا اور ہلچل کس نے پیدا کی! پھر دیکھئے کہ یہ پتھر کہاں کہاں لگ رہا ہے! اس کی چوٹ کہاں کہاں تک پہنچ رہی ہے! ـــ پس ثابت ہو گیا کہ تصادم شروع کرنے والے تھے: اسلامی انقلاب کے داعی، جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

چوتھا مرحلہ ـــ تشدّد و تعذیب پر صبرِ محض

جیسا کہ میں عرض کر چکا کہ گنتی کے اعتبار سے میں صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) کو چوتھا مرحلہ شمار کر رہا ہوں، ویسے یہ مرحلہ پہلے ہی مرحلے یعنی انقلابی دعوت و تبلیغ کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی دعوت کو جو خالص توحید کی بنیاد پر اُٹھے، رائج الوقت مشرکانہ معاشرہ اور نظام اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے نظام کے تحفظ کے لئے RETALIATE کرتا ہے۔ ردّعمل کا اظہار کرتا ہے اور تشدّد و تعذیب کا آغاز کرتا ہے۔

تشدّد اور تعذیب کے دو مرحلے: سیرتِ طیبہ میں ہمیں اس تشدد کے دو مراحل ملتے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ کہ توحید کی انقلابی دعوت کے داعی اوّل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین سال تک زبانی کلامی تشدد کا ہدف بنایا گیا ہے، آپ کا تمسخر اور استہزاء ہوا ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد، آپؐ کو مجنونی، دیوانہ (FANATIC) کہا گیا ہے، ساحر و شاعر اور کاہن کہا گیا ہے۔ الغرض حضورؐ کو ذہنی اذیت اور کوفت پہنچانے اور آپؐ کی شخصیت کو مجروح کرنے اور آپؐ کی کردار کشی کرنے کے لئے تمام حربے استعمال کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اعلانِ نبوت سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں کی آنکھوں کا تارا تھے۔ وہ

آپ کا تذکرہ الامین اور الصادق جیسے معزز خطابات اور القابات سے کرتے تھے ـــــ لیکن
اعلانِ نبوت کے ابتدائی تین سالوں تک اعصاب شکنی کی پوری کوشش ہوتی رہی ہے تاکہ آپ ؐ
کے اعصاب ٹوٹ کر اور بکھر کر رہ جائیں۔ آپؐ میں وہ ہمت باقی نہ رہے کہ کھڑے رہ کر دعوتِ
توحید پیش فرماتے رہیں ـــــ ان تین سالوں میں نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی جسمانی تشدد ہوا ہے
ورنہ آپؐ کی دعوت قبول کرنے اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کو تعذیب کا نشانہ بنایا گیا ہے۔
چونکہ ان کا خیال تھا کہ اعصابی جنگ میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ ارادی کو ختم اور آپؐ کے اندر
جو آہنی عزیمت ہے، اسے پگھلا کر رکھ دیں گے۔ اس طرح آپؐ پر ایمان لانے والوں کو بآسانی اپنے
آبائی دین کی طرف لوٹا لائیں گے، ان کو RE-CLAIM کرلیں گے۔

دوسرا مرحلہ: آغازِ وحی کے چوتھے سال کے شروع میں دارالندوہ میں سرداران قریش باقاعدہ
مشورہ کرتے ہیں کہ اب تک ہم نے جو تدبیریں اختیار کی ہیں وہ ناکام ہو چکی ہیں،
ہماری حکمتِ عملی کامیاب اور مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔ یہ دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے بلکہ یہ
آگ ہمارے بارود خانوں تک پہنچ گئی ہے۔ ہمارے غلاموں کے طبقہ کے لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے
حلقہ بگوش ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہمارے نوجوانوں میں آپؐ کی دعوت نفوذ کر رہی ہے جو ایک بڑے
خطرے کی علامت ہے۔ چنانچہ وہ اس مشاورت میں طے کرتے ہیں کہ اب ان اہلِ ایمان پر جسمانی
تشدد کرو، ان کو اتنا مارو کہ ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ ہم میں سے جس کسی کو بھی جس پر کوئی اقتدار
اختیار حاصل ہے وہ ان پر ہر نوع کا تعذیبی حربہ استعمال کرے، انہیں جور و تعدی اور ظلم و ستم کا
نشانہ بنائے تاکہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دامن چھوڑ کر اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ سکیں ـــــ
اب شدید قسم کے PERSECUTION کا ہدف بننے شروع ہوتے ہیں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
بھی اور قریباً تمام اہلِ ایمان بھی۔

حضورؐ پر تشدد: محبوب ربانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گردن مبارک میں چادر کا پھندا
ڈال کر آپؐ کا گلا گھونٹنے کی کوشش ہوتی ہے کہ آنکھیں ابل پڑنے کو ہو گئی
تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورؐ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو اتنا مارا جاتا ہے کہ
ان کے لالے پڑ جاتے ہیں ـــــ حرم شریف میں عین سجدے کی حالت میں رحمتِ عالم علیہ
الصلوٰۃ والسلام کے مبارک شانوں پر اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھ دی جاتی ہے محبوب رب العالمین ؐ
جب صبح منہ اندھیرے اپنے گھر سے اللہ کی عبادت کی غرض سے بیت اللہ تشریف لے جانے

کے لئے نکلتے ہیں تو آپؐ کی راہ میں کانٹے اور گوکھرو بچھا دیئے جاتے ہیں اور پائے مبارک کے تلوے زخمی ہو جاتے ہیں ـــــ رحمۃ للعالمینؐ کے گھر میں آپؐ کے پڑوسی جو آپؐ کے سگے چچا اور چچی ہیں (ابولہب اور اس کی بیوی)، کوڑا کرکٹ حتیٰ کہ غلاظت پھینکتے رہتے ہیں ـــــ داعئ الی اللہ جب دعوت و تبلیغ کے لئے مکہ آنے والے کسی قافلے کے لوگوں کے پاس جاتے ہیں تو چند سرداران قریش جن میں ابولہب پیش پیش ہوتا ہے، آپؐ کے پیچھے غُل غپاڑا کرتے چلتے ہیں کہ لوگو، انؐ کی بات نہ سننا یہ مجنون ہیں، دیوانے ہیں، ساحر ہیں' ـــــ پھر معاشی و معاشرتی مقاطعہ ہے۔ تین سال کی شعب بنی ہاشم کی قید اور محصوری ہے۔ جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنی ہاشم کا پورا قبیلہ (ابولہب کے علاوہ) جن کی عظیم اکثریت اس وقت تک ایمان بھی نہیں لائی تھی اس جرم کی پاداش میں قید کر دیا گیا ہے کہ وہ قبائلی روایات کی بنیاد پر حضورؐ کے پشت پناہ تھے۔ تین سال کی اس محصوری میں ایسا وقت بھی آیا ہے کہ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ گھاٹی کی جھاڑیوں کے پتے سب کے سب کھا لئے گئے تھے اور بھوک اور پیاس کے مارے بنی ہاشم کے بچوں کی زبانیں خشک ہو گئی تھیں، جن کو تر رکھنے کے لئے سوکھے چمڑے ابال ابال کر ان کے حلقوں میں بوندیں ٹپکائی جاتی تھیں۔

یوم طائف: پھر "رسوا سرِ بازارے ـ آں شوخ ستمگارے" کا نقشہ دیکھنا ہو تو یوم طائف دیکھ لیجئے۔ وہاں ایک دن میں وہ کچھ بیت گیا جو مکہ میں دس سال میں نہیں بیتا تھا ـــــ آغازِ وحی سے دس سال تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ صرف مکہ میں ہوتی رہی ہے۔ ان دس سالوں میں حضورؐ کو اپنے چچا ابوطالب کی پشت پناہی حاصل تھی جو اس وقت خاندان بنو ہاشم کے سردار تھے جو اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن چونکہ ان کو نبی اکرمؐ سے نہایت محبت تھی۔ چنانچہ حضورؐ کو ان کی حمایت حاصل تھی۔ پھر قریش کے نام سے جو قبیلہ مکہ میں آباد تھا وہ درحقیقت چند خاندانوں کے مجموعے اور اشتراک سے تشکیل پایا تھا جن میں 'بنو ہاشم' کو ایک بلند مقام حاصل تھا۔ خاندانوں کے اشتراک سے جو قبیلہ تشکیل پاتا ہے اس کی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ جن میں یہ بھی شامل ہوتی ہے کہ جس فرد کو خاندان کے سردار و سربراہ کی حمایت حاصل ہو، خاندان کے ہر فرد کی بھی اسے حمایت حاصل ہو گی۔ چنانچہ ابولہب اور دو تین دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر پورا خاندانِ بنو ہاشم حضورؐ کی پُشت پر تھا حالانکہ ان میں سے صرف گنتی کے لوگ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ لیکن جیسے ہی ابوطالب کی آنکھیں بند ہوئیں خاندان کی وہ پشت پناہی

ختم ہوگئی۔ گمان غالب ہے کہ ابوطالب کے انتقال کے بعد بنو ہاشم کی سرداری و سربراہی ابولہب کے ہاتھ میں آگئی تھی جو نبی اکرمؐ کا جانی دشمن تھا۔ ابوطالب کے انتقال کے بعد اِدھر بنو ہاشم کی حمایت ختم ہوئی اُدھر دار الندوہ میں قرارداد منظور ہوگئی کہ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مزید مہلت نہ دی جائے اور انہیں قتل کر دیا جائے ۔ یہ حالات تھے کہ جن کے پیشِ نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تبادل کی جستجو میں طائف تشریف لے گئے۔ آپ پاپیادہ تھے اور حضرت زید بن حارثہؓ ساتھ تھے۔ BASE
طائف پہنچ کر جب حضورؐ نے طائف کے سرداروں کے سامنے دعوتِ توحید و دعوتِ حق پیش فرمانی چاہی تو طائف کے سرداروں نے دعوت کو حقارت اور استہزاء کے انداز میں ٹھکرا دیا۔ انہوں نے جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اُس کو سننے کے لئے بڑے جگرے کی ضرورت ہے ۔ نقلِ کفر کفر نہ باشد، ایک سردار نے کہا کہ "اللہ کو تم جیسے مفلس و قلاش کے سوا رسول بنانے کے لئے کوئی اور نہیں ملا۔ اس طرح تو وہ گویا خود کعبے کے غلاف کو چاک کر رہا ہے"۔ دوسرے نے کہا "میں تم سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں اس لئے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعۃً اللہ کے رسول ہو تو ہو سکتا ہے کہ کہیں میں توہین کا مرتکب ہو جاؤں اور عذابِ الٰہی کا مستوجب بن جاؤں۔ اور اگر تم جھوٹے ہو تو کسی جھوٹے سے کلام کرنا میرے شان کے خلاف ہے"۔ ایسے ہی دل فگار جملے دوسرے سرداروں نے بھی کہے۔ پھر صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر احوال مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو ان سرداروں نے کچھ غنڈوں کو اشارہ کر دیا۔ اوباش لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے ۔ پھر وہ نقشہ جما ہے کہ جس پر آسمان و زمین لرز گئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں ۔ ان اوباشوں نے محبوب رب العلمین، سید المرسلین، خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پتھروں کی بارش شروع کر دی ہے۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ حضرتِ زیدؓ حضورؐ کو بچانے کے لئے اپنے جسم کو ڈھال بناتے ہیں لیکن پتھر مختلف اطراف سے برس رہے ہیں۔ اس پتھراؤ سے جسدِ مبارک لہولہان ہو گیا ہے۔ نعلین شریف خونِ اطہر سے بھر گئی ہیں اور پائے مبارک جم گئے ہیں ۔ ایک موقع پر حضورؐ ضعف کے مارے ذرا بیٹھ گئے ہیں تو وہ غنڈے آگے بڑھتے ہیں اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر آپؐ کو کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو ۔ تالیاں پیٹی جا رہی ہیں۔ استہزائیہ فقرے چست کئے جا رہے ہیں ۔

حضورؐ کی دردبھری دُعا : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے باہر آکر ایک پتھر سے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ دعا حضورؐ کی زبان سے نکلتی ہے کہ جس کو پڑھتے، سنتے اور سناتے وقت کلیجہ شق ہوتا ہے :

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

"اے اللہ! کہاں جاؤں، کہاں شکوہ کروں! تیری جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں، اپنی قوت اور اپنے وسائل کی کمی کی۔ اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے اس کی ــــ"

اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ

"اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے۔ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟"

اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ

"پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں مجھے اس تشدد کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

؎ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے ــ!

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ

"اے رب! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات بھی منور ہو جاتے ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے یوم طائف۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یوم احد کے بعد حضورؐ سے دریافت کیا تھا کہ "یا رسول اللہ! کیا اس سے زیادہ سخت دن بھی آپؐ کی زندگی میں آیا ہے؟" آپؐ نے جواب میں فرمایا "ہاں۔ یوم طائف میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن تھا۔"

اہلِ ایمان پر تعذیب: داعیٔ انقلاب جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو خاندانِ بنو ہاشم کے چشم و چراغ اور پورے مکہ والوں کی آنکھوں کا تارا تھے اور جن کا تذکرہ قریش الصادق والامین جیسے معزز القاب سے کرتے تھے اُنؐ کے ساتھ تعذیب و تشدد کا جو معاملہ ہوا ہے اس کی ایک جھلک میں نے آپ کو دکھائی ہے۔ اب ایک طائرانہ نظر ان مصائب اور جور و تعدی پر بھی ڈال لیجئے جو اہلِ ایمان پر توڑے گئے۔ ان میں سے بھی سب سے زیادہ ظلم و ستم کے پہاڑ ان اہلِ ایمان پر ڈھائے گئے جو غلاموں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے یا غیر قریشی ہونے کے باعث کسی قریشی سردار کے حلیف بن کر اور اس کی امان لے کر مکہ میں آباد تھے۔ مکہ میں نہ غلاموں کے کوئی حقوق تھے نہ ان حلیفوں کے یہی وجہ ہے کہ اس طبقے کے اہلِ ایمان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے سُن کر سخت سے سخت دل

میں بھی جبر جبری آجاتا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ امیہ ابن خلف نے جو کچھ کیا، وہ یقیناً آپ حضرات کے علم میں ہوگا۔ مکہ کی توے کی طرح جلتی ہوئی سنگلاخ زمین ہے، سورج آگ برسا رہا ہے۔ جن حضرات کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں کہ مکہ میں گرمی کا کیا عالم ہوتا ہے، خاص طور پر موسم گرما میں ـــ اس گرمی کے عالم میں حضرت بلالؓ کے ساتھ وہ بہیمانہ سلوک کیا جاتا ہے جو اگر کسی مردہ جانور کے ساتھ بھی کیا جائے تو طبیعت میں ناگواری کا احساس پیدا ہو جائے۔ کبھی انؓ کو باندھ کر اور اوندھے منہ لٹا کر زمین پر گھسیٹا جاتا ہے۔ کبھی انؓ کے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جاتا ہے کہ سانس لینا بھی مشکل۔ منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں، لیکن اس کیفیت میں بھی کوئی آہ و فغاں نہیں۔ زبان سے بمشکل الفاظ نکل رہے ہیں تو یہ "اَحَدٌ ۔ اَحَدٌ ۔ اَحَدٌ"۔ بس ایک معبودِ برحق ہے اور کوئی نہیں"

ـــ حضرت خبابؓ ابن ارت کے ساتھ کیا ہوتا ہے! ان کو پکڑ کر مجمع میں لایا جاتا ہے ـــ انگارے دہکا کر ننگی پیٹھ انؓ کو ان انگاروں پر لٹا دیا جاتا ہے۔ کمر سوختہ ہو جاتی ہے اور اس کی چربی سے انگارے بجھ جاتے ہیں، اس طرح ان کی جان بچ جاتی ہے ـــ آلِ یاسر کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کو بیان کرنے اور سننے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ یہ خاندان تین افراد پر مشتمل تھا۔ حضرت یاسرؓ، ان کی اہلیہ حضرت سمیہؓ اور ان کے بیٹے حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ یہ تینوں ایمان لے آئے تھے۔ اس وقت یہ خاندان ابوجہل کا حلیف اور اس کی پناہ میں تھا۔ وہ کئی روز تک ان تینوں کو طرح طرح سے تشدد کا نشانہ بناتا رہا۔ لیکن انؓ کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ انؓ کی اس استقامت سے تنگ آکر اور مغلوب الغضب ہو کر اس شقی القلب نے اس خاندان کے ساتھ جس وحشیانہ پن اور بربریت کا معاملہ کیا ہے اسے گوشِ ہوش سے سنئے۔ حضرت عمارؓ کو ایک درخت سے باندھ دیا جاتا ہے تاکہ اپنے ماں باپ پر ہوتا ہوا ظلم اپنی آنکھوں سے دیکھیں ـــ پھر ابوجہل ان میاں بیوی سے دین توحید سے منحرف ہونے کے مطالبہ کا اعادہ کرتا ہے۔ انکار پر حضرت سمیہؓ پر کوڑے برساتا ہے۔ پھر شوہر اور بیٹے اور مجمع کے سامنے انہیں نیم عریاں کرتا ہے۔ پھر یہ شقی اس طرح تاک کر ان کے اندامِ نہانی پر نیزہ مارتا ہے کہ پشت سے پار ہو جاتا ہے ـــ ایک مومنہ کا یہ پہلا خون تھا جس سے توحید کی انقلابی دعوت کے باعث مکہ کی سرزمین لالہ زار ہوئی۔ پھر حضرت یاسرؓ کے ہاتھ پاؤں چار سرکش اونٹوں سے باندھ کر انہیں چار سمتوں میں ہانک دیا جاتا ہے کہ اس طرح انؓ کے جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں ـــ

غلاموں اور حلیفوں کے طبقے سے ایمان لانے والوں پر جو ظلم و ستم ہوا، ان کی چند مثالیں میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ اب ذرا اس جور و تعدی کے بھی چند واقعات سن لیجئے جو ان نوجوانوں پر

دوسرے بھی جو قریش کے چوٹی کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور دعوت توحید پر ایمان لے آئے تھے۔ جیسے حضرت عثمانؓ ابن عفانؓ، خاندانِ بنو امیہ کے ایک صالح نوجوان۔ اُنؓ کا چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتا تھا کہ سانس لینا دوبھر ہو جاتا۔ حضرت مصعبؓ ابن عمیر نہایت خوش حال گھرانے کا ایک رعنا نوجوان۔ نہایت حسین وجمیل، نہایت خوش پوشاک۔ اُنؓ کے چچا نے اُنؓ کو ایمان لانے کی پاداش میں مادر زاد ننگا کر کے گھر سے نکال دیا۔ حضرت سعد ابن وقاص قریش کے ایک معزز خاندان کے چشم وچراغ۔ خاندان خصوصاً ماں کے نہایت لاڈلے۔ اُنؓ کے ایمان لانے پر ماں بھوک ہڑتال کر دیتی ہے کہ نہ کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی، بھوکی مرجاؤں گی اگر سعد اپنے آبائی مشرکانہ دین کی طرف نہ لوٹا۔ پھر حضرت حذیفہؓ ہیں جو عتبہ ابنِ ربیعہ جیسے قریش کے مدبّر سردار کے بیٹے اور ابوسفیان کے برادرِ نسبتی ہیں۔ ان پر ہر طرف سے دباؤ اور ماریں پڑ رہی ہیں کہ محمد (رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا ساتھ چھوڑ دیں۔ مزید برآں اونچے گھرانوں کے جو متعدد نوجوان نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں اور ان کے قدموں میں پہنچ گئے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی نوع کی تعذیب کا نشانہ بن رہے ہیں۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

صبر و استقامت: تعذیب، تشدّد اور ظلم وستم اور اس پر صبر وثبات اور استقامت کا مرحلہ مکّہ میں بارہ سال تک جاری رہا اور اس عرصے میں اس بہیمانہ تشدّد، جور وستم اور مظالم کی وجہ سے نہ تو کسی نے کمزوری دکھائی، نہ اپنے مؤقف سے ہٹا اور نہ ہی کسی نے جواباً ہاتھ اٹھایا۔ کُتبِ سیر میں صرف دو واقعات ملتے ہیں۔ ایک حضرت عمّارؓ کا۔ اپنے والدین (حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ) پر وحشیانہ ظلم دیکھ کر اُنؓ کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انہوںؓ نے اس موقع پر اپنی جان بچانے کے لئے زبان سے اسلام سے برأت کا اعلان کر دیا۔ اس پر وہ بڑے پریشان و پشیمان تھے۔ وہؓ اس حال میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں پہنچے اور واقعہ بیان کیا۔ رحمۃ اللعالمینؐ نے دریافت فرمایا کہ "دل کی کیا کیفیت ہے اور آئندہ کے لئے کیا ارادہ ہے!" انہوںؓ نے عرض کیا کہ "بحمد اللہ دل میں ایمان موجود ہے اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتا ہوں"۔ اس پر حضورؐ نے تسلّی دی کہ "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اب بھی مؤمن ہو"۔
اس کی وحی قرآنی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی توثیق فرما دی۔ چنانچہ حضرت عمّارؓ کو تسلّی حاصل ہوئی پھر انہوں نے اپنے ایمان کا علی الاعلان اظہار بھی کر دیا۔ دوسرا واقعہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا ہے۔ ایک موقع پر جب ابوجہل نے ان کو بہت مارا تو جواب میں انہوںؓ نے بھی ایک تھپڑ رسید

کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو آپؐ ناراض ہوئے اور آپؐ نے تادیبًا حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو کچھ عرصہ کے لئے مکہ سے جلاوطن کر دیا۔ ان دو واقعات کے علاوہ اگر کوئی اور واقعہ ہو تو وہ میرے مطالعہ میں نہیں آیا۔ کوئی ہو تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تربیت و تزکیۂ محمدیؐ کا کمال: میں کہا کرتا ہوں کہ یہ کمال ہی نہیں بلکہ معجزہ ہے تزکیہ و تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ـــــ ورنہ آپ خود سوچئے کہ اگر کسی شجاع نوجوان کو یہ نظر آجائے کہ اس کو ایسی اذیت دینے کی تیاری ہو رہی ہے جو اس کی موت پر بھی منتج ہو سکتی ہے۔ جیسے حضرت خبابؓ ابن ارت کے ساتھ معاملہ ہوا تھا ـــــ تو اگر وہ مشتعل اور DESPERATE ہو جائے تو وہ دس کو مار کر مرے گا۔ اسی طرح سوچئے کہ جب آل یاسرؓ پر ظلم ہو رہا تھا، خاص طور پر صنفِ نازک حضرت سمیہؓ کے ساتھ ابوجہل جو بہیمانہ سلوک کر رہا تھا تو کیا اس پر اہلِ ایمان کا خون کھولتا نہ ہوگا! کیا وہ اس مظلوم خاندان کی حمایت میں کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے! کیا معاذاللہ بزدل تھے! ان میں سے کوئی بات نہیں تھی۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ داعیٔ انقلاب جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ تم پر کتنے ہی مصائب آئیں، تم پر کتنے ہی ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جائیں، تمہارے اسلامی بھائی بہنوں کے ساتھ کتنا ہی بہیمیت و بربریت کا سلوک کیا جائے، ان سب کو برداشت کرو، جھیلو۔ ان مصائب، ان مظالم اور اس تعذیب پر صبر کرو۔ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ۔ اپنے ہاتھ بندھے رکھو، روکے رکھو، کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوگی۔ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھائے جا سکتے۔ اپنے کسی مسلمان بھائی بہن پر ظلم ہوتا دیکھ کر اس کی مدد کے لئے کوئی جوابی کارروائی بھی نہیں کی جا سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا نتیجہ تھا کہ مسلمان جن کی تعداد میرے اندازے کے مطابق اس وقت چالیس پچاس کے لگ بھگ تھی اور ان میں سے ہر ایک شجاعت و دلیری میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اور جن کو زندگی کی نسبت اللہ کے دین کے لئے جان دے دینا زیادہ عزیز تھا، آلِ یاسرؓ پر ظلم دیکھ کر خاموش رہے اور اپنے غم و غصہ کو ضبط کرتے رہے۔ جب حضورؐ آلِ یاسرؓ کے سامنے سے گزرتے تو تلقین فرماتے کہ: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ۔

"اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو اس لئے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے۔"

صبرِ محض کی حکمتیں: صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) جو ایک انقلابی عمل میں انقلابی دعوت کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے ـــــ لیکن جیسے بغرضِ تفہیم میں نے

چوتھا مرحلہ قرار دیا ہے ـــ بڑا ہی نازک، بڑا کٹھن، بڑا صبر آزما اور بڑا CRUCIAL مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ وقت کی محدودیت ان کو بیان کرنے میں مانع ہے۔ البتہ چند ایک کا بیان ناگزیر ہے اور ان کو سمجھنا ضروری ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے قوتِ محرکہ (MOTIVATING FORCE) آخرت کی فوز و فلاح ہے، رضائے الٰہی کا حصول ہے، "جنت" ہے۔ جیسا کہ نبی اکرمؐ کے اس فرمانِ مبارک میں سامنے آیا کہ اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ ـــ اگر اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کا آخرت پر ایمان ہے، اگر اس کے پاس یہ قوتِ محرکہ موجود ہے تو جماعت ہر ابتلاء، ہر نوع کے تشدد اور ہر نوع کی تعذیب کے مقابلہ میں کھڑی رہے گی۔ وہ مقاومت کرے گی، لیکن وہ بلامزاحمت یعنی PASSIVE RESISTANCE ہوگی۔ اس طرح اس میں قوتِ ارادی اور قوتِ برداشت نشوونما پائے گی جس کی اگلے مراحل میں سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ مزید یہ کہ اس صبرِ محض کی جو سب سے بڑی حکمت ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں انقلابی جماعت نہایت مختصر ہوتی ہے، جب کہ معاشرہ کا ایک ESTABLISH نظام ہوتا ہے۔ اب اگر یہ انقلابی لوگ شروع ہی میں VIOLENT ہو جائیں، تشدد کا جواب تشدد سے دینے لگیں تو اس معاشرے اور نظام کو اس مختصر سی جماعت کو پوری طرح کچلنے اور بالکل ختم کرنے کا اخلاقی جواز مل جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ انقلابی VIOLENT نہیں ہوتے اور اس کے باوجود معاشرے کا سربرآوردہ طبقہ ان کو کچل رہا ہے، ان پر تشدد کر رہا ہے تو یہ وہ عمل ہے جس کے باعث اس انقلابی جماعت کو عوامی سطح پر ایک خاموش ہمدردی حاصل ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جس کو اس دور میں آپ جس لفظ سے پہچان سکتے ہیں وہ ہے خاموش اکثریت (SILENT MAJORITY)۔ یہ بڑی خوبصورت اصطلاح ہے اور صورتِ حال کو سمجھنے میں بڑی ممد ہے۔ یہ اکثریت خاموش و ساکت تو ہوتی ہے، اندھی بہری نہیں ہوتی، بے حس نہیں ہوتی ـــ وہ دیکھتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیوں ستایا جا رہا ہے! آپؐ کو کیوں اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ آپؐ تو قریش کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ خود قریش کے سرداروں نے بالاتفاق آپؐ کو الصادق اور الامین جیسے معزز خطابات دیئے ہیں۔ آپؐ پورے مکہ میں سب سے زیادہ کریم و شریف النفس شخصیت ہیں۔ محتاجوں، یتیموں، بیواؤں اور معاشرے کے کچلے ہوئے طبقات کے ہمدرد و دمساز اور ان کی اعانت اور دستگیری کرنے والے ہیں۔ اخلاق کی

بلند ترین سطح پر فائز فرد ہیں۔ آپؐ سے زیادہ وعدے کا سچا اور معاملات میں کھرا کوئی دوسرا شخص پورے معاشرے میں موجود نہیں ہے۔ آپؐ پورے معاشرے میں محبوب ترین شخصیت ہیں۔ پھر آپؐ کے ساتھ تعذیب و تعدّی اور استہزاء و تمسخر کا یہ معاملہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ پھر بلالؓ کو کیوں مارا جا رہا ہے؟ امیّہ ابن خلف کو کیا ہو گیا ہے! کیا بلالؓ نے چوری کی ہے یا کوئی ڈاکہ ڈالا ہے؟ کہیں ابن خلف کی بیٹی پر دست درازی کی ہے؟ ـــــ یہ خبابؓ ابن ارت کے ساتھ کیا ہو رہا ہے! اچھا بھلا اور نیک آدمی ہے ـــــ وہؓ لوہار تھے اور اپنے کام میں ماہر، دیانت دار، وعدے پر کام کرنے والے، انہوںؓ نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا ـــــ آخر ان کو کیوں مارا جا رہا ہے؟ ان کو کیوں دہکتے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے؟ یہ عثمان، یہ مصعب، یہ ابوعبیدہ، یہ طلحہ، یہ سعید، یہ سعد، یہ زبیر، یہ ابوحذیفہ اور دوسرے نوجوان اہلِ ایمان (رضی اللہ تعالیٰ عنھم) جو اپنے اعلیٰ کردار و اخلاق کے اعتبار سے معاشرے میں بڑی قدر و وقعت رکھتے ہیں۔ یہ ابوبکرؓ جو قریش میں شرافت اور عزت و منزلت کے لحاظ سے اعلیٰ مقام کی حامل شخصیت اور ایک دیانت دار و راست باز تاجر ہیں، ان کو ظلم و ستم کا نشانہ کیوں بنایا جا رہا ہے؟ پھر جب صاف طور پر یہ نظر آتا ہے کہ ان کا کوئی اخلاقی جرم نہیں ہے۔ بس ان کی اگر خطا ہے تو صرف یہ ہے: اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ۔ "یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب، ہمارا مالک ہمارا آقا صرف اللہ ہے"۔ یہ شرک سے تائب ہو کر اللہ وحدہٗ لاشریک کے پرستار بن گئے ہیں۔ اور یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت پر ایمان لے آئے ہیں۔ انؐ کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں ـــــ

متاثر کن بات: غور کیجئے کہ بُرے سے بُرے معاشرے میں بھی انسانی فطرت اتنی مسخ نہیں ہوتی کہ وہ ان باتوں کو محسوس نہ کرے اور اس کا کوئی اثر قبول نہ کرے ـــــ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا باوقار رویہ، آپؐ کا حِلم، آپؐ کی استقامت، آپؐ کا صبر و ثبات ـــــ پھر آپؐ پر ایمان لانے والوں کی استقامت، ان کا ثبات، ان کا صبر، ان کا تحمل ـــــ یہ وہ اوصاف ہیں جو اس "خاموش اکثریت" کے دلوں کے اندر ہی اندر اثر کر رہے ہیں۔ اس نے ابھی حرکت نہیں کی ہے۔ نہ اس میں اتنی ہمت ہے کہ آگے بڑھ کر ظالموں کا ہاتھ روک لے اور کھلم کھلا توحید کی انقلابی دعوت کو قبول کر لے۔ لیکن اندر ہی اندر دلوں میں ایک خاموش انقلاب آ رہا ہے، اندر ہی اندر دل فتح ہو رہے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎ "جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ"۔ دعوتِ حق خاموشی کے ساتھ دلوں میں گھر کر رہی ہے۔ جس کا

ایک ظہور ہوتا ہے صلح حدیبیہ کے بعد اور کامل ظہور ہوتا ہے فتح مکہ کے بعد ۔ جس کی پیشین گوئی بہت پہلے ہو چکی تھی یعنی ہجرت سے قریباً ڈھائی تین سال قبل سورۃ الاسراء میں بایں الفاظ فرما دی گئی تھی:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

اس مرحلے کی حکمتوں کا اگر ایک خلاصہ بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ صبرِ محض کے دور میں انقلابی جماعت کو ایک طرف اپنے تین ابتدائی کاموں یعنی دعوت کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے، دعوت کو قبول کرنے والوں کو منظم اور ان کی تربیت و تزکیہ کرنے کے لئے مہلت ملتی ہے، چونکہ اگلے مراحل کی کامیابی کا دار و مدار ان ہی تین مراحل کی کامیابی پر ہوتا ہے ۔ دوسری طرف صبرِ محض کے اس مرحلہ میں معاشرے کی بڑی اکثریت اندر ہی اندر دعوت کی حقانیت کو قبول کرتی چلی جاتی ہے جو آخری مراحل کے بعد انقلابی جماعت کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے اور عملاً انقلابی دعوت کی علمبردار و داعی بن جاتی ہے ۔

اس چوتھے مرحلے کی اہمیت و افادیت: آگے بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اس مرحلہ کی اہمیت و افادیت کی وضاحت کا اعادہ کر دوں ۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ جب انقلابی مراحل کو ترتیب وار شمار کیا جائے گا تو صبرِ محض چوتھا مرحلہ قرار پاتا ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مرحلہ دعوت کے پہلے دن ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور ابتدائی و تمہیدی تینوں مراحل یعنی دعوت، تنظیم اور تربیت و تزکیہ کے شانہ بشانہ چلتا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ تعذیب و تشدد پر صبر و تحمل اور عزیمت و استقامت کا مظاہرہ کرنا اور اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھانا انتہائی مشکل اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے ۔ اس مرحلے میں استقلال و تثبیت اور اپنے موقف پر قائم و مستقیم رہنا ہی اگلے مراحل یعنی اقدام اور مسلح تصادم کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے ۔ صبرِ محض کا مرحلہ انقلابیوں میں قوتِ ارادی، قوتِ برداشت، اپنے مقصد کی حقانیت پر یقین پیدا کرنے اور کندن بننے کے لئے ازبس ضروری ہے ۔ یہ تیاری کا مرحلہ ہے ۔ یہ پختگی کا مرحلہ ہے ۔ اس کے بغیر اگر ٹکراؤ ہو جائے تو تمام محنت اور جد و جہد اکارت ہو جائے گی ۔ یہی حقیقت ہے جسے علامہ اقبال نے اس شعر میں سمو دیا ہے جو میں دورانِ تقریر دو مرتبہ آپ کو سنا چکا ہوں اور اب تیسری بار اس کا اعادہ کر رہا ہوں ۔

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

خطوط و نکات

بھارت میں دعوتِ رجوع الی القرآن کا ایک نیا مرکز ـــــ کلیان

محترمی و مکرمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔

ایک طویل مدت کے بعد دوبارہ آپ سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں ۔ امید ہے کہ اتنی ساری مصروفیات کے باوجود آپ کے مزاج بفضلہ تعالیٰ بخیر ہونگے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے اعزہ و اقارب و رفقاء کار بھی سب بخیر ہوں گے ۔

'میثاق' 'حکمت قرآن' اور 'ندا' باقاعدگی سے مل رہے ہیں جزاکم اللہ احسن الجزاء ۔ بدل اشتراک کے بغیر اتنی باقاعدگی سے تین تین قیمتی رسالے بیرون ملک ارسال کرنا آج کے زمانے میں حاتم طائی کے قبیل کا کام ہے ۔ یقین جانیئے ذاتی طور پر مجھے اور میرے دوسرے علمی ذوق رکھنے والے دوستوں کو 'میثاق' اور 'حکمت قرآن' کا بڑی شدت سے انتظار رہتا ہے ۔ ان دونوں رسالوں کے اکثر اہم مقالات کی میں فوٹو کاپیاں بنوا لیتا ہوں ۔ اور 'ندا' تو ہمارا لائبریری کا 'گرم کیک' (HOT CAKE) ہے ۔ نوجوانانِ ہند (جن کی جذباتی وابستگی پاکستانی مسلمانوں سے آج بھی جوں کی توں برقرار ہے) کے لیے یہ ایک انمول تحفہ ہے ۔

جناب حیدر غوری حیدر آباد سے ہمارا رابطہ قائم ہے اب تک ہم نے انہیں دو ہزار (۲۰۰۰/-) روپے بھجوائے ہیں ۔ موصوف نے کچھ کتابیں اور لگ بھگ ۳۰ کیسٹس ارسال کی ہیں ۔ مزید کیسٹس و کتابیں متوقع ہیں ۔ دریں اثنا ہمارے ایک عزیز جو کراچی میں مقیم ہیں ، انہیں ہم نے ہر سال ہماری جانب سے کم از کم پانچ سو روپے انجمن خدام القرآن لاہور تک پہنچانے کی ذمہ داری ڈالی ہے اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ فی سبیل اللہ یہ کام کریں گے ۔ امید ہے مستقبل قریب میں یہ روپے آپ کو مل جائیں گے ۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے مرکز سے طبع شدہ ہر پمفلٹ ، کتابچہ اور کتاب اور آپ کی آواز کا ہر کیسٹ ہمیں میسر ہو ۔

امسال ماہ رمضان میں رجوع الی القرآن کی دعوت بڑے وسیع پیمانے پر آپ کی کتابوں ، کتابچوں اور کیسٹس کی مدد سے گھر گھر پہنچانے کا منصوبہ زیر غور ہے ۔ اگر اللہ کی مرضی اور آپ کی دعائیں شامل حال رہیں تو انشاء اللہ تعالیٰ یہ کام ہم ضرور کر گذریں گے ۔ امید ہے انجمن خدام القرآن لاہور بالواسطہ یا بلاواسطہ

حتی الامکان ہم سے تعاون کرے گی۔ چونکہ رمضان کی آمد آمد ہے اس لیے آپ از جناب حیدر غوری صاحب سے تعاون میں تاخیر نہ کرنے کی مودبانہ درخواست ہے۔ امید ہے آپ اس کم سن عقیدت مند کی اس بے ادبی وجرأت سے درگزر کریں گے۔

جناب! ایمانیات پر مبنی آٹھ کیسٹس واسلام کا نظامِ حیات پر مبنی چھ کیسٹس جو شاید حیدرآباد سے ہمیں نہ مل سکیں گے اگر آپ بھجوائیں تو بہتر ہوگا۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کے کسی رفیق کار نے ایمانیات پر مشتمل خطبات کو کتابی شکل میں منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا ہوگا اس کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

نیز ویسے تو ہمیں آپ کی تمام تصنیفات درکار ہیں لیکن مندرجہ ذیل تصانیف ہماری LIST OF PRIORITIES میں سر فہرست ہیں۔

(۱) قرآن حکیم کا منتخب نصاب (۲) رسول کامل (۳) نبی اکرمؐ کا مقصدِ بعثت (۴) معراج النبی۔
(۵) اسلام کی نشاۃِ ثانیہ (۶) فلسفۂ قربانی (۷) اسلام کا معاشی نظام (۸) دعوت رجوع الی القرآن
(۹) اقبال اور ہم (۱۰) منہج انقلاب نبوی (۱۱) تنظیم اسلامی کی دعوت (۱۲) مسلمانوں کے دینی فرائض
(۱۳) فرائض دینی کا جامع تصور (۱۴) توحیدِ عملی (۱۵) وحدت امت۔

میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں کہ پاکستان سے ہندوستان لٹریچر بھیجنا ایک مشکل امر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کارِ خیر کے لیے اسباب فراہم کرے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دعاؤں میں مجھے اور میرے اہل بیت ورفقاء کو یاد رکھنے کی استدعا ہے جواب کا شدت سے انتظار رہیگا۔

حضرت اختتام پر ایک نہایت ہی اہم بات یاد آئی جس کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تقلید وعدم تقلید کا موضوع اور اس ضمن میں سلفی علماء کا تشدد (درانحالیکہ بعض معاملات میں وہ حق پر ہیں) ہم نوجوانوں کے لیے باعث بحث وجدل بنا ہوا ہے، آپ کے معتدل قلم سے ایک تشفی بخش وطویل مضمون کی درخواست ہے۔ جو اس "امت وسط" کو تقلید وعدم کی درمیانی "راہ اتباع" دکھلائے امید ہے اپنی مصروفیات کے باوجود مسئلہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔

والسلام

احقر معین الدین ڈون عفی عنہ

اقراء اسلامک لائبریری

ولی پیر روڈ، کلیان

انڈیا کے خریدار حضرات متوجہ ہوں

آپ کی سہولت کے لیے انڈیا میں انجمن خدام القرآن کا دفتر قائم ہے۔ میثاق اور حکمت قرآن کا زرتعاون وہاں ادا کیا جا سکتا ہے۔ مزید براں لٹریچر و کیسٹس بھی وہاں پر دستیاب ہیں۔

Anjuman Khuddam ul Quran India
4-1-444 2nd Floor Bank Street
Hyderabad 500001 AP India
Tel: 42127

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ان گناہوں پر، ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری غلطیوں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

ہر محفل کا میزبان خصوصی
رُوح افزا
خدمت خلق رُوحِ اخلاق ہے
ADARTS
HMD-6/87

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد : ۳۸
شمارہ : ۵
ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ
جون ۱۹۸۹ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرِ تعاون ۵۰/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات ـ	۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا ـ	۶ ـ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ ـ	۹ ـ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ـ	۱۲ ـ امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ـ ماڈل ٹاؤن فیروز پور روڈ ـ لاہور (پاکستان)

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مقامِ اشاعت: ۳۶ ـ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ ـ فون: ۸۵۶۰۰۳ ـ ۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱ ـ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی ـ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

اس سال ماہ رمضان المبارک کے دوران دورۂ ترجمۂ قرآن کے ضمن میں ایک ایسا معاملہ پیش آیا کہ جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بظاہر شر کے پردے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے حق میں ایک بڑے خیر کا ظہور ہوا اور اس کے سبب سے دورۂ ترجمۂ قرآن کی بازگشت نہ صرف یہ کہ ہمارے ملک کے چوٹی کے دارالعلوموں میں سنائی دی بلکہ اس پروگرام کی تصویب و توثیق ملک کے اکابر علماء کی جانب سے بھی ہو گئی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کراچی میں ناظم آباد کی ایک مسجد میں رفیق تنظیم محترم حافظ محمد رفیق صاحب قرآن حکیم کے ترجمے کا دورہ کرا رہے تھے۔ ابھی رمضان المبارک کا پہلا عشرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ بعض لوگ بنوری ٹاؤن کے مدرسے سے، جو بلاشبہ ایک عظیم دینی درسگاہ ہے، ایک فتویٰ لے کر آئے جس کی رُو سے دورۂ ترجمۂ قرآن خلافِ شرع قرار پاتا تھا۔ ہمارے لیے یہ امر اگرچہ کسی قدر اطمینان بخش تھا کہ یہ فتویٰ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے رئیسِ دارالافتاء اور بزرگ استاذ مولانا مفتی ولی حسن صاحب کا تحریر کردہ نہ تھا بلکہ کسی جونیئر استاذ کا مرتب کردہ تھا۔ تاہم تشویش اپنی جگہ موجود تھی۔ چنانچہ فوری طور پر ایک استفتاء مرتب کر کے لاہور کی چوٹی کی دو دینی درسگاہوں یعنی جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نعیمیہ میں اور کراچی میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ دارالعلوم، میں بھجوایا گیا تاکہ صورتِ مسئلہ کے بارے میں رہنمائی حاصل ہو سکے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل پچھلے سال بھی ایک حلقہ کی جانب سے دورۂ ترجمۂ قرآن کی مخالفت میں آواز اٹھی تھی لیکن اس وقت یہ مخالفت چونکہ کسی مستند دارالعلوم یا ثقہ عالمِ دین کی طرف سے نہیں تھی بلکہ ایک ایسے حلقے کی طرف سے ترجمۂ قرآن کے پروگرام کو بدعت قرار دیا گیا تھا جو دین کے بارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ہر تشریح و تعبیر کی مخالفت کو غالباً اپنا فرضِ منصبی گردانتا ہے لہٰذا اسے ہم نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا تھا۔ تاہم اس بار معاملہ مختلف تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ مذکورہ بالا تینوں دارالعلوموں کے بلندپایہ مفتی حضرات نے نہ صرف یہ کہ ترجمۂ قرآن کے پروگرام کے جواز کا فتویٰ دیا بلکہ بعض نے

کچھ شرائط کے ساتھ اسے بہتر اور مستحسن بھی قرار دیا۔ رفقاء واحباب کی دلچسپی کے پیشِ نظر ہماری جانب سے بھیجا جانے والا استفتاء اور اس کے جوابات پیشِ خدمت ہیں۔

استفتاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مورخہ ۷، رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ

السلام علیکم

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل کچھ لوگوں نے قرآن کریم کی تعلیمات مسلمانوں میں عام کرنے کی غرض سے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ رمضان المبارک میں قیام اللیل کی نیت سے تراویح اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ ہر چار رکعت کے بعد تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن کریم کی اوّلاً ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی جاتی ہے اور پھر حافظ صاحب چار رکعت تراویح سناتے ہیں۔ اس طرح ترجمہ اور تشریح میں ۴۵ منٹ صرف ہوتے ہیں اور نماز میں ۱۵ منٹ۔ بارہ رکعت کے بعد ۱۵ منٹ چائے کا وقفہ ہوتا ہے اس طرح تقریباً ۵ گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ اب اس بارے میں یہ دریافت کرنا ہے کہ:

۱۔ کیا یہ طریقہ عبادت "بدعت حسنہ" کی تعریف میں آتا ہے؟

۲۔ کیا ہمارے اسلاف میں اس طریقہ کی کوئی مثال ملتی ہے؟

۳۔ کیا اس سے ترویحہ کی روح ختم ہو جاتی ہے؟

۴۔ کیا اس طرح مسنون تراویح ادا ہو جاتی ہے؟

۵۔ کیا اس طرح قیام اللیل کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے؟

از راہِ کرم ان سوالات کے جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

شکریہ والسلام علیکم

دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء کی جانب سے مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کی توثیق و تصویب کے ساتھ اس استفتاء کا حسبِ ذیل جواب موصول ہوا۔

الجواب

"طریقۂ بالا کے مطابق تراویح ادا کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، ایک یہ کہ اس طرح تراویح ادا کرنے کو شرعی لحاظ سے واجب یا سنّت نہ سمجھا جائے، دوسرے یہ کہ جہاں تراویح بغیر ترجمہ اور تشریح کے ہوتی ہوں، ان تراویح کو غلط یا ناقص نہ سمجھا جاتا ہو اور ان پر طعن و تشنیع نہ کی جاتی ہو، تیسرے ذکر کردہ

طریقہ سے تراویح ادا کرنا شریک ہونے والوں پر اکتاہٹ اور بوجھ کا باعث نہ ہو چاہتے یہ سب کچھ ایسے انداز سے ہوتا ہو کہ جو لوگ اس میں شریک نہ ہوں، ان کے ذکر و تلاوت یا آرام و راحت میں خلل نہ آتا ہو۔ مثلاً تلاوت، ترجمہ و تشریح کے لیے لاؤڈ سپیکر اگر استعمال ہوتا ہو تو اس کی آواز مسجد کے اندر اندر رہتی ہو مسجد کے باہر نہ جاتی ہو ——— اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو پھر تراویح کا یہ طریقہ درست نہیں واجب الترک ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲ — ۹ — ۱۴۰۹ھ

بندہ: عبدالرؤف سکھروی
دارالافتاء دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴"
۱۲ — ۹ — ۱۴۰۹ھ
نائب مفتی دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

جامعہ نعیمیہ لاہور کے مفتی محمد حسین نعیمی صاحب مدظلہ کی جانب سے اس استفتاء کا حسب ذیل جواب موصول ہوا۔

" الجواب ھو الموفق للصواب

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے رمضان المبارک میں قرآن کریم کو تراویح میں سننا اور سنانا سُنّت ہے یہ اس لیے کہ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ کم از کم سال میں ایک بار تمام مسلمان قرآن کریم یعنی اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکام کو تازہ کر سکیں اور ہر مسلمان قرآن کریم میں ارشاداتِ الٰہی سے واقف ہو، خوش نصیب ہیں وہ افراد جو عربی زبان سے واقف ہیں اور قرآن کریم کے احکام سے بلاواسطہ واقفیت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عربی سے ناواقف افراد کے لیے اگر کسی دوسری زبان میں تشریح کی جائے تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

نیز تراویح کی تمام رکعات میں اتصال ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چار رکعت کے بعد وقفہ کیا جاتا ہے جس کو فقہ میں 'ترویحہ' کہتے ہیں۔ 'تراویح' اس کی جمع ہے۔ تراویح کے پڑھنے میں عجلت اور تسلسل مطلوب و مرغوب نہیں ہے۔ ابتدائے دورِ صحابہ میں کعبہ مکرمہ میں ہر چار رکعت کے بعد خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ لہٰذا نیک مقصد اور تبلیغ کے لیے ہر چار رکعت کے بعد ان میں پڑھے ہوئے قرآن کریم کی تشریح کی جائے تو یہ ہر طرح شرعاً مطلوب و محبوب ہے۔ لیکن ہر شخص پر اس میں شرکت ضروری قرار نہ دی جائے، باذوق اور اسلام سے لگاؤ رکھنے والے شریک ہوں تو بہتر ہے اور شرعاً جائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مفتی محمد حسین نعیمی — دارالافتاء۔ جامعہ نعیمیہ، لاہور"

جامعہ اشرفیہ لاہور کے دارالافتاء سے اس استفتاء کے سوالات کے ترتیب وار مختصر جوابات موصول ہوئے۔

پہلے سوال کے جواب میں فرمایا گیا کہ اس طریقۂ عبادت کو لازمی قرار دینا بدعت ہے۔ اسلاف میں اس طرح کی کسی مثال کے بارے میں سوال کے جواب میں لاعلمی کا اظہار کیا گیا۔ اس سوال کا جواب کہ "کیا اس طرح ترویحہ کی روح ختم ہو جاتی ہے؟" نفی میں دیا گیا۔ چوتھے سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اس طرح مسنون تراویح ادا ہو جائے گی۔ آخری سوال قیام اللیل کے مقصد کے بارے میں تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ مقصد حاصل ہو جائے گا بشرطیکہ کوئی غیر شرعی کام نہ کیا جائے۔

آخر میں جناب مفتی صاحب مدظلہ نے اپنا نوٹ بایں الفاظ تحریر کیا:

"اگر لوگوں پر بار ہوتا ہو تو صرف تراویح میں قرآن پڑھنے پر ہی اکتفا کیا جائے اور ترجمہ و تفسیر کسی دوسرے وقت میں بیان کیا جائے۔ اور اگر رات کو لوگوں پر بار نہ ہو تو تراویح کے درمیان یا بعد میں بیان کرنا درست ہے۔" فقط واللہ اعلم بالصواب

دارالافتاء جامعہ اشرفیہ لاہور

۱۲ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ

مذکورہ بالا استفتاء اور اُن کے جوابات سے درج ذیل امور بالکل واضح ہو کر سامنے آتے ہیں:

(۱) اِس طریقۂ عبادت کو بدعت قرار دینا درست نہیں۔ ہاں اگر اسے لازمی سمجھ لیا جائے اور یہ باور کیا جانے لگے کہ تراویح صرف اِسی طور سے پڑھنا جائز اور درست ہے تب یہ بدعت اور خلافِ شرع قرار پائے گا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ ہم نے تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن کو نہ کبھی لازم سمجھا اور نہ کبھی اسے فرض و واجب قرار دیا۔ ہمارے نزدیک کوئی نہایت احمق یا بدنیت شخص ہی یہ جسارت کر سکتا ہے۔ لیکن ہمیں تعجب ہوتا ہے اُن لوگوں کے حال پر جو نمازِ تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن کو بدعت اور غیر مشروع قرار دینے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ یہ اُسی نوع کا معاملہ اور اضافہ ہے جس قسم کا اضافہ ہمارے ہاں جمعے کے نظام میں رائج اور مقبول ہے۔ دیکھئے نمازِ جمعہ کی خصوصی اہمیت خطبۂ جمعہ کی وجہ سے ہے۔ اور خطبۂ جمعہ کا اصل مقصود ہے تذکیر و موعظت! لیکن خطبہ چونکہ اصلاً عربی زبان میں ہوتا ہے اور عربی زبان سے ہماری عظیم اکثریت ناواقف و نابلد ہے لہٰذا اصل مقصود یعنی تذکیر کو کسی نہ کسی درجے میں حاصل کرنے

کے لیے علماء کرام نے خطبے سے قبل اردو زبان میں بیان و تقریر کا سلسلہ شروع کیا جسے نہ صرف یہ کہ تمام مسالک کے فقہاء سندِ جواز عطا کرتے ہیں بلکہ اس پر سب عمل پیرا بھی ہیں۔ تراویح میں قرآن سننے اور سنانے سے اصل مقصود بھی یہ ہے، جیسا کہ جامعہ نعیمیہ لاہور کے محترم مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہ، نے تحریر فرمایا ہے کہ "شریعت کا منشا یہ ہے کہ سال میں کم از کم ایک بار تمام مسلمان قرآن کریم یعنی اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکام کو تازہ کرسکیں اور ہر مسلمان قرآن کریم میں ارشاداتِ الٰہی سے واقف ہو"۔ لیکن یہاں بھی حصولِ مقصد کی راہ میں وہی رکاوٹ سامنے آتی ہے جس کا تذکرہ خطبۂ جمعہ کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اگر ہر چار رکعت تراویح سے قبل پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ مع مختصر تشریح کے بیان کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ طریقہ شریعت کے منشا کے عین مطابق بھی ہے۔

(ii) محترم مفتی نعیمی صاحب نے لفظ 'تراویح' کی وضاحت فرما کر اس وسوسے کے ازالے کا سامان بھی کر دیا کہ ترجمۂ قرآن کے ساتھ تراویح ادا کرنے سے ہر چار رکعت کے درمیان میں جو وقفہ آجاتا ہے اس سے شاید اس عبادت کی روح مجروح ہوتی ہو۔ مفتی صاحب نے وضاحت فرمادی کہ اس عبادت کو تراویح کہا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس میں ہر چار رکعت کے بعد وقفہ کرنا مطلوب و محمود ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ ان وقفوں میں اگر قرآن ہی کا بیان ہو اور اس طرح قرآنی آیات کو سمجھنے سمجھانے اور پھر تراویح کی رکعات میں اُن آیات کی سماعت ہی میں تمام رات بسر ہوتی ہو اور مقصود یہ ہو کہ قرآن کے انوار اور اس کی برکات کو زیادہ سے زیادہ سمیٹا جاسکے تو یہ وہ چیز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان کے مطابق نہایت پسندیدہ ہی نہیں، آخرت میں قرآن کی شفاعت کا حقدار بنانے والی بھی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

اَلصِّیَامُ وَالْقُرْاٰنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَقُوْلُ الصِّیَامُ اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ وَیَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ فَیُشَفَّعَانِ

"روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا

کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما
اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے
روکے رکھا تھا، پس آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما چنانچہ روزہ
اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی۔

اِس حدیثِ مبارکہ میں "منعتُهُ النومَ باللیل" کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اگرچہ رمضان المبارک میں راتوں کو جاگ کر عبادت کرنا دن کے روزے کی طرح فرض نہیں قرار دیا گیا لیکن مطلوب یہی ہے کہ انسان ماہ صیام کی راتیں جاگ کر گزارے، اور اس شب بیداری میں بھی محض تسبیحات پھیرتے رہنے یا نوافل کے ڈھیر لگانے سے اس حدیث کا منشا پورا نہیں ہوگا بلکہ مقصود یہ ہے کہ قرآن کی معیت میں رات بسر کی جائے۔ نوافل میں قرآن کا زیادہ سے زیادہ حصہ پڑھنا اور اس کے انوار سے اپنے سینے کو منور کرنا یقیناً افضل ہے، لیکن اگر قرآن کو سمجھنے سمجھانے پر بھی وقت لگایا جائے تو اس سے بھی وہ مقصد پورا ہوتا ہے جس کا اشارہ 'منعته النوم باللیل' کے الفاظ میں ملتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں منشائے شریعت کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالنے اور رمضان المبارک کی راتوں کو اس طور پر گذارنے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا بشارت اور قرآن کی شفاعت کے حقدار بن سکیں (آمین)

اسلام آباد کمیونٹی سنٹر میں امیر تنظیم اسلامی کے ماہانہ درسِ قرآن کا سلسلہ گذشتہ چند ماہ سے تعطّل کا شکار ہے اور راولپنڈی / اسلام آباد میں مقیم تنظیم اسلامی کے رفقاء و احباب اور شرکائے درس اس کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل صورتِ حال سے رفقاء و احباب کو آگاہ کر دیا جائے۔

امیر تنظیم اسلامی کے دروسِ قرآن و خطاباتِ عام کے سلسلے میں اگرچہ تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کا اصولی فیصلہ تو یہ تھا کہ بیرون لاہور اس نوع کے تمام پروگرام حتی الوسع کم کر دیئے جائیں تاکہ امیر تنظیم کو مرکز میں رہ کر قرآن اکیڈمی کے معاملات اور تصنیف و تالیف کی جانب توجہ دینے کے لیے مناسب فراغت میسّر آسکے، تاہم کراچی اور اسلام آباد کے 'شام الہدیٰ' پروگراموں کے بارے میں رائے یہ بنی تھی کہ ایک سال کے

تذکرہ وتبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

عالمی امّتِ مسلمہ بالخصوص مسلمانانِ پاکستان کے زوال و اضمحلال کے اسباب

۵ مئی ۸۹ئ کے خطابِ جمعہ کی تلخیص

ترتیب وتسوید: حافظ خالد محمود خضر

ابوظبی میں دورہ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کے بعد پاکستان واپس پہنچ کر امیر تنظیم اسلامی نے مسلسل تین خطاباتِ جمعہ میں ملک و ملّت کے بعض نہایت اہم مسائل پر اظہارِ خیال فرمایا۔ ان خطبات کو بجا طور پر قومی ملّی وسیاسی مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کے فکر کا نچوڑ قرار دیا جاسکتا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر تینوں خطابات کا خلاصہ تذکرہ و تبصرہ کے مستقل عنوان کے تحت ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے۔ پہلا خطاب رفیقِ محترم حافظ خالد محمود خضر کا مرتب کردہ ہے جبکہ دیگر خطابات کی تلخیص چونکہ ہفت روزہ 'ندا' کے صفحات کی زینت بن چکی تھی لہٰذا انہیں 'ندا' کے تشکر یے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ ادارہ

ماہ رمضان المبارک، نیکیوں کا موسمِ بہار رخصت ہورہا ہے۔ لائقِ تہنیت و مبارکباد ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس کی برکتوں اور سعادتوں سے بھرپور فیض حاصل کیا اور لائقِ ہمدردی و تعزیت ہیں وہ کہ جن کی زندگیوں میں یہ ماہ مبارک آیا لیکن وہ اس کی برکتوں اور سعادتوں سے محروم رہے۔

اس ماہِ مبارک کے دو حصے ہیں ___ دن کا روزہ اور رات کا قیام۔ بدقسمتی سے ایک

طویل عرصے سے ہماری پوری توجّہ اس کے پہلے حصے ہی پر مرتکز رہی اور اس کے دوسرے حصے کی حیثیت محض رسمی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ دین کے معاملات میں زوال و اضمحلال کی وجہ سے بہت سے پہلوؤں سے ہمارے تصورات میں محدودیت پیدا ہوئی اور بحیثیت مجموعی ایک رسمیت (RITUALISM) اور محض ایک ظاہر پرستی کا معاملہ ہوا' اور بعض معاملات ایسے ہیں کہ جن سے ان کی روح بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ انہی میں سے ایک معاملہ ماہ رمضان المبارک کا ہے۔ رمضان المبارک کے پروگرام کی اصل روح روزہ نہیں بلکہ قرآن حکیم سے استفادہ ہے۔ روزہ بھی درحقیقت اسی لئے فرض کیا گیا کہ اس کا حاصل' اس کی غرض و غایت اور اس کا نتیجہ تقویٰ ہے' جو قرآن حکیم سے انتفاع اور استفادے کی شرط لازم ہے۔ دن بھر روزہ رکھ کر' اپنے حیوانی تقاضوں پر قدغن کو برداشت کرتے ہوئے تقویٰ کی جو بھی پونجی ہاتھ آئے اسے لیکر اب رات کو اللہ کے حضور قیام کیا جائے تاکہ باطن پر قرآن مجید کا ترشح ہو' ضمیر پر قرآن کا نزول ہو' جس کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے بایں الفاظ کی ہے کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی' نہ صاحبِ کشّاف

یہ درست ہے کہ تفسیریں قرآن فہمی میں ممد ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا فہم انسان پر اسی وقت کھلتا ہے جبکہ اس کے اپنے دل پر اس کا نزول ہو۔ دوسرے یہ کہ انسان اس جدّوجہد میں عملاً مشغول ہو جائے کہ جس کی طرف قرآن حکیم رہنمائی کرتا ہے۔ آپ جوں جوں اس راہ میں قدم بڑھاتے چلے جائیں گے قرآن اپنے آپ کو آپ پر' آپ کے شعور پر REVEAL کرتا جائیگا اور آپ پر اس کے علم و حکمت اور معرفت کے موتی اور عملی رہنمائیاں منکشف ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن اگر آپ اس کے لئے ایک قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں ہوں گے اور بس الفاظ و معانی کی لغوی بحثوں میں پڑے رہیں گے تو یہ قرآن کے شہرِ معنیٰ کے ارد گرد چکر لگانے کے مترادف ہو گا اور آپ اس میں داخل نہ ہو سکیں گے۔

صیام اور قیام ــــــــ دو متوازی پروگرام

رمضان المبارک کے دو حصوں میں سے دن کا روزہ تو ہر تندرست' مقیم مسلمان پر فرض کیا گیا ہے' لیکن یہ اللہ کی شفقت اور اس کی شانِ رؤفی و رحیمی کا ایک مظہر ہے کہ اس نے اس کے دوسرے حصے کو ہر مسلمان پر فرض نہیں کیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی امت کے

حق میں رؤف و رحیم ہیں۔ آپؐ کی شفقت ملاحظہ ہو کہ تین دن نمازِ تراویح مسلمانوں کے ساتھ با جماعت ادا کی' لیکن چوتھے روز آپؐ اس کے لئے اپنے حجرۂ مبارکہ سے بر آمد نہیں ہوئے کہ کہیں آپؐ کی مداومت کے باعث یہ عبادت امّت پر فرض نہ کر دی جائے۔ اللہ کے علم میں ہے کہ اس کے کتنے ہی بندے ایسے ہیں جو دن بھر شدید محنت و مشقت پر مجبور ہیں اور ان کے لئے پوری رات کا جاگنا ممکن نہیں ہے۔ انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اس کی کمزوریوں سے اس کے خالق سے بڑھ کر اور کون واقف ہو گا؟ بفحوائے الفاظ قرآنی: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ "کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا؟" چنانچہ اس دوسرے حصے کو فرض نہیں کیا گیا' لیکن اس کے لئے ترغیب و تشویق کا ایسا انداز اختیار کیا گیا کہ ہر مسلمان کے لئے جتنا ممکن ہو اس کے اندر آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ ہدف یہ سامنے رکھے کہ دن کا روزہ اور رات کا قیام دونوں پروگرام بالکل متوازی (PARALLEL) اور ہم وزن ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن اپنے خطبے میں' جسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے' رمضان المبارک کی فضیلت بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً وَ قِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا "اللہ نے اس کا روزہ رکھنا فرض قرار دیا اور اس کی راتوں کے قیام کو (بندوں کی) مرضی پر چھوڑ دیا ہے"۔ لیکن یاد رکھئے کہ مرضی پر تو ہر رات ہے۔ اللہ کے بندے رمضان کے علاوہ بھی راتوں کو جاگتے ہیں۔ رمضان مبارک میں اس کی طرف اشارہ کر کے گویا خصوصی ترغیب دلا دی گئی۔

یہاں ایک اور نکتہ غور طلب ہے کہ ہم نے "قیام لیلہ" سے صرف نماز تراویح مراد لے لی ہے' جبکہ احادیث میں دن کا روزہ اور رات کا قیام دونوں چیزیں متوازن اور متوازی طور پر آتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق جو متفق علیہ ہے' حضورؐ نے ارشاد فرمایا: مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَ احْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ ۔ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ ...... "جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان اور احتساب کے ساتھ بخش دیئے گئے اس کے تمام پچھلے گناہ اور جس نے قیام کیا رمضان (کی راتوں) میں ایمان و احتساب کے ساتھ اس کے بھی بخش دیئے گئے تمام پچھلے گناہ"۔ آپ خود اندازہ کر لیجئے کہ "صَامَ رَمَضَانَ" اور "قَامَ رَمَضَانَ" کے الفاظ کس قدر متوازن ہیں اور اسلوب میں کس قدر مشابہت ہے۔ اسی طرح عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں' جسے امام بیہقی

شعب الایمان میں لائے ہیں' حضورؐ نے فرمایا: الصِّیامُ و القراٰنُ یَشفعَانِ لِلعَبدِ "روزہ اور قرآن ایک بندۂ مومن کے حق میں شفاعت کریں گے" ۔ یَقولُ الصِّیامُ ای ربِّ منعتُه الطعامَ و الشهواتَ بِالنّهارِ فَشَفِّعنِی فِیهِ "روزہ کہے گا کہ اے رب میں نے اسے دن کے وقت کھانے پینے اور شہوانی خواہشات سے روکے رکھا' پس اس کے بارے میں میری سفارش قبول فرما!" وَ یقولُ القراٰنُ منعتُه النّومَ بِاللّیل فَشَفِّعنِی فیه "اور روزہ کہے گا کہ میں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکے رکھا' پس اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما!" فَیُشَفَّعان ۔ "پس ان دونوں کی شفاعت قبول ہوگی" ۔ اب کیا ہم بس گھنٹہ بھر جاگ لینے سے قرآن کی اس شفاعت کا مصداق بن جائیں گے؟ حدیث کا مفہوم تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دن بھر بھوک وغیرہ سے رکے رہے' اسی طرح رات بھر نیند سے رکے رہنا اور قرآن کے ساتھ جاگنا' یہ ہے وہ شے کہ جس کی بنیاد پر قرآن حکیم شفاعت کرے گا۔ یہ درست ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف نماز تراویح ہی کا با جماعت اہتمام فرمایا' لیکن حضرت عمرؓ کے اس اقدام میں امتِ مسلمہ کی عظیم اکثریت کی مصلحت پیش نظر تھی کہ ہر مسلمان بیس رکعت تک تو با جماعت ادا کرلے۔ محنت و مشقت کرنے والا مسلمان بھی ڈیڑھ دو گھنٹے تو رات کو نکال ہی سکتا ہے۔ آج ہم نے اس تراویح کو بھی ایک رسم (RITUAL) بنالیا ہے اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے پر ادا ہو رہی ہے کہ لوگ کسی طوفان میل حافظ کو تلاش کرتے ہیں جو کم سے کم وقت میں اس رسم کو پورا کردے۔ بہرحال دین کی روح یہ معلوم نہیں ہوتی۔ قرآن کریم جب ماہِ رمضان المبارک کا تعارف کراتا ہے تو وہ اسی اعتبار سے کہ شَهرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنزِلَ فِیهِ القُراٰنُ ۔ یہ تو وہ ماہِ مبارک ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر اس ماہ کو روزے کی عظیم عبادت کے لئے منتخب کیا گیا اور اس میں پیش نظر یہی ہے کہ آدمی قرآن کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو جائے اور بے اختیار اس کے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کی حمد و ثنا کے چشمے جاری ہو جائیں۔ از روئے الفاظ قرآنی وَ لَعَلَّکُم تَشکُرُونَ ۔

تحدیثِ نعمت

اس ضمن میں مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی فضل ہوا ہے' اسے میں " وَاَمَّا بِنِعمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّث " کی رو سے عرض کر رہا ہوں کہ گذشتہ پانچ چھ سال

ے ہم نے نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا سلسلہ شروع کیا ہے اور رمضان میں ہماری پوری پوری راتیں قرآن کے ساتھ بسر ہوتی ہیں۔ چند سال لاہور اور کراچی میں یہ کام کرنے کے بعد اس دفعہ میں نے ابوظبی میں چوبیس راتوں میں دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا ہے۔ اگلے سال کے رمضان کے لئے شکاگو کے احباب نے مجھ سے وعدہ لے لیا ہے اور بشرطِ زندگی 'بشرطِ صحت وعافیت اور حالات کی موافقت اور یہ تمام شرائط ایک شرط میں مضمر ہیں کہ اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ سال میں دورۂ ترجمۂ قرآن شکاگو میں کروں گا اور ان احباب کے اصرار پر یہ دورۂ ترجمۂ قرآن انگریزی زبان میں ہوگا۔

عدو شرّے برانگیزد.....

اس سال اس دورۂ ترجمہ قرآن کے ضمن میں ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ "وہ مردہ میں سے زندہ کو برآمد کرتا ہے اور زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے"۔ اسی طرح اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ شر میں سے خیر برآمد فرمادیتا ہے۔ پچھلے سال ہمارے اس کام کے بارے میں کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں کہ یہ ایک بدعت شروع ہو گئی ہے 'اس طرح ساری ساری رات جاگنا تو بالکل ایک نئی رسم ہے جو اسلاف میں نہیں پائی جاتی ـــ

یہ بات ایک ایسے حلقے کی طرف سے آئی تھی جو میرے نزدیک 'حدرجم' ایسی شے کو 'جس پر پوری امت کا تواتر کے ساتھ اجماع ہے' رد کرنے کے باعث منکرینِ سنّت میں شامل ہے۔ ان لوگوں کے منہ پر اب یہ بات بجتی ہی نہیں کہ وہ سنّت اور بدعت کی بات کریں 'لہٰذا ہم نے ان کو لائقِ اعتناء نہیں سمجھا۔ اس مرتبہ اس سلسلے میں جامعہ اسلامیہ ' بنوری ٹاؤن کے دارالافتاء سے ایک فتویٰ آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زیر تربیت نوجوان مفتی صاحب جنہیں کسی سبب سے ہم سے کوئی پرخاش ہوگی 'انہوں نے فتویٰ داغ دیا کہ یہ بدعت ہے اور ضلالت و گمراہی ہے۔ اس شر میں سے اللہ نے خیر یہ برآمد کیا کہ ہمارے ساتھیوں نے جب اس سلسلے میں جامعہ اشرفیہ لاہور ' جامعہ نعیمیہ لاہور ' دارالعلوم کراچی جیسے متعدد مستند دارالعلوموں کے مستند ترین اور معتمد ترین مفتی حضرات کی طرف رجوع کیا تو ان سب حضرات کی طرف سے وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آئی کہ یہ ہرگز بدعت نہیں ہے 'بلکہ یہی پسندیدہ ہے۔ البتہ اس میں جبر نہیں ہونا چاہئے 'شرکاء کی آزاد مرضی سے یہ کام مطلوب اور مستحسن ہے.....

چنانچہ حکمتِ رمضان المبارک کا یہ حصہ جو نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا' الحمد للہ ہماری اس کوشش کے طفیل اب علمائے کرام کی سند اور ان کی تائید کے ساتھ لوگوں کے سامنے آئے گا۔ بقول اقبال ۔

جو حرفِ ' قل العفو' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار !

"نظریۂ ضرورت" اور ہمارے علمائے کرام

دین کی بہت سی حقیقتوں پر پردے پڑتے چلے گئے اور اس میں ہمارے علمائے کرام نے بھی اپنے معاشرے سے ایک طرح کی مفاہمت اور مصالحت کر لی کہ جس چیز کا چلن جس انداز میں ہو گیا اسے چلنے دیا۔ جس طرح ہماری عدالتوں کے سامنے کبھی کبھی "نظریۂ ضرورت" کا اصول آجاتا ہے اور انہیں بعض اوقات مارشل لا جیسے اقدام کے کسی نہ کسی درجے میں جواز کا فتویٰ دینا پڑتا ہے' اسی طرح ہمارے علماء کا معاملہ بھی اکثر و بیشتر یہ ہو چکا ہے کہ جن چیزوں کا رواج پڑ جائے وہ مجبوراً اس کے ساتھ مصالحت کر لیتے ہیں اور اس کی وجہ سے دین کی بہت سی چیزیں چھپتی چلی جاتی ہیں۔اس کی ایک بہت بڑی مثال میرے سامنے اُس وقت آئی جب میں نے شادی بیاہ کے ضمن میں اصلاحی تحریک کا آغاز کیا اور سب سے پہلے میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد کا نکاح سرگودھا کی ایک مسجد میں منعقد ہوا تو مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ (سرگودھا والے) کے صاحبزادگان کو جو 'مفتیانِ شہر' مشہور ہیں مدعو کیا گیا۔ میں نے وہاں تقریر کی اور نکاح اُن سے پڑھوایا۔ انہوں نے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب یہ ہمارے کرنے کا کام تھا' ہمارے اندر ہمت نہیں تھی' اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی توفیق دی"۔ پیسے والے سیٹھ لوگ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کا دولہا مسجد میں حاضر ہو۔ وہ تو یہی چاہیں گے کہ مولوی بغل میں رجسٹر دبائے ان کے ہاں آکر سو دو سو روپے کے لالچ کے لئے بیٹھا بارات کی آمد اور نکاح کے مرحلے کا انتظار کرتا رہے۔ ہم نے اپنے علماء کے مقام کو اس درجہ گرایا ہے اور پھر انہوں نے بھی اس مقام کو مجبوراً قبول کر لیا ہے اور وہ بتاتے ہی نہیں کہ اصل بات یہ ہے جو ہمیں یوں کرنا چاہئے تھی۔ اسی طرح دیوبندی علماء کی طرف سے کچھ عرصہ قبل تک 'تیجے' یا 'سوئم' وغیرہ کی شدید مخالفت ہوتی تھی لیکن اب انہوں نے بھی اسے مشرف بہ اسلام کر کے 'قرآن خوانی' کا نام دے کر قبول کر لیا ہے۔ یہ علماء کی مجبوری ہے اور ان کے اس طرح کے اقدامات "نظریۂ ضرورت" کے تحت ہوتے ہیں۔

دورۂ ترجمۂ قرآن ـــــ قرآن سے زندہ رابطے کا ذریعہ

اسی نظریۂ ضرورت کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکمتِ رمضان المبارک سے متعلقہ دین کی ایک اہم حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ ویسے کچھ لوگ اس کا اہتمام کرتے بھی رہے کہ نمازِ تراویح کے علاوہ بھی کچھ وقت ذکر و عبادت میں صرف ہو۔ مثلاً سہارن پور میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ کی جو خانقاہ تھی وہاں رات بھر جاگنے کا اہتمام ہوتا تھا۔ وہاں ہر چار رکعت تراویح کے بعد آدھ پون گھنٹہ کا وقفہ ہوتا جس میں لوگ اپنے طور پر ذکر و تلاوت وغیرہ میں مشغول رہتے۔ الحمد للہ کہ ہمیں اللہ نے اس بات کی توفیق عطا فرمائی اور اس کی طرف رہنمائی فرمائی کہ ہم نے دورۂ ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ اب اس سلسلہ کو چلنا چاہئے اور مزید آگے بڑھنا چاہئے۔ یہ کام مشکل نہیں ہے۔ ملازمت پیشہ حضرات پہلے سے طے کر لیں کہ اس ماہِ مبارک کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کے لئے اپنی ایک ماہ کی استحقاقی چھٹی رمضان المبارک میں لیں گے۔ اس طرح یہ بہترین کمائی کا موقع ہو گا۔ اس سے بڑی کمائی اور کیا ہوگی کہ آپ راتوں کو قرآن کے ساتھ جاگیں۔ نیند کا جو طبعی تقاضا ہے وہ کسی حد تک دن میں پورا ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ دن میں جو وقت نکل آئے اس میں وہ ترجمہ جو رات کو سنا ہے اسے ایک بار دہرا لیا جائے۔ اگر کوئی شخص چند سال بھی یہ کر لے گا تو قرآن کے ساتھ اس کا ایک زندہ رابطہ قائم ہو جائے گا۔

قرآن حکیم کے ساتھ میرے اپنے رابطے کا معاملہ بحمد اللہ یہ ہے کہ اب میرے اکثر و بیشتر اوقات قرآن کریم پر غور و فکر اور تدبّر میں گزرتے ہیں۔ چاہے میں نے کسی مقام کا درس سینکڑوں مرتبہ دیا ہو لیکن جب اسی مقام کا دوبارہ درس دینا ہوتا ہے تو اس پر از سرِ نو غور و فکر کرتا ہوں۔ اس کے باوجود رمضان المبارک کے دورۂ ترجمہ قرآن کا سب سے بڑا فائدہ خود مجھے ہوتا ہے۔ از سرِ نو ایک 'RAPID READING' کا جو موقع ملتا ہے اس کی اپنی ایک تاثیر ہے۔ اس سے بہت سے حقائق از سرِ نو اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں اور بہت سے حقائق بالکل پہلی مرتبہ نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ اسی اعتبار سے میں نے آج کی جمعہ کی گفتگو کے لئے یہ عنوان مقرر کیا ہے کہ امتِ مسلمہ کے زوال اور خاص طور پر مسلمانانِ پاکستان کی موجودہ زبوں حالی کے اسباب جاننے کے لئے ہم قرآن سے رجوع کریں تو ہمیں یہ کیا جواب دیتا ہے!
اس رمضان المبارک میں ایک جمعہ میں شارقہ' دو جمعوں میں ابوظہبی اور آخری دن دبئی میں خطاب کا موقع ملا۔ انہی خطابات کے اشارات آج میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

"ہیں آج کیوں ذلیل ..." کا جواب قرآن سے

پہلا سوال جو ہم میں سے ہر شخص کے سامنے آنا چاہئے اور آتا بھی ہے 'لیکن شاید بہت سے لوگ اس پر سوچ سوچ کر تھک گئے اور اب اس پر غور کرنا چھوڑ دیا' یہ ہے جو کبھی غالب نے ان الفاظ میں کیا تھا۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ؟
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں !

اور جس کا 'شکوہ' اقبال نے ان الفاظ میں کیا تھا۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

میرے اندر اس کیفیت کا اور اس سوال کا خاص طور پر جو احساس پیدا ہوا ہے وہ اس دفعہ ابو ظہبی میں پچیس روزہ قیام کے دوران ہوا۔ اندازہ یہ ہوا کہ دولت کی ریل پیل کی انتہا ہے۔ پندرہ سولہ سال قبل جہاں لق و دق صحرا تھے وہاں اب عالی شان محل اور نظر کو خیرہ کرنے والی فلک بوس عمارتیں کھڑی ہیں۔ اس اعتبار سے وہاں کا معاشرہ آج امریکی معاشرے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ میں رات کے وقت ابو ظہبی کی 'SKYLINE' دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ جیسے لاس اینجلز کا کوئی ٹاؤن ہے۔ وہی آسائشیں انہیں بھی حاصل ہیں کہ ایک گھر میں کاروں کی تعداد اس کے افراد سے زیادہ ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود جس شے کا نام عزّت و وقار ہے کیا وہ بھی کہیں دنیا میں ان کے لئے ہے؟ کہیں محسوس کیا جاتا ہو کہ یہاں بھی کوئی قوم آباد ہے اور بین الاقوامی معاملات میں ان کی رائے کا بھی کوئی وزن ہو؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ صورتحال وہ ہے جیسے اقبال نے عبدالقادر روہیلہ کے بارے میں ایک نظم کے آخر میں کہا تھا ع۔ "حمیّت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے"۔ اسی طرح جس شے کا نام عزت و وقار ہے وہ امّتِ مسلمہ سے چھینی جا چکی۔ سوال ابھرتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ آخر عزت اُن قوموں کے لئے کیوں ہے جو کھلم کھلا کافر ہیں؟ ان میں سے وہ بھی ہیں جو اللہ کو بھی نہیں مانتے اور جو اللہ کو کسی طور سے مانتے بھی ہوں تو محمدؐ رسول اللہ کو نہیں مانتے۔ کیا اللہ کو ان سے زیادہ محبت ہے؟ نہیں..... قرآن حکیم تو بار بار کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ظالموں کو' کافروں کو' مشرکوں کو پسند نہیں کرتا..... پھر کیا سبب ہے کہ ان کو دنیا میں باعزت مقام حاصل ہے اور

ذلت ورسوائی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ ہم چاہے کتنے گئے گزرے ہیں' مسلمان تو ہیں' اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام تو لیتے ہیں' آج بھی اس گئے گزرے دور میں اس جمعۃ الوداع کو پوری دنیا میں کروڑہا کروڑ مسلمان مسجدوں میں حاضر ہوں گے اور اللہ وحدہٗ لاشریک کے حضور میں سجدہ ریز ہوں گے...... یہ وہ سوال ہے جس پر میں پہلے بھی قرآن حکیم کی روشنی میں غور کرتا رہا ہوں اور آپ کے سامنے بھی بعض چیزیں لاتا رہا ہوں' لیکن اس مرتبہ دورۂ ترجمۂ قرآن کے دوران یہ بات اور زیادہ اجاگر ہو کر میرے سامنے آئی ہے!

نفاقِ عملی

آیئے دیکھیں کہ قرآن حکیم اس سوال کا کیا جواب دیتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ قرآن حکیم کی نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا کفر کے مقابلے میں نفاق زیادہ ناپسند ہے۔ کافر تو برملا انکار کرتا ہے' اب اس سے کیا شکوہ و شکایت۔ اس کا تو جو حشر قیامت کو ہونا ہے وہ ہونا ہی ہے۔ لیکن جو اللہ کو ماننے اور امتیِ رسولؐ ہونے کا دعویدار ہو' جسے عشقِ رسولؐ کا دعویٰ بھی ہو' اگر اُس کا حال یہ ہو کہ اسے اللہ کے احکام کی پروا ہو نہ رسولؐ کے فرمان کی' نہ اس کی فکر ہو کہ قرآن نے کس چیز کو حلال کیا ہے اور کسے حرام ٹھہرایا ہے' واقعہ یہ ہے کہ وہ بدترین سزا کا مستحق ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ...... یعنی اللہ نے منافقوں کے لئے جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ مخصوص کر رکھا ہے' اس لئے کہ درحقیقت اللہ کو یہ شے زیادہ ناپسند ہے اور اسی لئے سورۃ الصف میں فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○ "اے ایمان کے دعویدارو' کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک بڑی شدید بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں!"۔ معلوم ہوا کہ یہ قول و عمل کا تضاد اللہ کے غضب کو بہت زیادہ بھڑکانے والی شے ہے بلکہ لفظ 'مقت' 'غضب' کے مقابلے میں زیادہ شدید چیز ہے۔ 'مقت' کے معنی شدید بیزاری کے ہیں۔ بیزاری اور غصے میں فرق یہ ہے کہ غصہ انسان کو وہاں آتا ہے جہاں اسے کوئی توقع ہوتی ہے' جہاں کہیں اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے' لیکن جب توقع ختم ہو جاتی ہے تو ایک شدید بیزاری پیدا ہو جاتی ہے' پھر آدمی اظہارِ غضب کرتا ہے نہ شکوہ و شکایت' بقول غالبؔ۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ   کیا کسی کا گلہ کرے کوئی!

آج پوری امتِ مسلمہ کا حال یہ ہے کہ ہم بحیثیتِ مجموعی قول و عمل کے شدید تضاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے درحقیقت عملی نفاق میں مبتلا ہیں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے غضب اور بیزاری کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

احکامِ الٰہی میں تفریق

اس ضمن میں سورۃ البقرۃ کی ایک آیت میں بارہا آپ کو سنا چکا ہوں۔ آج اسے اس لڑی میں پرو کر لا رہا ہوں جس سے اس کی کچھ اور حقیقتیں منکشف ہوں گی۔ دیکھئے "ہیں آج کیوں ذلیل.....؟" کا کس قدر واضح جواب ہمیں قرآن حکیم سے مل رہا ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ..... "کیا تم (ہماری) کتاب (اور شریعت اور ہمارے قانون) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو؟" فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ "تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو تم میں سے یہ حرکت کرے گا سوائے دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے!" اور دنیا کی زندگی کی یہ ذلت و رسوائی آج ہماری پوری امتِ مسلمہ کے ماتھے پر لکھی ہوئی ہے۔ ہم تو چلئے بھیک مانگ کر کھاتے ہیں' ہماری تو بڑی بڑی حکومتیں IMF وغیرہ کی شرائط ماننے پر مجبور ہیں' کیونکہ ظاہر ہے کہ سائل تو کہیں جا کر اپنی شرط نہیں منوا سکتا۔ لیکن میرا یہ احساس زیادہ اجاگر ہوا اپنے اُن بھائیوں میں جا کر جن کی نظر میں ہم "مساکین" ہیں' جن کے پاس دولت کے اتنے انبار جمع ہیں کہ شاید انہیں اپنی دولت کو خرچ کرنے کے لئے اب راستے یاد نہیں۔ صحرا کو گل و گلزار بنانے کے لئے ایک ایک پودے کے اوپر لاکھوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ ابوظہبی ایئرپورٹ سے ابوظہبی شہر تک جاتے ہوئے آپ کو احساس تک نہیں ہو گا کہ آپ کسی صحرا میں سفر کر رہے ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف نہایت خوبصورت پودے' گھاس اور پھولوں کے تختے ہیں اور اسلام آباد کے زیرو پوائنٹ سے پنڈی کے موڑ تک سڑک کی دونوں اطراف جس طرح اوپر اٹھی ہوئی ہیں اور سڑک نیچے ہے' اسی طرح انہوں نے دونوں طرف مصنوعی ابھار بنا دیئے ہیں۔ جہاں تک نگاہ جاتی ہے گل و گلزار ہے' یہ نظر نہیں آتا کہ پیچھے صحرا ہے___ لیکن ان کے لئے بھی دنیا میں عزت نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے اور "خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" کی خدائی وعید پوری ہوتی نظر آتی ہے اور اسی پر بس نہیں' اس طرزِ عمل کا نتیجہ قیامت کے روز کیا نکلنے والا ہے؟ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ۔ "اور

یہ قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیئے جائیں گے" ۔ اس کو جوڑ لیجئے اب اس آیت کے ساتھ کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔ "بے شک منافق تو آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے" ۔ اور یہاں بھی فرمایا : یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ۔ "شدید ترین عذاب میں جھونک دیئے جائیں گے"۔ اس آیت میں خطاب بنی اسرائیل سے ہے جو آسمانی کتابوں کے ماننے والے تھے، لیکن ان کا طرز عمل یہ تھا کہ تورات کے ایک حصے کو مانتے اور ایک کا انکار کر دیتے۔ یہی آج ہم کر رہے ہیں کہ قرآن کے کچھ حکم سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور کچھ حکم پاؤں تلے روند دیتے ہیں۔ گویا قرآن کا یہ حصہ ناقابلِ قبول ہے، یا ہم سمجھتے ہیں کہ ناقابلِ عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کو معلوم ہی نہیں تھا کہ حالات میں کیا تبدیلیاں اور کیا مشکلات پیدا ہوں گی اور اس نے ہمیں...... معاذ اللہ...... ناقص شریعت عطا کی، جبکہ دعویٰ یہ کیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔ "آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا " ۔ دین کے کسی بھی حکم کے بارے میں اگر یہ گمان کیا جائے کہ یہ ناقابلِ عمل ہے تو یہ در حقیقت کفر کے مترادف ہے۔ یہ اللہ کے علمِ کامل اور اس کی حکمتِ بالغہ کا انکار ہے اور اللہ کی اتنی بڑی بڑی صفات کا انکار اللہ کا انکار ہے۔ تو یہ ہے در حقیقت اس سوال کا جواب جو مجھے قرآن مجید سے ملا ہے۔

منافق کون ہے

اس ضمن میں ایک اشکال کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے ذہنوں میں منافق کا تصور صرف یہ ہے کہ جو شعوری اور ارادی طور پر، مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی خاطر، منافقت کر رہا ہو۔ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے اور در حقیقت یہ بھی ع "حقیقت خرافات میں کھو گئی" کے مصداق قرآن حکیم کے ایک مضمون کو گم کر دینے کے مترادف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اہل علم جن کے ذمے تھا کہ دین کے حقائق کو واضح کریں، انہوں نے اس حقیقت کو واضح نہیں کیا۔ جان لیجئے کہ شعوری منافق تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بہت کم تھے۔ ایسے لوگ آج بھی ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے کسی ملک میں جاسوسی کرنے یا تخریب کاری کی غرض سے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر چلے آئیں، بلکہ مجھے تو یاد ہے کہ کبھی ایسی خبریں بھی پڑھنے میں آئی تھیں کہ ہمارے کسی سرحدی گاؤں میں بھارت کا ہندو جاسوس سالہا سال تک امام مسجد بن کر نمازیں پڑھاتا رہا۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ ڈاڑھی رکھ کے، دینی تعلیم حاصل

کرکے' بلکہ ختنہ تک کرا کے آتے ہوں گے۔ لیکن ایسے شخص کو معلوم ہے کہ اس نے کبھی ایمان قبول نہیں کیا۔ اس کا یہاں داخلہ بھی دھوکے کے لئے ہے اور جب تک وہ یہ سوانگ رچائے رکھے گا اس سے اس کا مقصد دھوکہ اور فریب ہی ہو گا۔ منافق کی ایک قسم یہ بھی ہے' لیکن اصل نفاق وہ ہے جسے 'نفاقِ عملی' کہا جاتا ہے۔ یہ سب سے بڑا نفاق ہے۔ اس کا نقشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دو احادیثِ مبارکہ میں سامنے آتا ہے۔

۱۔ عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسولُ اللّٰہ صلیّ اللّٰہ علیہ وسلم "اٰیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ"...... زاد مسلم: "وَ اِنْ صَامَ وَ صَلّٰی وَ زَعَمَ اَنَّہٗ مُسْلِمٌ" ثم اتفقا: "اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَ اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ" ــــ (متفق علیہ)۔

ترجمہ..... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "منافق کی نشانیاں تین ہیں"۔ یہاں امام مسلمؒ نے مزید الفاظ روایت فرمائے ہیں کہ "خواہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو"۔ اس کے بعد بخاریؒ اور مسلمؒ کے متفق علیہ الفاظ ہیں کہ: "جب بولے جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور جب امانت کا حامل بنایا جائے تو خیانت کا ارتکاب کرے"۔

۲۔ وعن عبداللّٰہ بن عمرو قال قال رسولُ اللّٰہ صلیّ اللّٰہ علیہ وسلم: "اَرْبَعٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِنْھُنَّ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَھا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَ اِذَا عَاھَدَ غَدَرَ وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ"۔ (متفق علیہ)

ترجمہ..... حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چار باتیں جس شخص میں موجود ہوں گی وہ خالص منافق ہو گا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو گی اس میں اسی کی نسبت سے نفاق ہو گا' یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے۔ (۱) جب امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے' (۲) جب بات کرے جھوٹ بولے' (۳) جب عہد کرے تو بے وفائی کرے اور (۴) جب (کسی سے) جھگڑ پڑے تو آپے سے باہر ہو جائے"۔

اب امتِ مسلمہ کی حالت پر نظر کیجئے تو افراد کے استثناءات کے ساتھ' بحیثیتِ مجموعی

پوری امت میں نفاق کی یہ علامتیں نظر آئیں گی۔ یہ بڑے تلخ حقائق ہیں جن کو ہمیں دیکھنا ہوگا۔

سربلندی مومنوں کے لیے ہے

اس بحث کے آخر میں سورۂ آل عمران کی ایک آیت ملاحظہ کیجئے۔ قرآن کہتا ہے.....
اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ۔ "اگر تم مومن ہوگے تو تم ہی سربلند ہوگے!"
اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ہم سربلند نہیں ہیں، ہم تو سرنگوں ہیں۔ ہم تو اپنے دولت کے انباروں کے باوجود دوسروں کے محتاج اور ان کے در کے سوالی ہیں۔ ہماری صلح و جنگ انہی کے اشارے سے ہوتی ہے۔ ہمارے معاملات کا حل و عقد انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہاں تو کچھ کٹھ پتلیاں بیٹھی ہوتی ہیں، جو یہاں کے لوگوں پر جتنی چاہے اپنے اقتدار کی دھونس جمالیں اور اپنی سطوت کی چمک دکھالیں، لیکن ان کی اپنی ڈوریاں اور ہاتھوں میں ہوتی ہیں..... اب اس آیۂ کریمہ کو سامنے رکھیں تو ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو یہ مانئے کہ ہم مومن نہیں ہیں، یا یہ کہئے کہ قرآن کی بات غلط ہے، اللہ کا کلام جھوٹا ہے۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ! آج "عالم اسلام" موریطانیہ سے لے کر انڈونیشیا اور ملائشیا تک کتنے بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ میں ہندوستان کو بھی عالم اسلام میں شامل کرتا ہوں کیونکہ ہندوستان بالقوہ (POTENTIALLY) دار السلام ہے۔ یہ ایک ہزار برس تک دار السلام رہا ہے اور انشاء اللہ پھر بنے گا۔ اس وقت اگر نہیں ہے تب بھی آج کی دنیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی بھارت میں ہے۔ وہاں سرکاری اعداد و شمار میں مسلمانوں کی صحیح تعداد ظاہر نہیں کی جاتی اور یہ تعداد بارہ کروڑ بتائی جاتی ہے، لیکن آج وہاں کے ہندو لیڈر بھی جب گفتگو کرتے ہیں تو ان کی زبانوں پر پندرہ سولہ کروڑ کا عدد آتا ہے اور مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی کم از کم تعداد اٹھارہ کروڑ ہے۔ معلوم دنیا میں کسی اور ملک میں اتنے مسلمان جمع نہیں ہیں..... موریطانیہ سے لے کر انڈونیشیا کے بعید ترین جزیروں پر مشتمل اس خطۂ ارضی میں کون سی شے ہے جو موجود نہیں ہے؟ اس کے اندر دنیا کی زرخیز ترین زمینیں شامل ہیں، یہاں دنیا کے بہترین ذرائع و وسائل موجود ہیں، یہاں تیل جیسی دولت کے سب سے بڑے ذخائر ہیں، سبھی کچھ ہے لیکن افسوس کہ عزت نام کی شے کا وجود نہیں! سبب اس ذلت و خواری کا ــــ ان آیاتِ قرآنیہ کی رو سے ــــ یہ ہے کہ ہم امت کی سطح پر بحیثیت مجموعی عملی نفاق میں مبتلا ہیں اور قول و عمل کے تضاد کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا کفر سے بھی زیادہ

ناپسند ہے۔ تو یہ ہے "ہیں آج کیوں ذلیل..... ؟" کا جواب جو قرآن حکیم ہمارے سامنے رکھتا

اسلامیانِ پاکستان کا خصوصی انحطاط

اس ضمن میں اگلا مسئلہ مسلمانانِ پاکستان کے زوال و اضمحلال سے متعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس قدر ذلت و رسوائی آج ہمارے سر پر مسلط ہے وہ شاید دنیا میں اس وقت کسی اور مسلمان قوم کا نصیب نہیں ہے۔ پستی کی جس حد تک ہم پہنچ گئے ہیں اس پر عرب و عجم کا اور کوئی ملک نہیں۔ مصر اور ترکی کا بہرحال کچھ وقار ہے۔ ایران نے بھی دنیا میں بڑی عزت حاصل کی ہے۔ اس نے اگرچہ اپنی بعض غلطیوں کی وجہ سے اس کا ایک بڑا حصہ کھو بھی دیا ہے لیکن ایک دفعہ تو اس نے دنیا کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا اور ؏ "لڑادے ممولے کو شہباز سے" کا نقشہ دکھا دیا تھا۔ انڈونیشیا' ملائشیا اور دیگر مسلمان ممالک اس صورت حال سے دوچار نہیں' جس سے ہم ہیں۔ بنگلہ دیش کے معاشی حالات ہم سے زیادہ خراب ہونے کے باوجود وہاں کے مسلمان بہت سی چیزوں میں ہم سے آگے ہیں۔ بھارت کے مسلمانوں کے اندر آج بھی ہم سے زیادہ غیرتِ دینی موجود ہے۔ شریعتِ اسلامی کا جو بھی بچا کھچا حصہ ان کے پاس موجود ہے وہ اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کے لئے خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عائلی قوانین کے اندر کوئی دخل گوارا نہیں کیا اور اس مسئلے پر راجیو حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ بابری مسجد کے لئے بلکہ ہندوستان کی ایک ایک مسجد کے لئے وہ کٹ مرنے کو تیار ہیں۔

مضمحل معیشت اور زوال پذیر اخلاق و کردار

ہمارے ہاں بظاہر دولت کی کچھ ریل پیل نظر آتی ہے جو حقیقی نہیں' مصنوعی ہے۔ ہماری معیشت کی کوئی مستحکم بنیادیں نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں پیدا ہونے والا ہر بچہ پیدائشی طور پر ہزارہا روپے کا مقروض ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہماری بڑی تعریف کی جاتی ہے کہ یہ قوم سود کی ادائیگی میں بڑی مستعد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس لدّو اونٹ پر مزید بوجھ لادا جاسکتا ہے۔ ہماری بڑی بڑی حکومتوں کا یہ معاملہ رہا ہے کہ ہمارے وزیر خارجہ اپنا بریف کیس لے کر جاتے اور بہت سی خیرات مانگ کر لاتے تو اسے بہت بڑی کامیابی سمجھا جاتا۔ گویا یہ دنیا میں ہمارے ملک کے عزت و وقار کی علامت ہے کہ ہمیں سود پر بڑے

زنے مل جاتے ہیں۔ ہماری معیشت کا اصل حال یہ ہے کہ وہ بڑی تباہ کن سٹیج تک پہنچ چکی ہے۔ اخلاقی اعتبار سے بھی ہم قعرِ مذلت میں جا گرے ہیں۔ مجھے وہ نومسلم امریکی نوجوان عبداللہ مصطفیٰ یاد آجاتا ہے جو کئی سال پاکستان میں رہا۔ اس دوران کچھ عرصہ میرے پاس بھی مقیم رہا۔ نقش بندی سلسلے کے بزرگ سید علاؤالدین شاہ صاحب' جن کی شیخوپورہ گوجرانوالہ روڈ پر خانقاہ ہے اور کرشن نگر کی مسجد میں مجھے کئی مرتبہ ان کے ساتھ اعتکاف کرنے کی سعادت نصیب ہوئی' ان کے پاس وہ شخص سلوک کی منازل طے کرنے کے لئے مقیم رہا۔ اس نومسلم امریکی کی گواہی تھی کہ میں عالم اسلام کے تقریباً تمام ممالک میں گھوما پھرا ہوں' لیکن جو اخلاقی زوال میں نے یہاں دیکھا ہے وہ کہیں نہیں پایا۔ اس نے بتایا کہ جیسے ہی میں پاکستان میں داخل ہوتا ہوں مجھے اپنی جیب کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اور میں اپنے بٹوے کو سنبھال کر رکھتا ہوں۔ مصر' ترکی' سعودی عرب اور دیگر ممالک میں کہیں جیب کٹنے کا خوف نہیں ہوتا اور آدمی مطمئن ہو کر بازار میں چل پھر سکتا ہے' لیکن پاکستان میں یہ اطمینان موجود نہیں۔ یہ گویا ایک علامت ہے کہ یہاں پر اخلاقی زوال کس حد تک موجود ہے۔ دواؤں میں ملاوٹ بھلا دنیا کی کوئی دوسری قوم بھی کرتی ہوگی؟ ایک تو خوراک میں ملاوٹ ہے کہ چند ٹکوں کی خاطر آپ اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کی صحت سے کھیل رہے ہیں اور انہیں آہستہ آہستہ زہر کھلاتے جا رہے ہیں' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ادویات میں ملاوٹ اس سے بھی سینکڑوں گنا زیادہ گھناؤنا عمل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت اپنے گھر کے برتن بیچ کر اپنے بچے یا اپنے شوہر کے لئے دوائی لے کر آئی ہو اور اس کے پندرہ پندرہ روپے میں خریدے ہوئے کیپسول میں صرف چاک بھرا ہوا ہو۔

امن وامان کی صورتحال ۔ آتش فشاں کے دہانے پر

اس کے علاوہ ہمارے ہاں انتہائی درجے میں جو تشتت' انتشار اور بے امنی کی کیفیت اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کا معاملہ ہے یہ بھی اس درجے میں پوری دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ آپ عرب ممالک میں چلے جایئے کہیں یہ اندیشہ نہیں' ...... کہیں شاذ ہی کوئی قتل کا معاملہ ہوتا ہے اور وہ بھی اکثر و بیشتر باہر کے لوگ کرتے ہیں۔ لوگ امن کے ساتھ سوتے ہیں' زندگی کا کاروبار امن کے ساتھ چلتا ہے اور یہاں دیکھئے تو معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ سندھ کی صورت حال اس قدر خطرناک ہو چکی ہے کہ ہم گویا آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں۔ سورۂ

آلِ عمران میں الفاظ آئے ہیں...... وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ۔ "تم لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے تھے" ۔ ہمارا معاملہ آگ کے گڑھے سے بھی بہت آگے بڑھ گیا ہے اور یہ آتش فشاں کسی وقت بھی یکدم پھٹ سکتا ہے اور اس کے جو نتائج ہوں گے اس کے احساس ہی سے انسان کا دل لرز جاتا ہے اور میں تو ایک عرصے سے آپ کو وہاں کی بے چینی میں مضمر خطرات سے آگاہ کرتا رہا ہوں ۔ ایک صاحب جو ایک دینی پارٹی کے بڑے لیڈر ہیں مجھ سے سوال کر رہے تھے کہ "ڈاکٹر صاحب آپ بڑے عرصے سے سندھ کے بارے میں کہتے چلے آ رہے ہیں ' اب آپ کا کیا خیال ہے؟" اب تو یہ لوگ بھی وہ سب باتیں ماننے کو تیار ہیں جو میں سندھ کی صورت حال کے بارے میں کہا کرتا تھا اور یہ اسے دیوانے کی بڑ قرار دیتے تھے ۔ یہ کہتے تھے کہ "ہم بھی سندھ میں جاتے ہیں ' ہمیں تو یہ نظر نہیں آتا" ۔ اور جس تشویش کا اظہار میں اپنے مضامین کے اندر کیا کرتا تھا وہ اب بار بار کھل کر سامنے آئی ہے اور اب وہاں صورت حال ' چاہے سرکاری طور پر اس کی نفی کی جا رہی ہو ' واقعۃً یہ ہے کہ اندرونِ سندھ اردو بولنے والے مہاجر اور قدیم سندھی کے مابین بحیثیت مجموعی اس طرح کی نفرت اور دشمنی پیدا ہو چکی ہے جیسی کبھی ایک خاص زمانے میں ہندو مسلم کے درمیان پیدا ہو گئی تھی ۔ ابھی کچھ فرق ہے تو کمیت کا ہے ' نوعیت وہ پیدا ہو چکی ہے ۔ اندرونِ سندھ کوئی بھی مہاجر اپنے آپ کو محفوظ نہیں پا رہا اور ان پر ایک خوف اور دہشت طاری ہے ۔ حکومت نے اگرچہ وہاں کچھ حالات سنبھالنے کی کوشش کی ہے ' کیونکہ اس کے لئے تو سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہے اور اگر سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت ناکام ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر اس کا تیا پانچا ہو کر رہے گا اور اس کا پورا سیاسی کیریئر ختم ہو کر رہ جائے گا ' لیکن قانون کی حکمرانی جسموں پر ہوتی ہے ' دلوں پر نہیں ہوتی اور دلوں کے اندر نفرتیں اتنی گہری جا چکی ہیں کہ کوئی حکومت اس کا ازالہ نہیں کر سکتی ۔ تو یہ دوسرا سوال ہے کہ پاکستان کے حالات بالخصوص اس درجے خوفناک کیوں ہیں؟

نفاق کی خاص قسم کا ارتکاب

اس دوسرے سوال کا جواب قرآن حکیم کی روشنی میں یہ ہے کہ ہم نے بھی نہ صرف اُسی نفاقِ عملی کا ارتکاب کیا جس میں پوری امت مسلمہ مبتلا ہے بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ کر ایک خاص قسم کے نفاق کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ سورۃ التوبہ میں منافقین کا تذکرہ کرتے

ہوئے اس خاص نفاق کا ذکر کیا گیا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○ (التوبہ: ۷۵، ۷۶، ۷۷)

ترجمہ: "اور ان (منافقین) میں سے بعض وہ بھی ہیں، جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے (دولت) عطا فرمائے گا تو ہم خوب خیرات کریں گے اور لازماً نیک لوگوں میں سے ہو جائیں گے۔ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تو انہوں نے اس میں بخل کیا اور رخ موڑ لیا پہلو تہی کرتے ہوئے۔ تو اللہ نے سزا کے طور پر ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اُس دن تک کے لئے جب وہ اس کے حضور حاضر ہوں گے بہ سبب اس کے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس جھوٹ کے جو وہ بولتے تھے"۔

ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں غور کیجئے کہ کیا ہم نے بھی اللہ عزّوجلّ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا اور کروڑوں مسلمانوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر یہ دعائیں نہیں کی تھیں کہ یا اللہ ہمیں ہندو اور انگریز کی دوہری غلامی سے نجات عطا فرمادے تو ہم صرف تیرے بندے بن کر رہیں گے اور تیرے اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دین پر عمل پیرا ہوں گے۔ یا اللہ ہمیں ایک آزاد خطۂ ارضی عطا فرمادے، ہم اسے اسلام کا گہوارہ بنادیں گے! انڈونیشیا سے لیکر الجزائر تک تمام ممالک اسی صدی میں آزاد ہوئے ہیں، لیکن کہیں اس طرح سے اسلام کا نام نہیں لیا گیا، کہیں اسلام کا نعرہ نہیں لگا، لیکن "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الاّ اللہ" کے نعروں سے راس کماری سے لیکر درۂ خیبر تک اور چاٹگام سے لیکر مکران تک پورا برعظیم گونج گیا تھا۔ اسلام کا نام جتنا ہم نے لیا ہے، اس دور میں بحیثیتِ قوم کسی نے نہیں لیا..... لیکن اب ذرا غور کیجئے کہ قیامِ پاکستان کو نصف صدی ہونے کو آئی ہے اور ہم نے اس وعدے کا کہاں تک پاس کیا ہے! وعدہ خلافی تو انسانوں کے ساتھ بھی مذموم ہے اور ہم نے اللہ کے ساتھ اس قدر بڑی وعدہ خلافی کی! یازی بازی باریشِ بابا ہم بازی! ہم نے اللہ کے ساتھ ایک وعدہ کیا اور پھر من حیث القوم اس میں بے وفائی، غدر، جھوٹ، دھوکہ اور غداری کے مرتکب ہوئے۔ اس بدعہدی کی نقد سزا ہمیں دنیا میں یہ ملی کہ ہمارے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا گیا۔ یہ اسی بدترین

سزا کا مظہر ہے کہ اخلاق کا جس قدر بحران یہاں ہے ' دنیا میں اور کہیں نہیں۔ اور وہ مسلمان جو کبھی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ملّتِ واحدہ یا کم از کم ایک قوم کی شکل اختیار کر گئے تھے آج قومیتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ آج وہی مسلمان ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں اور کلاشن کوف سے ایک دوسرے کے سینے چھلنی کر رہے ہیں۔ آج ہماری وحدتِ ملی پارہ پارہ ہو چکی ہے اور ہمیں قدم قدم پر طرح طرح کی عصبیتوں کا سامنا ہے۔ کہیں صوبائی عصبیت ہے' کہیں لسانی عصبیت ہے' کہیں معاشی عصبیت ہے۔ یہ قرآن حکیم میں بیان کردہ عذاب کی تین صورتوں میں سے بدترین صورت ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے سورۃ الانعام کی آیت ۶۵ :

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط

ترجمہ : "کہہ دیجئے کہ اسی کو قدرت ہے اس پر کہ وہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے نازل کر دے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے (عذاب کا کوئی سوتا پھوٹ پڑے ' مثلاً زمین شق ہو جائے اور تم سب کے سب اس میں دھنس جاؤ) یا تمہیں فرقوں میں تقسیم کر کے آپس میں ٹکرا دے اور ایک دوسرے کی طاقت کا ایک دوسرے کو مزا چکھا دے۔"

آج ہم اپنی وعدہ خلافی کے سبب اسی تیسری صورت کے عذاب سے دوچار ہیں۔

نوارا تلخ ترمے زن . . . .

میری یہ باتیں بہت تلخ ہیں اور لوگ ان سے ناراض ہوتے ہیں۔ امارات میں بھی میں نے جب یہ باتیں کہیں تو بعض لوگوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ کچھ دبی دبی احتجاجی صدائیں مجھ تک پہنچیں کہ یہ کیا؟ آپ نے سب مسلمانوں کو منافق بنا دیا اور پوری امتِ مسلمہ پر نفاق کا فتویٰ لگا دیا! ایسے لوگوں سے میں سوال کرتا ہوں کہ کیا یہ قرآن کا قول ہے یا نہیں کہ "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" ۔ اب مجھے آپ زمین کا کوئی خطہ دکھا دیجئے جہاں مسلمان سربلند ہوں! اور کیا یہ قول قرآن کا ہے یا نہیں کہ اگر تم دین کے ایک حصے کو مانو اور ایک کو نہ مانو تو دنیا میں تمہیں بدترین رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آج آپ مجھے روئے زمین پر کوئی ایک انچ دکھلا دیجئے جہاں پورے کے پورے اسلام پر عمل ہو رہا ہو' جہاں پوری اسلامی شریعت نافذ

ہو۔ یہ بہت تلخ حقائق ہیں، لیکن حقائق سے غضِ بصر مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہمیں ان حقائق کو ان کے اصل پس منظر میں دیکھنا ہو گا، تبھی کوئی شکل پیدا ہو سکتی ہے کہ ہمارے اندر اصلاحِ احوال کا جذبہ پیدا ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی وعظ، برکتوں کے ذکر اور فضائل کی تعلیم سے یہ حقائق سامنے نہیں آئیں گے۔ اگر اسی کا وعظ کیا جائے کہ ایک ایک رات کے عوض یہ کچھ مل جاتا ہے اور یہ رات مل گئی تو پچھلا سارا کیا دھرا معاف ہو گیا، گویا کہ سارے کا سارا کالا دھن سفید ہو گیا۔ تو آپ بھی کہیں گے کہ یہ بڑے اچھے، دل خوش کن واعظ ہیں اور مجھے بھی اس کے لئے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہو گی۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ حقائق کو دیکھیں۔ آخر کار حقائق کا سامنا تو کرنا پڑے گا اور اس کے لئے پہلے ان کا مشاہدہ کرنا ہو گا۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ !

ایک اہم سوال

اپنی آج کی گفتگو کے تیسرے اور آخری حصے میں میں یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ اس ساری افتاد کی اصل ذمہ داری کس پر ہے۔ اگر پاکستان میں اب تک اسلام نہیں آیا تو اس کا ذمہ دار کون ہے۔ اس میں کسی کی تنقیص یا توہین پیش نظر نہیں ہے بلکہ اللہ گواہ ہے کہ یہ خود احتسابی اور خود تنقیدی کا معاملہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ہماری قومی کوتاہی ہے، اس حمام میں پوری قوم ننگی ہے اور اس کی ذمہ داری ہر ہر فرد پر عائد ہوتی ہے۔ البتہ کچھ طبقات ایسے ہیں جو اپنی حیثیت اور اہمیت کی وجہ سے اس کے خصوصی ذمہ دار بنتے ہیں۔ صحیح راستے کی طرف رہنمائی کے لئے ان کی نشاندہی ضروری ہے۔ اس پر میں ان شاء اللہ اگلے جمعہ میں گفتگو کروں گا۔

بارک اللہ لی ولکم فی القران العظیم و نفعنی و ایّا کم بالایات والذ کر الحکیم

مذہبی عناصر

انتخابی سیاست میں ناکام، احتجاجی و مظاہراتی سیاست میں کامیاب

۱۲ مئی کے خطاب جمعہ کی تلخیص

آج کی بحث کا کوئی تعلق موجودہ سیاسی گروہ بندی اور محاذ آرائی سے نہیں ہے۔ پچھلے چھ ماہ سے مرکز اور پنجاب کے درمیان جو کشمکش برپا ہے، اسے ذہن سے نکال دیجئے۔ ہماری تاریخ ان چھ ماہ کے اندر تو مقید نہیں ہے کہ اس سفر کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوا تھا۔ ۲۷ رمضان المبارک کو ہم نے ۴۳ سال پورے کر لئے ہیں۔ اس عرصے میں کیا افتاد پیش آئی، کون سی رکاوٹیں حائل رہیں کہ اس ملک میں اسلام نافذ نہ ہو سکا جو اسلام نافذ کرنے کے وعدے کے ساتھ حاصل کیا گیا تھا۔ اس سوال پر جماعتی اور تنظیمی حوالوں سے بالاتر ہو کر بھی غور کرنا ہے۔ کوشش یہ ہے کہ کسی جماعت کا نام نہ آئے۔ البتہ طبقات کا حوالہ دینا پڑے گا۔ اس تجزیئے میں لامحالہ تنقید تو شامل ہوگی۔ کہیں نہ کہیں تو کوئی گڑبڑ ہوئی ہے، کہیں نہ کہیں کوئی غلطی تو ہوئی، کسی کا قصور تو ہے۔ اتنی بڑی تحریک چلی راس کماری سے لے کر درۂ خیبر تک، چٹا گانگ سے مکران تک پورا ہندوستان "پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ سوال یہ ہے کہ تحریک اپنی منزل کیوں حاصل نہ کر سکی۔ ہمیں آج اس سوال کا جواب دینا ہے، کسی کی توہین یا تنقیص مقصود نہیں ہے۔

میرا احساس یہ ہے اور میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ کسی ایک فرد کی غلطی نہیں ہے، کسی ایک جماعت کی غلطی نہیں ہے، یہ ہماری مشترک غلطیاں ہیں۔ میری آپ سے استدعا ہے کہ آپ بھی اسی اعتبار سے اس پر غور کریں۔ یہ اجتماعی سطح پر خود احتسابی کا معاملہ ہے۔ اجتماعی سطح پر گہری سطح پر سنجیدہ تجزیئے کی ضرورت اس لئے ہے کہ صورت حال بد سے بدتر اور خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ہم صحیح تشخیص کر سکے تو آئندہ کے لئے اپنے طرز عمل کو درست کر سکیں گے اور ایک لائحہ عمل کے خطوط اجاگر ہو سکیں گے...... اس لئے آج میں اصطلاحات بھی قدرے مختلف استعمال کروں گا۔ آج اس موضوع پر سوچتے ہوئے قرآن مجید کا یہ نکتہ ذہن میں آیا کہ قرآن مجید میں ایک ہی مفہوم کے لئے مختلف اصطلاحات ہیں، مختلف اسلوب ہیں۔ اس کا سبب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف لوگوں کی طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ ایک شخص

ایک بات کو ایک طریقے سے بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے دوسرا اسی بات کی تفہیم کسی اور طریقے سے حاصل کرتا ہے اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک اصطلاح ایک ذہن میں کوئی تحریک پیدا نہیں کرتی۔ وہی بات قدرے مختلف انداز سے سامنے آئے تو ذہن وفکر اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوسکتے ہیں۔

ایک پوری قوم یا پورے گروہ کی اجتماعی کوتاہی کی ایک بہترین مثال سورۃ النور میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا واقعہ ہے..... "کہ جو لوگ بھی اس میں شریک ہوئے' انہوں نے اس گناہ میں سے حصہ پالیا؟ البتہ ایک شخص ایسا بھی ہے کہ جس نے اس کا سب سے بڑا حصہ کمایا ہے"۔

ہم نے آزادی سے کیا حاصل کیا؟

میری رائے میں پاکستان میں اسلام اس لئے نافذ نہ ہوسکا کہ پوری قوم قول وعمل کے تضاد میں مبتلا ہے۔ "تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے"۔ یہ پوری امت مسلمہ کا حال ہے۔ دین کے علمبردار بھی دین پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔ بعض حصوں کو انہوں نے حالات کی مجبوری قرار دے کر اور بہانہ بنا کر ترک کر دیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے گریبان میں جھانکے۔ ہم نے آزادی کا مطلب یہ سمجھا کہ دنیاوی ترقی کے لئے راستے کھل گئے۔ ترقی کے راستے میں ہماری غلامی بھی حائل تھی اور اس سے کہیں بڑھ کر ہندو حائل تھا۔ ہندو ہم سے زیادہ بیدار تھا' ہم سے زیادہ محنتی تھا' ہم سے زیادہ منظم تھا۔ وہ تعلیم میں ہم سے آگے نکل گیا تھا' تجارت کے میدان میں تو وہ پہلے ہی آگے تھا اور اگر وہ موجود رہتا تو مسلمانوں کو اس قدر آگے بڑھنے کے مواقع نہ ملتے۔ پاکستان بنا تو ترقی بھی ہوئی' ہمارے ہاں برلا اور ٹاٹا نہیں تھے' اب ہمارے ہاں برلا اور ٹاٹا کے باپ پیدا ہوگئے ہیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ایک ہی سیاسی جماعت تھی اور وہ مسلم لیگ تھی' احرار نے پاکستان بننے کے بعد سیاسی میدان سے پسپائی اختیار کر لی' جماعت اسلامی نے اس سے پہلے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا' اس کی سیاست محض نظری تھی۔ پاکستان بننے کے بعد سیاسی منظر پر کئی جماعتیں نمودار ہوئیں' ری پبلکن پارٹی' نیشنل عوامی پارٹی' جناح لیگ' عوامی لیگ' جناح عوامی لیگ ــــــ ان میں سے بعض مسلم لیگ ہی کے انڈے بچوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سیاسی جماعتوں کے حوالے سے ایک بنیادی اور اصولی بات یہ ہے کہ کسی پارٹی کے نام میں مسلم کا لفظ موجود ہو یا نہ رہا ہو' سیاسی جماعت عوام کی ذہنی سیاسی تربیت کرتی ہو یا نہ کرتی ہو' یہ انہی

کی ذہنی و سیاسی حالت کی عکاسی کرتی ہے، خواہ اسے عوام کی محدود سی حمایت ہی حاصل ہو۔
عوام کی جو بھی حالت ہو وہ آپ کو زیادہ گاڑھی شکل میں سیاسی جماعت میں نظر آجائے گی۔
اگر عوام میں دیانت ہے، امانت ہے، سچائی ہے تو سیاسی جماعت میں اس سے زیادہ دیانت
امانت ہوگی اور اگر لوگوں کے اندر دھوکا ہے، جھوٹ ہے، بدعہدی ہے تو یہ عیب سیاسی
جماعت میں بہت زیادہ گاڑھی شکل میں نمایاں ہو جائیں گے۔ جماعتوں کا جائزہ لینے
کے لئے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ ان فعال مذہبی عناصر کا ہے جو
خالصتاً غیر سیاسی ہیں، سیاست کے میدان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں، ان کا کام درس و
تدریس، تعلیم و تصنیف، نصیحت و تلقین، جمعہ و جماعت رہا۔ پاکستان میں خاص طور پر مغربی
پاکستان میں، دار العلوم بہت کم تھے، ہماری دینی ثقافت کا اصل مرکز یوپی تھا۔ دہلی سے بہار
تک، دار العلوم دیوبند ہے، ندوۃ العلماء ہے، مظاہر العلوم ہے، اعظم گڑھ کے مدارس
ہیں۔ مغربی پاکستان کے علاقے میں...... جواب پورا پاکستان ہے...... سیاست سے دلچسپی نہ
رکھنے والے مذہبی عناصر نے دینی درسگاہوں کی کمی دور کی۔ انہوں نے بہت محنت و مشقت
سے یہ بیش قیمت کام سرانجام دیا اور بڑے بڑے دار العلوم وجود میں آئے، جامعہ اشرفیہ
عظیم الشان دار العلوم ہے، کبھی نیلا گنبد کی ایک مختصر سی مسجد میں چھوٹے چھوٹے حجروں تک
محدود تھا۔ کراچی کا بنوری ٹاؤن کبھی ایک چھپر تھا۔ ایک بڑے ٹرنک میں کتابیں محفوظ رکھی
جاتی تھیں کہ بارش سے برباد نہ ہو جائیں۔ یہ علماء کی جگر کاویاں ہیں، کتنی ہی روشن زندگیاں
اس جدوجہد میں لگا دی گئیں، جن سے یہ منظر پیدا ہوئے۔ اسی حلقے کا ایک تحریکی حصہ تبلیغی
جماعت ہے۔ اس جماعت نے کتنی ترقی کی ہے ان کا بھی وہی کام ہے تلقین و نصیحت۔ یہ
جماعت نہ صرف غیر سیاسی ہے بلکہ ایک اعتبار سے اسے سیاست دشمن (ANTIPOLITICS)
کہا جاسکتا ہے۔ یہ دار العلوم نہ ہوتے تو مساجد کیسے آباد ہوتیں، یہ خطیب اور امام کہاں سے
آتے۔ مذہبی احساس کے ڈھانچے کو برقرار اور قائم رکھنے میں ان اداروں کا بڑا کردار ہے۔
تاہم یہ ادارے کتنے ہی قابل قدر کیوں نہ ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ انہوں نے حصولِ آزادی

سے پیدا ہونے کے تقاضوں کو محسوس کیا اور نہ انہیں ادا کرنے کی طرف کوئی توجہ دی۔ ان کا
جوش آزادی سے پہلے تھی وہی آزادی کے بعد بھی برقرار رہی، جو نصاب وہ آزادی سے پہلے
پڑھا رہے تھے، وہ آزادی کے بعد بھی وہی پڑھاتے رہے۔ انہوں نے تبدیلی کی اہمیت کو سمجھا

ہی نہیں کہ اس آزاد ملک کے اندر کس قسم کے علماء ہمیں تیار کرنے کی ضرورت ہے' ان میں کیا صلاحیتیں ہونی چاہئیں' یہ کہ اگر ہمیں یہاں اسلام کو عملاً برپا کرنا ہے تو کیا استعداد ہمیں فراہم کرنی چاہئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تقلید ان کے ہاں اصولِ موضوعہ بن چکی ہے' طرز زندگی اور ایک عادتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ ایوب خان کے دور میں نظریاتی کونسل کے سربراہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے "مجموعہ قوانین اسلامی" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ اس پر مولانا بنوری ؒ نے ایک تائیدی و تحسینی شذرہ لکھ دیا۔ بعض علماء نے اس پر ناخوشی کا اظہار کیا کہ مولانا بنوری نے ایک جدید تعلیم یافتہ دانشور کی حوصلہ افزائی کیوں کی۔ اس پر مولانا بنوری ؒ نے فرمایا کہ ہم وہ کام نہیں کر رہے جو ہمیں کرنا چاہئے اور اس سے آگے بڑھ کر ہماری غلطی یہ ہے کہ اگر کوئی اور یہ کام کرتا ہے تو ہمیں اچھا معلوم نہیں ہوتا اور ہم اس کی تائید اور تحسین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے عوام کا جو طبقہ مدرسے اور دار العلوم چلانے والے غیر سیاسی علماء کے زیر اثر آیا' ان میں عمومی بے چینی موجود رہی۔ اس بے چینی کا فائدہ اٹھایا غیر مذہبی طالع آزماؤں نے یعنی اگر مذہب کے نام پر کوئی سیاسی تحریک اٹھی تو اسے سیاسی طالع آزماؤں نے اچک لیا۔ مذہبی لوگ تو سمجھتے ہی نہ تھے کہ معاشرہ کدھر جارہا ہے' سیاست کا رخ کیا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر حضرات کا اندازِ فکر یہ تھا کہ صرف چمڑی کی رنگت بدلی ہے پہلے گوری چمڑی والے ہم پر حکمران تھے' اب وہ کالے انگریز ہم پر حکمران ہیں اور یہ بات اپنی اصل کے اعتبار سے حقیقت کے خلاف بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ جن لوگوں کے پاس اقتدار و اختیار آیا خاص طور پر سول اور آرمی بیورو کریسی میں سے تو عقیدت کے اعتبار سے' معاشرت کے اعتبار سے' اپنی وضع قطع کے اعتبار سے' اپنی نشست و برخواست کے اعتبار سے اپنے تہذیبی طور اطوار کے اعتبار سے یہ لوگ بڑی حد تک مغربی تھے۔ علماء میں یہ احساس موجود رہا اور ان کے زیر اثر ان کا احساس عوام میں منعکس ہوتا رہا' چنانچہ عوام میں بے چینی موجود رہی۔ لہٰذا جب سیاسی تحریک میں اسلام کا نعرہ لگا اور عوام میں تحریک کا ولولہ پیدا ہو گیا تو غیر سیاسی مذہبی عناصر بے اثر اور غیر متعلق ہو کر رہ گئے۔

نظری اور عملی سیاست کا فرق اور مذہبی عناصر کا کردار

سوال یہ ہے کہ سیاسی سطح پر فعال دینی حلقے کا کردار کیا رہا۔ سیاست کو دو حصوں میں بانٹ دیجئے' نظری سیاست اور عملی سیاست۔ نظری سیاست کی سب سے بڑی مثال صحافی

حضرات ہوتے ہیں کہ وہ اگرچہ الیکشن نہیں لڑتے، کبھی پاور پالی ٹیکس کے اندر خود کھلاڑی کی حیثیت سے شریک نہیں ہوتے، لیکن فضا ہموار اور رائے عامہ تیار کرتے ہیں، کسی ایک کے حق میں، کسی دوسرے کے خلاف۔ سرگرم اخبار نویس نظری سیاست میں بھرپور حصہ لینے کی بہترین مثال ہیں اگرچہ وہ عملاً سیاست کے میدان میں نہیں ہوتے۔ دوسرا حصہ عملی سیاست ہے۔ عملی سیاست کے پھر دو حصے ہیں، ایک انتخابی سیاست جس کے پیشِ نظر نظام کو بدلنا نہیں ہوتا بلکہ نظام کو چلانے والے ہاتھوں کو بدلنا ہوتا ہے، ایک انقلابی سیاست ہے جس کے پیش نظر رائج نظام کو یکسر بدل ڈالنا ہے۔ ایک ہے انتخابی سیاست یا براہِ راست حصول اقتدار کے لئے جدوجہد کی سیاست، جسے آپ کہیں گے الیکشن پالی ٹیکس یا پاور پالی ٹیکس۔ دوسرے حصے کے لئے تین اصطلاحیں استعمال کی جا سکتی ہیں۔ احتجاجی سیاست، مطالباتی سیاست، مظاہراتی سیاست۔ سیاسی تحریکیں چلتی ہیں، مظاہرے ہوتے ہیں، ایجی ٹیشن ہوتا ہے اس میں بھی ظاہر بات ہے کہ کوئی نہ کوئی سیاسی نقطۂ نظر سامنے ہوتا ہے۔ کبھی کسی کو گرانا مقصود ہے، کسی کو ابھارنا مقصود ہے۔ اگرچہ اس میں بھی اکثر و بیشتر پاور پالی ٹیکس ملوث ہو جاتی ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ الگ بھی ہیں۔

میزانیۂ نفع و نقصان

اب ذرا چالیس سالہ تاریخ کا جائزہ لیجئے کہ ہمارے ہاں ان دونوں سیاستوں کے اعتبار سے حال کیا رہا ہے۔ فعال مذہبی حلقے انتخابی سیاست میں بری طرح ناکام رہے، جبکہ احتجاجی سیاست، مظاہروں اور مطالبوں کی سیاست میں وہ نہایت کامیاب رہے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۰ء تک جو بھی انتخابی معرکے برپا ہوئے، ان میں مذہبی جماعتوں کو کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ایک خاص جماعت کراچی کارپوریشن کے لوکل الیکشن میں سرخرو ہوتی رہی لیکن صوبائی اور قومی سطح پر اسے کبھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مرکزی سطح پر تو بعض نمایاں رہنما جیت گئے تھے کہ جو گرمیٔ محفل کو برقرار رکھ سکتے تھے۔ اگرچہ وہ مؤثر ہرگز نہ تھے۔ اس جماعت کے علاوہ دوسرے مذہبی عناصر میں سے بھی کوئی بھی مؤثر گروپ اسمبلی میں نہ پہنچ سکا۔ صرف صوبہ سرحد میں ایک مذہبی جماعت کو ایسی حیثیت حاصل ہوئی تھی کہ وہ مخلوط وزارت میں شامل ہوئی۔ اب ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں اسی جماعت کو بلوچستان میں یہ حیثیت حاصل ہوئی ہے کہ وہ مخلوط وزارت میں شامل ہے۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے کچھ

تھوڑی سی شرکت ملی ہے اقتدار میں' لیکن کس قیمت پر۔ اپنا تشخص ختم کر کے' اپنے آپ کو ایک اتحاد میں مدغم کر کے' دوسرے یہ کہ اسے جو بھی حیثیت حاصل ہے وہ اصل میں اس کی سٹریٹ پاور کی بنیاد پر ہے۔ وہی ایجی ٹیشن اور مظاہرے کی سیاست میں استعمال ہونے والی قوت ورنہ عددی اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اتنے فعال دینی عناصر الیکشن کے میدان اس بری طرح ناکام کیوں ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں سیاست میں کامیابی اور قوت کی کلیدی اصل پاور بیس (POWER BASE) جاگیرداری' زمینداری اور سرمایہ داری ہے۔ جب تک طاقت کی اس بنیاد میں کوئی تبدیلی نہ ہو الیکشن کے نتائج میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ سندھ کی سطح پر جاگیرداری اور زمینداری' پنجاب کی سطح پر زمینداری اور سرمایہ داری۔ اکثر و بیشتر تو زمینداری کا ہی معاملہ ہے۔ کبھی کبھی کوئی سرمایہ دار گروپ بھی میدان میں آجاتا ہے' شاذونادر ___ درحقیقت سرمایہ دار بھی اکثر و بیشتر وہی ہے جو بنیادی طور پر زمیندار ہے۔

دوسرا بڑا سبب جس نے مذہبی عناصر کی ناکامی کو اور زیادہ نمایاں کر دیا وہ آپس کی چپقلش اور دھینگا مشتی ہے۔ اگر اسلام کے نام پر ایک محاذ وجود میں آگیا ہوتا تو یقیناً وہ اس حشر سے دوچار نہ ہوتے۔ مذہبی ووٹ تقسیم ہوا اور اس کا بہت بڑا منفی نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ واریت کے جراثیم زیادہ گہرائی میں اتر گئے۔ اس لئے کہ سیاست کی تلخیاں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ یہ تمام مذہبی عناصر کی کارگزاری ہے' کسی ایک کی نہیں۔ اس کے برعکس مطالباتی' احتجاجی اور مظاہراتی سیاست کے اندر یہی دینی عناصر معاشرے کی مؤثر ترین قوت ہیں۔ مطالباتی سیاست کی سب سے پہلی اور عظیم کامیابی مطالبۂ دستورِ اسلامی کی مہم تھی' جس کے نتیجے میں قراردادِ مقاصد پاس ہوئی۔ یہ تحریک اس لئے کامیاب رہی' کہ جس جماعت نے اس کا آغاز کیا تھا وہ اس وقت تک سیاسی جماعت نہیں بنی تھی۔ اس نے ایک اصولی' دینی مطالبہ اٹھایا' اسے تمام دینی عناصر کی تائید حاصل ہو گئی یہاں تک کہ حکومتی جماعت...... مسلم لیگ کے مخلص اور اسلام پسند عناصر نے بھی اس مطالبے کی بھرپور تائید کی۔ سب جانتے ہیں کہ اس میں فیصلہ کن کردار مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے ساتھیوں نے ادا کیا۔ یہ سیاست کا کھیل نہ تھا' ایک خالص دینی مطالبہ تھا' کہ دستور کا مزاج اور خمیر اسلامی ہونا چاہئے۔ اگر یہ محسوس کیا جاتا کہ یہ کسی جماعت کا سیاسی ہتھکنڈہ ہے تو برسرِ اقتدار پارٹی کبھی اس کی تائید نہ کرتی۔

احتجاجی سیاست کی ایک دوسری بڑی کامیابی صدر ایوب خان کا زوال ہے۔ اس تحریک میں غیر مذہبی عناصر بھی تھے لیکن تحریک کی اصل قوت مذہبی عناصر ہی تھے۔ کوئی تحریک ہمارے ہاں نہیں چل سکتی جب تک کہ مذہبی عناصر اس کا ساتھ نہ دیں۔ جب قربانی دینے کا وقت آتا ہے تو جمہوریت اور سوشلزم کے نام لیوا دبک جاتے ہیں، تب صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام لیوا اپنے گریبان کھولتے اور سینوں پر گولیاں کھانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔

ایک اور بڑی کامیابی ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت تھی۔ یہ قرارداد مقاصد کی منظوری ایسی کامرانی تھی جب مغرب نواز جدید تعلیم یافتہ لوگ رنجیدہ ہو کر کہتے تھے کہ وہ عوام کی بجائے اللہ کی حکمرانی کا تصور قبول کرنے کے بعد وہ دنیا کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اس دور میں جب سیکولرازم، یہ تصور کہ مذہب فرد کا انفرادی معاملہ ہے دنیا کا سب سے بڑا مقبول و محبوب عقیدہ بن چکا ہے، اس دور میں ایک مسلّمہ بین الاقوامی اصول بن چکا ہے، قادیانیوں کو اقلیت قرار دینا ایک حیرت انگیز کامیابی تھی۔ قادیانی جماعت پوری دنیا میں معروف تھی۔ کتنے ملکوں میں ان کے مشن کام کر رہے تھے۔ دنیا کے ممتاز رہنماؤں کے ساتھ ان کے مراسم اور تعلقات تھے، حکومت اس مطالبے کو ماننے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی لیکن جوش و جذبے سے بھرے بے پناہ انسانی ہجوموں نے اسے بے بس کر کے رکھ دیا۔ یہ مظاہراتی سیاست کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس میں علماء نے بھرپور حصہ لیا اور انہی کی قیادت میں یہ جنگ جیتی جا سکی۔ سب سے اہم اور آخری کامیابی وہ ہے جسے ہم ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ کہتے ہیں، کیسی عظیم تحریک تھی۔ لوگوں نے مانا کہ ۱۹۷۴ء والے حالات پیدا ہوئے۔ وہی جوش وہی قربانی کا جذبہ، لاہور نے جو منظر دیکھے ہیں، وہ کبھی فراموش نہ کئے جا سکیں گے، لوگ آگے بڑھتے اور گولیاں کھاتے رہے لیکن انہوں نے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ وہ کرسی زمین پر آ رہی ، جس کی مضبوطی کا دعویٰ کیا گیا تھا۔

اس تحریک میں جملہ مذہبی عناصر متحد تھے۔ ختم نبوت کی تحریک کی طرح جس میں شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث، جماعت اسلامی والے، سب شریک تھے۔ یہ اتحاد کامیابی کی کلید بنا۔ دوسری بات یہ کہ ان تحریکوں میں بیشتر سیاسی عناصر بھی شریک رہے۔ ایوب خان کے خلاف، بھٹو صاحب کے خلاف۔

اس موازنے کے چند اور دلچسپ پہلو بھی ہیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ ایک خاص جماعت نے اسلامی دستور کے لئے مہم شروع کی اور وہ کامیاب رہی لیکن وہی جماعت پہلی بار ۱۹۵۱ء

کہ الیکشن میں پنجاب کے میدانوں میں سامنے آئی تو چاروں شانے چت ہو گئی۔ وجہ کیا ہے؟
یہ کہ جب آپ نے تحریک اٹھائی تو سب آپ کے ساتھ تھے اور الیکشن کے میدان میں اترے تو
وہی سب لوگ آپ کے مدمقابل تھے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی کامیابی کے لئے کوشاں تھا۔
دوسری مثال یہ ہے کہ ختم نبوت جیسے خالص مذہبی مسئلے پر ایک تحریک ۱۹۵۳ء میں چلی
اور ناکام ہوئی' بری طرح ناکام ہوئی۔ حالانکہ تب ۱۹۷۴ء سے زیادہ قربانیاں دی گئیں۔
سبب یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کی تحریک مجلس احرار اسلام نے شروع کی تھی جو ماضی میں بہت بھرپور
سیاسی کردار ادا کرتی رہی تھی۔ اگرچہ اس نے قیام پاکستان کے بعد اپنی وہ سیاسی حیثیت ختم کر
دی تھی مگر لوگوں کو پچھلی تاریخ اور ان کا پس منظر بھولا تو نہیں تھا۔ لہٰذا اس تحریک میں سیاسی
معنی تلاش کئے گئے۔ ۱۹۷۴ء کی تحریک میں اگرچہ سیاسی عناصر بھی شریک تو تھے مگر اصل
قیادت خالص غیر سیاسی شخصیت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے ہاتھ میں تھی۔
شریعت بل ایک خالص دینی مسئلہ تھا۔ یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے
متحدہ شریعت محاذ بنا' لیکن بری طرح ناکام ہوا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا کلنک کا ٹیکہ ہو گا کہ کوئی
تحریک الٹی میٹم بھی دے کہ ۲۷ رمضان المبارک تک بل منظور نہ کیا گیا تو ایک عوامی تحریک
برپا کر دیں گے اور اس کے بعد پھر بالکل خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ متحدہ شریعت محاذ میں اگرچہ
سیاسی مذہبی عناصر بھی تھے اور غیر سیاسی مذہبی عناصر بھی۔ لیکن قیادت میں پلڑا بھاری تھا سیاسی
عناصر کا۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ جتنے دینی سیاسی عناصر اس میں شامل تھے وہ منقسم ہو چکے
تھے۔ مولانا احسان الٰہی ظہیر اور ان کی جمعیت اہل حدیث' مولانا نورانی میاں کی جمعیت علماء
پاکستان' مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علماء اسلام شدید مخالفت کر رہی تھیں' جبکہ جمعیت
اہل حدیث اور جمعیت علماء اسلام کا ایک ایک دھڑا بل کی حمایت میں سرگرم تھا۔ ان دھڑوں
کے درمیان جو بھی اختلاف تھا وہ خالص سیاسی تھا۔ کوئی مذہبی اختلاف نہیں تھا۔ ریفرنڈم کے
معاملے میں اختلاف' دستور کے معاملے میں اختلاف' بحالیٔ جمہوریت کے مسئلے پر
اختلاف۔

معلوم ہوا کہ تحریکیں ناکام وہاں ہوتی رہی ہیں جہاں کچھ بھی عمل دخل ان سیاسی عناصر کا
یا سیاسی ذہنیت کا ہو اور تحریکیں کامیاب وہ ہوئی ہیں جو خالص غیر سیاسی عناصر کے تحت چلی
ہیں۔ کسی خالص دینی مسئلے کے لئے۔

بھارت کا مسلمان بازی لے گیا

ان تین مثالوں کے علاوہ جو ہماری ۴۲ سالہ تاریخ کی عوامی تحریکوں سے پیش کی گئیں، بھارتی مسلمانوں کے حوالے سے بھی ایک نادر مثال حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ بھارتی مسلمانوں، خاص طور پر فعال مذہبی عناصر کے لئے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ الیکشن کے میدان میں آئیں اور انہیں کوئی کامیابی حاصل ہو۔ چونکہ یہ میدان بند ہے لہٰذا ساری توجہ اب دوسرے میدان کی طرف ہے اور اس سے کیا عظیم الشان نتیجہ سامنے آیا۔ بھارتی سپریم کورٹ نے مسلمانوں کے عائلی قوانین میں دخل اندازی کرنے والا ایک فیصلہ صادر کیا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو طلاق دے تو جب تک مطلقہ بیوی دوسری شادی نہ کرلے اس کا نان نفقہ سابق شوہر کے ذمے رہے گا۔ ہندوستان کا مسلمان اس فیصلے کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ اتنی عظیم تحریک برپا ہوئی، جانیں دیں انہوں نے، پٹنہ میں غالباً ایک دن میں ساٹھ مسلمانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ہندی مسلمانوں کے تمام فرقے جمع ہو گئے۔ سنی، شیعہ، اہل حدیث، جماعت اسلامی، بریلوی، دیوبندی سب بنیانِ مرصوص بن گئے۔ یہ ساری باتیں میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ شاید ان پر غور کیا جائے۔ میں کوئی مؤرخ نہیں ہوں، تاریخ نگاری میرا مشغلہ نہیں ہے۔ بھارتی مسلمانوں کی اس تحریک کی قیادت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جو خالص غیر سیاسی تھا یعنی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ۔ جیسے یہاں مولانا یوسف بنوریؒ تھے اسی طرح وہاں مولانا علی میاں ہیں۔ ایک عالم، ایک مصنف، لوگوں کے لئے محترم رہنما اور مشیر۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارتی وزیراعظم نے مولانا علی میاں سے رابطہ کیا، خود برسراقتدار کانگریس پارٹی نے اسمبلی میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کو تحفظ دینے کے لئے بل پیش کیا اور بھارتی وزیراعظم نے مسلمانوں کے مقدمے کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام عورتوں کے حقوق کی بہترین ضمانت مہیا کرتا ہے۔ سیکولر بھارت میں یہ ایک عظیم کامیابی تھی، محض سیکولر بھارت میں نہیں بلکہ اس بھارت میں جہاں ہندو کا غلبہ ہے۔ ہندوستان کا مسلمان ہم سے بازی لے گیا۔ ہم بہت پیچھے رہ گئے۔ ہمارے ہاں ۱۹۶۱ء میں فیملی لاء آرڈیننس آیا اور ہمارے ہاں کے تمام مذہبی عناصر نے بالکل بیک آواز کہا کہ یہ غلط ہے، اسلام کے خلاف ہے، شریعت اسلامی میں دخل اندازی ہو رہی ہے، لیکن کسی نے کوئی پرواہ نہیں کی، ۶۲ء میں وہ قوانین نافذ ہوئے اور آج ۸۹ء تک وہ قوانین جوں کے توں چھبیس برس سے ہمارے ہاں نافذ ہیں۔ سبب وہی ہے کہ سیاست کی گندگی ملوث ہو گئی۔

بھارت میں سیاست مسلمانوں کے لئے وجہ ترغیب نہیں ہے کیونکہ کسی کو بھی اس میں اپنے لئے امکانات نظر نہیں آتے۔ کسی بلی کو چھچھڑا نظر نہیں آتا۔ یہاں سیاسی اختلافات ختم کر کے ایک جگہ جمع بھی ہوتے ہیں تو باہم دگر لڑتے ہیں۔ ۷۷ء میں کیا ہوا کہ مذہبی عناصر ہی آپس میں منقسم ہوگئے۔ یہاں ایک افطار پارٹی میں علماء جمع ہوئے تو علیحدہ علیحدہ چھ جماعتیں ہوئیں ' اس لئے کہ ہر ایک کے سامنے ایک نقشہ ہے ' ہر ایک کو سیاست کے اندر اپنا مستقبل دیکھنا ہے ' اپنی بھیڑوں کو علیحدہ منظم کرنا ہے۔ یہ فرق و تفاوت ہے اسے اگر سامنے رکھیں گے تو بہت سے حقائق ہمارے سامنے اجاگر ہو جائیں گے۔

حاصلِ کلام

ان حقائق سے کیا نتیجہ سامنے آیا؟ کیا سبق نکلتا ہے؟ اگرچہ میرے نزدیک وہ از خود اظہر من الشمس ہے۔ کسی کی نیت پر کوئی حملہ مقصود نہیں ' اللہ شاہد ہے بدنیتی کے الزام کا شائبہ بھی میرے دل میں نہیں ہے۔ مذہبی سیاست کے بعض علمبرداروں کا ایک قول ہے اور اسے وہ ایک مثبت یافت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہیں کر سکے لیکن ہم نے یہاں کسی اور نظام کی جڑیں بھی جمنے نہیں دیں۔ یہ بات درست ہے ' اپنی جگہ پر معقول بھی اور اس سے بڑھ کر کارکنوں کے جذبۂ کار کو برقرار رکھنے کے لئے مؤثر بھی ہے۔ لیکن ذرا اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے اس کا منفی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستان عدم استحکام کا شکار ہے ' یہاں کوئی توازن قائم نہیں ہو سکا جو آیا اسے فکر رہی جیسا کہ آج بھی ہے کہ کسی طرح مینڈکوں کی پنسیری کو سنبھال کر رکھا جا سکے۔ کوئی سیاسی استحکام پیدا نہیں ہوا ' سیاسی ادارے جنم نہیں لے سکے ' کوئی سیاسی روایات قائم نہیں ہوئیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ہم سیاسی طور پر بحیثیت مجموعی نابالغ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ چیز ہمارے مستقبل کے اعتبار سے انتہائی خوفناک ہے۔

میں دو جملوں میں اس کا تجزیہ پیش کرنا چاہتا ہوں ' اگرچہ اندیشہ ہے کہ اس سے غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے میرا تجزیہ ہے کہ ہماری قوم بحیثیت مجموعی سیکولر مزاج کی حامل ہے۔ مذہب کا معاملہ متعلق ہے ذاتی زندگی سے۔ باقی زندگی کے گوشوں کا تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ آج مذہب مسجد سے متعلق رہ گیا ہے ' نماز سے ' روزے سے۔ کاروبار سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ ہر حرام چیز ہم نے اپنے لئے جائز کر لی ہے تو ہم نے سیکولر مزاج ملک کی گاڑی کو چلنے

نہیں دیا اسے روک کر کھڑے ہوگئے ہیں دین کی طرف لے جانے کے لئے جو محنت کرنی چاہئے تھی وہ نہیں کی بلکہ پاور پالی ٹیکس میں الجھ کر رہ گئے۔ ہم نے کبھی ایک دھڑے کا حصہ بن کر اسے کامیاب کرایا اور کبھی دوسرے دھڑے کے ساتھی بن گئے۔ یوں اصل طاقت بدستور جاگیردار طبقہ کے ہاتھ میں ہے' وہی ادھر سے ادھر ہوتے اور ہر بار پرانی حکومتوں کی لاش پر نئے اقتدار کا محل تعمیر کرتے ہیں۔ دین کے لئے جو کام کرنا چاہئے تھا وہ ہم نے نہیں کیا' خالص دینی مسئلے پر تحریک نہیں چلائی' سیاسی تحریکوں کا تتمہ بن گئے' الیکشن میں آئے تو ایک دوسرے کا مقابلہ کیا چنانچہ کوئی مثبت پیش رفت نہ ہو سکی۔ ۱۹۶۱ء کے فیملی لاء آرڈیننس کو تمام مکاتب فکر کے بڑے بڑے علماء نے خلاف اسلام قرار دیا تھا ——— لیکن اس کی بنیاد پر تحریک نہ اٹھائی' اس کی بنیاد پر جمع نہ ہوئے۔ شریعت کے اندر تحریف گوارا کی لیکن سارا زور ڈال دیا بحالیٔ جمہوریت کی تحریک پر۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں جو جمہوریت بحال ہوتی ہے' لازماً وہ ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ ہم ہیں۔ پہلی مرتبہ ایوب خاں کی ٹانگ آپ نے گھسیٹی پھر بھٹو کی اور دونوں مرتبہ جو نتیجہ نکلا' وہ آپ کے سامنے ہے۔ اب نومبر ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے بحالیٔ جمہوریت کے بعد تو اور بھی عجیب نقشہ ابھرا ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں جس کی سیاست میں ۵۰ سال سے اسلام کا نعرہ گونج رہا ہے اب وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر ایک خاتون فائز ہے۔ یہ اس تضاد کی انتہا ہے' جس میں ہم مبتلا ہیں یہ سب ہماری غلط حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے اور اگر یہ صورت حال جاری رہی تو شاید ہمارے پاس بہت تھوڑا سا وقت باقی ہو۔ ضرورت ہے کہ ہم صورت حال پر' اپنے اپنے طرز عمل پر از سر نو غور کریں۔ سنجیدگی سے' یکسوئی سے!

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ

دینی عناصر کے لیے

قرآن کا سہ نکاتی پروگرام اور چند عملی مشورے

۱۹ مئی کے خطاب جمعہ کی تلخیص

میں پچھلے جمعہ کے خطاب میں دینی و مذہبی قوتوں کی خالص سیاسی مہموں اور انتخابی سیاست میں اسلام کے نقطۂ نظر سے ناکامیوں اور احتجاجی ' مطالباتی اور مظاہراتی تحریکوں میں اسی حوالے سے کامرانیوں کا میزانیہء نفع و نقصان پیش کر چکا ہوں۔ کامیابیوں کی فہرست میں ایک واقعہ کا ذکر رہ گیا تھا جو مطالبہء دستور اسلامی کے نتیجے میں پاس ہونے والی قرار دادِ مقاصد سے کم اہم نہیں۔ میں اس واقعہ کو بیسویں صدی کے اس حصے کا دوسرا معجزہ قرار دیتا ہوں کہ اہل تشیع سمیت مسلمانوں کے جملہ مسالک کے اکتیس (۳۱) ممتاز علماء نے جن میں جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور بھی شامل تھے ' متفقہ طور پر دستور اسلامی کے بائیس (۲۲) اساسی اصول مرتب کئے جو قرار دادِ مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد اس عذر کا دندان شکن جواب بن گئے کہ اللہ کی حاکمیت اپنی جگہ ' سوال یہ ہے کہ ہم کس کا اسلام نافذ کریں ' سُنیّوں کا ' شیعوں کا ' دیوبندیوں کا ' بریلویوں کا یا اہل حدیث کا؟...... دینی و مذہبی عناصر کی یہ کامیابی بھی مطالباتی تحریک کی مرہونِ منت تھی۔ اس میں سیاسی معرکہ آرائی کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا ' بنیاد تھی تو محض اسلام کے ساتھ خلوص و اخلاص اور اسلام کے ساتھ وفاداری بشرطِ استواری۔ اس مثال سے بھی میرے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے جو پچھلی تقریر میں پیش کر چکا ہوں کہ دین و شریعت کے لئے احتجاجی ' مطالباتی اور مظاہراتی تحریکیں دینی و مذہبی عناصر کو یکجا کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتی ہیں جبکہ سیاسی اور انتخابی مہم جوئی انہیں تقسیم کر کے سب سے زیادہ گھاٹے میں رہ جانے والا فریق بنا دیتی ہیں۔ علماء کے اس اتفاقِ رائے کا اثر نفع و نقصان کے میزانیہ میں یہ ہوا کہ ۱۹۵۶ء میں قرار دادِ مقاصد کو دستور کا حصّہ بنایا گیا جس کا مفہوم میرے نزدیک کلمہ طیبہ یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے کم نہیں اور اگرچہ نفاذ اسلام کے خواب کی تعبیر تو نہ ملی تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس کے لئے ایک مدّت کا تعین ہوا جس میں علماء بورڈ کی تشکیل کے ساتھ اس کے ذمہ یہ کام لگا دیا گیا کہ قوانین کو اسلام کے تابع بنانے کا کام کرتا رہے۔ ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء اس دستور کی بساط الٹ نہ دیتا اور دینی و مذہبی عناصر

احتجاجی ' مطالباتی اور مظاہراتی لائحہ عمل پر قائم رہتے تو قوی امید تھی کہ اسلام کے عملاً نفاذ کی منزلِ ہفت خواں بھی طے کر لی جاتی لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

پس چہ باید کرد

اب میرے ذمہ یہ عرض کرنا ہے کہ دینی و مذہبی عناصر جو نقصان اٹھا چکے ' اس کے ازالے کی صورت کیا ہو اور حکمتِ عملی میں ایک بنیادی تبدیلی لانے کے کام کا آغاز کون کرے ' کیسے کرے۔ انگریزی محاورے کے مطابق بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ہمت کس

دو سیاسی تحریکیں جن کا سہرا مذہبی جماعتوں کے سر بندھا

دو سیاسی تحریکوں کے مطالعہ سے ایک عجیب و غریب لیکن عبرت انگیز صورت حال سامنے آتی ہے جو دونوں کی دونوں مذہبی عناصر کی رفاقت کے باعث کامیاب ہوئیں کہ پاکستان کے مسلمان دین و مذہب سے عملاً چاہے کتنی ہی دور ہوں ' گولیوں کے لئے سینہ اسلام کے نام پر ہی کھولتے ہیں۔ پہلی نفاذ اسلام کے لئے بحالیء جمہوریت کی تحریک کے نتیجے میں جو فی الحقیقت اینٹی ایوب خان مہم تھی ' اقتدار آخر کار پیپلز پارٹی کو منتقل ہوا جس کا مقصد سوشلزم اور سیکولرازم کا قیام تھا یا نہیں لیکن اسلام کے لئے اس کے پروگرام میں بہرحال کوئی جگہ نہ تھی اور دوسری نظام مصطفیٰ تحریک کا حاصل یہ رہا جو دراصل اینٹی بھٹو مہم تھی کہ حکومت و اختیار اسی پارٹی کے ہاتھوں سے نکل کر ایک فوجی آمر کی ذات میں مرتکز ہو گیا جو پہلی تحریک کے نتیجے میں برسراقتدار آئی تھی۔ طویل فوجی آمریت نے اسلام کے نام کو استعمال کر کے ملک خداداد کے مستقبل میں وہ کانٹے بو دیئے ہیں جن کی فصل کاٹتے نہ جانے کب تک قوم لہولہان ہو گی۔ یہ دونوں منفی نتائج مذہبی عناصر کی غیر دینی سیاست ہی کے کھاتے میں ڈالے جائیں گے کیونکہ متذکرہ دونوں تحریکوں کی کامیابی کا سہرا مذہبی عناصر کے سر ہے۔

میں ہے؟۔ میری گزارش ہے کہ کرنے کا اولین کام انتخابی سیاست سے کنارہ کشی کر کے اسلام کے حق میں مہماتی ' مطالباتی ' مظاہراتی اور احتجاجی سیاست کرنا ہے۔ تلافیٔ مافات کی اولین شرط یہی ہے کہ انتخابی محاذ سے پسپائی اختیار کر کے پاور پالی ٹیکس سے منہ موڑ لیا جائے۔ مطمحِ نظر یہ ہو کہ مسندِ اقتدار پر کوئی بھی جلوہ افروز ہو ' کوئی آئے کوئی جائے ' ہمیں گاؤ آمد خر رفت سے غرض نہیں محض اسلام چاہئے اور اس کے لئے ہم گردنیں کٹوانے کے لئے تیار ہو کر میدان میں اتریں۔ یہ نہ کیا جائے تو یاد رکھئے کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔

مہلتِ عمل اگر کوئی ہے' تو تیزی کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ فیصلہ آسان نہیں' ایک بڑا ہی کڑوا گھونٹ ہے جو نگلنا پڑے گا۔ سالہا سال میں بنے ہوئے مزاج اور ذہن میں رچے بسے منصوبے بدلنا واقعی بہت مشکل کام ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ نفع و نقصان کا یہ میزانیہ دیکھ اور سمجھ لینے کے بعد اس کی ہمت دینی و مذہبی عناصر کو اپنے اندر پیدا کرنی ہی ہوگی۔

عام انتخابی سیاست اور اسلام کے حق میں احتجاجی سیاست میں تقابل یہ ہے کہ اولاً انتخابی سیاست تقسیم کرتی ہے جبکہ مؤخر الذکر ہمیں جمع کرتی ہے۔ آج تک احتجاجی سیاست میں ہم کتنی ہی بار جمع ہوئے ہیں لیکن انتخابی سیاست نے دین و مذہب کے علمبرداروں میں تفرقہ ہی نہیں ڈالا' مذہبی بلکہ مسلکی جماعتوں تک کو داخلی تقسیم سے دوچار کر دیا۔ بریلوی حضرات جنہیں سوادِ اعظم ہونے کے دعوے کے ساتھ اپنی قوت پر بجا ناز تھا' حصوں بخروں میں بٹ گئے ہیں اور اب توان کے اکھاڑے میں ایک نیا پہلوان بڑی آن بان اور شان کے ساتھ اترنے والا ہے۔ ان حضرات کی انتخابی سیاست کے میدان میں گھمسان کا رن پڑنے والا ہے۔ آن بان اور شان کے ساتھ میدان اور گھمسان کا قافیہ ہی نہیں ملا' عنقریب منظر پر یہ سب کچھ گڈمڈ ہو کر نمودار بھی ہوگا۔ نئے پہلوان کے بارے میں سنا تھا کہ انقلاب کی بات کرتے ہیں لیکن انقلاب کے پٹارے سے انتخاب ہی نکلا' فلسفہء انقلاب کا پہاڑ کھود کر انتخاب کی چوہیا ہی بر آمد کی گئی ہے جس سے صورت حال پہلے سے بہت زیادہ مخدوش ہو جائے گی۔ انقلاب کے اسی داعی کا کیا مذکور' جمعیت علماء اسلام کا حال بھی مختلف نہیں۔ میں نے مینارِ پاکستان پر اس کے دونوں دھڑوں کی "انقلابی کانفرنسوں" میں شرکت کی ہے۔ انقلاب کے بلند بانگ نعروں اور دھواں دھار تقریروں کے بعد تان بالآخر وہاں بھی انتخاب پر ہی آکر ٹوٹی۔

ثانیاً انتخابی سیاست میں طالع آزماؤں کے آگے آجانے کا خطرہ موجود رہتا ہے جنہیں خواہشِ اقتدار اور نا آسودہ آرزوئیں کہیں سے کہیں پہنچا کر دم لیتی ہیں۔ ایک مذہبی جماعت کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے رکن اسمبلی کے مخالف سیاسی کیمپ میں چلے جانے کو نئے رفقاء کا کھلا کھلا سیکولرازم بھی روکنے میں بعض اوقات ناکام رہا ہے۔ آج بھی جمعیت علماء پاکستان اپنے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے ایک رکن قومی اسمبلی کے خلاف ریفرنس داخل کرنے کی تیاری کر رہی ہے جو پیپلز پارٹی کی حکومت سے جا ملے۔ جماعت اسلامی جیسی تنظیم بھی ایسے چرکوں سے محفوظ نہیں رہی۔ کراچی میں ان کے عباسی باوزیر ۱۹۸۵ء کے صوبائی الیکشن میں جماعت

کی "غیر جماعتی" حمایت سے منتخب ہوئے اور کچھ ہی دنوں بعد حکومتی مسلم لیگ میں نظر آنے لگے۔ باوزیر آخر کار باوزارت ہو کر رہے۔ انتخابی سیاست میں کالی بھیڑوں کے آگے آجانے کے امکانات کے برعکس مہماتی، مطالباتی اور احتجاجی سیاست میں صرف وہ لوگ ہراول دستے کا حصہ بنتے ہیں جو ایثار و قربانی کے لئے تیار ہوں، سر پر کفن باندھ کر آئے ہوں، لاٹھی گولی کھانے اور جیل جانے پر آمادہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ اقتدار کے خواہاں اس کوچے کا رخ کیوں کریں گے۔

ثالثاً انتخابی سیاست میں حصہ لینے والوں کے بارے میں عام و خاص ہر شخص یہ جانتا ہے کہ وہ لیلائے اقتدار کے ہجر میں مر رہے ہیں اور چاہے ان کی کامیابی کا امکان پانچ فی صد ہو، خواہشِ اقتدار ان پر تہمت نہیں سمجھی جاتی۔ نہ اس سے ان کے مرتبہ و مقام میں کوئی کمی آتی ہے، نہ وقار میں اور نہ سیاسی کیریئر کو کوئی ضعف پہنچاتی ہے لیکن دینی و مذہبی جماعتوں کی قیادتیں خواہ کتنی ہی مخلص کیوں نہ ہوں...... اور میں ان میں سے اکثر کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہوں کہ اقتدار کی خواہش اپنے لئے نہیں، اسلام کی سربلندی کے لئے رکھتے ہیں...... انتخابی عمل میں ان کی شرکت عام لوگوں کے ذہن میں بدگمانی پیدا کرتی ہے کہ یہ بھی حکومتی اختیار اور دبدبہ کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ یہ بدگمانی ان کی دینی حیثیت اور ان کے دینی کام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کا باعث بنتی ہے۔ دینی و مذہبی جماعتوں کا احترام اپنی جگہ لیکن وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں تو شک و شبہ سے بالاتر ہرگز نہیں ہو سکتے جو ایک خاتون کے ساتھ صبح کے دھندلکے میں اپنے ایک جانثار صحابیؓ کے قریب سے گزرے تو پلٹ کر انہیں آواز دی اور قریب بلا کر فرمایا مبادا تمہارے دل سے کوئی اور خیال گزرے، یہ خاتون میری فلاں اہلیہ ہیں۔

رابعاً انتخابی سیاست میں کامیابی کے لئے اکثریت درکار ہے۔ وہ اکثریت جس میں عالم فاضل اور اجڈ گنوار برابر ہیں۔ دین دار، پرہیزگار اور باعمل مسلمان کا ووٹ اس کے مذہب سے بیزار اور فکرِ آخرت سے آزاد دوسرے مسلمان بھائی کے ووٹ سے رتی بھر زیادہ وزنی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ انتخابی عمل میں تو جمہور کی عملداری ہے، جمہوریت کا دور دورہ ہے جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے"۔ جبکہ نص قرآنی ہے کہ "اگر تم زمین کے اندر اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تو تمہیں گمراہ کر کے رہیں گے"۔ اس کے مقابلے میں مظاہراتی اور احتجاجی سیاست میں ایک اقلیت بھی کامیاب ہو جاتی ہے۔ بلکہ اقلیت ہی کامیاب ہوتی ہے۔

اقلیت جس میں مقصد سے لگن ہو' قربانی کا جذبہ ہو' جو تن من دھن لگا کر سروں پر کفن باندھ کر میدان میں آجائے اور جو پوری طرح منظم بھی ہو۔

اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست

۱۹۶۲ء کا سن ایک یادگار سال ہے۔ اس میں پہلے اسلام کے عائلی قوانین کو ایوب خاں نے پامال کرنے کی جسارت کی جس کی مخالفت میں اور دین میں ایسی مداخلت قرار دینے میں جو انگریز حاکم بھی نہ کر سکے تھے' ملک کے تمام دینی و مذہبی حلقے یک زبان ہو گئے۔ دیوبندی' بریلوی' اہل حدیث' شیعہ اور جماعت اسلامی میں مکمل اتفاق رائے تھا لیکن ایوب خاں کے عائلی قوانین کے خلاف کوئی تحریک نہ چلائی گئی۔ البتہ اسی سال تحریک بحالیء جمہوریت کا آغاز ضرور ہوا جس کے لئے انہی دینی حلقوں نے جو مداخلت فی الدین پر محض بیانات داغنے پر اکتفا کرتے رہے تھے' خالص سیکولر سیاسی عناصر کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر میدان کارزار میں داد شجاعت دی۔ اے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ انہوں نے دین کو سیاست پر ترجیح دے کر ایوبی عائلی قوانین کے خلاف تحریک چلائی ہوتی تو محاذ آرائی (POLARISATION) مذہب و شریعت کے حق میں اور خلاف ہوتی' جمہوریت کے سوال پر نہ ہوتی۔ شریعت کے ساتھ رویہ میں یہ ایک طرح "گربہ کشتن روزِ اول" والی بات تھی' پھر مسلمان کہلانے والی ہماری بہنوں بیٹیوں کو یہ ہمت ہرگز نہ ہوتی کہ شہادت کے قانون میں اس آدمی گواہی کے مسئلے پر سڑکوں پر نکل کر حکومت کو ناکوں چنے چبوا دیتیں جو کسی حدیث مبارک سے ماخوذ نہیں' کسی فقیہہ کا اجتہاد نہیں بلکہ نصِ قرآنی ہے اور ایک منطقی انتہاء کے طور پر یہ روزِ بد بھی دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ ایک آزاد خیال خاتون عظیم اسلامی ملک کی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہیں۔ آج دینی حلقوں کی نگاہیں شرم سے زمین میں گڑی ہوئی ہیں بالکل اسی طرح جیسے قرار دادِ مقاصد پاس کرتے ہوئے ہماری مجلس دستور ساز کے نام نہاد ترقی پسند اراکین جدید دنیا سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ کاش دینی اور مذہبی حلقوں سے یہ کہنے کا موقع نہ پیدا ہوا ہوتا کہ "اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست" ......

سہ نکاتی پروگرام

اس فرق و تفاوت سے جو بات کھل کر سامنے آئی وہ یہ ہے کہ احتجاجی' مطالباتی اور مظاہراتی سیاست کا مقصد معاشرے میں ایک ایسے مؤثر عامل کی افزائش ہے جو جدید سیاسی

اصطلاح میں "پریشر گروپ" کا کام دے۔ قرآنی اصطلاح میں یہی "نہی عن المنکر بالید"
کے لئے تیاری ہے۔ اسلام کے لئے، شریعت کے لئے، دینی شعائر کے حق میں مظاہروں او
گھیراؤ کے ذریعے رائے عامہ کا دباؤ استعمال کرنا اس کا سب سے فعال مرحلہ ہوگا۔ لیکن دبا
کے یہ سب ذرائع حد درجہ منظم انداز میں اختیار کئے جائیں گے۔ پرامن رہنا اور توڑ پھوڑ سے

سندھ کی صورتِ حال مشرقی پاکستان کے معاملے سے بدتر ہے

آج کے اخبارات میں ایک تشویش ناک اور دوسرا فکرانگیز بیان شائع ہوا ہے۔ رسول بخش پلیجو نے مہاجروں کو "نمک حرام" قرار دیا ہے گویا نوبت اب ننگی گالیوں تک آپہنچی اور دوسرے بیان میں بزرگ سیاست دان نواب زادہ نصراللہ خاں نے سندھ کے حالات کو مشرقی پاکستان کی صورت حال سے زیادہ تشویش ناک قرار دیا ہے جس نے بنگلہ دیش کو جنم دیا۔ جی چاہتا ہے کہ ان سے پوچھوں کہ سندھ کے حالات کی نزاکت انہیں آج ہی کیوں نظر آئی ہے؟۔ کیا پہلے اس لئے دکھائی نہ دیتی تھی کہ بحالیء جمہوریت کی دھن میں مگن رہنے کے باعث انہیں کسی اور بات کا ہوش نہ تھا۔ مجھ جیسے غیر سیاسی آدمی نے ۱۹۸۲ء میں جنرل ضیاءالحق کے نام اپنے خط میں انہیں خبردار کیا تھا کہ سندھ کا معاملہ اپنی نوعیت میں بنگلہ دیش کی تحریک سے مختلف نہیں اور مزید وضاحت کی کہ بہت زیادہ بدتر ہے۔ یوں کہ بنگلہ دیش کے فدائیوں نے پاکستان سے بیزاری کا اظہار کیا تھا دین سے نہیں جبکہ سندھو دیش کے حامی صرف پاکستان ہی سے نفرت نہیں کرتے، اسلام کو بھی گالی دیتے ہیں۔ کراچی میں ایک صاحب آج بھی موجود ہیں جن کی زبانی میں نے یہ واقعہ سنا کہ مکتی باہنی والے سترہ غیر بنگالیوں کو پکڑ اور باندھ کر ویرانے میں لے گئے۔ انہیں ایک لائن میں کھڑا کر کے سفاک قاتلوں نے وضو کیا، دو نفل نماز پڑھی اور پھر بلند آواز سے یہ اجتماعی دعا کی کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ ہم تیرے ان بندوں کو تہ تیغ کرنے پر مجبور ہیں، ہمارا یہ فعل ظلم کا حصہ نہیں بلکہ ظالموں سے بدلہ لینے کی ایک شکل ہے جس پر تو ہمیں یقیناً معاف فرمائے گا۔ اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے سترہ مسلمان بھائیوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا اور اس واقعہ کے راوی چونکہ بندھے ہوئے ساتھیوں کے ڈھیر میں گولی کا شکار ہوئے بغیر دب گئے تھے جن کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا تردد بھی مکتی باہنی کے رضاکاروں نے نہ کیا، لہٰذا زندہ بچ رہے۔

اجتناب اولین شرط ہے۔ شائستگی اور متانت لیکن اپنے موقف پر چٹان کی طرح جمے رہ
طرۂ امتیاز ہوگا۔ اپنی جانیں دینے کے لئے مظاہرین تیار رہوں گے لیکن کسی جاندار کو کیا، گھا
کے تنکے کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔ بسیں نہیں جلیں گی، سڑکوں پر ٹائر جلا کر فضاء

آلودہ نہیں کیا جائے گا' قومی سرمایہ ضائع نہیں ہو گا۔ یہی دورِ جدید میں "نہی عن المنکر بالید" ہے جس کا سہ نکاتی پروگرام سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ میں بیان ہوا ہے۔ پہلا یہ کہ پہلے خود مسلمان اور متقی بنو دوسرا یہ کہ اس کے بعد جمع ہو جاؤ' متفرق نہ رہو' جمعیت فراہم کرو اور تیسرا یہ کہ اس جمعیت کو پھر بھرپور طریقے سے استعمال کرو' کس کام میں.....
"تم سے ایک ایسی امت وجود میں آئے جو خیر کی طرف دعوت دے' نیکی کا حکم کرے' اور برائی کو روکے۔ صرف یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے"۔

یہ سہ نکاتی پروگرام پہلا مرحلہ ہے اور فلاحِ اخروی پانے کے پروگرام کا نقطۂ عروج سورۃ التوبہ کی آیات ۱۱۱ اور ۱۱۲ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ مال و جان ہتھیلی پر رکھ کر نہی عن المنکر کے میدانِ کارزار میں اتر جایا جائے کیونکہ "اللہ نے جانیں اور مال خرید لئے ہیں اہل ایمان کے جنت کے بدلے میں" لیکن اس کے لئے وہ لوگ درکار ہیں جو نو (۹) شرائط پوری کرتے ہوں اور آیت ۱۱۲ میں ان نو صفات کا ذکر ہے جن کے بغیر یہ شرطیں پوری نہیں ہوتیں۔ دینی اور مذہبی عناصر کے کرنے کا کام ابتدائی سہ نکاتی پروگرام پر عمل کرتے ہوئے اس کے درجۂ کمال' نقطۂ عروج کی طرف سفر جاری رکھنا ہے۔ لیکن کیا ان سب لوگوں میں اس کا دم خم ہے؟۔ ان کے اصل حال سے تو اللہ تعالیٰ ہی پوری طرح واقف ہے اور وہی جانتا ہے کہ یہ بلند مرتبہ کس کے نصیب میں ہے۔ میں تو اپنے علم اور اپنے احساسات کی حد تک ہی سوچ سکتا ہوں اور میری یہ سوچ خوش فہمی پر مبنی بھی ہو سکتی ہے لیکن مایوسی کے اندھیرے میں امید کا چراغ روشن رکھنے کی غرض سے نام بہ نام کچھ جماعتوں اور گروہوں سے توقعات کا اظہار کروں گا۔ کیا عجب کسی کے دل میں میری بات اتر جائے۔ امکانات بظاہر معدوم نظر آتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہیں۔ لوگوں کے دل اس کی انگلیوں کے درمیان ہیں' جدھر چاہے پھیر دے اور کسی جماعت کی سمجھ میں میری بات آ جائے جو میں نے اپنے پاس سے نہیں بنائی' ۴۳ قمری سالوں کے تجربات کی روشنی میں اور نصوصِ قرآنی کے حوالے سے بیان کی ہے تو میں خود اور میری تنظیم اس جماعت کے ادنیٰ خادموں اور پیروکاروں میں شامل ہونے کو خوش نصیبی سمجھیں گے۔ بصورتِ دیگر میرا آوازہ صدا بصحرا ثابت ہوا اور دلوں کے بند کواڑ کھلوانے میں کامیاب نہ ہوا تو تنظیم اسلامی انشاء اللہ تن تنہا اس راستے پر گامزن رہے گی اور میں وہی کام کرتا رہوں گا جس میں زندگی کے تینتیس (۳۳) سال لگائے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے توفیق و تائید طلب کرتا رہوں گا کہ آخری سانس تک شب و روز کا مصرف یہی رہے۔

تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام

اب مہماتی سیاست کا راستہ اختیار کریں

قیامِ پاکستان کے بعد اب تک کے تجربات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مروّجہ انداز کی سیاست میں حصہ لے کر یعنی انتخابی مہمات سے دینی و مذہبی عناصر نے کوئی مثبت فائدہ حاصل نہیں کیا اور میں وضاحت کر چکا ہوں کہ یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس کے برعکس احتجاجی، مطالباتی او مظاہراتی سیاست کے ذریعہ متعدد بار میدان مارے گئے اور ان کی مثالیں بھی پیش کر چکا ہوں۔ اس فرق و تفاوت کی وجہ یہ بیان کی کہ انتخابی سیاست دینداروں کو تقسیم کرتی ہے جبکہ احتجاجی مطالباتی اور مظاہراتی سیاست (جسے اختصار کے لئے مہماتی سیاست کہا جا سکتا ہے) ان دی عناصر کو بھی جمع کرنے میں کامیاب رہی اور آئندہ بھی رہے گی جن میں مسلک کے اختلافات نے بظاہر خلیج حائل کر رکھی ہے۔ انتخابی سیاست میں طالع آزماؤں کے اوپر آجانے کے زیاد امکانات ہیں اور اس صورت حال کے مفاسد نے ہماری قومی سیاست میں تو غلاظت پیدا کی ہ تھی، مذہبی سیاسی عناصر کو بھی آلودہ کر کے چھوڑا جبکہ مہماتی سیاست میں ایثار و قربانی کا جذ رکھنے والے ہی آگے آتے ہیں۔ پھر انتخابی سیاست میں حصہ لینے والوں کے بارے میں س جانتے ہیں کہ ان کا مطمحِ نظر حصولِ اقتدار ہے اور یہ خواہش نہ سیاست دان خود چھپا ہیں، نہ ووٹ دینے والوں کو اس خواہش میں کوئی عیب نظر آتا ہے جبکہ دینی و مذہبی عناصر می سے اکثر لوگ خواہشِ اقتدار سے بے نیاز ہوتے ہوئے بھی انتخابی سیاست میں آکر اسی الزا کے سزاوار ٹھہرتے ہیں جس سے ان کی مذہبی حیثیت اور مقام دونوں معکوس اثر قبول کر ہیں اور ان کا دینی کام بھی متأثر ہوتا ہے۔ آخری بات یہ کہ انتخابی سیاست میں کامیابی کے اکثریت درکار ہوتی ہے جو نصِ قرآنی کے مطابق "گمراہ کر کے چھوڑنے" والا عامل ہے جب مہماتی سیاست میں مقصد سے لگن رکھنے والی لیکن منظم اقلیت نہ صرف اکثریت کا نعم البد ثابت ہوتی ہے بلکہ اسے پیچھے بھی لگا لیتی ہے۔ یہ مہماتی سیاست جدید اصطلاح میں دراصل ایک "پریشر گروپ سازی" ہے اور دینی اصطلاح میں "نہی عن المنکر بالید" جس کا سہ نکا پروگرام سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کے مطابق یہ ہے کہ پہلے خود مسلمان اور م

ہو' پھر یہ کہ متفرق نہ رہو بلکہ جمعیت فراہم کرو اور آخر میں اس قوت کا بھرپور استعمال نیکی کا حکم دینے اور برائی کو روکنے میں کرتے رہو۔ اسی پروگرام کا نقطۂ عروج سورۃ کی آیات ۱۱۱ اور ۱۱۲ میں بیان ہوا ہے کہ جان و مال ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے جان و مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔

ایک آسانی جو مشکل ہو گئی

ہمارے اکثر دینی و مذہبی عناصر کے لئے مروّجہ انتخابی سیاست سے جان چھڑا کر اپنے آپ کو دین اور شریعت کے حق میں مہماتی سیاست کے لئے وقف کر دینا اب آسان تو نہیں رہا کہ وہ مروّجہ سیاست میں بری طرح ملوث ہو چکے ہیں۔ تاہم ان میں سے کوئی گروہ اللہ کی توفیق سے یہ کڑوا گھونٹ بھر لے تو اپنی جماعت 'تنظیم اسلامی' سمیت میں کسی مقام و مرتبہ کا مطالبہ کئے بغیر اس کا ادنیٰ خادم اور پیرو کار بننے میں سعادت محسوس کروں گا۔ بصورت دیگر مجھے تو تن تنہا اسی راستہ پر سفر کرنا ہے۔ اب میں ان جماعتوں کا ترتیب وار ذکر کر رہا ہوں جو میرے نزدیک مہماتی سیاست کے سہ نکاتی پروگرام پر چلنے اور اس کے نقطۂ عروج کی طرف سفر جاری رکھنے کے زیادہ اہل بھی ہیں اور اس کا حق بھی رکھتے ہیں۔

تبلیغی جماعت

میرے سامعین حیران ہوں گے کہ آج میں اس کام کی اہل ترین اور سب سے زیادہ حقدار جماعتوں میں تبلیغی جماعت کو سرِفہرست رکھ رہا ہوں۔ تاہم مجھے توقع ہے کہ وہ میری بات بہت آسانی سے سمجھ لیں گے اور پھر کوشش کریں گے کہ تبلیغی جماعت کے بزرگوں تک اپنے اپنے ذرائع سے یہ پیغام پہنچائیں۔ اس جماعت کے حلقہ بگوشوں کی تعداد لاکھوں میں ہے ان میں ذوقِ عبادت بھی ہے اور اتباعِ سنت بھی۔ نماز روزے کا اہتمام ہے اور چھوٹی چھوٹی سنتیں بھی انہیں نورانی معلوم ہوتی ہیں' سادگی ہے اسراف و تبذیر نہیں' گویا انہوں نے اسلامی معاشرت اختیار کی ہے لیکن میں حرکت بھی ہے۔ وہ تفریغِ اوقات یعنی دین کے لئے وقت نکالنے کی کوشش کرتے اور اس عادت کو پختہ کرتے ہیں۔

گھر کے آرام چھوڑ کر باہر نکلتے اور سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ سفر آخر سفر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق جدید ترین سہولیات کے باوجود سفر آج بھی عذاب کا ایک ٹکڑا ہی ہے۔ ان سب مراحل سے تبلیغی جماعت گزر کر گویا اہلیت (PRE-QUALIFICATION) کا مرحلہ طے کر چکی ہے۔ یہ لوگ پیش قدمی کریں یعنی تیاری

کے دائرے میں سفر کرتے رہنے کی بجائے بقول اقبال اس لائحہ عمل کو اپنائیں کہ۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ رسمِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

تو یہ میدان میں نکلنا ہوگا اور حد درجہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان کے لئے یہ کام پیش قدمی لیٖ
آگے بڑھنا ہوگا' پسپائی یعنی پیچھے ہٹنا نہیں۔ مروجہ سیاسی میدان میں سرگرم جماعتوں کے ا
انتخابی سیاست کی بساط لپیٹ کر پسپائی اختیار کرنے کا جو مشکل فیصلہ پاؤں کی زنجیر بن گیا ہ
اس سے یہ لوگ آزاد ہیں۔ تبلیغی جماعت کو "با نشہء درویشی در ساز و دمادم زن" پر عمل کر
ہوئے تو پچاس برس ہو گئے' اب اگلا قدم یعنی "چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن" اٹھ
جانا چاہئے ورنہ یہ پروگرام ہمیشہ ادھورا رہے گا۔

تبلیغی جماعت کا بھولا ہوا سبق

ان کے داعیٔ اوّل اور مؤسّس مولانا محمد الیاسؒ کا یہ قول ریکارڈ پر موجود ہے کہ میں ا
جماعت حضرت شیخ الہندؒ کا آدمی ہوں' وہ شیخ الہندؒ جہادِ حریت میں جن کی ہڈیاں گھل گئیں
جو اسی جرم میں اسیرِ مالٹا رہے لیکن افسوس کہ آج ہمارے تبلیغی بھائی اس پروگرام کو فراموش
بیٹھے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ بھولا ہوا سبق انہیں یاد دلانا آسان نہیں۔ کاش یہ بات ان
سمجھ میں آجائے کہ "امر بالمعروف" سے پہلے "نہی عن المنکر" کا ذکر آتا ہے۔
اقامتِ دین' غلبہ دین کی جدوجہد' حکومتِ الٰہیہ' اسلامی انقلاب اور مہماتی سیاست ج
اصطلاحات کے حوالے کو جانے دیں صرف اسی ایک حقیقت پر غور فرمائیں کہ ہدایت کے ا
سر چشموں یعنی قرآن و حدیث میں نہی عن المنکر اور امر بالمعروف ہمیشہ جوڑے کی شکل میں
ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کے اس مستقل پروگرام کا ذکر متعدد مقامات پر ان دو
شقوں پر مشتمل ہے اور کسی جگہ اگر محض ایک شق پر علیحدہ سے زور دیا گیا تو وہ "نہی
المنکر" ہے "امر بالمعروف" نہیں۔

اللہ کے لئے یہ آسان ہے

مجھے احساس ہے کہ تبلیغی جماعت کو دین و شریعت کے حق میں مہماتی سیاست ک
میدان میں نکلنے پر آمادہ کرنا آسان نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے اس میں کیا مشکل ہے۔
ان حضرات کو توفیق دے تو یہ اس کام کے لئے اہل ترین لوگ ہیں' انہیں اس کا س

زیادہ حق پہنچتا ہے کیونکہ وہ اس کے لئے ابتدائی کام کر کے مطلوبہ اہلیت (PRE-QUALIFICATION) حاصل کر چکے ہیں۔

جماعتِ اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام

دوسرے درجہ میں دو جماعتوں کا نام لوں گا جو ان دِنوں انتخابی سیاست میں بہت گہرائی تک اتری ہوئی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک اور اللہ توفیق دے تو دونوں اگر فیصلہ کر لیں کہ انتخابی میدان سے پسپائی اختیار کر لی جائے تو یہ ناممکنات میں سے ہرگز نہیں۔ آخر مجلس احرارِ اسلام نے بھی تو ایک موقع پر یہ فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ ہم سیاست کے میدان سے نکل رہے ہیں۔ اگر کوئی جماعت دین کے لئے غیر سیاسی کام کرتے کرتے یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ اب ہم سیاست کے میدان میں اتر رہے ہیں جیسا کہ ایک پہلوان نے انہی دنوں کیا تو کوئی دینی جماعت سیاست کا کھیل کھیلتے کھیلتے یہ فیصلہ کیوں نہیں کر سکتی کہ دین ومذہب کے مفاد میں وہ سیاست کے اکھاڑے کو خیرباد کہہ رہی ہے۔ جن دو جماعتوں کا نام میں نے لیا وہ اگر یہ فیصلہ کر لیں تو دو خوبیاں جمع ہو جائیں گی۔ ان میں سے ایک کی تنظیم بہت مضبوط ہے تو دوسری کا حلقہ اثر بہت وسیع کہ وہ دیوبندی علماء کے حلقہ اثر پر مشتمل ہے۔ مہماتی سیاست میں آ جائیں تو یہ دونوں گروپ جمع ہو جائیں گے کیونکہ نزاع اور اختلاف کی وجہ انتخابی سیاست ہے جو فساد پیدا کرتی ہے۔ ان کے لئے مروّجہ سیاست سے رجوع کرنا ایک کڑوی گولی نگلنے کے مترادف اور دراصل توبہ کی ایک شکل ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور اعتراف کریں کہ قیام پاکستان کے بعد چالیس سال کی مدت انتخابی سیاست میں جھونک کر انہوں نے غلطی کی ہے اور پلٹ آئیں۔ یہی توبہ کا مفہوم ہے۔

خیر کا ایک بڑا پہلو

میں ان دونوں جماعتوں..... اور اگر تین کہا جائے تب بھی غلط نہیں کہ ان میں سے ایک دو دھڑوں میں منقسم ہے..... کے اجتماعی یا ان میں سے جن کو بھی توفیق کی ارزانی ہو جائے، اس کے انفرادی فیصلے میں خیر کا ایک بڑا پہلو یہ دیکھتا ہوں کہ وہ فعال اور مؤثر دینی ومذہبی عناصر بھی جو مروّجہ سیاست سے علیحدہ رہ کر دین کی خدمت میں مصروف ہیں، دار العلوم چلا رہے ہیں، تصنیف و تالیف کر رہے ہیں، درس و تدریس میں مشغول ہیں، دین و شریعت کے حق میں مہماتی سیاست میں ان جماعتوں کے دست و بازو بن جائیں گے۔ اس کی ایک نمایاں مثال متحدہ شریعت محاذ ہے جس میں تھانوی حلقے کے علماء اور مفتی محمد شفیعؒ کے صاحبزادگان بھی

شریک ہوگئے حالانکہ یہ حضرات انتخابی سیاست کے قریب بھی پھٹکنے کو تیار نہیں۔ بریلوی علماء میں سے مفتی محمد حسین نعیمی صاحب اور دیوبندی مکتبۂ فکر کے اسی شہر لاہور میں چوٹی کے دو مدرسوں کے سربراہ بھی سرگرم ہو گئے تھے جو انتخابی سیاست میں ملوث نہیں ہوتے اور جماعتی سیاست سے بالاتر ہیں۔

ضمنی فوائد

سیاسی میدان سے پسپائی اختیار کرنے کا کڑوا گھونٹ بھرنے والی دینی ومذہبی جماعت یا جماعتوں کو کیا فوائد حاصل ہوں گے؟۔ پہلا یہ کہ ہمارے عوام کے ان تمام مایوس عناصر کی ہمدردیاں حاصل ہوں گی جن کا سب سے بڑا الزام ہی یہ ہے کہ دینی جماعتوں کے آپس کے اختلافات کی وجہ سے اسلام نہیں آرہا۔ دوسرا یہ کہ باقی مذہبی عناصر جو الیکشن کے اکھاڑے میں موجود رہنے پر مصر ہیں سیاست کو خیرباد کہنے والی جماعت یا جماعتوں کی طرف رجوع کریں گے تاکہ ان کے حلقۂ اثر کے ووٹ حاصل کر سکیں لہٰذا تلخی کم ہوگی' محبت پیدا ہوگی اور تیسرا وہی جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں کہ میں اور میری تنظیم اسلامی ایسی جماعت یا جماعتوں کے ادنیٰ خادموں میں شامل ہوں گے۔ میں نے متحدہ شریعت محاذ میں بھی اسی جذبہ سے شرکت کی تھی اور علیحدگی اختیار کی تو اس وقت جب دیکھ لیا کہ یہ اصل میدانِ کارزار میں اترنے کو تیار نہیں۔ لوگ اسمبلیوں سے استعفاء دینے کو تیار نہ ہوئے۔ کچھ بعد بساط الٹ گئی تو سب ہی اسمبلیوں سے باہر تھے لیکن اس موقعہ پر معدودے چند حضرات بھی ازخود اس محرومی کو گلے لگانے کو آمادہ نہ ہوئے اور غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔

میں نے حد درجہ خلوص واخلاص سے یہ باتیں کہیں اور پہلے بھی کہتا رہا ہوں لیکن انہیں توجہ کے قابل نہ سمجھا گیا تو میرا راستہ بہرحال یہی ہے جس میں عمر عزیز کے تیئیس (۲۳) سال لگا چکا ہوں۔ اسی کے حق میں اپنے دو خطباتِ جمعہ میں میں نے شواہد پیش کئے اور دلائل بھی دیئے ہیں۔

اب میدان میں نکلیں

تبلیغی جماعت نے اپنے لاکھوں وابستگان کو نیکی کا پرچار کرنے اور خود چھوٹی سے چھوٹی نیکیاں تک کمانے میں محنت کرنے کی تربیت دی ہے۔ اب اسے اپنی یہ قوت برائیوں کو روکنے اور ان کے راستے بند کرنے کے لئے میدان میں لانی چاہئے۔ یہ لوگ بے غرضی سے اور نام و

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ

نوا را تلخ ترمے زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی
حُدی را تیز ترمے خواں چو محمل را گراں بینی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے ایک حالیہ خطابِ جمعہ میں، جس کی تلخیص اسی شمارے میں شامل ہے، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے زیرِ نظر مضمون کا حوالہ دیا تھا۔ اولاً "بینات" میں شائع ہونے والا یہ گرانقدر مضمون اس سے قبل مئی ۷۶ء میں میثاق کے صفحات کی زینت بن چکا ہے۔ اس وقت محترم ڈاکٹر صاحب نے مولانا بنوریؒ کے اس مختصر سے مضمون پر جو مفصل تعارفی نوٹ لکھا تھا اس کے مطالعے سے چونکہ وہ پس منظر واضح ہو جاتا ہے جو اس تحریر کا محرک بنا لہٰذا اسے بھی شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

ذیل کی تحریر ماہنامہ 'بینات'، کراچی کی مارچ ۷۶ء کی اشاعت سے ماخوذ ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ 'بینات'، کے ماہ رجب کے شمارے میں 'ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی راولپنڈی کے جانب سے شائع شدہ 'مجموعۂ قوانینِ اسلامی' مؤلفہ جناب تنزیل الرحمٰن پر ایک مفصل تبصرہ جناب مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی کے قلم سے شائع ہوا ——— اوّل تو یہ طرزِ عمل بجائے خود مثبت تعمیری طرزِ فکر کا آئینہ دار تھا کہ بجائے اس کے کہ محض اس بنا پر کہ زیرِ تبصرہ کتاب ایک معروف تجدّد پسند ادارے کی جانب سے شائع ہوئی تھی اسے کلیۃً رد کر دیا جاتا، فاضل تبصرہ نگار نے انتہائی محنت سے پوری کتاب کا تنقیدی مطالعہ کیا اور شدید عرق ریزی سے اس کی ایک ایک دفعہ میں صحیح و غلط اور حق و باطل کی علیحدہ علیحدہ نشان دہی کر دی ——— اس پر مستزاد یہ کہ تبصرے کے آخر میں "مؤلف اور تالیف کے بارے میں بحیثیتِ مجموعی ہماری رائے" کے ضمن میں وسعتِ قلب کے ساتھ اور اعترافِ حق کے جذبے کے تحت یہ اعتراف بھی کر لیا کہ مؤلف سے غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں لیکن ان کے نقطۂ نظر میں کجی اور طرزِ فکر میں فتنہ انگیزی موجود نہیں ہے اور بحیثیت مجموعی یہ کتاب "لیساً مغتنم" اور "قابلِ تحمل" ہے ——— اس پر دینی حلقوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور بعض انتہائی ذمہ دار اور ممتاز علمائے نے "بینات" کے سرپرست اور نگران حضرت مولانا

محمد یوسف صاحب بنوری کے نام شکایتی خطوط لکھے جن کا مرکزی مضمون یہ تھا کہ ــــ "تج
پسندی کا جواب ہی بیّنات تھا۔ اگر یہی گھٹنے ٹیک دے تو انجام کیا ہوگا" ــــ اور یہ کہ ــــ
"تھوڑی سی نرمی علماء کے موقف کو کمزور کر دیتی ہے۔ اور اس طرح دشمنانِ دین کے موقف ک
غیر شعوری طور پر قوت مل جاتی ہے" ــــ اس پر ادارۂ 'بیّنات' نے ایک جانب تو تبصرے ک
اس حصّے کی قدرے وضاحت کی جو شاید حضراتِ معترضین کے نزدیک تو "عذرِ گناہ بدتر از گناہ"
قرار پائے۔ اور دوسری طرف علمائے کرام کی خدمت میں بھی "نوارا تلخ ترمی زن . . . .' کے عنوا
سے بعض گزارشات بڑے ادب و احترام کے ساتھ پیش کیں۔

ان گزارشات میں بعض باتیں چونکہ انتہائی اہم آگئی ہیں اور اس لائق ہیں کہ پاکستان ک
تمام علماء ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور ان کی روشنی میں اپنے موجودہ طرزِ فکر و عمل پر نظر ثانی
فرمائیں ــــ لہٰذا ہم اس تحریر کو ادارۂ 'بیّنات' کے شکریے کے ساتھ 'قارئین میثاق' کی خ
میں پیش کر رہے ہیں ــــ مدیر)

"نوارا تلخ ترمے زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی
حُدی را تیز ترمے خواں چو محمل را گراں بینی"

اس موقع پر ہم علمائے اُمت کی خدمت میں بھی چند گزارشات پیش کر دینا ضروری فر
سمجھتے ہیں :۔

الف: انگریز کے دورِ حکومت میں ہمارے اکابر نے جو شاندار دینی و ملّی کارنامے انجام دیئے ا
کا خلاصہ نکالیے تو انہیں بڑے بڑے دو شعبوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ **اوّل:** ہر قسم کے جدید و
قدیم فتنہ کا استیصال بذریعہ تقریر و تحریر، وعظ و تبلیغ، درس و خطابت اور ارشاد و تلقین۔ **دوم:** اُمت
مسلمہ کے لیے روحانی غذا مہیا کرنا، بذریعہ قیامِ مدارس و معاہد، دارالعلوم، دارالافتاء، مساجد و خانقاہ
تصنیف و تالیف، اور جلسہ و کانفرنس۔ آج کل کی اصطلاح میں قسم اوّل کو "منفی" اور قسم ثانی کو "مثبت
کہا جاتا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ دین کی پاسبانی کے لیے علمائے اُمت نے ان دونوں میدانوں
میں بیش قیمت قربانیاں دیں اور اپنے خونِ جگر سے "گلشنِ دینِ خداوندی" کو سیراب کیا، الحمدللہ ک
آج تک اپنی بساط کے موافق یہ سلسلہ جاری ہے، خدمتِ دین کی ان ہی مثبت و منفی تاروں کے ذریع

ب تک اُمّتِ مسلمہ کا رابطہ (کشش) ذاتِ نبوی (بآبائنا ھو و اُمّھاتنا، صلی اللہ علیہ وسلم) سے قائم رہے گا، اُمّت انوارِ نبوت سے مستفید ہوتی رہے گی، اور اس سلسلہ میں سعی کرنے والے حضرات اپنی اپنی محنت اور قربانی کے بقدر، اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔

ب: انگریز کے رخصت ہو جانے اور اسلامی نظریۂ حیات کی بنیاد پر مملکتِ خداداد پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد علمائے اُمت پر مذکورہ بالا دوگونہ ذمّہ داریوں کے ساتھ ایک تیسری ذمہ داری عائد ہو گئی، یعنی حکومتِ پاکستان کے سامنے نہایت پیار و محبت، انتہائی ہمدردی اور خلوص اور بے حد حکمت و فراست کے ساتھ اسلامی اور دینی نقوشِ حیات پیش کرنا، جن پر ایک اسلامی ریاست کی بنیادیں اُٹھائی جائیں نیز دورِ حاضر کی تمام مشکلات کا حکیمانہ جائزہ لے کر اسلامی قانون کی تدوین، جسے عدلیہ میں نافذ کیا جاتے، یہ علمائے اُمت کا اپنا منصبی فریضہ تھا، خواہ حکومت ان سے مطالبہ کرتی یا نہ کرتی، انہیں صحیح اور واقعی مقام دیتی یا نہ دیتی، ان کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کسی حلقہ کی جانب سے کیا جاتا یا نہ کیا جاتا، دنیا کے ہر اجر و مُزد، منصب و وجاہت، اور مال و جاہ کی منفعت سے بالاتر رہ کر صرف رضائے الٰہی ادائے حقِ رسالت، نصحِ اسلام، اور فلاحِ آخرت کی خاطر انہیں یہ کام کرنا چاہیے تھا، جانشینِ نبوت کی حیثیت سے ان کا مشن وہی ہونا چاہیے تھا جو تمام انبیاء علیہم السلام کا رہا یعنی:

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۔

"میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں چاہتا، میرا اجر و ثواب تو بس اللہ نے اپنے ذمّہ لے رکھا ہے"

لیکن ہمیں اپنی اس کمی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ جہاں ہم دین کی اور بیش بہا خدمتوں کی بناء پر رحمتِ خداوندی سے اجر و ثواب کے متمنی ہیں وہاں اس عظیم الشان فریضہ سے صرفِ نظر کرنے کی وجہ سے معرضِ مسئولیت میں آجانے کا شدید اندیشہ بھی لاحق ہے، اگر میدانِ قیامت میں یہ مناقشہ فرمایا لیا گیا کہ تم نے اس نازک مرحلہ میں اپنی اجتماعی قوتوں کو کیوں نہ کھپایا؟ اس زبردست خلاء کو پُر کر کے اُمّت کی قیادت کیوں نہ کی؟ وقت کے ایک عظیم دینی فریضہ سے کیوں بے اعتنائی برتی؟ تمہارے نفراتی مشاغل، نجی مقاصد اور گروہی فوائد اس کے درمیان کیوں حائل رہے؟ اور اسلامی حکومت کے سامنے ایک صحیح "مجموعۂ قوانینِ اسلام" پیش کر کے تم نے اتمامِ حجت کیوں نہ کیا؟ تو غالب گمان یہ ہے کہ جہاں

ارکانِ مملکت، اربابِ سیاست اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے لوگوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا، وہاں علمائے امت بھی اس کی مسئولیت سے بری نہ ہو سکیں گے۔ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰہُ

ج : ایک جمہوری ملک میں تہذیب و متانت اور خیر خواہی و دل سوزی کے ساتھ حکومت کو نیک مشورہ دینا ——— کوئی شجرۂ ممنوعہ نہیں، بلکہ ایک اچھی روایت ہے، اور علمائے اُمت پر تو ایک شرعی فریضہ کی حیثیت سے یہ لازم ہے کہ وہ اصلاحی مشورے دیں، لیکن علمائے اُمّت کی ذمہ داری مجرد اس بات پر ختم نہیں ہو جاتی کہ وہ حکومت پر تنقید کر لیا کریں اور "یہ نہ کرو، وہ نہ کرو" کا صرف وعظ کہہ لیا کریں، بلکہ انہیں آگے بڑھ کر حکومت کو یہ بھی بتلانا ہوگا کہ "یہ کرو" ——— ان کے پاس ایسا مرتب شدہ مجموعۂ قوانین ہو جسے دفعات کی شکل میں جدید طرز کی قانونی زبان میں مدوّن کیا گیا ہو اور شرعی حدود کے تقاضوں کی رعایت پوری طرح اس میں ملحوظ رکھی گئی ہو، نئے دَور کی مشکلات کا شرعی حل پیش کیا گیا ہو، قرآن و حدیث، اجماعِ امّت اور اصولِ اجتہاد کی ٹھیک ٹھیک پابندی رکھتے ہوئے ... اُمت کے لیے ممکن حد تک آسانی کی گنجائش باقی رکھی گئی ہو، پھر اس "مجموعۂ قوانینِ اسلام" کو پوری بصیرت سے انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ "اسے اسلامی ریاست میں نافذ کرو" اور اس وقت اربابِ اختیار بالفرض اسے نافذ نہ بھی کریں تو کم از کم علمائے اُمت عنداللہ اخروی مسئولیت سے تو بری الذمہ ہو ہی جائیں گے اور داورِ محشر کی عدالت میں اوّلین و آخرین کے سامنے وہ اتنا تو کہہ سکیں گے کہ :

> "یا اللہ اپنی فہم و بصیرت کی ممکنہ حد تک تیرے پاکیزہ قانون کو ہم نے آسان سے آسان تر صورت میں قوم کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اے اللہ! ہم اپنے ضعف اور اپنی ناداری کے ساتھ بس اتنا کام ہی کر سکتے تھے، لیکن قوت کے ساتھ اسے نافذ کرانا ہمارے بس سے باہر تھا۔
>
> اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ۔
>
> "اب آپ انہیں عذاب دینا چاہیں تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر آپ ان کی بخشش فرمادیں تو بلاشبہ آپ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔"

اور کیا بعید ہے کہ حق تعالیٰ کسی وقت اربابِ اختیار کو اس کے نافذ کرنے کی توفیق ہی دے دیں (جہاں تک ہمیں معلوم ہے حکومت میں اب بھی اللہ کے ایسے مخلص بندے موجود ہیں، جو دل وجان سے اس بات کے متمنی ہیں کہ انگریزی قانون (جو جزوی ترمیمات کے ساتھ ہمارے یہاں رائج ہے) کی جگہ اسلامی قانون نافذ کیا جائے، چنانچہ صدر مملکت نے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسی نیک مقصد کے لیے قائم کیا تھا کہ تدریجاً مروجہ قانون کی دفعات کو اسلامی قانون میں ڈھال دیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ادارہ کے بعض ارکان کی اُلٹی ذہنیت نے اس کے مقاصد ہی کو اُلٹ کر رکھ دیا ہے اور صرف "مغربیت پر اسلام کی چھاپ" لگا دینے کے لیے ہی تمام الحادی اسلحہ استعمال کیا جانے لگا۔)

۵: اس سلسلہ میں علمائے اُمت کے سامنے جو مشکلات ہیں اور جن دشوار گزار مراحل سے وہ گزر رہے ہیں، نکتہ چین لوگوں کو ان کا احساس ہو یا نہ ہو، ہمیں ان کا پوری طرح احساس ہے، لیکن اس کا کیا کیجیے کہ زمانے کے دینی تقاضے ہماری مشکلات پر نظر رکھنے کے عادی نہیں ہیں، مقتضیاتِ وقت کی عدالت میں ہمارے اس عذر کی کوئی شنوائی نہیں کہ ہمارے پاس نہ تو اس کام کے لیے باصلاحیت افراد کو فارغ کرنے کی ادنیٰ گنجائش ہے، اور نہ ہم اس کے لیے زرِ کثیر فراہم کر سکتے ہیں۔ "قاضیِ وقت" کا فیصلہ یہی ہے کہ تمہارے پاس فرصت ہو یا نہ ہو، قوت ہو یا نہ ہو، سرمایہ ہو یا نہ ہو، بیٹھنے کی جگہ ہو یا نہ ہو، تمہیں یہ کام بہرحال کرنا ہوگا، اور بغیر کسی دنیوی منفعت کے کرنا ہوگا، کیونکہ کرنے کا کام صرف گفت و شنید سے نہیں ہوتا، وہ تو بہرصورت کرنے ہی سے ہوتا ہے، گزشتہ چند سالوں سے ہندوستانی علما نے ایک "ادارۂ تحقیقاتِ شرعیہ" قائم کر لیا ہے۔ جس سے قارئینِ "بینات" متعارف ہیں۔ لیکن بڑی ندامت کی بات ہے کہ پاکستانی علما اب تک اپنا "ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی" قائم نہیں کر سکے جو ہر قسم کی سیاست بازی سے الگ رہ کر پوری ملت کی اس عظیم خدمت کو بجا لاتا۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر پوری سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہیے، نری جذباتیت سے مسائل حل نہیں ہو جاتے۔

لعمری لقد نبهت من کان نائمًا
واسمعت من کانت له اذنان!

(الامام الکشمیری)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ھمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ھماری غلطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

رفقائے کار
چوہدری غلام محمد

ماہِ صیام کے دوران

رفقاءِ تنظیم کی دعوتی و تحریکی سرگرمیاں

تنظیم اسلامی پاکستان کا چودھواں سالانہ اجتماع ۳۱ مارچ ۸۹ء کو اختتام پذیر ہوا اور ملک کے دور دراز علاقوں نیز بیرونِ ملک سے آنے والے احباب و رفقاء نے یکم اپریل کو اپنے اپنے مقامات کی جانب مراجعت اختیار کی۔ چند روز بعد ہی رمضان المبارک کی بابرکت ساعتیں شروع ہونے والی تھیں۔ نیکی اور سعادت کی راہ پر پیش قدمی کی تڑپ رکھنے والے خوش بخت، جواں ہمت لوگوں کے لئے ربِّ رحیم و کریم کے خصوصی فضل و عنایت اور بے پایاں رحمتوں کے نزول کا ماہِ مبارک سایہ فگن تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور توفیق الٰہی سے اس ماہ کے دوران حسب معمول رفقائے تنظیم اسلامی نے اپنے اپنے مقامات پر اپنی تعلیم و تربیت و تزکیہ نیز دعوت و تنظیم کے لئے پروگرام ترتیب دیئے۔ مختلف مقامات سے مرکزی دفتر تنظیم اسلامی میں موصولہ رپورٹس کی بنیاد پر بعض مقامات پر منعقد شدہ پروگراموں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

کوئٹہ

کوئٹہ میں رمضان المبارک سے قبل اپریل کے پہلے ہفتہ کے دوران تنظیم اسلامی کوئٹہ کے پروگرام حسب سابق ہی رہے یعنی جمعۃ المبارک کو ۳ گھنٹہ کا ہفتہ وار اجتماع اور اس کے دوران معمول کے تربیتی و تنظیمی پروگرام۔ علاوہ ازیں ترجمۃ القرآن کی ایک کلاس بھی جاری تھی۔ اس کو سالانہ اجتماع اور رمضان المبارک کی وجہ سے عارضی طور پر معطل کیا گیا تھا اور اب انشاء اللہ العزیز رمضان المبارک کے بعد اس کا اجراء ہو جائے گا۔

جناب میاں محمد نعیم صاحب سابق ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان جن کو اب سالانہ اجتماع کے موقع پر ناظمِ تربیت کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے انہوں نے سالانہ اجتماع کے بعد اپنی پہلی فرصت میں رمضان المبارک کے دوران ہی اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ تربیت گاہوں کا ایک باقاعدہ نظام وضع کر لیا گیا ہے جس کا ایک خاکہ مقامی امراء کو بھیج دیا گیا ہے اور بقیہ تفصیلات طے کی جا رہی ہیں۔ رفقاء سے براہِ راست رابطہ و مشورہ، مسائل اور اشکالات پر گفتگو اور مقامی سطح پر تربیتی محافل کے انعقاد کے لئے

موصوف شعبان المعظم کے آخری روز یعنی ۷ر اپریل کو کوئٹہ پہنچ گئے اور ۳ر مئی ۲۶ر رمضان المبارک تک وہیں قیام کیا۔ موصوف کی کوئٹہ میں موجودگی کی وجہ سے جہاں رفقاء سے رابطہ اور تعلیم و تربیت کے پروگرام ہوئے وہاں تنظیم اسلامی کوئٹہ کے زیر اہتمام رمضان المبارک کے دوران دعوتی پروگرام بھی نہایت بھرپور انداز میں ہوئے۔ اولاً تمام رفقائے تنظیم اسلامی کوئٹہ کو جمع کیا گیا۔ دو روز دفتر تنظیم اسلامی کوئٹہ میں رفقاء کی خصوصی نشستیں ہوئیں جن میں باہم تعارف ' افہام و تفہیم اور باہم مشورہ کے بعد پورے مہینہ کے دوران تربیتی و دعوتی پروگرام ترتیب دیئے گئے۔ تربیت کے لئے رفقاء کو دو گروپس میں تقسیم کیا گیا۔ ایک گروپ میں اُن رفقاء کو شامل کیا گیا جو نسبتاً ذمہ دار ' فعال اور زیادہ وقت فارغ کر سکتے تھے۔ دوسرے گروپ میں وہ رفقاء شامل ہوئے جو زیادہ وقت فارغ نہیں کر سکتے تھے۔ ہر ہفتہ کے دوران تین روز دفتر تنظیم اسلامی کوئٹہ میں جناب ناظم تربیت کی ان گروپس کے ساتھ طویل خصوصی نشستوں کا اہتمام ہوا۔ ان نشستوں میں دین کا جامع تصور اور اس کے مطالبات ' مردِ مومن کی زندگی کا نقشہ اور ترجیحات ' جہاد فی سبیل اللہ ' ہدف اور طریق کار ' تحریکِ احیائے دین اور انقلابی جدوجہد' مبتدی نصاب اور مرکز سے جاری شدہ دیگر ہدایات پر تفصیلی گفتگو ہوئی اور افہام و تفہیم کی کوشش کی گئی۔ تنظیم اسلامی کوئٹہ کی کارکردگی کا جائزہ بھی ہوا اور آئندہ کے لئے پروگراموں کے بارے میں مشورے بھی ہوئے ' رمضان المبارک کے دوران کوئٹہ میں بھرپور دعوتی پروگرام ہوئے۔ مرکز سے جاری شدہ ہدایات کے مطابق جناب ناظمِ تربیت نے کوئٹہ میں دعوتی پروگراموں کو اس طریقہ سے ترتیب دیا کہ اس میں رفقاء کم سے کم شریک ہوں جبکہ میزبان رفیق کے احباب ' عزیز و اقارب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں مدعو کیا جائے تاکہ دعوت دوسرے لوگوں تک زیادہ پہنچے۔ کوئٹہ کے بارہ مختلف مقامات پر یہ پروگرام ہوئے۔ ان پروگراموں میں رفقاء کے علاوہ اوسطاً چالیس احباب شریک ہوتے رہے۔ بعض مقامات پر حاضری ستّر سے بھی متجاوز ہو گئی۔ عصر تا قبلِ افطار باہم تعارف و درسِ قرآن حکیم کا پروگرام ہوتا تھا جن میں میاں محمد نعیم صاحب نے بالعموم دین کے مطالبات اور موجودہ حالات میں ان کی بجا آوری کے لئے محنت و کوشش اور موانعات کو دور کرنے کی تدابیر جیسے اہم موضوع کو گفتگو کا مرکز بنایا۔ بعد از نمازِ مغرب سوال و جواب کی محفل میں ان موضوعات کے مزید پہلو بھی نکھر کر سامنے آتے رہے۔ ان پروگراموں کے علاوہ جناب میاں محمد نعیم صاحب نے اپنے قیام کوئٹہ کے دوران امیر تنظیم اسلامی کوئٹہ ' دیگر ذمہ دار حضرات اور دیگر رفقاء سے انفرادی ملاقاتیں بھی کیں جن میں بعض خاصی طویل بھی تھیں۔ ان ملاقاتوں میں میاں صاحب نے مختلف تنظیمی معاملات ' کارکردگی ' رفقاء کا باہمی تعلق اور ان کے ذاتی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا اور مناسب مشورے دیئے۔ جناب ناظم تربیت کے دورۂ کوئٹہ کے دوران بروز جمعہ ۲۱ر اپریل کو مقامی تنظیم کے امیر کی رہائش گاہ پر رفقائے تنظیم کی خواتین کا خصوصی اجتماع منعقد ہوا۔ بیس خواتین نے شرکت کی اور صبح ساڑھے نو بجے تا ساڑھے گیارہ بجے یہ اجتماع جاری رہا۔ میاں محمد

نعیم صاحب کی اہلیہ نے اس اجتماع سے مفصل خطاب کیا اور اپنے عملی تجربہ کی روشنی میں اس بات کو واضح کیا کہ اگر قوانینِ شریعت کی پابندی کی جائے تو گھر میں کس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت کا نزول ہوتا ہے اور ماحول امن و عافیت اور محبت کا گہوارہ بن جاتا ہے جس میں افرادِ خانہ اور بچوں کی تربیت و نشوونما کے بہتر مواقع میسّر ہوتے ہیں۔ اس اجتماع کے دوران دوسرے کمرہ میں خواتین کے ساتھ آئے ہوئے رفقاء جمع تھے اور بچوں کی نگہداشت ان کے ذمّہ تھی۔ میاں محمد نعیم صاحب نے بھی اس اجتماع سے مختصر خطاب کیا جس میں خواتین کو اسلام کے عطا کردہ حقوق کا تذکرہ ہوا۔

ملتان اور جنوبی پنجاب

ملتان اور نواحی علاقہ پر مشتمل علاقہ جنوبی پنجاب کے امیر ڈاکٹر محمد طاہر خان خاکوانی اور ناظمِ حلقہ ڈاکٹر منظور حسین صاحب کی کوشش و محنت سے گزشتہ ماہ کے دوران اس حلقہ میں قابلِ قدر دعوتی اور تنظیمی کام ہوا۔ سالانہ اجتماع سے واپسی پر ماہِ صیام میں دعوتی پروگراموں کی منصوبہ بندی کے لئے دفترِ حلقہ میں مشاورت کا اہتمام ہوا۔ اتفاقِ رائے سے ملتان کے لئے چار ہفتہ وار پروگراموں کو آخری شکل دی گئی۔ نیز حلقہ میں دیگر مقامی تنظیموں اور اسرہ جات کو بھی اپنے اپنے مقامات پر اسی قسم کے پروگرام تشکیل دینے کی تلقین کی گئی۔ مرکز کی ہدایات اور سابقہ تجربات کی روشنی میں یہ طے پایا تھا کہ معمول کے ہفتہ وار دعوتی و تدریسی پروگراموں کے ساتھ افطاری کے پروگرام ترتیب دیئے جائیں جن میں باہم تعارف ' درسِ قرآن اور افہام و تفہیم کا اہتمام ہو۔ ان مجالس میں رفقائے تنظیم کے علاوہ تدریسی پروگراموں کے شرکاء اور اس روز کے میزبان رفیق کے اعزّہ و اقارب اور احباب کو شرکت کی خصوصی دعوت دی جائے۔ الحمدللہ تنظیم اسلامی ملتان کی حد تک یہ پروگرام بحسن و خوبی منعقد ہوئے۔ ہر پروگرام میں شرکاء کی تعداد اوسطاً ستر تھی۔ احباب ذوق و شوق سے شریکِ محفل ہوئے اور دین کی دعوت کو سمجھنے سمجھانے کے عمدہ مواقع میسّر آئے۔ ان مواقع پر حسبِ ضرورت ابتدائی تعارفی دعوتی کتابچے شرکاء کو مہیا کئے گئے۔ ان اجتماعات میں سے تین میں امیر حلقہ ڈاکٹر محمد طاہر خان خاکوانی صاحب نے خطاب فرمایا اور ایک اجتماع میں سابق امیرِ حلقہ جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے خطاب کیا۔ فاروقی صاحب اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے اب ملتان میں نہیں ہوتے تاہم رفقاء و احباب سے ملاقات اور کسی ہفتہ وار تدریسی و دعوتی پروگرام میں شرکت کے لئے ہر ماہ تشریف لاتے ہیں۔ ملتان میں منعقدہ متذکرہ بالا چار اجتماعات میں خطابات کے عنوانات یہ تھے۔ (۱) روزہ کی غرض و غایت اور مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق۔ (۲) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں۔ (۳) دین اور مذہب کا فرق۔ (۴) اقامتِ دین کی فرضیت اور اس کا نبویؐ منہاج .... دفتر حلقہ سے ان پروگراموں کی مناسب تشہیر اور رفقاء و احباب کو اطلاع کا بہت عمدہ اہتمام کیا گیا تھا۔ رمضان المبارک کے دوران حلقہ کے مرکز میں قیام اللیل کا بھی اہتمام رہا جس میں خواتین و حضرات کی ایک معقول تعداد نے شرکت کی۔

حلقہ جنوبی پنجاب کے دوسرے مقامات پر بھی بفضلہ تعالیٰ گذشتہ ماہ کے دوران دعوتی و تحریکی پہلو سے نمایاں پیش رفت کی کیفیت محسوس ہوئی۔ تنظیم اسلامی وہاڑی کے زیر اہتمام ماہ صیام میں جامع مسجد اہلحدیث لکڑمنڈی میں چار ہفتہ وار دعوتی اجتماعات ہوئے۔ عصر تا مغرب باہم تعارف' درسِ قرآن اور مختصر وقفہ کے لئے افہام و تفہیم کے پروگرام ہوئے اور افطار و طعام کے بعد رفقاء و احباب کو قیام اللیل کے لئے جلد فارغ کیا جاتا رہا۔ امیر حلقہ ڈاکٹر محمد طاہر خان خاکوانی نے ایک پروگرام میں شرکت کی اور درسِ قرآن دیا۔ بقیہ پروگراموں میں درس قرآن کا فریضہ رفیق محترم جناب پروفیسر محمد اسلم جاوید صاحب نے سرانجام دیا۔ جمعۃ الوداع کے عظیم اجتماع سے "فرائضِ دینی کا جامع تصور" کے موضوع پر خطاب کا بھی اہتمام ہوا۔ شجاع آباد میں رفقائے تنظیم اسلامی نے ماہ صیام کے دوران چھ دعوتی پروگرام ترتیب دیئے۔ ۲ر مئی بروز منگل بلدیہ شجاع آباد کے جناح ہال میں امیر حلقہ ڈاکٹر محمد طاہر خان خاکوانی کے خطابِ عام کا پروگرام تھا۔ موصوف نے "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ بہاولپور' جھنگ' بورے والہ اور لیّہ میں معمول کے تعلیمی و تدریسی پروگرام جاری رہے اور بعض مقامات پر محدود پیمانہ پر دعوتی پروگرام بھی ہوئے۔

لاہور

قرآن اکیڈمی لاہور میں گذشتہ کئی سالوں سے رمضان المبارک کے دوران جشنِ بہاراں کا سماں ہوتا ہے۔ اس ماہ مبارک میں قیام اللیل کے دوران دورۂ ترجمۃ القرآن کی پرکیف محافل اب یہاں کی زندگی کا ایک مستقل حصہ بن چکی ہیں۔ طالبانِ علم جوق در جوق شریک ہوتے ہیں اور نہ صرف قرآن مجید کے علم و حکمت کے موتیوں سے دامن بھرتے ہیں بلکہ ان مبارک ساعتوں کے انوار و تجلیات سے اپنے باطن کو بھی منور کرتے ہیں۔ دعوتِ رجوع الی القرآن کے داعی جناب امیر تنظیم اسلامی نے چند سال قبل اس مبارک سلسلہ کا آغاز کیا تھا اور اب بفضلہ تعالیٰ دوسرے مقامات پر بھی یہ سلسلہ روز افزوں ہے۔ اس سال ابوظہبی کے رفقاء و احباب کے اصرار پر محترم امیر تنظیم اسلامی نے دورۂ ترجمۃ القرآن وہاں پر مکمل کیا۔ اس کی روداد آپ انہی صفحات میں الگ ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس سال قرآن اکیڈمی لاہور میں دورۂ ترجمۃ القرآن کی تکمیل جناب پروفیسر حافظ احمد یار صاحب (سابق پروفیسر اسلامیات پنجاب یونیورسٹی) استاذ قرآن کالج لاہور نے کی۔ الحمد للہ قرآن حکیم کی تعلیمات ایک نئے انداز میں سامنے آئیں۔ محترم امیر تنظیم کے بیان میں جہاں فکرِ قرآنی کے انقلابی پہلو نمایاں ہوتے ہیں وہاں حافظ صاحب موصوف نے اس کے علمی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے...... آمین۔

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی میں بھی ماہ صیام کی مبارک راتیں آباد رہیں۔ شہر کے نواحی حصہ سے رفقاء و احباب کی ایک معتدبہ تعداد یہاں جمع رہی اور امیر محترم کے دورۂ ترجمہ قرآن کی وڈیو کیسٹس

سے استفادہ کیا گیا۔ چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے مسجد طوبیٰ نوتاریاں شالیمار روڈ نواں کوٹ لاہور میں بعد نماز تراویح روزانہ قریباً تین گھنٹہ کی محفل میں دورۂ ترجمۂ قرآن مجید مکمل کیا۔ یہاں کے منتظمین اور احباب نے بہت ذوق و شوق اور اہتمام کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت اور خلوص کو قبول فرمائے اور تعلیماتِ قرآنی کے نور سے ان کے گھروں اور ماحول کو منور کرے۔ حافظ محمد رفیق صاحب فیلو قرآن اکیڈمی و استاذ قرآن کالج لاہور نے امسال کراچی میں دورہ ترجمۃ القرآن مکمل کیا۔ بعض دیگر مقامات پر بھی رفقاء و احباب نے امیر محترم کے دورۂ ترجمۃ القرآن کے وڈیو کیسٹس سے استفادہ کیا اور رمضان المبارک کی راتیں قرآن مجید کا پیغام سمجھنے میں گذاریں۔ باجوڑ میں تنظیم کے رفقاء نے اپنے نقیب جناب محمد فہیم صاحب کی قیادت میں دعوتی پروگرام ترتیب دیئے اور عصر تا مغرب دورۂ ترجمۃ القرآن کے آڈیو کیسٹس سنانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ اس بابرکت سلسلہ کو مزید ترقی دے۔ محترم امیر تنظیم اسلامی ابوظہبی میں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کے بعد ۲۴ رمضان المبارک کو واپس تشریف لے آئے تھے۔ موصوف نے رمضان المبارک کی ۲۸ ویں اور ۲۹ ویں شب کو قرآن اکیڈمی لاہور میں قرآن مجید کے بعض منتخب حصوں کا درس دیا۔ جس میں پیش نظر یہ تھا کہ قرآن مجید کا پیغام اختصار اور جامعیت کے ساتھ سامنے آجائے۔ رفقاء و احباب نے بھرپور شرکت کی۔

رمضان المبارک کے دوران تنظیم اسلامی لاہور کے زیر اہتمام مختلف مقامات پر ۷۵ سے زائد دعوتی پروگرام ہوئے۔ رفقاء نے انفرادی سطح پر اپنے احباب اور عزیز و اقارب میں بھی دعوتی کام کیا۔ ان کی تفصیلات کا احصاء اس مختصر رپورٹ میں ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ خدمت دین کے سلسلہ میں کی گئی کوششوں کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور مزید محنت کی توفیق مرحمت فرمائے...... آمین۔

بقیہ: تذکرہ و تبصرہ

نمود کی خواہش کے بغیر خاموشی کے ساتھ اپنا کام کئے چلے جانے کے عادی ہو چکے ہیں اور الحمدللہ کہ ان کے ہاں امیر کی اطاعت اور مسلم کے اکرام کا تصور بھی نہ صرف پختہ ہے بلکہ عمل سے بھی جھلکتا ہے۔ یہ لوگ دین و شریعت کے حق میں مہماتی سیاست کا راستہ اختیار کریں تو نظم و ضبط کا مظاہرہ بھی ہو گا' عام لوگوں کی عزت' آبرو اور مال و جان پر کوئی آنچ بھی نہ آئے گی اور خواہشِ اقتدار سے لاتعلقی پر ان کی پچاس سالہ تاریخ کی گواہی پہلے سے موجود ہے۔ یہی عوامل آج پاکستان میں نہی عن المنکر بالید کے لئے درکار ہیں اور شریعت کی بالادستی عملاً قائم ہونے کی کوئی امید ہے تو وہ انہی عوامل سے وابستہ ہے۔

رپورتاژ
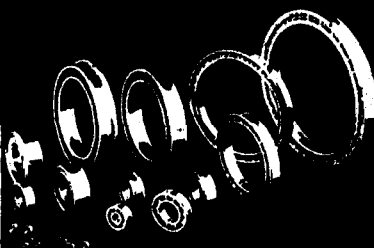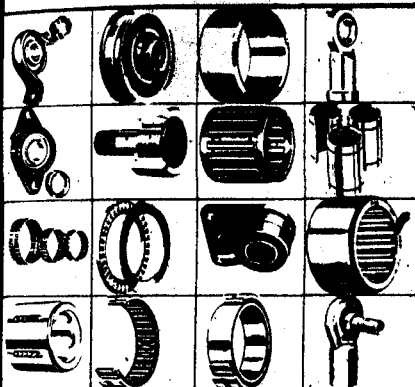
صومِ نہار اور قیامِ لیل

ماہِ صیام کے دوران متحدہ عرب امارات میں امیر تنظیمِ اسلامی کا دورۂ ترجمۂ قرآن اور دیگر تحریکی سرگرمیاں

داعیٔ تحریک رجوع الی القرآن اور امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے رمضان المبارک کی بابرکت راتوں میں قرآن حکیم کے فیوض و انوار سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کے لیے چند سال سے نماز تراویح کے ساتھ ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہ یقیناً اہلِ پاکستان کی بہت بڑی خوش بختی ہے۔ یہ پروگرام خواہ لاہور میں ہو یا کراچی میں، طالبانِ علمِ ہدایت ملک کے ہر حصے سے اس میں شرکت کے لیے پہنچ جاتے ہیں اور قرآن حکیم کے علوم و معارف سے مقدور بھر فیضیاب ہوتے ہیں۔ بیرونِ پاکستان مقیم رفقاء و احباب کے لیے پورے ایک ماہ کے اس پروگرام میں شرکت ممکن نہیں ہوتی اور وہ دلوں میں اس کی حسرت لیے اپنے ان بھائیوں کی قسمت پر رشک کرتے رہتے ہیں جن کی قسمت میں ایسی سعادتیں لکھی ہوتی ہیں۔ بیرونِ ملک مقیم احباب کی اس محرومی کا کسی حد تک ازالہ آڈیو و ویڈیو کیسٹس کے ذریعے ہو پاتا ہے۔ لیکن اس بار اللہ تعالیٰ نے ابوظہبی میں مقیم ہم پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں پر اپنا اس قدر فضل و کرم فرمایا کہ اس پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ ع خدایا ایں کرم بارِ دگر کن! ہمارے ہاں قرآنی فیوض و برکات کی یہ بہار اس طور سے جلوہ آرا ہوئی کہ یہاں کے احباب کے اصرار پر امیر محترم نے اس رمضان المبارک میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام ابوظہبی میں رکھ لیا۔

تنظیم اسلامی اور جمعیت خدام القرآن ابوظہبی نے محترم ڈاکٹر صاحب کے اس دورۂ ابوظہبی کے سلسلے میں ایک مشترکہ مجلسِ مشاورت قائم کی۔ اس پروگرام کے ضمن میں تین مسئلے درپیش تھے۔

- محترم ڈاکٹر صاحب کے لیے ایک ماہ کے 'VISIT VISA' کا حصول۔
- امارات کی وزارتِ اوقاف سے اس پروگرام کے لیے اجازت نامہ کا حصول۔

۳ - سرمایہ کی فراہمی۔

ان میں سے تیسرا مسئلہ یعنی سرمایہ کی فراہمی تو درحقیقت کوئی مسئلہ نہ تھا اور یہ رفقاءِ تنظیم اسلامی اور اراکینِ جمعیت خدام القرآن کی مالی معاونت سے بغیر کسی دشواری کے حل ہو گیا۔

وزارتِ اوقاف سے اجازت نامہ کے حصول میں مرکز پاکستان ——— (PAKISTAN CENTRE) کی مسجد کے امام قاری حنیف ڈار صاحب جو کہ ہمارے رفیق بھی ہیں اور مرکز کی سالِ رواں کی مجلسِ انتظامیہ نے بھرپور تعاون کیا اور یہ مسئلہ بھی اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے حل ہو گیا۔

سب سے کٹھن مسئلہ پورے ایک ماہ کے ویزا کے حصول کا تھا جو بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا، لیکن اللہ تعالےٰ نے جناب نسیم الدین صاحب اور ان کے رفقاء کی کوششوں اور دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور رفیق محترم سرفراز چیمہ صاحب کے ذریعے یہ مسئلہ بالآخر ماہ شعبان کے آخری ہفتے میں حل ہو گیا۔ اس مرحلہ کے طے ہونے پر رفقاء واحباب کی خوشی دیدنی تھی۔ ویزا کے حصول کی اطلاع مرکز کو بھیجی گئی تو محترم ڈاکٹر صاحب کا ابوظہبی کے لیے حتمی پروگرام تشکیل پایا۔ چونکہ لاہور سے ابوظہبی براہ راست کوئی پرواز نہیں آتی، اس لیے یہ طے پایا کہ امیر محترم پہلے دوبئی تشریف لائیں اور وہاں سے بذریعہ کار ابوظہبی کے لیے روانہ ہوں جو دوبئی سے قریباً ۱۶۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کی آمد سے تین روز قبل ہمیں ان کی آمد کے پروگرام کا علم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب ۲۹ رشعبان کو تشریف لا رہے تھے۔ ابوظہبی کے ہر رفیق کی خواہش تھی کہ اپنے امیر محترم کو مہمان بنانے کی سعادت اس کے حصے میں آئے اور اس کے لیے بہت سے رفقاء کی طرف سے جناب نسیم الدین صاحب پر بڑا سخت دباؤ تھا۔ خود نسیم الدین صاحب کی بھی یہ خواہش تھی کہ امیر محترم ان کے فلیٹ کو رونق بخشیں ——— لیکن جمعیت خدام القرآن کی مرکزیت، مرکز پاکستان کی مسجد سے قربت اور وقتاً فوقتاً چھوٹے پیمانے کے اجتماعات کے لیے تمام سہولتوں کی موجودگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ امیر محترم کا قیام جمعیت خدام القرآن کے دفتر میں زیادہ مناسب رہے گا۔ اس فیصلہ میں یہ بات بھی پیشِ نظر تھی کہ دفتر میں قیام پذیر رفقاء امیر محترم کی خدمت کے لیے ہمہ وقت حاضر

رہنا چاہتے تھے۔ پھر جمعیت کا یہ دفتر بھی ایک کشادہ عمارت میں پرسکون جگہ پر واقع ہے اور اس میں رہائشی کمروں کے علاوہ ایک ہال کمرہ بھی ہے جو درس و تدریس اور اجتماعات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

امیر محترم کی آمد کے موقع پر تمام رفقاء کی یہ خواہش تھی کہ دوبئی کے ہوائی اڈہ پر جا کر ان کا استقبال کریں، لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ صرف نسیم الدین صاحب امیر محترم کو لینے کے لیے دوبئی جائیں گے۔ عین وقت پر نسیم الدین صاحب کی طبیعت خراب ہو جانے کے باعث یہ سعادت ابوظہبی تنظیم کے نائب امیر جناب قمر حسن صاحب کے حصے میں آئی۔ دوبئی میں ہمارے رفیق جناب ظفر اقبال صاحب کو بھی امیر محترم کی آمد کی اطلاع پہلے سے کر دی گئی تھی۔ امیر محترم کی فلائٹ مقامی وقت کے مطابق ساڑھے گیارہ بجے دوبئی پہنچی۔ ایئرپورٹ کے پسنجر زلاؤنج میں پی آئی اے کے اسٹیشن منیجر نے امیر محترم کو خوش آمدید کہا۔ کسٹم اور امیگریشن کے معمولات سے فارغ ہو کر امیر محترم ائیرپورٹ سے باہر تشریف لائے تو جناب قمر حسن صاحب اور جناب ظفر اقبال صاحب نے ان کا انتہائی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ظفر اقبال صاحب نے سب سے پہلے اپنے ہاں چلنے کی درخواست کی جہاں انہوں نے پرتکلف ضیافت کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ یہاں کچھ دیر رکنے کے بعد امیر محترم قمر حسن صاحب کے ہمراہ ابوظہبی کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں نسیم الدین صاحب کو فون پر امیر محترم کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی، لہٰذا امیر محترم جب عصر کے وقت جمعیت کے دفتر پہنچے تو رفقاء کی ایک کثیر تعداد استقبال کے لیے موجود تھی۔

امیر محترم چونکہ طویل سفر کی صعوبت برداشت کر کے پہنچے تھے، لہٰذا ہمارا خیال تھا کہ اب آرام فرمائیں گے۔ لیکن انہوں نے اسی وقت مجلسِ مشاورت طلب کر کے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ مشاورت میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا اور یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ دورۂ ترجمہ کے پروگرام کا آغاز آج (۲۹ رشعبان) ہی سے کر دیا جائے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کل پہلا روزہ ہو جائے ـــــ چنانچہ بعد نماز عشاء امیر محترم نے سورۃ الفاتحہ کی تشریح فرمائی اور استقبالِ رمضان کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ آج کے پروگرام کی مناسب تشہیر نہ ہو سکنے کے باوجود حاضری خاصی رہی۔ تقریباً ساڑھے دس بجے پروگرام کا اختتام ہوا۔ حسب توقع رات گئے چاند کا اعلان ہو گیا، چنانچہ اگلے

روز جمعرات کو پہلا روزہ ہوا۔ جمعرات کے روز رفقاء نے ابوظہبی کے مروّجہ قانون کے اندر رہتے ہوئے دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام کی بھرپور تشہیر کی اور انفرادی ملاقاتوں میں لوگوں کو دورۂ ترجمہ کا تعارف کرایا اور اس میں شرکت کی دعوت دی۔

جمعہ کی شب یعنی رمضان المبارک کی دوسری رات نماز عشاء کے بعد امیر محترم نے سورۃ البقرۃ کا آغاز کیا۔ اس وقت مرکز پاکستان کی مسجد کا ہال اور برآمدہ شرکاء سے پوری طرح بھرا ہوا تھا، بلکہ کچھ لوگ مسجد کے باہر بھی بیٹھے ہوتے تھے۔ لگ بھگ چار سو کی حاضری تھی جسے یہاں کے حالات میں غیر معمولی کہا جاسکتا ہے۔ ساڑھے دس بجے پہلی چار رکعت میں پڑھے جانے والے حصّے کا ترجمہ و تشریح مکمل ہوا تو حافظ زوار احمد صاحب، جن کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے، کی زیر امامت نمازِ تراویح کا آغاز ہوا۔ حاضرین کی ایک کثیر تعداد اس لذت سے پہلی بار آشنا ہوئی کہ عربی نہ جاننے کے باوجود، قراءت کے دوران قرآن کا مفہوم ذہن و قلب پر اتر رہا تھا اور یہ امیر محترم کے دورۂ ترجمہ قرآن کا اعجاز تھا۔ تقریباً سوا بارہ بجے آٹھ رکعات ختم ہوئیں اور پندرہ منٹ کا وقفہ ہوا جس کے دوران مختلف قسم کے مشروبات سے شرکاء کی تواضع کی گئی۔ تین بجے کے قریب بیس رکعات مکمل ہوئیں جن میں آج قریباً ڈیڑھ پارہ پڑھا گیا۔ نماز وتر سے فراغت کے بعد جب ہم مسجد سے باہر نکلے تو ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اگرچہ جسمانی طور پر کچھ تھکاوٹ ہو گئی تھی لیکن ہر شخص اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا اور اس کا دل قرآن حکیم اور اس کے نازل کرنے والے ربّ العزّت کی عظمت سے معمور تھا۔

اگلے روز جمعہ تھا، لیکن بدقسمتی سے یہاں کے قوانین کے تحت امیر محترم کا خطابِ جمعہ ممکن نہ تھا، چنانچہ امیر محترم نے خلیفہ مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ ہفتہ کی شب بھی دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام میں حاضری بھرپور رہی، لیکن اتوار کی شب سے شرکاء کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی۔ اب حاضری کی صورتحال یہ تھی کہ پہلی آٹھ رکعات میں قریباً ایک سو پچاس کی حاضری ہوتی جو وقفہ کے بعد قریباً ایک سو رہ جاتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے لوگوں کے لیے رات بھر جاگنے کے بعد صبح ڈیوٹی پر بر وقت پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔ البتہ جمعرات اور جمعہ کو حاضری میں اضافہ ہو جاتا۔

ابوظبی میں امیر محترم کے قیام کے دوران بہت سے رفقاء انہیں اپنے ہاں افطار کے لیے مدعو کرنے کے خواہاں تھے لیکن امیر محترم کی آمد پر ہی اصولی طور پر یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ وہ خصوصی طور پر افطار کے لیے کسی کے ہاں نہیں جائیں گے۔ اس فیصلے سے بعض رفقاء کو مایوسی بھی ہوئی، البتہ بعض رفقاء نے اپنی اس خواہش کو اس طور سے پورا کیا کہ وہ جمعیت کے دفتر میں ہی افطار اور کھانے کا انتظام کر لیتے جس میں امیر محترم اور دفتر میں مقیم حضرات کے علاوہ مزید چالیس پچاس احباب کو بھی مدعو کر لیا جاتا۔ اس طرح یہ افطاریاں بہت سارے حضرات کے لیے امیر محترم کے فکر سے متعارف اور مستفیض ہونے کا ذریعہ بنیں۔

امیر محترم کو بہت سے فورمز (FORUMS) اور سوسائٹیوں کی طرف سے اپنے ممبران سے خطاب کی دعوت بھی دی جاتی رہی، لیکن ان کی علالت اور عدیم الفرصتی کے باعث سوائے دو کے یعنی 'OVERSEAS PAKISTANI INVESTORS' FORUM' اور 'THNKERS' FORUM' کے سب سے معذرت کرنا پڑی۔

'OVERSEAS PAKISTANI INVESTORS' FORUM' نے اپنا اجلاس ہوٹل شیزان میں رکھا تھا۔ فورم کی طرف سے امیر محترم کو ایک سوالنامہ دیا گیا جس میں سود کی لعنت کے خاتمے اور اسلامی طرزِ معیشت کے قیام کے مختلف پہلوؤں پر سوال کیے گئے تھے۔ امیر محترم نے قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ایک خطاب کی صورت میں ان سوالوں کے جوابات بڑے احسن انداز سے دیے، جسے سامعین نے بہت سراہا۔ شرکاء کے لیے افطار اور کھانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اس پروگرام اور امیر محترم کے خطاب کی خبر اگلے روز یہاں کے انگریزی روزنامے 'خلیج ٹائمز' میں شائع ہوئی۔

' THNKERS' FORUM ' نے امیر محترم کو جہاد کے موضوع پر خطاب کے لیے مدعو کیا۔ طبیعت کی ناسازی کے باوجود امیر محترم نے مسلسل ڈیڑھ گھنٹہ خطاب کیا اور بیس منٹ تک حاضرین کے سوالات کے تشفی بخش جوابات دیئے۔ اس پروگرام کا اہتمام یہاں کے ایک ہوٹل ' CORNISH RESIDENCE ' میں کیا گیا تھا۔ خطاب کے بعد افطاری اور کھانے کا انتظام تھا۔ اس اجتماع کی خبر بھی خلیج ٹائمز نے شائع کی۔

مقامی امیرِ تنظیم جناب نسیم الدین صاحب نے اپنے گھر پر خواتین کے لیے ہفتہ وار درس قرآن حکیم کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ درس ہر اتوار کو صبح ساڑھے دس بجے ہوتا

ہے اور اس میں پچیس تیس خواتین پابندی سے شریک ہوتی ہیں۔ ان خواتین کا اصرار تھا کہ امیرِ محترم خواتین سے خصوصی خطاب فرمائیں اور انہیں بتائیں کہ موجودہ معاشرہ میں خواتین کا کیا کردار ہونا چاہیے اور وہ اقامتِ دین کی عملی جدوجہد میں کس طریقے سے حصہ لے سکتی ہیں۔ امیرِ محترم کے اس خطاب میں اسی ۸۰ کے قریب خواتین نے شرکت کی، اگرچہ اس پروگرام کی کوئی خاص تشہیر نہیں کی گئی تھی۔ خطاب کے بعد امیرِ محترم نے خواتین کے تحریری سوالات کے جوابات بھی دیئے۔

امارات میں بحمداللہ جمعیت خدام القرآن کی شاخیں دوبئی، شارقہ اور راس الخیمہ میں قائم ہو چکی ہیں اور وہاں پر تنظیم کا کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا رہا ہے۔ ان مقامات کے رفقاء کی پرزور فرمائش تھی کہ اپنے ابوظہبی کے قیام کے دوران امیرِ محترم کم از کم ایک ایک مرتبہ مذکورہ جگہوں پر تشریف لائیں۔ امیرِ محترم کی ناسازیٔ طبع اور وقت کی کمی کے باوجود یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر یہ تنظیمیں اپنی اپنی امارت میں جمعہ کے خطابات کے لیے انتظام کر لیں تو امیرِ محترم جمعہ کے روز صبح کے وقت یہاں سے نکل جایا کریں گے اور نمازِ جمعہ ادا کر کے واپس ابوظہبی کے لیے روانہ ہو جایا کریں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے جمعیت خدام القرآن شارقہ نے انڈسٹریل ایریا کی مسجد میں جمعہ کا انتظام کیا۔ امیرِ محترم کے ہمراہ قریباً ساڑھے گیارہ بجے جب ہم مسجد میں پہنچے تو مسجد کا اندرونی ہال اور برآمدہ مکمل طور پر بھر چکا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق حاضرین کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی۔ نمازِ جمعہ کے بعد مقامی امیر جناب مشتاق احمد کی دعوت پر امیرِ محترم جمعیت خدام القرآن شارقہ کے دفتر تشریف لے گئے، جہاں قریباً ستر اسّی آدمی موجود تھے۔ یہاں امیرِ محترم نے حاضرین کے مختلف سوالات کے جوابات دیئے۔ خطابِ جمعہ کے وقت مکتبہ کا انتظام بھی کیا گیا تھا جہاں کتب اور کیسٹس کی ایک بڑی تعداد فروخت ہوئی۔

ابوظہبی اور شارقہ کے درمیان فاصلہ ایک سو اسّی کلومیٹر ہے۔ اس دو طرفہ سفر، خطابِ جمعہ اور نیند کی کمی سے امیرِ محترم کی صحت فوری طور پر متاثر ہوئی۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ دورۂ ترجمۂ قرآن کے دوران امیرِ محترم باہر تشریف نہیں لے جائیں گے۔ اس فیصلہ سے دوبئی اور راس الخیمہ کے رفقاء کو بہت مایوسی ہوئی لیکن معاملہ چونکہ امیرِ محترم کی صحت کا تھا اس لیے سب نے اس فیصلے کو صبر کے ساتھ قبول کر لیا۔

ابوظہبی تنظیم کے امیر جناب نسیم الدین صاحب نے جمعیت خدام القرآن ابوظہبی کے

دفتر میں تمام رفقائے تنظیم اسلامی کے ایک اجتماع کا انتظام کیا جس میں امیر محترم آخر وقت تک موجود رہے اور رفقاء کے ساتھ کھل کر تبادلہ خیالات کیا۔ رفقاء کو امیر محترم کے ماضی قریب کے بیانات اور سیاسی تجزیوں کے بارے میں کچھ اشکالات تھے، چنانچہ امیر محترم نے بڑے صاف اور سادہ الفاظ میں اپنے سیاسی فکر کو واضح کیا۔ اور مشورہ دیا کہ ہر رفیق ماہنامہ میثاق اور حکمت قرآن کا مطالعہ گہری نظر سے کرے تاکہ جس طریقے سے وہ ان کے دینی فکر سے واقف ہے اسی طریقے سے وہ ان کے سیاسی اور عمرانی فکر سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔

ابوظہبی میں قیام کے دوران امیر محترم کا یہ معمول رہا کہ عمومی ملاقاتوں کے لیے نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک باہر بیٹھتے۔ ایسی ملاقاتوں اور تعارف کے لیے دو خصوصی اجتماعات بھی منعقد کیے گئے، جن میں تنظیم کی دعوت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو افطار کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس طرح ان حضرات کو امیر محترم کے ساتھ وقت گذارنے، انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ان اجتماعات میں رفقائے تنظیم اور اراکین جمعیت مدعو نہیں تھے۔

امیر محترم کے سفر ابوظہبی میں ان کے ہمراہ ان کی اہلیہ محترمہ کی آمد کا پروگرام بھی طے تھا، چنانچہ ان کے لیے ویزہ وغیرہ کا انتظام بھی کیا گیا تھا، لیکن امیر محترم بوجوہ اکیلے ہی تشریف لائے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ بعد ازاں ۱۹۔ اپریل کو تشریف لائیں۔ دوبئی ایئرپورٹ پر امیر محترم، نسیم الدین صاحب اور ان کی اہلیہ کے علاوہ دوبئی سے ظفر اقبال صاحب اور ان کی اہلیہ بھی استقبال کے لیے موجود تھے۔ وقت کی کمی کے باعث دوبئی میں رکے بغیر ابوظہبی کے لیے روانگی ہوئی اور بعد نماز ظہر جمعیت خدام القرآن کے دفتر پہنچے۔ ابوظہبی میں امیر محترم کی اہلیہ کے شب و روز بڑے مصروف گذرے۔ ظہر سے عشاء تک کا وقت نسیم الدین صاحب کی رہائش گاہ پر ان کی اہلیہ اور والدہ کے ساتھ گذرتا، جہاں بہت سی دوسری خواتین بھی ان سے ملاقات کے لیے آجاتیں۔ نماز عشاء کے وقت سب خواتین مسجد مرکز پاکستان میں پہنچ جاتیں۔ امیر محترم کی اہلیہ کی آمد کے بعد مسجد میں خواتین کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

مسجد مرکز پاکستان کے امام قاری حنیف ڈار صاحب کی کوششوں اور مرکز کی انتظامیہ کے تعاون سے یہاں امیر محترم کے خطباتِ جمعہ کی اجازت بھی حاصل کر لی گئی۔ امیر محترم نے جمعہ کے ایک خطاب میں ملتِ اسلامیہ کے اس مرض کی تشخیص کی کہ آج دنیا میں مسلمان اتنے ذلیل و خوار کیوں ہیں اور دوسرے خطابِ جمعہ میں دوا تجویز کی کہ اس ذلت و انحطاط کے گڑھے سے آخر کیسے نکلا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں خطابات ایسے پُرتاثیر تھے کہ حاضرین کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دونوں خطابات میں حاضری غیر معمولی رہی اور مسجد کے باہر دور دراز شامیانوں کے انتظام کے باوجود لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے دھوپ میں نماز ادا کی۔ دونوں خطابات کے آڈیو، وڈیو کیسٹس بھی تیار کئے گئے۔

ابوظہبی میں قیام کے دوران امیر محترم سے بہت اخبارات اور دیگر خبر رساں ایجنسیوں مثلاً روزنامہ خلیج ٹائمز، روزنامہ جنگ، راس الخیمہ ریڈیو اور اے پی نیوز ایجنسیز وغیرہ نے انٹرویو لیے، جن میں سے بعض امیرِ محترم کی موجودگی ہی میں شائع ہو گئے تھے اور بعض اب آ رہے ہیں۔

امیر محترم جس مشن پر ابوظہبی تشریف لائے تھے یعنی دورۂ ترجمۂ قرآن وہ رمضان المبارک کی چھبیسویں شب کو تکمیل پذیر ہوا ــــــــــــ نماز تراویح کے بعد امیر محترم نے دورۂ ترجمۂ قرآن کے شرکاء کو یہ سعادت نصیب ہونے پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد فرائضِ دینی کے جامع تصور پر ایک فکر انگیز پُرتاثیر خطاب فرمایا، چونکہ یہ دورۂ ترجمہ کے پروگرام کا آخری دن تھا اور امیر محترم کو اگلے روز پاکستان کے لیے روانہ ہونا تھا، لہٰذا جمعیت خدام القرآن کے دفتر میں رفقاء و احباب کی اچھی خاصی تعداد ملاقات کے لیے جمع تھی۔ ان میں سے کچھ حضرات وہ بھی تھے جو تنظیم اسلامی کے قافلہ میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے شامل ہونا چاہتے تھے۔ رات اگرچہ کافی بیت چکی تھی اور امیر محترم بھی خاصے تھک چکے تھے، لیکن انہوں نے ان سینتیس (۳۷) حضرات سے سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کی بیعت لے کر انہیں اپنے قافلہ میں شامل کیا۔ رفقاء نے بھی بیعت کے الفاظ ساتھ ساتھ دہرا کر تجدیدِ عہد کیا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے ساتھ یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔

دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کے فوراً بعد امیر محترم پاکستان واپس تشریف

جانا چاہتے تھے، چنانچہ اگلے ہی روز بعد نماز ظہر دوبئی کے لیے روانگی کا پروگرام طے ہوگیا۔ اس موقع پر نئے اور پرانے رفقائے تنظیم اور اراکین جمعیت کی ایک بڑی تعداد الوداع کہنے کے لیے موجود تھی۔ امیر محترم کی اس پچیس روزہ رفاقت نے ان کے ساتھ ہمارے عقیدت و محبت کے جذبات میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا اور اب مفارقت کے وقت ہماری جو کیفیت تھی اسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ پرنم آنکھوں کے ساتھ سب ایک ایک کر کے گلے مل رہے تھے۔ سب سے ملنے کے بعد امیر محترم اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ نسیم الدین صاحب کی گاڑی میں دوبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ اس الوداعی سفر میں تین مزید گاڑیاں بھی ہمراہ تھیں۔ نسیم الدین صاحب انتہائی تیز رفتاری سے اپنی گاڑی کو اڑائے لیے جا رہے تھے تاکہ امیر محترم کو نماز عصر سے قبل کچھ دیر آرام کرنے کا موقع مل جائے، لیکن دوبئی کی حدود میں داخل ہوتے ہی گاڑی کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا کہ ۱۵۰ / ۱۶۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کے باوجود گاڑی کسی بڑے حادثے سے محفوظ رہی۔ کچھ دیر بعد باقی گاڑیاں بھی وہاں پہنچ گئیں اور سب نے اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی پر اس کا شکر ادا کیا۔ پہیہ تبدیل کیا گیا اور نماز عصر سے قریباً بیس منٹ قبل ہم ظفر اقبال صاحب کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ نمازِ عصر کے بعد پروگرام کے مطابق پاکستان اسکول کی مسجد میں اجتماع منعقد ہوا جس میں ایک ہزار کے قریب افراد نے امیر محترم کے خطاب سے استفادہ کیا۔ یہاں مکتبہ بھی لگایا گیا جہاں سے لوگوں نے بڑے ذوق وشوق سے کتابیں اور کیسٹس خریدیں۔

دوبئی سے لاہور کے لیے پی آئی اے کی پرواز کا وقت رات ساڑھے گیارہ بجے تھا۔ چنانچہ کھانے سے فارغ ہو کر سامان وغیرہ ایئرپورٹ بھیج دیا گیا اور امیر محترم انہیں رخصت کرنے کے لیے آنے والے رفقاء واحباب سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ امیر تنظیم اسلامی راس الخیمہ جناب طفیل گوندل صاحب نے اس محرومی پر خاصے افسوس کا اظہار کیا کہ امیر محترم وہاں تشریف نہ لا سکے۔ اس گفتگو کے دوران شارقہ اور دوبئی کے چند حضرات نے بیعت بھی کی۔ دس بجے ایئرپورٹ سے ٹیلیفون آیا کہ پائلٹوں کی ہڑتال کے باعث جہاز نہیں آسکا۔ فون پر کراچی رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ جہاز کے آنے کا فی الحال کوئی انتظام نہیں۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ امیر محترم نے جناب مشتاق بیگ صاحب اور نسیم الدین صاحب سے کہا کہ وہ اب ابوظہبی تشریف لے جائیں۔ چنانچہ دونوں حضرات اور ان کی خواتین دل میں یہ

ملل لیے رخصت ہو گئے کہ انہیں امیر محترم کو ایئر پورٹ تک چھوڑنے کی سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ دوسرے دن جناب ظفر اقبال صاحب بڑی تگ و دو کے بعد امیر محترم اور ان کی اہلیہ محترمہ کو کراچی کی ایک پرواز پر بٹھانے میں کامیاب ہو سکے۔ (رپورٹ: محمد خالد ابوظبی)

بقیہ: عرض احوال

دوران کراچی شہر میں چار اور اسلام آباد میں سال بھر میں چھ پروگراموں کے لیے وقت ضرور نکالا جاتا ہے گا ــــ لیکن رفقاء کے علم میں ہوگا کہ تین ماہ قبل جب اسلام آباد میں شام الہدیٰ کا پروگرام طے پا گیا تھا اور تقریر کے لیے "اسلام کا نظریۂ مساواتِ مرد و زن" کے عنوان کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا تو عین وقت پر مقامی انتظامیہ نے یہ کہہ کر پروگرام میں رکاوٹ ڈال دی کہ اس کے لیے ضلعی انتظامیہ سے این۔او۔سی حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ اور چونکہ وقت اتنا کم تھا کہ این۔او۔سی کا انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا پروگرام منسوخ کرنا پڑا ــــ اس سے اگلے ماہ بھی یہی حربہ دہرایا گیا اور شرط عائد کر دی گئی کہ سیاسی معاملات کو موضوع نہ بنایا جائے اور پھر جب پروگرام کی تاریخ کا اعلان ہو گیا تو مقامی انتظامیہ نے عذراتِ لنگ کا سہارا لے کر کمیونٹی سنٹر کی بکنگ کو منسوخ کر دیا۔ ان حالات میں امیر محترم کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مقامی انتظامیہ کی عائد کردہ پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود کو درس قرآن کے لیے آمادہ کر سکیں۔ لہٰذا اسلام آباد میں 'شام الہدیٰ' کے پروگرام کو فی الحال معطل رکھنے ہی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

عَنِ الحَارِثِ الاشعری، قَالَ، قَالَ رسُولُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم

"اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ

بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِی سَبِیْلِ اللهِ

ضرورتِ رشتہ

راجپوت گھرانے کی ۲۴ سالہ ایم۔ اسے اسلامیات دوشیزہ کے لیے دینی ذہن رکھنے والے تعلیم یافتہ برسرِ روزگار نوجوان کا رشتہ درکار ہے۔

رابطہ۔ معرفت ماہنامہ میثاق ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۵۴۷۰۰

دینی تعلیم اور سوچ کے حامل ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کے لیے جو آجکل حصولِ تعلیم (پی۔ ایچ۔ ڈی۔ الیکٹریکل انجینئرنگ) کی خاطر امریکہ میں عارضی مقیم ہیں، ہم پلہ، خوبصورت، کم از کم گریجویٹ لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ صاف گوئی، راست بازی، رسومات سے اجتناب، اسلامی ذہن اور سوچ ہماری اوّلین شرائط ہیں۔

رابطہ: معرفت ماہنامہ "میثاق" ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔

تنظیم اسلامی سے وابستہ ۲۸ سالہ لڑکے کے لیے دیندار گھرانے کی خوبصورت، نیک سیرت لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ ذات کی کوئی قید نہیں۔ جہیز قطعاً نہیں چاہیئے۔ لڑکے کا ذریعۂ معاش کاروبار اور ماہانہ آمدنی چار ہزار روپے ہے۔

رابطہ: معرفت صغیر احمد۔ مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی
گڑھی شاہو۔ علامہ اقبال روڈ۔ لاہور

"تنظیمِ اسلامی کا رفیق، راجپوت فیملی کے کھاتے پیتے گھرانے کا ۳۰ سالہ نوجوان جو بی اے۔ بی ایڈ ہے اور گورنمنٹ ہائی سکول میں بطور مدرس تعینات ہے۔ مذکور دونوں ٹانگوں سے معذور ہے اور بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے۔ فرنیچر کی مرمت، بجلی اور جلد سازی میں ماہر ہے۔ ضلع میرپور، آزاد کشمیر کا رہنے والا ہے۔ موزوں رشتہ کے خواہش مند رجوع کریں۔

سیّد محمد آزاد۔ موضع گورسیاں۔ ڈاکخانہ جاتلاں۔ ضلع میرپور۔ آزاد کشمیر۔

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ

طلبہ کےلیے بامقصد انداز میں چھٹیاں گزارنے کا پروگرام

ان شاء اللہ تعالےٰ بروز منگل مورخہ ۱۸ جولائی سے جمعرات ۱۰ اگست ۱۹۸۹ء
قرآن اکیڈمی میں طلبہ کے لیے ایک اسلامک جنرل نالج ورکشاپ منعقد ہوگی۔
بیرون لاہور کے طلبہ کے لیے ہوسٹل کی سہولت موجود ہے ذہین اور مستحق طلبہ
کے لیے رجسٹریشن فیس اور ہوسٹل اخراجات میں رعایت کی گنجائش ہے۔
تفصیلات کے لیے پراسپکٹس طلب کریں۔
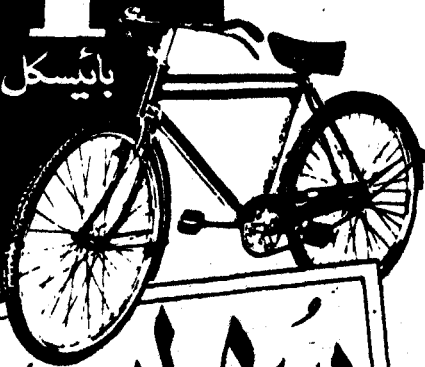
سات روزہ بین الاقوامی مسلم تربیتی کیمپ

تنظیم اسلامی شمالی امریکہ کے زیر اہتمام مسلم خاندانوں کے لیے

ایک دعوتی و تربیتی کیمپ ۲۰ تا ۲۶ اگست ۱۹۸۹ء

ریاست مشی گن میں ڈیٹرائٹ (DETROIT) شہر کے نواح میں ملفورڈ (MILFORD) کے مقام پر منعقد ہو رہا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کیمپ کے مرکزی مقرر اور مہمانِ خصوصی ہونگے۔

کیمپ کا موضوع " اسلامی طریقِ حیات اور بحیثیت مسلمان ہماری ذمہ داریاں "

(ISLAMIC WAY OF LIFE AND OUR OBLIGATIONS AS MUSLIMS)

ہوگا۔ موضوع کی مناسبت سے لیکچرز، ورکشاپس اور سوال و جواب کی نشستوں کے علاوہ دینی دلچسپی کے دوسرے پروگراموں کا اہتمام کیا جائے گا۔ بچوں اور عورتوں کے لیے خصوصی پروگرام تشکیل دیئے گئے ہیں۔

کیمپ میں پاکستان، بھارت، مشرقِ وسطیٰ، یورپ، کینیڈا اور امریکہ سے احباب کی شرکت متوقع ہے۔ جگہ محدود ہونے کے باعث شرکت کے خواہشمند حضرات سے درخواست ہے کہ وہ رجسٹریشن فارم جلد از جلد ارسال فرمائیں۔ ۳۰ جون کے بعد موصول ہونیوالے فارم قبول نہیں کیے جائیں گے۔ رجسٹریشن فیس اور دیگر اخراجات بڑوں کیلئے ۱۱۰/- امریکی ڈالر، طلباء کیلئے ۷۵/- امریکی ڈالر اور ۵ سے ۱۴ سال کی عمر کے بچوں کیلئے ۵۵/- امریکی ڈالر ہونگے۔ ۵ سال سے کم عمر کے بچے مفت شامل ہوسکیں گے۔ فارم داخلہ (ہمراہ رجسٹریشن فیس) بھجوانے اور مزید معلومات کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ کریں:

MR. RASHID A. LODHI,
14461 MAISANO DR. STERLING HGTS.
MICHIGAN 48077. TEL. (313)977-8081.

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی
رُوح افزا
روحِ پاکستان ـ رُوح افزا
راحتِ جان ـ رُوح افزا
ہمدرد
خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے
ADARTS
HMD

Manufactured By
SALEEM SONS
FACTORY

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت

جلد: ۳۸
شمارہ: ۶
ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ
جولائی ۱۹۸۹ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات۔ ۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا۔ ۶۔ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔ ۹۔ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔ ۱۲۔ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ۔ ماڈل ٹاؤن فیروز پور روڈ۔ لاہور (پاکستان)

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ ۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

پاکستان میں ماہ جون کا شمار موسم گرما کے سخت ترین مہینوں میں ہوتا ہے اور اس مہینے میں بالعموم ہر نوع کی اضافی سرگرمیاں سرد پڑ جاتی ہیں۔ موسم کی حدت انسان کو بے بس کر دیتی ہے اور انسان اپنے روزمرہ کے کاموں میں صرف انہی کو سرانجام دے پاتا ہے جو اس کے خیال میں ناگزیر اور ازبس ضروری ہوں۔ لیکن الحمدللہ کہ اس بار ماہ جون کے دوران تنظیم اسلامی کی تنظیمی، تربیتی سرگرمیاں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی سرد بازاری کا شکار نہیں ہوئیں، بلکہ ان میں پہلے سے زیادہ شدت اور ہماہمی نظر آئی۔ فللہ الحمد و المنہ

اس ماہ کے آغاز میں ۲ تا ۹ ر جون قرآن اکیڈمی لاہور میں مبتدی رفقاء کیلئے پہلی باقاعدہ تربیت گاہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ بلاشبہ یہ ایک مثالی تربیت گاہ تھی جو اگرچہ شرکاء کی تعداد کے اعتبار سے کچھ زیادہ حوصلہ افزاء نہیں تھی، لیکن جس نہج سے اسے منعقد کیا گیا، خصوصاً شرکاء کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت کا خیال کرتے ہوئے اور ان کے شب و روز کے معمولات کو سنت سے قریب تر لانے کیلئے ۲۴ گھنٹوں کو جس طرح ایک ڈسپلن کے تحت گزارنے کی تربیت دی گئی وہ معاملہ لائق تحسین ہی نہیں قابل رشک بھی تھا۔ تمام شرکاء نے اس تربیت گاہ کی افادیت کو پورے طور پر محسوس کیا اور وہ جب یہاں سے رخصت ہوئے تو فکری غذا کا توشہ ہی ان کے ہمراہ نہ تھا ایک ولولۂ تازہ اور عزم نو کے ساتھ دین کی سربلندی کیلئے جان و مال کے ایثار کی آرزو بھی ان کے ہم رکاب تھی۔ قرآن اکیڈمی ہی میں ۱۶ تا ۲۳ ر جون منتظم رفقاء کیلئے تربیت گاہ منعقد ہوئی۔ یہ تربیت گاہ بھی الحمدللہ کہ اسی شان کی حامل تھی جس کا ذکر مبتدی رفقاء کی تربیت گاہ کے ذیل میں آیا ہے، بلکہ تعداد شرکاء کے اعتبار سے یہ بہت بھرپور تھی۔ رفقاء و احباب کی دلچسپی کے پیش نظر ان دونوں تربیت گاہوں کی مفصل رپورٹیں اسی شمارے میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ یہ دونوں تربیت گاہیں نہایت کامیاب اور سودمند ثابت ہوئیں۔ جن مقاصد کے پیش نظر ان تربیتی پروگراموں کا انعقاد کیا گیا تھا، الحمدللہ کہ وہ باحسن وجوہ پورے ہوئے اور امید واثق ہے کہ اس

نوع کے پروگرام اگر باقاعدگی سے ہوتے رہے تو انشاء اللہ بہت جلد تنظیم اسلامی ایک چلتے ہوئے قافلے کی شکل اختیار کر لے گی۔

ان تربیت گاہوں کو تشکیل دینے اور کامیابی کے ساتھ ان کا انعقاد کرنے میں لاہور میں مقیم تنظیم کے قریباً تمام سرکردہ حضرات کی کاوشوں کو دخل ہے' لیکن ان میں سب سے بڑا حصہ ناظم تربیت جناب میاں محمد نعیم صاحب کا ہے' جنہیں بلاشبہ دونوں تربیتی پروگراموں میں روح رواں کی حیثیت حاصل تھی۔ انہوں نے امیر تنظیم اسلامی کی لاہور میں موجودگی سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے مشوروں کی روشنی میں پروگرام کو مثالی بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا' بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ انہوں نے خود کو ان تربیتی پروگراموں میں "گم" کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی کاوشوں کو شرف قبول فرمائے (آمین) تربیت گاہوں کا یہ سلسلہ انشاء اللہ العزیز اب باقاعدگی سے جاری رہے گا۔ اس ضمن میں آئندہ دو ماہ کیلئے جو پروگرام ترتیب دیئے گئے ہیں ان کی تفاصیل اسی شمارے کے صفحہ نمبر ۶ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

۲۱ر جون ۸۹ء کے روز ملک کے دو نمایاں ترین اردو اخبارات ..... روزنامہ جنگ لاہور اور روزنامہ نوائے وقت کے دفاتر کے سامنے رفقاء تنظیم نے ایک خاموش احتجاجی مظاہرہ کیا۔ یہ مظاہرہ جس میں صرف شہر لاہور کے رفقاء تنظیم شامل تھے یا بیرون لاہور سے وہ چند رفقاء بھی شریک تھے جو منتظم رفقاء کیلئے ترتیب دی جانے والی تربیت گاہ میں شرکت کیلئے لاہور میں مقیم تھے' نظم وضبط اور پلاننگ کے اعتبار سے ایک مثالی مظاہرہ تھا۔ یہ مظاہرہ اس اعتبار سے بھی نہایت کامیاب رہا کہ اس چھوٹے اور بظاہر بےضرر سے مظاہرے سے جو مقاصد پیش نظر تھے۔ الحمدللہ کہ وہ پورے طور پر حاصل ہوئے۔ یعنی اُس مرحلہ اقدام سے قبل جس کے آثار مستقبل قریب میں سردست نمایاں نظر نہیں آتے' منظم احتجاجی مظاہروں کے سلسلے میں رفقاء کی تربیت اور پبلک میں تنظیم اسلامی اور اس کے منہجِ عمل کا تعارف ..... چنانچہ اس مظاہرے کے نتیجے میں جہاں رفقاء میں ایک ولولہ تازہ کے آثار نظر آئے اور ایک منظم مظاہرہ کرنے کا کامیاب تجربہ حاصل ہوا' وہاں ساکنان لاہور کو بھی تنظیم اسلامی ، اس کے طریقِ عمل اور اس کے پیش نظر مشن کو ایک نئے انداز میں جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ دیکھنے والوں میں سے اکثر کو اس خوشگوار حیرت میں مبتلا پایا گیا کہ کوئی مظاہرہ تخریب کاری سے بالکل پاک اور اس درجے منظم بھی ہو سکتا ہے!!!

(اس مظاہرے کی مفصل رپورٹ بھی اسی شمارے میں شامل ہے' لیکن جو لوگ اس کے بارے

ہیں کسی غیر تنظیم مبصر کے تاثرات جاننا چاہیں' ان کیلئے ہمارا مشورہ یہ ہو گا کہ وہ ہفت روزہ "ندا" کے ۴ر جولائی کے شمارے میں شائع شدہ ہارون الرشید صاحب کی رپورٹ کو بھی اپنی نظر سے ضرور گذار لیں' جس کے ذریعے اس مظاہرے کا آنکھوں دیکھا حال بہت خوبصورت انداز میں سامنے آتا ہے) ۔ اخبارات میں عریانی وفحاشی کے خلاف یہ احتجاجی مظاہرہ دراصل آئندہ مظاہروں کے سلسلے کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب انشاء اللہ العزیز ۲ر جولائی کو انہی دو اخبارات کے دفاتر کے سامنے دوبارہ مظاہرہ کیا جائے گا اور اس میں رفقاء تنظیم اسلامی کے علاوہ ان حضرات کو بھی شرکت کی اجازت ہو گی جو تنظیم کے مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں اور مظاہرے کے دوران مکمل طور پر ڈسپلن کی پابندی قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ ارادہ یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کے تحت پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی ایسے مظاہروں کا پروگرام بنایا جائے گا۔ اس سلسلے کی تفصیلات ابھی طے ہونا باقی ہیں۔

....

رفقاء واحباب اس حقیقت سے بخوبی باخبر ہیں کہ تنظیم اسلامی نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ہی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے جو تنظیم اسلامی کے امیر اور مرکزی انجمن کے صدر موسس ہیں' تنظیم کے قیام سے قبل مرکزی انجمن خدام القرآن نامی ادارہ قائم کیا تھا' جو علوم قرآنی کی نشرواشاعت کا اہم مرکز ثابت ہوا۔ چنانچہ قرآن حکیم کے دروس وخطابات اور اس کے انقلابی پیغام کی نشرواشاعت ہی کے نتیجے میں وہ مردانِ کار فراہم ہوئے' جنہوں نے اس عزم کے ساتھ جماعتی ڈسپلن میں آنا قبول کیا کہ اولاً اسلام کو اپنے وجود پر نافذ کرنے کی سعی کریں گے اور پھر پورے نظام پر اسے غالب کرنے کی منظم جدوجہد میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیں گے' اور اس طرح تنظیم اسلامی کا قافلہ تشکیل پایا۔

قرآنی علوم ومعارف کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کرنے کا جو عظیم علمی کام مرکزی انجمن خدام القرآن کے پیش نظر ہے' قرآن کالج کا منصوبہ اس سلسلے کی ابتدائی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ قارئینِ 'میثاق' کے علم میں ہے کہ اس اہم تعلیمی منصوبے کا آغاز دو سال قبل ہوا تھا اور آغاز میں ایک تین سالہ اسکیم کا اعلان کیا گیا تھا۔ جس کے تحت ایف اے' ایف ایس سی پاس طلبہ داخلے کے اہل قرار پاتے تھے اور تین سال کے عرصے میں انہیں بی اے کی باضابطہ تیاری کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے ایک معین نصاب کی تکمیل کرا دینا پروگرام میں شامل تھا۔ اللہ کی نصرت وتائید سے یہ تعلیمی اسکیم خاصے تسلی بخش انداز میں آگے بڑھ رہی

باقی صفحہ ۷۲ پر

آئندہ دو۲ ماہ کے مجوزہ پروگرام

ماہ جولائی و اگست کے دوران تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے تربیتی و تنظیمی پروگرام

(۱)

۲۱ر تا ۲۸ر جولائی ۸۹ تربیت گاہ برائے مبتدی رفقاء

بمقام : کراچی (تفصیلات کے لیے امیر حلقہ کراچی شیخ جمیل الرحمٰن صاحب سے دفتر تنظیم اسلامی کراچی کے پتہ پر یا مرکزی دفتر لاہور سے رابطہ کریں)۔

نوٹ : تربیت گاہ کے دوران عریانی و فحاشی کیخلاف مظاہرہ بھی کیا جائے گا۔

(۲)

۴ر تا ۱۱ر اگست ۸۹ تربیت گاہ برائے مبتدی رفقاء

بمقام : مرکزی دفتر تنظیم اسلامی، گڑھی شاہو، لاہور

(۳)

۱۰ر تا ۱۱ر اگست ۸۹ تعارفی و تنظیمی اجتماع طلباء تنظیم اسلامی، پاکستان

بمقام : قرآن اکیڈمی، لاہور

(۴)

۱۱ر تا ۱۸ر اگست ۸۹ تربیت گاہ برائے منتظم رفقاء

بمقام : قرآن اکیڈمی، لاہور

تذکرہ و تبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات میں مرکزی علماء کونسل اور متحدہ حزب اختلاف کا کردار: ایک جائزہ، چند مشورے

امیر تنظیم اسلامی کے حالیہ خطاب جمعہ کی تلخیص

جن دو معاملات پر آج مجھے اظہار خیال کرنا ہے ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہماری قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے تمام دھڑوں نے اپنے آپ کو ایک اتحاد میں منسلک کر لیا ہے 'ان کا ایک اشتراک وجود میں آ گیا ہے۔ دوسرا وہ جس کی طرف میں نے پچھلے جمعہ میں بھی اشارہ کیا تھا جو عین ممکن ہے کہ ہمارے ملک میں ایک اہمیت اختیار کرنے والا معاملہ بن جائے اور اس کا ہمارے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس فلسفہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے جو پچھلے دو خطبات جمعہ میں بیان ہوا۔

ایک متحدہ علماء کونسل وجود میں آئی ہے اور کراچی میں اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اس ملک میں بعض باتوں کے خلاف تحریک چلائیں گے۔ ان میں ایک خالص شرعی معاملہ بھی ہے، عورت کی حکمرانی غیر شرعی حکمرانی ہے۔ پھر کچھ معاشی معاملات بھی ہیں، بہت بڑھتی ہوئی مہنگائی اور گرانی۔ خالص خارجہ پالیسی سے متعلق معاملات بھی ہیں کہ ہندوستان کے ساتھ دب کر معاملہ کیا جا رہا ہے، ہنود اور یہود کی لابی کے سامنے ہتھیار ڈالے جا رہے ہیں۔ خالص انتظامی معاملہ بھی ہے کہ آئی ایس آئی کے سربراہ کو بدلا گیا ہے۔ اس طرح مختلف معاملات جمع کئے گئے ہیں۔ عام عریانی اور فحاشی بھی ان میں شامل ہیں۔

مرکزی علماء کونسل کی اپیل

مرکزی علماء کونسل وجود میں آ چکی ہے اور اس کا پہلا جلسہ لاہور میں اگلی جمعرات کو ہونا

ہے۔ گویا میری جو آپ سے اگلی ملاقات ہوگی اس سے پہلے جلسہ عام ہو چکا ہو گا اور آج مجھے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے اظہار خیال اس لئے بھی کرنا ہے کہ آج ہی اخبارات میں ان حضرات کی جانب سے باقاعدہ ایک اپیل بھی آئی ہے کہ خطباء اپنے جمعہ کے خطبوں میں اسی کے متعلق اظہار خیال کریں۔ تو گویا یہ ایک امتثالِ امر بھی ہے۔ میں نے اپنے پچھلے خطابات کے تسلسل میں امربالمعروف اور نہی عن المنکر پر آج پھر سورہ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی تلاوت کی اور سورۃ توبہ کی آیات ۱۱۱ اور ۱۱۲ بھی جس میں اس موضوع کا ذروۂ سنام (TIP OF THE TOP) آگیا۔ علماء کی تحریک کا مضمون آگے جاکر اسی حکیمانہ فلسفہ سے جا ملے گا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ حدیث بھی سنائی ہے جو حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ دین نصیحت کا نام ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الدین النصیحۃ" دین تو نام ہے نصیحت کا، خیر خواہی کا اور وفاداری کا۔ اصل میں نُصح کہتے ہیں عربی میں خلوص کو۔ جہاں خلوص ہو گا وہاں اپنے سے بڑی ہستی کے ساتھ وفاداری ہوگی، اپنے برابر کے یا چھوٹوں کے ساتھ خیر خواہی ہوگی۔ لہٰذا ترجمے دونوں ہوں گے۔ پوچھا گیا "لمن یا رسولَ اللہ؟" حضورؐ کس کی وفاداری اور کس کی خیر خواہی؟۔ فرمایا "لِلّٰہِ"۔ اب یہاں اللہ کے لئے خیر خواہی کا لفظ تو نہیں لا سکتے چنانچہ اللہ کی وفاداری۔ "وَلکتابِہ" اور اس کی کتاب کے ساتھ وفاداری۔ "و لرسولِہ" اس کے رسول کے ساتھ وفاداری "و لائمۃ المسلمین و عامتھم" اور مسلمانوں کے جو امام ہوں، سربراہ ہوں، ان کی خیر خواہی اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی۔ یہ کل دین ہے اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا ہے اور یہ روایت ہے صحیح مسلم کی یعنی صحیح اور پختہ حدیث ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے.. "اوتیتُ جوامعُ الکلم" مجھے بڑے جامع کلمات اللہ نے عطا فرمائے ہیں۔ کل دین کی حقیقت کو آپ کبھی کسی ایک لفظ سے تعبیر فرما دیتے اور وہ واقعتاً جامع ترین لفظ ہوتا ہے۔ ایک بدو کہتا ہے کہ حضورؐ میں لمبی چوڑی باتیں نہیں سمجھ سکتا مجھے تو بس ایک بات بتا دیجئے کہ میں اسے دانتوں سے پکڑ لوں فرمایا "قل امنتُ باللہ ثم استقم" کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ۔ اب اس استقامت میں ہی ساری قیامت مضمر ہے۔ اسی طرح "الدین النصیحہ" کے بلیغ و جامع ارشاد کی تعمیل میں چند باتیں عرض کر رہا ہوں۔

تین تمہیدی باتیں

لیکن آج مجھے ان امور کے ضمن میں کچھ عرض کرنے سے پہلے تین تمہیدی باتیں کہنی ہیں جو کچھ عرصہ پہلے بھی بیان ہوتی رہی ہیں لیکن ان کوا جمالاً دہرانے کی ضرورت ہے۔ پہلی بات یہ کہ سیاست کے بارے میں گفتگو سے ہمارے بعض شرکاءِ جمعہ کچھ گھبراتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب میرا اور میرے رفقاء کا کہنا یہ ہے کہ ہم سیاسی نہیں ہیں' ہمارا سیاست میں کوئی حصہ نہیں ہے تو پھر سیاست پر بات کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بارہا میں نے وضاحت کی ہے اور تفصیل مطلوب ہو تو اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں میں نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے' اس کا مطالعہ کرلیں۔ اگر تو سیاست کا مطلب مروّجہ طریقوں سے حصولِ اقتدار کی کوشش ہے تو ہم صد بار اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ وہ آیت میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ "تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا" ۔ یہ آخرت کا گھر تو ہم نے رکھا ہی ان کے لئے ہے جو زمین میں اقتدار کے طالب نہیں بنتے اور یہ اقتدار کا طالب ہونا ہی فساد کی جڑ ہے۔ یہ بھی طالب' وہ بھی طالب' آخر جھگڑا فساد تو ہو گا ہی۔ یہی سارے مذہبی اختلاف کی بھی جڑ ہے۔ ایک دوسرے پر بالادستی ایک دوسرے کے اوپر سوار ہو جانا' یہ ہے اصل فساد۔ وہ مذہبی فساد ہو یا سیاسی فساد' اس آیت نے اس کی جڑ کاٹ دی۔

اس سیاست یعنی POWER POLITICS کا دروازہ ہم نے اپنے اوپر بند کرلیا ہے۔ ادھر کبھی نہیں جانا اور اللہ اس فیصلہ پر ہمیں استقامت عطا فرمائیں۔ البتہ سیاست اگر نام ہے ملکی حالات پر غور کرنے کا' اگر سیاست نام ہے اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد تو اس کے لئے ملکی حالات کا فہم حاصل کرنا اور یہ سمجھنا لازم ہے کہ کون کون سی قوتیں بر سرِ پیکار ہیں' ان کا پس منظر کیا ہے' ان کی سوچ کیا ہے' ان کے اختلافات کیا ہیں' ملک کے حالات کیا ہیں' اندر کے مسائل کیا ہیں اور باہر کے خطرات کیا ہیں۔ اگر ان کا شعور نہ ہو گا تو پھر آپ ابلۂ مسجد بن کر رہ جائیں گے یا صرف خیر کی تبلیغ کرنے والے بن کر رہ جائیں گے' آپ اقامتِ دین کا کام نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے تو آپ کو ان ساری چیزوں کو سمجھنا ہو گا' ان سارے عوامل کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا ہو گا۔ اپنے ساتھیوں کے ذہن کو بنانا ہو گا۔ اس کے بغیر آپ کیا مشورہ دے سکتے ہیں' خیر خواہی کا حق کیسے ادا ہو گا؟ پھر تو نفی ہو جائے گی اس حدیثِ مبارک کی۔

نہیں تو خیر خواہی میں مشورہ دینا ہے' کوئی سنے یا نہ سنے۔ مجھے بارہا خطوط آتے ہیں کہ کون آپ کی بات سنتا ہے؟ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ میرے سامنے تو قرآن مجید کی آیت موجود ہے کہ لوگوں نے کہا کہ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہے ہو "لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰہُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا...... یہ قوم تو اس حد کو جا چکی ہے کہ اب اللہ اس پر عذاب بھیج کر رہے گا' اب یہ تمہاری بات نہیں سننے لگے۔ "قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ" انہوں نے کہا کہ یہ معذرت ہے ہماری طرف سے ہمارے رب کی خدمت میں کہ پروردگار ہم آخری وقت تک بات کرتے رہے کوئی سنتا ہے تو سنے' نہیں سنتا نہ سنے۔ ؎

اک طرزِ تغافل ہے' سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے' سو ہم کرتے رہیں گے

پاکستان کے استحکام کی بنیاد

دوسری تمہید یہ ہے جس پر میں اپنی کتاب میں تفصیلاً لکھ چکا ہوں کہ پاکستان کا جواز اور پاکستان کے استحکام کی بنیاد سوائے اسلام کے اور کوئی شے نہیں بن سکتی۔ یہ ایک علمی اور تاریخی بحث ہے کہ پاکستان کیوں قائم ہوا؟ کیسے ہوا؟۔ کوئی نعرہ لگایا گیا تو دھوکے کے لئے لگایا گیا تھا یا خلوص سے لگایا گیا۔ آج کچھ لوگ ہمیں بتا رہے ہیں کہ "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" تو چند چھوکروں کا نعرہ تھا۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ بحث ہے' اس وقت میں اس کی تفصیل میں نہیں جا سکتا' محض اشارہ کر رہا ہوں۔ لیکن میں یہ بات دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس ملک کے لئے کوئی اور وجہ جواز ہے ہی نہیں۔ اگر دین و مذہب کو بیچ سے نکال دیں تو ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایک قوم کب تھے؟ نہ زبان ایک' نہ لباس ایک' نہ معاشرت ایک۔ ایک ہی شے مشترک تھی اور وہ مذہب تھا' اسلام اور دین تھا۔ کہاں چاٹگام کا مسلمان اور کہاں درۂ خیبر میں بسنے والا کوئی قبائلی مسلمان۔ کیا چیز قدرِ مشترک تھی ان میں سوائے دین کے؟ یہ ایک قوم بنے تھے تو ایک مذہب کی بنیاد پر بنے۔ چاہے وہ قومی جدوجہد تھی یا معاش کا مسئلہ تھا اور اگر معاش کا ہی مسئلہ تھا تو کسی قوم کا تھا نا!۔

وہ قوم کس بنیاد پر قوم تھی؟۔ سوائے مذہب کے اور کوئی بنیاد نہ تھی۔ یہ پولیٹکل سائنس کا مسئلہ ہے اور میں نے تفصیل سے تجزیہ کر کے بتلایا ہے کہ ملکوں اور قوموں کے استحکام کے جو جو عوامل ہوتے ہیں ان میں سے کوئی عامل ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

جغرافیائی عامل ہمارا مخالف ہے' تاریخی عامل ہمارے پاس موجود نہیں۔ پھر جو قومیتوں کے تصور ہیں' نسلی قومیت یا لسانی قومیت تو وہ بھی ہمیں جوڑنے والے نہیں بلکہ وہ تو کاٹنے والے ہیں۔

میں آج یہ بات خاص طور پر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ اگر کوئی شخص یا کوئی پارٹی' وہ پیپلز پارٹی ہو یا کسے باشد' اگر پاکستان کے لئے مخلص ہے تو اس حقیقت کو قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ پاکستان کی بقاء اور استحکام صرف اور صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کو کمزور کر کے آپ سمجھیں کہ ملک کو قوی کر لیں گے تو ایں خیال است و محال است و جنوں۔ اگر سیکولر پاکستان آپ بناتے ہیں تو سیکولر انڈیا اتنی بڑی طاقت ہے کہ وہ آپ کو کھینچ کر لے جائے گا' آپ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ وہی ثقافت' وہی اباحیت اور وہی بے پردگی اور عریانیت اور میوزک ۸۹ء جیسی چیزیں اختیار کرتے ہیں تو ان چیزوں میں بھارت ہم سے بہت آگے ہے۔ پھر تو وہ امام ہو گا اور آپ پیچھے چلیں گے۔ ان کے تو کلچر کا جزو ہے بے حیائی' ان کے تو مذہبی تہواروں میں بے حیائی جزوِ لازم ہے۔ اگر ثقافت اور "لوک ورثہ" کی بات ہے تو لوک ورثہ پنجابی مسلمان کا اور سکھ کا ایک ہے۔ غرض جس کسی کو پاکستان کا استحکام مطلوب ہے' چاہے کسی غرض سے مطلوب ہو' اسلام کے لئے اس خطہ کو بچانے کی یا اپنی مسندِ اقتدار ایک بڑے ملک پر بچھانے کی غرض سے' ہم نیت کے بارے میں فیصلہ نہیں دے سکتے لیکن مقصود اگر اس ملک کو باوقار اور قوم کو متحد رکھنا ہے تو اسلام سے انحراف کا سوچا بھی نہیں جا سکتا جو ملک کے اندر سوچ اور جذبات کا تصادم پیدا کرے گا۔

چنانچہ اب اگر کوئی حدود آرڈیننس کے خلاف زبان دراز کر رہا ہے' اگر کوئی اسلام کے قانونِ شہادت اور قانونِ وراثت کے خلاف زبان کھولتا ہے تو وہ درحقیقت اس ملک کی جڑیں کھود رہا ہے۔ ہاں عدالت میں جا کر علمی بحث کی جائے کہ ان قوانین کی تفصیلات کیا ہیں تو یہ دروازہ سب کے لئے کھلا ہے۔ یہ بات ہر شخص کو سمجھ لینی چاہئے کہ اسلام کا کوئی نیا تصور آپ لا کر نافذ نہیں کر سکتے۔ آخر چودہ سو برس بیتے ہیں اس قوم پر' ایک اجتماعی شعور اس کا وجود میں آ چکا ہے۔ اس قوم کا ہر ہر فرد یہ جانتا ہے کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں۔ چاہے وہ نماز پڑھتا ہو یا نہ پڑھتا ہو مگر جانتا ہے کہ نماز فرض ہے۔ کسی شخص کے گھر میں پردہ ہو یا نہ ہو مگر وہ جانتا ہے کہ اسلام میں پردہ ہے۔ اسی طرح مخلوط معاشرت اسلامی معاشرت نہیں' سب جانتے ہیں۔ عذر کریں گے کہ مجبوری ہے' حالات ایسے ہیں لیکن یہ کہ قوم کا ایک مزاج بن چکا ہے اور اس

میں ائمہ دین، محدثین، فقہاء، اولیاء اللہ اور ہمارے بزرگانِ دین کی چودہ صدیوں کی کوششوں کا عمل دخل ہے۔ آج اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ اپنا کوئی نیا خیال لائے اور وہ اس قوم میں قبولیت حاصل کر لے گا، وہ احمق ہے۔ قوم کو اسلام کے جانے پہچانے تصورات پر جمع کیا جائے تو اس میں سے قربانی اور ایثار کا مادہ بر آمد ہو گا۔ بیرونی سہارے آج ہیں کل نہیں ہونگے۔ امریکہ کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیر لگتی ہے؟ کتنی دفعہ ہم اس سے ڈسے جا چکے ہیں۔ مومن تو ایک سوراخ سے دو دفعہ بھی نہیں ڈسا جاتا۔ غنیمت ہے وہ اس وقت آپ کی مدد کر رہا ہے لیکن یہ کوئی مستقل بنیاد تو نہیں ہے۔ وہ ذرا سی بات پر ناراض ہو سکتا ہے۔ "نازک مزاجِ شاہاں، تابِ سخن ندارد"۔ جب بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ ہم گھاس کھالیں گے مگر ایٹم بم بنائیں گے تو امریکہ بہادر ناراض ہو گیا کہ ہمارا ہی کھاتے اور ہمیں کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔ ہماری بلی ہمیں کو میاؤں۔ پھر جو کچھ ہوا وہ آپ کے علم میں ہے۔ لہٰذا اصل سہارا کسی قوم کے اندر داخلی جذبہ کا بیدار ہونا ہے اور یہ داخلی جذبہ اس قوم میں صرف اور صرف اسلام کے حوالے سے بیدار ہو سکتا ہے۔ اسلام کا بھی کوئی نیا ایڈیشن نہیں۔

یہ چند باتیں میں نے اس وقت اس لئے کہی ہیں کہ ان کا روئے سخن ان لوگوں کی طرف تھا جن کے ہاتھوں میں اس وقت قوم کی تقدیر آ گئی ہے۔ ؎

رنگِ گل کا ہے سلیقہ، نہ بہاروں کا شعور
ہائے کن ہاتھوں میں تقدیر حنا ٹھہری ہے

اسلام کا ہمہ گیر تصور

دوسری بات یہ کہ اسلام کے ساتھ ہمارا ایک تصور روزہ نماز کا چلا آ رہا ہے تو اس کے ساتھ پردے اور حجاب کے کچھ تصورات بھی ساتھ چلے ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ اگر ضیاء الحق صاحب کی بیگم صاحبہ نے کسی سے ہاتھ ملایا تھا تو ہمیں برا لگا۔ شاید ضیاء الحق صاحب کو بھی برا لگا ہو تاہم میں نے برملا ان کو لکھ دیا تھا کہ اب بات اس حد تک پہنچ گئی کہ آپ کی بیگم صاحبہ کا HAND SHAKE ہو گیا۔ وہی معاملہ اب یہاں ہو گیا ہے اور یہ گویا دو عملی کی اس لعنت کو مسلط رکھنے کی کوشش ہے جس نے پہلے ہی قوم کو کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس ملک میں تو اب تک ہاتھ نہیں ملایا گیا تھا، بڑی بڑی تقریبات ہوئیں لیکن ہاتھ بندھے رہے، رکے رہے مگر معلوم ہوا کہ امریکہ کی بالادستی، اس کی سیادت، اس کی چودھراہٹ ذہنوں پر پوری طرح چھائی ہوئی

ہے۔ ذرا سی ہمت وہاں بھی کر لی جاتی تو ظاہر بات ہے کہ ایک اعتماد پیدا ہوتا۔ امریکیوں کو بھی معلوم ہوتا کہ ان کا طرز عمل جو اسلام آباد میں ہے وہی واشنگٹن میں رہا۔ اس سے عزت بڑھتی اور جب یہ بات سامنے آئی کہ واشنگٹن میں عمل کچھ اور ہے اور اسلام آباد میں اور تو عزت گھٹتی ہے۔ لیکن یہ کیوں ہوا' اس لئے کہ در حقیقت دین کے بارے میں ہمارا مجموعی شعور ناقص اور محدود ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارا دین صرف نماز روزہ کا دین نہیں ہے' یہ عدلِ اجتماعی کا دین ہے' یہ لوگوں کو انسانوں کے حقوق عطا کرنے والا دین ہے' یہ سماجی طور پر تمام انسانوں کو برابر قرار دینے والا دین ہے۔ یہ دین اسلامی ریاست کا فرض قرار دیتا ہے کہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا ذمہ لے۔ یہ چیزیں چونکہ صدیوں سے عملاً نکل گئی ہیں' آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل' تاہم جو کچھ بچا ہے اس کی تو حفاظت کی جائے۔ وہ بھی دین کا حصہ تو ہے۔ اسے مجروح کر کے آپ قوم کے رخ سے اپنا رخ جدا کر لیں گے۔ تاہم مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ دین کی ہمہ گیریت کا تصور بے جان ہو گیا ہے۔ ایک خلاء پیدا ہوا جس کے باعث قوم کبھی کمیونزم کی طرف دیکھتی ہے' کبھی سوشلزم کی طرف دوڑتی ہے اور کبھی تہذیبِ مغرب اس کی آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے۔ لوگوں کو یہ بات بتانے' سمجھانے اور کر کے دکھانے کی ضرورت ہے کہ انسانی قدروں کی اعلیٰ ترین شکلیں ہمارے دین میں موجود ہیں۔ سب خیر اسی سے نکلا ہے۔ انسانیت نے جو بھلی بات سیکھی' ہمارے دین سے سیکھی ہے اور بالآخر اسے ہمارے دین کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہو گا۔

اسلام کے تصوّرِ عدلِ اجتماعی اور دین کی ہمہ گیریت کو واضح کئے بغیر مسلمانوں میں خود اعتمادی بحال نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے اپنی سی کوشش کی اور ایک عرصہ سے انہی موضوعات پر محاضرات اور تقاریر کے سلسلے کراچی' لاہور اور اسلام آباد جیسے اہم مراکز میں جاری رکھے ہیں لیکن اس کلام کو قومی سطح پر اور وسیع ترین پیمانے پر نہ کیا گیا تو خلاء کو پر کرنے کے لئے کوئی سی بھی بلا ہمارا گھر دیکھ سکتی ہے۔

پاکستان اور جمہوریت

تیسری تمہیدی بات یہ ہے کہ جہاں یہ بات صد فیصد درست ہے کہ اس ملک کا جواز صرف اسلام ہے اور استحکام کی بنیاد صرف اسلام ہے' وہاں موجودہ حالات میں یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ اس کی بقاء جمہوریت سے وابستہ ہے۔ میں نے دو الفاظ یہاں جان بوجھ کر استعمال کئے ہیں۔ اگر جمہوریت نہیں ہو گی تو ملک ٹوٹ جائے گا اور یہ باقی ہی نہ رہے تو استحکام کا

کیا سوال۔ یہ ملک وجود میں آیا اسلام کے نعرہ اور ووٹ کے ذریعہ اور ظہور پذیر ہوا الیکشن کے ذریعہ۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن نے ثابت ہو گیا کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی متفقہ نمائندگی کرنے والی جماعت ہے، تب ہی تو پاکستان بنا۔ اس کا تقاضا ہے کہ یہاں کوئی حاکم بن کر نہ بیٹھ جائے، بیٹھے تو ووٹ کی طاقت سے بیٹھے۔ لوگوں کو ان کے سیاسی حقوق دیئے جانے چاہئیں۔ ان کی آزادی و حریت لوٹائی جائے۔ ہمارا دین اس معاملہ میں اعلیٰ ترین تصوّرات دیتا ہے اور ہماری تاریخ اس نظام کی مثالوں سے بھری پڑی ہے، انسان جس کی تلاش میں ہے اور ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ ہم اس خزانہ پر سانپ بنے بیٹھے ہیں۔ نہ خود اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کی جھلک دکھانے پر آمادہ ہیں۔ پاکستان بنایا ہی اس غرض سے گیا تھا کہ دور جدید میں اس کا ایک عملی نمونہ دکھا سکیں۔ اسلامی اخوت، مساوات اور حریت پر مبنی نظام حکومت قائم کریں لیکن جمہوریت کی مسخ شدہ صورت، آمریت اور فوجی حکومتوں نے ملک کی بقاء اور سلامتی کو ہی خطرے میں ڈال دیا اور آخری طویل ترین مارشل لاء نے تو حالات کو اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ تفصیل بڑی ہی روح فرسا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ ایک ہی حادثے میں ضیاء الحق صاحب کو شہادت کی موت ملی اور ملک کی بھی جان چھوٹی۔ اب خدا خدا کر کے جمہوریت بحال ہوئی ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں رخنہ اندازی کی ہر کوشش ملک کے وجود کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہے۔ یہ ملک صرف یہاں کے رہنے والوں کا نہیں ہے، اس پر کہیں زیادہ حق بھارتی مسلمان کا ہے۔ سب سے بڑی قربانی اس نے دی تھی اور آج تک دے رہا ہے۔ اس کی قیمت اس کو اپنے خون سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس نے مسلم لیگ کا ساتھ دے کر پاکستان بنوایا تھا۔ آج ہم اس کے مالک بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ درحقیقت سمجھایہ گیا تھا کہ یہ ملک برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے لئے حفاظت کا ذریعہ بن جائے گا۔ مضبوط پاکستان ہو گا تو یہاں ہندو کو کچھ کہنے کی جرائت نہیں ہو گی۔ ۸۰ء میں جب میں پہلی مرتبہ علی گڑھ گیا تھا، وہاں کے مسلمانوں نے مجھ سے کہا کہ ۷۱ء تک ہم سمجھتے تھے کہ پاکستان ہمارا محافظ ہے لیکن ۷۱ء کے بعد ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنی حفاظت خود کر لے تو بڑی بات ہے، ہماری کیا حفاظت کرے گا۔ یہ ہیں ہمارے کرتوت اور یہ سارے کرتوت نتیجہ کس کا ہیں؟۔ یہاں قوم کے حقوق اس کو نہیں دیئے گئے یہاں سیاست کی گاڑی چلنے نہیں دی گئی۔ اب پھر اس میں رکاوٹ ڈالی گئی تو نتیجہ ظاہر ہے کہ بُرا ہو گا۔ یہ کچھ اسباب ہیں جنہوں نے جمہوریت کو ہمارے لئے اہم بنا دیا اور پاکستان کی سلامتی کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔

متحدہ حزب اختلاف

اب آیئے میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس وقت جو بھی حکومتیں بنیں' ووٹ کے ذریعہ بنی ہیں۔ پوری دنیا نے مانا ہے کہ انتخابات صحیح ہوئے ہیں۔ انتخابات کے نتیجہ میں حکومتیں بنیں۔ لیکن ہم نے اب تک دوطرفہ طور پر ثابت یہ کیا ہے کہ سیاسی روایات کا پاس اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا مادہ دونوں میں نہیں ہے۔ نہ ان میں جو حکومت میں ہیں اور نہ ان میں جو اپوزیشن میں ہیں۔ اور یہ دونوں علیحدہ بھی نہیں ہیں اس لئے کہ ایک مرکزی حکومت میں بیٹھا ہے اور دوسرا وہاں اپوزیشن میں ہے' تو دوسرا سب سے بڑے صوبے میں حکومت میں اور پہلا اپوزیشن میں ہے۔ یہ بالکل برابر کی چوٹ ہے۔ لیکن ہم ابھی اپنے آپ کو اہل ثابت نہیں کر رہے۔ پھر ہماری ایک ریت یہ چلی آرہی ہے کہ جو حکومت میں آگیا اس کی ٹانگ گھسیٹنے کے لئے باہر رہ جانے والے سب لوگ جمع ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ تیسری مرتبہ پھر وہی کام ہو رہا ہے۔ بے اصولے پن کی انتہا ہے۔ کہاں اے این پی اور کہاں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام! ۔ ایک افغانستان کی جنگ کو فساد کہتا ہے دوسروں کے نزدیک یہ جہاد ہے۔ مجاہدین پہلے کے نزدیک ڈاکو ہیں اور دوسرے توقع رکھتے ہیں کہ افغانستان میں ہی نہیں' وہ پورے ترکستان میں اسلام کا جھنڈا بلند کریں گے۔ زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن ایک وقتی سیاسی مصلحت نے انہیں جوڑ دیا ہے۔ میں اس پر کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ ان کا مقابلہ جن سے ہے' وہ بھی کم نہیں۔ یہ اے این پی وہی تو ہے جس پر بے نظیر صاحبہ کے والد نے غدار قرار دے کر مقدمہ چلایا تھا۔ انہوں نے ان کے ساتھ اتحاد کیا تو کون سے اصول کی پاسداری کی۔ سیاسی مصلحت وہاں بھی آڑے آئی تھی لہٰذا کسی کو بھی اچھا نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اللہ کرے اصول پرستی آئے' جماعتوں کا نظام مضبوط ہو اور انشاء اللہ ہو بھی جائیگا اگر تسلسل قائم رہے۔ ہاں اگر مارشل لاء لگ گیا تو پھر اس کا کوئی امکان نہیں۔ چونکہ ہماری سیاسی تربیت نہیں ہو سکی' سیاست کی سطح پر ہم بالغ نہیں ہو پائے ہیں لہٰذا دونوں طرف کا طرز عمل یکساں ہے۔ اپنے مناسب وقت پر ایک دو الیکشن ہو جائیں گے تو صحت مندانہ سیاسی روایات بھی بن جائیں گی۔ جماعتوں کے ڈھانچے بھی مستحکم ہو جائیں گے اور کسی نہ کسی درجہ میں اس کے آثار بھی ہیں۔ خرید و فروخت جس بڑے پیمانے پر ہوا کرتی تھی اس پیمانے پر اب نہیں ہوئی حالانکہ دونوں طرف سے خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے تھے۔

اپوزیشن کو متحد ہونے کا پورا حق حاصل ہے۔ مجھے اصولوں کے معاملے میں

سودے بازی سے دکھ ہوا جو بیان کر دیا ہے۔ تاہم میری وہ بات اپنی جگہ قائم ہے جو میں نے خلوص سے کہی تھی لیکن شاید یہاں نصیحت ماننا تو کیا' سننا بھی لوگوں کو گوارا نہیں۔ متحدہ حزب اختلاف بلکہ اس کا جزو اعظم آئی جے آئی بھی کوئی جماعت نہیں۔ عارضی مصلحت کی پیداوار ہے۔ ضرورت تھی کہ مسلم لیگ کو مضبوط کیا جاتا۔ ایک پارٹی کے سامنے ایک پارٹی آتی جسے پاکستان اور نظریہ پاکستان کی بات کرنے کا حق حاصل ہے۔ پیپلز پارٹی کے حق میں یہی تو میں نے کہا تھا کہ وہ ایک جماعت ہے۔ کیا اس میں کسی کو شبہ ہے' ہمارے سب معیارات کے مطابق وہ ایک پارٹی ہے اور اس کا مقابلہ بھی ایک پارٹی ہی کر سکتی ہے۔ اب اتحاد سے اوپر جو اتحاد بن رہے ہیں وہ کسی مستقل منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں۔ مسلم لیگ پر پہلے آئی جے آئی کا ملبہ گرا اور اب خود آئی جے آئی متحدہ حزب اختلاف کے ملبہ تلے آگئی ہے جس کے سربراہ جناب جتوئی ہیں۔ وہی جو بھٹو صاحب کے دست راست تھے اور آخری وقت تک پیپلز پارٹی کے ساتھ رہے۔ علیحدہ ہوئے ہیں تو کسی اصولی اختلاف پر نہیں' محض اس وجہ سے کہ بے نظیر کی قیادت انہیں منظور نہ تھی۔ مسلم لیگ کی قیادت کے لئے ایک توانا شخصیت ابھر کر سامنے آئی تھی وہ مارشل لا کی باقیات ہونے کے باوجود اس صلاحیت کا مظاہرہ کر چکی تھی کہ سیاسی لڑائی میں قیادت کا حق ادا کر سکے۔ وہ حکومت کے عارضی فائدے پر لات مار کر سیاست کے کھلے میدان میں آتے تو صورت حال کہیں بہتر ہوتی۔

وہ وقت گزر گیا ہے۔ اب کم از کم اتنا ہی کیا جائے کہ جو کھاڑ پچھاڑ ہو وہ دستور اور آئین کی حدود کے اندر اندر ہو تاکہ جمہوری روایات مستحکم ہوں۔ اس کے کچھ آثار بھی ہیں کہ جو دو الیکشن حال میں ہوئے ہیں ان میں پیپلز پارٹی کی سیٹ پیپلز پارٹی نے جیت لی اور آئی جے آئی کی سیٹ آئی جے آئی نے جیت لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ٹھہراؤ ہماری سیاست میں آگیا ہے۔ وہ جو سودے ہو جاتے تھے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر 'لیا دیا اور معاملہ ختم ہو گیا جیسے کہ لینے کے کاروبار میں ہوتا ہے اس طریقے سے جو سیاست ہوتی تھی' اس کا دور ختم ہو رہا ہے۔

تازہ ترین مہم جوئی

آج کی گفتگو کا اہم ترین حصہ علماء کونسل کی مجوزہ تحریک ہے۔ میرے نزدیک یہ ملک کے لئے سب سے زیادہ خوفناک مسئلہ ہے۔ وہی صورتحال ایک مرتبہ پھر پیدا ہو رہی ہے۔ ایوب خان کو گرانے کے لئے سیاستدان اور مذہبی عناصر جمع ہو گئے' نعرہ مذہب کا لگا' ایوب خان گر گیا' لیکن آیا کیا؟ پہلے یحییٰ خان پھر بھٹو صاحب' حاصل کیا ہوا؟۔ بھٹو صاحب

گرانے کیلئے پھر نعرہ مذہب کا، سب جمع ہو گئے، دائیں بازو والے بھی بائیں بازو والے بھی، اور مذہبی بھی سیکولر بھی۔ بھٹو صاحب کو گرا لیا گیا، آیا کیا؟۔ مارشل لاء۔ اب پھر یہ جمع ہو رہے ہیں، وہی لوگ جو سیاست کے میدان کے کھلاڑی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ عورت کی سربراہی منکر ہے اور میں مانتا ہوں کہ منکر ہے۔ اس اعتبار سے تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تو نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے چلے ہیں۔ یہ بات ہے تو اس کی شرائط کو پورا کرنے کا انتظام پہلے کریں۔ اولین شرط یہ ہے کہ وہ اقتدار کی کشمکش (POWER POLITICS) سے نہ صرف علیحدہ ہوں بلکہ واقعی اس سے دور کھڑے نظر آئیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والا ہر شخص یہ عہد کرے کہ وہ اپنے اوپر بھی اسلام کو نافذ کرے گا۔ منکرات کو خود بھی ترک کرے گا۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ شرط میں نے نہیں لگائی، قرآن مجید میں بہت زیادہ تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ "اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کے ساتھ "اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ ......" کی صفات نعوذ باللہ شاعری نہیں، لفاظی نہیں بلکہ بنیادی ضروریات ہیں۔ تیسری شرط "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" کا تقاضا ہے کہ کسی ایک امیر کے پیچھے جمع ہوں۔ ستاروں کی محفل اور کونسلیں یہ کام انجام نہیں دے سکتیں۔ ہنگامہ آرائی اور شور و غوغا تو ممکن ہے لیکن دین کا کام نظم کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ فساد ہو سکتا ہے، جہاد نہیں۔

افغان جہاد سے سبق

افغان جہاد عظیم کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اگر آج تعطل کا شکار ہو گیا ہے تو اس کی دوسری وجوہات بھی ہوں گی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مجاہدین سے ایک بڑی خطا ہوئی ہے۔ انہوں نے پروفیسر عبدالرب رسول سیاف کو جہاد کا امیر بنا کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی لیکن پھر توڑ دی۔ سات سات آٹھ آٹھ گروپ بن گئے اور اکثر میں تقسیم در تقسیم بھی پیدا ہو گئی۔ امدادی رقوم اور اسلحہ سب لوگ الگ الگ لینا چاہتے تھے۔ آج اس کا نتیجہ سامنے ہے۔ گوریلا طرز جنگ کے عادی مجاہدین نے ثمر خیل چھاؤنی کو جس طرح روند کر دکھا دیا اس کے بعد جلال آباد کی حیثیت کیا رہ گئی تھی۔ انہوں نے یہ کارنامہ باقاعدہ جنگ کے ذریعے ہی انجام دیا تھا لیکن پھر بدنظمی نے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ ہر دھڑا جلال آباد کی تسخیر کا سہرا اپنی پیشانی پر باندھنے کا آرزومند تھا چنانچہ منصوبہ بندی کے بغیر اور اپنی قوت کو جمع کئے بغیر ہر کمانڈر از خود چڑھ دوڑا۔

عظیم جانی نقصان اٹھانے کے باوجود جلال آباد مجاہدین کے راستے کی دیوار بنا ہوا ہے۔

ایران کا انقلاب جو کامیاب ہوا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ قیادت ایک ہاتھ میں تھی۔ نو ستارے یا سات ستارے ہوتے تو وہی ہوتا جو ہمارے یہاں نظام مصطفیٰ تحریک کا ہوا۔ مارشل لا آگیا۔ غنیمت ہے کہ مارشل لا میں ایک ایسا شخص اوپر آگیا جو نمازی روزہ دار تھا ورنہ کوئی ایسا شخص بھی آسکتا تھا جو زانی ہوتا' شرابی ہوتا۔ کیا گارنٹی تھی آپ کے پاس کہ وہ نہیں آسکتا تھا۔ وہ تو اللہ کا فضل سمجھئے اور اگر اس کا کریڈٹ دینا ہے تو بھٹو صاحب کو دیجئے کہ چن کر اور دوسروں پر ترجیح دے کر ضیاءالحق صاحب کو لے آئے ورنہ کوئی اور بھی آسکتا تھا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے ٹائیگر زرہے ہیں۔ ایسے ایسے شرابی اور زانی جن کی شراب خوری اور زنا کی داستانیں پوری دنیا میں مشہور ہیں' وہ بھی تو ہمارے جرنیل تھے۔

تو اچھی طرح جان لیجئے کہ یہ شرطیں پوری کریں تو میدان میں آئیں ورنہ پہلے کی طرح سیاست کا پاسنگ بن جانا' سیاست اور مذہب کو گڈمڈ کر کے اور عوام کے مذہبی جذبے کو مشتعل کر کے حکومت کو غیر مستحکم کر دینا بہت ہی خوفناک نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ ہمارے اندرونی حالات ہی نازک نہیں' بیرونی ماحول بھی سازگار نہیں۔ اگر پاکستان کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو ہمارے ساتھ ہندوستانی مسلمان بھی پس جائیں گے جن پر ہر روز قیامت ٹوٹتی ہے۔ بھارت کی متعصب ہندو تنظیم آر ایس ایس نے چھ لاکھ رضا کاروں کو تنظیمی اور جسمانی تربیت دی ہے اور ان کا ہدف کوئی راز نہیں۔ وہ کھل کر اعلان کرتے ہیں کہ برصغیر سے مسلمان اور اسلام کا نام ونشان مٹا کر چھوڑیں گے۔

میں یہ بات بھی آپ سے عرض کر دوں کہ بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کے بارے میں اپنی رائے بدلی۔ مثلاً پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم صاف کہتے تھے کہ میں نے حماقت کی تھی تحریک پاکستان میں حصہ لیکر' میں نے بھاڑ جھونکا مسلم لیگ کا اور دھوکہ دیا لوگوں کو کہ وہاں اسلام آئیگا۔ یہاں اسلام نہیں آیا۔ میں نے مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کی ۱۹۶۸ء کے دوران جامعہ اشرفیہ میں تقریر سنی جب ایوب خاں کے خلاف عیدالفطر کے چاند کے مسئلہ پر پہلی تحریک چلی تھی۔ وہ صدفیصد مسلم لیگی تھے لیکن انہوں نے کہا آج ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ شاید ہماری بات غلط تھی اور اُن علماء کی رائے صحیح تھی جنہوں نے پاکستان کے خلاف جدوجہد کی۔ تاہم میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ میرا قطعاً اس فکر سے کوئی تعلق نہیں۔ آج بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان کا بننا ضروری تھا اور اس کا بننا صحیح

اور اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندو ذہنیت جو کچھ پورے ہندوستان کے بارے میں سوچ رہی تھی اور
لمان کے ساتھ جو کچھ کرتی' آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پاکستان کا بننا مشیتِ
ادی کے تحت ہوا ہے۔ صد فیصد صحیح ہوا ہے لیکن اس کو سنبھالنا ضروری ہے۔ اگر ہماری اس
ر پولیٹکس کے نتیجے میں اور خاص طور پر مذہبی جذبے کو میدان میں لا کر اشتعال پیدا کرنے سے
جودہ کمزور و ناتواں جمہوریت کی بساط لپٹ جائے تو یہ اس ملک کے قتل میں شریک ہونے کے
رادف ہو گا۔ اللہ کرے کہ ہمارے زعماء کو ہوش آجائے اور وہ منفی سیاست سے پرہیز
یں۔

ضی قریب کی تاریخ

میں نے اتنی وضاحت سے یہ باتیں اس لئے عرض کی ہیں کہ کسی کو اشتباہ نہ رہے۔ میں
س تحریک میں شامل نہیں ہوں۔ ۱۹۶۲ء میں ایک آمر نے عائلی قوانین کے اندر تبدیلی کی تھی'
ریعت کو مسخ کیا تھا۔ اُس وقت تحریک نہیں چلائی گئی۔ ہمارے یہ زعماء بلکہ ان کے بزرگ
س وقت موجود تھے۔ انہوں نے تحریک چلائی تو جمہوریت کے لئے چلائی۔ پھر شریعت بل کا
وقع آیا تو متحدہ شریعت محاذ میں بلا استثناء سب دینی عناصر جمع ہو گئے۔ لیکن ہوا کیا؟۔ اس
تحریک کے لئے ایک الٹی میٹم دیا گیا کہ ۲۷ رمضان المبارک تک یہ بل پاس نہ ہوا تو ہم تحریک
چلائیں گے' سول نافرمانی کریں گے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پھر ہم ان اسمبلیوں میں بھی نہیں بیٹھیں
گے جو شریعت بل کو منظور نہ کریں لیکن جب وقت آیا تو دس بارہ پندرہ سیٹیں گلے کا ہار بن
گئیں' پاؤں کی بیڑیاں بن گئیں۔ اور وہ قدم نہ اٹھ سکا۔ وہ وقت تھا تحریک چلانے کا' ہم بھی
خادموں کی طرح شریک ہو گئے تھے۔ لیکن وہ کام نہیں ہوا۔ مگر اب سیاست کے گڈمڈ مجموعے
کے ساتھ پھر عوام کے مذہبی جذبہ کو مشتعل کرنے کی جو کوشش ہو رہی ہے' میرے نزدیک یہ
اس ملک کے استحکام کے اعتبار سے بھی انتہائی خوفناک نتائج کی حامل ہے اور دینی اعتبار سے بھی
حد درجہ ضروری شرائط کو پورا نہیں کرتی۔ میں نے تو شریعت محاذ میں بھی کہا تھا کہ کسی ایک کے
ہاتھ پر بیعت کرو' جب تک یہ شکل نہیں ہو گی ہمارا یہ کام منظم طور پر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔
لیکن وہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ اصل مقصود سیاست اور چودھراہٹ تھی۔ اب میں کیا عرض
کروں کہ مجھے کیا تجربہ ہوا۔ متحدہ شریعت محاذ کے اجلاس کے دوران جو کچھ ہوتا رہا اسے
بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری۔ جھگڑے اس پر چلتے رہتے تھے کہ فلاں
پوسٹر میں فلاں جماعت کا نام نمایاں کیوں آگیا اور ہمارا نام پیچھے کیوں رہ گیا۔ قرآنی

استعارے کے مطابق وہ بظاہر جمع نظر آتے تھے لیکن دل پھٹے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حال سے محفوظ رکھے اور ملک کو کسی نئی آزمائش میں نہ ڈالے۔ ہمیں سیاسی طالع آزماؤں کی مہم جوئی سے بچنے کی ضرورت امریکی امداد کی احتیاج سے زیادہ ہے جس کے امکان روشن نظر آرہے ہیں لیکن کیا ہمارے لئے وہ اپنی مصلحت کو بھی قربان کر سکے گا؟

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس نمبر ۱۲ نشست نمبر ۶۰

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۷)

نحمده و نصلّی علی رسوله الکریم...... امابعد فاعوذ باللّٰه من الشیطٰن الرّجیم ○ بِسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم ○

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (الحجرات = ۱۵)

صدق اللہ العظیم

"مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، پھر شک میں نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں...... صرف یہی لوگ (اپنے دعوئ ایمان) میں سچے ہیں"۔

معزز حاضرین اور محترم ناظرین...... یہ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۵ ہے، جو ابھی آپ نے سماعت فرمائی اور اس کا ترجمہ بھی سنا۔ میں نے گزشتہ نشست میں اس سے پچھلی آیت کے

بارے میں عرض کیا تھا کہ ایک خاص مضمون کے اعتبار سے وہ قرآن مجید کی اہم ترین آیت ہے۔ بالکل وہی کیفیت اس آیتِ مبارکہ کی ہے کہ یہ بھی اپنے مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید کا نقطۂ عروج ہے۔ وہ مضمون یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی کی تعریف کیا ہے؟ جب یہ واضح ہو گیا کہ ایمان اور ہے' اسلام اور ہے تو فطری طور پر ایک سوال ذہن میں ابھر کر آئے گا کہ 'ایمان' کسے کہتے ہیں! چنانچہ یہ وہ مقام ہے جسے میں ایمان کی جامع و مانع تعریف قرار دیتا ہوں۔ جامع و مانع تعریف ایک تو اس پہلو سے ہے کہ چونکہ سیاقِ کلام میں ایمان اور اسلام کا علیحدہ علیحدہ بیان ہوا ہے۔ ویسے ایمان کی کیفیات قرآن مجید میں جابجا بیان ہوئی ہیں۔ ایمان کے ثمرات اور اس کے نتائج کے بارے میں ہم سورۃ التغابن میں تفاصیل پڑھ چکے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا رکوع ایمان کے ثمرات' ایمان کے نتائج' ایمان کے مقتضیات اور ایمان کے مضمرات ہی کے موضوع پر تھا۔ لیکن یہاں یہ دیکھنا ہے کہ سیاقِ کلام کیا ہے! وہ ہے ایمان اور اسلام کا فرق۔ لہٰذا اس پس منظر میں یہ مضمون آ رہا ہے کہ مومن تو بس وہ ہیں جن میں وہ دو شرطیں پوری ہوں جو اس آیتِ مبارکہ میں بیان ہو رہی ہیں...... گویا یہ ایمان کی تعریف (DEFINITION) کا مقام ہے...... دوسرے اس پہلو سے کہ اس آیت مبارکہ کے شروع میں بھی اسلوبِ حصر ہے اور اختتام پر بھی...... 'حصر' ایک اصطلاح ہے' اس کو اس مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکے گا کہ ہم ایک جملہ کہتے ہیں 'زید عالم ہے' اور ایک کہتے ہیں کہ 'زید ہی عالم ہے'۔ اب غور کیجئے کہ ان دو جملوں میں کیا فرق واقع ہوا۔ پہلے جملے 'زید عالم ہے' میں زید کے عالم ہونے کا اثبات ہوا لیکن کسی دوسرے کے عالم ہونے کی نفی نہیں ہوئی یعنی زید کے علاوہ کوئی اور بھی عالم ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس جملے میں کہ 'زید ہی عالم ہے' زید کے عالم ہونے کا اثبات اور دوسروں کے عالم ہونے کی نفی ہو رہی ہے۔ یعنی زید کے سوا اور کوئی عالم نہیں ہے۔ گویا علم منحصر ہے زید میں۔ اس کو اسلوبِ حصر کہتے ہیں...... آیت کے شروع میں آیا...... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ' معنی ہوں گے "مومن تو بس وہ لوگ ہیں" یا "مومن تو صرف وہ لوگ ہیں"...... آخر میں بھی اسلوبِ حصر ہے...... اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ "صرف یہی لوگ سچے ہیں"۔ یعنی دعویٰ تو انہوں نے بھی کیا تھا' جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ ایمان کے مدعی اور دعویدار تو بہت سے ہیں' لیکن اس دعویٔ ایمان میں سچے صرف وہ ہیں جو ان شرطوں کو پورا کریں جو اس آیتِ مبارکہ میں بیان کی جا رہی ہیں۔

آیت کے اس اول و آخر کو سمجھ کر اب آیئے یہ دیکھیں کہ اس آیت کا اصل مضمون اور اصل CONTENT کیا ہے!...... آیت پر تھوڑے سے غور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دو لوازم ہیں۔ یا اگر میں بغرضِ تفہیم فقہی اصطلاح استعمال کروں تو کہوں گا کہ ایمانِ حقیقی کے دو ارکان ہیں۔ دیکھئے کہ ارکانِ اسلام سے ہر مسلمان واقف ہے۔ جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں...... بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ - شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَاءِ الزَّکٰوةِ وَ الْحَجِّ وَ صَوْمِ رَمَضَانَ (بخاری و مسلم) ...... اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔ کلمۂ شہادت' نماز' زکوٰۃ' حج' اور صومِ رمضان۔ یہ پانچوں کیا ہیں؟ یہ ارکانِ اسلام ہیں' اسلام کے ستون ہیں!...... اسی اصطلاح کو ذہن نشین کر لیجئے اور دیکھئے کہ اس آیتِ مبارکہ کی رُو سے ایمان کے دو ارکان کیا ہیں! پہلا رُکن ہے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وہ ایمان جس میں شکوک و شبہات باقی نہ رہیں۔ یہاں بھی دیکھئے کہ 'ریب' سے فعلِ مضارع 'یرتابوا' سے پہلے 'لم' آیا۔ معنی ہوئے "ہرگز شک نہ کریں"۔ یعنی شکوک و شبہات کے کانٹے بالکل نکل چکے ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ ہے 'یقینِ قلبی' ...... یہ فکر و نظر یعنی عقیدے کا اخلاص ہوا۔ یہ ہے ایمانِ حقیقی کا پہلا رکن۔ دوسرا رکن عمل سے متعلق ہے اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ' اپنے اموال اور اپنی جانوں سے۔ پس ایمان حقیقی کے دو ارکان ہوئے' ایک 'یقین' جو قلب میں ہو گا اور دوسرا 'جہاد' جو عمل میں ہو گا۔

یہاں ایک نکتہ اور سمجھ لیجئے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ایمان مجمل کے الفاظ اکثر حضرات کو یاد ہوں گے...... اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَ صِفَاتِهٖ وَ قَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ۔ معلوم ہوا کہ ایمان کے دو پہلو یا دو درجے ہیں۔ ایک زبان سے اقرار اور دوسرا دل سے تصدیق یا قلبی یقین...... اب ان میں سے پہلا درجہ یعنی اقرار باللسان ایمانِ قانونی یا اسلام کا رُکن ہے...... شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہُ و ان محمدًا رسولُ اللہ یہ تصدیق ہے' TESTIMONY ہے۔ ایک شخص زبان سے اقرار کرے کہ میں مانتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور تسلیم کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں...... تو اس اقرار باللسان کی حیثیت اسلام کے رکن کی ہوگی جبکہ تصدیق بالقلب ایمانِ حقیقی کا رُکن ہو گا۔

ایمان حقیقی کے دو ارکان میں سے پہلے رکن یعنی یقینِ قلبی پر پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے کہ

اس کے کیا آثار ہیں؟ یقین ہے تو اس کے کیا نتائج و ثمرات انسان کے عمل میں ظہور پذیر ہوں گے! ان امور کا ہم سورۃ التغابن میں تفصیل سے مطالعہ کر چکے ہیں۔ للذا آج گفتگو کو زیادہ مرتکز کرنا ہو گا دوسرے رکن یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ رکن ہے ایمان حقیقی کا، یعنی یہ ہے تو حقیقی ایمان ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو ایمانِ حقیقی حاصل نہیں ہے...... اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے کیا؟ جہاد کے بارے میں ہمارے یہاں دو بڑے بڑے مغالطے ہیں۔ ایک یہ کہ جہاد کے معنی جنگ کے لئے جاتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے' اس کی بلند ترین چوٹی جنگ ہے۔ اس کی وضاحت میں آگے بیان کروں گا...... ویسے جنگ کے لئے قرآن مجید کی اصطلاح ہے 'قتال فی سبیل اللہ' ــــ 'جہاد' کا لفظ بنا ہے 'جہد' سے' اور جُہد کے معنی ہیں کوشش۔ جِدّوجہد کا لفظ ہم بولتے ہیں۔ 'قتال' کا لفظ بنا ہے 'قتل' سے' اس کے معنی ہیں جنگ ــــ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ مسلمان جو بھی جنگ کرے' جہاد ہے۔ یہ گویا بنائے فاسد علی الفاسد ہے' یعنی ایک غلط بات پر ایک اور غلط بات کی بنیاد رکھ دینا۔ مسلمان کی صرف وہ جنگ قتال فی سبیل اللہ یا جہاد کی چوٹی کے اعتبار سے جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتی ہے جس کا مقصد صرف اللہ کے کلمہ کو سربلند کرنا ہو۔ اگر وہ ہوسِ ملک گیری کی غرض سے ہے' اپنے دنیوی اقتدار کی توسیع کے مقصد کے تحت ہے تو وہ قتال یا جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ للذا ان دونوں مغالطوں کو ذہن سے نکال دیجئے اور اب مثبت طور پر سمجھئے کہ جہاد کہتے کسے ہیں!

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کا مادّہ (ROOT) ہے جہدٗ اور جُہد کے معنی ہیں کوشش۔ انگریزی میں اسے ادا کریں گے 'TO STRIVE FOR SOMETHING' یہ جُہد ہے...... لیکن مجاہدہ یا جہاد کے الفاظ میں ایک اضافی معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجاہدہ وہاں ہو گا جہاں جہد' جہد سے ٹکرائے۔ جہاں کوشش کا کوشش سے مقابلہ ہو۔ عربی زبان میں بابِ مفاعلہ میں جو الفاظ آتے ہیں ان میں اکثر الفاظ میں آپ کو یہ خاصیت ملے گی کہ دو فریق بالمقابل آ کر ایک ہی عمل کر رہے ہوں اور ایک دوسرے کو زیر کرنا چاہتے ہوں۔ جیسے مباحثہ ہے۔ مباحثہ کیا ہوتا ہے! دو فریق ہیں' اس کا ایک موقف ہے' دوسرے کا کوئی دوسرا موقف ہے۔ یہ اپنے حق میں دلیل دے گا' وہ اپنے حق میں دلیل دے گا۔ یہ اُس کی دلیل کو کاٹے گا' وہ اِس کی دلیل کو کاٹے گا۔ یہ مباحثہ ہے۔ اسی طرح مقابلہ کے معنی ہیں ایک دوسرے کے سامنے آنا۔ مقاتلہ کے معنی ہوئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔ جہاد یا

مجاہدہ کیا ہے! جُہد، جُہد سے ٹکرا رہی ہو، کوششوں کا تصادم ہو رہا ہو۔ فارسی میں اس کو کشمکش اور کشاکش سے تعبیر کریں گے۔ جہد کوشش ہے اور جہاد یا مجاہدہ کشمکش یا کشاکش ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے STRUGGLE بالکل صحیح لفظ ہے۔ STRUGGLE یقیناً کسی RESISTANCE کے خلاف ہوتی ہے، کسی مزاحمت کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ اسی لئے اس کے بعد صلہ یعنی PREPOSITION کے طور پر AGAINST آتا ہے۔

اب دیکھئے دنیا میں کیا ہوتا ہے! ایک شخص کا ایک نظریہ ہے، دوسرے کا دوسرا۔ مثال کے طور پر ایک شخص مارکسسٹ ہے، دوسرا شخص مغربی جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کا قائل ہے۔ یہ بھی اخلاص کے ساتھ اپنے نظریئے کا قائل ہے اور وہ بھی اپنے نظریئے میں مخلص ہے۔ ان دونوں کے درمیان تصادم ہو کر رہے گا۔ یہ تصادم پہلے نظریاتی سطح پر ہو گا۔ وہ اپنے IDEA کو PROMOTE کرے گا، یہ اپنے نظریئے کو پھیلائے گا۔ وہ اپنے ہم خیال لوگوں کی جماعت بنائے گا، یہ اپنے ہم خیالوں کی تنظیم بنائے گا۔ پھر ان کے درمیان کشمکش ہو گی۔ جو جیت جائے گا، اس کے نظریہ کے مطابق اس ملک میں نظام قائم ہو جائے گا۔ لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ اگر خلوص کے ساتھ کسی نظریہ کو تسلیم کیا گیا ہو تو اس کے لئے جدّوجہد اور مجاہدہ ناگزیر ہے، لازم ہے۔ اگر نہیں ہو رہا ہے تو قطعی طور پر یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص اپنے نظریئے میں مخلص نہیں ہے۔ مخلص اور صاحبِ کردار انسان ہو گا تو وہ اپنے نظریئے کی دعوت و تبلیغ کے لئے جدوجہد کرے گا اور اسی عمل کا نام جہاد ہے۔ پس اگر کسی شخص کو یقین حاصل ہے اللہ پر، اس کی توحید پر اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن پر اور اسلام پر تو لامحالہ اس کے اس یقین کا ظہور اس کے عمل میں اس طریق سے ہو گا کہ وہ اسلام کے لئے جدّوجہد کرے گا، محنت کرے گا، کوشش کرے گا...... اسلام کو پھیلائے گا، ایمان کی دعوت عام کرے گا۔ اُن لوگوں کو جمع کرے گا جو اسلام کے لئے جان اور مال دینے کے لئے تیار ہوں۔ وہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے STRUGGLE کرے گا۔ اگر ایمانِ حقیقی دل میں ہے تو یہ ہو کر رہے گا اور اگر یہ نہیں ہو رہا ہے تو دلی یقین والا ایمان موجود نہیں ہے۔ یہ ہیں معنی اس کے کہ جہاد رکن ہے ایمان کا۔

اب ذرا جہاد کے جو مراتب اور درجات ہیں ان کو بھی سمجھ لیجئے۔ میں اس کی تعبیر کے لئے عرض کروں گا کہ ایک تین منزلہ عمارت کو ذہن میں رکھئے۔ اس کا پہلا اور اہم ترین درجہ "مجاهده مع النفس" ہے۔ آپ نے اللہ کو مانا ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو

مانتا ہے' قرآن کو مانتا ہے' شریعت کو مانتا ہے لیکن آپ کا نفس آپ کو کسی اور طرف لے جانا چاہ رہا ہے۔ شریعت نے کہا کہ سود حرام ہے' نفس آپ کو ترغیب دے رہا ہے کہ نہیں یہ تو کاروبار کو پھیلانے کے لئے' آگے بڑھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر کاروبار محدود رہے گا اور اس کی توسیع ممکن نہیں ہوگی' نتیجتاً میں معاشی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاؤں گا۔ اب یہ کشمکش آپ کے باطن میں پیدا ہوگی۔ صبح کا وقت ہے' اذان بھی ہو گئی ہے' آپ نے سن بھی لی ہے۔ آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس وقت 'حیّ علی الصّلوۃ' اور 'حیّ علی الفلاح' کی یہ صدا' یہ پکار' یہ CALL اللہ کی طرف سے ہے' للذا اب مسجد کا رخ کرنا اور نماز پڑھنا ہے۔ لیکن نفس کہتا ہے کہ نہیں ابھی سوتے رہو' ابھی آرام کرو' کیوں صبح کی میٹھی نیند کو خراب کرتے ہو۔ تو یہ اور اسی نوع کی کشمکش ہر شخص کے اندر ہر آن ہر وقت ہوتی رہتی ہے' اسے ہر لحظہ ایسی کشمکش سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس میں اگر آپ اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کریں' اُسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع بنائیں' تو یہ کیا ہے! یہ مجاہدہ مع النفس ہے' یہ اپنے اندر کا جہاد ہے۔ اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے افضل اور اعلیٰ ترین جہاد قرار دیا۔ حضورؐ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰه "آپؐ نے فرمایا: اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَکَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ۔ سوال یہ تھا کہ "اے اللہ کے رسولؐ' سب سے افضل' سب سے اعلیٰ جہاد کون سا ہے؟" جواب میں حضورؐ نے فرمایا: "یہ کہ تو اپنے نفس سے کشمکش کرے اور اسے اللہ کا مطیع بنائے"۔ بدقسمتی سے جہاد کا یہ تصوّر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اندر کی شخصیت سے پھر یہ جہاد باہر نکلے گا۔ اب ہو گا "مجاہدہ مع الکفر" — نظریاتی سطح پر آپ ایمان کی دعوت دیجئے۔ کفر' الحاد' مادّہ پرستی' اباحیت کے خلاف تبلیغ' تلقین اور وعظ و نصیحت کیجئے اور دلائل و براہین پیش کیجئے۔ نظریاتی سطح پر اسلام و ایمان کی دعوت اور فروغ کا کام کیجئے۔ ظاہر بات ہے کہ ان کاموں میں مال بھی کھپے گا' جان بھی کھپے گی اور وقت بھی لگے گا۔ اسی وقت کو صرف کر کے آپ پیسہ کما سکتے ہیں لیکن یہ وقت آپ کو دعوت و تبلیغ میں لگانا ہے — تو یہ جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل ہوئی — پہلی مجاہدہ مع النفس اور دوسری مجاہدہ مع الکفر۔

تیسری منزل ہے "مجاہدہ مع الکفّار" ...... بات اب اگر آگے بڑھے گی تو کشمکش ہوگی۔ کفار چاہتے ہیں اپنے نظریئے کا غلبہ اور مومن چاہتا ہے دین کا غلبہ! لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا۔ ان کے مابین پُرامن مفاہمت ناممکن ہے' تصادم ہو کر رہے گا۔ لیکن اس تصادم کے بھی مختلف مراحل ہوں گے۔ اس تصادم کا ابتدائی مرحلہ ہو گا صبرِ محض' جسے

انگریزی میں PASSIVE RESISTANCE کہتے ہیں۔ وہ آپ پر تشدد کریں' آپ کو ستائیں لیکن آپ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں' پیچھے نہ ہٹیں اور پھر جواباً ہاتھ بھی نہ اٹھائیں۔ یہ پہلا مرحلہ ہے لیکن جب طاقت اتنی فراہم ہو چکی ہو کہ آپ جوابی کارروائی بھی کر سکیں تو اس کو ACTIVE RESISTANCE کہیں گے۔ اب آپ بھی اقدام کریں۔ دیکھئے مکہ میں صحابہؓ کو کیا حکم تھا! یہ کہ چاہے تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے' لیٹ جاؤ۔ تم جوابی اقدام نہیں کر سکتے' اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن اس کے بعد وہ وقت آیا کہ ہاتھ کھول دیئے گئے۔ آیت نازل ہو گئی..... اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ یعنی آج سے اجازت دی جا رہی ہے ان کو جن پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے گئے تھے کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں اور اس تصادم مع الکفّار کا آخری درجہ ہے ARMED CONFLICT' یعنی مسلح تصادم اور یہ ہے جہاد کی وہ بلند ترین چوٹی' جہاں پہنچ کر جہاد قتال بن جائے گا ــــ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ۔ مدینہ منورہ میں وہ وقت آیا کہ حکم آ گیا کہ اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی۔

پس یہ تین مراحل ہیں جہاد فی سبیل اللہ کے۔ اس کی غرض و غایت کیا ہو گی! اللہ کے دین کا غلبہ' اللہ کے دین کو قائم کرنا۔ وہ نظام جو اللہ تعالیٰ نے دیا' جو اس تعؒ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا' جو قرآن نے دیا' اسے بالفعل نافذ کرنا۔ اس کے لئے پہلے مجاہدہ مع النفس ہے۔ اپنے اندر جو خدا کا دشمن ہے' اسے زیر کرو..... پھر مجاہدہ مع الکفر ہے۔ نظریاتی سطح پر اسلام و ایمان کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کرو۔ پھر مجاہدہ مع الکفار ہے' جس میں صبرِ محض' اقدام اور وقت آنے پر مسلح تصادم کے مراحل ہیں۔

اور یہ جان لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی راہ میں جان دینے کی آرزو رکھنے کو بھی ایمان کا ایک اہم ترین رکن قرار دیا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ جنگ ہر وقت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دل میں حقیقی ایمان ہے تو یہ تمنا موجود رہنی چاہئے کہ کاش میری زندگی میں وہ وقت آئے کہ خالصتاً قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آئے اور میں اس میں اپنی گردن کٹا کر اللہ تعالیٰ کی جناب میں سرخرو اور سبکدوش ہو جاؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی موت اس حال میں واقع ہوئی کہ اس کے دل میں شہادت کی تمنّا نہ تھی فَقَدْ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ۔ "تو اس شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی" ــــ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو شوقِ شہادت سے معمور فرمائے۔

جہاد شروع تو مجاہدہ مع النفس سے ہوتا ہے لیکن اس کی آخری منزل وہی قتال فی سبیل اللہ

ہوگی۔ یہ نگاہ سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اگرچہ اس کی کچھ شرائط ہیں' وہ پوری ہوں گی تو آپ
وہاں تک پہنچیں گے' چھلانگ لگا کر وہاں نہیں پہنچ سکتے۔ سارے مراحل طے کریں گے تو
وہاں تک پہنچیں گے' لیکن یہ آرزو دل میں رہنا کہ ہماری زندگی میں وہ مرحلہ بھی آئے' ایمان
کی شرطِ لازم ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ پس ایمان کے دو رکن ہیں جو اس آیت
مبارکہ کے حوالے سے آج ہمارے سامنے آئے۔ اب آپ جمع کر لیجئے۔ جب اسلام اور
ایمان دونوں یکجا ہو جائیں گے تو گویا اقرار باللسان بھی ہو گا اور تصدیق بالقلب بھی۔ نماز'
روزہ' حج اور زکوٰۃ اسلام کے ارکان کی حیثیت سے ہوں گے اور شک و شبہ سے مبرّا ایمان دل
میں اور جہاد فی سبیل اللہ بالنفس وبالمال عمل میں' یہ ایمان کے ارکان کی حیثیت سے ہوں گے
اور اس طرح گویا ایک بندۂ مومن کی شخصیت مکمل ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس نقشے پر
پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے ___ اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے' اس کے بارے میں کوئی
وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں ___

سوال و جواب

○ _س: ڈاکٹر صاحب جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟

☆ ___ ج ___ میں نے جو بات آج عرض کی ہے' میں سمجھتا ہوں کہ مسئلہ اس سے واضح ہو
جانا چاہئے تھا کہ جہاں تک جہاد کا تعلق ہے وہ فرضِ عین ہے' وہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ جسے
ہم فرضِ کفایہ کہتے ہیں۔ وہ قتال یعنی جنگ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جنگ کسی نظم کے تحت
لڑی جائے گی اور کسی خاص موقع پر جتنے لوگوں کی ضرورت ہے اگر اتنے فراہم ہو گئے تو ضرورت
پوری ہو جائے گی۔ مثلاً ایک مہم کے لئے دس ہزار کی نفری درکار ہے۔ اب اگر دس ہزار آدمی
آ گئے تو باقی سب کی طرف سے گویا وہ اس فریضہ کو ادا کر رہے ہیں۔ اگر ضرورت پوری ہو گئی تو
سب کی طرف سے فرض ادا ہو جائے گا۔ فرضِ کفایہ اسی کو کہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی وقت ایسا
ہو کہ اتنا بڑا مرحلہ پیش آ جائے کہ سب کو نکلنے کا حکم مل جائے' جیسے غزوۂ تبوک کے موقع پر
نفیرِ عام ہوئی' تو پھر ہر مسلمان کے لئے وہ فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ لیکن قتال یعنی جنگ ہر حال
میں فرضِ عین نہیں ہے۔ البتہ جہاد یعنی دین پر عمل کرنے کے لئے کوشش اور دعوت و تبلیغ
کے لئے محنت کرنا تو ہر مسلمان کے لئے ہر حالت میں فرضِ عین ہے۔

○ ___ س ___ ڈاکٹر صاحب' اغیار الزام لگاتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا' اس کا صحیح
جواب کیا ہے؟۔

☆ ج ــــ اس الزام میں کوئی صداقت نہیں ہے' یہ بالکل غلط ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اسلام کے اجتماعی نظام کے قیام میں تلوار کو دخل حاصل ہے' لیکن اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نشرواشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ انقلاب برپا کرنا یعنی پہلے سے قائم شدہ کسی نظام کو ختم کر کے دوسرا نظام قائم کرنا' یہ دنیا میں آج تک بغیر کسی مسلح تصادم کے نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کہ وہ نظام جو پہلے سے قائم ہوتا ہے' وہ اپنا تحفّظ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک مخصوص طبقے کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ کچھ لوگوں کے VESTED INTERESTS ہوتے ہیں۔ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ دوسرا نظام آئے جس سے ان کے ناجائز مفادات ختم ہو جائیں۔ وہ چاہے انقلابِ فرانس ہو چاہے وہ بالشویک انقلاب ہو اور چاہے وہ انقلابِ محمدی ہو' علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام' ان میں تلوار اٹھی ہے۔ لیکن یہ ہے انقلاب کا معاملہ۔ نظام کی تبدیلی اور نئے نظام کو قائم کرنے کا معاملہ ــــ ایک ہے لوگوں کو اسلام کی دعوت و تلقین کرنا' اس کے لئے کبھی تلوار نہیں اٹھی۔ اس میں کبھی جبر نہیں ہوا اور نہ کبھی جبر ہو گا۔ قرآن مجید میں وضاحت موجود ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ - دین کے معاملہ میں کبھی جبر سے کام نہیں لیا جائے گا۔ یہ لوگوں کی آزاد مرضی سے متعلق معاملہ ہے۔ جو لوگ اسلام کی حقانیت کے قائل ہو کر اسے قبول کر لیں گے' وہ اسلامی معاشرے میں شامل ہو جائیں گے۔ البتہ جہاں تک اسلام کے مبنی بر عدل و قسط نظامِ اجتماعی کا معاملہ ہے تو اس کو برپا کرنے کے لئے طاغوتی اور باطل نظاموں کے حامیوں سے بوقتِ ضرورت قتال کیا جائے گا ــــ لہٰذا ان دونوں چیزوں کو علیحدہ علیحدہ کر لیں گے تو مسئلہ بالکل نکھر کر سمجھ میں آجائے گا۔

حضرات! آج ہم نے خاص طور پر جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں سمجھی ہیں۔ اہم ترین یہ کہ جہاد ایمان کا رکنِ لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یقینِ قلبی والا ایمان بھی عطا فرمائے اور جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی توانائیوں' اپنی قوتوں' اپنی صلاحیتوں' اپنے اوقات اور اپنے مالی وسائل کو صرف کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صلىّ الله عليه وسلّم وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صلىّ الله عليه وسلّم وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ

آمین یا ربَّ العٰلمین۔

قارئین ندا متوجہ ہوں!

رفقاء تنظیم میں سے اُن احباب سے جو ندا کے باقاعدہ قاری ہیں

اور ـــــــ

یہ جانتے ہوئے بھی ـــــــ کہ اس پرچے کی حیثیت تنظیم اسلامی کے باقاعدہ آرگن کی نہیں ہے بلکہ اب یہ ایک آزاد سیاسی ہفت روزہ ہے جو سیاسی معاملات میں تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم کے موقف سے بالکلیہ اتفاق بھی کرتا ہے بلکہ اس موقف کو فروغ دینے اور تنظیم اسلامی کو ایک وسیع تر حلقے میں متعارف کرانے کے لیے کوشاں بھی ہیں ـــــــ پرچے کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں اور پرچے کی بقا اور اس کے فروغ کے خواہاں ہیں۔

یہ گزارش ہے کہ وہ:

(ا) پرچے کی باقاعدہ خریداری قبول کریں۔ اگر کسی کے لیے سالانہ زرتعاون یکمشت ادا کرنا ممکن نہ ہو تو ششماہی یا سہ ماہی بنیادوں پر خریداری قبول کریں۔

تاکہ

پرچے کے مستقل خریداروں کی تعداد میں اضافے سے پرچے کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم ہو سکے ـــــــ اور تاکہ ـــــــ مستقل خریداروں کے معاملے میں نیوز ایجنٹ کا معاملہ درمیان سے نکل جائے اور اس طرح ایجنٹ کو پرچہ ارسال کرنے کے اضافی اخراجات اور بے حساب واپسی کے سلسلے کو کم سے کم کیا جا سکے۔

(ii) اپنے حلقہ احباب میں پرچے کو زیادہ سے زیادہ متعارف کرائیں اور انہیں بک سٹالوں سے پرچہ خریدنے پر آمادہ کریں۔

تاکہ

پرچے کی سرکولیشن میں اضافے کے ساتھ ساتھ بک سٹال والوں کی حوصلہ افزائی بھی ہو اور نیوز ایجنٹ سے رابطہ بھی نہ ٹوٹے

نوٹ: پرچے کا سالانہ زرتعاون -/۲۵۰ روپے، ششماہی -/۱۳۰ روپے اور سہ ماہی -/۷۰ روپے ہے۔

منجانب: ناظم الامور، ہفت روزہ 'ندا'، لاہور

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بحیثیت
داعئ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد
کا ایک پُر تاثیر اور فکر انگیز خطاب

ترتیب و تسوید (شیخ) جمیل الرحمٰن

(۴)

پانچواں مرحلہ ۔ اقدام

اس پانچویں مرحلے یعنی اقدام (ACTIVE RESISTANCE) کے ساتھ ہجرت کے مرحلے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے کہ اقدام کے لئے ایک مرکز (BASE) کی ضرورت ہے، جہاں سے انقلابی دعوت کی کامیابی اور غلبے کے لئے پیش قدمی کی جاسکے۔ آخر توپ چلانے کے لئے بھی تو جگہ درکار ہوتی ہے' جہاں اسے نصب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب داعی کو یہ محسوس ہو کہ اتنی طاقت مہیا ہو گئی ہے اور وہ آزمائش کی بھٹیوں سے گزر کر اتنی پختہ بھی ہو گئی ہے کہ باطل نظام پر مؤثر وار کیا جاسکتا ہے تو لازمی طور پر اسے ایک مرکز کی تلاش ہوتی ہے ۔ میری رائے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طائف کا سفر اسی مقصد کے لئے تھا' چونکہ مکہ کے بعد قریب ترین دوسرا بڑا شہر طائف ہی تھا۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اجتہادی فیصلہ تھا۔ یہ فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ نبوی میں اس وقت کیا جب مشرکین مکہ نے دارالندوہ میں حضورؐ کے قتل تک کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آپؐ کے اس فیصلہ کی تصویب یا اصلاح وحئ جلی یا وحئ خفی کے ذریعے سے نہیں ہوئی۔ گویا اللہ تعالٰی کی مشیت یہ تھی کہ طائف والے بھی ہمارے رسول (صلی اللہ

علیہ وسلم) کے صبر و ثبات اور عزیمت و استقامت کی خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر لیں ۔ چنانچہ طائف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک دن میں وہ سلوک ہوا جو مکی دور کے دس برس میں نہیں ہوا تھا۔ اس کی مختصر روداد میں پہلے بیان کر چکا ہوں ۔

<u>یثرب کی طرف سے کھڑکی کھلتی ہے</u> : طائف کے نصیب میں قسام ازل نے یہ سعادت نہیں رکھی تھی کہ وہ دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے پانچویں مرحلے ' اقدام کے لئے مرکز بنتا ۔ اللہ تعالےٰ کی مشیتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ میں یہ بات طے شدہ تھی کہ " مدینۃ النبیؐ " بننے کی سعادت " یثرب " کے حصے میں آئے گی ۔ حالانکہ طائف کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس دعوت و تبلیغ کے لئے تشریف لے گئے تھے، مگر وہاں دعوت قبول کرنا تو درکنار کوئی اس پر کان دھرنے کو بھی تیار نہیں ہوا ۔ اور آپؐ کے ساتھ انتہائی تعذیب کا معاملہ کیا گیا۔ لیکن ادھر اللہ تعالےٰ نے یثرب کی طرف سے کھڑکی کھول دی ۔ اسی سال یعنی ۱۰ھ نبوی میں حج کے موقع پر یثرب کے چھ حضرات دولتِ ایمان سے مالا مال اور شاد کام ہوئے ۔ اگلے سال ان چھ میں سے پانچ دوبارہ آئے اور سات مزید افراد کو ساتھ لے آئے جن کو انہوں نے اپنی دعوت و تبلیغ سے مسلمان کر لیا تھا ۔ چنانچہ اس مرتبہ بارہ حضرات نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی ۔ ان حضرات کی درخواست پر توحید کی انقلابی دعوت اہلِ یثرب کے سامنے قرآن مجید کے ذریعے سے پیش کرنے کے لئے حضورؐ نے حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت عبداللہ بن امِ مکتوم رضی اللہ تعالےٰ عنہما کو یثرب بھیج دیا ۔ قرآن حکیم کے اعجاز ، توحید کی انقلابی دعوت کی تاثیر اور ان دو جان نثاروں کی مخلصانہ جدوجہد کا ثمرہ اگلے سال (۱۲ھ نبوی میں) حج کے موقع پر ظاہر ہو گیا اور بہتر ۷۲ مرد اور تین خواتین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی ۔ کتبِ سیر و احادیث میں " بیعتِ عقبہ ثانیہ " کے عنوان سے اس بیعت کے جملہ کوائف محفوظ ہیں اور جن امور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن پچھتر ۷۵ اہلِ ایمان سے بیعت لی تھی اس کی تفصیل حضرت عبادہؓ بن الصامت کی حدیث میں موجود ہے ۔ جس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے جلیل القدر محدثین نے اپنی اپنی صحیح ' میں روایت کیا ہے اور جو میں آپ کو پہلے سنا چکا ہوں ۔ یہاں یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیجئے کہ اس " بیعتِ عقبہ ثانیہ " کو انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ میں ایک اہم نشانِ راہ کی حیثیت حاصل ہے ۔ اور یہ ہے سیرتِ مطہرہ کا وہ اہم موڑ (TURNING POINT) جس کی وجہ سے یثرب کو ' مدینۃ النبیؐ ' اور دار الہجرت بننے کی سعادت نصیب ہوئی اور انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک BASE مہیا ہوئی ۔

ایک لمحہ فکریہ: آگے بڑھنے سے قبل میں ایک ضمنی لیکن اہم بات کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں ورنہ آج کی تقریر میں ایک خلا رہ جائے گا ۔ وہ بات یہ ہے کہ پانچویں مرحلے یعنی ہجرت و اقدام، کا فیصلہ انبیاء و رسل علیہم السّلام کے لئے خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور اس فیصلے سے وہ وحیِ متلو (یعنی کتاب) یا وحیِ غیر متلو (یعنی کشف، القاء، الہام اور رویائے صادقہ) کے ذریعے انہیں مطلع فرماتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یثرب کی طرف خود بنفسِ نفیس ہجرت اُس وقت فرمائی ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت آگئی۔ اس کی تفاصیل سیرتِ مبارکہ کی تمام مستند کتب میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح مدینہ منوّرہ پہنچ کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو اقدامات فرمائے، ان کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ قدم قدم پر آپؐ کی رہنمائی وحیِ متلو (قرآن مجید) اور وحیِ غیر متلو کے ذریعہ سے فرماتے رہے ہیں۔

لیکن مابعد کا معاملہ مختلف ہے۔ نبوّت و رسالت کا اکمال و اتمام حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس پر ہوگیا، اب تا قیامِ قیامت کسی نوع کا نبی نہیں آئے گا۔ ان حالات میں جبکہ دشمنانِ اسلام کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث اور خود مسلمانوں کی اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کے سبب سے اسلام بالفعل زوال و انحطاط سے دوچار ہوگیا ہے، جو بھی اسلامی احیائی تحریکیں اٹھتی ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ماضی میں بھی ان تحریکوں کی قیادت کی ذمّہ داری رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کسی امّتی ہی نے ادا کی ہے، موجودہ دور میں بھی امّتی ہی یہ فریضہ ادا کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور آئندہ بھی یہ کام کسی امّتی ہی کے ہاتھوں ہوگا۔ لہٰذا جان لیجئے کہ کوئی امّتی بھی معصوم عن الخطا نہ پہلے گزرا ہے، نہ آج موجود ہے، نہ قیامت تک ہوگا۔ معصومیت خاصّۂ نبوّت ہے، نبوّت ختم ہوئی تو معصومیت بھی ختم ہوئی۔ اب تجدیدِ دین، احیائے اسلام اور دورِ جدید کی اصطلاح کے مطابق اسلامی انقلاب کی جو تحریک بھی برپا ہوگی، اس کے پانچویں مرحلے یعنی اقدام (جس کے ساتھ ہجرت بھی شامل ہے) اور چھٹے اور آخری مرحلے یعنی مسلّح تصادم (ARMED CONFLICT) کا معاملہ — جس کا ذکر اختصار کے ساتھ آگے آئے گا — اجتہادی ہوگا۔ پھر اس اجتہاد میں خطا کا امکان رہے گا۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا، کسے باشد، کہ اس سے خطا کا صدور ممکن نہیں ہے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا، یا کسی نے کسی کے متعلق ایسا یقین رکھا تو وہ اہل السنّۃ والجماعۃ کے دائرے سے خارج ہوجائے گا۔

ایک اطمینان بخش بات: البتہ الصّادق والمصدوق جناب محمد رسول اللہ الامّی الاُمّی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک

ارشادِ مبارک کے مطابق اہلِ سنّت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ نیک نیت، خدا ترس، متقی مجتہد اگر مصیب ہے، یعنی اس نے صحیح صحیح اجتہاد کیا ہے تو وہ آخرت میں دوہرا اجر و ثواب پائے گا، لیکن اگر مخطی ہے یعنی اس سے نیک نیتی کے ساتھ اجتہاد میں خطا ہوئی ہے تو اسے عدالتِ اخروی میں اکہرا ثواب ملے گا۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کے داعیان سے اسلامی انقلاب کے کسی مرحلے میں نیک نیتی سے کسی اجتہادی غلطی کا صدور ہو گیا، جیسے پوری تیاری کے بغیر عملی اقدام کر دیا گیا۔ یا حالات کے صحیح تجزیہ و مطالعہ میں خطا ہو گئی تو اسباب و علل کی اس دنیا میں اس کا نتیجہ تحریک کی ناکامی کی صورت میں نکلے گا۔ البتہ ان کا اخروی اجر و ثواب ان شاء اللہ ضائع نہیں ہو گا۔

<u>تحریکِ شہیدینؒ کی مثال</u>: آج قریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد ہم تحریکِ شہیدینؒ کے معروضی مطالعے کے بعد یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ان پاک طینت مومنینِ صادقین سے سرحد کے رہنے والے مسلمانوں کے بارے میں رائے قائم کرنے اور ان پر پورا اعتماد کرنے کے باب میں اجتہادی غلطی ہوئی، جس کے نتیجے میں یہ تحریک خالص دنیوی نقطۂ نظر سے ناکام ہو گئی۔ میں نے اپنا یہ تأثر بارہا بیان کیا ہے کہ دورِ صحابہ کرامؓ کے بعد ایک خالص اسلامی تحریک ہونے کے اعتبار سے تحریکِ شہیدین کے ہم پلّہ مجھے کوئی دوسری تحریک نظر نہیں آتی۔ اس تحریک کے قائد تھے بطلِ جلیل، پیکرِ تقویٰ، صحابہ کرامؓ کی سیرت کا نمونہ اور اخلاص و للّٰہیت کا خورشید تاباں، جناب سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دستِ راست تھے حضرت مولوی شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ۔ مجدّدِ وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے، جو تقویٰ اور تدیّن کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے آسمانِ علمِ دین کے مہرِ درخشاں، بے مثال عالم، محدّث، فقیہہ اور منقولات و معقولات کا حسین پیکر تھے۔ علاوہ ازیں اس تحریک میں سیّد شہیدؒ کی قیادت میں جو مجاہدین ہندوستان سے خالصۃً سکھوں کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کے مقصدِ اعلیٰ کے لئے ہجرت کر کے ایک نہایت طویل، کٹھن اور جاں گسل دشواریاں عبور کر کے سرحد پہنچے تھے، ان میں ہر ایک برّ و تقویٰ کے آسمان کا روشن ستارہ تھا۔ ہجرت کے سفر کے دوران جناب سیّد احمد بریلوی، جناب شاہ اسمٰعیل اور دوسرے بہت سے مرشدین رحمۃ اللہ علیہم قافلے میں شریک مہاجرین و مجاہدین کی تربیت و تزکیہ کرتے رہے تھے۔ اس اعتبار سے یہ پورا قافلہ اس مرحلے سے گزرتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن سرحد پہنچ کر اقدام سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں کے تربیت و تزکیہ کی بھی ضرورت تھی۔ ان کے عقائد، ان کے اعمال اور ان کے اخلاق کی تصحیح کے لئے کافی محنت

ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ سید احمد شہیدؒ نے حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے مقامی پٹھانوں کو سچا اور پکا مسلمان سمجھ کر ایک طرف اسلامی شریعت کی تمام حدود و تعزیرات نافذ کردیں جو ان لوگوں کے لئے بڑی شاق تھیں۔ چونکہ وہ لوگ ایک مدت سے دین کے صحیح و حقیقی علم سے ناواقف تھے اور وہ اگرچہ مسلمان تھے لیکن ان کی بڑی اکثریت حقیقی ایمان کی لذت آشنا نہیں تھی ـــــ دوسری طرف سکھوں کے خلاف جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی باشندوں کی اکثریت نے سید صاحبؒ کا نہ صرف ساتھ چھوڑ دیا بلکہ بعض بااثر خوانین نے ان کے خلاف سازشیں کیں۔ سید صاحب کو زہر دے کر شہید کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں کے علمائے سُو نے فتوے جاری کر دیئے کہ ہندوستان سے آنے والے یہ لوگ وہابی ہیں، گستاخِ رسولؐ ہیں، مرتد ہیں، واجب القتل ہیں۔ چنانچہ خود مقامی لوگوں نے مجاہدین کے کیمپوں پر شب خون مارے اور بے شمار مجاہدین کو شہید کر ڈالا۔ انہی لوگوں نے مجاہدین کے خلاف مخبری کی اور سکھوں کو مجاہدین کے لشکر کی نقل و حرکت اور اس کی قوت و وسائل کی خبریں پہنچائیں۔ الغرض مقامی لوگوں کی اکثریت کی ناپختہ سیرت و کردار اور عدم تربیت و تزکیہ کے باعث یہ عظیم اسلامی تحریک دنیوی اعتبار سے ناکام ہوگئی ـــــ لیکن ان مجاہدین رحمہم اللہ کا اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے جس کی تمنا اور آرزو ہر مومنِ صادق کرتا ہے۔

ضمنی مسئلہ پہ بات خاصی طویل ہوگئی۔ لیکن اس کی اس اعتبار سے افادیت ہے کہ یہ بات سامنے رہے کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے دعوت، تنظیم اور تربیت کی کیا اہمیت ہے! نیز یہ کہ اب جو لوگ بھی اسلامی انقلاب کی تحریک برپا کرنے کے لئے کوشاں ہوں گے، ان سے مراحلِ انقلاب، خاص طور پر اقدام و تصادم کے مرحلوں کے ضمن میں، نیک نیتی سے بھی اجتہادی خطا ہونے کا پورا پورا امکان و احتمال موجود ہے۔ لیکن ان شاء اللہ وہ اس پر بھی آخرت میں ماجور ہوں گے ـــــ اب آیئے اس بات کی طرف کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے فوراً بعد وہ کون سے کام سرانجام فرمائے جن کو اسلامی انقلاب کے ضمن میں "اقدام" (ACTIVE RESISTANCE) قرار دیا جائے گا۔ اور وہ کیا حالات اور اسباب تھے جن کے باعث اس اقدام نے مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) کی صورت اختیار کی۔

مرحلہ "اقدام" کی چند تفاصیل

بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے موقع پر انصارِ مدینہ نے آنحضورؐ سے عرض کیا تھا کہ مکہ والے آپؐ کے خون کے پیاسے ہیں، لہٰذا آپؐ مدینہ تشریف لے چلئے۔ اگر وہاں حملہ ہوگا تو ہم آپؐ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کی اس پیش کش کے پیشِ نظر اوّل اوّل مکہ کے اہلِ ایمان کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ اکثر صحابہ کرامؓ نے ہجرت شروع کردی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکمِ الٰہی کے منتظر رہے۔ جیسے ہی اجازت آگئی آپؐ نے بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیّت میں مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

حضورؐ کی مدینہ میں تشریف آوری سفرِ ہجرت میں کم از کم ۲۰ دن لگے اور ۱۲ ربیع الاوّل سنہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منوّرہ میں بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ورودِ مسعود ہوا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے انقلاب کی پیش قدمی کیلئے BASE عطا فرمادی، ایک مرکز عنایت فرمادیا۔ راست اقدام کا مرحلہ دراصل ہجرت کے متصلاً ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ اثنائے سفر ہی میں یہ آیات نازل ہوگئیں: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ (الحج: ۳۹، ۴۰) "اُن لوگوں کو جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے جن سے جنگ کی جاتی تھی، اس واسطے کہ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، (جن کے ہاتھ آج تک بندھے ہوئے تھے، ان کے ہاتھ اب کھول دیئے گئے) اور بے شک اللہ ان لوگوں کی نصرت پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ صرف اس جرمِ قصور کی پاداش میں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب صرف اللہ ہے"۔ اس طرح گویا اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو قتال کا اذن مل گیا۔

مدینہ میں حضورؐ کے اقدامات بغرضِ استحکام داعیٔ انقلاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لاکر ٹھنڈی چھاؤں میں آرام نہیں فرمایا۔ مستشرقین اور مغربی مؤرخین کی ہرزہ سرائی دیکھئے کہ وہ ہجرت کا ترجمہ کرتے ہیں "FLIGHT TO MADINAH" "یعنی مدینہ کی طرف فرار" — معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ ہجرت دراصل عنوان ہے

اس کا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ اور آپؐ کے اعوان و انصار کو اسلامی انقلاب کی تحریک کی پیش قدمی اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک مرکز عطا فرما دیا ـــ یہاں آکر آپؐ کو دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مدینہ میں عربی النسل دو بڑے قبیلے اوس و خزرج آباد تھے، جن کے بڑے بڑے سردار اور رؤسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے قبل ہی آپؐ پر ایمان لا چکے تھے۔ ان قبیلوں کی عظیم اکثریت بھی مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی۔ تین یہودی قبیلے بھی مدینہ آکر آباد ہو گئے تھے لیکن ان کو مالکانِ دہ کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ نبی اکرمؐ نے مدینہ تشریف لاکر چھ ماہ تک مکہ کی طرف کوئی اقدام نہیں فرمایا بلکہ ان چھ مہینوں کا عرصہ داخلی استحکام پر صرف فرمایا۔

پہلا اور فوری اقدام اقامتِ صلوٰۃ سے متعلق تھا۔ چنانچہ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کے لئے جگہ کا انتخاب، اس کا حصول اور پھر تعمیر کا آغاز ہوا۔ اس تعمیر کا یہ پہلو ضرور سامنے رکھئے کہ محبوب ربّ العٰلمین، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس میں بنفسِ نفیس شریک رہے اور آپؐ اپنے دستِ مبارک سے گارا اور پتھر اٹھاتے رہے۔ یوں سمجھئے کہ آپؐ نے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر میں ایک مزدور اور کارکن کی حیثیت سے حصہ لے کر اپنے آباء و اجداد کی اس سنت کی تجدید فرمائی: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ط ـــ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کی صورت میں ایک مرکز بن گیا۔ یہ پنجگانہ صلوٰۃ کی ادائیگی کے لئے مسجد بھی تھی۔ یہی درس گاہِ نبویؐ بھی تھی اور یہی اسلامی حکومت کا دارُالشوریٰ اور ایوانِ عام بھی تھا۔

دوسرا اقدام جو آپؐ نے فرمایا وہ مہاجرین و انصار میں مؤاخات قائم کرنے کا کام تھا تاکہ مہاجرین مدینہ کی آبادی میں مدغم اور ضم ہو جائیں اور وہ اس معاشرہ میں علیحدہ طبقہ کی حیثیت سے رہنے کے بجائے اس کا جزوِ لاینفک بن جائیں۔ آپؐ نے مہاجرین کے انصار کے ساتھ بالکل سگے بھائیوں کی طرح رشتے کرا دیئے۔ مؤاخات کا یہ معاملہ سیرتِ مطہرہ کا بڑا تابناک اور روشن باب ہے۔ ایسی کوئی دوسری مثال شاید ہی تاریخ سے مل سکے۔

تیسرا اقدام مدینہ کے داخلی استحکام سے متعلق تھا۔ یہودیوں کے جو تین قبیلے مدینہ میں آباد تھے وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود بہت بااثر، طاقت ور اور خوش حال تھے۔ مدینہ کے اقتصادی شعبے پر ان کا اپنے سرمائے، تنظیم اور تعلیم کی وجہ سے بڑا گہرا تسلط (HOLD) تھا۔ ان کی قلعہ نما گڑھیاں موجود تھیں جن میں کافی اسلحہ اور ساز و سامان جمع تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی دور اندیشی، معاملہ فہمی، فراست اور تدبر کا یہ شاہکار ہے کہ آپؐ نے ان تینوں قبیلوں کو معاہدوں کا پابند بنا لیا۔ ان معاہدوں کے اہم نکات یہ تھے کہ یہود اپنے مذہب پر قائم رہیں گے، ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے اور اگر کبھی مدینہ پر کسی کی طرف سے حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کے حلیف کی حیثیت سے ساتھ دیں گے یا بالکل غیر جانبدار رہیں گے۔ اگرچہ بعد میں یہود اسلام کی اشاعت، اس کے فروغ اور استحکام کو دیکھ کر انگاروں پر لوٹتے رہے اور پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہے، ان کی مشرکینِ مکہ سے بھی ساز باز رہی، لیکن یہ سب کچھ وہ چوری چھپے کرتے رہے۔ وہ علی الاعلان مقابلے میں نہیں آ سکتے تھے، چونکہ معاہدے میں جکڑے ہوئے تھے۔

نبیٔ اکرمؐ کے اقدام کی نوعیت

اب اس بات کو بھی سیرتِ مطہرہ سے جان لیجئے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مدینہ میں تشریف آوری کے بعد چھ مہینے (ربیع الاوّل تا رمضان المبارک سنہ ۱ھ) داخلی استحکام میں صرف فرما کر، دورانِ سفر ہجرت میں مشرکینِ مکہ کے خلاف اقدام کی جو اجازت اس آیت کی رُو سے ملی تھی کہ "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا" اس پر کس طور پر عمل فرمایا اور اور اس کے ضمن میں کیا اقدام فرمائے۔! دیکھئے کوئی بھی نظام ہو، وہ ایک وحدت ہوتا ہے اس کے تمام اجزاء باہم مربوط ہوتے ہیں، اس کی کسی بھی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑنا اس نظام کے لئے چیلنج ہوتا ہے۔ داخلی استحکام سے فارغ ہو کر حضورؐ نے مکہ کے مشرکین کے خلاف آٹھ مہمیں روانہ فرمائیں۔ جن میں سے چار میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم بنفسِ نفیس سپہ سالار اور قائدِ لشکر تھے۔ حضورؐ جس مہم میں خود شرکت فرمائیں، اسے اسلامی اصطلاح میں 'غزوہ' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ چار غزوات کی قیادت خود حضورؐ نے فرمائی اور چار مہمیں کسی صحابیؓ کو قائد یا سپہ سالار مقرر فرما کر روانہ فرمائیں۔ ایسی مہمات کو جن میں حضورؐ بذاتِ خود شریک نہ ہوں اور کوئی صحابی سپہ سالار یا امیرِ لشکر ہوں 'سرایا' کہا جاتا ہے۔ یہ آٹھوں مہمیں غزوۂ بدر سے قبل کی ہیں۔ ہمارا عام تصوّر یہ ہے کہ آنحضورؐ کا پہلا غزوہ، غزوۂ بدر ہے۔ یقیناً پہلی باقاعدہ جنگ غزوۂ بدر ہی ہے، لیکن غزوۂ بدر سے پہلے جو آٹھ مہمیں بھیجی گئیں ان میں چار غزوات اور چار سرایا کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان آٹھ مہموں کے حالات و واقعات کے متعلق ہمارے اکثر سیرت نگاروں اور مؤرخوں نے نہایت ایجاز و اجمال سے کام لیا ہے۔ حالانکہ یہ نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد کا وہ اہم اور نازک (CRITICAL AND CRUCIAL) مرحلہ ہے جس میں اقدام اور پیش قدمی آپؐ کی جانب سے ہو رہی ہے، یا بالفاظِ دیگر صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) کا مرحلہ اب 'راست اقدام' (ACTIVE RESISTANCE) میں تبدیل ہو رہا ہے۔ ان ہی آٹھ مہمات کا نتیجہ تھا کہ سانپ بل سے باہر نکلا اور مشرکین مکہ کا ایک ہزار کا کیل کانٹے سے لیس لشکر میدانِ بدر میں مسلمانوں کے قریباً بے سروسامان تین سو تیرہ جان نثاروں کی نفری سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

اس اقدام کی غرض و غایت

اب آپ اس راست اقدام کی غرض و غایت سمجھ لیجئے۔ اس کو جدید دور کی دو اصطلاحات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے خلاف جو اقدام کیا، اس کے دو مقصد سامنے آتے ہیں۔ پہلا مقصد تھا قریش کی "معاشی ناکہ بندی" جسے ہمارے اس دور کی اصطلاح میں "ECONOMIC BLOCKADE" کہا جاتا ہے۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ قریش کی معاشی زندگی کا دارومدار تجارت پر تھا۔ مکہ اور اس کے اطراف و جوانب کو قرآن نے "بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ" بیان کیا ہے، وہاں کسی نوع کی پیداوار تھی ہی نہیں۔ وہ غذائی اجناس کے لئے باہر کی منڈیوں کے محتاج تھے، جس کے لئے وہ تجارت کیا کرتے تھے، ان کا ایک سفر تجارتی سازوسامان کی خرید و فروخت کے لئے یمن کے ساحل سے شام کے ساحل کی طرف ہوتا تھا، جبکہ دوسرا سفر شام کے ساحل سے مشرقی یورپ اور شام و فلسطین سے سازوسامان خرید کر یمن کے ساحل تک پہنچانے کے لئے ہوتا تھا۔ اس دوطرفہ تجارت کے منافع سے وہ اپنے لئے غذائی اجناس، کپڑے، ظروف اور دیگر ضروریات کی چیزیں خریدتے تھے۔ قریش کے قافلے شام کی طرف بدر کے قریب سے گزرتے، جو مدینہ سے قریباً اسی میل کے فاصلے پر تھا۔ یمن کی طرف قافلے طائف سے گزر کر جاتے تھے۔ یہ راستہ مدینہ سے قریباً تین سو میل سے بھی زیادہ دور تھا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ کعبۃ اللہ کی وجہ سے جہاں عرب قبائل کے بت رکھے ہوئے تھے قریش کو پورے عرب میں مذہبی قیادت و سیادت حاصل تھی۔ چنانچہ دوسرے عرب قبائل اور خاص طور پر بدو جن میں سے اکثر کا پیشہ ہی لوٹ مار تھا، قریش کے قافلوں پر بالکل تاخت نہیں کرتے تھے اور ہر دو اطراف میں ان کے قافلے امن و امان سے آتے جاتے رہتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آٹھ مہمیں بھیج کر قریش پر اپنی 'موجودگی' ثابت کر دی اور ان کے دونوں اطراف آنے جانے

والے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنا دیا۔ گویا ان کی رگِ جاں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا جسے میں جدید دور کی اصطلاح کے حوالے سے قریش کی "معاشی ناکہ بندی" سے تعبیر کرتا ہوں۔

ان مہمات کا دوسرا مقصد سیاسی طور پر قریش کو گرد و نواح کے قبائل سے منقطع (ISOLATE) کرنا تھا یعنی مکہ اور مدینہ کے درمیان کے علاقہ میں جو قبائل آباد ہیں یا تو ان کو اپنا حلیف بنا لیا جائے یا ان کو غیر جانب دار کر لیا جائے کہ تم جنگ کی صورت میں نہ ہمارے خلاف قریش کی مدد کرو اور نہ قریش کے خلاف ہمارا ساتھ دو۔ بعض قبائل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس بارہ روز تک قیام بھی فرمایا اور معاہدوں کی گفت و شنید کے ساتھ اسلام کی دعوت بھی پیش فرمائی۔ یہ قبائل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ اخلاق، کریمانہ و مشفقانہ سلوک اور حسنِ تدبیر سے بہت متاثر ہوئے اور اکثر نے حضورؐ کی تجاویز سے اتفاق کرتے ہوئے معاہدے کر لئے۔ سیاسی طور پر یہ آپ کی بڑی زبردست کامیابی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اقدام کو میں دورِ جدید کی اصطلاح کے حوالے سے قریش کے سیاسی رسوخ میں محدودیت اور دوسرے قبائل سے حلیفانہ تعلق کے انقطاع (POLITICAL CONTAMINATION AND ISOLATION) سے تعبیر کرتا ہوں

دو اہم واقعات ان آٹھ مہموں کی مختصر روداد پیش کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ دو اہم واقعات آپ کو سنا دوں جو اس دوران پیش آئے ــــ ایک واقعہ تو ان مہمات کے آغاز سے پہلے کا ہے جب آپؐ داخلی استحکام کی طرف متوجہ تھے۔ ہوا یہ کہ رئیسِ اوس حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مکہ گئے۔ ابھی تک مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے مابین کھلا اعلانِ جنگ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کوئی قابلِ ذکر مسلح جھڑپ ہوئی تھی۔ البتہ قریش کی طرف سے مدینہ والوں کو گاہے گاہے زبانی دھمکیاں دینے اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مہاجر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مدینہ سے بے دخل کرنے کے مطالبوں کا سلسلہ جاری تھا۔ حضرت سعدؓ کے امیّہ بن خلف سے جو کبھی حضرت بلالؓ کا آقا ہوا کرتا تھا، حلیفانہ تعلقات تھے۔ حضرت سعدؓ نے اس کے ہاں قیام کیا۔ جب حضرت سعدؓ طواف کے لئے حرم شریف گئے تو وہاں ابوجہل سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس نے امیّہ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ اس نے جب ان کا تعارف کرایا کہ قبیلہ اوس کے رئیس سعدؓ بن معاذ ہیں تو ابوجہل انؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا اور اس نے کہا کہ اگر تم امیّہ کے حلیف نہ ہوتے تو تم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ تم ہمارے دشمنوں اور بے دینوں کو پناہ دو اور خود آ کر بیت اللہ کا طواف کرو ــــ اس کے نزدیک تو، نعوذ باللہ، جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیؓ قریش کے آبائی دین بت پرستی چھوڑنے کے باعث بے دین

گئے تھے ـــــ حضرت سعدؓ نے اسی وقت ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ "اگر تم نے ہم پر طواف
بند کیا تو جان لو کہ ہم تمہارے تجارتی راستوں کو روک دیں گے۔"

دوسرا واقعہ عبداللہ بن اُبی (جو بعد میں رئیس المنافقین کہلایا) سے متعلق ہے۔ وہ قبیلۂ
خزرج کا بہت بڑا سردار تھا اور اوس و خزرج دونوں قبیلوں کے سرداروں کی باہمی مشاورت سے
اسے مدینہ کا بادشاہ بنانے کے فیصلے کے بعد اس کے لئے تاج بھی تیار ہو چکا تھا۔ اب نبیٔ اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ورودِ مسعود کے باعث اس کی
بادشاہت کے خواب کا آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ وہ ایمان تو لے آیا تھا، چونکہ دونوں قبیلوں کی عظیم
اکثریت ایمان لا چکی تھی، لیکن بادشاہت کا خواب پریشان ہونے کے سبب سے اس کے دل
میں پہلے ہی دن سے نفاق کا جو بیج پڑا، وہ پروان چڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کے پاس سردارانِ
قریش کے خطوط اور پیغامات برابر آ رہے تھے کہ "تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپؐ کے مہاجرینؓ
کو مدینہ سے نکال دو۔ تم کھڑے ہو جاؤ، تمہیں اقدام کرنا چاہئیے، ہم تمہاری مدد کے لئے لشکر
لے کر آنے کے لئے تیار ہیں، ہمیں تمہارے فیصلے کا انتظار ہے" وغیرہ وغیرہ ـــــ نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ریشہ دوانیوں سے بے خبر نہیں تھے۔ آپ آٹھ مہموں کے آغاز سے قبل
بنفسِ نفیس چل کر عبداللہ بن اُبی کے پاس اوس و خزرج کے چند بڑے سرداروں کے ساتھ
تشریف لے گئے۔ حالانکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حضورؐ اس کو طلب فرماتے، لیکن معاملہ چونکہ مصالحِ
دین سے متعلق تھا، لہٰذا مدینہ کے بے تاج بادشاہ، سرورِ عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
بذاتِ خود پیش قدمی فرمائی اور ابن ابی کو خالص دنیوی انداز اور دلیل سے سمجھایا کہ "دیکھو تمہارا
سارا قبیلہ خزرج اور سارا قبیلہ اوس ایمان لا چکا ہے، اگر تم نے اس طرح کی کوئی حرکت کی جو
ہمارے علم میں آئی ہے تو اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا! تمہیں اپنے بھائیوں
کے خلاف جنگ کرنا پڑے گی" ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے اُسے کسی موقع پر بھی
کسی کھلی اقدام کی جرأت نہیں ہوئی۔ اگرچہ وہ ساری عمر سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرتا رہا،
جیسے یہودی کرتے رہے، لیکن نہ اسے اور نہ ہی یہود کو کبھی بھی کھلم کھلا سامنے آنے کی
جرأت ہوئی۔ پھر میرا یقین ہے کہ نبیٔ اکرمؐ کے اس طرزِ عمل اور اسلوبِ تفہیم سے اوس و
خزرج کے ان سرداروں کے دلوں میں جو اس موقع پر آپؐ کے ساتھ تھے، نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی محبت و عقیدت ہزاروں گنا مزید راسخ ہو گئی ہوگی۔

(جاری ہے)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

ایک خاموش مگر متاثر کن مظاہرہ

اخبارات میں عریانی و فحاشی کے خلاف تنظیم اسلامی کے پہلے مظاہرے کی رُوداد

(مرتب: حافظ خالد محمود خضر)

اسلام کے نام پر حاصل کیا جانے والا پاکستان آج جس طرح ایک منکرات سے بھرپور معاشرے کی تصویر پیش کر رہا ہے' اس پر ہر دردمند اور باشعور مسلمان کو گہری تشویش ہے۔ ان منکرات میں ایک بہت بڑا منکر بے حیائی' عریانی اور فحاشی ہے اور یہ منقش اژدہا ہماری اخلاقی اقدار کو تیزی سے نگلتا جا رہا ہے۔ اس بے حیائی کی اشاعت میں ہمارے ذرائع ابلاغ خصوصاً ٹیلیویژن اور اخبارات و جرائد نے نہایت ناپسندیدہ کردار ادا کیا ہے۔ اباحیت پسند کاروباری طبقہ اپنی مصنوعات کی فروخت کیلئے عورت کو محض بنا سجا کر ہی نہیں' بلکہ بے لباس کر کے بطور اشتہار استعمال کر رہا ہے۔ اور ہمارے ذرائع ابلاغ اس مذموم اور قابل نفرین کام میں اس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ آج کی صحافت بجائے خود ایک کاروبار کی صورت اختیار کر گئی ہے اور اس کے ذریعے حرام و حلال کی تمیز کئے بغیر دولت اکٹھی کرنا یار لوگوں کا مقصود و مطلوب بن گیا ہے..... اور حد تو یہ ہے کہ اس حمام میں اسلام پسند قسم کے صحافیوں نے بھی برہنہ ہونا کوئی عیب نہیں جانا' چنانچہ آج ہمارے اچھے اچھے ماہنامے اور ہفت روزے گھٹیا قسم کے اشتہارات کی لعنت سے آلودہ نظر آتے ہیں..... الاماشاءاللہ..... لیکن فواحش کی اس دوڑ میں سبقت ہمارے اردو روزنامے لے گئے ہیں' جن کے صفحات میں نیم عریاں نسوانی تصاویر پر مشتمل مصنوعات کے اشتہارات کے ساتھ ساتھ لچر قسم کے مخربِ اخلاق فلمی اشتہارات پہلے ہی کچھ کم فتنہ انگیز نہ تھے' کہ اب ایک عرصے سے انہوں نے تقریباً روزانہ ہی رنگین صفحات کے مختلف ایڈیشن شائع کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ یہ رنگین صفحات کم و بیش فلمی و غیر فلمی حیاباختہ عورتوں کی نسوانیت سوز اداؤں کے انداز کی عکاسی کیلئے وقف ہوتے

ہیں۔ اخبارات میں ہر روز ایسی کئی شیطانی تصویریں دینی غیرت وحمیت کا منہ چڑاتی ہیں۔

اخبار ہر شہری کی بنیادی ضرورت ہے اور وہ اسے ملکی وعالمی حالات سے صحیح طور پر آگاہ رہنے کیلئے خریدتا ہے' لیکن اسے اخبار کی صورت میں ایسی (SUGAR COATED) گولی نگلنے پر مجبور کیا جارہا ہے جو اپنے اندر بے غیرتی اور بے حیائی کا زہر لئے ہوئے ہے' اور نہ معلوم کتنے معصوم ذہن اس زہر سے مسموم ہو رہے ہیں۔ شریف گھرانوں کے سادہ لوح نوجوانوں اور عزت دار بہو بیٹیوں کو گناہ ومعصیت کی طرف مائل کرنے والی تصاویر دے کر اور بدنام زمانہ ایکٹریسوں کے جنسی سکینڈلز کی معلومات فراہم کر کے ان کے اخلاق وکردار کو تباہ کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔

بے حیائی اور فحاشی کے اس اُمڈتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی فکر کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے' چنانچہ اخبارات کے ذمہ دار حضرات کو ان کی دینی وملی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کی غرض سے تنظیم اسلامی پاکستان کی طرف سے پُرامن' خاموش احتجاجی مظاہروں کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا مظاہرہ ۲۱ر جون بروز بدھ دو روزناموں 'جنگ' اور 'نوائے وقت' کے دفاتر کے سامنے بیک وقت کیا گیا۔ اس مظاہرہ کیلئے دو گروپ تشکیل دیئے گئے تھے۔ روزنامہ 'جنگ' کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کرنے والے گروپ کی قیادت تنظیم اسلامی پاکستان کے ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے کی' جبکہ 'نوائے وقت' کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کرنے والے گروپ کے قائد ناظمِ تربیت جناب میاں محمد نعیم صاحب تھے۔

مظاہرے سے متعلق ضروری ہدایات رفقاء کو ایک اجتماع میں پہلے سے دے دی گئی تھیں۔ ہدایات کے مطابق روزنامہ 'جنگ' کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کرنے والے گروپ کے رفقاء کو شملہ پہاڑی کی مسجد میں اور روزنامہ 'نوائے وقت' کے سامنے مظاہرہ کرنے والے حضرات کو تھانہ سول لائنز کی مسجد میں ٹھیک پانچ بجے پہنچنا تھا۔ الحمد للہ رفقاء چار بجے کے بعد ہی شہر کے مختلف حصوں سے مقررہ مساجد میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے اور حسب ہدایت پانچ بجے تک تمام رفقاء پہنچ چکے تھے۔ آج رفقاء کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے' کیونکہ آج انہیں اپنے رب کی رضا کے حصول کیلئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرآنی حکم پر عمل کرنے کی توفیق اسی کی بارگاہ سے حاصل ہو رہی تھی۔ انہیں احساس تھا کہ ابھی ان کے ہاتھ اس قدر مضبوط نہیں ہیں کہ وہ منکر کی گردن دبوچ سکیں۔ لیکن اتنے ناتواں بھی نہیں کہ احتجاجی

تحریروں کے آئینے اٹھاکر منکر کو اس کی مکروہ شکل بھی نہ دکھاسکیں۔ آج وہ اس لئے بھی خوش تھے کہ انہوں نے 'منہجِ انقلابِ نبویؐ' کے جن مراحل کو سیرت نبویؐ کی روشنی میں سمجھا تھا' انہیں اس کے ابتدائی مرحلے پر عملی طور پر چلنے کی سعادت حاصل ہو رہی تھی۔

نمازِ عصر با جماعت ادا کرنے کے بعد رفقاء کو ضروری ہدایات کی یاد دہانی کرائی گئی۔ ان ہدایات میں اہم ہدایات یہ تھیں کہ مظاہرے کے دوران رفقاء آپس میں کسی قسم کی گفتگو نہیں کریں گے' اپنی نگاہیں نیچی رکھتے ہوئے ذکر اللہ میں مصروف رہیں گے' کسی بھی صورت میں نعرہ بازی یا اشتعال انگیزی اختیار نہیں کریں گے اور ان پر اگر کوئی آوازے کسے تب بھی اس کا جواب نہیں دیں گے۔ اس کے بعد رفقاء کو بینرز اور کتبے (PLACARDS) دیئے گئے اور یہ بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق بڑے باوقار انداز میں روانہ ہوئے۔ بینر یا کتبہ اٹھانے کی خواہش ہر رفیق کے دل میں تھی' لیکن نظم کی ہدایت کے مطابق ہر کتبہ کے بعد تین رفقاء کو بغیر کتبہ کے چلنا تھا۔ ہر دو گروپ اپنے اپنے مقررہ ہدف پر پہنچ کر رک گئے۔ اور ہر دو مقامات پر حسب ہدایت خاموش مظاہرہ کیا گیا۔ اخبارات کے دفاتر کی حفاظت اور مظاہرین سے "نمٹنے" کیلئے دونوں جگہ پولیس کی بھاری جمعیت موجود تھی...... لیکن پولیس اور عوام کیلئے یہ مظاہرہ نہایت حیران کن تھا۔ ایک ایسا مظاہرہ جس میں ٹریفک رکی نہ شیشے ٹوٹے' نعرے بازی ہوئی' نہ خشت باری۔ کسی کا پتلا جلایا گیا نہ گالی دی گئی۔ پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی ہوئی' نہ پکڑ دھکڑ اور ہنگامہ ہاؤ ہو! نہ لڈی' نہ ڈانس' نہ تالیاں...... عجیب مظاہرہ تھا' پولیس والے انگشت بدنداں تھے کہ کبھی کسی احتجاجی مظاہرے میں ایسا مثالی نظم و نسق انہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ 'جنگ' کے دفتر کے سامنے ایک پولیس والے نے اور 'نوائے وقت' کے دفتر کے سامنے ایک اخباری رپورٹر نے ایک ہی بات کہی کہ احتجاج کے طور پر ایک آدھ اخبار ہی نذرِ آتش کر دیں...... لیکن ان مظاہرین کو اپنے نظم کی طرف سے ایسی کسی کارروائی کی اجازت نہ تھی۔ مظاہرین میں ایک بڑی تعداد کالجوں اور یونیورسٹیوں سے پڑھے ہوئے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی تھی' جو ایک نظم کے پابند ہو کر اپنے جذبات کو سینوں میں تھامے ساکت وصامت کھڑے تھے۔ یہ پرامن' خاموش مظاہرہ چونکہ عریانی و فحاشی اور بے غیرتی و بے حیائی کے مہلک جراثیم گھر گھر پہنچانے والے اداروں کے سامنے کیا جا رہا تھا' لہٰذا بینرز اور کتبوں پر فحاشی و عریانی کی مذمت پر مشتمل اس طرح کی عبارتیں درج تھیں:۔

☆...... اللہ منع کرتا ہے ہر نوع کے فحش کام اور منکرات سے (القرآن)

☆...... یقیناً جو لوگ مسلمانوں میں فواحش کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں' ان کیلئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے! (القرآن)

☆...... ہم سیاست' معیشت اور معاشرت کے ساتھ ساتھ اندازِ صحافت بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ (تنظیم اسلامی)

☆...... خدارا ادب و ثقافت کے نام پر بے حیائی پھیلانے سے باز آجاؤ۔

☆...... بے پردگی و عریانی اس دور کا عظیم فتنہ ہے۔

☆...... خدا کیلئے آزادئ نسواں کے نام پر عورت کی تذلیل مت کرو'

☆...... عورت کی تصویر کو تجارت کا ذریعہ بنا کر اپنی آخرت برباد مت کرو۔

☆...... مستورات کو مستور ہی رہنے دو' انہیں شمع محفل نہ بناؤ۔

☆...... فحاشی و عریانی پھیلانے والے اسلام کے کھلے دشمن ہیں۔

☆...... خدا کیلئے غور کرو!

کیا عریانی و فحاشی صحافت کا لازمی جزو ہے؟

☆...... بے پردگی اور فحاشی پھیلانا قوم فروشی کے مترادف ہے۔

☆...... فحاشی و عریانی کی اشاعت شیطانی کام ہے!

☆...... خدارا' بے پردگی اور فحاشی پھیلانے کی بجائے نوجوانوں کی فکری رہنمائی کی طرف توجہ دو!

☆...... بے پردگی اور فحاشی کی اشاعت کی بجائے نظریۂ پاکستان کو فروغ دیا جائے۔

☆...... فحاشی و عریانی کو فروغ دینے والے ملک و ملت کے دشمن ہیں۔

☆...... قرآن ہمیں نیکیوں میں مسابقت کا حکم دیتا ہے' لیکن ہمارے اخبارات و جرائد فحاشی و عریانی کی دوڑ میں شریک ہیں۔

☆...... ہم ایسی صحافت سے اعلانِ بیزاری کرتے ہیں جس کی عمارت فلموں کے فحش اشتہارات کی کج بنیادوں پر استوار کی گئی ہو۔

☆...... اخبارات کا کردار تعمیری اور تعلیمی ہونا چاہئے

فحاشی و عریانی کی دوڑ میں وہ اپنا کردار فراموش کر چکے ہیں۔

☆...... خدارا فحاشی و عریانی بند کرو

یہ دین و شریعت کی کھلی خلاف ورزی ہے

یہ احتجاجی مظاہرہ جو دراصل ایک منکر کے خلاف پرامن یلغار (PEACEFUL OFFENCE) کا آغاز تھا' دونوں اخبارات کے دفاتر کے سامنے ایک ہی وقت میں جاری رہا...... 'جنگ' کی مرمریں دیواروں کے سامنے سڑک کے دوسری طرف تنظیم اسلامی کے رفقاء ایک صف میں کندھے سے کندھا ملائے آہنی دیوار کی مانند کھڑے تھے۔ اس صف میں ہر چوتھے رفیق کے پاس پلے کارڈ تھا' جسے اس نے اپنے سر سے بلند کر کے اٹھا رکھا تھا۔ ان سے آگے ایک صف ان رفقاء کی تھی جن کے پاس بینرز تھے، جن کو انہوں نے سینوں کے برابر بلند کر رکھا تھا۔ نوائے وقت کے دفتر کے سامنے رفقاء کو چار گروپوں میں تقسیم کر کے کھڑا کیا گیا تھا۔

مظاہرہ کے دوران "اخبارات و جرائد میں عریانی و فحاشی کے خلاف ایک دردمندانہ اپیل" کے عنوان سے ایک دوورقہ بڑی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ مظاہرے کے آغاز سے قبل خود رفقاء کو اس دوورقہ کا اجتماعی مطالعہ کروا دیا گیا تھا۔ یہ دوورقہ درج ذیل عبارت پر مشتمل تھا۔

اخبارات و جرائد میں فحاشی و عُریانی کے خلاف ایک دردمندانہ اپیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنظیم اسلامی پاکستان ہر طرح کی سیاسی' گروہی اور مسلکی مصلحتوں سے بالاتر رہتے ہوئے محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اور اتمامِ حجت کی غرض سے اخبارات و جرائد کے معزز مالکوں' مؤقر مدیروں' مشتہرین اور عام مسلمانوں سے درخواست کرتی ہے کہ بے پردگی' عریانی اور فحاشی کے اس امڈتے سیلاب پر بند باندھنے کی فکر کریں جو آخر کار قوم کو بہا کر لے جائے گا۔ سادہ سے سادہ اور شعوری یا غیر شعوری بے عملی کا شکار مسلمان بھی اتنی بات ضرور جانتا ہے کہ ہمارا دین یعنی اللہ کی وہ نعمت جو ہمیں کوئی زحمت اٹھائے بغیر گھر بیٹھے مل گئی ہے' ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کو چراغ خانہ بنانا چاہتا ہے' شمع محفل نہیں۔ وہ "مستورات" ہیں یعنی چھپائی جانی والی متاع' "مکشوفات" نہیں کہ منظرِ عام پر لائی جائیں۔ مسائل اور احکام کو جانے دیجئے' کسے معلوم نہیں کہ خواتین کے بارے میں ہمارا موجودہ طرزِ عمل اور خود خواتین کا شوق خود نمائی نہ صرف اسلام کے مزاج

کے خلاف ہے بلکہ مشرقی تہذیب میں بھی اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

ہمیں اپنی شامتِ اعمال نے اگر دین ومذہب سے بیگانہ کر دیا ہے تو کیا مغرب کے انجام سے بھی عبرت نہ پکڑیں گے جہاں عیّار مرد نے عورت کو اپنی ہوسناکی کا شکار بنائے رکھنے کے لئے بازار کی جنس بنادیا' اس کے لباسِ تقدس کو تار تار کیا' آرٹ اور فنون لطیفہ کے نام پر اس کے جسم کی نمائش کی' رسائل وجرائد کو سجانے کے لئے اور اشیاء صرف بیچنے کی غرض سے اس کے ملکوتی حسن کو سارے رنگوں سے داغدار کیا۔ کیا شاعر مشرق اور حکیم الامت علامہ اقبال علیہ رحمتہ کی اس تنبیہ کا مخاطب ہم خود بننا چاہتے ہیں جو انہوں نے مغرب کو دی تھی کہ ۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ـــــ ناپائیدار ہو گا

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو۔ بے حجابی' عریانی اور فحاشی کو عام کر کے اس کے عذاب کو دعوت نہ دو جو کسی اور شکل میں نہ بھی آئے تو بے شرمی' بے غیرتی اور سکونِ قلب سے محرومی کا روپ دھار کر قوم کی رگ وپے میں سما ہی رہا ہے۔ یاد رکھو کہ حسن کی یہ بے حجابی اور جلوؤں کی یہ فراوانی تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک نہیں پہنچاتی' دلوں کو آسودگی سے ہمکنار نہیں کرتی' قلب ونظر کو تشنگی کی آگ میں جھونک دیتی اور ہوس کی نہ بجھنے والی پیاس میں مبتلا کر دیتی ہے کیا آج کا انسان اسی کیفیت سے دوچار نہیں ہے؟۔ اخبارات ورسائل' اشتہارات اور پوسٹروں میں شائع ہونے والی دعوت گناہ دیتی تصاویر فطری جذبے کی تسکین نہیں کرتیں' اسے ہیجان میں مبتلا کر دیتی ہیں اور ہماری نئی نسل کے ناپختہ ذہنوں کو غلاظت کے سنڈاس میں تبدیل کر رہی ہیں۔ معصوم بچیو ں کو درندگی کا نشانہ بنانے والوں اور قبر سے نکال کر نوجوان لڑکی کی لاش کی بے حرمتی کرنے والے کو بر سر عام پھانسی کی سزا کا مطالبہ کرنے والو ذرا تو سوچو' ان سنگین اور ننگ انسانیت جرائم کا ارتکاب کرنے والے بڑے مجرم ہیں یا وہ لوگ جو نوجوانوں کے سفلی جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔

ہم تو وہ خوش نصیب لوگ ہیں جن کی خواتین کے لئے رشک اور تقلید کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک نمونہ موجود ہے۔ ہاجرہؑ' آسیہؑ' مریمؑ' خدیجہ الکبریٰؓ' عائشہ صدیقہؓ' فاطمہ زہراؓ' زینبؓ...... کس کس کا نام لیا جائے ـــــ کبھی کبھار محض اجر وثواب کے لئے ان کا ذکر کر کے اگر صفحے کے صفحے اداکاراؤں' ماڈلوں اور آبرو باختہ عورتوں کی اداؤں سے رنگین کئے جائیں تو قوم کی بیٹیاں کسے اپنا "آئیڈیل" بنائیں گی؟۔ اس سوال کا جواب موجودہ حالات میں تو مشکل نہیں جب دین ومذہب کی

دریں کمزور پڑتی جا رہی ہیں اور خواہشاتِ نفس کا منہ زور گھوڑا کسی بھی سوار کے بس میں نہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

ہمارے معاشرے کی اخلاقیات کے ڈھانچے کو سینما' ویڈیو اور ٹیلی ویژن کی دیمک چاٹ رہی ہے' سو الگ۔ کم سے کم اخبارات و رسائل ہی اپنا فرض پہچانیں اور ان کے کام کو آسان بنانے کی بجائے دردمند مسلمانوں کی خاموش اکثریت کو ساتھ لے کر فحاشی و عریانی کی لعنت کا مقابلہ کریں۔ ہمارا مطالبہ نہیں' مخلصانہ درخواست ہے۔ زبردستی نہیں' ہمدردانہ مشورہ ہے کہ قومی اخبارات ان لعنتوں کے خلاف جہاد میں پہل کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہوں' اپنے صفحات کو آلائشوں سے پاک کریں اور باخبری کے خواہشمندوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیں جو اخبار خبروں کے لئے خریدتے ہیں تو ساتھ ہی بے حیائی کا طوفان بدتمیزی بھی ان کے گھروں میں داخل ہو جاتا ہے۔

اخبارات و جرائد کے قارئین بھی معاشرے کے اجتماعی ضمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے ناشروں اور مرتب کرنے والوں کو ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعے توجہ دلائیں کہ نت نئے رنگین ایڈیشن چھاپ کر وہ ایک طرف روز بروز مہنگے ہوتے کاغذ کو ضائع کر رہے ہیں جس پر قومی وسائل سے قیمتی زرمبادلہ صرف ہوتا ہے اور دوسری طرف اپنے قارئین کے خرچ میں حالیہ مہنگائی کے باعث اضافہ کا باعث بھی بنیں گے۔

بے ضرورت رنگینی کو اگر ختم کر دیا جائے تو اخبارات اپنی قیمت بڑھانے کی بجائے کم کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ اس حقیقت کی طرف بھی ان کی توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے کہ خود ہمارے ملک میں انگریزی اخبارات اب تک اس لعنت سے بچے ہوئے ہیں حالانکہ وہ اگر اس میں ملوث ہو جائیں تب بھی عوام الناس کا بڑا حصہ اس کے ضرر سے محفوظ رہ سکتا ہے کیونکہ ان کی رسائی ایک محدود طبقے تک ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ "شوبزنس" اور فیشن وغیرہ پر نکلنے والے بے شمار رسائل و جرائد کی موجودگی میں اخبارات بے حجابی' بے حیائی اور مادر پدر آزادی کے جدید رجحانات کو اپنے صفحات میں جگہ دینے پر کیوں مجبور ہیں۔ وہ قوم کو ملکی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر رکھنے' صورت حال کے تجزیہ اور لوگوں کی رہنمائی میں ہی اپنی صلاحیتیں صرف کریں تو اپنے فرائض سے کماحقہ عہدہ برآ ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی وہ خبروں کے لئے اخبار خریدیں گے اور اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لئے مخصوص رسائل و جرائد۔

ہمارا دین 'دین فطرت ہے۔ اس میں شراب پینا اگر حرام ہے تو اس کی تیاری اور خرید و فروخت بھی یکساں حرام ہے۔ بے پردگی 'فحاشی 'عریانی اور بے حیائی جتنی بڑی لعنتیں ہیں 'ان کی نشرو اشاعت بھی کم قابل گرفت نہیں۔ قلم و قرطاس کے دھنی بھائیو! ذرا سے اضافی دنیاوی فائدے کے لئے اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ اب تک جو ہوا 'اس پر اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائیں! اب توبہ کیجئے 'سب دردمند مسلمان بھی آپ کی مغفرت اور رزق میں کشادگی کی دعا کریں گے۔ ہر روز رنگین صفحات بڑھا کر اپنے پھیلاؤ اور خریداروں کے بوجھ میں اضافہ نہ کیجئے۔ یہ فالتو بیگار آپ لوگوں نے خود اپنے آپ پر ڈالی ہے۔ دنیا بھر میں سادہ اخبارات چھپتے اور بکتے ہیں جنہیں لوگ تصویروں کے لئے نہیں 'خبروں اور تبصروں کے لئے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ یہاں بھی چند سال پہلے تک یہی رواج تھا۔ خدارا اسی طرف لوٹ جایئے جہاں سے چلے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور اس موڑ سے آگے نکل آیا ہے جس کی پیشینگوئی حکیم الامت نے اِن الفاظ میں فرمائی تھی : ؎

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند
غیرت نہ تجھ میں ہوگی 'نہ زن اوٹ چاہے گی

وہ دن تو آگیا 'اب کس قیامت کا انتظار ہے؟

دونوں مقامات پر مظاہرہ کے قائدین نے اخبارات کے ذمہ دار حضرات سے ملاقات کر کے انہیں عرض داشتیں بھی پیش کیں۔ دونوں عرض داشتوں کا مرکزی مضمون اگرچہ ایک ہی تھا 'لیکن ان کی عبارتوں میں فرق تھا۔ 'نوائے وقت' کو پیش کی جانے والی عرض داشت میں اس اخبار کے تابناک ماضی کا حوالہ دے کر موجودہ حالات میں اس پر عائد ہونے والی اضافی ذمہ داری کا احساس دلایا گیا تھا۔ اس عرض داشت کی عبارت ذیل میں دی جا رہی ہے۔

محترم و مکرم جناب مدیر روزنامہ نوائے وقت لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تنظیم اسلامی پاکستان کے رفقاء و احباب آپ کی توجہ ملکی صحافت کے اس روز افزوں رجحان کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس کے نتیجہ میں بے پردگی 'عریانی اور فحاشی کا ایک سیلاب بلاخیز امڈتا چلا آرہا ہے۔ اخبارات و رسائل دن بدن گناہ و معصیت کی طرف مائل کرنے والی تصاویر سے مزید آلودہ ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اخبارات کے رنگین صفحات

بالعموم اداکاراؤں ' ماڈلوں اور آبرو باختہ عورتوں کی اداؤں کے انداز کی عکاسی کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ سفلی جذبات کی اس انگیخت سے قوم کی رہی سہی اخلاقی اقدار کا بھی دیوالیہ نکلتا چلا جا رہا ہے۔ بالخصوص نئی نسل کے ناپختہ ذہن اس غلاظت کے زہر سے اس قدر مسموم ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ اسلامی اقدار ہی نہیں ' بنیادی انسانی اخلاقیات اور شرافت و نجابت کا مستقبل بھی تاریک نظر آ رہا ہے۔

اخبار ہر شہری کی ایک ضرورت ہے۔ حالات کا صحیح علم اور اصحاب فکر و نظر کے تجزیوں اور تبصروں سے آگاہی ملک و ملت کے ہر بہی خواہ اور باشعور فرد کی ناگزیر ضرورت ہے اور اس اعتبار سے گھریلو خواتین اور بچے بچیاں بھی اس ضرورت سے مستغنی نہیں ہیں۔ اخبارات میں شامل غیر شریفانہ بلکہ مخرب اخلاق فلمی اشتہارات کی وجہ سے پہلے ہی نہایت تکلیف دہ اور اذیت ناک صورتحال سے سامنا تھا ' لیکن اب قومی روزناموں نے اپنے قیمتی صفحات میں نسوانی تصاویر کی رنگین عکاسی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا جو سلسلہ شروع کر دیا ہے وہ مزید اذیت کا باعث ہے۔ یہ غارت گر دین و ایمان رویّہ نہ صرف ہمارے اخلاقی ڈھانچے کو منہدم کر رہا ہے بلکہ اس سے ہماری ملکی و ملّی اور تہذیبی و ثقافتی روایات بھی پامال ہو رہی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اخبارات بے حجابی ' بے حیائی اور مادر پدر آزادی کے رجحانات کو گھر کی چار دیواری کے اندر تک فروغ دے کر ملک و ملت کی جڑیں کھود رہے ہیں۔

ہماری آپ سے دردمندانہ اپیل ہے کہ قوم کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے اپنے مؤقر اخبار میں نسوانی تصاویر کی اس بے جا نمائش کے سلسلہ کو روک دیں۔ اس ضمن میں "نوائے وقت" پر اضافی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ یہ اخبار ہماری ملّی اقدار کا امین رہا ہے۔ تحریک پاکستان کا یہ نقیب علامہ اقبال مرحوم کے افکار و نظریات کا پاسبان بھی ہے...... فحش اور مخرب اخلاق مواد کی اشاعت کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر واضح رہا ہے اور اس کے دورِ اول میں اس کی پابندی ہوئی ہے۔ نوائے وقت کے شمارہ مورخہ ۳ر نومبر ۱۹۴۹ء کے ایک تراشے کی فوٹو کاپی منسلک ہے جس میں فحش اشتہارات کے حامل اخبارات کو "گھر میں سانپ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ سے گزارش کی جاتی ہے کہ آج خود اپنے اخبار کو اس نوعیت کا سانپ نہ بنائیں اور اپنی دورِ اول میں متعین کردہ پالیسی کی جانب رجوع کریں۔ آپ کی جانب سے اس سلسلہ میں پیش قدمی سے یقیناً آپ کی عزت و توقیر میں اضافہ ہو گا ' اخبار کی اشاعت بھی مزید ترقی کرے گی اور آپ اللہ کے ہاں بھی اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔

والسلام

میاں محمد نعیم

اس عرض داشت میں "نوائے وقت" کے جس خلاف تراشے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قارئینِ میثاق کی دلچسپی کیلئے شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔ قارئین اسے دیکھ کر خود اندازہ فرمالیں کہ اس اخبار نے چالیس سال کے اندر کس سمت میں کتنا سفر طے کیا ہے...... اور اب حالات کا تقاضا ہے کہ یہ ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو" کے مصداق اپنے دورِ اوّل کی پالیسی کی طرف مراجعت کرے۔

DAILY NAWA-I-WAQT LAHORE

گھر میں سانپ

کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے گھر میں سانپ آگھسے۔ موجودہ زمانہ بیداری کا زمانہ ہے۔ آپ کی طرح آپ کے گھر کی خواتین اور لڑکے لڑکیاں بھی حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ مگر بعض اخبار گھر میں لے جاتے ہوئے اس طرح جھجکتے ہیں۔ گویا سانپ آپ کے گھر میں آگھسے گا اس لئے کہ اس اخبار میں گندے فحش اور مخربِ اخلاق اشتہار ہوتے ہیں اور آپ نہیں چاہتے کہ یہ اشتہار آپ کے بچوں کی نظر سے گزریں۔ مگر اس کا یہ علاج تو نہیں۔ کہ آپ انہیں اخبار کے مطالعہ ہی سے محروم رکھیں۔ آپ ایسا اخبار پڑھیئے۔ جس میں کوئی فحش اشتہار کسی قیمت پر بھی نہ چھپ سکتا ہو۔

نوائے وقت ہی ایک ایسا اخبار ہے

اور اسی وجہ سے ہر شریف گھرانے میں پڑھا جاتا ہے

مغرب کی اذان سے کچھ پہلے رفقاء کو واپس چلنے کی ہدایت کی گئی، چنانچہ دونوں گروپ بڑے منظم انداز میں انہی دونوں مساجد کی طرف واپس لوٹے، جہاں سے انہوں نے مظاہرہ کا آغاز کیا تھا۔ دونوں مساجد میں پہنچ کر رفقاء نے ربِ ذوالجلال کا شکریہ ادا کیا، جس نے انہیں منکرات سے بھرپور معاشرے میں "نہی عن المنکر" کی ایک کوشش کی توفیق ارزانی فرمائی۔

دونوں گروپوں کے قائدین...... ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اور میاں محمد نعیم صاحب......

اپنے اپنے گروپ کے رفقاء کا شکریہ ادا کیا اور مثالی نظم و ضبط پر اطمینان کا اظہار کیا۔ دعا کے بعد یہ مظاہرہ اختتام پذیر ہوا۔

دوسرے روز یعنی جمعرات ۲۲ر جون کو اس مظاہرہ کی خبر 'نوائے وقت' اور 'پاکستان ٹائمز' میں شائع ہوئی۔ 'نوائے وقت' نے مینگنیاں ڈال کر دودھ دینے والی بکری کی طرح یہ ستم ظریفی بھی کی کہ اخبارات میں نسوانی تصاویر کی اشاعت کے خلاف ہونے والے مظاہرے کی خبر اور تصویر ایک فلمی اداکارہ کی تصویر کے زیر سایہ شائع کی۔ 'پاکستان ٹائمز' میں شائع ہونے والی خبر خاصی متوازن تھی' اگرچہ اس میں تنظیم اسلامی کیلئے دو جگہ 'ٹی آئی' کے بجائے سہواً 'جے آئی' چھپ گیا تھا۔ 'جنگ' کے صفحات سے اس مظاہرہ کی خبر اس طرح غائب تھی جیسے "گدھے کے سر سے سینگ"۔ اس اخبار نے عین اپنی ناک کے نیچے ہونے والے اس مظاہرے سے اس طرح غضِ بصر کیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور واقعتاً کچھ ہوا بھی نہیں تھا۔ اخبار کے دفتر کے شیشے ٹوٹے' نہ فرنیچر کو آگ لگی اور نہ ہی مشینری برباد ہوئی۔ اگر اس طرح کا کچھ ہوا ہوتا تو یقیناً 'جنگ' اس پر واویلا بھی کرتا اور خبر بھی بنتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے قارئین کو اپنے دفتر کے سامنے ہونے والے ایک واقعے کی خبر سے محروم رکھ کر صحافیانہ بددیانتی اور خیانت کا مظاہرہ کیا گیا۔

اگلے روز جمعہ ۲۳ر جون کو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد دارالسلام باغ جناح میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے علمائے کرام اور دینی جماعتوں سے اپیل کی کہ وہ بھی عریانی و فحاشی کی اشاعت کے خلاف مؤثر آواز بلند کریں اور عوام کو بیدار کریں تاکہ اگر کوئی ادارہ اس میدان میں آگے بڑھنا چاہے تو وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے۔ امیر محترم نے کہا کہ اب ہم اس مسئلے کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' اس کیلئے ہم رائے عامہ کو بیدار کریں گے اور پھر اخبارات کیلئے اس روش کو برقرار رکھنا اتنا آسان نہیں رہے گا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اس سلسلے کا اگلا خاموش مظاہرہ ۲ر جولائی بروز اتوار نماز عصر کے بعد انہی دو اخبارات کے دفاتر کے سامنے کیا جائے گا۔ امیر محترم نے اعلان کیا کہ یہ مظاہرہ تنظیم اسلامی کے رفقاء تک محدود نہیں ہو گا بلکہ اس میں وہ دیگر احباب بھی شریک ہو سکتے ہیں' جو اس منکر کو ختم کرنے کے آرزومند ہوں۔ انہوں نے حاضرینِ جمعہ سے بھی اپیل کی کہ وہ نظم و ضبط کی پابندی کے ساتھ اس پرامن مظاہرے میں شریک ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ جو حضرات اس طرح کے مظاہروں میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں انہیں اپنے گھروں میں پردے کے

اسلامی احکام پر عمل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ امیر محترم کے اس خطاب جمعہ کی اخباری رپورٹنگ کے عکس سطورِ ذیل میں دیئے جا رہے ہیں :

روزنامہ جنگ لاہور (2) 24/جون 1989ء

لاہور (پ ر) امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ہماری دینی جماعتوں نے معاشرے کی اصلاح اور بھلائی کے تمام کاموں کو پس پشت ڈال کر اپنی ساری توجہ اقتدار اور حکومت حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگا رکھی ہے حالانکہ پاکستان کے موجودہ سیاسی ڈھانچے میں دینی جماعتوں کے برسر اقتدار آنے کا کوئی امکان نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک معاشرے کی سیاسی قوت کی بنیاد سرمایہ داری اور جاگیرداری پر ہے اس وقت تک کوئی دوسرا طبقہ انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار نہیں آ سکتا۔ باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ ہمارے عوام کی دینی حمیت مردہ نہیں ہوئی۔ اسے بیدار کر کے عوامی دباؤ کے ذریعے خیر اور بھلائی کے بہت سے کام کئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ تنظیم اسلامی نے اردو کی روزنامہ صحافت سے عریانی اور فحاشی کے خاتمے کیلئے ایک مہم کا آغاز کیا ہے کیونکہ یہ وہ زہر ہے جو روزانہ زیر دستی ہمارے گھروں میں پہنچایا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہماری اخلاقی قدروں اور خاندانی نظام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے گذشتہ بدھ کو ملک کے دو بڑے اخبارات کے دفاتر کے سامنے خاموش مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ علماء کرام اور دینی جماعتوں کو بھی چاہئے کہ وہ اس مسئلے پر آواز اٹھائیں اور عوام کو بیدار کریں تاکہ اگر کوئی ادارہ اس میدان میں آگے بڑھنا چاہے تو وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اب ہم اس مسئلے کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ہم رائے عامہ کو بیدار کریں گے اور پھر اخبارات کیلئے اس روش کو برقرار رکھنا آسان نہیں رہے گا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اس سلسلے کا اگلا خاموش مظاہرہ 2 جولائی بروز اتوار نماز عصر کے بعد دو بڑے اخبارات کے دفاتر کے سامنے کیا جائے گا۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۴ جون ۸۹ء

دینی جماعتوں نے تمام توجہ اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگا رکھی ہے

عوامی دباؤ کے ذریعے خیر اور بھلائی کے بہت سے کام کئے جا سکتے ہیں ڈاکٹر اسرار

لاہور ۲۳ جون (پ ر) امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ہماری دینی جماعتوں نے معاشرے کی اصلاح اور بھلائی کے تمام کاموں کو پس پشت ڈال کر اپنی ساری توجہ اقتدار اور حکومت حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگا رکھی ہے۔ حالانکہ پاکستان کے موجودہ سیاسی ڈھانچے میں دینی جماعتوں کے برسر اقتدار آنے کا کوئی امکان نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک معاشرے کی سیاسی قوت کی بنیاد سرمایہ داری اور جاگیرداری پر ہے اس وقت تک کوئی دوسرا طبقہ انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار نہیں آ سکتا۔ باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ ہمارے عوام کی دینی حمیت مردہ نہیں ہوئی، اسے بیدار کر کے عوامی دباؤ کے ذریعے خیر اور بھلائی کے بہت سے کام کئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ تنظیم اسلامی نے اردو کی روزنامہ صحافت سے عریانی اور فحاشی کے خاتمے کے لئے ایک مہم کا آغاز کیا ہے کیونکہ یہ وہ زہر ہے جو روزانہ زبردستی ہمارے گھروں میں پہنچایا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہماری اخلاقی قدروں اور خاندانی نظام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے گذشتہ بدھ کو ملک کے دو بڑے اخبارات "جنگ" اور "نوائے وقت" کے دفاتر کے سامنے خاموش مظاہرہ کیا تھا مگر "جنگ" اخبار نے صحافیانہ بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قارئین کو اپنے دفتر کے سامنے ہونے والے ایک واقعے کی خبر سے بھی محروم رکھا۔ ڈاکٹر اسرار نے کہا کہ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کی نشاندہی کرنا پڑ رہی ہے کہ عریانی و فحاشی پھیلانے اور بھارتی ایکٹرسوں کے جنسی سیکنڈلوں پر مبنی لچر کہانیاں اور خبریں چھاپنے میں "جنگ" دوسرے اخبارات سے بہت آگے ہے۔ "جنگ" لاہور نے اس میدان میں پیش قدمی کر کے دوسرے اداروں کو بھی یہ روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ علمائے کرام اور دینی جماعتوں کو بھی چاہئے کہ وہ اس مسئلے پر آواز اٹھائیں اور عوام کو بیدار کریں تاکہ اگر کوئی ادارہ اس میدان میں آگے بڑھنا چاہے تو وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اب ہم اس مسئلے کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ہم رائے عامہ کو بیدار کریں گے اور پھر اخبارات کے لئے اس روش کو برقرار رکھنا آسان نہیں رہے گا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اس سلسلے کا اگلا خاموش مظاہرہ ۲ جولائی بروز اتوار نماز عصر کے بعد دونوں اخبارات کے دفاتر کے سامنے کیا جائیگا

DAWN

Karachi Sunday June 25, 1989

Dr Israr's call to reform society

Dawn Lahore Bureau

LAHORE, June 24: Amir Tanzeem-i-Islam, Dr Israr Ahmad, has said that under the present political structure of the country there was no chance for religious parties to come into power.

Addressing a Juma congregation at Bagh-i-Jinnah here Friday, Dr Israr Ahmad said that instead of paying attention to reformation of society, the religious parties were devoting all energies on gaining power.

As long as the base of political power in the country remains capitalism and Jagirdari no other group could gain power through elections, he emphasised.

His Tanzeem, he said, had started an anti-obscenity campaign, as it was causing irreparable loss to our moral values and family system. He called upon Ulema and religious parties to raise voice against it to arouse awareness among the people. He announced that the second silent protest of the campaign would be staged on July 2 after Asr prayers in front of the offices of two lea[illegible]g Urdu dailies. He also appealed [illegible] Muslims to join [illegible] in the [illegible]

The Pakistan Times, Saturday, June 24, 1989

Women exposure in newspapers lamented

BY A STAFF REPORTER

LAHORE — Underscoring the need for exerting pressure for the promotion of values and eradication of social evils as provided in the manifesto, given by Prophet Mohammad (PBUH), Dr. Israr Ahmad, Amir Tanzeem-i-Islami has deplored that certain Urdu dailies were violating Islamic injunctions.

Delivering his lecture on Friday on "Islamic injunctions on veil, covering and clothing and our newspapers", Dr. Israr deplored that certain Urdu newspapers were trying to surpass each other in the race for the publication of female pictures. This tendency, he said, needed to be curbed in a Muslim society.

To resent the overdoing vis-a-vis publication of pictures of women in daily newspapers, Tanzim-i-Islami will organise demonstrations on July 2, like the one held on June 21 in front of Daily Jang and Nawa-i-Waqt.

تنظیم اسلامی کے خاموش مظاہرہ کی رپورٹ جو پاکستان ٹائمز میں شائع ہوئی

THE PAKISTAN TIMES

LAHORE, JUNE 22, 1989

Protest rally against publishing women pictures in dailies

BY A STAFF REPORTER

LAHORE — **More than 500 members of Tanzim-i-Islam on** *Wednesday staged two peaceful* demonstrations to protest against over-emphasis on the publication of pictures of women in newspapers.

One of the groups, consisting of more than 200 J.I. members; carrying placards and banners stood in silence in front of the office of Daily Jang. The other group agitated on the road in front of Daily Nawa-i-Waqt.

Under instructions from J I Amir, the demonstrators did not raise any slogan, they did not indulge in mutual conversion. They stood in silence for about 50 minutes and recited "Zikar" in their hearts.

The crux of the placards and banners was "Is publication of the pictures of women in feature articles and advertisements or obscenity a part of journalism. Also that publication of such pictures is an open invitation to sin".

The procession was taken out after offering Asr prayers in nearby mosques. After the procession, the participants prayed for the glory of Islamic values.

رفتارِ کار

- تنظیم کے مرکزی قائدین کا دورہ کراچی اور شام الہدیٰ پروگرام
- پہلا ۸ روزہ تربیتی پروگرام برائے مبتدی رفقاء
- لاہور میں منعقدہ تربیتی پروگرام برائے منتظم رفقاء

کراچی

تنظیم اسلامی حلقہ کراچی کے رفقاء میں گہما گہمی اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب مئی ۸۹ء کے
، عشرہ میں مرکزی قائدین نے کراچی کا دورہ شروع کیا۔ ہر تنظیم کے امیر 'ناظم' نقباء اور منتظم
، سے خصوصی ملاقات کے ذریعے انہوں نے اپنی تنظیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ حلقہ کراچی تین
ں (شرقی' شمالی اور جنوبی) پر مشتمل ہے۔ جنوبی تنظیم میں رابطہ کے فرائض انجام دیئے ڈاکٹر
لخالق صاحب نے جو کہ ناظم اعلیٰ ہیں' شمالی تنظیم کی ذمہ داری سنبھالی تھی میاں محمد نعیم صاحب نے
، ناظم تربیت ہیں اور شرقی تنظیم کیلئے کمرِ ہمت کسی بھائی عبدالرزاق صاحب نے جن کا سابقہ تعلق اسی
ہ سے رہا ہے لہٰذا ان کی بھاگ دوڑ کے ثمرات آج تک بھی نظر آ رہے ہیں۔ فجزاہ اللّٰہ احسن
تراء۔ ہر تنظیم میں باقاعدہ اجتماع منعقد کیا گیا اور رفتار کار کا جائزہ لیا گیا' رفقاء کی وابستگی پر بھی نظر
، گئی اور تربیت سے متعلق پالیسی کی وضاحت کے ساتھ مختلف سطح کی تربیت گاہوں کے انعقاد کا اعلان
کیا گیا۔ رفقاء کی حرکت میں مزید تیزی اس وقت پیدا ہو گئی جب انہوں نے "شام الہدیٰ" کیلئے
بلز کی تقسیم اور پوسٹرز کو چسپاں کرنے کا کام شروع کیا۔ جمعرات ۲۵ رمئی کی خصوصی ملاقات کے
وہ جمعہ ۲۶ رمئی کو بھی اکابرینِ مرکز نے متعلقہ تنظیموں کے ہفتہ وار اجتماعات میں شرکت کی۔ بعد نماز
۔ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب تو لاہور تشریف لے گئے البتہ مزید پروگراموں میں میاں محمد نعیم صاحب اور
ئی عبدالرزاق صاحب نے بنفس نفیس شرکت کی۔

شیڈول کے مطابق ۲۸ر اور ۲۹ر مئی کو شام الہدیٰ کا پروگرام تھا۔ ۳۰ر مئی کی صبح حلقہ کا
تماع تھا جہاں تمام رفقاء کی امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے رسمی ملاقات طے تھی جس میں امیر
ترم کی خواہش کے مطابق رفقاء کو اظہار خیال کیلئے دعوت دی گئی تھی' جسے وہ فیڈ بیک پروگرام کا نام

دیتے ہیں تاکہ رفقاء کی مختلف آراء، تجاویز اور مشوروں سے استفادہ کیا جائے اور تازہ ترین صورتحا
[illegible] ئے۔ ۳۰ر مئی ہی کی شام کو ہوٹل جبیس میں سامعینِ شام الہدیٰ کیلئے سوال و جواب
نشست [illegible] تھی۔ اس سہ روزہ مصروفیات کی تفصیلات ذیل کی سطور میں پیش کی جا رہی ہیں۔

شامِ الہدیٰ

شہر کراچی جس کی شام ایک ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکی تھی مدت ہوئی اپنی رعنائیوں سے محروم ہو چکی ہے۔ یہاں کی ایک شام جو اپنی نوع کے اعتبار سے منفرد ہے "شام الہدیٰ" کے نام سے معروف و مشہور ہے اور جس کی وجہ سے شام کا تقدس بھی کچھ نہ کچھ برقرار رہتا نظر آتا ہے۔ ابتداء میں اس کا اہتمام مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کرتی رہی لیکن انجمن خدام القرآن سندھ کی تاسیس کے بعد اس کے انعقاد کی ذمہ داری اُسے سونپ دی گئی۔

ٹی وی کے مشہور دینی پروگرام "الہدیٰ" کی بندش کے بعد، جس کے بند کروانے کی مہم میں ملک کی مغرب زدہ خواتین نے بھرپور حصہ لیا تھا اور اسلام کا راگ الاپنے والی آمریت نے خواہشِ زن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے، دروسِ قرآن کے سلسلے کو جاری رکھنے کیلئے 'انجمن' نے ماہانہ پروگرام ترتیب دیئے اور اس طرح شامِ الہدیٰ کا آغاز ہوا۔

اس دفعہ شام الہدیٰ ایک لمبے وقفے کے بعد منعقد کی گئی۔ اس تعطل کی مختلف وجوہات تھیں جن میں سے ایک خود "شمعِ محفل" اور تقریب کی روحِ رواں شخصیت محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا گریز بھی ہے۔ اس دفعہ بھی موصوف نے اپنے اس فیصلہ کو دھرایا کہ وہ اب خطابات و تقاریر کی بجائے تالیف و تصنیف کی طرف زیادہ متوجہ ہونا چاہتے ہیں۔ اس دفعہ شام الہدیٰ کا دو روزہ پروگرام طے ہوا تھا۔ جدید تزئین و آرائش کے حامل ریکس آڈیٹوریم میں، جو کہ عبداللہ ہارون روڈ پر ہوٹل جبیس سے مختصر فاصلے پر ہے، یہ تقریب اُس وقت سے منعقد ہوتی چلی آئی ہے جب سے تاج محل ہوٹل کی انتظامیہ نے اپنے "موتی محل" میں پروگرام کی اجازت سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔

۲۸ر اور ۲۹ر مئی کے دو روزہ خطاب کیلئے عنوان تھا ... "ملت اسلامیہ عالمی سطح پر بے عزت و بے وقعت کیوں ہے اور خصوصاً پاکستان شدید انتشار سے دوچار کیوں ہے اور اس صورت حال میں تبدیلی کس طرح ممکن ہے؟" ... کراچی ایک میٹروپولیٹن سٹی ہے لہٰذا تقریب میں ہر طبقہ کے یارانِ نکتہ داں شریک تھے۔ پہلے روز کی نشست سے تعارفی و استقبالی کلمات کیلئے جناب سراج الحق سید صاحب ٹھیک آٹھ بجے اسٹیج پر تشریف لائے اور سامعین کو خوش آمدید کہا۔ سید صاحب عمر رسیدہ، جلال و جمال کا مرقع جبینِ نیاز کے حامل، بھاری بھرکم اور قد آور شخصیت ہیں جن کا دل اسلامی انقلاب کی جدوجہد کیلئے ہر آن دھڑکتا رہتا ہے۔ آپ انجمن خدام القرآن سندھ کے صدر ہیں اور شام الہدیٰ کی تقاریب کے

ن تنظیم اسلامی حلقہ کراچی کے امیر بھی تھے۔ (بوقتِ تحریر ہذا انہیں انجمن کے مقاصد کے لئے
، وقت لگانے کی خاطر 'تنظیم' کی امارت سے فارغ کیا جا چکا ہے) سید صاحب نے اپنے تلے
ں کے ذریعے سامعین کو ہمہ تن گوش کر دیا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک انہوں نے شامِ الہدیٰ کیلئے
موضوع پر گفتگو فرمائی۔ سید صاحب نے جن کا اندازِ تخاطب جوش کی بجائے ہوش کا مظہر ہوتا ہے'
، دل نشیں پیرائے میں امتِ مسلمہ کی حالت زار کا جائزہ پیش کیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان اب
لک سے زیادہ چار صوبوں کی فیڈریشن بن چکا ہے بلکہ کوشش ہو رہی ہے کہ اسے کنفیڈریشن
ں کر دیا جائے۔ یہاں ایک قوم کی بجائے پانچ قومیتیں بستی ہیں۔ معاشی سطح پر حلال و حرام کی تمیز اٹھ
ہے' صرف دولت کمانا ہی مقصودِ زندگی بن کر رہ گیا ہے۔ سیاسی محاذ آرائی نے اسلامی نظام کے قیام
ر سے بعید تر کر دیا ہے۔ آپس کے اختلافات اور محاذ آرائی سے حکومت بنانے اور بگاڑنے کا کھیل
ا ہے۔ دینی جماعتوں نے فرقہ واریت کو شدید تر کیا ہے۔ طاغوتی طاقتیں متحد ہیں لیکن دینی
توں میں افتراق و انتشار ہے' اختلاف تفرقہ بن چکا ہے' مذہبی رہنما ایک دوسرے کے پیچھے نماز
نے کو تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی گفتگو کا اختتام دوسرے دن کے موضوع کا اعلان کرتے ہوئے
، "تبدیلی کس طرح ممکن ہے!" پھر انہوں نے 'شام الہدیٰ' کے واحد مقرر جناب ڈاکٹر
احمد صاحب کو خطاب کی دعوت دی۔

ڈاکٹر صاحب نے حمد و صلوٰۃ سے اپنے خطاب کا آغاز کیا۔ انہوں نے سورۂ آل عمران کی آیت
کو اپنی گفتگو کی بنیاد کیلئے منتخب کیا تھا: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ
مْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

انہوں نے گفتگو کا آغاز موجودہ دور میں مسلمانوں کے معیارِ زندگی اور مہیا شدہ مادی اسباب
ل کے تذکرہ سے کیا' انہوں نے کہا کہ امتِ مسلمہ اپنی تعداد' وسیع و عریض رقبے اور قدرتی
ں سے مالا مال ہونے کے باوجود عزت و وقعت سے محروم ہے۔ عالمِ اسلام کے حالات کا جائزہ پیش
تے ہوئے انہوں نے امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا سبب جذبۂ ایمان کی کمی کو قرار دیا۔ انہوں نے
نت کی کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں عدم ترقی جزوی اسباب ہیں۔ انہوں نے قرآنی آیات کے
لے سے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ سربلندی کا وعدہ صرف مومنین سے ہے۔ اس وقت ملتِ
سیہ قول و عمل کے تضاد اور نفاقِ عملی سے دوچار ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو کفر کے مقابلے پر نفاق زیادہ
یدہ ہے۔ انہوں نے پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر وجود
آیا تھا' لیکن آج سب سے مخدوش حالت بھی اسی کی ہے۔ انہوں نے سورۂ توبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷
نوالے سے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے اللہ سے وعدہ کر کے اس کی مسلسل وعدہ
کی ہے' جس کے نتیجے میں ہمیں خاص قسم کے نفاق میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ صوبہ

سندھ میں خوف کی حالت ہے، صورتحال غیر یقینی ہے۔ پورے ملک میں کسی کی عزت و آبرو اور جان محفوظ نہیں ہے۔ جتنا اخلاقی زوال پاکستان میں ہے پورے عالم اسلام میں کہیں نہیں ہے۔ یہاں بنیادی انسانی اخلاقیات تک کا جنازہ نکل چکا ہے۔ انہوں نے عرب ترک تصادم اور خونریزی اور سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے خبردار کیا کہ خونریزی کی سزا بھی طویل ہوتی ہے۔ انہوں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حالتِ بد سے نکال دے۔

انہوں نے کہا کہ قیام پاکستان کے بعد آزادی کا مطلب صرف دنیاوی ترقی سمجھ لیا گیا اور اللہ سے کیے ہوئے وعدہ کو پس پشت ڈال دیا گیا جو کہ ہمارا اجتماعی جرم ہے اور آج ہم جس کی سزا کی لپیٹ میں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہ ہو سکنے کی ذمہ داری اُن جماعتوں پر زیادہ عائد ہوتی ہے جو اسلام کے نام پر سیاست کرتی رہی ہیں۔ یہ جماعتیں مظاہراتی دھماتی اور مطالباتی واحتجاجی سیاست میں کامیاب رہنے کے باوجود انتخابی سیاست میں بری طرح ناکام ہوئیں۔ ان جماعتوں نے ترجیحات کا غلط تعین کیا، جس کی وجہ سے نفاذِ اسلام کا عمل آگے نہ بڑھ سکا۔ انہوں نے نہایت دلسوزی سے خبردار کیا کہ ہوش میں آجاؤ مہلتِ عمل ختم ہوتی نظر آرہی ہے۔

۲۹ر مئی شام الہدای کی دوسرے روز کی نشست حسبِ اعلان رات آٹھ بجے شروع ہوئی۔ ... صاحب نے گذشتہ روز کے خطاب کا خلاصہ بیان کیا اور سوال وجواب کی نشست کیلئے یاد دہانی کرائی جس کا منعقد ہونا ۳۰ر مئی کو ہوٹل جبیس میں طے تھا۔ آج کے موضوع کی وضاحت بھی کی کہ موجود انتشار سے گلو خلاصی کیلئے چارۂ کار کیا ہے۔ تقریباً ۱۵ منٹ کی مختصر لیکن جامع ومؤثر گفتگو کے ذریعے انہوں نے سامعین کے دلوں کو گرما دیا۔ آج موضوع کی مناسبت سے سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ اور سورۂ توبہ کی آیات ۱۱۱۔ ۱۱۲ کا متن بھی تقسیم کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تقریباً دو گھنٹے کا خطاب فرمایا۔ چونکہ آج کا موضوع پاکستان ہی کے حالات سے متعلق تھا اس لئے خطاب میں ارتکاز بھرپور تھا۔ ان کے خطاب کا تانا بانا اسلامی جماعتوں کے لائحہ عمل کے گرد گھومتا رہا۔ انہوں نے فرمایا کہ دینی جماعتیں انتخابی سیاست کو چھوڑ کر نہی عن المنکر کے فریضے پر کاربند ہو جائیں تو اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ آسان ہو جائے گی۔ انہوں نے قرآنی آیات واحادیثِ شریفہ کی روشنی میں نہی عن المنکر کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کے نام پر سیاست کرنے والی جماعتوں نے متعدد مواقع پر خالص دینی معاملات پر مطالباتی ومظاہراتی سیاست کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے کے باوجود اس راستہ کو چھوڑ دیا اور انتخابی سیاست کے خارزار میں پھنس گئے۔ تبلیغی جماعت کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اُسے دعوت وتبلیغ کے کام سے آگے بڑھ کر منکرات کے روکنے کیلئے جدوجہد کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ نہی عن المنکر کے فریضے کو ادا کرنے کیلئے معتد بہ تعداد میں ایسے افراد کا منظم ہونا ضروری ہے جو خود بھی دین

عمل پیرا ہوں' معروف پر کاربند اور منکرات سے اجتناب کرنے والے ہوں۔ انہوں نے احادیث کی روشنی میں کہا کہ اللہ کی رسی قرآن حکیم ہے' جسے مضبوطی سے تھامنے سے ایسی انسانی اجتماعیت وجود میں آتی ہے جو کہ ذہنی و فکری ہم آہنگی کا مظہر ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف حیوانی اجتماعیت ڈنڈے کے زور سے پیدا کی جاتی ہے۔ قرآنی سوچ' فکر اور نقطۂ نظر میں یکسانیت پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی پاداش میں بھوک اور خوف مسلط کر دیا جاتا ہے۔ آسمانی فیصلے معاشرہ کے مجموعی مزاج کے مطابق صادر کیے جاتے ہیں۔

انہوں نے جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام سے اپنی پالیسی پر نظر ثانی کی درخواست کی کہ وہ انتخابی سیاست چھوڑ کر منکرات کے خلاف جدوجہد کیلئے کمر ہمت کس کر میدان میں آجائیں' کیونکہ یہی وہ راستہ جس کے ذریعے یہاں اسلامی نظام نافذ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انتخابی سیاست میں قوت تقسیم ہوتی ہے' گندی مچھلیوں کو جگہ ملتی ہے' ہوسِ اقتدار کا شبہ خلوص کے باوجود باقی رہتا ہے اور فیصلہ کن حیثیت تعداد کو حاصل ہوتی ہے' جبکہ مطالباتی سیاست اتحاد کا ذریعہ بنتی ہے۔ قربانی دینے والے لوگ ہی آگے جگہ پاتے ہیں۔ خلوص پر شبہ کا امکان نہیں رہتا اور اقلیت بھی جذبہ' ایثار و قربانی اور تنظیم کے بل پر کامیاب ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ایک نئی سیاسی پارٹی کی تشکیل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی جماعتوں کے کلب میں ایک ممبر کے اضافہ سے ان کے ووٹوں کی مزید تقسیم کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔

انہوں نے بھارتی مسلمانوں کی عظیم جدّوجہد کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اپنے پرسنل لاء میں مداخلت کی شدت سے مزاحمت کی اور حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا' جبکہ ہمارے ملک میں غیر اسلامی عائلی قوانین ایک مدت سے نافذ ہیں' لیکن کسی مذہبی جماعت کو اس کے خلاف تحریک چلانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مذہبی جماعتوں نے اپنی قوت اور توانائی انتخابی سیاست میں ضائع کر دی۔ انہوں نے کہا کہ خالص دینی مسائل پر سیاسی اغراض سے بالاتر ہو کر تحریک چلائی جائے تو اسلامی نظام کے قیام کی منزل آسان ہو جائے گی۔ انہوں نے پیشکش کی کہ جماعت اسلامی انتخابی سیاست سے دستبردار ہو جائے تو وہ ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے اس میں شمولیت کیلئے تیار ہیں۔

۳۰ رمئی (صبح) ۔ اجتماعِ رفقاء

رفقاء ساڑھے سات بجے امیر حلقہ جناب سراج الحق سید صاحب کی رہائش گاہ واقع شمالی ناظم آباد میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ کراچی اب اپنے رقبہ و آبادی کے لحاظ سے بڑی وسعت اختیار کر چکا ہے اور کسی ایک انتہا سے دوسری تک پہنچنے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا ہے' چنانچہ رفقاء کی آمد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجتماع کی کارروائی کا آغاز آٹھ بجے کیا گیا۔ اس فورم میں ذمہ دار حضرات نے کم کم ہی حصہ لیا' ممکن ہے انہوں نے رفقاء کو زیادہ سے زیادہ وقت دے کر تربیت کا سامان فراہم کیا ہو۔ خاص رفقاء کو

امیر محترم نے خود طلب فرمایا اور اظہارِ خیال کا حکم بھی دیا۔ اجتماع میں ملکی حالات خصوصاً سندھ اور کراچی کی صورتحال کا تجزیہ پیش کیا گیا اور مستقبل میں تنظیم کے کردار سے متعلق آراء بھی پیش کی گئیں۔ توسیعِ دعوت کے ضمن میں بھی گفتگو ہوئی۔ یہاں اُن اصحاب کیلئے اس بات کا بطورِ خاص ذکر کیا جاتا ہے جو تنظیم اسلامی کی امارت کو طنزاً "آمریت" سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس اجتماع میں امیر محترم کی ذات کو بھی، تمام آداب و اعزاز ملحوظ رکھتے ہوئے ہدفِ تنقید بنایا گیا جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے سنا۔ آخر میں امیر محترم نے خطاب فرمایا اور تمام مباحث کو سمیٹتے ہوئے رفقاء کو احساسِ فرض کی ترغیب دی کہ بے لوث و بے غرض کارکنان کے بغیر تنظیم کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ اطاعتِ امیر کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ماسوائے معصیت کے تمام امور میں امیر کے حکم کو ماننا ضروری ہے ورنہ یہ بد عہدی ہو گی۔ انہوں نے توجہ دلائی کہ حیلے بہانوں سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں آرمی ڈسپلن کی ضرورت ہے۔ انہوں نے رفقاء کو بیعت کے تقاضوں پر غور و فکر کی دعوت دی۔ مغالطہ دور کرنے کیلئے فرمایا کہ ہم کسی بڑے اقدام کیلئے پلان کرنے نہیں جا رہے البتہ آبادیوں میں کچھ نہ کچھ حرکت ضرور ہونی چاہئے۔

۳۰ مئی (شام) نشست سوال و جواب

شام الہدیٰ کا اصل پروگرام تو دو روزہ ہی تھا، لیکن تیسرے روز ہوٹل جبیس میں منعقد ہونے والی سوال و جواب کی نشست نے اسے سہ روزہ تقریب کی شکل دے دی۔ اس کیلئے شرکاء کو پہلے سے مطلع کر دیا گیا تھا۔ اس نشست کو شام الہدیٰ کی توسیع (EXTENSION) کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ باعثِ تقریب یہ امر قرار پایا کہ دورانِ خطاب عموماً سامعین کے ذہنوں میں اشکال و سوالات ابھرتے ہیں اور وقت کی کمی کی وجہ سے موقع ہی پر جوابات دینا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی مدِ نظر تھی کہ سامعین کو اپنے سوالات مرتب کرنے کا موقع بھی فراہم کر دیا جائے، جس کے لئے باقاعدہ چھپے ہوئے فارم (سوال نامے) مہیا کئے گئے، جن میں سوال کنندگان کو اپنے مختصر کوائف بھی درج کرنا تھے۔ ساتھ ہی وقت کی تنگیٔ داماں کا احساس بھی پیش نظر تھا، لیکن کہنا پڑتا ہے کہ اسے رفع کرنے میں کامیابی ممکن نہ ہوئی کیونکہ سوالات کی بھرمار تھی اور وقت کل دو گھنٹے کا تھا، جبکہ کئی سوال انتہائی طوالت کے حامل تھے۔ تاہم محترم ڈاکٹر صاحب نے نہایت تحمل مزاجی سے ایسی تحریروں کو بھی پڑھا اور آڑے تیکھے سوالوں کے جوابات بھی دیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ مقررہ وقت سے بھی زیادہ وقت ہو جانے کے باوجود شرکاء کا ذوق و شوق برقرار تھا اور وہ کھوج کرید کے عمل کو جاری رکھنے پر مصر نظر آتے تھے، لیکن ہوٹل انتظامیہ سے طے شدہ معاملہ کے باعث نشست کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ارادہ و اعلان کے مطابق اب ایسی شام کا انعقاد شاذ کے ضمن میں آئے گا۔ شامیں ڈھلیں گی اور شبِ دیجور کی صورت اختیار کر جائیں گی لیکن الہدیٰ کا نور جذبہ

رقہ سے ہی حاصل ہو سکے گا کہ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

۳۱ رمئی...... اختتام

آج امیر محترم نے بعد نماز مغرب حلقہ کی شوریٰ کا اجلاس طلب فرمایا تھا لیکن اُن کی اچانک لاہور
مت کے باعث یہ اجلاس ملتوی کر دیا گیا' البتہ تنظیمی امور سے متعلق جو فیصلے انہوں نے صادر فرما
ئے تھے وہ حلقہ کے ماہانہ اجتماع منعقدہ جمعہ ۲رجون میں رفقاء تک پہنچ گئے' جس کے مطابق سراج الحق
صاحب کو حلقہ کی امارت سے فارغ کر کے شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کو امیر حلقہ کراچی نامزد کیا گیا
' جو تنظیم کی معروف شخصیت ہیں۔ حلقہ کا دفتر بھی شمالی ناظم آباد سے داؤد منزل ' شاہراہ لیاقت
منتقل کر دیا گیا ہے ' اسی طرح شرقی تنظیم کی امارت انجینئر طارق سعید صاحب کو تفویض کی گئی ہے جو کہ
سینئر رفقاء میں سے ہیں اور پہلے بھی مختلف ذمہ داریاں نبھاتے رہے ہیں۔ سابقہ امیر جناب عبدالرؤف
خان صاحب اپنی پیرانہ سالی اور طبیعت کی مسلسل ناسازی کی بناء پر متعدد موقعوں پر معذوری کا اظہار کر
چکے تھے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ ان فیصلوں کو بابرکت بنائے اور ان خادمانِ دین کو اپنے
دین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تربیتی پروگرام برائے مبتدی رفقاء

تنظیم اسلامی پاکستان کے چودھویں سالانہ اجتماع کے موقع پر تنظیم کی رفتار کار اور مجموعی کار کردگی
کو بہتر بنانے کے لئے جہاں اور بہت سے اہم اور دور رس نتائج کے حامل فیصلے کئے گئے وہاں ایک فیصلہ
رفقاء کی مناسب تربیت کیلئے تربیت گاہوں کے انعقاد کا بھی تھا۔ اس فیصلے کی رُو سے ہرماہ کے پہلے جمعہ
سے دوسرے جمعہ تک ایک تربیت گاہ کا اہتمام ہونا تھا جس میں ایسے رفقاء کی تربیت پیش نظر تھی جو نئے
نئے بیعت کے مرحلے سے گزر کر تنظیم میں شامل ہوئے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی تربیت گاہ قرآن
اکیڈمی لاہور میں ۲ر تا ۹رجون منعقد ہوئی۔ اس تربیت گاہ کا مقصد رفقاء کو تنظیم کے مقاصد اور
طریقہ کار سے روشناس کرانا تھا تا کہ اپنے ہدف یعنی (پوری دنیا میں غلبۂ دینِ اسلام) کے تصور کو واضح
طور پر اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے مناسب انداز میں پیش قدمی کر سکیں۔ تربیت گاہ میں شریک رفقاء کے
تأثرات کو قارئینِ میثاق کی خدمت میں پیش کرنے کی ذمہ داری راقم کے سپرد کی گئی ہے تا کہ تربیت گاہ
سے حاصل ہونے والی افادیت کو بعینہٖ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔
اس تربیت گاہ میں پاکستان کے مختلف اضلاع یعنی راولپنڈی ' ملتان ' لاہور ' گجرات '

گوجرانوالہ، وزیر آباد اور شجاع آباد کے کل تیرہ رفقاء نے شرکت کی سعادت حاصل کی، جن میں طالب علم، ملازم اور کاروباری حضرات شامل تھے۔ تمام حضرات نے نہایت جوش وجذبہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام معمولات میں بھرپور حصہ لیا۔ عام زندگی کے معمولات سے ہٹی ہوئی ترتیب کے باوجود کسی رفیق نے عدم دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کا احساس ترقی کرتا رہا۔ تربیت گاہ کا پروگرام نہایت جامعیت کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا۔ دن بھر کے معمولات کو اس حکمت سے ترتیب دیا گیا تھا کہ ایک عام انسان اور ایک مسلمان کے طرز زندگی میں واضح فرق محسوس ہوا اور شرکاء میں دینی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر زندگی گزارنے کی تڑپ پیدا ہوئی۔

روزانہ کے معمولات...... خوابِ غفلت سے بیداری کا وقت تین بجے صبح تھا اور نمازِ فجر سے قبل تہجد، ذکر اللہ اور تلاوت کلام پاک کی سعادتوں سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملتا۔ اس قیمتی وقت میں ناظم تربیت میاں نعیم صاحب کی مستقل رفاقت میں وقتاً فوقتاً ترغیب وتشویق کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔

بعد از نمازِ فجر تجوید القرآن کا پروگرام ہوتا جس میں پانچ قرّاء اور حفاظِ کرام کی مستقل رفاقت میں تلاوت کلام پاک کی تصحیح، پوری نماز مع ترجمہ اور آخری پانچ سورتوں کو بہتر انداز میں پڑھنے کی مشق ہوئی۔ ناظمِ تربیت کی ہدایت کے مطابق ساڑھے پانچ بجے صبح سے پونے سات بجے تک آرام کا وقفہ ہو تا کہ بقیہ دن کے معمولات کیلئے پھر سے تازہ دم ہو سکیں۔ سوا سات بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر آٹھ۔ نو بجے تک عبدالرزاق صاحب کا پیریڈ ہوتا جس میں موصوف اپنے بارعب مگر مسکراتے ہوئے انداز میں تنظیم کے قیام کا مقصد، تنظیم کی ہیئتِ ترکیبی (STRUCTURE) دوسری دینی جماعتوں سے مابہ الامتیاز اور رفقاء میں باہمی رابطہ کے موضوع پر مفصل گفتگو فرماتے۔ ۹ تا ۱۰ بجے تک استماع کیسٹ کا پروگرام ہوتا جس میں امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ریکارڈ شدہ تقاریر سننے کا موقع ملتا۔ دین کے بنیادی تصوّرات کو اجاگر کرنے والے موضوعات یعنی "حقیقتِ جہاد، تقربِ الٰہی بذریعہ فرائض و نوافل، تحریک کے کارکنوں کے اوصاف اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا کیوں کیسے؟" پر مشتمل تھیں۔ گیارہ سے پونے بارہ بجے تک ترتیل القرآن کا پروگرام ہوتا، جس میں ہمارے کوئٹہ کے رفیق جناب شاہد اسلام بٹ صاحب اپنے ہنستے مسکراتے انداز میں قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنے کی مشق کرواتے اور تجوید کے بنیادی قواعد سکھاتے۔ پونے بارہ تا ایک بجے میاں محمد نعیم صاحب کی نگرانی میں مطالعہ لٹریچر کا پروگرام ہوتا جس میں ایک تو امیر محترم کی تحریر اور پھر سونے پر سہاگہ میاں محمد نعیم صاحب کا جذب و مستی میں ڈوبا ہوا اور دردبھرا لہجہ جو براہ راست دل پر اثرانداز ہوتا۔ اس پیریڈ میں امیر محترم کے تحریر کردہ چار کتابچوں "(۱) مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق، (۲) نبی اکرم

ے تعلق کی بنیادیں' (۳) فرائض دینی کا جامع تصور اور (۴) راہِ نجات سورۃ العصر کی روشنی
" کا مطالعہ کیا گیا۔ مزید بر آں 'قافلۂ تنظیم منزل بہ منزل' اور امیر محترم کا سوانحی خاکہ اور
اتی و خانگی حالات بھی زیر مطالعہ آئے۔ عصر تا مغرب کا وقت ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے ساتھ
رہا جس میں موصوف اپنے دھیمے اور میٹھے لہجے میں اسلام کے اخلاقی پہلو قرآن و حدیث کی روشنی میں
ر فرماتے۔ اس کے علاوہ نماز کے بنیادی مسائل 'تعمیرِ سیرت و کردار کے لوازم اور غیبت' حسد'
ب' تکبر جیسی باطنی بیماریوں سے بچنے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے' جنہیں عام طور پر معمولی سمجھ کر
انداز کر دیا جاتا ہے جبکہ قرآن و حدیث میں ان کے ارتکاب پر بڑی شدید وعید آئی ہے۔ بعد از نمازِ
ب امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب شرکاءِ تربیت گاہ سے خطاب فرماتے۔ "اسلام کا انقلابی
ر" کے موضوع پر یہ خطاب ایک گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل ہوتا۔

اہدات و تاثرات..... متذکرہ بالا بھرپور اور ہمہ گیر پروگرام پر مسلسل عمل کے دوران
اسات و جذبات پر جو کیفیات طاری ہوئیں اور مجموعی طور پر جو اثرات مرتب ہوئے انہیں الفاظ کا جامہ
ناممکن نہیں۔ ذکر اللہ سے فکر کی کونپلوں کا پھوٹنا اور ان کونپلوں سے عمل کے پھولوں کا کھلنا صرف
ئی اور خاموشی میں حضورِ قلب کے ساتھ مالکِ ارض و سماوات کے حضور سجدہ ریز ہونے سے ہی ممکن
' جس کا بھرپور موقع دورانِ تربیت میسر آیا۔

ازِ فجر میں جناب حافظ محمد رفیق صاحب کی آواز میں تلاوتِ کلام پاک بادِ نسیم کے جھونکوں کی طرح
ں پر دستک دیتی ہوئی محسوس ہوتی۔ قرآن اکیڈمی کی مسجد کے صحن میں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں
ہوئے رفقاء حفاظِ کرام سے تجویدِ قرآن کی مشق کے دوران تلاوت کی غلطیوں کی نشاندہی پر
ندی کے احساس سے دوچار ہوتے اور یقیناً یہی فکرمندی رفقاء میں تصحیح تلاوت کی تڑپ کا باعث
۔ ایک انقلابی تنظیم کے رفیق کی حیثیت سے تنظیم کے مقصد اور ہدف سے پوری پوری واقفیت بھی اس
ن گاہ میں شرکت سے ممکن ہو سکی اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوئی کہ اقامتِ دین کیلئے ایک
ت یا تنظیم کی تشکیل از بس ضروری ہے' جو انتخاب کی بجائے انقلاب کا راستہ اختیار کرے اور بیعت
طاعت فی المعروف کے مسنون طریقے پر قائم ہو۔ امیر محترم کی خداداد صلاحیتوں سے کماحقہ
ہ ہونے کا سب سے مؤثر ذریعہ اُن کے خطابات ہیں جن میں آواز کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ
ہ کی شدت رفقاء میں تڑپ پیدا کرنے میں بڑی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ مسجد کے ہال میں دائرے میں
وئے شرکاء جب پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ امیر محترم کی ریکارڈ شدہ تقاریر سنتے تو ان میں اپنے
ارضا کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ فزوں تر ہو جاتا۔ مطالعۂ لٹریچر میں میاں نعیم صاحب کی
ئی اور وضاحتیں نہایت مفید اثرات مرتب کرتی۔ خاص خاص نکات اس طرح بیان کئے جاتے
ہن نشین ہو جاتے جس سے زبانی [illegible]

اس تربیت گاہ میں سب سے بڑا شرف جو شرکاء کو حاصل ہوا وہ امیر محترم سے براہ راست خطاب
کی سماعت تھی۔ اس طرح "اسلام کے انقلابی منشور" جیسے حساس موضوع کے تحت اسلام کے سماجی
معاشی اور سیاسی نظام کے متعلق نہایت جامع معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا اور حقیقت یہ ہے
اسلام کے نظامِ عدل و قسط کی حقانیت واضح ہو جانے کے بعد بے اختیار اسے اپنی زندگیوں میں نافذ کر۔
اور ساری دنیا کے انسانوں کو اس کی برکات سے بہرہ مند کرنے کا ایک عزمِ مصمم دلوں میں پیدا ہوا۔
بحمد اللہ تمام رفقاء فوری طور پر اللہ تعالیٰ کے احکامات کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی زندگیوں میں عملاً نا
کرنے کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہوئے۔

ہفتہ بھر کی اس رفاقت میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ۔
مطابق گزارے ہوئے معمولات نے رفقاء کے دلوں میں خلوص' اخلاص اور محبت و الفت کے د۔
روشن کر دیئے اور انہیں ' رحماء بینھم ' کا مصداق بنا دیا۔ وقت اور نظم کی پابندی جیسے سنہ
اصول (جن سے ہماری قوم مجموعی طور پر محروم ہو چکی ہے) پھر سے دلوں میں اجاگر ہوئے اور وقت جہ
دولت کو دنیاداری کے فضول دھندوں سے بچا کر "اقامتِ دین" جیسے اعلیٰ و ارفع کام میں لگانے
تڑپ پیدا ہوئی۔ وقت کے تیز دھارے سے کچھ دنوں کیلئے علیحدہ ہو کر جن رفقاء کو تربیت گاہ کے ا
گوشۂ عافیت میں آنے کا موقع ملا ان پر یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ زندگی کے معمولاتِ عامہ۔
وقت نکالنا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ انسان ہمت کر کے اللہ کی راہ
قدم اٹھا دے تو اللہ تعالیٰ ضرور راستے کھولتا ہے۔ چند دنوں کے لئے دنیاداری کے معمولات سے نکل
ایک تربیتی ماحول کو اپنانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک معمولات میں ڈھلنا آسا
ہو جاتا ہے اور آنحضورؐ کے عطا کردہ آدابِ زندگی اپنا کر آدمی اپنے ارد گرد رہنے والوں کی زندگی
پر سکون بنا سکتا ہے......... لیکن رفقاء کی زندگیاں ان مبارک آداب اور معمولات سے اُس وقت تک
منور نہیں ہو سکتیں' جب تک وہ تربیت گاہوں کے ان سانچوں سے گزر نہیں پاتے جہاں ادعیۂ ماثور
اذکارِ مسنونہ اور اپنی باطنی بیماریوں کا روزانہ جائزہ لینے کی مشق ہوتی ہے۔

تربیت گاہ کے اس پروگرام سے کامیابی اور پابندی کے ساتھ گزرنے میں جو بات سب سے زیا
ممد و معاون ثابت ہوئی اور جسے میں نے ذاتی طور پر بڑی شدت سے محسوس کیا وہ ناظمِ تربیت جناب میا
نعیم صاحب کی ہمہ وقت رفاقت و راہنمائی' ترغیب و تشویق اور خاص طور پر ان کی فکرمندی اور جا
صادق کی شدت ہے۔ رفقاء کی ضروریات کا خیال رکھنا' دن میں کئی کئی بار ان کا حال واحوال دریافت
کرنا اور تمام اوقات کا کھانا ان کے ساتھ کھانا' یہ سب یقیناً ایسی باتیں ہیں جنہوں نے رفقاء کے خوا
جذبہ کو بیدار کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ پھر قرآن اکیڈمی کے مجموعی ماحول کو دیکھ کر یوں محسو
ہوتا تھا کہ جیسے اپنے ہی گھر میں شب و روز بسر ہو رہے ہوں۔ ہر شخص کے چہرے پر خلوص بھ
مسکراہٹ اور عمل میں نبی اکرمؐ کے اعمالِ مبارکہ کی جھلکیاں نظر آتی تھیں جن سے یہ بات ثابت ہو

۔ دینِ اسلام ہر وقت اور تمام حالات میں قابلِ عمل ہے اور اس پر عمل کرنے سے جو مجموعی ماحول بنتا
ں میں ہر طرف سکون ہی سکون اور راحت ہی راحت نظر آتی ہے۔ امیرِ تنظیم کے سوانحی خاکہ اور
ے خانگی و معاشی حالات کے مطالعہ نے تربیت گاہ میں شریک رفقاء کے دلوں میں عملی طور پر راہِ
ت پر گامزن ہونے کا بھرپور جذبہ پیدا کیا۔
رفقاء کیلئے جو بات سب سے زیادہ خوشی و مسرت کا باعث بنی وہ امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد
ب سے انفرادی ملاقات تھی۔ امیر محترم نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تربیت گاہ کے
ے فرداً فرداً اپنے دفتر میں ملاقات کی، جس نے رفقاء کے دلوں کو طمانیت بخشی کہ اللہ تعالیٰ نے
ایک عظیم محسن کی سرپرستی عطا فرمائی ہے۔ ایک ایسا محسن جو خلوص و اخلاص کا پیکرِ مجسم اور نورِ
رآن سے مزین ہے۔ اللہ تعالیٰ امیر محترم کی زندگی میں برکت عطا فرمائے۔
آخر میں مَیں اپنے تمام رفقاء تنظیم سے دل کی گہرائیوں سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ اقامتِ دین کے
یضے کیلئے جو عہد ہم نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کر کے کیا ہے اس کیلئے کمرِ ہمت باندھ لیں اور
، کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں اس لئے کہ انقلاب ہمیشہ تربیت یافتہ لوگوں ہی کے ہاتھوں برپا
تا ہے اور یہ حقیقت شرکاءِ تربیت گاہ پر پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ جب انسان اپنے پختہ ارادے
ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محنت و کوشش کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ کھول دیتا ہے اور
پاک کی آیت " وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا " کی عملی تفسیر انسان اپنی
ں سے دیکھتا ہے۔

(مرتّب: سعید اظہر عاصم۔ ملتان)

تربیتی پروگرام برائے منتظم رفقاء

کام کسی بھی نوعیت کا ہو، تربیت کے بغیر انجام نہیں پاتا۔ البتہ انقلابی عمل کے لئے تربیت ایک
ر ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اگلے مراحل میں کامیابی کا انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ خصوصاً
ی انقلاب کیلئے تو اس کی اہمیت دہ چند ہو جاتی ہے۔ عام انقلابی نظریات کے برعکس اسلامی انقلاب
روحانیت اور اخلاقیات کو اساسی اہمیت حاصل ہوتی ہے، لہٰذا ایسے انقلاب کے کارکنوں کیلئے اخلاقی
مانی تربیت اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کارکنوں میں اپنے نظریۂ انقلاب کی توسیع
شن کی تکمیل کیلئے حرکت کا جذبہ پیدا کیا جانا اور انہیں نظم کی پابندی کا خوگر بنایا جانا بھی اس تربیت کا
تقاضا ہے۔ ایسی تربیت کے نتیجے میں وہ کارکن تیار ہوتے ہیں جو رات کے راہب اور دن کے مجاہد
تے ہیں۔ گویا ان میں صحابہ کرامؓ کی سیرت " هم رهبان بالليل وفرسان بالنهار " کا

عکس نظر آتا ہے۔ تربیت کے سانچے سے گزر کر کارکنوں کی مختلف صلاحیتیں اور استعدادات نکھر کر سامنے آتی ہیں اور اگلے مراحل کیلئے منصوبہ بندی اور پیش رفت کا انحصار کارکنوں کی انہی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔

تربیت کی اسی اہمیت کے پیش نظر تنظیم اسلامی کے چودھویں سالانہ اجتماع کے موقع پر رفقاء کی مطلوبہ تربیت کیلئے تربیت گاہوں کا ایک مستقل سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور میاں محمد نعیم صاحب کو ناظم تربیت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس سلسلہ کی پہلی دو تربیت گاہیں قرآن اکیڈمی لاہور میں جون ۸۹ء کے دوران منعقد ہوئیں۔ پہلی تربیت گاہ نئے رفقاء کیلئے تھی جو ۲ تا ۹ر جون بحسن وخوبی مکمل ہوئی۔ دوسری تربیت گاہ منتظم رفقاء کیلئے تھی جو ۱۶ تا ۲۳ر جون جاری رہی۔ اس تربیت گاہ کا مقصد رفقاء میں توسیع دعوت کیلئے محنت اور لگن کا جذبہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنے کی تڑپ اور شوق پیدا کرنا تھا۔ راقم کو بھی اس تربیت گاہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ تربیت گاہ کی تفصیلات اور شرکاء کے تاثرات قارئین میثاق کے لئے پیش خدمت ہیں۔

تربیت گاہ کے پہلے روز امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے شرکاءِ تربیت گاہ اور لاہور کے رفقاء سے خصوصی خطاب میں تربیت گاہوں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ رفقاء کی تربیت کی اہمیت توسیع دعوت کے کام سے کہیں زیادہ ہے' کیونکہ ہمارا مقصد محض ہجوم اکٹھا کرنا نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی وروحانی اوصاف سے مزین کارکنوں کی جمعیت فراہم کرنا ہے۔ ۲ تا ۹ر جون منعقد ہونے والے تربیت گاہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے امیر محترم نے فرمایا کہ یہ تنظیم اسلامی کی تاریخ میں پہلی حقیقی تربیت گاہ تھی' ورنہ اس سے قبل سلسلہ درس وتدریس تک محدود رہتا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ تربیت گاہوں کی موجودہ شکل تنظیم اسلامی کیلئے ایک اہم پیش رفت ہے اور ہمارے ہر رفیق کو ان میں ضرور شرکت کرنی چاہئے۔

۱۶ تا ۲۳ر جون کی تربیت گاہ میں کل ۴۹ رفقاء شریک ہوئے۔ ان میں کراچی سے ۱۵' لاہور سے ۸' گجرات سے ۵' راولپنڈی سے ۳' آزاد کشمیر سے ۴' دہاڑی سے ۳' سکھر سے ۲ اور ڈسکہ' سیالکوٹ' قصور' بہاولنگر' پشاور' ملتان' حیدر آباد' ابوظہبی اور کھاریاں سے ایک ایک رفیق نے شرکت کی۔ رفیق محترم جناب میجر خاور قیوم صاحب کو جو خود بھی شریک تربیت گاہ تھے' شرکاء کا امیر مقرر کیا گیا۔ شرکاء کو چھ گروپس میں تقسیم کیا گیا اور ہر گروپ میں سے ایک ساتھی کو گروپ کا امیر بنایا گیا۔ تمام رفقاء نے پورے جوش وجذبہ' دلی آمادگی اور انہماک کے ساتھ تمام معمولات میں حصہ لیا' نظم کی پابندی کی اور امراء سے مکمل تعاون کیا۔ امراء نے بھی اپنے رفقاء کے آرام وسکون کا ہر ممکن خیال رکھا۔ جناب خاور قیوم صاحب نے تو اپنے مشفقانہ مزاج اور انتھک محنت سے اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا۔

اوقات کار کی تقسیم کچھ اس طرح سے تھی کہ شرکائے تربیت گاہ نماز فجر سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل بیدار

تے اور کھانے' آرام اور حوائج ضروریہ کے وقفوں کے علاوہ رات دس بجے تک انتہائی مفید ' دلچسپ
معلومات افزاء پروگراموں میں مصروف رہتے۔
تربیت گاہ کا اہم ترین حصہ امیر محترم کے "اسلام کا انقلابی منشور" پر ایک ایک گھنٹہ کے چھ
بات تھے۔ ان میں سے پانچ خطابات بذریعہ وڈیو کیسٹ ' رفقاء کو دکھانے کا اہتمام کیا گیا' جبکہ
ی خطاب کیلئے امیر محترم خود تشریف لائے۔ ان خطابات نے نہ صرف اسلام کے نظام عدل و قسط کو
کرنے کیلئے مسنون طریق کار کو واضح کیا' بلکہ اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی سماجی ' معاشی اور
ی تبدیلیوں کو بھی کھول کر رکھ دیا۔
کیف و سرور اور سوز و درد میں ڈوبے ہوئے میاں محمد نعیم صاحب کے لیکچرز بلاشبہ اس پورے
رام کی جان تھے۔ ان لیکچرز نے اس پروگرام کو ذکر و فکر اور علم و عمل کی ایک جامع تربیت گاہ بنا دیا۔
صاحب نے اپنے سادہ اور تصنع سے پاک انداز گفتگو میں واضح کیا کہ ہمارے جمود کی اصل وجہ یہ
کہ غلبۂ دین کا جذبہ ہمارے ذہنوں میں تو سما گیا ہے لیکن ابھی قلب کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔
نے رفقاء کے سامنے اس عمارت کا تصور پیش کیا' جس کی تین منزلیں یعنی عبادتِ رب ' شہادت
لناس اور اقامتِ دین زمین سے اوپر ہیں اور حدیث جبرائیل کے حوالے سے تین منزلیں یعنی اسلام '
ن اور احسان زمین سے نیچے ہیں۔ اوپر کی تین منزلوں کا تعلق اگر ذہن اور عمل سے ہے تو نیچے کی تین
ں قلب سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے قلب میں نرمی اور سوز و گداز پیدا کرنے کیلئے سورۃ البقرہ
یت ۷۴' سورۃ الحدید اور متعدد احادیث مبارکہ کی روشنی میں گفتگو فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ کلمہ
افضل ذکر ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ ہی معبود ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ اللہ کو معبود ماننا ہے تو
کا حکم بھی ماننا ہو گا اور قرآن حکیم ہی دراصل اس کا حکم ہے اور سنت رسولؐ اس کا عملی نمونہ ہے۔
اپنانے کیلئے ہمیں سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں بیان شدہ چھ نکاتی پروگرام پر عمل
ہو گا اور اس عمل کو اس درجے پختہ کرنا ہو گا کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ کے مطابق اللہ ' اللہ کے
ل اور جہاد فی سبیل اللہ ہمارے لئے باقی تمام دنیوی رشتوں سے محبوب تر ہو جائیں۔ غلبۂ دین کی
نہد میں ہمیں بھی کسی درجہ میں اسی کشمکش سے دوچار ہونا پڑے ' جس کا سامنا صحابہ کرامؓ اور خود نبی
کو کرنا پڑا اور پھر ہم ہر طرف سے مایوس ہو کر مدد اور استعانت کیلئے رات دن بارگاہ رب العزت
سجدہ ریزی کی تڑپ محسوس کریں۔ میاں صاحب نے عملی مثالوں کی مدد سے بڑی عمدگی سے واضح کیا
لدین ' اولاد ' بیوی اور احباب کو دعوتِ دین کس حکمت کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔

ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے بڑے دل پذیر انداز
یں رفقاء کی توجہ ان باطنی بیماریوں کی طرف دلائی جو انسان کی نیکیوں کو برباد کر کے رکھ
تی ہیں۔ غیبت ' کینہ ' حسد ' تکبر ' بے جا غصہ ' جھوٹ اور ریاکاری جیسی بیماریوں کی نشاندہی

اور ان کی ہلاکت خیزی کی وضاحت کیلئے انہوں نے قرآن و حدیث کے انتہائی جامع حصوں کا انتخاب کیا۔ آپ نے نماز کے مسائل بتانے کے علاوہ ادعیہ ماثورہ کے التزام اور دعوتِ دین کیلئے مخلصانہ انداز اختیار کرنے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔

جناب عبدالرزاق صاحب نے جماعت کی ضرورت' جماعت میں شمولیت کا مقصد' تنظیم اسلامی کی بیعت اجتماعی' تنظیم اور دیگر دینی جماعتوں میں امتیاز' تنظیم اسلامی کا ڈھانچہ اور تنظیم کے رفقاء میں باہمی رابطہ ایسے اہم موضوعات پر لیکچر دیئے۔ انہوں نے ان تفصیل طلب موضوعات کو مختصر وقت میں بڑے جامع انداز سے بیان کیا اور کسی بھی لمحہ کلاس کے ماحول کو خشکی کا شکار نہ ہونے دیا۔ تربیتی پروگرام کا ایک اہم حصہ مطالعہ لٹریچر تھا۔ اس ضمن میں تنظیم اسلامی کی قرار دادِ تاسیس' امیر محترم کی تالیف دعوت الی اللہ' مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصنیف دعوت دین اور اس کا طریقہ کار اور امیر محترم کی تقاریر پر مشتمل کتاب "منہج انقلاب نبوی" کی تلخیص رفقاء کے سامنے لائی گئی۔ یہ فریضہ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے بحسن وخوبی ادا کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جامعہ پنجاب کے شعبہ فلسفہ سے منسلک ہیں اور قرآن اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر بھی۔ ان کی منکسر المزاج متواضع طبیعت نے تمام شرکاء کو بہت متاثر کیا۔

تجوید القرآن کے اصول سکھانے کیلئے قاری افتخار احمد کاظمی صاحب کی کتاب ترتیلِ قرآن سے مدد لی گئی۔ قاری شاہد اسلام بٹ صاحب نے ایک لیکچر میں تجوید قرآن کی اہمیت پر انتہائی جامع انداز میں روشنی ڈالی۔ چھ قاری حضرات نے بڑی مستقل مزاجی سے روزانہ شرکاء کے چھوٹے چھوٹے گروپوں کو تجوید کے قواعد اور الفاظ کے مخارج نہ صرف سکھائے بلکہ قرآن حکیم کی آخری دس سورتوں کی مشق بھی کروائی۔ اس مشق سے نہ صرف رفقاء میں قرآن مجید کو تجوید کے ساتھ پڑھنے کی اہمیت کا احساس دلایا بلکہ اس ضمن میں اپنی خامیوں کو دور کرنے کی پیاس بھی پیدا کی۔ نماز عشاء کے بعد اور اذان فجر سے قبل احادیث مبارکہ کے ذریعہ ذکر الٰہی' قیام اللیل' مسواک کے استعمال اور نماز با جماعت کے فضائل کا بیان رفقاء کے ایمان میں تازگی اور جذبہ عمل میں اضافہ کا سبب بنا۔

نظم کی پابندی کیلئے ہر رفیق کو ایک چارٹ دیا گیا تھا جسے وہ روزانہ بعد نماز عشاء پر کرتا اور خود اپنا احتساب کرتا کہ اس نے دن بھر کن کن معمولات میں حصہ لیا اور کتنے پروگراموں میں بروقت شرکت کی۔

امیر محترم نے تربیتی پروگرام شرکاء کے ہر گروپ کو علیحدہ علیحدہ شرف ملاقات بخشا۔ آپ نے ہر رفیق کا تعارف حاصل کیا اور ان کے ذاتی حالات دریافت کئے۔ اس کے علاوہ

میر محترم نے اپنی اہم مصروفیات کے باوجود روزانہ ایک گھنٹہ رفقاء کے سوالات کے جوابات
ینے کیلئے مرحمت فرمایا۔ ان جوابات نے نہ صرف رفقاء کے بہت سے اشکالات کو دور کیا بلکہ
ن کے علم میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا۔

محترم خادر قیوم صاحب کے خصوصی لیکچرز نے بلاشبہ رفقاء کے قلوب پر انمٹ نقوش قائم
ر دیئے ان کے لیکچرز کا موضوع تھا امیر تنظیم اسلامی کے خانگی اور معاشی حالات اور ان
تراضات کا جواب جو امیر محترم پر ان کی فکر اور ذات کے حوالہ سے کیے جاتے ہیں۔ انہوں
نے سقوط ڈھاکہ سے قبل مشرقی پاکستان میں ہونے والے عبرتناک واقعات اور پاکستانی قوم کی
وجودہ غفلت اور زبوں حالی کا نقشہ اس دردمندی سے کھینچا کہ اکثر رفقاء کی آنکھیں اشک بار
و گئیں۔

تربیت گاہ کے دوران لاہور کی پانچوں تنظیموں نے عریانی اور فحاشی کے خلاف مظاہرہ کا
روگرام بنایا۔ لاہور کی شرقی، شمالی اور غربی تنظیم نے روزنامہ جنگ کے دفتر کے سامنے مظاہرہ
یا جبکہ شرکائے تربیت گاہ نے لاہور کی وسطی اور جنوبی تنظیم کے ہمراہ روزنامہ نوائے وقت کے
فتر کے سامنے مظاہرہ کیا۔ مظاہرہ میں رفقاء کا نظم وضبط مثالی اور ان کا جوش و خروش قابل دید
تھا۔ آج کا دن ان کے لئے اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ عریانی، فحاشی اور دیگر
منکرات کے خلاف جس طوفان کو وہ ایک عرصے سے اپنے سینوں میں تھامے ہوئے تھے آج
نہیں اس کے اظہار کا موقع مل رہا تھا۔ ان کے چہروں پر عزم و حوصلہ ظاہر کر رہا تھا کہ اگر ان کی
زندگی میں اقدام کا مرحلہ آ گیا تو وہ بفضلہٖ تعالیٰ اپنی جانیں دینے سے بھی گریز نہ کریں گے۔

تربیت گاہ کا آخری پروگرام سورۃ الحدید کے جامع درس پر مشتمل تھا جو بذریعہ وڈیو
کیسٹ رفقا کو دکھایا گیا، سورۃ الحدید قرآن حکیم کی بڑی جامع سورہ ہے اور اس پر امیر محترم کے
تفصیلی دروس بذریعہ کیسٹ محفوظ ہیں، لیکن رمضان ۸۸ء میں دورہ ترجمہ قرآن کے دوران
امیر محترم نے مختصر سے وقت میں اس سورہ کا درس جس قدر جامع اور پرتاثیر انداز میں دیا ہے
اس نے بلاشبہ رفقاء کے قلب و دماغ پر گہرا تاثر قائم کیا۔

تربیت گاہ کے معمولات اور پروگراموں کیلئے اوقات کار کی تقسیم بڑی حکمت اور
منصوبہ بندی سے کی گئی تھی۔ اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ شرکاء میں وقت کی قدر و قیمت کا
احساس اجاگر ہوا۔ میاں صاحب کی شرکاء کے ساتھ ہمہ وقت رفاقت بھی ہر رفیق کیلئے باعث
تقویت تھی۔ میاں صاحب کا بار بار امراء سے مشورہ کرنا بھی دراصل انہیں شورائیت کی اہمیت
کا احساس دلانے کیلئے تھا۔ اس تربیت گاہ نے رفقاء کے مابین وہ ذہنی ہم آہنگی، قلبی محبت اور
بے تکلفی پیدا کر دی جو غلبہ دین کی جدوجہد کرنے والوں کیلئے وصف لازم کی حیثیت رکھتی

ہے۔ اسی طرح اس تربیتی پروگرام نے شرکاء کو نہ صرف ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کا شدید احساس دلایا بلکہ ان کو دور کرنے کیلئے نیا جذبہ اور ولولہ بھی عطا کیا۔

تنظیم اسلامی کے ہر رفیق نے بیعت کی صورت میں دین کے غلبہ کی جدوجہد کیلئے ایک عہد کیا ہے۔ اس عہد کی پاسداری اور اپنے ایمان کو جلا بخشنے کیلئے ضروری ہے کہ ایسی تربیت گاہ میں شرکت کی جائے۔ درپیش رکاوٹوں کی دوری کیلئے اللہ سے خصوصی دعا مانگنی چاہیے۔ تجربات شاہد ہیں کہ اگر نیت صاف ہو' جذبہ صادق ہو اور تڑپ سچی ہو تو بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی دور ہو جاتی ہے۔ (مرتب: نوید احمد)

بقیہ: عرضِ احوال

ہے۔ سال اول اور سال دوم دونوں کلاسز پروگرام کے مطابق چل رہی ہیں... لیکن احباب کی جانب سے یہ تقاضا بار بار سامنے آتا تھا کہ قرآن کالج میں ایف اے کلاسز کا آغاز بھی کیا جا چاہیے۔ اس لئے کہ میٹرک کے فوراً بعد کا وقت ہی طلبہ کیلئے آئندہ تعلیم کے سلسلے میں منصوبہ بندی کے اعتبار سے فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اسی طرح کی بعض دیگر وجوہات بھی سامنے آئیں۔ چنانچہ اس سال سے قرآن کالج میں ایف اے کلاسز کے آغاز کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ گویا اب قرآن کالج میں میٹرک کے فوراً بعد طالبعلم کو داخلہ دیا جائے گا اور وہ گریجویشن تک اپنی تعلیم اسی کالج میں اس کیفیت کے ساتھ مکمل کر سکے گا کہ عربی گرامر' ترجمہ قرآن او تجوید کی تعلیم ایک حد تک مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ حدیث وفقہ کی مبادیات سے بھی اس کی شناسائی ہو جائے گی۔ طلبہ اور ان کے سرپرستوں کیلئے اس نئی اسکیم میں اضافی کشش اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس تعلیمی منصوبے میں طلبہ کا کوئی اضافی سال صرف نہیں ہو گا' بلکہ چار سال کے دورانئے ہی میں یہ پورا تعلیمی نصاب مکمل کر لیا جائے گا۔ (انشاء اللہ)۔ البتہ جو طالبعلم ایف اے' ایف ایس سی کے بعد بی اے کرنے کی غرض سے قرآن کالج میں داخلہ لیں گے انہیں بہرحال ایک اضافی سال دینا ہو گا کہ کل دو سال میں بی اے کی تیاری کے ساتھ دینی نصاب کی تکمیل کسی طور ممکن نہیں۔ ایف اے کلاسز میں داخلے میٹرک کا رزلٹ نکلنے کے بعد انہی ایام میں ہوں گے' جب دیگر کالجوں میں داخلوں کا آغاز ہوتا ہے۔ قارئین 'میثاق' کیلئے موقعہ ہے کہ وہ ابھی سے اپنے گھروں اور حلقہ احباب میں شامل ان طلبہ پر کام شروع کر دیں جو اس سال میٹرک کا امتحان دے چکے ہوں اور انہیں ذہناً آمادہ کریں کہ وہ قرآن کالج میں داخلہ لے کر اس حدیث نبویؐ کے کسی درجے میں مصداق بننے کی سعی کریں' جس کی رُو سے قرآن کا پڑھنا پڑھانا ہی بہترین کیریئر ہے۔ خیرکم مَن تعلم القرآنَ وعلّمَهٗ [

خطوط و نکات

مکتوبِ نیویارک

ایک دینی تحریک کے ایک دیرینہ شریکِ سفر کے تاثرات

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ ۷ر دسمبر ۱۹۸۸ء (بخط تحریر محترم قمر سعید صاحب) ۲۸ر دسمبر کو موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ غریب الدیار لوگوں کو بالکل بھول ہی گئے ہوں گے، لیکن خط سے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ ہم سب دین کے ادنیٰ ترین خادم ہیں اور جتنا کچھ اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وطنِ عزیز سے کچھ امیدیں وابستہ ہیں کہ شاید اللہ کا دین وہاں کچھ برگ و بار لائے اس لئے وہاں کی تحریکاتِ اسلامی سے مانوس ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہوں، خواہ دُور سے ہی۔ شاید اللہ تعالیٰ کوئی خدمت لے لے۔

خط کے ساتھ ہی دسمبر ۱۹۸۸ء کا میثاق ملا۔ پڑھا اور ختم بھی ہو گیا۔ "عرض احوال" میں وہی کچھ ہے جو میرے خواب و خیال میں گونجتا رہتا ہے اور اسی کی طرف میں نے توجہ بھی دلائی تھی آپ کو۔ آپ کا CONCERN تحریک اسلامی کے تعلق سے بجا ہے اور ہر سوچنے سمجھنے والا فرد جس کے دل میں اسلام کی محبت ہے اور وہ پاکستان میں اللہ کے دین کو غالب دیکھنا پسند کرتا ہے، اسی انداز پر سوچے گا۔ میں نے "عرض احوال" پڑھنے سے ایک ہفتہ قبل ایک تفصیلی خط محترم اسعد گیلانی صاحب کو بھیجا ہے، جس کا مرکزی مضمون وہی ہے اور میں نے اسی چیز کو اقوام عالم کی سیاست، امریکہ اور روس کی افغانستان کی رسہ کشی اور انقلابِ اسلامی کی آفاقی ضرورت کے پس منظر میں لکھا ہے۔ ان سے میں نے درخواست کی ہے کہ جماعت کو انتخابی سیاست سے نہ کچھ ملا ہے "سوائے بھیک کے چند ٹکڑے" اور نہ آئندہ ملے گا اور نہ پاکستان میں اسلام اس راہ سے آسکتا ہے۔ لہٰذا انتخابی سیاست کو طلاق دے کر کسی اور ہی انقلابی عنوان سے تحریک کی فکری تعمیر کریں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آئندہ آٹھ دس سال تک دنیا کو روسی بھیڑیئے (RUSSIAN BEAR) کی دست برد سے نجات ملے گی۔ روس اپنے حالات کو ٹھیک کرنے میں لگ گیا ہے اور چین پہلے ہی سے اسی ڈگر پر چلا جا رہا ہے۔ ان قوموں کے سرخ انقلابیوں کو دنیا کے دیگر ممالک میں ہنگامے کھڑا کرنے کی فرصت نہیں ملے گی۔ وہ اب اپنی دنیا بنانے کی فکر میں

لگ گئے ہیں۔ مغرب کی آزاد اقوام کے شانہ بشانہ ترقی اور معیاری زندگی بڑھانے کی مسابقت میں لگ گئے ہیں' لیکن میرا خیال ہے کہ ایک دہائی (DECADE) کے اندر ہی انہیں مایوسی ہوگی' اس لئے کہ اشتراکیت اپنی موجودہ ہیئتِ اجتماعی میں ان مقاصد کو حاصل نہ کر سکے گی۔ وہ پھر اپنے پنجے نکال کر اقوامِ عالم کو زیر وزبر کرنے کا کھیل شروع کر دے گی۔

لیکن یہ چند سال ایشیائی بالخصوص مسلم قوموں کیلئے ایک نعمت ہیں جو خاص اللہ کی دین ہے۔ .... اس فرصت میں اگر وہ سنبھل کر اپنے حالات درست کر لیں اور کہیں کسی خطہ میں اسلامی انقلاب چپکے سے لے آئیں تو یورپی اور سرخ اقوام زیادہ شور نہ کریں گی..... پاکستان اور افغانستان یا وہ مسلم ممالک جہاں جہاں اسلامی تحریکیں اقامتِ دین کی جدّوجہد کر رہی ہیں' ان کے لئے سنہری موقع ہے کہ اللہ کا دین قائم کر لیں۔ یہ اس صدی کا دوسرا موقع ہے۔ پہلا موقع ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۸ء تک رہا جب یورپ اپنے زخموں کو چاٹ رہا تھا' امریکہ مارشل ایڈ کے ذریعے اقوامِ یورپ کی تشکیلِ نو میں لگا ہوا تھا اور روس سٹالن کے توڑ پھوڑ کے تجربات سے گذر رہا تھا۔ وہ وقت پاکستان میں اسلامی انقلاب کیلئے بہت موزوں تھا۔ اگر دستوری مہم کو ختم نہ کر دیا گیا ہوتا بلکہ اس مہم کو ۱۹۵۶ء کا دستور بن جانے کے بعد انقلابِ حیات کے رخ پر ڈال دیا گیا ہوتا تو چند برسوں میں پاکستان میں اسلامی انقلاب آ گیا ہوتا اور کسی ایوب خان کو (جو یہود اور صیہونی تحریک کا ایک ایجنٹ تھا) اس ملک کی سیاسی بساط کو الٹ دینے کا موقع نہ ملتا۔

لیکن تحریک اسلامی کا انقلابی راہ کو چھوڑ کر اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک چلائی ہوئی دستوری مہم کے انقلاب انگیز نتائج سے چشم پوشی کر کے انتخابات کے انتظار میں بیٹھ جانا ایک تاریخی غلطی تھی' جس سے فائدہ اٹھا کر اغیار نے ملت کی پوری گاڑی کو DERAIL کرا دیا اور وہ اب تک ٹھیک نہیں ہو رہی ہے۔

اب تیس سال کے بعد یہ موقع پھر آ گیا ہے اگر پاکستان کی دونوں اسلامی تحریکیں مل کر انقلاب کیلئے تیار ہو جائیں' افغانستان کی جنگ آزادی کے منطقی نتیجہ میں اسلامی حکومت کے قیام میں پوری طرح ممدّو معاون ہوں تو پھر تینوں کی متحدہ قوت سے انقلاب کی راہ وطن عزیز میں بھی ہموار ہو سکتی ہے۔ اس کے مواقع میسر ہیں' وقت تیار ہے' بین الاقوامی حالات ساز گار ہیں۔ صرف مسلمان جماعتوں کی ایک متحدہ صورت گری اس کو حاصل کر سکتی ہے۔ اگر تحریک اسلامی سیاست کے میدان سے نہیں' بلکہ صرف انتخابی سیاست سے علی الاعلان دستبردار ہو جائے تو دیگر مسلمان جماعتیں جن کو جماعت سے خدائی بیر ہے' ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو کر ملک کے VESTED INTERESTS کو شکست سے دوچار کر سکتی ہیں اور جس کے بغیر پاکستان میں اسلامی انقلاب کی راہ کبھی بھی ہموار نہیں ہو سکتی ہے۔

میں نے یہی کچھ تأثر اپنے خط میں اسعد گیلانی صاحب کو دیا ہے۔ تنظیم اسلامی کا " OFFER " بھی بہت کھلا ہوا ہے اور نیک ہے' لیکن معاملہ کچھ ایسا ہے کہ جماعت کے اندر بھی کچھ VESTED INTEREST گھس آئے ہیں جو اغیار کا کھیل کھیل کر جماعت کو اندر ہی اندر کر کے اس

اپنے مرکزی مقصد سے کشاں کشاں دور لئے جا رہے ہیں۔ اب تو اس GAME کو طشت از بام ہوتا ہے' ورنہ تحریک ایک SINKING PROCESS میں چلی گئی ہے' جس کیلئے ہم سب ذمہ دار ہوں گے۔
یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اگست میں تشریف لا رہے ہیں۔ میں انشاء اللہ بیگ بھائی کے ہمراہ آپ کے کیمپ میں ضرور شریک ہوں گا۔ ان کا سلام قبول کیجئے۔ آپ یہاں کے رفقاء کو لکھ بھیجئے گا کہ مجھ کو اپنے پروگرام سے مطلع کرتے رہیں۔ ۳۰ ڈالر کا ایک چیک ارسال خدمت ہے جو چندہ ہے میثاق اور حکمت قرآن کا۔ باقی رقم سے کچھ تحریکی لٹریچر ارسال کر دیں' مشکور ہوں گا۔ ایک مشورہ ہے کہ میثاق میں ایک صفحہ پر مطبوعہ کتابوں کی فہرست ضرور دیا کریں' تاکہ لوگوں کو انتخاب میں دشواری نہ ہو اور تشہیر بھی ہوتی رہے۔ میں غالباً مارچ کے آخر یا پھر رمضان کے بعد پاکستان آؤں گا تو انشاء اللہ آپ سے ملاقات رہے گی۔ اپنی نئی کتاب جو یہاں کے مسلمانوں کیلئے لکھی ہے اور ایک کتاب جو امریکی غیر مسلموں کیلئے ہے ارسال خدمت ہے۔ اپنی آراء (VIEWS) سے ضرور نوازیئے گا! ایک دوسری کتاب ابھی زیر تکمیل ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس کا تعارف یا دیباچہ لکھ دیں۔ وہ کتاب یہاں اقامتِ دین کی جدوجہد کیلئے ایک پورا نقشۂ کار پیش کرے گی۔ وہ بھی مسلمانوں کیلئے ہے۔ آپ کو انشاء اللہ جلد ہی اس کا مسودہ ارسال کر دوں گا۔ میری کتاب کمپیوٹر میں داخل ہو چکی ہے۔ کچھ ضروری اصلاح و ترمیم کے بعد جب وہ آخری شکل میں آئے گی تو آپ کو ارسال کر دوں گا۔ امید ہے کہ آپ اس کے لئے وقت ضرور نکالیں گے۔ قمر سعید صاحب اور دیگر رفقائے کار کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

خادم دین شمیم احمد صدیقی

تعلیمی قرضہ فنڈ کا اجراء

ہمارے مشاہدہ میں یہ بات آئی تھی کہ کچھ ضرورت مند طلباء قرآن اکیڈمی یا قرآن کالج میں داخلہ کے خواہشمند ہونے کے باوجود داخلہ سے اس لیے پہلو تہی کر جاتے تھے کہ انجمن سے وظیفہ لینے پر ان کی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر انجمن نے ایک تعلیمی قرضہ فنڈ قائم کر دیا ہے جس سے قرض لے کر ضرورت مند طلباء اپنے تعلیمی اخراجات پورے کر سکیں گے اور برسر روزگار آنے کے بعد آسان اقساط میں یہ قرض واپس کر دیں گے۔

تمام اصحاب سے گزارش ہے کہ وہ مستحق اور ذہین طلباء کی توجہ اس اضافی سہولت کی طرف مبذول کرائیں اور انہیں قرآن کالج اور قرآن اکیڈمی میں داخلہ کی ترغیب دلائیں۔ جو اصحاب اس صدقہ جاریہ میں شرکت کے خواہش مند ہوں وہ اپنا چیک یا ڈرافٹ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام ارسال کریں۔ واضح رہے کہ اس فنڈ میں زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جا سکتی۔

نئی کارمینا نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے زیادہ پُرتاثیر

انسان کی تن درستی کا زیادہ تر انحصار معدے اور جگر کی صحت مند کارکردگی پر ہے۔ اگر نظامِ ہضم درست نہ ہو تو دردِ شکم، بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن، گرانی یا بھوک کی کمی جیسی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں جس کے سبب غذا صحیح طور پر جزوِ بدن نہیں بنتی اور صحت رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگتی ہے۔

پاکستان اور دنیا کے بہت سے ممالک میں ہمدرد کی کارمینا پیٹ کی خرابیوں کے لیے ایک مؤثر نباتی دوا کے طور پر شہرت رکھتی ہے۔ چونکہ یہ ہر گھر کی اہم ضرورت ہے اس لیے ہمدرد کی تجربہ گاہوں میں اس کی افادیت پر ہمہ وقت تحقیق و تجربات کا عمل جاری رہتا ہے۔ نئی کارمینا اسی تحقیق کا حاصل ہے۔ نئی کارمینا کو پودینے کے جوہر اور دیگر مفید و مؤثر اجزا کے اضافے سے زیادہ قوی، پُرتاثیر اور خوش ذائقہ بنا دیا گیا ہے۔

نئی کارمینا نظامِ ہضم کو بیدار کرنے، معدے اور آنتوں کے افعال کو منظم و دُرست رکھنے میں زیادہ کارگر ہے۔

بچوں بڑوں سب کے لیے مفید **نئی کارمینا** ہمیشہ گھر میں رکھیے

تحقیق رُوحِ تخلیق ہے

Adarts

CAR- 4,88

عمر السوسیہ، ابٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۰۱۲ کراچی نمبر ۲

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

۳۸
۸
رام ۱۴۰۹ھ
۱۹۸۹ء
۵/-
زرتعاون ۵۰/-

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات	۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا	۶۔ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ	۹۔ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ	۱۲۔ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ۔ ماڈل ٹاؤن فیروز پور روڈ۔ لاہور (پاکستان)

ادارہ تحریر

ل الرحمٰن
ف سعید
الد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

ناشر: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

اس بار عید الاضحی کے موقع پر امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جہاد افغانستان کو خطاب کا موضوع بنایا۔ 20 منٹ کے مختصر سے خطاب میں انہوں نے سورہ الحج کی اُن چار آیات کے ترجمے کے حوالے سے' جو حج اور قربانی کے بیان کے متصلاً بعد اس سورہ مبارکہ میں وارد ہوئی ہیں' اس حقیقت پر روشنی ڈالی کہ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ افغان جہاد پر یہ آیات یوں منطبق ہوتی دکھائی دیتی ہیں گویا اُن کا نزول اِسی سلسلے میں ہوا ہو۔ اس موقع پر امیرِ تنظیم نے دو ٹوک الفاظ میں مجاہدین کی عبوری حکومت کے تسلیم کرنے میں حکومت پاکستان کی جانب سے تاخیر کو ملت اسلامیہ سے غداری کے مترادف قرار دیتے ہوئے ایک قرارداد کی صورت میں حکومت پاکستان سے پر زور مطالبہ کیا کہ مجاہدینِ افغانستان کی عبوری حکومت کو بلا تاخیر تسلیم کیا جائے۔ مسجد دار السلام باغ جناح کے سبزہ زاروں میں صفیں باندھے ہزاروں فرزندانِ توحید نے اس قرارداد کو بالاتفاق منظور کیا جسے بعد میں پریس ریلیز کی شکل میں اخبارات کو بھجوا دیا گیا۔ لیکن یہ نہایت عجیب بلکہ قابل افسوس معاملہ ہے کہ ملک کے چوٹی کے اخبارات' جو امیر تنظیم کے اُن بیانات کو جن سے موجودہ جمہوری نظام کو بلاواسطہ یا بالواسطہ تقویت پہنچتی ہو بڑے اہتمام سے ہی نہیں بلکہ کچھ اِس انداز سے شائع کرتے ہیں کہ امیر تنظیم کا موقف یک رُخے انداز میں پبلک کے سامنے آتا ہے' اس قرارداد اور خطابِ عید کے پریس ریلیز کو بالکل ہضم کر گئے۔ حالانکہ عید سے ایک روز قبل مذکورہ بالا خطاب عید اور اس کے موضوع کا اخبار میں باقاعدہ اشتہار بھی دیا گیا تھا تاکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے ساتھ ساتھ پریس کے لوگ بھی متوجہ ہو جائیں۔ لیکن ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اِن اخبارات والوں کو کیا کہا جائے! قارئینِ "میثاق" کے افادے کے لئے محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب مع قرارداد کے اِس پرچے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

قارئین کے علم میں ہو گا کہ گذشتہ چند ماہ سے مسجد دار السلام میں جہاں امیر تنظیم اسلامی اجتماعِ جمعہ سے خطاب فرماتے ہیں' نماز جمعہ کے بعد باقاعدگی سے سوال جواب کی ایک مختصر نشست منعقد ہوتی ہے جس میں نمازی حضرات دلچسپی اور انہماک سے شریک ہوتے ہیں۔ عید سے متصلاً قبل 7 جولائی کے اجتماعِ جمعہ میں خطبہ و نماز کے بعد سوال جواب کی نشست میں شرکاء جمعہ کی جانب سے امیر محترم سے جو سوالات کئے گئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا پیپلز پارٹی کا مشہور نعرہ "طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں" شرک کے زمرے میں آتا ہے یا اس کی کوئی تاویل ممکن ہے؟ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس مختصر وقت میں جو جواب دیا وہ خود اپنی جگہ مزید تشریح کا متقاضی تو تھا ہی مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اخبارات میں اس کی رپورٹنگ جس انداز میں ہوئی اس سے عام لوگوں کے ذہنوں میں خلجان کا پیدا ہونا فطری تھا۔

چنانچہ اخبارات میں بعض پر ایک آدھ حلقے کی جانب سے تنقیدی بیانات بھی شائع ہوئے۔ اس سے اگلے جمعے میں، کہ عید الاضحی بھی اتفاق سے اسی روز تھی، امیر محترم نے تفصیل سے اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اسی خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز اخبارات کو ارسال کیا گیا لیکن عید کے سبب چونکہ دو دن اخبارات کے دفاتر میں تعطیل رہی لہٰذا وہ وضاحتی بیان بھی اخبارات کے صفحات میں جگہ نہ پا سکا۔ بہت مناسب ہوتا اگر ہم اس خطاب کو ٹیپ کی ریل سے صفحہء قرطاس پر منتقل کر کے اس پرچے میں شائع کرتے لیکن بوجوہ ایسا ممکن نہ ہوا۔ تاہم "مَالَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ" کے اصول کے تحت اس خطاب کے پریس ریلیز کو بھی اسی شمارے میں شامل کیا گیا ہے، جس سے معاملہء زیرِ بحث کی کسی قدر وضاحت ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں "مسلم فیملی لاز آرڈی ننس پر علماء کرام کا تبصرہ" کے عنوان سے وہ تاریخی دستاویز شائع کی جا رہی ہے جسے بجا طور پر پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ میں علماء کرام کی خدمات کے باب میں ایک اہم سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ مارچ 1961ء میں شائع ہونے والی یہ دستاویز اُن اباحیت پرست دانشوروں کے منہ پر ایک زوردار طمانچے کی حیثیت رکھتی ہے جن کے خیال میں دین کے بنیادی مسائل پر علماء متفق و متحد نہیں ہیں اور انہیں مسائلِ دینیہ کے معاملے میں کسی بھی متفقہ رائے پر جمع نہیں کیا جا سکتا۔ سابق صدر ایوب خان کے نافذ کردہ عائلی قوانین کے خلاف، جو در حقیقت غلام احمد پرویز کے تصنیف کردہ تھے، تمام قابلِ ذکر مکاتبِ فکر کے علماء کرام کا متّفقہ بیان ایک برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں مروّجہ عائلی قوانین کا غیر اسلامی ہی نہیں غیر فطری ہونا بھی قطعیّت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے وہاں یہ دستاویز احکامِ دین کے بارے میں علماء کرام کے فہم و تفقّہ پر عمومی اعتماد میں اضافے کا باعث بھی بنتی ہے۔ علماء کرام کے اس متفقہ بیان کے ہوتے ہوئے مملکت اسلامیہ پاکستان میں پرویز صاحب کے تجویز کردہ خلاف اسلام عائلی قوانین کا بدستور نافذ رہنا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک میں قومی و ملکی سطح پر احکامِ دین کا نفاذ شروع ہی سے ہماری ترجیحات میں شامل نہ تھا۔ اور شاید اسی جرم عظیم کی سزا آج پوری پاکستانی قوم بدترین خانہ جنگی کی شکل میں بھگت رہی ہے جس کا فتنہ مملکت خداداد پاکستان میں ہر چہار طرف نت نئی صورتوں میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ اور ہر آنے والی صبح اندیشوں اور خدشات کی ایک نئی لہر لے کر طلوع ہوتی ہے۔ نہ معلوم ہمیں ہوش کب آئے گا اور وہ مبارک ساعت کب آئے گی جب ہم اجتماعی توبہ کا راستہ اختیار کر کے اپنے جرم کی تلافی کا کچھ سامان کر سکیں گے؟ خدشہ یہ ہے کہ اس شبھ گھڑی آنے سے قبل اللہ کی طرف سے دراز کردہ رسی کھینچ لی جائے اور ہم کفِ افسوس ملتے رہ جائیں۔ "اعاذنا اللہ من ذلک"!!!

خنک روزے بود یا بیم اگر خضرِ ہدایت را
کہ ہموار لقمہ، مالعمہ لسـتے گماں گر شدا

کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم حاصل کرنیکا بہترین موقع
قرآن کالج
نوٹس داخلہ
میں ایف اے (سال اوّل) میں داخلے کے لیے فارم جمع کرانے کی آخری
تاریخ ۳۱ اگست ۸۹ ہے۔ نتیجے کے منتظر طلبہ بھی درخواست دے سکتے ہیں
تفصیلات کے لیے پراسپکٹس طلب فرمائیں۔
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور
تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے
ماہ اگست کے مجوزہ پروگرام
۴ تا ۱۱ اگست ۸۹ تربیت گاہ برائے مبتدی رفقاء
بمقام: مرکزی دفتر تنظیم اسلامی، گڑھی شاہو، لاہور
(۲)
۱۰ تا ۱۱ اگست ۸۹ تعارفی و تنظیمی اجتماع طلباء تنظیم اسلامی پاکستان
بمقام: قرآن اکیڈمی، لاہور
(۳)
۱۱ تا ۱۸ اگست ۸۹ تربیت گاہ برائے منتظم رفقاء
بمقام: قرآن اکیڈمی، لاہور

نئی کارمینا نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے زیادہ پُرتاثیر

انسان کی تن دُرستی کا زیادہ تر انحصار معدے اور جگر کی صحت مند کارکردگی پر ہے۔ اگر نظامِ ہضم درست نہ ہو تو دردِ شکم، بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن، گرانی یا بھوک کی کمی جیسی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں جس کے سبب غذا صحیح طور پر جُزوِ بدن نہیں بنتی اور صحت رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگتی ہے۔

پاکستان اور دنیا کے بہت سے ممالک میں ہمدرد کی کارمینا پیٹ کی خرابیوں کے لیے ایک مؤثر نباتی دوا کے طور پر شہرت رکھتی ہے۔ چونکہ یہ ہر گھر کی اہم ضرورت ہے اس لیے ہمدرد کی تجربہ گاہوں میں اس کی افادیت پر ہمہ وقت تحقیق و تجربات کا عمل جاری رہتا ہے۔ نئی کارمینا اسی تحقیق کا حاصل ہے۔ نئی کارمینا

کو پودینے کے جوہر اور دیگر مفید و مؤثر اجزا کے اضافے سے زیادہ قوی، پُرتاثیر اور خوش ذائقہ بنا دیا گیا ہے۔

نئی کارمینا نظامِ ہضم کو بیدار کرنے، معدے اور آنتوں کے افعال کو منظم و دُرست رکھنے میں زیادہ کارگر ہے۔

بچوں بڑوں سب کے لیے مفید **نئی کارمینا** ہمیشہ گھر میں رکھیے

تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

darts

CAR- 4,88

مجاہدین افغانستان کی عبوری حکومت کو بلا تاخیر تسلیم کیا جائے

اس معاملے میں تاخیر و تعویق ملّتِ اسلامیہ سے غداری کے مترادف ہے

——— عیدالاضحیٰ کے اجتماع سے امیر تنظیم اسلامی کا خطاب ———

(ترتیب و تسوید: حافظ خالد محمود خضر)

حضرات! بارہا میں نے جمعہ اور عیدین کے خطابات میں یہ بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں حج اور عیدالاضحیٰ کے سلسلہ میں جو آیات وارد ہوئی ہیں' سورۃ البقرہ میں ان سے متّصلاً قبل اور سورۃ الحج میں ان سے متّصلاً بعد قتال یعنی اللہ کی راہ میں جنگ کا ذکر آیا ہے' اس کی بڑی حکمت ہے اور خاص طور پر عیدالاضحیٰ کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ آج کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ کام 'اہراق الدّم' ہے۔ یعنی اللہ کے پیدا کردہ جانور جو اس نے ہمیں عطا کئے ہیں (عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ) اُن پر اللہ کا نام لیا جائے اور ان کا خون بہایا جائے۔ اللہ کے نام پر جانوروں کو قربان کرنے کی بڑی معنوی مناسبت ہے اللہ کی راہ میں جنگ کرنے سے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحج میں اس مضمون کے فوراً بعد جہاد و قتال کا مضمون وارد ہوا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کی آیات ۲۴ تا ۳۷ کا ترجمہ و مفہوم بلکہ تفصیل کے ساتھ ان کے مضامین میں اپنے جمعہ کے خطاب میں بیان کر چکا ہوں کہ اس کی قربانی کی اصل روح کیا ہے! اس کی روح ہے تقویٰ...... اس کی روح ہے اسلام...... اللہ کے نام پر' اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کی خاطر تن من دھن لگا دینا' جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی اسی کام میں کھپا دی اور ہر امتحان میں پورے اترے۔ جس وقت جو مرحلہ بھی آیا اور جس چیز کی قربانی دینی پڑی' انہوں نے اللہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ یہاں تک کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے' بلکہ چھری پھیر دی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت

ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَا اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا...... "اے ابراہیم، تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا (تم اس امتحان میں کامیاب ہو گئے)" ...... یہ قربانی جو سنتِ ابراہیمی ہے، اس کی روح یہ ہے کہ اسی طریقے سے ہر مسلمان، ہر مدعیٔ ایمان اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ و تیار رہے۔ اگر یہ جذبہ پیدا ہو تو یہ قربانیاں قربانیاں ہیں۔ اور اگر یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا تو یہ محض ایک رسم ہے جو ہم پوری کر رہے ہیں۔

اس کے بعد کی چار آیات (۳۸ تا ۴۱) کا بڑا گہرا تعلق اس وقت عالم اسلام میں جو سب سے نمایاں جہاد ہو رہا ہے یعنی جہاد افغانستان، اُس سے ہے۔ سب سے نمایاں اس لئے کہ ویسے تو پورے عالم اسلام میں اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں۔ مختلف جماعتیں اور مختلف تحریکیں اسلام کے غلبے اور احیاء کے لئے جدّوجہد کر رہی ہیں۔ لیکن تمام ممالک میں یہ جدّوجہد پرامن ہے۔ دعوت، تبلیغ، تنظیم، لوگوں کو اس کے لئے آمادہ و تیار کرنا...... اور پھر مختلف ذرائع سے...... کہیں الیکشن کے ذریعے سے...... کہیں DEMONSTRATION کے ذریعے سے شعائرِ دینی اور اللہ کے احکام کی تنفیذ کا مطالبہ کرنا، یہ وہ جہاد ہے جو ہر جگہ مختلف جماعتوں اور مختلف تحریکوں کے زیر قیادت ہو رہا ہے...... لیکن افغانستان میں قتال فی سبیل اللہ کے سلسلہ کو جاری ہوئے دس برس ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ میں نے جب ان چار آیات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ آیات خاص اسی وقت کے لئے اور اسی افغان جہاد کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ ذرا ان کا ترجمہ سنیئے اور پھر ان کا انطباق دیکھئے!

یہ کلام اللہ کا اعجاز ہے کہ چودہ سو برس قبل نازل ہونے والا کلام ہمیں آج بھی ہر ہر قدم پر، ہر ہر مرحلے پر رہنمائی عطا فرماتا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ یُدَافِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ○

"بے شک اللہ تعالیٰ مدافعت کرتا ہے اہلِ ایمان کی طرف سے۔ اور اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں وہ جو خیانت کرنے والے اور ناشکرے ہیں"۔

اس میں درحقیقت وعدہ کیا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم کمرِ ہمت کس لو تو تمہاری مدافعت ہم کریں گے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم تمہارے عزم کا امتحان لیں گے، ذرا ٹھونک بجا کر دیکھیں گے کہ یہ "واقعتہً" ہماری راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ لیکن اگر تم اس ابتدائی امتحان میں کامیاب ہو جاؤ تو یاد رکھو، ہمارا وعدہ ہے کہ ہم مدافعت کریں گے تمہاری طرف سے۔ یہ جو خائن ہیں، ناشکرے ہیں، یہ اللہ کو قطعاً پسند نہیں ہیں۔ اب

آپ دیکھئے کہ افغانستان میں روس کی جو کٹھ پتلی حکومتیں بنیں اور اب بھی موجود ہیں ' یہی ہیں جن پر اس وقت لفظ خائن کا سب سے بڑا اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہ نام لیتے ہیں اللہ کا اور اس کے رسولؐ کا اور اسلام کا' ان کے نام مسلمانوں کے سے ہیں..... لیکن یہ سائنٹفک سوشلزم اور سائنٹفک مارکسزم کے ماننے والے ہیں۔ آج انہوں نے منافقانہ انداز اختیار کیا ہے۔ اب وہ مسجدوں میں جاکر تصویریں اترواتے ہیں 'لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو دین کا استہزاء و تمسخر کرتے تھے۔ شعائرِ دین کا مذاق اڑایا کرتے تھے ' تو اللہ کو یہ لوگ پسند نہیں ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا امتحان لے رہا تھا۔ اس کے بعد اللہ کا وہ وعدہ سچا ہوا کہ اللہ تعالیٰ مدافعت فرمائے گا۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ میرے علم میں ذاتی طور پر یہ بات موجود ہے اور میں نے کئی مرتبہ اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ میجر محمد امین منہاس صاحب جو اسلام آباد کی ایک معروف شخصیت ہیں ' ۱۹۷۹ء میں جب افغان جہاد کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ امارات میں کاروبار کر رہے تھے اور ان کا شمار وہاں کے بڑے سیٹھوں میں تھا۔ ان کی یہ شہادت ہے کہ اُن دنوں افغان مجاہدین کا وفد وہاں گیا تھا اور وہ نقد رقم سے ہتھیار خریدنا چاہتے تھے 'لیکن کوئی انہیں نقد قیمت پر بھی ہتھیار فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ نہتے میدان میں نکل آئے اور پھر اللہ کی مدد بھی آگئی۔ اللہ کی یہ مدد مختلف ذرائع سے آتی ہے۔ چنانچہ یہ مدد چاہے ایک سپر پاور کی طرف سے آئی ہے لیکن واقعتاً یہ اللہ کی مدد ہے۔ ابتداء میں یہ مدد موجود نہیں تھی۔ یہ نہتے میدان میں آئے اور چھاپہ مار کارروائیوں کے نتیجے میں روسیوں سے ہتھیار چھینے۔ وہ جب اللہ کے بھروسے پر میدان میں آگئے تو اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔

اگلی آیت میں ارشاد ہوا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ○

" (آج سے) اذن دیا جا رہا ہے اُن لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونس دی گئی ہے۔ اس واسطے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے 'اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کی نصرت پر قادر ہے "۔

ذرا یاد کیجئے یہ آیات اتری ہیں چودہ سو برس قبل جب مہاجرینِ مکہ نے بارہ برس تک ظلم و ستم کا مقابلہ کیا اور ہاتھ نہیں اٹھایا' کیونکہ اس کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے انہیں مدینہ منورہ کی صورت میں ایک مرکز (BASE) عطا کر دیا تو ساتھ ہی اذنِ قتال دے دیا' یعنی آج سے تمہیں بھی اجازت ہے کہ تم بھی میدان جنگ میں آؤ اور اینٹ کا جواب پتھر

سے دو۔ یہی معاملہ افغانستان میں ہوا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ احیائی تحریک وہاں بھی تھی۔ علمائے کرام اپنے انداز سے دین کی خدمت کر رہے تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوان ' جنہیں اس دور میں اسلام کی دعوت نے مسخر کیا ' وہ اللہ کے دین کے غلبے اور اس کے احکام کی تنفیذ کے لئے اپنے طور پر پرامن طریقے پر جدّوجہد کر رہے تھے ' لیکن ان پر جنگ ٹھونس دی گئی۔ جب مارکسسٹوں نے یہ محسوس کیا کہ ہم تو یہ مقابلہ ہار رہے ہیں اسلام کی بازی جیتتی معلوم ہوتی ہے تو پھر ان میں وہ بے صبرا پن پیدا ہوا کہ پرامن مقابلے اور جدّوجہد کے بجائے انہوں نے پھر یکے بعد دیگرے فوجی انقلابات کا معاملہ شروع کیا۔ ملک میں قتل و غارتگری شروع ہوئی۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا کٹھ پتلی حکمران آیا۔ اور اس کے بعد روسی فوج براہ راست افغانستان میں داخل ہو گئی۔ گویا کہ جنگ ان پر ٹھونسی گئی۔ ورنہ وہ تو پرامن طریقے پر جدوجہد میں مصروف تھے ' جیسے یہاں ہم جدّوجہد کر رہے ہیں ' دوسری مختلف تحریکیں جدوجہد کر رہی ہیں ' عالم عرب میں الاخوان المسلمون جدّوجہد کر رہے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی احیائے اسلام کے لئے پرامن جدوجہد کر رہے تھے ' لیکن ان پر جنگ ٹھونس دی گئی (یُقَاتَلُوْنَ) اور چونکہ ان پر ظلم کیا گیا (بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا) لہٰذا وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ گئے۔ اور یہ دس سال کی تاریخ گواہ ہے کہ: وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ○

"اور یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے"۔

اللہ کی یہ نصرت مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ بسا اوقات اللہ تعالیٰ کفر اور فسق کے ذریعے سے بھی اسلام کی نصرت فرماتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف تشریف لے گئے تھے تو مکہ میں واپس داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ اور حضورؐ ایک مشرک اور کافر مطعم بن عدی کی امان میں مکہ میں داخل ہوئے۔ اگرچہ اس کا خاتمہ بھی کفر ہی پر ہوا ہے ' لیکن حضورؐ نے اس کے احسان کا اعتراف فرمایا اور بدر کے روز جب اسیرانِ قریش آپؐ کے سامنے کھڑے تھے ' فرمایا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ سفارش کرتا تو میں ان تمام کو بغیر کسی فدیے کے چھوڑ دیتا۔ اس لئے کہ ایک بہت بڑا احسان تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اسلام پر اُس شخص نے کیا تھا ' جبکہ بظاہر ان کا کوئی مدد گار نہ تھا۔ تو کبھی کفر کے ذریعے سے بھی اللہ اسلام کو تقویت دیتا ہے۔ ابو طالب آخری وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پشت پناہ رہے ' حالانکہ یہ ثابت ہے کہ انہوں نے مرتے دم تک زبان سے کلمۂ شہادت ادا نہیں کیا۔ یہ معاملہ اللہ کا ہے کہ وہ کس کے ذریعے سے نصرت فرماتا ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ تیسری آیت کس قدر منطبق ہو رہی ہے:

اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ط

"وہ لوگ کہ جنہیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا' صرف اس پاداش میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے"۔

یوں سمجھئے کہ افغانستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ یعنی کل دو کروڑ کی آبادی میں سے پچاس لاکھ مہاجرین پاکستان اور ایران کے اندر پہنچے۔ یہ کس لئے آئے؟ ان کا کیا جرم تھا! اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ...... چاہے انہیں اس کا شعور تھا یا نہیں تھا' لیکن وہ کلمۂ شہادت کے لئے' توحید کے لئے' دین محمدیؐ کے لئے گھر بار چھوڑ کر آئے...... اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ بالکل بے سرو سامانی کے عالم میں ہجرت کر کے آئے تھے' اگرچہ بعد میں تعاون بھی ہوا ہے' مسلمان ممالک نے مدد بھی کی ہے' جیسے مہاجرین کی مدد کی تھی انصارِ مدینہ نے! میں ان کا ذکر اگر کر رہا ہوں تو یہ ہرگز نہ سمجھئے کہ میں رتبے میں ان کے برابر سمجھتا ہوں۔ معاذ اللہ! ہماری کیا نسبت ہو سکتی ہے صحابہ کرامؓ کے ساتھ!۔ مرتبے کے لحاظ سے نہ افغان مہاجرین کی کوئی نسبت ہے مہاجرینِ مکہ کے ساتھ اور نہ انصارِ پاکستان کی انصار مدینہ کے ساتھ...... لیکن اور ہم تلاش کہاں سے کریں؟ ہمیں تو مثال وہیں سے ملے گی' ہمارے لئے اسوہ وہی ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ...... انہی کی زندگیاں ہمارے لئے مثال ہیں۔ انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم نے اپنے مہاجر افغان بھائیوں کی نصرت کی ہے اور پورے عالم اسلام نے بھی ان کی مدد کی ہے۔

اس کے بعد ایک بڑی اہم فلسفیانہ بات ارشاد فرمائی کہ یہ قتل و خونریزی اللہ کو بھی پسند نہیں ہے۔ فطرت انسانی بھی اس کو پسند نہیں کرتی' اس سے اِباء کرتی ہے...... لیکن اگر اللہ مختلف مواقع پر کچھ لوگوں کے ذریعے سے کچھ دوسرے لوگوں کو دور نہ کرتا رہے تو دنیا کے اندر فساد پیدا ہو جائے اور بڑھتا چلا جائے۔ فساد کو رفع کرنے کے لئے خونریزی بھی کرنی پڑتی ہے' چنانچہ فرمایا:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا۔

"اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے ذریعے سے بعض کو دور نہ کرتا رہتا تو منہدم کر دیئے جاتے معبد اور کلیسا اور سینیگاگ اور مسجدیں جن میں

اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے"۔

یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کے ذریعے سے بعض کی سرکوبی نہ کرتا رہتا اور انہیں ملیامیٹ نہ کرتا رہتا تو دنیا میں کفر اور شرک کا اتنا غلبہ ہو جاتا کہ عیسائیوں کا کوئی معبد اور کوئی کلیسا' یہودیوں کا سینیگاگ اور مسلمانوں کی کوئی مسجد باقی نہ رہتی جہاں اللہ کا نام لیا جائے۔ اپنے اپنے وقت میں یہ سب اللہ کی عبادت کے مرکز رہے ہیں۔ اگر اہلِ حق تلوار ہاتھ میں نہ لیتے اور اہل باطل کی سرکوبی نہ کرتے تو ان میں سے کوئی مرکز بھی قائم نہ رہتا' دنیا میں فساد ہی فساد ہو جاتا اور حق اور خیر کہیں باقی نہ رہتا۔ فرمایا کہ یہ اللہ کی سنت ہے:

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○

"اور اللہ لازماً مدد کرتا ہے ان کی جو اس کی مدد کرتے ہیں (جو اس کے دین کے لئے اور اس کے رسولؐ کی نصرت کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجاتے ہیں)۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ قوی ہے' زبردست ہے"۔

جسے اس کی نصرت حاصل ہو جائے اب اس کے لئے شکست کا کوئی سوال نہیں۔

آخری آیت بہت اہم ہے۔ اس میں ہمارے لئے اور ہر مسلمان قوم کے لئے جسے بھی آزادی کی دولت میسر ہے' بھرپور رہنمائی کی گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

"وہ لوگ کہ جنہیں ہم زمین میں اقتدار عطا فرمادیں تو وہ نماز کا نظام قائم کریں گے' زکوٰۃ ادا کریں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ اور (جان لو کہ) بالآخر تمام معاملات کا آخری فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔

یہ چار آیات ہیں۔ ان کا انطباق ہر دور میں ہوگا' لیکن اس دور میں سب سے بڑا انطباق مجاہدینِ افغانستان پر ہوتا ہے' ایک بات میں نے پہلے بھی عرض کی ہے' پھر عرض کرتا ہوں کہ میں درجے میں قطعاً ان کو صحابہ کرامؓ کے برابر گننے کے لئے تیار نہیں۔ یقیناً زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مجاہدین افغانستان کا ایک اجلاس اسلام آباد ہوٹل میں ہوا تھا تو وہاں پر بعض حضرات نے مبالغہ آمیزی کی تھی کہ صحابہ کرامؓ کے بعد تاریخِ اسلامی میں آج تک ایسا جہاد نہیں ہوا۔ مجھے جو چند منٹ ملے تھے میں نے کہا تھا کہ یہ مبالغہ ہے۔ آپ ان کے جہاد کی

تائید کریں' اس کی قدر کریں' ان کا اعزاز کریں' ان کی مدد کریں...... لیکن یہ مبالغہ آرائی درست نہیں ہے۔ خاص طور پر ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کو تو یاد رکھنا چاہئے کہ ڈیڑھ سو برس قبل بالاکوٹ کی سرزمین میں سید احمد شہیدؒ ' شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں کا خون جذب ہوا تھا۔ ان کی یہ تحریک نہایت خالص اسلامی جہاد تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ دنیا میں بعض انبیاء بھی اپنی جدوجہد کے اندر بظاہر ناکام ہو گئے۔ اسی طرح تحریکِ شہیدینؒ بھی بظاہر ناکام ہو گئی...... لیکن رتبہ یقیناً اُس تحریک کا بہت بلند تھا۔ ہمارے ان افغان مجاہدین سے تو ایک بہت بڑی کمی رہ گئی ہے کہ وہ ایک امیر کے پیچھے جمع نہیں ہوئے۔ اس چیز کے نتائج اب انہیں بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ان سے جو بھی کوتاہیاں ہوئی ہیں وہ اپنے فضل و کرم سے ان کی تلافی کر دے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے' ان کی نصرت کرے' اس جہاد کو سرخرو کرے اور آخری کامیابی سے ہمکنار کرے' تاکہ ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں ایک ایسی واقعی اسلامی حکومت قائم ہو جائے جو اس آیت کا مصداق ہو کہ:...... اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ...... اس لئے کہ در حقیقت اس سے خود پاکستان کو بہت بڑی تقویت حاصل ہو گی۔ ہمارا یہ مغربی پہلو اگر محفوظ ہو جائے تو یہ ہمارا بہت بڑا سہارا بنے گا' بلکہ ادھر سے ہمیں مدد حاصل ہو گی۔ یاد کیجئے' تقریباً دو سو سال قبل وہیں سے احمد شاہ ابدالی آیا تھا۔ مرہٹہ قوت اُس وقت بڑی قوت کے ساتھ ابھری تھی اور ہندوستان کے اندر' جو اُس وقت کا برِّعظیم پاک و ہند تھا' کوئی مسلمان قوت ایسی موجود نہیں تھی جو اس کا مقابلہ کر سکے۔ ان حالات میں دہلی کے ایک مردِ درویش شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا کہ حالات ایسے ہیں کہ ہندوستان میں (یعنی اُس وقت کے پورے برِّعظیم پاک و ہند میں) اسلام کو شدید خطرہ لاحق ہو چکا ہے' ملتِ اسلامی شدید خطرات سے دوچار ہے۔ تم آؤ اور آکر کفر کی طاقت کو توڑو۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں اللہ تعالیٰ نے احمد شاہ ابدالی کو فتح عطا فرمائی اور فیصلہ کن طور پر مرہٹہ قوت ٹوٹ گئی۔ آج پھر وہی مرہٹہ قوت اُسی علاقے سے پھر ابھر رہی ہے۔ وہی مہاراشٹر کا علاقہ ہے' جہاں سے آر ایس ایس' جنگ سنگھ اور سکھ سینا جیسی تنظیمیں پروان چڑھ رہی ہیں۔ یہ پھر ایک طوفان ہے' جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دِگر خیزد
آشوبِ ہلاکوے، ہنگامۂ چنگیزے

معلوم ہوتا ہے کہ اسی طریقے سے وہ طوفانِ مرہٹہ' وہ جنگ سنگھ اور آر ایس ایس کا طوفان جو ہے وہاں سے ابھر رہا ہے اور اس کا مقابلہ پاکستان اسی صورت میں صحیح طور پر کر سکے گا جبکہ افغانستان کے اندر ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو جائے' ہمیں اُس جانب سے کوئی اندیشہ نہ رہے اور ہم اپنی پوری دفاعی قوت کو مشرقی محاذ کے اوپر صرف کر سکیں...... لہٰذا میں اس وقت اس عظیم الشان اجتماع عید کے اندر ایک قرارداد پیش کر رہا ہوں کہ ہم حکومت پاکستان سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ افغان عبوری حکومت کے تسلیم کئے جانے میں یہ جو تاخیر و تعویق ہو رہی ہے' اس کو فی الفور ختم کیا جائے اور اسے فوراً تسلیم کیا جائے۔ افغان مجاہدین نے دس برس تک خون دے کر' لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر اپنا حق منوایا ہے۔ آج ہم اُن سے یہ حق کیونکر چھین سکتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تاخیر و تعویق کا یہ معاملہ اگر زیادہ دیر تک جاری رہا تو نہ صرف یہ کہ اس وقت جہادِ افغانستان کو گزند پہنچے گا' بلکہ شاید ہم تاریخ میں ہمیشہ ہمیش کے لئے اسلام اور مسلمانوں کے غداروں کی فہرست میں شامل کئے جائیں اور ہمارا نام ان لوگوں کی فہرست میں آجائے جنہوں نے مختلف مراحل پر ملّتِ اسلامیہ سے دغا کی ہے اور غداری کا معاملہ کیا ہے۔ اب میں وہ قرارداد پڑھ رہا ہوں......

"مسلمانانِ لاہور کا یہ عظیم اجتماع حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ عبوری افغان حکومت کو فوراً تسلیم کرکے افغان جہاد کے حق میں اپنا پورا وزن ڈالے۔ اس مرحلے میں جب کہ افغان مجاہدین کی قربانیوں سے بھرپور جدوجہد کے نتیجے میں روسی افواج افغانستان سے نکلنے پر مجبور ہو گئی ہیں' حکومتِ پاکستان کو اُن کی حمایت کرنے میں ہچکچاہٹ اور بے دلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ صرف افغان مجاہدین کی حتمی اور فیصلہ کن فتح بلکہ افغان مسئلے کے ایسے سیاسی حل تک پہنچنے کے لئے بھی جو افغان مجاہدین اور ملت اسلامیہ کے لئے قابل قبول ہو' لازم ہے کہ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک نہ صرف عبوری افغان حکومت کو تسلیم کریں بلکہ اُس کی ہر ممکن اخلاقی' مالی اور فوجی امداد بھی کریں۔ کیونکہ مجاہدین کی عبوری حکومت کی مضبوط سیاسی اور فوجی پوزیشن کو دیکھ کر ہی روس اور اُس کی کٹھ پتلی افغان حکومت مسئلے کے معقول سیاسی حل پر آمادہ ہوں گے۔ اس اجتماع کی رائے میں اندیشہ ہے کہ حکومتِ پاکستان کی جانب سے افغان مجاہدین کی عبوری حکومت کے تسلیم کرنے میں تاخیر کو تاریخ میں نہ صرف افغان مجاہدین بلکہ اسلام اور امتِ مسلمہ کے وسیع تر مفادات سے غداری کی حیثیت سے ہی یاد رکھا جائے گا"۔

اخبارات میں فحاشی کے خلاف

امیر تنظیم اسلامی کی پریس کانفرنس

اور

خطاباتِ جمعہ کے پریس ریلیز

تنظیم اسلامی نے اخبارات میں بے پردگی اور فحاشی کے فروغ کے خلاف خاموش احتجاجی مظاہروں کی جس مہم کا آغاز کیا ہے اس کے تحت ماہ جون کے دوران دو بار شہر لاہور میں رفقائے تنظیم اسلامی لاہور نے روزنامہ 'جنگ' اور روزنامہ 'نوائے وقت' کے دفاتر کے سامنے پُرامن اور منظم مظاہرے کیے جن کی روداد جولائی کے 'میثاق' میں شائع ہو چکی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی کی یکم جولائی کی پریس کانفرنس بھی دراصل اِسی مہم کا حصہ تھی۔ مقصود یہی تھا کہ اخبارات کے مدیران کو سنجیدگی سے اس جانب متوجہ کیا جائے اور اپنا مدعا و مقصود وضاحت سے انکے سامنے رکھا جاتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک تو معاملہ وہی ہے کہ "شہ اِلطرز تغافل ہے سو وہ انکو مبارک۔ اِک عرض تمنا ہے سو ہم کہتے رہینگے"

مزید برآں امیر تنظیم کے ۱۴ جولائی اور ۲۸ جولائی کے خطاباتِ جمعہ کو بھی، ان کی خصوصی اہمیت کے پیشِ نظر، انہی صفحات میں جگہ دی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

بیان پریس کانفرنس یکم جولائی ۱۹۸۹ء

ہر باشعور شخص دیکھ رہا ہے کہ سلطنتِ خداداد پاکستان ایک جانب تو سیاسی افراتفری سے دوچار ہے اور اس افراتفری کی شدت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ قوم جس نے نصف صدی قبل برِعظیم پاک و ہند کی دس گنا وسعتوں میں ایک بنیانِ مرصوص کی صورت اختیار کر لی تھی —

— نیچے پاکستان کے نسبتاً بہت محدود علاقے میں نہ صرف یہ کہ متعدد قومیتوں میں تقسیم ہو چکی ہے بلکہ تقسیم در تقسیم کا یہ عمل تیزی سے آگے ہی بڑھتا نظر آرہا ہے۔ اسی طرح جس قوم نے اپنی سیاسی بیداری اور تنظیم و شعور کے ذریعے تعداد میں اپنے سے کئی گنا زیادہ اور تعلیم اور سرمایہ دونوں سے کہیں زیادہ مالا مال قوم کو سیاسی میدان میں شکستِ فاش دی تھی، آج سیاسی اعتبار سے ایک نابالغ قوم کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ چنانچہ بظاہر آزاد ہونے کے باوجود حال یہ ہے کہ یہاں بیرونی اذن و منشا کے بغیر نہ کوئی حکومت بن سکتی ہے، نہ ختم ہو سکتی ہے۔

دوسری جانب معاشی اور اقتصادی ابتری کے اثرات بھی نمایاں سے نمایاں تر ہوتے چلے جارہے ہیں، چنانچہ نہ صرف یہ کہ قوم کا ہر فرد ایک گراں قدر سودی قرضے کے بندھن میں بندھا ہوا ہے بلکہ ہماری معاشی اور اقتصادی پالیسیاں بھی "کہیے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں" کے مصداق بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے چشم و ابرو کے اشاروں پر مبنی ہیں، اور قومی بجٹ کے ضمن میں بھی ہم ان کی منظوری کے بغیر کوئی قدم اپنی آزاد مرضی سے نہیں اٹھا سکتے!

ہماری قومی و ملی زندگی کے ان دو افسوسناک پہلوؤں کے ضمن میں امید کی یہ کرن بہر حال موجود ہے کہ ہمارے قومی و سیاسی زعماء اور باشعور شہریوں میں ان کا احساس و ادراک کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہے لیکن ہماری اجتماعی زندگی کا ایک تیسرا گوشہ وہ ہے جہاں ہمارے ملی تشخص کو سب سے زیادہ خطرناک چیلنج کا سامنا ہے اور اس طرح ہماری نظریاتی سرحدوں ہی نہیں بنیادوں تک کو منہدم کرنے کا عمل نہایت خاموشی لیکن حد درجہ سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے ——— اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس خاص خطرے کا ادراک نہ اہلِ سیاست کو ہے نہ عوام النّاس کو، بلکہ ہم من حیث القوم سے "وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا" کی سی صورت سے دوچار ہیں۔

یہ تیسرا گوشہ جس میں ہمارے قومی وجود اور تشخّص کو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے، ہماری تہذیبی روایات، معاشرتی اقدار، شرم و حیا کے معیارات، عصمت و عفت کے تصورات، اور ستر و حجاب کے حدود و قیود سے عبارت ہے جنہیں مغرب سے درآمد شدہ مخلوط معاشرت، اور بے پردگی، عریانی اور فحاشی کا بڑھتا ہوا طوفان تیزی کے ساتھ دیمک کے مانند اندر ہی اندر چٹ کر رہا ہے! ——— اور افسوس در افسوس اس پر کہ ہمارے سیاسی و دینی زعماء غالباً اس خیال کے تحت کہ جب حکومتی اختیارات ہمارے ہاتھ میں آجائیں گے تو ہم اس پوری صورتِ حال کو درست کر دیں گے، فی الوقت اس سے شعوری یا غیر شعوری اور ارادی یا غیر ارادی طور پر اغماض برت رہے ہیں!

اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب اور اباحیت کے اس ''ڈان'' کے رُخ کو کلی طور پر اسلامی تہذیب و روایات کی جانب موڑ دینا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ کسی فیصلہ کن انتخابی عمل کے ذریعے ـــــ یا ایک ہمہ گیر انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں اختیار و اقتدار کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آ جائیں جو دین و مذہب کے ساتھ گہرا لگاؤ ہی نہیں پختہ وابستگی (COMMITMENT) رکھتے ہوں، نتیجۃً خود بھی بالفعل اسلامی طرزِ فکر اور دینی طرزِ زندگی کو اختیار کر چکے ہوں ـــــ تاہم یہ نری نافہمی کی بات ہو گی اگر اس ہمہ جہتی تبدیلی سے قبل اس تخریبی عمل کو بالکل بے لگام چھوڑ دیا جائے ـــــ اور درمیانی عرصے کے دوران سماجی دباؤ اور رائے عامّہ کے اظہار کے ذریعے اس منفی عمل کو حتی الامکان روکنے یا کم از کم اس کی شدت میں کمی کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

بنابریں تنظیمِ اسلامی نے یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنی اصل جدوجہد کو ایک ایسی جمعیت کے فراہم اور منظم کرنے پر مرکوز رکھتے ہوئے جو اسلامی انقلاب کے لیے براہِ راست جدوجہد کر سکے' ـــــ درمیانی عرصے میں اپنے آپ کو اقتدار کی سیاست (POWER POLITICS) سے بالکل علیحدہ رکھتے ہوئے اپنی قوتوں اور توانائیوں کا ایک حصّہ سماجی اصلاح کے عمل کے لیے وقف کرے' ـــــ اور اس ضمن میں عوام کو اسلامی طرزِ معاشرت اختیار کرنے اور ستر و حجاب کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کے ساتھ ساتھ اُن کی رائے کے منظّم اور پُرامن اظہار کے ذریعے ذرائعِ ابلاغ کے رُخ کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش کرے۔

جہاں تک نظامِ تعلیم اور عہدِ حاضر کے جدید تر اور زیادہ سریع الاثر ذرائع ابلاغ کا تعلق ہے' ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ہمارے یہاں بالکلیہ حکومت کے کنٹرول میں ہیں' لہٰذا ان کے ضمن میں جدوجہد تو وسیع تر سیاسی یا انقلابی عمل ہی کا حصہ ہو سکتی ہے' البتہ اخبارات و جرائد کا قدیم تر ذریعۂ اشاعت و ابلاغ پرائیویٹ سیکٹر سے تعلق رکھتا ہے اور چونکہ ہمارا معاشرہ معروف اصطلاح کے مطابق ترقی پذیر معاشروں کی فہرست میں شامل ہے لہٰذا ہمارے یہاں یہی ذریعہ تاحال وسیع ترین حلقۂ اثر کا حامل بھی ہے ـــــ اور اثرات کے دیرپا ہونے کے اعتبار سے دوسرے ذرائع کے مقابلے میں کہیں زیادہ مؤثر بھی' لہٰذا تنظیم اسلامی نے اپنی اس اصلاحی مہم کا آغاز اسی گوشے سے کیا ہے' ـــــ پھر ان میں سے بھی ہفت روزہ یا ماہانہ جرائد اور انگریزی اخبارات کا حلقۂ اثر بہت محدود ہے ـــــ جبکہ اردو روزناموں کا حلقۂ اثر وسیع ترین ہے' ـــــ اور اسے قسمت کی ستم ظریفی (IRONY OF FATE) ہی کہا جا سکتا ہے کہ بعض مخصوص کاروباری اسباب کی بنا پر ہمارے دونوں اردو قومی روزنامے بے پردگی اور فحاشی کی ترویج، مغرب کی مخلوط طرزِ معاشرت کے فروغ، اور شرم و حیا اور ستر و حجاب کی اسلامی تعلیمات کی دھجیاں بکھیرنے میں پوری دنیا کی روزنامہ صحافت سے بازی لے

گئے ہیں! چنانچہ:

۱۔ ایک جانب مختلف حیلوں اور بہانوں سے جوان خواتین اور نوخیز طالبات کی رنگین اور دیدہ زیب تصاویر کی اشاعت کے ذریعے اُس عمل کے فروغ کا سامان بڑے پیمانے پر اور تسلسل کے ساتھ فراہم کر رہے ہیں جسے حدیثِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں آنکھوں کے زنا سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۔ دوسری جانب فلمی اشتہارات میں شامل فحش تصاویر پر مستزاد سینما، تھیٹر اور ٹی وی سے متعلق اداکاراؤں، رقاصاؤں اور مغنیات کے نسوانی حسن اور ذاتی زندگی کی نہایت پُرشکوہ اور آب و تاب کے ساتھ تشہیر کے ذریعے ان کو معصوم بچیوں کے لیے کم از کم بناؤ سنگھار اور میک اپ کے انداز اور لباس کی وضع قطع کی حد تک تو آئیڈیل یا قابلِ تقلید مثال کی حیثیت سے پیش کر ہی رہے ہیں، مزید برآں اس سے نعلوم کتنے معصوم ذہنوں میں اُن ہی کی سی طرزِ معاشرت اور ان ہی کی سی طرزِ زندگی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہو!

۳۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض اخبارات دنیا بھر سے جنسی بے راہروی یا معاشقوں کی داستانیں جمع اور شائع کر کے اِس جرمِ عظیم کا سب سے زیادہ گھناؤنے انداز میں ارتکاب کر رہے ہیں جس پر نہایت سخت وعید سورۂ نور کی آیت نمبر ۱۹ میں وارد ہوئی ہے ——— یعنی "یقیناً جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں فحش باتوں کی اشاعت اور چرچا ہو اُن کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں دردناک عذاب ہے!"

بنابریں ہماری نہایت دردمندانہ درخواست قومی روزناموں کے مالکان سے بالخصوص اور اُن کے کارکنان و وابستگان سے بالعموم یہ ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں اور جس جانب وہ تدریجاً اور یقیناً غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر بڑھتے چلے گئے ہیں اس سے رجعت اور واپسی یعنی توبہ کی صورت اختیار کریں۔ یقیناً اِسی میں اُن کی اپنی آخرت اور عاقبت کی بھلائی بھی ہے ——— اور اس ملک و ملت کی عافیت اور سلامتی بھی!

واقعہ یہ ہے کہ روزنامہ اخبار عوام کی ضرورت ہے ——— اور اس کا اصل مقصد عوام کو خبروں سے مطلع، اور اُن کے پس منظر سے واقف رکھنے کے ساتھ ساتھ قوم و ملک کی بہتری کے لیے صائب اور مفید رہنمائی فراہم کرنا ہے ——— اس سے آگے بڑھ کر جو مزید رول اخبارات نے اختیار کر لیا ہے وہ خالص اضافی ——— اور محض کاروباری مصلحت اور مسابقت پر مبنی ہے جس سے خواہ مخواہ کا بوجھ عام قارئین کی جیبوں پر بھی پڑتا ہے ——— اور قومی معیشت پر بھی۔

لہٰذا ہم درخواست کرتے ہیں کہ:-

شرم وحیا اور ستر وحجاب کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے واضح احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات کے پیشِ نظر اخبارات میں خواتین کی تصویریں چھاپنا بالکل بند کر دی جائیں۔ اس سے روزنامہ صحافت کے عالمی سطح پر مروجہ معیارات کے پیشِ نظر بدرجۂ مجبوری زیادہ سے زیادہ تازہ خبر سے متعلق تصویر، اور وہ بھی رنگین نہیں بلکہ عام طباعت میں، مستثنیٰ کی جا سکتی ہے۔

۲۔ روزنامہ اخبارات کو اضافی رنگین ایڈیشنوں اور میگزینوں وغیرہ سے آزاد کر کے صرف اخبار بنا دیا جائے ـــــ اور دوسرے علمی و ادبی یا ثقافتی موضوعات کے لیے علیحدہ ہفتہ وار جرائد شائع کیے جائیں جن کی قیمت کو روزنامے کی قیمت کے ساتھ نتھی نہ کیا جائے، تاکہ مختلف چیزوں کے شائقین اپنی اپنی پسند کی چیزیں خریدیں اور ان سے اپنے اپنے ذوق کے مطابق محظوظ ہوں ـــــ اخبار کے عام قاری کی جیب پر زبردستی ان کا بوجھ ڈالنا یقیناً ناجائز استحصال کی صورت ہے۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تنظیمِ اسلامی اس ضمن میں نہ کسی دھمکی یا الٹی میٹم کا رخ اختیار کرنا چاہتی ہے، نہ ان شاء اللہ کبھی توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کی ادنیٰ سے ادنیٰ صورت اختیار کرے گی، ـــــ بلکہ ہماری اس مہم کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک جانب عوام کا شعور بیدار کیا جائے اور اُن کی رائے کے اظہار کی مؤثر صورت پیدا کی جائے اور دوسری جانب اخبارات کے مالکان اور کارکنان کے ضمیر کو اپیل کیا جائے تاکہ وہ خود ہی اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں۔ وما علینا الا البلاغ

اسرار احمد عفی عنہ

"طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں" ایک وضاحت

۱۴ رجولائی کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز

"لاہور 17 رجولائی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ اگر طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں" کا مطلب عوام کی حاکمیتِ مطلقہ ہے تو یقیناً یہ کفر اور شرک ہے اور اگر اس کا مطلب اللہ کی حاکمیت کے تحت اور کتاب و سنت کے واضح احکام کے دائرے کے اندر اندر عوام کی رائے کی بالادستی ہے تو یہ نہ کفر ہے اور نہ شرک بلکہ عین تقاضائے اسلام ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دستور میں قراردادِ مقاصد کے ذریعے اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ کو تسلیم کیا گیا اور مغربی جمہوریت کے اسی بنیادی

تصور کی نفی کر دی گئی ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کے مالک عوام ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پیپلز پارٹی اگر قرارداد مقاصد کی نفی کر کے یہ نعرہ بلند کرتی کہ "طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں" تو یقیناً یہ شرک ہوتا۔ باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پیپلز پارٹی نے اپنے پہلے پانچ سالہ دورِ اقتدار میں اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل پر 73 کے دستور میں کئی یک طرفہ ترامیم کی تھیں مگر قرارداد مقاصد کو اس نے نہیں چھیڑا' اس لئے اصولی اعتبار سے اس نعرے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اب حکومت کا نظام مارشل لاء' جاگیرداری اور سرمایہ داری کی بنیاد پر نہیں چلایا جائے گا بلکہ عوام کی رائے اور مرضی سے چلایا جائے گا۔ تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ اسلام کے سیاسی نظام میں قرآن و سنت کی بالادستی کے ساتھ ساتھ عوام کی مرضی اور رائے کے بروئے کار آنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ اسلام نے انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق پابندی اور آزادی کا حسین امتزاج قائم کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل تاریخ میں پہلی مرتبہ بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کر کے عوام کو جو شرف اور بالادستی عطا کی تھی' مغرب ایک ہزار سال بعد سماجی اور معاشرتی ارتقاء کی اس منزل تک پہنچا ہے۔ مگر وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم ہونے کی وجہ سے اس کا فکر و عمل توازن و اعتدال سے محروم ہے۔ بادشاہوں' مذہبی پیشواؤں اور دیگر بالادست طبقات کے اقتدار کی نفی کرتے ہوئے انہوں نے اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیتِ مطلقہ کا بھی انکار کر دیا جو بلاشبہ اس دور کا سب سے بڑا شرک ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستان ایک جمہوری عمل اور انتخاب کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا' اب اس کے استحکام اور بقا کے لئے بھی ایک مضبوط جمہوری نظام کی ضرورت ہے جس میں بالادست طبقات کے نمائندوں کی بجائے عوام کے حقیقی نمائندے برسر اقتدار آ کر قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے مسائل حل کریں۔

بھارتی بالادستی کا مقابلہ شمشیرِ قرآنی سے ممکن ہے

۲۱ جولائی کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور 21 جولائی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ بھارت فوجی اعتبار سے ایک بڑی قوت بن چکا ہے اور علاقے میں اس کی بالادستی عملاً قائم ہو چکی ہے۔ اب کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلی غائب نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے حکمرانوں کو چونکہ اس حقیقت کا پہلے بھی احساس تھا اس لئے وہ "کرکٹ ڈپلومیسی" اور "امن کی یلغار" جیسی پالیسیاں اختیار کرتے رہے۔ باغ جناح میں نمازِ جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ بھارت کے مقابلے میں ہم دوسری طاقتوں کا سہارا لینے پر مجبور ہیں کیونکہ ہمارا اپنا وجود دوسروں کے سہارے پر قائم ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ بھارت کا مقابلہ

کرنے کے لئے ہمارے پاس جو سب سے بڑا ہتھیار موجود ہے' اُس کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں۔ اگر ہمیں پاکستان کا تحفظ' وقار اور عزت مطلوب ہے تو ہمیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر قرآن کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور نظریہ کے مضبوط ہتھیار سے بھارت پر یلغار کرنی ہوگی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ آج ہماری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب قرآن سے دوری ہے' جسے ہم نے نہ صرف خود چھوڑ دیا ہے بلکہ ہدایت کی پیاسی دنیا تک بھی نہیں پہنچایا۔ اُنہوں نے کہا کہ بھارت کی ثقافتی یلغار تو ہم پر ایک عرصے سے جاری ہے اور اُسے کسی مصنوعی طریقے سے روکنا ممکن نہیں۔ ایک بودی' بے بنیاد اور کمزور تہذیب کا مقابلہ اسلام کے جاندار اور زندگی کے مسائل کا حل دینے والے پیغام اور فلسفے سے ہی ممکن ہے۔ جس سے عوام و خواص سب ہی اسلامی جمہوریہ پاکستان کی محفوظ چار دیواری میں بیٹھ کر غافل ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ نوجوانوں کو قرآن کی طرف راغب کئے بغیر اسلام کی انقلابی فکر کو بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ اُنہوں نے والدین سے اپیل کی کہ اپنے ذہین بچوں کو عربی زبان اور قرآن کی تعلیم بھی دلوائیں تاکہ نئی نسل اپنے نظریاتی ہتھیار کو استعمال کرنے کے قابل ہو سکے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اعلان کیا کہ قرآن کالج میں میٹرک پاس طلبہ کے لئے ایک چار سالہ کورس شروع کیا جا رہا ہے جس میں بی اے کے معمول کے نصاب کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم قرآن کے انقلابی فکر و فلسفے کی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔

غلام مصطفےٰ شاہ کی تحریریں مریض ذہنیت کی آئینہ دار ہیں

وفاقی کابینہ سے اُن کا اخراج فی الفور عمل میں لایا جائے

۲۸ جولائی کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور 28 جولائی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ وفاقی وزیر تعلیم پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ کی دل آزار تحریروں کے سامنے آنے کے بعد اب یا تو انہیں خود مستعفی ہو جانا چاہیے یا وزیر اعظم کو انہیں اپنی کابینہ سے خارج کر دینا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ اس مسئلے پر پنجاب اور سندھ کے درمیان نفرت کی جو نئی لہر اٹھ رہی ہے اُس کا اِس کے سوا کوئی علاج نہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ وفاقی وزیر تعلیم نے جو ایک ماہرِ تعلیم کے طور پر بلاشبہ اچھی شہرت کے مالک ہیں' پاکستان' پنجاب' قائد اعظم اور مہاجروں کے بارے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ اُن کے شدید نفسیاتی اور ذہنی مریض ہونے کی علامت ہے اور اس اعتبار سے وہ ہمدردی کے مستحق بھی ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ اقبال کو جو نام انہوں نے دیئے ہیں وہ میرے لئے شدید صدمے کا باعث ہیں۔ اُس اقبال کو پنجاب کے ناطے سے گالی دینا جو خود اہل پنجاب سے ناخوش تھا اور جس نے اپنی شاعری

میں پنجابی تو کیا ہندی مسلمانوں کے حوالے سے بھی بات نہیں کی" ظلم کی انتہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ علامہ اقبال پوری امت مسلمہ کے شاعر تھے اور ان مقامات پر جا کر آنسو بہاتے رہے جن کا تعلق ہندوستان سے نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ سے تھا تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ نے اپنی ایک تحریر میں مجھے بھی سندھ کے خلاف زہر اگلنے والوں میں سر فہرست رکھا ہے حالانکہ میں وہ شخص ہوں جو لاہور میں بیٹھ کر سندھ کے مسئلے پر سیمینار کراتا رہا اور سندھی بھائیوں کو یہ موقع فراہم کرتا رہا کہ وہ اہل پنجاب کے سامنے آکر اپنے دکھ درد بیان کریں انہوں نے کہا کہ اب پنجاب میں صوبائی عصبیت کی . . ر اٹھ رہی ہے اس کا الزام کسی کو نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ بھی اسی طرح کا فطری رد عمل ہے' جس کا اظہار سندھ میں کا . عرصہ سے ہو رہا ہے۔ باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جمہوری حکومتیں قائم ہونے کے بعد ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہونے کی امید روشن نظر آتی ہے۔ پیپلز پارٹی اور اسلامی جمہوری اتحاد دونوں اثر و رسوخ اور دولت کے بھرپور استعمال کے باوجود پنجاب یا سرحد میں ایک دوسرے کی صوبائی حکومتوں کو گرانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ اب عوام کے نمائندے اپنی سیاسی وابستگیوں کے بارے میں سنجیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کہیں کوئی حکومت گرے یا بنے اس میں پریشانی کی بات نہیں۔ ہونا صرف یہ چاہئے کہ سب کچھ دستوری حدود کے اندر ہو۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگر سیاسی عمل جاری رہا تو جلد یا بدیر ہم سیاسی استحکام کی منزل تو پالیں گے' لیکن ہمارا اصل مسئلہ نظریاتی خلفشار سے نجات پانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ احمد فراز اور فہمیدہ ریاض جیسے دانشوروں کا اہم ثقافتی ذمہ داریوں پر فائز کیا جانا اِسی نظریاتی خلفشار کا ایک مظہر ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے احمد فراز کا ایک شعر سناتے ہوئے کہا کہ قرآن سمیت تمام آسمانی کتب کو نفرتوں کے صحیفے قرار دینے والا شاعر پاکستان جیسی نظریاتی مملکت میں اتنی اہم ذمہ داری نبھانے کا کسی طرح بھی اہل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انہوں نے کہا اس نظریاتی خلفشار اور فکری انتشار سے نجات پانے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ہم بحیثیت قوم قرآن کی طرف رجوع کریں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ قرآن کی ناظرہ تعلیم سے لے کر فکر و فلسفے کی اعلیٰ سطح تک قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کی اصل قوت اِس کی دلیل اور اِس کے فلسفے میں ہے مگر ہم اسے اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ ہندوستان پر ایک ہزار برس حکومت کرنے کے باوجود ہم نے اسلام کی تبلیغ کا حق ادا نہیں کیا۔ صوفیاء کرام کی کوششوں کو چھوڑ کر ہم نے ہمیشہ ہندوؤں کے سامنے اسلام کو دشمن قوم کے مذہب کے طور پر ہی پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگر ہم اب بھی قرآن کے فکر و فلسفے اور دین کے دلائل کو مثبت انداز میں پیش کریں تو اعلیٰ ذات کے ذہین ہندو طبقات کو اسلام کی حقانیت کا قائل کرسکتے ہیں۔

★★★

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیت

داعیٔ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک پُر تاثیر اور فکر انگیز خطاب

ترتیب و تسوید (شیخ) جمیل الرحمٰن

(۵)

غزوۂ بدر سے پہلے آٹھ مُہمّات کی اجمالی رُوداد

میں نے جن آٹھ مہمات کا تذکرہ کیا تھا اب میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ ان کی رُوداد بھی آپ کو سنا دوں چونکہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کے منہج کو سمجھنے کے لئے ان کی اہمیت کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ ان آٹھ مہمّات کے ضمن میں ایک دو ضروری باتیں نوٹ فرما لیجئے۔ پہلی یہ کہ حضورؐ نے ان میں سے کسی میں بھی کسی انصاری صحابی کو شامل نہیں فرمایا۔ یہ مہمیں صرف مہاجرین پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس کی حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصار نے عرض کیا تھا کہ "آپؐ مدینہ تشریف لے آئیے۔ اگر قریش نے آپؐ کی وجہ سے مدینہ پر حملہ کیا تو ہم آپؐ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں"۔ اور چونکہ یہ مہمیں مدینہ سے باہر بھیجی جا رہی تھیں لہٰذا آپؐ نے ان میں کسی انصاری صحابی کو شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر مکہ سے بے دخل ہونے پر مہاجرین میں جو جوش و جذبہ تھا، اس کے اعتبار سے بھی ان پُرخطر مہموں میں مہاجرین کی شمولیت زیادہ مفید اور مناسب تھی۔ دوسری خاص بات یہ کہ ایک سال یعنی رمضان سنہ ۱ھ سے لے کر رمضان سنہ ۲ھ کے عرصے میں

یہ آٹھ مہمیں سرانجام پاگئیں۔ اس سے آپ حضرات اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ عمل کس قدر برق رفتاری، شدومد اور زور و شور کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جب کہ یہ تمام مہمیں اونٹوں پر یا پاپیادہ انجام دی گئیں

پہلی مہم: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مہم یا پہلا سریّہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں رمضان سنہ ۱ھ میں بھیجا۔ اس میں تیس مہاجرین شامل تھے۔ یہ لشکر ساحلِ بحر تک پہنچ گیا۔ وہاں ابوجہل سے مڈبھیڑ ہوگئی جو تین سو کی نفری کے ساتھ کوئی تجارتی قافلہ لے کر جارہا تھا۔ وہاں آباد ایک قبیلے کے سردار مجدی بن عمرو جہنی جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر جانب داری کا معاہدہ ہوچکا تھا بیچ میں پڑگیا اور اس نے کوئی مسلح تصادم نہیں ہونے دیا۔ اگر جنگ ہوتی تو ایک اور دس کی نسبت تھی۔ اس سریّہ کے متعلق ایک تاریخی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پہلا عَلَم (جھنڈا) جو جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوایا اور بلند فرمایا وہ اس سریّہ کے لئے تھا، جو آپؐ نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرمایا۔ گویا اسلامی جھنڈے کے پہلے عَلَم بَردار ہونے کی سعادت حضرت حمزہؓ کے نصیب میں آئی۔

دوسری مہم: ایک ماہ بعد ہی شوال سنہ ۱ھ میں مہاجرین پر مشتمل دوسری مہم حضرت عبیدہؓ ابن الحارث کی سرکردگی میں بھیجی گئی اس کا بھی ابوسفیان کے ایک قافلہ کے ساتھ رابغ کے مقام پر آمنا سامنا ہوگیا اور ٹکراؤ کی نوبت آگئی، لیکن یہاں بھی بیچ بچاؤ ہوگیا اور باقاعدہ جنگ کی صورت نہیں بن سکی۔ البتہ اس مہم کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دشمن کے لشکر کی طرف تیر چلایا۔ اگرچہ اس سے کوئی زخمی نہیں ہوا، لیکن ہجرت کے بعد جو پہلا تیر چلایا گیا، وہ مسلمانوں کی طرف سے چلایا گیا۔

تیسری مہم: ذوالقعدہ سنہ ۱ھ میں تیسری مہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں بھیجی۔ یہ سریّہ بھی تیس مہاجرین پر مشتمل تھا۔ اس مہم کے لئے حضورؐ نے خرّار کا مقام مقررہ فرمایا تھا۔ یہ بھی قریش کے شام جانے والے قافلوں کی گزرگاہ کے درمیان پڑتا تھا۔ حضور نے تاکید فرمادی تھی کہ اس مقام سے تجاوز نہ کرنا۔ اس سریّہ کی قریش کے کسی قافلے سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ یہ لشکر چند دن خرّار کے مقام پر قیام کے بعد مدینہ واپس آگیا۔ اس سے زیادہ تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔

چوتھی مہم اور پہلا غزوہ: ان تین سریّوں کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ اس سلسلہ کا پہلا سفر غزوۃ الابواء کے لئے صفر سنہ ۲ھ

ں ہوا۔ قریش کے شام جانے والے قافلوں کے راستہ میں بنوضمرہ کا ایک بڑا قبیلہ آباد تھا۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں چند دن قیام فرما کر اپنی موجودگی کا اظہار فرمایا اور اس قبیلہ کے
ساتھ حلیف ہونے کا معاہدہ بھی کر لیا۔
پانچویں مہم اور دوسرا غزوہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا سفر ربیع الثانی سنہ ۲ھ
میں بُواط کے لئے اختیار فرمایا۔ کتب سیر میں غزوۂ بُواط کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن تفاصیل نہیں
ملتیں۔
چھٹی مہم اور تیسرا غزوہ: یہ مہم یا غزوہ دور رس نتائج کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ کتب
سیر میں اس غزوہ کا تذکرہ "غزوۂ عشیرہ" کے عنوان سے ملتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
یہ سفر تقریباً دو ماہ یعنی جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخریٰ سنہ ۲ھ پر محیط تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے یہ سفر اس قافلے کو روکنے کے لئے اختیار فرمایا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں جا رہا
تھا۔ اس قافلے کے ایک مخصوص تاریخی پس منظر کو بھی سمجھ لیجئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضور
کی مدینہ کی طرف ہجرت سے متصلاً قبل اور بعد مکہ سے بہت سے مسلمانوں نے مدینہ کی
طرف ہجرت کی تھی، لیکن اکثر وبیشتر مہاجرین نہ اپنے اہل وعیال کو ساتھ لا سکے اور نہ ہی اپنا ساز و
سامان اور اثاثہ و سرمایہ۔ مشرکین نے دارالندوہ کے فیصلے کے مطابق مہاجرین کی تمام املاک
ضبط کر لیں اور ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقوم کو ایک مشترکہ فنڈ کی صورت دے
دی پھر اس رقم سے شام سے مالِ تجارت کی خرید کے لئے ایک قافلہ ترتیب دیا گیا اور طے
کیا گیا کہ اس سے حاصل ہونے والے منافع کو مدینہ پر مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کے لئے
استعمال کیا جائے گا۔ یہ خبر مدینہ پہنچ گئی تھی۔ اس قافلہ پر تاخت کے فیصلے کا ایک مقصد یہ
بھی تھا کہ وہ سرمایہ واپس حاصل کیا جائے جس کے حقیقی مالک مہاجرین تھے — بہر حال
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ سو مہاجرین کی معیت میں اس قافلے کے تعاقب کے لئے نکلے
اور ینبوع[1] کے مقام تک پہنچ گئے لیکن چند دنوں کا فصل پڑ گیا۔ قافلہ چند راتیں قبل شام کی طرف
نکل چکا تھا اور مسلمانوں کی پہنچ سے کافی دور جا چکا تھا۔ البتہ نبی اکرمؐ نے وہاں چند یوم قیام
فرمایا۔ وہاں قبیلہ بنی مصطلق آباد تھا، جس سے آپؐ نے غیر جانب داری کا معاہدہ طے فرما لیا

---

[1] ینبوع مکہ اور مدینہ کے درمیان وہ مقام ہے جہاں سعودی حکومت ایک عظیم بندرگاہ
تعمیر کر رہی ہے۔ (مرتب)

کہ یہ قبیلہ جنگ کی صورت میں نہ قریش کا ساتھ دے گا نہ ہی مسلمانوں کا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ غزوۂ عشیرہ دور رس نتائج کے اعتبار سے بڑا اہم ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قریش کے قافلے کو روکنے کا ارادہ فرمایا تو اس کا بالواسطہ تعلق ایسی صورت حال سے قائم ہوگیا جس کے نتیجے میں غزوۂ بدر واقع ہوگیا۔ اس کے علاوہ حضورؐ نے وادیٔ نخلہ کے لئے جو آخری مہم روانہ فرمائی تھی ــــ جس کا ذکر میں آگے کیوں گا ــــ وہاں غیر متوقع طور پر مسلمانوں کی ٹکڑی کا قریش کے ایک مختصر سے تجارتی قافلہ سے مسلح تصادم ہوگیا تو اس واقعہ نے بھی مکہ میں آگ لگائی اور یہ بھی 'غزوۂ بدر' کے وقوع پذیر ہونے کا بہت بڑا سبب بن گیا۔

سا تویں مہم اور چوتھا غزوہ: غزوۂ بدر سے قبل ایک غزوہ اور ہے جسے 'غزوۂ بدر اولیٰ' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک شخص کرز بن جابر الفہری نے خالصتہً اپنی ذاتی حیثیت سے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مدینہ کے قرب و جوار پر چھاپہ مارا، لوٹ مار کی اور چند مویشی پکڑ کر لے گیا۔ اس چھاپے میں قریش کا ہاتھ نہیں تھا۔ حضورؐ نے حضرت زید بن حارثہ کو مدینہ کا عامل مقرر فرما کر چند جان نثاروں کے ساتھ بدر تک اس کا تعاقب کیا، لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ حضورؐ آگے تشریف نہیں لے گئے، وہیں سے مراجعت فرمائی۔ چونکہ یہ بھی حضورؐ کا ایک سفر ہے، نفری کے ساتھ اور اسلحہ کے ساتھ، لہٰذا یہ بھی 'غزوۂ بدر' سے پہلے کی مہمات اور غزوات میں شامل ہے۔

ایک اہم نکتہ اور اس کی وضاحت: آگے بڑھنے سے قبل میں آپ حضرات کی توجہ ایک خاص نکتے اور ایک اہم بات کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے یہاں اس مسئلہ پر بڑی بحثیں ہوئی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو جنگیں کی ہیں وہ مدافعت میں ہوئی ہیں۔ ان پر حملے کئے گئے تھے جن کے دفاع میں اہل ایمان جنگ پر مجبور ہوئے۔ یہ بات صراحتاً اور بداہتاً بالکل غلط ہے۔ یہ نقطۂ نظر یا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی امتیازی شان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے اکمل و اتم ہونے کے مقام نیز حضورؐ کے بعثتِ مبارکہ سے اظہار دینِ الحق علی الدین کلّہٖ یا دورِ جدید کی اصطلاح میں جزیرہ نمائے عرب میں 'اسلامی انقلاب' کی تکمیل کو نہ سمجھ پانے کا نتیجہ ہے ــــ یا پھر اعدائے اسلام کے لگائے ہوئے ان الزامات سے مرعوبیت کا شاخسانہ ہے کہ 'اسلام

بڑا خونیں مذہب ہے' ـــ اور یہ کہ 'اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے' ـــ میں نے عرض کیا تھا کہ مکّہ کے پرسکون مشرکانہ معاشرے میں پہلا پتھر کس نے مارا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے! انقلابی ہی تو رائج الوقت نظام کو چیلنج کرتا ہے کہ یہ نظام غلط اور باطل ہے اور اسی نعرہ سے تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم دعوتِ توحید لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللہ نہ دیتے تو کسی تصادم اور نزاع کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ حضورؐ تو مکّہ کی نہایت محترم اور محبوب شخصیت تھے۔ آپؐ کو الصادق اور الامین کے معزز القاب مکّہ والوں ہی نے دیئے تھے۔ پھر ہجرت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لاکر اقدام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے۔ قریش کی معاشی ناکہ بندی اور مکہ و مدینہ کے مابین بسنے والے قبائل میں سے اکثر کو قریش سے حلیفانہ تعلقات منقطع کرنے اور غیر جانب دار رہنے پر آمادہ کرنے کے لئے حضورؐ ہی نے پے در پے آٹھ مہمیں ترتیب دی ہیں جن میں سے سات مہمات میں اجمالاً بیان کر چکا ہوں۔

قریش کو جنگ کی کوئی ضرورت نہیں تھی: آپ حضرات اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کی تمام کتب اس پر شاہد ہیں کہ مکّہ والوں کو حضورؐ کے خلاف جنگ کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ آپ اپنے آپ کو مکّہ والوں کی جگہ پر رکھ کر سوچئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عظیم اکثریت کی مکہ سے تقریباً تین سو میل دور مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کی صورت میں ایک طرح سے اُن کے سَر سے تو بَلا ٹل گئی تھی۔ اب ان کو جنگ کی کیا مصیبت پڑی تھی۔ حضورؐ جب تک مکّہ میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک تو ان کے خیال کے مطابق ان کا مشرکانہ نظام سخت خطرے سے دوچار تھا' چونکہ اُن کے لوگوں خاص طور پر نوجوانوں اور غلاموں کے طبقوں میں توحید کی انقلابی دعوت بتدریج نفوذ کر رہی تھی۔ اب ہجرت کی صورت میں ان کے سر سے یہ خطرہ اور اندیشہ ٹل گیا تھا۔

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ان کے یہاں کیسے کیسے مدبّر' موقع شناس' دور اندیش اور سیاست دان موجود تھے۔ ان میں عتبہ ابن ربیعہ بھی تھا جو قریش کے نامی گرامی سرداروں میں سے ایک تھا۔ اس نے قریش کے مشتعل مزاج لوگوں سے جو مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے بے چین تھے، ایک ایسی بات کہی تھی جسے پنجابی میں "مت دینا" کہتے ہیں۔ اس نے قریش کو مَت دی کہ "دیکھو اے قریش کے لوگو! اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو عرب کے حوالے کر دو۔ اگر وہ عرب پر غالب آجاتے ہیں تو اپنا ہی غلبہ ہے۔ آخر محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کون ہیں؟ قریشی ہی ہیں! آخر وہ ہمارا ہی فرزند ہے۔ اب تک تو ہمیں عرب پر بالواسطہ [illegible]

سیادت حاصل ہے۔ اس طرح ہماری بلاواسطہ (DIRECT) حکومت قائم ہوجائے گی۔ اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عرب غالب آجائیں اور ان (محمد) اور اُن کے ساتھیوں کو ختم کر دیں تو جو تم چاہتے ہو وہ ہوجائے گا اور تمہارے ہاتھ اپنے ہم قبیلہ بھائیوں کے خون سے رنگین بھی نہیں ہوں گے، لہٰذا اب تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عرب کے حوالے رہنے دو۔" چونکہ مکہ والے قبائلی نظام کے عادی اور خوگر تھے، لہٰذا عتبہ کی یہ سوچ قبائلی نظام کے عین مطابق تھی۔ — تو ایسے ایسے مدبر بھی وہاں موجود تھے۔ آج کل جو اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں — 'DOVES'، یعنی صلح جو اور ٹھنڈے مزاج کے لوگ — اور 'HAWKS'، یعنی تند خو، جوشیلے اور مشتعل مزاج لوگ — عتبہ ابن ربیعہ جیسے لوگوں کا شمار میں 'DOVES' میں کرتا ہوں۔ یہ نہیں چاہتے تھے کہ خون ریزی ہو۔ ان کی بات لوگوں کی اکثریت نے قبول کرلی تھی، جبکہ 'HAWKS' کا سردار تھا ابوجہل اور وہ اس بات پر مصر تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپؐ کے ساتھیوں کو ختم کر دیا جائے، لیکن اس کی بات نہیں چلی — البتہ دو واقعات ایسے وقوع پذیر ہوگئے کہ 'DOVES' کی بات دب گئی اور HAWKS کی رائے غالب آگئی، جس کے نتیجہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقدام کا جو پانچواں مرحلہ شروع کر رکھا تھا وہ چھٹے اور آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) میں داخل ہوگیا۔

چھٹا مرحلہ = مُسلّح تصادم کا آغاز !!

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس مرحلے کے آغاز کا سبب دو واقعات ہیں۔ پہلا واقعہ تو اس آٹھویں مہم سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "وادیٔ نخلہ" کی طرف روانہ فرمائی تھی۔ اس کا ذکر میں قدرے تفصیل سے عرض کرنے والا ہوں۔ اصل میں اسی واقعہ نے مکہ میں جنگی جوش و خروش کی آگ بھڑکا دی تھی۔ دوسرا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اقدام سے متعلق ہے جو آپؐ نے ابوسفیان کے اس تجارتی قافلے پر تاخت کرنے کے بارے میں کیا تھا جو شام جاتے وقت غزوۂ عشیرہ میں بچ نکلا تھا اور اب تجارتی مال سے لدا پھندا شام سے مکہ واپس آرہا تھا۔

واقعہ وادیٔ نخلہ: وادیٔ نخلہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے جو آٹھویں مہم ترتیب دی، وہ سریّہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اس کا خاص معاملہ یہ ہے کہ آپؐ نے عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں مہاجرین میں سے بارہ افراد پر مشتمل ایک دستہ ترتیب فرمایا اور امیرِ لشکر کو ایک خط مرحمت فرماکر ہدایت فرمائی کہ فلاں جانب کوچ کرو اور دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد خط کھول کر پڑھو اور اس کی تعمیل کرو۔ غور فرمایئے کہ رازداری کس درجہ کی ہے کہ خود کمانڈر کو بھی معلوم نہیں کہ وہ مہم کیا ہے جو میرے سپرد کی گئی ہے۔ وہؓ روانہ ہو گئے اور دو دن کی مسافت کے بعد خط کھولا۔ اس میں لکھا تھا کہ "وادیٔ نخلہ جاکر قیام کرو اور قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور ان کے بارے میں ہمیں اطلاع دیتے رہو"۔ میں آپ حضرات کو وادیٔ نخلہ کا محل وقوع بتا چکا ہوں کہ یہ وادی طائف اور مکہ کے درمیان ہے۔ قریش کے جو قافلے یمن جاتے تھے وہ اسی وادی سے گزر کر طائف ہوتے ہوئے یمن کی طرف جاتے تھے۔ یہ وادی مدینہ سے قریباً تین سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چونکہ طویل سفر تھا اور بڑی سخت اور کٹھن مہم تھی لہٰذا عبداللہ بن جحشؓ نے اپنے ساتھیوں کو آزاد کر دیا کہ میں تو جاؤں گا چونکہ حضورؐ کا حکم ہے تم میں سے جو میرا ساتھ دینا چاہے وہ دے، میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ سب نے کہا کہ حضورؐ کا حکم ہم سب کے لئے ہے، اور آپؓ کا حکم ہمارے لئے واجب الاطاعت ہے۔ ہم کیسے واپس جا سکتے ہیں۔ چنانچہ پورا دستہ وہاں پہنچ کر مقیم ہو گیا۔ وہاں قریش کے ایک مختصر قافلے سے جو صرف پانچ افراد پر مشتمل تھا اور جن کے ساتھ اونٹوں پر لدا ہوا کافی سامانِ تجارت موجود تھا، اچانک مڈبھیڑ ہو گئی۔ کوئی صورتِ حال ایسی پیدا ہو گئی کہ جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس میں کسی پیشگی ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اب دو ہی شکلیں تھیں کہ 'مارو یا مرجاؤ' (EITHER KILL OR BE KILLED) اس کے سوا اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں چنانچہ مقابلہ ہوا اور نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ والوں میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی قتل ہو گیا۔ اس کا باپ اگرچہ حضرموت کا رہنے والا تھا لیکن مکہ میں امیّہ بن حرب (ابوسفیان کے والد) کا حلیف تھا اور قریش کی روایات میں حلیف کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس قافلے میں مغیرہ بن ولید کے دو پوتے، ایک آزاد کردہ غلام اور ایک دوسرا قریشی شامل تھے۔ ان چاروں میں سے دو افراد جان بچاکر فرار ہو گئے اور بقیہ دونوں کو مسلمانوں نے قیدی بنالیا جن میں مغیرہ کا ایک پوتا بھی شامل تھا۔ یہاں نوٹ کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ ہجرت کے بعد اس مسلح مڈبھیڑ میں پہلی بار مکہ کا ایک کافر مسلمانوں کے ہاتھ قتل ہوا، دو قریشی کافر اسیر

بنائے گئے اور قافلے کا مالِ تجارت بطور مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ واپس آکر حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی رپورٹ دی تو اس کے متعلق دو روایات ملتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور سرزنش فرمائی کہ میں نے تم کو جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ دوسری یہ کہ پوری صورتِ حال سن کر حضورؐ نے عتاب نہیں فرمایا نہ کوئی سرزنش فرمائی اور مالِ غنیمت میں سے خمس بھی قبول فرمالیا۔ جو دو قیدی تھے ان کا فدیہ قبول کرکے انہیں آزاد فرما دیا۔ ان میں سے مغیرہ کا پوتا تو واپس مکہ چلا گیا جبکہ دوسرے قیدی حکم بن کیسان آزاد ہونے کے بعد مسلمان ہو گئے اور انہوں نے مدینہ ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آنیوالے قافلے کا معاملہ: وادیٔ نخلہ میں عمرو بن الحضرمی کے قتل، دو قریشیوں کی اسیری جن میں مغیرہ بن ولید جیسے معزز خاندان کا ایک فرد بھی شامل تھا اور پورے سامانِ تجارت کا مسلمانوں کے ہاتھ لگ جانے کی وجہ سے پورے مکہ میں غیظ و غضب کی آگ لگی ہوئی تھی۔ لوگ بے قابو ہو رہے تھے اور انتقام کے لئے مدینہ پر چڑھائی کا مطالبہ کر رہے تھے کہ اسی ہیجان خیز صورتِ حال میں ابوسفیان کی طرف سے مکہ میں ہنگامی پیغام پہنچ گیا کہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے خطرہ ہے کہ وہ اس تجارتی قافلے پر تاخت کریں گے جو نہایت بیش قیمت تجارتی ساز و سامان سے لدا پھندا شام سے واپس آرہا ہے۔ اس خبر نے مکہ میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور مکہ میں ٹھنڈے مزاج اور بردبار طبیعت کے جو سردار اب تک آپس کی خون ریزی سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے وہ تندخو، جوشیلے، مشتعل مزاج لوگوں کے آگے بے بس ہو گئے، جن کا قائد تھا اللہ، اس کے رسولؐ اور دینِ توحید کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل۔ اب ان کے ہاتھ میں خون ریزی کے لئے بیک وقت بہت سی دلیلیں آگئیں۔ چنانچہ پورے مکہ میں چیخ و پکار شروع ہو گئی کہ قتل کا بدلہ قتل، خون کا بدلہ خون۔ اب ہم ان صابیوں اور بے دینوں کی گردنیں مار کر ہی دم لیں گے۔ (مشرکین کے نزدیک تو اہلِ ایمان اپنے آبائی دین سے منحرف ہو کر بے دین ہو گئے تھے)۔ مکہ میں اس وقت انتقام کی جو آگ لگی ہوئی تھی آپ اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ کسی قبائلی معاشرے میں اس نوع کے واقعات کس قدر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور جوشِ انتقام کی کیا کیفیات ہوش و حواس پر غالب آ جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک ہزار جنگجوؤں کے لشکر نے کیل کانٹے سے لیس ہو کر مکہ سے سوئے مدینہ اس عزم و ارادہ سے کوچ

ار توحید کی انقلابی دعوت کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم کر کے دم لیں گے۔ گویا سب آپنے بل سے باہر
یا اور اسی کے نتیجے میں انقلاب محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام کے چھٹے مرحلے "مسلح تصادم"
(ARMED CONFLICT) کا غزوۂ بدر کی صورت میں آغاز ہو گیا

چند اہم نکات: اس سے قبل کہ غزوۂ بدر سے مسلح تصادم کے جس مرحلہ کا آغاز ہوا میں اس پر
گفتگو کروں، میں چاہتا ہوں کہ میں نے پانچویں مرحلے یعنی اقدام کے ضمن میں جو تین اہم نکات آپ
نوٹ کرائے تھے، ان کو اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیجئے۔ یہی نکات اس نقطۂ نظر کی قطعی تردید
کرتے ہیں کہ اہلِ ایمان نے تو محض اپنی مدافعت میں جنگ لڑی ہے۔

پہلا نکتہ یہ کہ ہجرت کے بعد پہلا عَلَم بلند فرمایا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے اور پہلے عَلَم بردار تھے اسد اللہ و اسد رسولہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

دوسرا نکتہ یہ کہ پہلا تیر چلا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار حضرت سعد
بن ابی وقاص رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی طرف سے

اور ——

تیسرا نکتہ یہ کہ پہلا کافر عمرو بن الحضرمی قتل ہوا اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں
سے۔ دو کافر اسیر بنائے گئے مسلمانوں کی طرف سے۔ اور پہلا مالِ غنیمت بھی
اہلِ ایمان کے ہاتھ لگا۔

اس آخری نکتے کے متعلق اس بحث کو نظر انداز کر دیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا
م دیا تھا یا نہیں! بہر حال یہ کام اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں بالفعل ہوئے ——
اہر بات ہے کہ جماعتی سطح پر تو یہی ہوتا ہے کہ انقلابی جماعت کا کوئی فرد جب کوئی اقدام کرتا ہے
اس کی ذمہ داری قائدِ انقلاب پر آتی ہے۔ یا پھر یہ ہوتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے
کلیہ اظہارِ براءت فرماتے یا اقدام کرنے والوں کو سزا دیتے اور مشرکین کے نقصانات کی تلافی
ماتے۔ آپؐ نے ایسی کوئی شکل اختیار نہیں فرمائی۔ گویا آپؐ نے اپنے اصحابؓ کے اس
قدام کو قبول (OWN) فرما لیا۔

اب آئیے غزوۂ بدر کی طرف ——

(جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۔

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

مسلم فیمیلی لاز آرڈیننس
پر
علماءِ کرام
کا
تبصرہ
ایک تاریخی دستاویز

۲ مارچ کو مرکزی حکومت نے مسلم فیملی لاز آرڈی ننس ۱۹۶۱ء کے نام سے جو قانونی حکم صادر کیا ہے اور اس کو پیش کرتے ہوئے وزیرِ قانون جناب محمد ابراہیم صاحب نے جو توضیحی بیان دیا ہے اس کو ہم نے بغور دیکھا۔ ہم اس بات پر افسوس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پچھلے پانچ سال کے دوران میں عائلی کمیشن کی رپورٹ پر اہلِ علم (یعنی علمِ دین کے جاننے والوں) کی طرف سے جو مدلل تبصرے کیے گئے تھے۔ اور اس کی کمزوریوں کی جو صاف صاف نشان دہی خود کمیشن کے ایک عالمِ دین رُکن اور دوسرے لوگوں کی طرف سے کی گئی تھی ان سب کو مرکزی حکومت نے بے تکلف نظر انداز کر دیا اور اس کمیشن کی بیشتر سفارشات کو قانون کا جامہ پہنا دیا۔ مزید افسوس اِس بات کا ہے کہ وزیرِ قانون نے اس نئی قانون سازی کو عین مطابقِ قرآن قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ تاہم یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ آرڈیننس کو فوری طور پر نافذ العمل قرار نہیں دیا گیا ہے اور اس کے نفاذ کو آئندہ کے کسی اعلان تک مؤخر رکھا گیا ہے۔ ہم اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر پُورے دلائل کے ساتھ اس آرڈیننس کی کمزوریوں اور اس کے نقصانات کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ حکومت پھر ایک مرتبہ غور کرے اور اس غلطی کی تلافی کرے۔ اب تک موجودہ حکومت کی یہ ایک قدر روایت رہی ہے کہ اس کے کسی فیصلہ کی غلطی اگر اس پر واضح کر دی گئی ہے تو اس نے اِس فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے میں تأمل نہیں کیا ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس آرڈی ننس کے معاملے میں بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔

ذیل میں آرڈیننس کی قابلِ اعتراض دفعات پر سلسلہ وار تبصرہ اسی تعمیری غرض کے لیے پیش کیا جا رہا ہے

دفعہ نمبر ۴:۔ اِس دفعہ کی رُو سے دادا اور نانا کے اُن پوتوں اور پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کو دادا اور نانا کا وارث قرار دیا گیا ہے جن کے باپ یا ماں مُورث کی زندگی ہی میں وفات پا گئے ہوں۔ محترم وزیرِ قانون کے خیال میں یہ قرآنی قانون کی پیروی ہے۔ لیکن اس کے اندر قرآن کے چار صریح قاعدوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

۱۔ قرآن ایک مُورث کے ترکے میں صرف اُن رشتہ داروں کے حصّے مقرر کرتا ہے جو مُورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں لیکن آرڈی ننس کی یہ دفعہ بعض ان رشتہ داروں کو حصہ دلواتی ہے جو مُورث کی زندگی میں وفات پا چکے ہوں۔ اس دفعہ کی رُو سے پہلے یہ فرض کیا جائے گا کہ وہ وفات یافتہ رشتہ دار مُورث کی وفات کے وقت زندہ ہیں اور اس مفروضے کی بنا پر واقعی زندہ رشتہ داروں

کے ساتھ ان کا حصہ نکالا جائے گا۔ پھر ان کا حصہ نکالتے ہی انہیں مُردہ تسلیم کر لیا جائے گا اور آگے ان کے وارثوں میں وہ حصہ تقسیم کیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی کس آیت سے یہ قانونی مفروضات اور قانونی حیلے اخذ کیے گئے ہیں؟

۲۔ قرآنِ کریم میں جن رشتہ داروں کے حصّے مقرر کیے گئے ہیں ان میں بیٹوں اور بیٹیوں کے علاوہ ماں، باپ، بیوی، شوہر اور مورث کے کلالہ ہونے کی صُورت میں بھائی اور بہن بھی شامل ہیں، لیکن آرڈی ننس کی یہ دفعہ ان میں سے صرف بیٹوں اور بیٹیوں کو اس امتیاز کے لیے منتخب کرتی ہے کہ مورث کی زندگی میں مر جانے کے باوجود وہ حصّہ وصول کرنے کے لیے مورث کی موت کے وقت زندہ فرض کیے جائیں گے اور پھر آگے حصّہ تقسیم کرنے کے لیے مُردہ تسلیم کر لیے جائیں یہ امتیاز قرآن کی کس نص یا اس کے کس اقتضاء یا دلالت یا اشارے سے ماخوذ ہے؟

۳۔ قرآن کی رُو سے ایک مورث کے ترکے میں اس کے تمام بیٹوں اور بیٹیوں کا حق ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ صاحبِ اولاد ہوں یا نہ ہوں، شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں، بالغ ہوں یا نہ ہوں لیکن اس آرڈی ننس میں مزید امتیاز برتا گیا ہے کہ جو بیٹے اور بیٹیاں مورث کی زندگی میں لاولد مر گئے ہوں ان کو تو حصّہ وصول کرنے کے لیے زندہ فرض نہیں کیا جائے گا۔ البتہ جو اولاد چھوڑ گئے ہوں صرف اُن کا حصہ وصول کیا جائے گا۔ اس امتیاز کے لیے قرآن کریم میں کیا دلیل ہے۔

۴۔ یہ آرڈی ننس مزید امتیاز یہ برتتا ہے کہ فوت شدہ صاحبِ اولاد بیٹوں اور بیٹیوں کی بھی صرف اولاد کو حصہ پہنچاتا ہے۔ دراں حالیکہ قرآن کی رُو سے اگر مورث کے مال میں اُن کا کوئی حق ہے تو وہ پھر ان کی ماں یا ان کے باپ اور اُن کی بیوی یا اُن کے شوہر کو بھی پہنچنا چاہیے مثلاً اگر ایک متوفیہ بیٹی کا حصہ نکالا جائے تو اس کا شوہر بھی حقدار ہے اگر وہ زندہ ہو اور اس کی ماں بھی حقدار ہے اگر وہ متوفیہ باپ سے حصہ پا رہی ہو اور اس کا باپ بھی حقدار ہے اگر وہ متوفیہ ماں سے حصہ پا رہی ہو نانا سے صرف نواسوں اور نواسیوں کو حصہ دلوانا اور دوسرے وارثوں کو چھوڑ دینا قرآن کے کس حکم پر مبنی ہے؟

ان سوالات کے جواب میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام نئے مفروضات اور قاعدے صرف قرآن کے اس منشاء کو پورا کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں کہ یتامیٰ کی مدد کی جائے اگرچہ بجائے خود یہ قاعدے اور مفروضے قرآن سے ماخوذ نہیں ہیں۔ لیکن یہ عذر

وجوہ سے بالکل غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا قانونِ میراث سرے سے اس اصول پر مبنی ہی نہیں ہے کہ کسی پر رحم کھا کر اس کی مدد کی جائے، ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ قرآن ایک مالدار رشتہ دار کو میراث کا حق پہنچاتا محض اس بنا پر کہ وہ قاعدے کے مطابق حقدار رشتوں کے دائرے میں شامل نہیں ہے۔ ایک اپاہج مفلس بھائی کو محروم کرنا اور ایک دولت مند بیٹے کو دولت مند باپ کی جائداد کا وارث بنانا بالکل غلط ہو جاتا۔ اگر قانونِ میراث بنانے سے قرآن کا منشا یہ ہوتا کہ حاجت مندوں کی مدد کی جائے۔ دوسری وجہ جس کی بنا پر یہ عذر قطعاً غلط ہوگا یہ ہے کہ اگر فی الواقع قرآن کا ایسا کوئی منشا ہوتا کہ یتیم پوتوں اور نواسوں کی مدد دادا اور نانا کی میراث میں اُن کو حصہ دار بنا کر کی جانی چاہیے تو آخر کیا امر اس میں مانع تھا کہ قرآن اپنے اس غامض منشا کو ایک صاف حکم کے ذریعہ سے کھول دیتا، اور اگر قرآن نے نہ کھولا تھا تو یہ منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تو مخفی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ انہوں نے ایسا حکم کیوں نہیں دیا؟ اگر حضورؐ نے اس کو نہیں کھولا تھا تو آخر کیا معقول وجہ ہے کہ قرآن کا یہ منشا تمام خلفا سے، تمام صحابہ سے، تمام آئمہ اہل بیت سے، تمام مجتہدین سے اور پچھلی تیرہ صدیوں میں اسلام کے سارے فقہا سے مخفی رہ گیا اور اس کو پایا تو اس زمانہ میں چند اُن لوگوں نے جنہوں نے چاہے جس علم کی بھی تعلیم و تربیت پائی ہو، قرآن و سنت کے علم کی تعلیم و تربیت نہیں پائی۔ باپ کی زندگی میں فوت ہو جانے والے بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد کو جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کو رفع کرنے کا صحیح طریقہ بارہا علماء کی طرف سے پیش کیا جا چکا ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ البتہ اس معاملے میں شریعت کے خلاف طریقوں کو درخورِ اعتنا سمجھا جاتا ہے اور انہیں رواج دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دفعہ نمبر ۵: اس دفعہ کی رُو سے یہ لازم کیا گیا ہے کہ تمام نکاح جو کسی علاقے میں ہوں وہ اِس علاقے کی یونین کونسل کے مقرر کردہ نکاح رجسٹرار کے پاس درج کیے جائیں اور اگر نکاح رجسٹرار کے سوا کسی اور نکاح خواں سے پڑھایا ہو تو اس کی اطلاع نکاح رجسٹرار کو کی جائے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو تین مہینے قید یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ تک کی سزا دی جائے گی یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

جہاں تک کہ نکاح کی رجسٹری کا تعلق ہے اس کی ضرورت اور اس کے فائدے سے انکار

نہیں۔ اگر اس رجسٹری کے لیے ملک میں جگہ جگہ مناسب انتظامات موجود ہوں اور لوگوں کے علم میں اس کے فائدے لائے جائیں تو امید ہے کہ لوگ خود اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے رجسٹریشن کی ان سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اس کو قانوناً لازم کرنا اور اس کی خلاف ورزی کو ایک جرم مستلزم سزا قرار دینا متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں نکاح شرعاً بالکل صحیح طور پر منعقد ہو جاتا ہے اگر عورت اور مرد نے دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کر لیا ہو۔ نکاح کا خطبہ پڑھا جانا کوئی ضروری امر نہیں ہے کسی قاضی یا عالم کا موجود ہونا اور اس کا خطبہ پڑھنے کے بعد ایجاب و قبول کرانا زائد از ضرورت مستحبات میں سے ہے۔ نکاح اس کے بغیر منعقد ہو جاتا ہے لیکن یہ رجسٹریشن کا حکم نکاح خوان کا ایک باقاعدہ منصب قائم کرتا ہے۔

دوسری بات وضاحت طلب یہ ہے کہ جس نکاح کی رجسٹری نہ ہوئی ہو اور شریعت کے مطابق دو شہادتیں اس پر قائم ہو جائیں، آیا اس کو آپ کی عدالت تسلیم کرے گی یا نہیں ؟ اس نکاح کی بنا پر عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا جائز وارث تسلیم کیا جائے گا یا نہیں ؟ ان سے پیدا شدہ اولاد کو جائز اولاد مانا جائے گا یا نہیں ؟ وہ اولاد اپنے باپ سے میراث پائے گی یا نہیں ؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو یہ شریعتِ اسلامیہ سے کھلا تصادم ہے کیونکہ شریعت کی رُو سے ایک نکاح جائز ہوگا اور آپ کے قانون کی رُو سے ناجائز ہوگا۔ شریعت کی رُو سے کچھ حقوق ثابت ہوں گے اور آپ کے قانون کی رُو سے وہ باطل ہو جائیں گے اور اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو پھر آپ کا ازروئے قانون رجسٹریشن کو لازم کرنا اور رجسٹری نہ کرانے والوں کو سزائیں دینا عملاً بے معنی ہو جاتا ہے۔

تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ آیا واقعی یہ رجسٹریشن جائز نکاحوں کے ثبوت کا کوئی یقینی ذریعہ ہے ؟ اور آج تک مسلمانوں میں جو نکاح رجسٹری کے بغیر ہوتے رہے ہیں ان پر اس طریقہ کو کوئی واضح فوقیت حاصل ہے ؟ ہمارے خیال میں تو رجسٹریشن کو اس حد تک اہمیت دینا صحیح نہیں ہے۔ ملک کی موجودہ بگڑی ہوئی حالت میں اس بات کا بہت کافی امکان ہے کہ ایک بااثر غنڈہ رشوت اور سازش کے ذریعہ سے کسی شریف عورت کے ساتھ اپنے نکاح کا بالکل فرضی اندراج کرا دے

ور اس پر اپنے ساتھی غنڈوں کی گواہیاں ثبت کرا دے۔ اس طرح کے اندراجات سے وہ ساری قباحتیں پیدا ہو سکتی ہیں، جو مروّج طریقِ نکاح کی صورت میں فرض کی جا سکتی ہیں۔

اِن وجوہ سے ہم پھر اپنی اس رائے پر اصرار کریں گے کہ رجسٹریشن کی سہولتوں کو صرف مہیا کر دینے پر اکتفا کیا جائے اور بتدریج لوگوں کو اس بات کا عادی کیا جائے کہ وہ رضاکارانہ طریقے پر ان سے فائدہ اٹھائیں۔ معاشرے کے ہر مسئلہ کو جبر و تعزیر کے زور سے حل کرنے کی کوشش نہ صحیح ہے اور نہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

دفعہ نمبر ۶ : یہ دفعہ تعدّدِ ازواج پر پابندیاں عاید کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے قبل اس کے کہ ہم اس دفعہ کا تجزیہ کر کے اس پر بحث کریں، ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ تعددِ ازواج کو اصلاً ایک بُرائی سمجھنا اور صرف ناگزیر ضرورت کی حالت میں اس کو جائز قرار دینا ایک غیر اسلامی تخیّل ہے۔ اسلام اس تخیل سے قطعاً نا آشنا ہے، یہ مغرب سے درآمد ہوا ہے اور اس کے جواز کو ناگزیر ضرورت کے ساتھ مقیّد کرنے کی کوشش مغرب کے سامنے ایک معذرت کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قرآن جن انبیاء کو خدا کے مقرر کردہ امام اور پیشوا اور مقتدا قرار دیتا ہے، اُن میں سے بیشتر تعدّدِ ازواج پر عامل تھے۔ خود سرورِ انبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد بیویاں تھیں۔ کوئی منکرِ حدیث بھی اِس امرِ واقعہ سے انکار نہیں کر سکتا کیونکہ قرآن میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا ذکر ہے (وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ۔ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ) پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں خلفاء، بیشتر صحابہ، اکثر ائمہ اہلِ بیت اور اسلامی تاریخ کے بیشتر اکابرین جن پر مسلمانوں کو فخر ہے بیک وقت متعدد بیویاں رکھنے والے تھے۔ اُن میں سے کس کس کے متعلق آخر آپ ثابت کریں گے کہ اُن کو ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی سخت ضرورت تھی؟ اِس چیز کو اصلاً ایک بُرائی تسلیم کر لینے کے بعد تو لازماً "یک زوجی" کے قائل اہلِ مغرب بہت سی ناجائز داشتائیں اور آشنائیں رکھنے کے باوجود صالح قرار پاتے ہیں۔ اِس لیے کہ ان میں سے کسی نے کسی ضرورت کی بناء پر بھی ایک سے زائد قانونی بیویاں نہیں رکھیں، اور مسلمانوں کے بیشتر اکابر کم از کم نیم صالح تو قرار پاتے ہی ہیں کیونکہ وہ ضرورتاً اس "برائی" پر عمل کرتے رہے۔

مزید برآں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تعدّدِ ازواج کے معاملے میں تو ہمارے وزیرِ قانون صاحب

ور ہمارے دوسرے لیڈروں اور حکمرانوں کو قرآن کا کوئی مخفی منشا تلاش کر کے اس پر پابندیاں عائد
رنے کی اس قدر سخت ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن قرآن نے جن برائیوں کو صریح الفاظ میں منع کیا ہے
ن میں سے کسی کو قانون کے ذریعہ سے روکنے کی اُنہوں نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر ایک
شخص ایک بیوی کے موجود ہوتے ہوئے طوائفوں کے ہاں جائے یا کوئی داشتہ رکھے یا آزادانہ شہوت
انی کرتا پھرے تو فرمائیے کہ آپ کے قانون میں اس کے لیے کیا رکاوٹ ہے۔ کیا سزا اس کے لیے
تجویز کی گئی ہے؟ کن بیگمات نے اس کے خلاف کبھی احتجاج کیا اور اُس کو ازرُوئے قانون روکنے کا
بھی مطالبہ کیا؟ کب آپ نے کوئی کمیشن بٹھایا کہ اس کے سدِباب کے لیے بھی کوئی تدبیر تجویز کی جائے؟
س صریح بُرائی کو تو آپ رواداری کا مستحق سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن اسے انتہائی سخت جُرم قرار دیتا ہے
ور اس کے لیے سخت سزا تجویز کرتا ہے مگر تعدّدِ ازواج پر آپ پابندیاں عائد کرنے کی فکر کرتے ہیں
ور دعوٰی یہ کرتے ہیں کہ ہم قرآن کے منشا کو پُورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ طرزِ عمل کسی صحیح ذہنیت
کی غمازی نہیں کرتا۔ کیوں صاف صاف یہ اعتراف نہیں کیا جاتا کہ قرآن کا منشا پُورا کرنا پیشِ نظر نہیں ہے
بلکہ اُن اہلِ مغرب کے سامنے معذرت پیش کرنا مقصود ہے جو مسلمانوں سے سابقہ پیش آتے ہی سب
سے پہلے تعدّدِ ازواج پر برسنا شروع کر دیتے ہیں اور اس بات کو بھُول جاتے ہیں کہ غیر قانونی تعددِ
ازواج اُن کے ہاں جس بڑے پیمانے پر رائج ہے اتنا مشکل ہی سے دنیا کی کسی سوسائٹی میں آج تک
رائج رہا ہوگا۔ حتیٰ کہ اُن کے بعض ملکوں میں آج خود یو۔ این۔ او کی ایک رپورٹ کے مطابق ناجائز
ولادتوں کا اوسط ۶۰ فی صدی تک پہنچ چکا ہے۔

اب ہم اس دفعہ کے مشتملات پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس میں ایک شخص کو جو ایک بیوی
یا زائد بیویوں کی موجودگی میں مزید نکاح کرنا چاہتا ہو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ اوّلاً وہ اپنی موجودہ بیوی
یا بیویوں کی رضامندی حاصل کرے، ثانیاً اپنے علاقہ کی یونین کونسل کے چیئرمین سے اجازت حاصل
کرنے کی درخواست کرے، ثالثاً ایک پنچایت کو جو اس شخص کے نمائندے اور اُس کی بیوی یا بیویوں
کے نمائندے اور یونین کونسل کے چیئرمین پر مشتمل ہوگی، اس بات پر مطمئن کرے کہ اس کا مزید ایک بیوی
کرنا ضروری اور حق بجانب ہے۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد پنچایت سے اجازت نامہ حاصل کرنے پر وہ
نکاح کرنے کا مجاز ہوگا لیکن پنچایت کے اِس فیصلے کے خلاف مغربی پاکستان میں کلکٹر کے پاس

اور مغربی پاکستان میں سب ڈویژنل آفیسر کے پاس نگرانی کی جا سکے گی اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا جس کے خلاف کہیں کوئی اپیل نہ ہو سکے گی قطع نظر اس کے کہ وہ نکاح کی اجازت دینے کے حق میں ہو یا اجازت منسوخ کرنے کے حق میں۔ مزید برآں اس دفعہ میں یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ جو شخص مذکورۂ بالا قاعدہ کے خلاف نکاح کر لے۔

۱۔ اس کی بیوی یا بیویوں کو فوراً پورا مہر دلوایا جائیگا، خواہ وہ اصلاً مہر معجل ہو یا مؤجل۔

۲۔ اس کو ایک سال قید یا پانچ ہزار روپیہ جرمانہ تک کی سزا دی جائے گی یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

۳۔ اس کا نکاح علاقے کے رجسٹرار کے پاس درج نہیں کیا جائے گا، جس کے معنی غالباً یہ ہیں کہ وہ سرے سے قانوناً مسلّم ہی نہیں ہوگا۔

۴۔ اس کی بیوی یا بیویوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس شکایت کی بنیاد پر عدالت میں خُلع کا مطالبہ کرے یا کریں۔

وزیرِ قانون صاحب ہم کو یہ یقین دلانے کی کوشش فرماتے ہیں کہ سب کچھ انہوں نے قرآن کے منشاء کو پُورا کرنے کے لیے کیا ہے لیکن قرآن کے جس منشاء کی وہ نشان دہی فرماتے ہیں وہ خود اُن کے الفاظ میں اِس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک سے زائد بیویوں کے ساتھ نکاح اس شرط پر جائز ہے کہ شوہر سب بیویوں کے درمیان عدل کرے۔ وزیرِ قانون صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ تعدّدِ ازواج پر پابندیاں اس لیے عائد فرما رہے ہیں کہ لوگ اس اجازت سے غلط فائدہ اُٹھا کر ایک سے زائد بیویاں کر لیتے ہیں اور عدل کی شرط پوری نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عدل کا سوال آیا نکاح سے پہلے پیدا ہوتا ہے یا نکاح کے بعد؟ ظاہر بات ہے کہ یہ سوال ایک سے زائد نکاح کر لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے کہ آیا شوہر نے عدل کیا ہے یا نہیں۔ وجہ شکایت قرآن کی رُو سے جائز طور پر صرف اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ شوہر نے عدل نہ کیا ہو۔ اور اُس وقت ایک بیوی کو جس کے ساتھ عدل نہ ہو رہا ہو یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے کہ یا تو اس کے ساتھ عدل کیا جائے یا شوہر صرف ایک بیوی رکھے۔ قرآن کا نام لے کر اس کے اِس منشاء کو پُورا کرنے کی یہ شکل قرآن کے کس لفظ یا اشارے یا فحویٰ سے اخذ کی گئی ہے کہ نکاح سے پہلے شوہر اپنی موجود بیوی یا بیویوں

کی رضامندی حاصل کرے اور ایک پنچایت کو اپنی ضرورت کا اطمینان دلاتے ؟ پھر قرآن کے کس لفظ یا اشارے سے یہ حکم اخذ کیا گیا ہے کہ جو نکاح موجود بیوی یا بیویوں سے اجازت لیے بغیر اور ایک پنچایت سے لائسنس حاصل کیے بغیر کیا گیا ہو، وہ قانوناً تسلیم ہی نہ کیا جائے اور اس شخص کو جیل بھی بھیجا جائے۔ اور قبل اس کے کہ اس کی بیوی یا بیویوں کو عدل نہ کیے جانے کی شکایت پیدا ہو مجرد نکاح کر لینا ہی وہ جائز وجہ شکایت ہو جس کی بناء پر وہ خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے یا کر سکتی ہیں ؟ براہِ کرم ہمیں یہ بتائیے کہ یہ سب کچھ قرآن کے کس مقام سے اخذ کیا گیا ہے ؟ اور اگر قرآن میں یہ نہیں ہے تو کیا کہیں کوئی شہادت اِس امر کی موجود ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوی کے بعد جتنی شادیاں کیں اُن سے پہلے حضور نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے انہیں اس بات پر مطمئن کیا ہو کہ مجھے مزید بیویوں کی ضرورت ہے ؟ یا صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو دُوسری شادی کرنے سے پہلے اِس بات پر مجبور کیا گیا ہو کہ وہ کسی پنچایت کے سامنے اپنی ضرورت ثابت کریں ؟ یا تاریخِ اسلام میں کبھی کسی بیوی کو صرف اس بناء پر خلع کے مطالبے کا حق دیا گیا ہو کہ اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے ؟ یا کسی شخص کو اِس جرم میں پکڑا گیا ہو کہ اس نے پچھلی بیویوں سے اجازت لیے بغیر اور پنچایت سے لائسنس لیے بغیر مزید ایک نکاح کر ڈالا ہے ؟

اگر پیشِ نظر قرآن کا نام لے کر مغربی تخیلات کو اسلامی قانون میں داخل کرنا ہو تب تو بات دوسری ہے ورنہ قرآن کے منشا ہی کو پُورا کرنا فی الواقع پیش نظر ہو تو یہ پُوری دفعہ منسُوخ کر دینے کے قابل ہے کیونکہ قرآن اور سُنت اور فقہِ اسلامی اس کے بنیادی تخیلات اور اس کے اصول و قواعد سے بالکل ناآشنا ہیں۔ اس کے بجائے صرف ایک چیز اس دفعہ میں ہونی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی صورت میں اُن کے درمیان عدل نہ کرے، اس کے خلاف اس بیوی کو عدالت میں شکایت لے جانے کا حق ہو گا جس کے ساتھ عدل نہ کیا جا رہا ہو اور عدالت شوہر کو اس کے ساتھ انصاف کرنے پر مجبور کرے گی۔

دفعہ نمبر ۷ : اِس دفعہ میں طلاق کے جو احکام وضع کیے گئے ہیں وہ تقریباً پُورے کے پُورے قرآن کے احکام کے خلاف ہیں۔ اور ان احکام کو نافذ کرنے کے نتائج مسلم معاشرے کے حق میں اس قدر فتنہ انگیز ہوں گے کہ شاید ابھی اُن کا پُورا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی پہلی شق میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو کسی صورت میں طلاق دے (غالباً کسی صورت سے مراد یہ ہے کہ خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن یا مغلظ) وہ یونین کونسل کے چیئرمین کو اپنے اس فعل کی اطلاع دے گا۔ دوسری شق میں یہ طے کیا گیا ہے کہ جو شخص اطلاع نہ دے اس کو ایک سال قید یا پانچ ہزار روپے جرمانہ تک کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔ تیسری اور پانچویں شق میں طے کیا گیا ہے کہ: (۱) طلاق کی عدت طلاق دینے کے وقت سے نہیں شروع ہوگی، بلکہ یونین کونسل کے چیئرمین کو نوٹس ملنے کے بعد سے شروع ہوگی۔ (۲) اور یہ عدت عورت کے غیر حاملہ ہونے کی صورت میں ۹۰ دن کی ہوگی اور حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل تک یا ۹۰ دن تک (ان میں سے جو مدت بھی طویل تر ہو) ممتد ہوگی یعنی اس مدت کے اندر رجوع کا حق ہوگا۔ (۳) یونین کونسل کا چیئرمین نوٹس ملنے کے بعد ۳۰ دن کے اندر ایک پنچایت مقرر کرے گا جو زوجین کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے گی اور اس کے ناکام ہونے کی صورت میں طلاق نافذ ہوگی۔

یہ تمام شقیں قرآن کے صریح احکام سے ٹکراتی ہیں۔ وزیر قانون صاحب اپنے بیان میں فرماتے ہیں کہ "اسلامی قانون طلاق کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کبھی میاں اور بیوی میں اختلافات رونما ہوں تو قریبی رشتہ دار اور دوسرے لوگ ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں تاکہ فوری تفریق نہ ہونے پائے" لیکن در اصل انہوں نے قرآن کے دو احکام کو بالکل غلط طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے اور قرآن کے دیئے ہوئے حق طلاق کو ایک پنچایت کے ساتھ معلق کر کے رکھ دیا ہے۔ قرآن مجید میں طلاق کے احکام بالکل الگ بیان کیے گئے ہیں اور میاں بیوی کے اختلافات کو رفع کرنے کی صورت الگ بیان کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیت ۲۲۷ سے لے کر ۲۴۲ تک اور سورۂ احزاب کی آیت ۴۹ میں اور سورۂ طلاق کی پہلی آیتوں میں طلاق کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ کوئی قانونی فہم رکھنے والا شخص ان احکام کو پڑھتے ہوئے قطعاً یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ یہاں شوہر کے حق طلاق کو کسی پنچایت یا عدالت کے سامنے پیش کرنے اور اس کا فیصلہ حاصل کرنے سے مقید کیا گیا ہے۔ ان تمام احکام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر جب چاہے طلاق دینے کا مختار ہے۔ ایک آیت کے اندر تو صاف الفاظ میں بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ کا فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عقد نکاح کو برقرار رکھنا یا توڑ دینا شوہر کے اختیار میں

ہے اور اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے کے لیے وہ قطعاً کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنے کا پابند نہیں ہے۔ دوسری طرف سورۂ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ نیک بیویاں شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ اگر بیوی نشوز کا رویہ اختیار کرے تو شوہر کو اسے مطیع بنانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنے کا حق ہے اور اگر زوجین کے درمیان کوئی جھگڑا ہو تو ایک حَکم شوہر کے خاندان سے اور ایک حَکم بیوی کے خاندان سے مقرر کیا جائے تاکہ وہ دونوں مل کر ان کے جھگڑے کو رفع کرانے کی کوشش کریں۔ اس آیت میں سرے سے طلاق کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے اور کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اس سعی مصالحت کے بغیر شوہر طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ ان دو الگ قوانین کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی کوشش کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

دراصل اس دفعہ کا پورا تخیل مغرب کے انتہائی ناقص قوانینِ نکاح و طلاق سے اخذ کیا گیا ہے اور نام یہ لیا جا رہا ہے کہ یہ قرآنی قانونِ طلاق کے اصولوں پر مبنی ہے۔ مغرب ایک مدتِ دراز تک طلاق کو ایک برائی اور ایک ناجائز کارروائی سمجھتا رہا اور اسلام پر اعتراض کرتا رہا کہ اس میں یہ چیز جائز ہے۔ پھر اپنے اس غلط تخیل کے بدترین نتائج دیکھ لینے کے بعد جب اس نے طلاق کے جواز کی ضرورت محسوس کر لی تو اپنے سابق طرزِ فکر کو برقرار رکھتے ہوئے، اس نے طلاق کی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ شکل اختیار کی کہ عورت اور مرد دونوں کو علیحدگی چاہنے کی صورت میں عدالتی فیصلہ کا پابند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانوں کے گندے کپڑے کھلم کھلا عدالتوں میں دھوئے جانے لگے۔ طلاق چاہنے والے چونکہ مجبور تھے کہ ایک عدالت کو اس بات پر مطمئن کریں کہ ان کے لیے جدائی ناگزیر ہو چکی ہے، اس لیے انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے الزامات اور زیادہ تر اخلاقی کے اتہامات مجبوراً لگائے کیونکہ اصل وجوہِ طلاق لازماً وہی نہیں ہو سکتے جو کسی عدالت کو مطمئن کر دیں۔ اس طرح ان غلط قوانینِ طلاق کی بدولت مغربی معاشرہ طلاق کے انتہائی فتنہ انگیز مفاسد سے لبریز ہو گیا۔ اب ہمارے نئے قانون سازان اہلِ مغرب کی اندھی تقلید میں ہمارے معاشرے کو اس فتنہ سے دوچار کرنے کے درپے ہیں۔

آرڈیننس کی اس دفعہ کی مذکورہ بالا شقوں میں حسبِ ذیل امور صریح طور پر قرآن کے خلاف ہیں:

۱۔ اس میں عورت کی عدت یونین کونسل کے چیئرمین کو نوٹس دینے کے بعد سے شروع ہوتی ہے، خواہ طلاق دینے کے مہینے دو مہینے بعد ہی یہ نوٹس دیا گیا ہو حالانکہ قرآن کی رُو سے طلاق زبان سے نکالتے ہی عدت کی مدت شروع ہو جاتی ہے۔

۲۔ اس میں عدت کی مدت غیر حاملہ عورت کے لیے ۹۰ دن قرار دی گئی ہے، حالانکہ قرآن کی رُو سے تین حیض اس کی مدت ہے۔

۳۔ اس میں حاملہ عورت کی عدت کی مدت وضعِ حمل یا ۹۰ دن (ان میں سے جو مدت بھی طویل تر ہو) قرار دی گئی ہے حالانکہ قرآن کی رُو سے حاملہ کی عدت وضعِ حمل پر ختم ہو جاتی ہے اور صرف غیر حائضہ عورت کی مدتِ عدت نوّے دن نہیں، بلکہ تین مہینے رکھی گئی ہے۔

۴۔ اس میں طلاق کے نفاذ کو یونین کونسل کے چیئرمین تک اطلاع پہنچنے اور اس کی سعی مصالحت کرنے پر موقوف کر دیا گیا ہے، حالانکہ یہ قرآن کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ ہم اُوپر واضح کر چکے ہیں۔

۵۔ اس میں شوہر کے خاندان اور بیوی کے خاندان کے ایک ایک حَکَم کے ساتھ یونین کونسل کے چیئرمین کا مزید اضافہ کر دیا گیا ہے، حالانکہ قرآن صرف دونوں خاندانوں کے ایک ایک حکم کے سامنے اختلافات پیش کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یونین کونسل کا چیئرمین لازماً اپنے علاقے کے تمام خاندانوں کا کوئی معتمد علیہ سرپرست نہیں ہو سکتا بلکہ آپ کے کسی قانون کی رُو سے اس کا مسلمان ہونا تک ضروری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں خاندان یا ان میں سے کوئی ایک اس بیرونی آدمی کے سامنے اپنے گھریلو جھگڑے رکھنے پسند نہ کریں۔ کسی بیرونی شخص کے سامنے میاں اور بیوی کے بعض ایسے معاملات بھی آسکتے ہیں کہ اگر از روئے قانون اُن کا لانا لازم کر دیا جائے تو شاید وہی خواتین جو آج اِس طرح کے قانون کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم فرما رہی ہیں، اُس وقت چیخ اٹھیں گی جب یہ جھگڑے پنچایتوں میں آنے شروع ہوں گے۔ اور بعید نہیں کہ جب طلاق کا نفاذ ایک پنچایت کے اطمینان پر موقوف ہو جائے تو ہمارے ہاں بھی شوہر اپنی بیویوں پر جھوٹے اخلاقی الزامات لگانا شروع کر دیں گے تاکہ پنچایت کو طلاق کے ناگزیر ہونے کا قائل کر سکیں۔

اِس دفعہ کی شق نمبر ۶ ایک اور فتنہ انگیز صُورت پیدا کرتی ہے۔ اس میں یہ طے کیا گیا ہے

کہ ہر وہ نکاح جو کسی مؤثر طلاق کے ذریعے سے ختم ہو چکا ہو اس کے فریقین دوبارہ باہم نکاح کرسکیں گے بغیر اس کے کہ یک وقت دی ہوئی طلاقیں خواہ تین ہی کیوں نہ ہوں مغلظ نہیں ہوں گی اور عملاً ان کی تاثیر ایک ہی طلاق کی ہو گی۔ بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں تو اس سے طلاقِ مغلّظ واقع ہو جاتی ہے اور مطلّقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدتِ عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت گزر جانے کے بعد اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے، جب تک کہ اس کی تحلیل نہ ہو جائے۔ اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔ ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مذہبِ حنفی کے ائمہ و فقہا کے علم و تقویٰ پر ہے وہ اعتماد آج کل کے قانون سازوں پر نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا۔ اس قانون سازی کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے عقیدے اور قانونِ رائج الوقت کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے گا اور اس سے اُن کی معاشرتی زندگی میں بڑی پیچیدگیاں رونما ہوں گی۔ مثال کے طور پر ایک شوہر اگر اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاق دینے کے بعد اس سے رجوع کر لے تو اسی کی حنفی بیوی اور اُس کا خاندان اس رجوع کو جائز تسلیم نہیں کریں گے، بیوی نہ شوہر سے آزاد ہو کر دوسرا نکاح کر سکے گی کیونکہ قانون اس میں مانع ہو گا اور نہ اپنے آپ کو اس شوہر کے حوالے کر سکے گی کیونکہ اس کے عقیدہ کی رُو سے یہ زنا کا ارتکاب ہو گا۔ کیا اس پیچیدگی کو آپ کا کوئی قانون رفع کر سکتا ہے؟ کیا آپ کے قوانین یہ طاقت رکھتے ہیں کہ لوگوں کے عقائد تبدیل کر سکیں؟

دفعہ نمبر ۱۲: اس دفعہ میں لڑکیوں کے لیے عمرِ نکاح کی مدّت ۱۴ سال سے بڑھا کر ۱۶ سال کر دی گئی ہے یعنی ۱۶ سال سے کم عمر کی لڑکی کا نکاح اب از رُوئے قانون نہ ہو سکے گا۔ عمرِ نکاح مقرر کرنے کا قانون پہلی مرتبہ جب انگریزی دَور میں بنایا گیا تھا، اُس وقت بھی علماء نے اس پر احتجاج کیا تھا اور اب اس موقعہ پر ہم پھر اس پر اعتراض کرنے کے لیے مجبور ہیں کیونکہ یہ قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف اور اُن کے مصالح سے متصادم ہے جنہیں اسلامی شریعت نے اہمیت دی ہے۔

قرآن مجید میں بالفاظِ صریح ایسی لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے جس کو ابھی حیض نہ آیا ہو۔ سورۂ طلاق کی آیت نمبر ۴ میں بتایا گیا ہے کہ جن عورتوں کا حیض آنا بند ہو چکا ہو یا جن عورتوں کو ابھی

حیض آنا شروع ہوا ہو ان کے معاملے میں عدتِ طلاق تین مہینے ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ
عدتِ طلاق کا سوال پیدا ہی اُس وقت ہوتا ہے جبکہ پہلے نکاح ہو چکا ہو۔ اس طرح قرآن مجید
صریح طور پر اس لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیتا ہے جس کو حیض آنا شروع ہوا ہو۔ ہمارے
ملک میں بالعموم لڑکیوں کو ۱۳ برس کے لگ بھگ عمر میں حیض آنا شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن
کی رُو سے اس سے کم عمر کی لڑکی کے ساتھ نکاح جائز ہے، لیکن اس آرڈی ننس کی رُو سے ۱۶ برس
سے کم عمر کی لڑکی سے نکاح ناجائز ہے۔

قرآن کے ساتھ اِس تصادم کے علاوہ یہ سوال قابلِ غور ہے کہ اس ملک میں کیا کوئی ایسا
قانون ہے جس کی رُو سے ۱۶ برس سے کم عمر کی لڑکی کے ساتھ زنا کی روک تھام ہو سکے؟ محض یہ
بات کہ ۱۶ برس سے کم عمر کی لڑکی نابالغہ ہو اور اس کے ساتھ مباشرت زنا بالجبر قرار پائے اس خرابی
کی روک تھام کے لیے مؤثر ذریعہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسی لڑکی اگر اپنی مرضی سے زنا کرائے
تو اس جُرم کا قانون کے علم میں آنا ضروری نہیں ہے، لیکن اس کا نکاح جب بھی کیا جائے گا
لازماً قانون کے علم میں آئے گا اور اس کے مرتکبین سزا پائیں گے۔ اب یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ایک
لڑکی کے زانیہ ہو جانے کا تو سدِّباب نہ ہو مگر اُس کے نکاح کا سدِّباب کر دیا جائے اور اگر ایک
باپ اپنی ۱۴، ۱۵ برس کی عمر کی لڑکی بگڑتے ہوئے دیکھ کر اُس کا نکاح کر دینا چاہے تو نہ کر سکے اور
اس کے بگڑنے کے خطرے کو مجبوراً برداشت کرتا رہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ صغر سنی کی
شادی بالعموم ہمت افزائی کی مستحق نہیں ہے اور جن علاقوں میں اس کا رواج قباحتیں پیدا کر رہا ہے
وہاں اس کی اصلاح کی ضرورت ہے لیکن معاشرے کی ہر خرابی کا علاج لازماً جبر ہی نہیں ہے
عوام میں تعلیم و تلقین کے ذریعہ سے اس رُجحان کو روکا جا سکتا ہے بغیر اس کے کہ قانوناً نکاح کی
عمر مقرر کر کے اس سے کم عمر کے نکاح کو سرے ہی سے حرام کر دیا جائے۔

یہ ایک حقِ نصیحت ہے جو ہم اس مُلک کی بھلائی کے لیے اس آرڈی ننس کے نفاذ
سے پہلے ادا کر رہے ہیں۔ اس کو ادا کر دینے کے بعد ہمارا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ اب یہ حکومت کا کام
ہے کہ جن غلطیوں کی نشاندہی دلائل کے ساتھ کر دی گئی ہے اُن کی اصلاح کرے۔

مولانا مفتی محمد حسن۔ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری، ناظم مرکزی حزب الاحناف پاکستان لاہور

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور

مولانا محمد ادریس کاندھلوی، شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

مولانا مفتی جعفر حسین مجتہد، سابق ممبر بورڈ آف تعلیمات، دستور ساز اسمبلی پاکستان

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف، صدر جماعت اہلحدیث لاہور

مولانا سید محمود احمد رضوی، نائب ناظم مرکزی انجمن حزب الاحناف پاکستان لاہور

مولانا ابن الحسنات سیّد خلیل احمد قادری، خطیب مسجد وزیر خان لاہور

مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی، خطیب جامعہ قدس اہلحدیث لاہور

مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی لاہور

مولانا عبدالستار خاں نیازی لاہور

"مجھے اصل دفعات سے وہی اختلاف ہے جو اس مضمون میں ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن اِن دفعات کی وضاحت میں جو امور تحریر فرمائے گئے ہیں ان کے بعض اجزاء سے اتفاق نہیں ہے"۔

مولانا حافظ کفایت حسین مجتہد ادارہ عالیہ

تحفظ حقوق شیعہ پاکستان لاہور

"مضمون بالا کی بعض جزئیات اگرچہ تفصیل طلب یا غور طلب ہیں، مگر اصل مقصد کے لحاظ سے میں اِس پورے مضمون سے متفق ہوں"۔

مولانا حافظ محمد عبداللہ روپڑی۔ متولی جامع قدس

اہل حدیث لاہور

ماخوذ از ہفت روزہ "شہاب" لاہور

مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۶۱ء

تحریک الاخوان المسلمون (۲)
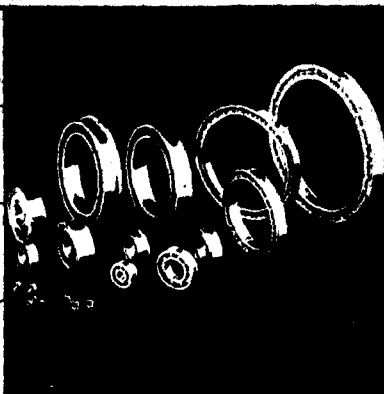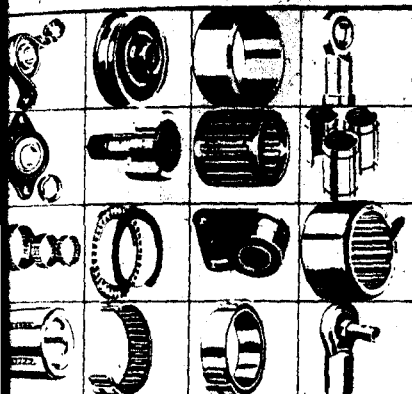
حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ قبل از وقت تھا!

قاضی ظفر حق

ابتداء و آغازِ کار..... شیخ حسن البنّا کے حالات زندگی میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ وہ نہایت بے قرار روح اور سیماب وش شخصیت کے مالک تھے۔ ایک بزرگ کے قول کے مطابق قدرت جسے کسی خاص کام کے لئے پیدا کرتی ہے اس کو وہ کام انجام دیئے بغیر چین نہیں آتا۔ چنانچہ ملازمت اختیار کرنے کے بعد جب ان کی تقرری اسماعیلیہ میں ہو گئی تو قاہرہ کی سرگرمیاں چھوٹ جانے کا انہیں نہایت غم ہوا جہاں وہ تندہی سے قہوہ خانوں میں اسلامی دعوت کا کام کر رہے تھے اور بڑے بڑے علماء کو انہوں نے اپنے جذب و آتشِ عشق سے پگھلا کر الحاد و لادینیت کی اٹھتی ہوئی لہر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار و بیدار کر دیا تھا۔ چنانچہ مشہور ہفت روزہ الفتح انہی کی کوششوں کا ثمر تھا۔ اب جو حسن البنا اسماعیلیہ منتقل ہوئے تو وہاں نہ محمودیہ کی جمعیت الاخوان الحصافیہ تھی جس کی شمولیت انہیں دائمی روحانی مسرتوں سے ہمکنار کرتی تھی اور نہ وہاں قاہرہ کی بزمِ علمی تھی۔ چنانچہ شیخ حسن البنا خود لکھتے ہیں کہ اسماعیلیہ کی تقرری کا پروانہ پا کر وہ ہکا بکا رہ گئے اور محکمہ تعلیم کے دفتر میں جا کر اپنی تقرری پر خوب لے دے کی۔ تاہم یہ ایک آسمانی فیصلہ تھا جس کا بدلا جانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ استاد البنا رضا بالقضاء اسماعیلیہ آن پہنچے۔ یہاں کا حال دیکھ کر شیخ نہایت رنجیدہ ہوئے کیونکہ ایک طرف تو اسماعیلیہ شہر انگریزی فوج کے

★ ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس سلسلۂ مضمون کی قسط کئی ماہ کے وقفے سے شائع کی جا رہی ہے۔ ربطِ مضمون کو قائم رکھنے کے لیے فروری ۸۹ء میں شائع شدہ قسط کا مطالعہ مفید ہے گا۔

مستقر اور دوسری طرف سوئز کینی کے کیمپ میں تھا جبکہ مسلمان باشندے شہر مذہبی گروہوں اور سیاسی گروپوں میں منقسم تھے۔ یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی مگر اس پر بھی مستزاد یہ بات تھی کہ اس صورت حال کے ازالہ کے لئے وہاں اسلامی دعوت کا کوئی وجود نہ تھا۔ شیخ نے چالیس دن تک حالات کا مطالعہ اور اللہ سے رجوع کی سنت پر عمل کیا اور پھر کسی مخصوص مذہبی گروہ سے وابستہ ہو جانے کی تہمت سے بچنے کے لئے ایک بار پھر اپنی اسلامی دعوت کا آغاز مسجد کے بجائے قہوہ خانوں سے کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ شیخ کے دروس نے قہوہ خانوں میں آنے جانے والوں کو موم کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان قہوہ خانوں کا رش دوبالا ہو گیا۔ بے چین دل اور سعید و بے قرار روح کے حامل افراد نے شیخ کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا اور شیخ سے تربیت کا مطالبہ کرنے لگے۔ چنانچہ شہر سے باہر ایک پرانے زاویہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا گیا اور وہاں تازہ تازہ وارد ہونے والوں کو عملی اسلامی احکامات مثلاً وضو اور نماز وغیرہ کی ٹریننگ دی جانے لگی۔ یہ کام گویا الاخوان المسلمون کی تاسیس کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ چنانچہ الاخوان المسلمون کی تاسیس ان چھ افراد سے ہوئی جو شیخ کے قہوہ خانوں کے دروس اور زاویوں کی تربیت سے متاثر تھے اور اس کام کو مقصد زندگی بنا کر چلنا اور جینا چاہتے تھے۔ تاسیس کا یہ سارا واقعہ حسن البنا شہید نے اپنی ڈائری میں محفوظ کر دیا ہے۔ ہم اسے انہیں کے الفاظ میں نقل کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"جہاں تک مجھے یاد ہے یہ ذوالقعدہ ۱۳۴۷ھ مطابق مارچ ۱۹۲۸ء کی بات ہے کہ مندرجہ ذیل چھ احباب گھر پر مجھے ملنے کے لئے آئے۔ حافظ احمد الحصری' فواد ابراہیم' عبدالرحمان حسب اللہ' اسماعیل عز اور زکی المغربی۔ یہ حضرات میرے ان درسوں اور تقریروں سے متاثر تھے جو میں اسماعیلیہ میں وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ سے دعوت کی گفتگو چھیڑ دی۔ اس وقت ان کی آواز میں گرج' آنکھوں میں چمک اور چہروں پر عزم و ایمان کی روشنی دمک رہی تھی۔ کہنے لگے :

"ہم نے آپ کی تقریریں سنی ہیں' انہیں دل کی گہرائیوں میں نقش کیا ہے اور ان کا ہم پر غیر معمولی اثر ہوا ہے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ اسلام کی عزت اور مسلمانوں کی بہبود کا عملی طریقہ کیا ہے۔ موجودہ طرز حیات سے ہم بیزار ہیں۔ یہ ذلت اور قید کی زندگی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس ملک کے اندر عربوں اور مسلمانوں کا کوئی مقام و مرتبہ اور عزت و وقار نہیں ہے۔ وہ بس غیر ملکیوں کے

فرمانبردار مزدوروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف یہ خون گرم ہے جو رگوں میں غیرت و خودی کی حرارت لئے دوڑ رہا ہے۔ یہ جانیں ہیں جو شرف و ایمان کے احساس سے لبریز ہیں۔ یہ چند درہم ہیں جو ہم اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کرلائے ہیں۔ جس طرح آپ کام کا راستہ سمجھ سکتے ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے۔ جس طرح آپ وطن، دین اور ملت کی خدمت کی سبیل جانتے ہیں ہم نہیں جان سکتے۔ ہم اس وقت جو خواہش لے کر یہاں آئے ہیں وہ یہ ہے کہ جو کچھ ہماری ملکیت میں ہے وہ آپ کو پیش کر دیں تاکہ ہم اللہ کے حضور اپنی ذمہ داری سے بری ہوسکیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے اس کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ جو گروہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ عہد باندھتا ہے کہ وہ اس کے دین کے لئے زندہ رہے گا اور دین کی راہ میں مرے گا اور اسے صرف اللہ کی رضا درکار ہوگی...... ایسا گروہ اس امر کا مستحق ہے کہ وہ کامیاب و کامران ہو خواہ اس کی تعداد کم ہو اور اس کے وسائل ہیچ ہوں"۔

اس مخلصانہ صدا نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ جو بوجھ مجھ پر لاد دیا گیا تھا میں اس سے فرار کی راہ اختیار نہ کرسکا۔ یہ وہی بوجھ ہے جس کی میں خود دعوت پیش کر رہا ہوں اور جس کے لئے میں تگ و دو کر رہا ہوں اور جس کے گرد میں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے تاثر و انفعال کے جذبات میں ڈوبتے ہوئے انہیں کہا،

"اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو قبول فرمائے اور ان نیک ارادوں میں برکت بخشے اور ہم سب کو عمل صالح کی توفیق ارزانی فرمائے۔ جس سے اس کی رضا بھی حاصل ہو اور خلقِ خدا کو بھی فائدہ پہنچے۔ ہمارا فرض محنت و کوشش ہے۔ کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آیئے ہم اللہ سے عہد کریں کہ ہم اسلام کی دعوت کے سپاہی بنیں گے، اسی دعوت کے اندر وطن کی زندگی اور قوم کی سرخروئی ہے"۔

چنانچہ عہد و بیعت وقوع پذیر ہوئی۔ ہم نے یہ حلف اٹھایا کہ ہم بھائی بن کر جئیں گے، اسلام کے لئے کام کریں گے اور اسلام کی راہ میں جہاد ہمارا اشعار ہوگا۔

ایک دوست نے اٹھ کر کہا کہ ہم اپنے آپ کو کس نام سے پکاریں؟ کیا ہم کوئی انجمن ہوں گے یا کلب؟ یا سلسلہ یا کوئی ایسوسی ایشن۔ تاکہ ہم کوئی رسمی

حیثیت اختیار کر سکیں۔

میں نے کہا! ہم ان میں سے کچھ بھی نہ ہوں گے مظاہر پرستی اور رسمیات سے ہم دور ہی اچھے۔ ہمارے اس اجتماع و اتحاد کی بنیاد ہونی چاہئے۔ ایک مخصوص نظریہ و عقیدہ، مخصوص اخلاقی تصورات اور مخصوص منہاج کار۔ اسلام کی خدمت کے لئے ہم آپس میں رشتہء اخوت سے وابستہ ہیں۔ لہٰذا ہم مسلمان بھائی ہیں اور ہمارا نام ہے! "الاخوان المسلمون"۔

یہ نام یکایک زبانوں پر جاری ہو گیا اور پھر ضرب المثل بن گیا۔ یوں ان چھ افراد کے اتحاد سے اخوان المسلمون کی پہلی جماعت تشکیل پائی۔ مذکورہ مقاصد کی خاطر اس سادہ سی تقریب میں اور اس ناگہانی اور اتفاق اصطلاح کے تحت......"

(حسن البنا شہید کی ڈائری...... مترجم خلیل حامدی)

یہ ہے وہ تأسیسی اجتماع جس میں الاخوان المسلمون کی داغ بیل پڑی۔ چھ افراد کا یہ قافلہ رفتہ رفتہ عالمی تحریک میں بدلتا چلا گیا۔ مشرق و مغرب کی باطل قوتیں اس سے خوفزدہ ہونے لگیں۔

اسلام دشمنوں کی آنکھوں میں یہ بال کی طرح کھٹکنے لگی۔ اس کی روز افزوں ترقی نے الحاد، لادینیت کے سیلاب کے آگے بند باندھنے شروع کر دیئے۔ مقامی حکومتیں اس سے خوف، اندیشہ محسوس کرنے لگیں اور ابناء شیطان اس کے خلاف ملکی و بین الاقوامی سازشوں کے جال بننے لگے۔ سازشوں، مظالم، قربانیوں اور لازوال جذبوں کی یہ کہانی بہت طویل ہے مگر ہم قارئین کے طوالت گزیدہ ذہنوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو مختصر کرنے پر مجبور ہیں۔

تحریک کا ارتقاء

الاخوان المسلمون کی تأسیس کے پانچ سال بعد تک استاد حسن البناء اسماعیلیہ میں رہے۔ اس دوران حسن البناء اور ان کے رفقاء نے انتھک محنت اور بیمثال جدوجہد ۔ تحریک کا قافلہ منزل کی جانب تیز گام کر دیا۔ حسن البناء شہید نے اسماعیلیہ کے ان پا سالوں کی مکمل روداد اپنی ڈائری کے پہلے حصہ میں تحریر کی ہے۔ اس ڈائری کا ترجمہ محترم خلیل حامدی صاحب نے اپنے فاضلانہ اور معلومات افزا مقدمہ کے ساتھ تحریر کر کے اسلامک پبلی کیشنز والوں کے ذریعہ چھپوایا ہے۔ تحریک کے ارتقاء کے ایک ایک جزو کو سمجھنے اور اس۔

آگاہ ہونے کے لئے اس سے زیادہ قیمتی اور مستند مواد کہیں اور نہیں مل سکتا۔

ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ارتقاء تحریک کی داستان خود حسن البناء کے الفاظ میں ان کی ڈائری سے جستہ جستہ حصوں کو نقل کر کے بیان کریں۔

مدرسہ تہذیب و تربیت...... "پھر ہم نے یہ مشورہ کیا کہ ہم اجتماع کہاں منعقد کریں اور اجتماع کا پروگرام کیا ہوا کرے۔ آخر کار ہم اس بات پر متفق ہو گئے کہ ہم شیخ علی الشریف کے مکتب میں شارع فاروق پر ۴۰ قرش ماہانہ کا ایک درویشانہ کمرہ کرائے پر لے لیں۔ اس میں ہم اپنی ضروری اشیاء بھی رکھیں اور اپنے خصوصی اجتماعات بھی منعقد کریں۔ اس شرط پر کہ ہمیں یہ حق ہو گا کہ جب طلبہ گھروں کو چلے جایا کریں تو ہم عصر سے لے کر رات تک مکتب کے سامان سے استفادہ کر سکیں۔ اس جگہ کا نام الاخوان المسلمون کا مدرستہ التہذیب رکھا جائے گا۔ اس کا نصاب اسلامیات کی تعلیم ہو گا جس میں بنیادی مضمون قرآن مجید کی صحیح قرات ہوگی۔ اس مدرسہ سے تعلق رکھنے والا اخ احکام تجوید کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کرے گا۔ پھر چند آیات اور سورتوں کے زبانی حفظ کی کوشش ہوگی اور ان آیات اور سورتوں کی مناسب و موزوں تفسیر بیان کی جائے گی۔ چند احادیث بھی یاد کرائی جائیں گی اور ان کی تشریح کی جائے گی۔ عقائد و عبادات کی تصحیح' اسلامی قوانین اور اسلامی اجتماعی آداب کے فلسفہ و حکمت کی تشریح' اسلامی تاریخ' سیرت رسول اللہ اور سلف صالحین کی سیرت کی آسان انداز میں تدریس ہوگی جس کا مقصد عملی اور روحانی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہو گا۔ نیز باصلاحیت افراد کو خطابت و تبلیغ کی تربیت دی جائے گی اور اس غرض کے لئے انہیں نظم و نثر کے ضروری حصوں کو زبانی یاد کرایا جائے گا۔ یہ تمام امور مدرسہ کے نصاب میں شامل ہوں گے۔ نیز عملی مشق کے طور پر اخوان کو پہلے اپنے ہی ماحول میں تدریس و تقریر کی تکلیف دی جائے گی پھر آہستہ آہستہ انہیں وسیع تر ماحول میں اس خدمت پر مامور کر دیا جائے گا۔ اس مخصوص نصاب تعلیم کے گرد اخوان کا پہلا گروپ مدرستہ التہذیب سے وابستہ ہوا جو ۱۹۲۷ء۔ ۱۹۲۸ء کے تعلیمی سال کے اختتام پر ستر افراد کے لگ بھگ کی تعداد کو پہنچ گیا"۔

اسماعیلیہ میں اخوان کا مرکز اور مسجد:۔ "اخوان کے ایک خصوصی اجتماع میں یہ بحث چھڑ گئی کہ اسماعیلیہ کے اصل باشندوں کے اندر اپنی دعوت کو خصوصی طور پر زیادہ سے زیادہ فروغ دینا نہایت ضروری ہے...... چنانچہ ایک صاحب نے جماعت کا اپنا ایک مرکز تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ دوسرے صاحب نے اس میں مسجد کے لئے اضافہ کیا......

اس کے بعد ہم نے ایک قطعۂ زمین کی تلاش شروع کر دی۔ عرب محلہ کے بالکل آخری کنارے پر ہمیں ایک ٹکڑا ملا۔ چنانچہ ہم نے اسے خرید لیا اور بیعنامہ پر دو نیک انسانوں کے دستخط ہو گئے"۔ یہ مسجد اور مرکز دار الاخوان کے نام سے موسوم ہوا اور اس نے اسماعیلیہ میں دعوت کے استحکام کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔

شُبرا خَیت میں اخوان:۔ "اخ حامد عسکریہ کو شُبرا خَیت منتقل کر دیا گیا۔ ایک لحاظ سے یہ منتقلی دعوت کے لئے خیر و برکت کا موجب ثابت ہوئی۔ شُبرا خَیت میں بھی تنظیم کی ایک شاخ کھول دی گئی اور اس شاخ نے اتنی ترقی کی کہ اس کی طرف سے ایک حفظِ قرآن کا مدرسہ جاری کیا گیا، ایک عظیم الشان مسجد بنائی گئی اور ایک پر شکوہ بلڈنگ تعمیر کی گئی جسے مدرسہ اور مسجد کے نام وقف کر دیا گیا"۔

اسلامی درس گاہِ حراء:۔ "اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کی بدولت مسجد کے اوپر مدرسہ کی عمارت قائم کر دی گئی، جونہی مدرسہ کی عمارت مکمل ہوئی ہم نے اس کے لئے "اسلامی درسگاہ حراء" کا اسلامی نام تجویز کیا۔

نصابِ تعلیم تین اقسام پر مشتمل تھا: پہلی قسم ازہر کے مدارس ابتدائیہ کے نصاب کے مطابق تھی اور طالب علم ازہر اور دینی درس گاہ کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ دوسری قسم میں دن کے ابتدائی حصہ میں ازہر کے ابتدائی مدرسہ کے نصاب کی تعلیم دی جاتی تھی اور آخری حصہ میں صنعت کاری کی تعلیم ہوتی تھی۔ تیسری قسم گورنمنٹ کے پرائمری اسکول کے مطابق تھی اور اس میں طلبہ کو ثانوی تعلیم اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے تیار کیا جاتا تھا.......... اسلامی درس گاہِ حراء کی طرف خلقِ خدا کا رجوع بہت ہوا"۔

ابو صُوَیر میں دعوت کا آغاز:۔ "میں نے ابو صویر کا دورہ کیا اور مجھے یہ خیال ہوا کہ یہاں جماعت کی ایک شاخ کھولنا چاہئے۔ اس غرض سے میں نے لوگوں کے چہروں کو تاڑنا شروع کیا۔ قہوہ خانوں میں، سڑکوں پہ اور دکانوں میں میں لوگوں کو بھانپتا رہا۔ بالآخر میں شیخ محمد العجرودی کی دکان پر پہنچ گیا.......... میں نے انہیں سلام کیا اور ان کے پاس بیٹھ گیا.......... میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور وہ مقصد بھی بیان کر دیا جس کے لئے میں ابو صویر آیا تھا۔
.... اس نے بشدت اصرار کیا کہ میں مسجد کے اندر تقریر کروں یا سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد کے اندر جہاں لوگ جمع ہو جاتے ہیں مجلسِ وعظ منعقد کروں۔ میں نے یہ پسند کیا کہ میں قہوہ خانے میں درس دوں گا۔ چنانچہ میری تجویز منظور کر لی گئی۔ لوگ قہوہ

خانے میں جمع ہوگئے اور میری تقریر کو بڑے غور سے سنتے رہے۔۔۔ میری گزارشات ان کے لئے بڑی اثر آفرینی کا سبب ہوئیں اور انہوں نے تاکید کی کہ میں دوبارہ یہاں آؤں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پے درپے دوروں کے بعد معاملہ یہاں تک ترقی کر گیا کہ ایک روز ہم احمد افندی سوتی کے مکان پر جمع ہوئے اور ابو صویر میں الاخوان المسلمون کی شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کیا"۔

بعد میں جلد ہی ایک مسجد کی تعمیر و توسیع کے بعد اس میں اخوان کا مرکز مقامی قائم ہو گیا۔

پورٹ سعید میں آغازِ دعوت:۔ "اسماعیلیہ میں احمد افندی مصری ایک نوجوان تھا۔ اس کی عمر ۱۷ یا ۱۸ برس تھی پورٹ سعید کا رہنے والا تھا۔ اپنے کچھ کاموں کے سلسلہ میں عارضی طور پر اسماعیلیہ میں مقیم تھا۔ اسماعیلیہ میں اس نے طویل عرصہ گزارا۔ اس دوران وہ الاخوان کے مرکز میں آمدورفت رکھتا رہا اور وہاں جو تقریریں کی جاتیں یا ہدایات جاری کی جاتیں انہیں وہ سنتا رہا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد اس نے باقاعدہ بیعت کر لی اور جماعت میں شمولیت اختیار کر لی اور اخوان کے اس گروہ میں شامل ہو گیا جو دعوت کے لئے مخلص ترین تھا اور دعوت کے فہم و ادراک میں پیش پیش تھا۔ اسماعیلیہ میں اس کا مشن ختم ہو گیا اور وہ اپنے اصلی وطن پورٹ سعید واپس چلا گیا اور اپنے ساتھ دعوت کی روشنی بھی لے گیا۔

پورٹ سعید میں اخ احمد افندی مصری کے نیک نہاد احباب اور وہاں کے پاکیزہ نفس نوجوانوں کا ایک گروہ ان کے گرد جمع ہو گیا اور وہ لوگ دعوت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو گئے۔ اخوان کی شاخ پورٹ سعید میں قائم ہو گئی۔ ایک معمولی درجہ کے زاویئے کے اندر بیٹھ کر میں نے پورٹ سعید کے نوجوانوں کی ابتدائی جماعت سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ دعوت کے راستہ میں جہاد کریں گے یہاں تک کہ دو نتیجوں میں سے ایک نتیجہ بر آمد ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس دعوت کو غلبہ عطا فرما دے یا ہم اس دعوت کی راہ میں ملیامیٹ ہو جائیں"۔

الاخوان البحر الصغیر میں..... "پورٹ سعید کے تحریکی اجتماع میں بحر صغیر کے علاقہ الجمالیہ کے باشندوں کا ایک وفد شریک ہوا۔ وفد میں اخ محمود افندی عبداللطیف، الجمالیہ کے ایک نوجوان بھی تھے۔ اخ عمر غنام، دقہلیہ کی سنگر کمپنی کے ایجنٹ بھی تھے۔ ان کی یہ شرکت کسی پروگرام کے تحت نہ تھی۔ اجتماع کی کشش پر وہ آگئے اور اجتماع کی عام تقریر انہوں نے سنی۔ اجتماع کے بعد وہ رک گئے ______ اور تحریک کے مقاصد

اور بنیادی نکات پر بحث و مباحثہ کرنے لگے اور پھر وہ اس عزم کے ساتھ لوٹے کہ وہ اپنے علاقہ بحر صغیر میں بھی اس کار عظیم کو سرانجام دینے کی ذمہ داری اٹھائیں گے۔ چنانچہ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ان کی طرف سے ہمیں پے در پے خطوط ملنے شروع ہو گئے اور آخر کار بحر صغیر کے علاقہ المنزلہ میں اخوان کی ایک شاخ کھل گئی۔ اس کے صدر استاذ جلیل شیخ مصطفیٰ الطیر منتخب ہوئے"۔ اس کے بعد الجمالیہ کے آل عبداللطیف کے مکان پر ایک اور شاخ قائم ہو گئی۔ ایک تیسری شاخ جو جدیدۃ المنزلۃ کے نام سے مشہور ہے' آل طویلہ کے مکان پر کھول دی گئی۔ الغرض وطن عزیز کے اس محبوب حصے میں بھی قافلۂ دعوت پورے جوش و خروش سے رواں دواں ہو گیا"۔

سویز میں عَلم دعوت بلند ہوتا ہے...... "دوسری بار پھر میں سویز کے دورے پر گیا اور استاذ محمد طاہر منیر' اخ شیخ عبدالحفیظ اور اخ شیخ الشافعی عطوہ عفیفی سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اربعین کے اندر اخوان کی شاخ قائم ہو گئی' جس کے صدر شیخ عفیفی الشافعی عطوہ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دعوت کو برابر فروغ ملتا رہا یہاں تک کہ اس علاقہ کے اندر ایک سے زائد شاخیں کھل گئیں اور اخوان کا ایک عظیم الشان مرکز اور ایک عظیم الشان عمارت قائم ہو گئی۔ بحر احمر کے تمام قصبوں مثلاً غزُوقہ' رأس غارب' قصیر' سفاجہ وغیرہ میں شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور یہ سب سویز کے مرکز کے تابع ہیں۔ ان علاقوں میں پاکباز و پاک نفس انسانوں کا ایک چیدہ گروہ اس دعوت کے گرد جمع ہو چکا ہے"۔

فتح قاہرہ...... تحریک اسلامی کے لشکر کی تیز تر فتوحات کو دیکھ کر ہر صاحب نظر مصر میں اس کی درخشانی کا اندازہ کر سکتا ہے۔ قاہرہ' مصر کا دارالحکومت جہاں حسن البناء کا خاندان منتقل ہو گیا تھا' کیونکر اس چراغ کی روشنیوں سے محروم رہ سکتا تھا۔ جہاں پہلے ہی سے حسن البناء کے چھوٹے بھائی عبدالرحمان الساعاتی اور ان کے دوست محمود سعدی الحکیم نے "جمعیت الحضارۃ الاسلامیۃ" تشکیل دے کر دعوت و تربیت کا غلغلہ بلند کر رکھا تھا۔ جمعیت کے ذہین و فطین نوجوانوں نے الاخوان المسلمون کی جدوجہد کا مطالعہ کیا اور اسماعیلیہ اور اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی اخوان کی شاخوں کا جائزہ لیا۔ ان حضرات نے اسماعیلیہ کے اخوانی مرکز سے رابطہ قائم کیا۔ اتحاد پر مذاکرات ہوئے اور جمعیت حضارۃ الاسلامیہ الاخوان میں ضم ہو گئی۔ قاہرہ میں جمعیت کے دفتر کو اخوان کا مرکز بنا لیا گیا اور وہاں بھی اخوان کی شاخ کھل گئی۔ اس کے بعد الاخوان نہ صرف قاہرہ میں بلکہ تمام مصر میں بڑھتے اور پھیلتے ہی چلے گئے۔

حسن البناء شہید کی محنت اور تحریک کی سرعت کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مارچ ۱۹۲۷ء سے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے ساڑھے پانچ سالہ قیامِ اسماعیلیہ کے دوران الاخوان المسلمون کی سترہ[1] شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہو چکی تھیں ہر شاخ کے ساتھ ایک مسجد اور ایک تربیتِ جہاد حاصل کرنے کا کلب اور بعض کے ساتھ مدرسہ بھی ملحق تھا۔ ایک بڑا مدرسہ لڑکوں کے لئے درس گاہ حراء اور لڑکیوں کے لئے ایک نسبتاً چھوٹا مگر کافی گنجائش کا مدرسہ امہات المومنین اسکول کے نام سے چل رہا تھا۔ خواتین کا شعبہ الگ قائم ہو کر الاخوات المسلمات کے نام سے خدمات سرانجام دے رہا تھا اور "فرقہ الرحلات" کے نام سے تربیتِ جہاد کا نظم باقاعدہ کام کر رہا تھا۔

بے پناہ وسعت کا دور

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جب حسن البنّاء قاہرہ منتقل ہو گئے تو تحریک کا مرکز بھی ان کے ساتھ ہی شفٹ ہو گیا۔ ایک ہی سال کے بعد تحریک کی وسعت کا حسن البناء کے قلم سے پتہ چلتا ہے کہ......

> "اخوان کی دعوت اور نظریہ مصر کے پچاس سے زیادہ شہروں اور قصبوں تک پھیل گیا ہے۔ ان شہروں میں نہ صرف اخوان کی شاخیں قائم ہو گئی ہیں بلکہ ان شاخوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی مفید اسکیم بھی ہر جگہ عمل میں آ چکی ہے"۔

ڑوں کو خوب مستحکم کر لینے کے بعد شہید البناء نے دعوت کو حکومتوں اور سیاستدانوں تک وسیع کر یا۔ انہیں پے در پے خطوط لکھ کر اصلاحِ احوال کی طرف توجہ دلائی اور سیاسی و معاشی نظام اور لیمی و عدالتی نظم میں انقلابی انداز میں اسلامی خطوط کے مطابق تبدیلیاں کرنے کی تلقین کی۔ ۱۹۳ء تک الاخوان کی دعوت مصر کے کونے کونے اور عالم عرب کے حساس مقامات تک ل چکی تھی۔ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء کا جنگ عظیم کا زمانہ الاخوان کی تاریخ کا سنہرا دور ہے جس م ں اس کی دعوت زندگی کے تمام طبقات سے تعلق رکھنے والوں میں پھیل گئی۔ اب یہ تمام بقات کی نمائندہ ایک انقلابی جماعت تھی جس کی قوت نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھی۔ ۱۹۴۵ء الاخوان نے مصر سے انگریزوں کی ہر قسم کی دست اندازی ختم کرنے اور اس کو اُس شجر خبیثہ

---

[1] یہ یاد رہے کہ چھوٹی شاخ سو ارکان اور بڑی تین سو ارکان پر مشتمل ہوتی تھی۔

جسے برطانوی استعمار کہتے ہیں سے پاک کرنے کے لئے بھرپور مہم چلائی جس سے اس کی مقبولیت کو چار چاند لگا دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے فعال کارکنوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی اور مصر سے باہر سوڈان میں بھی اس کی پچاس شاخیں قائم ہو گئیں۔ شام لبنان اور دیگر عرب ریاستوں میں بھی اس کا اثر و نفوذ نظریاتی ہم آہنگی سے بڑھ کر تنظیمی سانچے میں ڈھل گیا۔ یہی وہ دور ہے جس میں الاخوان پے در پے آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزرنے لگے اور اسی دور نے دور حاضر میں عشق و وفا کے نہایت عجیب و غریب فسانے رقم ہوتے دیکھے۔ سازشوں کے دام ہمہ رنگ زمین لگے اور قربانیوں کے نئے باب کھلے۔ قلم کے اس خونچکاں باب کو ضبط تحریر میں لانے سے پہلے مناسب یہ ہے کہ الاخوان کے اندرونی نظم و تربیت اور دعوتی طریق کار پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

الاخوان المسلمون کا اندرونی نظم

الاخوان المسلمون شدید مرکزیت کی حامل ایک ایسی منظم تحریک تھی جس پر سے اس کی مرکزی قیادت کی گرفت ڈھیلی نہ ہوتی تھی۔ جماعت کے سربراہ کو مرشد عام کہتے تھے جس کی مدد و اعانت کے لئے برتر جمعیت قائم کی گئی تھی جس کا نام مکتب الارشاد العام (OFFICE OF THE GENERAL DIRECTIONS) تھا۔ یہ بارہ ارکان پر مشتمل تھی اور یہ سب ارکان مجلس تاسیسی میں سے مرشد عام خود چنتے تھے۔ قاہرہ میں جماعت کی شاخ مرکز عام کہلاتی تھی اور یہ مجلس تاسیسی کے سو ارکان اور مکتب الارشاد العام پر مشتمل تھی۔ یہ مرکز عام کسی بھی شاخ کے قیام کو رد کر سکتا تھا اور قائم شاخ کو توڑ سکتا تھا۔ اس مرکز عام نے متعدد کمیٹیاں بنا رکھی تھیں تاکہ کام تقسیم ہو کر بسہولت اور بنظم انجام پائے۔ جماعت کی ایک جمعیت عمومی انتظامی بھی تھی جس میں جماعت کے تمام مسائل و معاملات زیر بحث آتے تھے۔ جو شاخوں اور انتظامی وحدتوں کو قائم کرتی تھی۔ دستوری مسائل بھی جمعیت عمومی (GENERAL ASSEMBLY) میں طے ہوتے تھے۔ اس مرکزی نظم کے بعد مقامی نظم تھے جن میں سب سے بالا نظم انتظامی وحدت کا تھا یہ انتظامی وحدتیں اپنی مجلس شوریٰ رکھتی تھیں جس کے ارکان جمعیت عمومی نامزد کرتی تھی۔ پھر شاخ ہوتی تھی جسے ترقی دے کر انتظامی وحدت میں بدلا جا سکتا تھا۔ شاخ کے تحت متعدد مراکز زاویئے اور اسرے اور کتائب ہوتے تھے جن میں فعال ارکان کو تقسیم کر د

جاتا تھا تاکہ ان کی تربیت اور کام کی نگرانی میں آسانی ہو۔ ایک اخوانی کو فعال کارکن کے مقام تک پہنچنے کے لئے کئی مدارج طے کرنا ہوتے تھے جب وہ ان مدارج سے کامیابی سے گزر جاتا تو اسے بیعت کر لیا جاتا۔ اس کے بعد وہ خصوصی اجلاسوں میں شرکت اور اہم ذمہ داریوں کی ادائیگی کا اہل سمجھا جاتا تھا۔

جماعت میں تقسیم کار کا اصول اپنایا گیا تھا۔ چنانچہ مرکز عام کی قائم کردہ کمیٹیوں کے تحت ایک شعبہ سوشل ویلفیئر کے کاموں کی نگرانی کرتا تھا۔ ایک شعبہ فرقۃ الرحلات یعنی تنظیم جہاد کا نگران تھا۔ ایک شعبہ کے ذمہ عالم اسلام سے رابطہ کا کام تھا تو ایک سیاسی صورت حال پر مستقلاً نگاہ رکھے ہوئے تھا اور اس کے علاوہ جماعت کے اقتصادی معاملات کی دیکھ بھال اور تجارتی فرموں کے قیام و انتظام کا شعبہ جدا تھا۔ الغرض اسی طرح صحافت، تعلیم اور دینی تربیت کے جماعتی پروگرام باقاعدہ اور منظم انداز میں مرکزی نگرانی میں چل رہے تھے۔

اس نظم کی ایک اہم بات الاخوات المسلمات کا پہلے ہی دن سے علیحدہ قیام بھی ہے۔ ان کی سرگرمیاں گھر اور سماجی خدمات تک محدود تھیں۔

ہر دو سال بعد تمام شاخوں کے سربراہوں کی کانفرنس بھی منعقد ہوتی تھی۔

ماخوذ از "اسلام ایک نظریہ ایک تحریک" (مریم جمیلہ)
"حسن البناء کی ڈائری"

الاخوان المسلمون کا تربیتی نظام

الاخوان المسلمون کے تربیتی نظام کی اساسات کو ایک منظم فکر کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارا یہ خیال علامہ یوسف القرضاوی کی اپنے موضوع پر بے مثال تصنیف 'التربیۃ الاسلامیۃ و مدرسۃ حسن البناء' پڑھ کر قائم ہوا ہے۔ اگر اس موضوع پر سیر حاصل بحث پڑھنے کی خواہش ہو تو اس کتاب کا مطالعہ سیرابی کے لئے کافی ہے اس کا ترجمہ عبید اللہ فہد فلاحی کے قلم سے اردو زبان میں بھی ہو چکا ہے جس کا نام عنوان بالا ہی ہے۔ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے بقول اس تربیتی نظام کی فکری اساس چھ نظریاتی نکات پر مشتمل ہے۔ فرماتے ہیں!

اخوان نے افراد کی تربیت میں مندرجہ ذیل پہلوؤں کو خصوصی طور سے ملحوظ رکھا ہے۔ ربانیت، جامعیت، تعمیر و ایجابیت، اعتدال و توازن، اخوت و اجتماعیت اور صبر و استقلال۔

ربانیت سے مراد ہے فرد میں ایمان حقیقی کا شعور تھا۔ ایک فرد میں ربانیت اس وقت پروان چڑھتی ہے جب اس کا ایمان اقرارِ لسانی سے بڑھ کر ایک طرف تو تصدیق قلبی میں اضافہ کا موجب بنتا ہے اور دوسری طرف عمل کی جہتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس ایمان کی تابناکی دلِ زندہ پر منحصر ہے۔ دل کی زندگی یہ ہے کہ اسے مادہ پرستی کے اثرات سے بچایا جائے اس کے لئے قرآن و سنت کی تعلیم اور عبادات و ذکر کی غذا کا اہتمام کیا جائے اور اس کی صحت پر اثر انداز ہونے والی آفات یعنی باطنی بیماریوں اور عملی گناہوں سے اسے بچایا جائے۔ تربیت کی دوسری اساس جامعیت ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ فرد میں زندگی کے تمام شعبوں میں مرضیاتِ الٰہیہ کے مطابق رویہ ابھرے۔ اس کے لئے اخوان نے فکری تربیت اخلاقی آرائش' جسمانی نگہداشت و قوت میں اضافہ' مجاہدانہ اوصاف کی نمود' اجتماعیت کے تقاضے نبھانے کی عادت ڈالنے اور سیاسی میدان میں بیدار ذہن اور مستحکم رائے اور مدبّرانہ کردار کی پرورش کا اہتمام کیا۔ تاکہ تربیت میں جامعیت حاوی رہے۔

تربیت کی تیسری بنیاد تعمیر و ایجابیت سے مراد یہ ہے کہ تخریب و تردید کے کام سے جو تمام صلاحیتیں منفی راستہ پر لگا کر ضائع کر دیتا ہے، بچا جائے اور ہر دم وقت مال اور صلاحیتیں تعمیری کاموں میں صرف کی جائیں تاکہ دنیا اور آخرت کا منافع حاصل ہو اور ایجابیت سے جو اسی فکری اساس کا دوسرا پہلو ہے مراد یہ ہے کہ کسی مفسدہ کا توڑ عمل کو سلبیت پر اکسا کر کرنے کے بجائے ایجابیت کی راہ پر لگا کر کیا جائے۔ اس کی مثال حسن البناء کی ڈائری میں منقول ایک واقعہ ہے۔ جس کے مطابق جب لوگوں میں اشرار علماء اخوان کے بارے میں یہ مشاغبہ (PROPAGANDA) کرنے لگے کہ اخوان گستاخِ رسولؐ (معاذ اللہ) ہیں اور معراج کے منکر ہیں تو بعض اخوانی مرشد البناء کے پاس حزن و یاس کا پیکر بنے ہوئے آئے اور ان علماء کی شکایت کر کے ان کے خلاف کارروائی کی اجازت چاہی تو حسن البناء نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ عظمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک عوامی اجتماع کا اہتمام کریں جس میں اخوانی رہنما اس موضوع پر خطاب فرمائیں گے۔ اجتماع کا اہتمام کیا گیا اور پر کشش و پر مغز تقاریر نے لوگوں کا دل موہ لیا جبکہ اشرار علماء انگاروں پر لوٹتے رہ گئے اور اخوان کی دعوت کا راستہ مزید ہموار ہو گیا۔

اس اساس کا تقاضہ ہے کہ ہر فرد لغویات سے مکمل پرہیز کرے۔ ایجابا عمل کرتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کو مکمل مسلمان اور کامل مومن اور اللہ کا محبوب بنانے کے لئے کوشاں رہے۔ ایک مثالی مسلمان گھرانہ کے قیام کا اہتمام کرے۔ معاشرے کی اصلاح

رہے اور خیر کے فروغ اور شر کے استیصال کے لئے مستعد و کوشاں ہو۔ اپنی زمین کو غیر اسلامی اقتدار و اثرات سے پاک کرنے یا پاک رکھنے کے لئے ہمہ تن جدوعمل میں مصروف رہے اور ایک حقیقی اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے سرگرم عمل رہے۔ اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ امت مسلمہ کی سابقہ بین الاقوامی قائدانہ حیثیت اور انسانیت ساز' امن نواز اور خیرپرور تہذیب و ثقافت کی بحالی کے لئے حتی المقدور جان و مال کھپائے اور دنیا کی رہبری و معلمی کی ذمہ داری پوری کرے۔ دینی معاملات میں فقہی مناقشات اور فروعی اختلافات و موشگافیوں سے پرہیز کرے اور یہ خیال رکھے کہ اسے کم وقت میں ہی یہ زیادہ فرائض پورے کرنے کے لئے دنیامیں بھیجا گیا ہے اس لئے وہ ایک لمحہ بھی ضائع کردینے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اعتدال و توازن سے مراد یہ ہے کہ عقل اور جذبات' مادہ اور روح' فکروعمل' فرد اور معاشرہ' شوریٰ اور امیر' حقوق و فرائض جدید و قدیم اور تقلید و اجتہاد میں سے ہر چیز اپنے مقام پر اہم اور لائق توجہ ہے چنانچہ کسی ایک کا اختیار دوسرے کے ترک کو لازم نہیں ٹھہراتا اور نہ ہی اسے ٹھہرانا چاہئے اور ضروری ہے کہ سب کے تقاضے پورے کئے جائیں اور سب کا جائز مقام برقرار رکھا جائے۔

پانچویں فکری بنیاد اخوت و اجتماعیت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپس میں رحمت و مؤدت کو بڑھایا جائے۔ مسلمان کو فطری اختلافات کے سبب سے جنہیں دنیا رنگ و نسل اور زبان و زمین کی تفریق کے سبب نادانی سے اہمیت دیتی ہے' غیر نہ سمجھا جائے۔ امت مسلمہ کی فلاح ہر فرد کی فلاح ہے جس کے لئے کوشش ضروری ہے یہی اخوت و محبت کا حقیقی مفہوم ہے۔

چھٹی اور آخری تربیتی اساس صبر و استقلال اپنے مفہوم میں تو واضح ہے ہی حقیقت یہ ہے کہ اخوان کے عمل میں اس کی وضاحت نہایت روشن ہے۔ اسلام پر عمل پیرا ہونے اور دعوت کی اشاعت و اقامت دین کے راستہ میں جو مصائب کے پہاڑ اخوان پر ٹوٹے وہ راہِ حق سے بھٹکا دینے کے لئے کافی تھے مگر آفرین ہے اس تربیت پر جس کے صدقے نے اخوان خواتین و حضرات کو بیس بیس سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے پر آمادہ کرلیا مگر ان کے دل معافی طلبی کا ایک کلمہ کہنے پر راضی نہ ہوئے۔

ان فکری اساسات پر جن کا مفہوم کسی قدر ہم نے واضح کردیا ہے' اخوان کی قیادت نے اخوان کی تربیت کے لئے جن ذرائع کو اختیار کیا اب ہم مختصراً انہیں بیان کئے دیتے ہیں۔

ہفتہ وار درسِ قرآن...... یہ درس قرآن پہلے منگل اور پھر بدھ کے روز ہوتا تھا۔ یہ درس ایک عمدہ دعوتی ذریعہ کے ساتھ ساتھ بہترین تربیتی آلہ بھی تھا۔ اخوان فکری رہنمائی اور قلبی حرارت یہیں سے حاصل کرتے تھے۔ مرکزی سطح پر یہ درس کبھی حسن البناء شہید دیتے تھے پھر سید قطب دینے لگے۔ نہ معلوم آج کل یہ سلسلہ جاری ہے یا حالات کی ستم ظریفی نے ختم کرا دیا۔

شبینہ مدرسہ...... اس مدرسہ کا اجراء حقیقت میں بڑا کارنامہ تھا۔ اسلامی تحریکیں مقامی سطح پر فرد کو اجتماعی تربیتی پروگرام دینے میں اکثر کامیاب نہ ہو سکی تھیں مگر اخوان نے ہر محلّہ میں شبینہ اسکول کھول کر جن میں نماز تہجد، دعاو مناجات، تلاوت و ترتیل اور تعلیم کا بندوبست کیا گیا تھا ایک طرف تو اخوان کے ہر فرد کو ایک مستقل تعلیمی اور تربیتی ذریعہ مہیا کر دیا دوسری طرف مکہ کی تحریک اسلامی کی سنت بھی زندہ کر دی۔ یہ اسی مدرسہ کا اثر تھا کہ اخوان جیل خانوں سے حافظ قرآن، عالم حدیث اور اسلامی قانون کے ماہرین بن کر نکلے کیونکہ ان کے بقول قید نے تو ہمیں انہی کاموں کے لئے دنیا کے مشاغل سے نجات بخشی تھی۔

کلب...... الاخوان المسلمون نے مجاہدانہ تربیت کے حصول کے لئے کلب قائم کئے تاکہ انہیں جہاد کی ٹریننگ، جسم کی قوت میں اضافہ اور عملی مہموں کی مشق بہم پہنچانے کا ذریعہ بنائیں۔ یہ کلب ہر اخوانی شاخ کا مسجد، بہبود مرکز اور مدرسہ کی طرح ایک لازمہ تھا۔ اسی کلب کی برکات تھیں کہ جہادِ فلسطین میں اخوانی ایک دہشت زدہ کر دینے والے بے جگر مجاہد بن کر یہودیوں کے حواس پر چھا گئے اور ایک یہودی خوف سے چلّا اٹھا:

> "ہم ساری دنیا سے آ آکر اس خطہ میں جمع ہوئے ہیں تاکہ امن و سکون سے زندگی بسر کریں اور یہ سارے عرب سے آ آکر اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ کرب سے جان دے سکیں۔ ہم انہیں شکست کیسے دیں کیا زندگی اور موت کے طلبگار برابر ہو سکتے ہیں؟"

نصاب......

الاخوان المسلمون کے نصاب میں قرآن پاک مکمل، ریاض الصالحین مکمل اور حسن البناء، سید قطب، سید مودودی اور سید ابوالحسن علی ندوی کے رشحاتِ قلم شامل ہیں۔

الاخوان کا دعوتی طریق کار

گزشتہ صفحات میں آپ نے الاخوان المسلمون کا تحریکی ارتقاء، نظم جماعت اور تربیتی نظام مطالعہ کر لیا ہے اب ہم آپ کا تعارف الاخوان کے دعوتی طریق سے کرانا چاہتے ہیں۔ حسن البناء شہید کے حالات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ دعوت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں کتنا نوازا تھا اور سن تمیز سے وقتِ شہادت تک وہ تو گویا مجسم دعوت ہی رہے۔ ایک شخصیت جس کا دعوت سے اتنا گہرا قلبی و روحانی تعلق ہو بھلا اپنی جماعت اور اپنے شاگردوں کو دعوت کے میدان میں پیچھے کس طرح دیکھ سکتی تھی جبکہ اسے اس حقیقت کا بھی پورا فہم و ادراک ہو کہ جس نظریہ اور نظام کی پشت پر سے دعوت کی قوت ہٹ جائے وہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ چنانچہ الاخوان نے دعوت کو ہر ممکن ذریعہ سے پھیلایا اور اس میدان میں بہت آگے نکل گئے۔

اخوان کی دعوت کا آغاز قہوہ خانوں سے ہوا تھا اس لئے اخوانی پبلک مقامات پر صدائے حق بلند کرنے میں بہت بے جھجک واقع ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اخوانی عام مقامات پر اللہ کی طرف پکارتے تھے اس نے پیغمبروں کی وہ سنت کہ "ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا" زندہ کر دی تھی۔ عام مقامات، قہوہ خانوں، ساحلی علاقوں، مساجد اور پارکوں میں تو ہر اخوانی جو موقع پاتا وعظ کہتا تھا تاہم دعوت کا ایک باقاعدہ نظم قائم کر دیا گیا تھا جس میں تربیت یافتہ اخوانی داعیوں کے ذمہ قریہ قریہ ہفتہ وار درس دینا، اہم شخصیات سے ملاقات کر کے انہیں دعوت دینا اور ہر فرد تک پیغام پہنچانا لگایا گیا تھا۔ دعوت کے افشاء کے لئے مختلف اسکولز، کالجز اور جامعات میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اخوانی داعیوں کے لیکچرز کا بندوبست بھی کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ شیخ البناء نے اس بات کا اہتمام بھی کیا تھا کہ دعوت کے لئے ہر ممکن ذریعہ کو اختیار کیا جائے اور دعوت سے کوئی آدمی ناواقف نہ رہ سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اخبارات و رسائل و ہفت روزے بطور آرگن استعمال ہوئے۔

دعوتی آرگن

ماہنامہ المنار:۔ یہ ماہنامہ سید رشید رضا مصری کی زیر ادارت نکلا کرتا تھا مگر ان کے بعد ان کے خاص حلقہ میں اس کو سنبھالنے والا کوئی نہ رہا تو حسن البناء نے اسے سنبھال لیا اور یہ

پہلے سے زیادہ آب وتاب سے نکل نکلا۔

ہفت روزہ التعارف' الشعاع :۔ یہ دونوں ہفت روزے الاخوان نے اپنا پریس خریدنے کے بعد جاری کیے تھے۔ پھر جب استبدادی حکومتیں اخوان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئیں اور حسین سری پاشا کی حکومت نے اخوان کا پریس ضبط کر لیا اور ان رسالوں کو بند کر دیا تو ادھر ڈوبے ادھر نکلے کے مصداق اخوان نے مزید رسالے جاری کئے یہ النذیر' الشہاب' الباحث اور الدعوۃ اور المسلمون تھے۔ طویل عرصہ کی بندش کے بعد جب الدعوۃ کا دوبارہ اجراء ہوا تو اس کا بے پناہ جوش و خروش کے ساتھ استقبال ہوا جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ الاخوان ہی نہیں ان کی دعوت کی ضرورت بھی ابھی زندہ و باقی ہے۔

روزنامہ الاخوان :۔ یہ روزنامہ ۵ر مئی ۱۹۴۶ء کو جاری ہوا اور اس نے مصر کے صحافتی حلقوں میں ایک انقلاب بپا کر دیا۔

افشاءِ دعوت کے لئے الاخوان کی مرکزی قیادت نے دو فیصلے ایسے کئے جن کی درستی پر کافی کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔ ایک تو قبل از وقت انتخابات اور سیاسی عمل میں شمولیت جو بقول مولانا علی میاں تمام آنے والی سخت منزلوں کی تمہید تھا۔ اور دوسرے تحریک چلانے کا فیصلہ۔ جب الاخوان نے حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تو مولانا محمد یوسف صاحبؒ امیر التبلیغ نے تین آدمیوں کا ایک وفد حسن البناء کی خدمت میں روانہ کیا کہ دعوت جس انداز میں چل رہی ہے اسی انداز میں آٹھ دس سال اور چلنے دیں تاکہ جب آپ کوئی تحریک چلائیں تو وہ کسی مثبت نتیجہ تک پہنچ سکے اور اگر آپ نے ابھی سے حکومت سے ٹکر لے لی تو حکومت جماعت کو پوری قوت سے کچل دے گی اور پچھلا کیا ہوا کام بھی ضائع چلا جائے گا۔ امام البناء نے یہ مشورہ نامعلوم وجوہ کی بناء پر قبول نہ کیا اور امیر التبلیغ کا اندیشہ افسوس کہ سچا ثابت ہو گیا۔ اس فیصلہ کے نتیجہ میں مصر میں برسراقتدار آنے والی ہر جماعت نے اخوان کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھا اور اخوان کی بربادی میں ہر ممکن کردار ادا کیا جس کے باعث مصر آج تک سیاسی طور پر غیر مستحکم چلا آ رہا ہے کیونکہ اخوان کی مقبولیت کے پیش نظر ہر حکومت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ پارلیمینٹ سے دور رہیں چنانچہ مصر مستقل طور پر آمریت کا شکار رہتا ہے کبھی انتخابات ہوں بھی تو اخوان پر سے پابندی نہیں ہٹائی جاتی۔ یوں چالیس سال سے بندشوں کا شکار ہے۔

اس قبل از وقت فیصلہ کا انجام بڑے دوررس اثرات کا حامل [illegible]

معاصر تحریکوں کے لائحہ عمل کو متاثر کیا ہے چنانچہ تبلیغی جماعت اور نورسی تحریک نے تو اپنے لئے مکمل طور پر غیر سیاسی کردار پسند کر لیا ہے جبکہ جماعت اسلامی، ملی سلامت پارٹی اور دیگر ایسی ہی جماعتوں نے مکمل طور پر سیاسی مگر ٹکراؤ سے گریزاں بلکہ خرم مراد صاحب کے الفاظ میں کچھ لو کچھ دو کی پالیسی اختیار کر کے خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں ہی طریقوں کے اسلامی دعوت پر منفی اثرات پڑے ہیں کیونکہ تاریخ دعوت میں یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ کوئی اسلامی تحریک مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو اشرار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کٹ گئی اور محدود ہو گئی ہے[1] اور یہ اصولوں پر سودے بازی اور پورے اور مکمل اسلام کے بجائے چند اقدامات پر اکتفا اور حمایت کا معاملہ بھی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ بہرحال اس عجلت پسندانہ فیصلہ کے اثرات نہایت ہمہ گیر اور دوررس ہوئے ہیں اور آج باقی عرب ممالک کی اخوانی جماعتیں بھی جماعت اسلامی کے نقشِ قدم پر چل رہی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں سوڈان کی اخوانی جماعت نے وہ غلطی کی تھی جو جنرل ضیاء کی حمایت کر کے پاکستان میں جماعت اسلامی نے کی تھی۔

۱۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صوفیاء کی تحریکیں مسلمانوں کی ملی اور سیاسی زندگی سے منقطع اور CUT OFF ہوتی تھیں حالانکہ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ صوفیاء کا کردار اس معاملہ میں نہایت شاندار رہا ہے اور جہاد و قتال اور اقامتِ دین و نفاذِ حدودِ شرعیہ کا قیام اکثر و بیشتر انہیں کا مرہون منت رہا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

غیاث الدین چوہدری / ڈاکٹر اسرار احمد

سوال: محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

آپ ہمارے ان چیدہ مذہبی علماء اور رہنماؤں میں سے ایک ہیں جو حریت خیال و نگاہ کے حوالے سے منفرد ہیں اور جن کی آراء سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر اُن کی فکری استقامت، جرأت اظہار، بیباکیٔ گفتار اور بے خوفیٔ کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے قرآن و حدیث کا غیر معمولی وسعت کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور اُن کے عملی اطلاقات کی تمام تر نزاکتوں پر آپ کی نظر ہے۔ آپ لوگوں کو ہم خیال بنانے کی غیر معمولی قوت رکھتے ہیں۔ تنظیم اسلامی آپ کی اس قوتِ جلیلہ کا ایک نمایاں مظہر ہے۔ آپ نے دین کے تقاضوں کی تکمیل و تنفیذ کے سلسلے میں عصری ضرورتوں کی اہمیت کے حوالے سے بہت تدبر فرمایا ہے۔ یوں ایک مخصوص نوع کے اجتہاد کا در وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا میں آرزومند ہوں کہ آپ میرے سوال کے جامع جواب سے اُن تمام لوگوں کو اپنے منفرد خیالات سے مستفیض فرمائیں گے جو میری طرح اس کے ہمہ جہت جواب کے لئے بے تاب ہیں۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے ”سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم کیوں ہے جب کہ ہر کوئی سچ ہی کا حامی یا دعویدار ہے؟“

غیاث الدین چوہدری
عارف عبدالمتین اکیڈمی،
۸۔ ایسٹ روڈ، لاہور۔

محترمی و مکرمی غیاث چودھری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے میرے بارے میں جن نیک خیالات و جذبات کا اظہار فرمایا ہے اگرچہ وہ زیادہ تر تو آپ کے حسنِ نظر ہی کا مظہر ہیں اس لئے کہ "من آنم کہ من دانم" کے مصداق اپنی اصل حیثیت سے میں خود ہی واقف ہوں، تاہم آپ کے اس حسنِ ظن پہ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ کا سوال دو مشاہدات (OBSERVATIONS) پر مبنی ہے یعنی:

ایک یہ کہ دنیا میں سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم ہے، اور

دوسرے یہ کہ ہر انسان سچائی کا حامی یا دعویدار ہے !

میرے نزدیک آپ کے یہ دونوں مشاہدات درست اور مطابق واقعہ بھی ہیں اور مطابق وحیٔ الٰہی بھی ـــــ چنانچہ:

۱۔ سورۂ سبا کی آیت ۱۳ میں فرمایا گیا: " وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ " یعنی "میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہیں"۔ اسی طرح سورۂ صٓ کی آیت ۲۴ میں فرمایا: " إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَا هُمْ " یعنی ایمان سے بہرہ مند اور اچھے عمل کرنے والے لوگ کم ہی ہیں۔ اسی طرح سورۂ انعام کی آیت ۱۱۶ میں فرمایا گیا: " وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ " یعنی " اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کے (سیدھے) راستے سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے" ـــــ مزید برآں بارہ مرتبہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: " وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ " یعنی "لیکن لوگوں کی اکثریت علم (صحیح) سے عاری ہے!" اور متعدد بار فرمایا گیا: " وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ " یعنی لوگوں کی اکثریت جذبۂ شکر سے محروم ہے " وقس علیٰ ذلک۔

۲۔ اسی طرح قرآن اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ اس میں اللہ نے اپنی روح میں سے پھونکا ہے، چنانچہ سورۂ حجر اور سورۂ صٓ دو مقامات پر فرمایا گیا " وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي " ـــــ انسان میں نفخ شدہ اس روحِ ربانی کا اثر یہ ہے کہ فطرتِ انسانی حق اور خیر، بھلائی اور نیکی اور صداقت و امانت کو پسند کرتی ہے اور جھوٹ اور باطل اور شر اور ظلم کو ناپسند کرتی ہے، ـــــ اس حقیقتِ واقعی پر سب سے بڑا گواہ تو ہر انسان کا اپنا ذاتی ضمیر یا نفسِ لوّامہ (یعنی CONSCIENCE) ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں سورۂ قیامہ کی دوسری

آیت میں اس کی قسم کھائی گئی ہے، یعنی " وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ " ــــــ اس کے علاوہ یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے گناہ کو چھپاتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اُس کی خبر دوسرے انسانوں کو ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کا اجتماعی ضمیر بھی جھوٹ اور ظلم سے نفرت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیثِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں بدی کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ کی گئی ہے کہ: " اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِی صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ " یعنی " گناہ وہ ہے جس سے تمہارے اپنے سینے میں بھی خلجان پیدا ہو جائے اور تم اسے ناپسند کرو کہ لوگ اُس سے واقف ہوں " ــــــ مزید برآں اسی حقیقت کو قرآن اس طرح بھی واضح کرتا ہے کہ اس نے نیکی کے لئے " معروف " اور بدی کے لئے " منکر " کے الفاظ کو بطور اصطلاح اختیار کیا ہے، یعنی نیکی فطرتِ انسانی کی جانی پہچانی شے ہے، اور بدی اُسے ناپسند ہے!

اب آئیے آپ کے سوال کی جانب، یعنی یہ کہ جب حق و صداقت فطرتِ انسانی کو اتنے پسند ہیں تو پھر دنیا میں غلبہ ظلم و زور کو کیوں حاصل ہے! ــــــ تو اس امرِ واقعی کے دو اسباب ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ انسان میں صرف روحِ ملکوتی ہی نہیں ہے، اس کا نفسِ حیوانی بھی ہے جو صرف اپنی حیوانی جبلتوں کی تسکین سے دلچسپی رکھتا ہے اور جس میں ایک شدید رجحان بدی اور پستی کی جانب موجود ہے، بقولِ الفاظِ قرآنی: " اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ " (سورۂ یوسف آیت ۵۳)۔ انسان کی روحِ ملکوتی کے پاؤں پستی کی جانب کھینچنے والی ان بھاری بیڑیوں ہی کی جانب اشارہ ہے سورۃ التین کی ان آیات میں کہ: " لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ " یعنی " ہم نے انسان کو پیدا تو کیا تھا بہترین ساخت پر، لیکن پھر اسے گرا دیا نیچے والوں میں سب سے نیچے! " ــــــ چنانچہ انسان کی حیاتِ دنیوی کی توجیہہ ہی ازروئے قرآن یہ ہے کہ یہ ایک امتحانی وقفہ ہے، بقولِ الفاظِ قرآنی: " اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا " یعنی " جس نے تخلیق فرمایا موت اور زندگی کو تاکہ تمہیں جانچے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا! " جس کی صحیح ترین تعبیر کی ہے علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کہ ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب ۔۔۔ اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

۲۔ دوسرے یہ کہ اس مادی دنیا میں جہاں قانونِ طبعی پوری طرح نافذ ہے، قانونِ اخلاق نافذ العمل

نہیں ہے۔ گویا یہاں طبعی اسباب و علل کے نتائج و عواقب تو بہ تمام و کمال ظاہر ہوتے ہیں۔ اخلاقی اعمال کے اثرات یا تو بالکل ظاہر ہی نہیں ہوتے، یا ہوتے ہیں تو بہت محدود پیمانے پر، بلکہ بسا اوقات تو یہ بھی ہوتا ہے کہ "گندم از گندم بروید، جَو ز جَو" کے بالکل برعکس خیر اور نیکی کے نتائج نقصان اور تکلیف کی صورت میں جبکہ شر اور بدی کے نتائج نفع اور آرام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، نتیجۃً انسان شر اور بدی کے اکتساب، اور جھوٹ اور خیانت کے ارتکاب میں زیادہ سے زیادہ جری اور بیباک ہوتا چلا جاتا ہے اور اس طرح بحیثیت مجموعی عالمِ انسانیت میں جھوٹ اور شر کا غلبہ ہو جاتا ہے ——— اس پورے فلسفے کو ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کی بالکل ابتدائی آیات میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں یوں سمو لیا گیا کہ :

"كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝" (العلق آیات ۶، ۷) یعنی "کوئی نہیں، انسان سرکشی اور تعدی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو (گرفت اور عقوبت سے) آزاد دیکھتا ہے!"

الغرض از روئے قرآن یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر دنیا میں اکثر و بیشتر جھوٹ ہی کا غلبہ اور ظلم ہی کا دور دورہ رہتا ہے، اس طرح گویا خالص اصولی اعتبار سے تو آپ کے سوال کا جواب میں نے اپنے فہم کی حد تک عرض کر دیا ہے ——— البتہ آپ کے ظاہری سوال میں ایک دوسرا سوال مضمر ہے، اور وہ یہ کہ آخر اس کا حل کیا ہے!

اس کے ضمن میں بھی دو ہی باتیں پیشِ خدمت ہیں جو اصلاً ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں کی حیثیت رکھتی ہیں :

ایک یہ کہ انسان کی حیاتِ دنیوی اس کی اس اصل زندگی کے مقابلے میں بہت حقیر اور بے وقعت ہے جو ابدی اور لامتناہی ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم کا فرمانا یہ ہے کہ : "وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝" (العنکبوت، آیت ۶۴) یعنی "یقیناً اصل زندگی تو آخرت کے گھر والی ہے، کاش کہ انہیں معلوم ہوتا" ——— اور جس کے ضمن میں علامہ اقبال کا یہ شعر صد فی صد حقیقت پر مبنی ہے کہ ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ ——— جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!

لہٰذا اگر اس عارضی اور بے وقعت زندگی میں جھوٹ کی عملداری سچ کے مقابلے میں زیادہ نظر آئے تو زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں! ——— اصل اور ابدی زندگی آخرت کی ہے

جس میں اس عالم کے برعکس اصل عملداری اخلاقی قانون کی ہوگی نہ کہ طبعی کی۔ چنانچہ ہر آن اور ہر لحظہ سچ اور حق ہی کا ظہور و غلبہ ہوگا ـــــ جھوٹ اور باطل کا وجود ناپید ہو جائے گا بمصداق الفاظِ قرآنی " جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا " (بنی اسرائیل آیت ۸۱) یعنی " حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا ــــ اور باطل تو (اپنی اصلیت کے اعتبار سے) ہے ہی ناپید ہو جانے والی شے !"

دوسرے یہ کہ اس دنیا میں حق و باطل اور سچ اور جھوٹ کے مابین کشاکش و کش مکش میں انسان کا اصل ہتھیار یہی ایمان بالآخرت ہے۔ اگر انسان کو آخرت کا یقین ہوگا تو اس عالمِ مادّی یعنی " جہانِ رنگ و بو " اور سلسلۂ اسباب و علل میں جھوٹ اور ظلم کے غلبے کے باوجود خود سچ اور حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ سورۂ علق کی جن آیتوں کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے ان کے بعد تیسری آیت یہی ہے کہ " إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ "، یعنی " یقیناً تیرے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے !" ـــــ گویا کانٹ نے اپنی تالیف " تنقید عقلِ عملی " (CRITIQUE OF PRACTICAL REASON) میں جس اخلاقی قانون (MORAL LAW) کو وجود باری تعالیٰ کے لئے دلیل کے طور پر بیان کیا ہے، وہ حکمتِ قرآنی کی رُو سے اصلاً عقیدۂ آخرت کی دلیل ہے۔!

فقط

خاکسار

اسرار احمد

اخبارات میں فحاشی کے خلاف

تنظیمِ اسلامی کی مہم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ

السلام علیکم

میں اخبارات و رسائل میں بے حیائی و فحاشی کے فروغ کے خلاف آواز بلند کرنے اور تحریک چلانے پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میں نے ماہ رمضان میں میر خلیل الرحمن کے نام ایک کھلا طویل خط اس سلسلے میں تحریر کیا تھا اور آخرت کی جوابدھی کا احساس دلاتے ہوئے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ پاکستانی قوم پر کچھ رحم کریں۔ لیکن "صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ" کے مصداق موصوف ٹس سے مس نہ ہوئے۔ خدا ان کے حال پر رحم کرے اور ان کو ہدایت دے (آمین) اس خط کی نقول میں نے ملک کے تمام جید علماء کرام اور اہم شخصیات کو ارسال کی تھیں اور ان سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اس برائی کے خلاف میدان عمل میں اتریں، لیکن افسوس کہ اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس برائی کے خلاف آواز بلند کی ہے، لیکن محض آواز بلند کرنے سے آپ کا کام مکمل نہیں ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس برائی کے خاتمے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگادیں گے۔

میں آپ کو تجویز پیش کرتا ہوں کہ آپ جناب خلیل الرحمن اور جناب مجید نظامی سے بالمشافہ ملاقات کر کے انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالی آپ کی ذات کو ان لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنادے (آمین)

عاجز

فرخ شہزاد

اے 8/90، ایف.بی.ایریا۔ کراچی

(۲)

محترمی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اخبارات میں رنڈیوں، طوائفوں، ایکٹرسوں، ماڈل گرلز وغیرہ کی تصاویر کی بلا جواز اشاعت کے خلاف جو مہم آپ کی تنظیم نے شروع کی ہے میں اور میرے ہزاروں شاگرد اُس کی زبردست

حمایت کرتے ہیں اس ضمن میں پاکستان ٹائمز اور نیشن میں میرے مراسلے چھپے ہیں عکسی کاپی منسلک کر رہا ہوں۔ مغربی ممالک تو خیر بہت دور کی بات ہے کراچی کے اخبارات بھی جمعہ کو اس قسم کا میگزین شائع نہیں کرتے۔

تاہم ایک گذارش ہے کہ آپ ٹی وی سٹیشن کے باہر بھی مظاہروں کا اہتمام کریں ٹی وی اخبارات سے بھی زیادہ آگے نکل گیا ہے انگریزی فلموں میں بوسہ بازی شروع ہو چکی ہے۔ ڈراموں میں بغیر دوپٹے کے نوجوان لڑکیاں کام کر رہی ہیں۔ ڈانس دکھائے جا رہے ہیں۔ جامد تصویر سے زیادہ خطرناک متحرک تصویر ہے اور چلتی پھرتی کہانی ہے۔ مظاہروں میں میں خود شریک ہوتا مگر عصر کا وقت مجھے SUIT نہیں کرتا یا پھر مظاہرے جمعہ کو کسی وقت کئے جائیں۔

والسلام

ناچیز

مظہر علی ادیب

(۳)

تازہ شمارے میں تنظیم اسلامی کے کارکنوں کا ردو روزناموں کے خلاف مظاہرہ دیکھ کر اور اس کی روداد پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ لاکھوں اخلاق پسند اور دین پسند لوگوں کے دل کی آواز ہے جو اپنے آپ کو مجبور خیال کر کے 'جنگ' اور 'نوائے وقت' کے میگزینوں کو خریدتے ہیں اور دل میں کڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ مجبور نہیں ان اخباروں کی نفسیاتی سحر کاری کا شکار ہیں اسی لئے میری یہ رائے ہے کہ محترم اسرار صاحب اس قسم کے مظاہروں کے اہتمام کے ساتھ ساتھ براہ راست خریداروں اور قارئین کو مخاطب کرنے کا بھی اہتمام کریں اور وہ خود اور ان کے کارکن اپنی تحریروں اور تقریروں میں خریداروں اور پڑھنے والوں سے اپیل کریں کہ وہ تصویری میگزین خریدنے سے انکار کر دیں اور اگر ہاکر ضد کرے تو دوسرا اخبار خرید لیں جس میں تصویریں اور میگزین سیکشن نہیں ہوتے۔ ذراسی ناگواری برداشت کرنے کا ایثار گوارا کر لیں۔ آخر میگزین خرید کر بھی ذہنی کوفت خریدتے ہیں۔ میں چونکہ آج کل فارغ ہوں اس لئے کئی روزنامے پڑھتا ہوں۔ وہ بھی جو میگزین شائع کرتے ہیں اور وہ بھی جو میگزین کا اہتمام نہیں کرسکتے۔ یقین مانئے کہ خبروں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر دو ایک خبروں کا فرق ہو بھی جائے تو ٹی وی اس کی تلافی کر دے گا۔ آخر ہر کام کے لئے کچھ نہ کچھ ایثار تو کرنا ہی پڑتا ہے بقول مولانا جامی "بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید" یعنی ایک پھول کے لئے بہت سے کانٹوں کی چبھن برداشت کرنی ہی پڑتی ہے۔

پھر یہ دیکھئے کہ تصویروں کا مشغلہ پاکستان میں پہلے جنگ نے شروع کیا۔ نوائے وقت نے خریداری کم ہوتے دیکھ کر اپنی اخلاقی حس کو کاروباری حس سے مغلوب ہونے دیا اور بامر مجبوری یہ سلسلہ شروع کر دیا جیسا کہ آپ کے دیئے ہوئے 'نوائے وقت' کے ایک تراشے سے ثابت ہوتا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ مجید نظامی صاحب کی طرح جنگ والے میر صاحب بھی دل اور ضمیر کی گہرائیوں سے اس بدعت کو پسند نہیں کرتے ہوں گے لیکن مصلحت نے ان کے ضمیر کی آواز کو خاموش ہی نہیں بلکہ گہرائیوں میں دفن کر دیا ہے۔ ذراسی تحریک پر ضمیر کی اور تحت الشعور کی

بے پناہ طاقت پھر بالائی سطح پر آ جائے گی۔

پھر یہ سب پاپڑ آخر خریداری کو بڑھانے کے لئے ہی بیلے جاتے ہیں۔ اصلاح احوال کے خواہش مندوں کی کوشش کے زیر اثر اگر خریداری کم ہوئی تو اخبارات کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ خریدار اگر سادہ اخبار پسند کریں گے تو انہیں سادہ ہی شائع کرنے پڑیں گے۔ اس معاملے میں خریداروں کی حوصلہ افزائی کا بھی بہت بڑا قصور ہے۔ اسرار احمد سہاوری

ترجمۂ قرآن ۔ وقت کی اہم ضرورت

ـــــ سوئٹزرلینڈ سے ایک صاحبِ درد کی پکار

ریگن ڈروف
سوئٹزرلینڈ

مورخہ 6 جولائی 1989ء

مکرمی جناب اسرار احمد صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں جس میں آپ تمام مومن و مومنات کی دعاؤں کی برکتیں شامل حال ہیں۔ شکر گزار ہوں رب العزت کا اور ساتھ دعا گو رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں سے ہم تمام مومن و مومنات کے گناہوں کو بخش دے' ہمارے دل کو روشن کر دے' اور ہم لوگوں کی زندگی کو خدا کی کتاب قرآن اور سنت رسول کے مطابق عملی طور پر عمل پیرا کر دے ۔ آمین. ثم آمین۔

اسرار صاحب اس خط کو لکھنے کے لئے میں کافی دنوں سے بے چین تھا اور ہوں۔ جانتے ہیں کیوں؟۔ سب سے پہلے تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے قرآن پاک کا ترجمہ مع مختصر تشریح کے اردو میں جو کیا ہے جو کیسٹس کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے وہ بلاشبہ نہایت اہم اور سنہرے حرفوں سے لکھا جانے والا کام ہے۔ آپ کی جتنی بھی اس سلسلے میں تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ ایمانی جذبات ہیں جو حرف کی شکل میں نکل رہے ہیں۔ میں روزانہ خدا کی رحمت سے آپ کے ترجے والے قرآن کے کیسٹ سنتا ہوں۔ جس سے ایمان اور روح تازہ ہو جاتی ہے۔ آج ہم مسلمانوں کی غفلت اور زبوں حالی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے معنی مطلب کو نہیں سمجھا اور نہ کبھی اس کے لئے وقت نکالتے ہیں۔ اگر ہمیں کامیابی چاہئے' سکون' چین' امن اور باہمی محبت چاہئے' جینے کا طریقہ اور سلیقہ چاہئے' روز مرہ زندگی میں آنے والے حالات سے نمٹنے کا طریقہ چاہئے کہ کس طرح کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے تو پھر ہر انسان کو ایک سہارے کی ضرورت ہے' ایک رہنما کی ضرورت ہے۔ اور یہ سہارا اور رہنما صرف اور صرف قرآن پاک ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم تمام مومن و مومنات کو اس قابل بنا دے کہ ہم قرآن سمجھیں اور عمل کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت سے نوازے۔ آمین ثم آمین

آپ سے ایک گذارش ہے اور یہ وقت کی پکار ہے' یہ دنیا کی پکار ہے' یہ گناہوں کی کھائی میں گرے ہوئے انسانوں کی پکار ہے' یہ بے چین دلوں کی پکار ہے کہ آپ صرف اردو ترجمے پر اکتفا نہ کریں بلکہ انگلش' جرمن' فرنچ' ترکی' اسپین' اٹلی' الغرض دنیا کی تمام زبانوں میں اسی طرح قرآن پاک کا ترجمہ و تشریح کریں جس طرح آپ نے اردو میں قرآن پاک کا ترجمہ و تشریح کیا ہے۔ اگر آپ اس کا بندوبست و انتظام اپنی سربراہی میں کریں یا کروائیں تو اس سے آج کے 85 فیصد بے چین انسانوں کو رہنمائی قرآن کے ذریعے مل جائے گی اور صحیح رخ کو اختیار کرتے ہوئے سچائی کی طرف اپنی زندگی کو رواں دواں رکھ سکیں گے۔ اسرار صاحب میرا جی چاہتا ہے کہ اس معاملے میں آپ کو لکھوں اتنا جو کبھی ختم نہ ہو۔ کیونکہ میں اس ملک میں ہوں جہاں لوگوں کو قرآن کا نام تو معلوم ہے لیکن قرآن کے اندر کیا ہے' کیوں ہے' کس لئے ہے' کس کے لئے ہے' یہ باتیں وہ نہیں جانتے۔ وجہ ظاہر ہے۔ کاش کہ آپ نے قرآن پاک کا جیسا ترجمہ اردو زبان میں تشریح کے ساتھ سلیس زبان میں کیا ہے ایسا ہر زبان میں ہو تا تو آج دنیا کی یہ حالت نہ ہوتی۔ اسرار صاحب آپ میری اس آرزو' تمنا' خواہش' اور قلب کی آواز کو میری طرف سے تمام دنیا کے انسانوں تک پہنچادیں۔

۔ کاش کہ سعودی عرب کے بادشاہ کو اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ وہ آپ کے ترجمۂ قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے دنیا کی تمام زبانوں میں قرآن کے ترجمہ اور مختصر تشریح کو ریکارڈ کر کے دنیا بھر میں پھیلانے کا انتظام کریں۔ آمین ثم آمین۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہماری مشکلوں کو آسان بنادے۔ ثم آمین۔

آپ کا قیمتی وقت لینے پر معذرت خواہ ہوں لکھنے میں غلطی اور بے ادبی ہو گئی ہو تو دل سے معاف کر دیجئے گا۔ شکریہ

فقط والسلام ہمیشہ دعاوں کا طالب ناچیز

سید نہال احمد

——(۲)——

بھوانڈی (انڈیا) سے ایک طالبِ قرآن کا خط

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زاد اللہ معالیک

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ بخیر و عافیت ہوں گے۔

میں آپ کیلئے اجنبی شخص ہوں لیکن میں آپ سے کسی حد تک متعارف ہو چکا ہوں ۔ گذشتہ جمعہ کو بمبئی میں آپ کے رسائل "میثاق"' "حکمۃ قرآن" ایک صاحب کی میز پر رکھے نظر آئے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سرسری طور پر ان اوراق کی ورق گردانی اور جستہ جستہ

تحریرات کو پڑھا جس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ سرسری طور پر آپ سے تعارف کرا دوں۔ میں ہندوستان میں مروجہ مدارس درس نظامیہ کا فارغ ہوں اور پھر بعد میں میں نے بمبئی یونیورسٹی سے "بی اے" "ایم اے" اور بی۔ ایڈ تعلیم حاصل کی ہے۔ اور یہاں ایک سیکنڈری اسکول رفیع الدین فقیہ نامی میں معلمی کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

اس مختصر تمہید و تفصیل کے بعد آپ سے یہ عرض ہے کہ میں خود قرآن کا شیدائی اور اس کی حکمتوں کا معترف و متلاشی ہوں۔ آپ کی تحریروں سے قرآن مقدس کی جو حکیمانہ تشریحات و توضیحات صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو کر' آپ کیلئے صدقہ جاریہ اور عوام و خواص کیلئے افادۂ عام کا ذریعہ بن رہی ہیں اور رجوع الی دعوت القرآن کا جو جذبہ و شوق پیدا ہو رہا ہے اور ہو چکا ہے وہ قابل ستائش و احترام ہے اور آپ کیلئے ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء کا مصداق ہے۔

ان سطور کی تحریر سے مقصد و مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی سبیل نکل سکے تو آپ اپنے رسائل کا اجراء میرے نام فرما دیں میں آپ کا ممنون کرم ہوں گا۔ نیز ایک مسجد میں خطابت کی ذمہ داری بھی میرے شانہ پر ہے جہاں تقریباً نماز جمعہ کیلئے سات سو سے لے کر ایک ہزار تک نمازیوں کی تعداد رہتی ہے۔ نیز بعد نماز عشاء درس قرآن کا سلسلہ بھی اپنی معلومات و مطالعہ کی حد تک دیا کرتا ہوں۔ آپ کے رسائل کو دیکھ کر راقم اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ وہ میرے لئے انتہائی کار آمد اور مفید ثابت ہوں گے اور ان کے مطالعہ سے میں عوام کو اور احسن طریقہ پر رجوع الی القرآن کی طرف مائل کر سکوں گا جس کے خاطر خواہ فوائد اور ثمرات حاصل ہونے کی توقع ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ قرآن اور قرآنی موضوعات پر آپ کی اور کتابیں ہیں اور کتنی؟ یہ تو یقین ہے کہ جو جذبہ و شوق اور تڑپ آپ کی تحریروں میں مجھے نظر آیا، آپ کی مستقل تصانیف بھی ان موضوعات پر ہوں گی۔ کیا آپ سے میں یہ توقع رکھوں کہ آپ ایک تشنۂ قرآن کو' قرآن کے سرچشمۂ حیات سے سیرابی کے مواقع مہیا کریں گے اور عند اللہ ماجور ہوں گے۔

فقط والسلام

عطاء اللہ خاں غفرلہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ادارہ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

ممالک	زر تعاون
سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات	۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا	۶- امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ	۹- امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ	۱۲- امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ۔ ماڈل ٹاؤن فیروز پور روڈ۔ لاہور (پاکستان)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حسب پروگرام ۱۲ اگست کو کراچی سے پیرس تشریف لے گئے تھے جہاں عالم اسلام کے مشہور سکالر اور محقق ڈاکٹر حمید اللہ سے ان کی ملاقات کا پروگرام طے تھا۔ وہیں سے امیر محترم کو ملفورڈ (ڈیٹرائٹ) کے سات روزہ بین الاقوامی مسلم تربیتی کیمپ میں شرکت کی غرض سے امریکہ کے لیے عازم سفر ہونا تھا۔ اس کیمپ کے لیے ۲۰ تا ۲۶ اگست کی تاریخوں کا تعین کئی ماہ قبل کر دیا گیا تھا اور امیر تنظیم اسلامی کو اس میں مرکزی مقرر اور مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ الحمد للہ کہ اس کیمپ کا انعقاد طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوا اور امریکہ سے آمدہ اطلاعات کے مطابق حسب توقع امریکہ اور کینیڈا میں مقیم تنظیم اسلامی اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے وابستگان کی اکثریت نے جو اکثر و بیشتر پاکستان اور ہندوستان کے اُن مسلمانوں ہی پر مشتمل ہے جو امریکہ میں مستقلاً یا عارضی طور پر مقیم ہیں، اس کیمپ میں اپنے اہل خانہ سمیت شرکت کی اور اس طرح یہ پروگرام بہت بھرپور اور کامیاب رہا۔ ناظم اعلیٰ برائے بیرون پاکستان محترم قمر سعید قریشی صاحب اور انجمن خدام القرآن سندھ کے صدر محترم سراج الحق سید صاحب اس سفر میں امیر تنظیم کے ہمراہ ہیں۔ اس تربیتی کیمپ کے بعض پروگراموں کو CONDUCT کرنے کی ذمہ داری محترم سید صاحب کے کاندھوں پر تھی اور امریکہ میں مقیم رفقاءِ تنظیم اور وابستگانِ انجمن سے فرداً فرداً رابطہ اور اُن کی اجتماعی کارکردگی کا جائزہ حسب سابق محترم قریشی صاحب کے ذمے تھا۔ اس دورے کی تفصیلات سے آگاہی تو وسط ستمبر میں ان قابل احترام بزرگوں کی مراجعت پر ہی ہو سکے گی، تاہم ہماری کوشش ہو گی کہ اگلے شمارے میں دورے کی تفصیلی رپورٹ کو ضرور شامل کر دیا جائے۔

امیر محترم کی امریکہ روانگی سے چند روز قبل، ۳۱ اگست کو لاہور میں رفقاءِ تنظیم اسلامی کا ایک خصوصی اجتماع منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع میں امیر تنظیم کا خطاب بہت سے اعتبارات سے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ اس خطاب میں امیر محترم نے موجودہ حالات میں تنظیم اسلامی کو درپیش سخت مراحل کا ذکر کرتے ہوئے قومی و سیاسی معاملات میں اپنے موقف کا خلاصہ بھی پیش کیا تھا اور ان متعدد

کا ایک بار پھر تفصیلی اعادہ کیا تھا جن پر اُن کا فکری استدلال اور موقف استوار ہے۔ رفقاءِ تنظیم کو صبر و مصابرت کی تلقین، خصوصاً اپنے موقف پر صبر و استقامت کی تاکید کرتے ہوئے تنظیم کے آئندہ لائحہ عمل اور حکمتِ عملی کے بارے میں تفصیلی ہدایات اور مشورے بھی انہوں نے رفقاءِ تنظیم کے گوش گزار کیے تھے۔ امیر محترم کے خطاب میں فکری غذا کا توشہ بھی وافر تھا اور پیغامِ عمل کی فراوانی بھی، شدتِ احساس کی تپش بھی تھی اور سوزِ دروں کی آنچ بھی، اندیشہ ہائے فردا کی نشاندہی بھی تھی اور وقت کی نزاکت کا احساس بھی، افہام و تفہیم کا انداز بھی تھا اور تلقین و نصیحت کا اسلوب بھی، حالات کی تجزیہ نگاری بھی تھی اور راہِ عمل کی تعیین بھی، اپنے استدلال کی صحت کا یقین بھی تھا اور اپنے فکر کی درستی کا ایقان بھی، اپنے موقف پر استقامت کا عزم بھی تھا اور صبر و مصابرت کی تاکید بھی، مضبوط دو ٹوک اعتماد لہجے کی کھنک بھی تھی اور نرم گفتاری کی مٹھاس بھی۔ چنانچہ اس اہم خطاب کو جلد از جلد مرتب کر کے قابلِ اشاعت بنانا ہماری ترجیحِ اوّلین بن گیا تھا۔ اگرچہ امیر محترم کے اس خطاب کا خلاصہ ماہ گزشتہ کے دوران ہفت روزہ 'ندا' کے دو شماروں میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے لیکن وہاں چونکہ اختصار کے پیشِ نظر بعض باتیں حذف کر دی گئی تھیں اور بالخصوص خطاب کا آخری حصہ جو رفقاء کے لیے ہدایات و تجاویز پر مشتمل تھا کچھ زیادہ ہی مختصر کر دیا گیا تھا لہٰذا رفقاء و احباب اور قارئینِ 'میثاق' کے افادے کی خاطر اس خطاب کو نوک پلک کی مزید درستی اور اختصار میں کسی قدر کمی کے ساتھ زیرِ نظر شمارے میں یکجا شائع کیا جا رہا ہے تاہم اِس سلسلے میں 'ندا' کا شکریہ نہ ادا کرنا احسان ناشناسی کے زمرے میں آئے گا کہ اِس خطاب کی ترتیب و تسوید کے سلسلے میں ادارۂ 'ندا' کی محنت سے ہم نے بھی استفادہ کیا ہے۔

تنظیم اسلامی کے تحت مبتدی اور منتظم رفقاء کی تربیت گاہوں کا جو سلسلہ چند ماہ قبل لاہور میں شروع ہوا تھا، الحمدللہ کہ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق باقاعدگی سے جاری ہے۔ صرف اِس فرق کے ساتھ کہ اِس سلسلے کی ابتدائی تربیت گاہیں قرآن اکیڈمی میں منعقد ہوتی تھیں جبکہ گزشتہ ماہ کے دوران تربیتی پروگراموں کا انعقاد تنظیم اسلامی کے مرکزی دفتر، گڑھی شاہو میں ہوا۔ ماہِ اگست کے دوران جن تربیتی پروگراموں کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا تھا، اللہ کی نصرت و تائید سے وہ پروگرام موسم کی شدت اور بارشوں کی غیر یقینی صورتِ حال کے باوصف اعلان کردہ تاریخوں کے مطابق منعقد ہوئے۔ مختلف شہروں کے رفقاءِ تنظیم نے اِن تربیت گاہوں میں شرکت کی اور فکری غذا کے ساتھ ساتھ جذبۂ عمل سے بھی انہوں نے بقدرِ صلاحیت و وسعت حصہ پایا۔ پچھلے 'میثاق' میں چونکہ مبتدی اور

منظم رفقاء کے لیے منعقد ہونے والی ابتدائی تربیت گاہوں کی مفصل رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں لہٰذا ماہِ اگست کے دوران منعقدہ تربیت گاہوں کی تفصیلی رپورٹیں شائع کرنا ہماری دانست میں غیر ضروری ہے۔ تاہم 'مشاہدات و تاثرات' کے زیرِ عنوان ہمایوں ارشد صاحب کی ارسال کردہ ایک رپورٹ چونکہ ذرا مختلف انداز میں تحریر کی گئی تھی اور اس کا مضمون سابقہ رپورٹوں سے بہت ہٹ کر تھا لہٰذا اُسے اس شمارے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح کراچی میں منعقد ہونے والی مبتدی رفقاء کی تربیت گاہ کی رُوداد کو بھی اس پرچے میں جگہ دی گئی ہے کہ شہرِ کراچی میں اس طرح کی تربیت گاہ کے انعقاد کا یہ پہلا موقع تھا۔ مزید برآں اخبارات میں بے پردگی اور عریانی کے فروغ کے خلاف پُرامن احتجاجی مظاہروں کا جو سلسلہ لاہور میں شروع ہوا تھا، ماہِ گزشتہ کے دوران اس کا دائرہ کار پاکستان کے دوسرے شہروں تک وسیع کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ کراچی اور راولپنڈی میں کیے گئے مظاہروں کی مختصر رپورٹوں اور لاہور میں ٹی وی اسٹیشن کے سامنے کیے جانے والے احتجاجی مظاہرے کی رُوداد کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے

قرآن کالج میں ایف اے کے داخلے اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکے ہیں۔ الحمدللہ کہ نصف صد درخواستیں آج کی تاریخ تک وصول ہو چکی ہیں اور مزید کی بھی توقع ہے۔ ہم نے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ اگست طے کی تھی لیکن چونکہ طلبہ کے انٹرویوز محترم ڈاکٹر صاحب کی پاکستان واپسی پر ہوں گے، جو وسط ستمبر تک متوقع ہے، لہٰذا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں کو بھی زیرِ غور لایا جا سکے گا۔ اس طرح امید ہے کہ قرآن کالج کی ایف اے کلاس کو، جس کا اجراء اسی سال سے ہو رہا ہے، ایک اچھا آغاز مل سکے گا۔ بی اے کے لیے داخلے بھی عنقریب شروع کیے جائیں گے۔ اور ایک سالہ تدریسی نصاب کی نئے سال کی کلاس کا آغاز بھی ان شاء اللہ ۱۵ اکتوبر تک ہو جائیگا۔ موخر الذکر دونوں کلاسوں میں داخلوں کے سلسلے میں تاریخوں کے اعلان اور ایک سالہ تدریسی نصاب کے جائزے پر مشتمل لطف الرحمٰن خان صاحب کا ایک اہم مضمون اسی شمارے میں شامل ہیں۔ تحریک رجوع الی القرآن اور تعلیم و تعلم قرآن سے دلچسپی رکھنے والے احباب سے گزارش ہے کہ انہیں نظر سے ضرور گزار لیں اور دیگر رفقاء و احباب سے بھی التماس ہے کہ وہ اس کام کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس میں اپنا بھرپور حصہ ادا کرنے کے معاملے پر سنجیدگی سے غور کریں۔

تنظیم اسلامی کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے

ستمبر اور اکتوبر ۸۹ء کے مجوزہ پروگرام

(۱)

۸ تا ۱۵ ستمبر ۸۹ء

تربیت گاہ برائے مبتدی رفقاء

بمقام: مرکزی دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو، لاہور

تنظیم اسلامی میں نئے شامل ہونے والے رفقاء کے علاوہ وہ پرانے رفقاء بھی اس میں شریک ہوں جنہوں نے ابھی تک مبتدی تربیتی نصاب شروع نہیں کیا۔

(۲)

یکم تا ۳ اکتوبر ۸۹ء

اجتماع رفقاء بسلسلہ اظہارِ خیال

بمقام: قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن - لاہور

اس اجتماع میں رفقاء مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کریں گے تاکہ تنظیم اسلامی کے ذمہ دار حضرات ان کی آراء سے استفادہ کر سکیں

(۳)

۲۰ تا ۲۷ اکتوبر ۸۹ء

تربیت گاہ برائے منتظم رفقاء

اس میں وہ رفقاء شریک ہوں گے جنہوں نے مبتدی تربیتی نصاب مکمل کر لیا ہو

جمہوریت کی تائید اور اسلامی انقلاب کی جدوجہد ہمارا لائحۂ عمل ہے ہمیں صبر و مصابرت کی روش پر کاربند رہنا ہوگا

—— رفقاءِ تنظیم اسلامی سے امیر تنظیم کا خطاب ——

رفقائے گرامی! آج کے اجتماع میں اگرچہ میرا تقریر کرنے کا پہلے سے کوئی ارادہ نہ تھا بلکہ اس کے انعقاد میں کچھ اور مصلحتیں پیش نظر تھیں۔ لیکن آج مجھے اچانک عصر کی نماز کے بعد خیال آیا کہ ع "امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے!" میں اگلے چند روز میں ایک طویل سفر پر جا رہا ہوں، کسے خبر ہے پھر ملاقات ہوتی ہے یا نہیں ہوتی! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس وقت اگر لاہور کے رفقاء ایک معتدبہ تعداد میں جمع ہوں گے تو کچھ اہم باتیں اس موقع پر گوش گزار کر دوں گا اور چونکہ اس کو ٹیپ کر لیا جائے گا اور ملک کے طول و عرض میں رفقاء تنظیم تک وہ کیسٹ پہنچ جائے گا تو اس وقت درحقیقت میں صرف آپ حضرات سے ہی مخاطب نہیں ہوں بلکہ میرا خطاب تنظیم کے تمام رفقاء سے ہے۔

مرحلہ سخت ہے

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم میں سے ہر شخص واقف ہے کہ اس وقت ہماری یہ چھوٹی سی تحریک اور تنظیم ایک سخت مرحلے سے دوچار ہے۔ فضا جو بن رہی ہے اور خاص طور پر پنجاب میں جو سیاسی رخ اختیار کر چکی ہے، وہ ہمارے لئے نہایت ناساز گار بلکہ مخالفانہ ہے اور مختلف اطراف و جوانب سے اس کے شواہد سامنے آ رہے ہیں۔ یہ صورت حال اسی انداز میں آگے بڑھتی رہی تو اس میں مزید شدت پیدا ہونے کا صرف امکان ہی نہیں بلکہ خاصی توقع ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو میں کہنا چاہوں گا' یہ ہے کہ اس قسم کے مراحل تحریکوں کے لئے مفید بھی ہو جاتے ہیں اور مضر بھی۔ ان کی حیثیت ایک طرح کے چیلنج کی ہے۔ کوئی تحریک اگر اس قسم کی صورت حال سے عہدہ بر آ ہو سکے تو یہ اس کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے' اس کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے' اس کی رفتار بڑھتی ہے اور اس کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہوتا ہے۔ بصورت دیگر کوئی تحریک اس سے صحیح طور سے عہدہ بر آ نہ ہو سکے تو یہ اس کی موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ ان دونوں نتائج میں جو شے فیصلہ کن ہے اسے ہم صبر اور مصابرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر کسی تحریک کے کارکنوں اور اس کے وابستگان میں صبر اور مصابرت کا مادہ ہے تو اس قسم کے مراحل سے وہ تحریک فائدہ اٹھاتی ہے' اسے فروغ حاصل ہوتا ہے ۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

اور اگر خدانخواستہ صبر اور مصابرت نہ کیا جا سکے اور بودے پن یا کمزوری کا مظاہرہ ہو تو پھر اس کا نتیجہ وہ نکلتا ہے جو اقبال نے کہا ہے...... کہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات"۔ اتفاق سے پرسوں کے درس میں اچانک وہ اشعار میری زبان پر آ گئے تھے جن کا تعلق ۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت سے ہے۔ تحریکِ جماعتِ اسلامی کے لئے وہ ایک کڑا وقت تھا۔ ۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا عبد الستار نیازی دونوں کو مارشل لاء کورٹ سے پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ وہ سزا تو اللہ کی تائید سے بعد میں منسوخ ہو گئی تھی لیکن ان دونوں حضرات کو کچھ عرصہ پھانسی کی کال کوٹھری میں بھی رہنا پڑا۔ اُس زمانے میں رئیس امروہوی کا ایک قطعہ روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اسی واقعہ سے متأثر ہو کر انہوں نے وہ اشعار کہے تھے یا ان اشعار کے ورود کا کوئی اور سبب تھا۔ بہرکیف وہ اشعار نہایت برمحل اور متاثر کن تھے۔ میں نے انہیں "عزم" میں شائع کیا تھا جس کی ادارت اُن دنوں میرے سپرد تھی۔ اُس وقت جمعیت طلبہ لاہور اور پنجاب کی نظامت بھی میرے کاندھوں پر تھی۔ وہ اشعار آپ بھی سن لیجئے۔ ۔

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی' فلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے

سیاہیوں سے حزیں نہ ہونا' غموں سے اندوہ گیں نہ ہونا
انہی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے
رئیسؔ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں
جسے سمجھتے ہو آزمائش' وہی تو بگڑی بنا رہی ہے

میں نے آخری شعر کو 'رئیس' کی زیر لگا کر شائع کیا تھا اور "رئیسِ اہلِ نظر" سے میرا اشارہ مولانا مودودی مرحوم کی طرف تھا۔ ان دنوں وہ جیل میں تھے۔ میں نے وہ پرچہ بھی انہیں جیل میں بھجوا دیا تھا۔۔۔ اس وقت ان اشعار کا میں اس لئے حوالہ دے رہا ہوں کہ مخالفانہ فضا تحریکوں کے لئے دو بالکل متضاد نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اگر اس کے چیلنج کو پورے طور پر قبول کیا جائے' صبر و مصابرت کا مظاہرہ ہو تو یہ بادِ مخالف نئی زندگی' نئی توانائی' نیا عزم اور نئی ہمت پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے اور اگر استقلال اور ثبات کا فقدان ہو تو ایسی صورت حال میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے جو تحریکوں کی موت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

صبر، مصابرت، رابطہ اور تقویٰ

میں نے دو لفظ کہے ہیں' صبر اور مصابرت۔ صبر کے ساتھ مصابرت کا اضافہ قرآن مجید کی سورہ آل عمران کی آخری آیت میں ہوا ہے جس کی تلاوت میں نے آغازِ کلام میں کی تھی۔ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اس میں اہل ایمان کو چار باتوں کا حکم دیا گیا۔ صبر کرو اور مصابرت کرو۔ یہ مصابرت کا لفظ بابِ مفاعلہ سے ہے جس کا خاصّہ ہے کہ اس میں مقابلے کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے یعنی صبر کا صبر سے مقابلہ ہو گا۔ ظاہر بات ہے کہ تم میدان میں اکیلے تو نہیں ہو' اگر تم توحید کے علمبردار ہو تو شرک کے علمبردار بھی موجود ہیں۔ تم گردنیں کٹوانے کو تیار ہو تو وہ بھی جانیں دینے کو تیار ہیں۔ چنانچہ صبر کے مقابلے میں بھی ان پر بازی لے جانی ہو گی۔ تیسری ہدایت ہے "رابِطوا"۔ یعنی جڑے رہو' مربوط رہو' بنیانِ مرصوص بنے رہو اور منظم رہو اور آخری بات جو ہر حال میں درکار ہے "واتقوا اللہ"۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ ہر وقت یہ احساس رہے کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے' ہم اس کی نگاہ میں ہیں' اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور جوابدہی کرنی ہے۔ انہی چار ہدایات پر عمل کرنے میں تمہاری فلاح کا راز مضمر ہے۔ صبر کی حقیقت اور اس کی قسمیں میں نے اپنے دروس میں بارہا بیان کی ہیں۔ ذرا ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ ایک ہے "صبر علی الطاعت" اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر

صبر۔ یعنی حکم کی تعمیل کرنی ہے چاہے نفس کو ناگوار ہو اور اس میں تکلیف پہنچتی ہو۔ دوسری قسم کو "صبر عن المعاصی" کا نام دیا گیا ہے یعنی نافرمانی، معصیت اور گناہ سے اپنے آپ کو روک کر رکھنا ہے۔ خواہشاتِ نفس کی لگام کو کھینچ کر رکھنا ہے۔ پھر "صبر علی البلاء" ہے یعنی امتحان، آزمائش اور تکلیف کو برداشت بھی کرنا ہے۔

اپنے فکر کا شعوری جائزہ لیجئے!

آج آپ کو دو اصطلاحات اور بتاؤں جو ہماری اس وقت کی صورت حال کے اعتبار سے زیادہ مناسبت رکھتی ہیں۔ ایک ہے "صبر علی العقیدہ" یعنی عقیدہ اور ایمان پر جمے رہنا اور دوسرا ہے "صبر علی المخالفہ" یعنی مخالفت پر صبر کرنا۔ آپ کو معلوم ہے کہ سب سے پہلا صبر جو صحابہؓ کو کرنا پڑا وہ ایمان پر تھا۔ ابھی اور اعمال تو تھے ہی نہیں، نہ لمبی چوڑی اطاعت کا معاملہ تھا، نہ شریعت کے احکام آئے تھے اور نہ چیزوں کی حرمت آئی تھی تو اس مرحلے میں ایمان پر جمے رہنا ہی صبر تھا اور اسی کا عکس یہ کہ مخالفت کا مقابلہ بھی صبر سے کیا جائے۔ یہ معاملہ آج ہمیں بھی درپیش ہے۔ ہماری تحریک کا ایک فکر ہے، اس کا ایک صغریٰ کبریٰ ہے، اس کی بنیاد میں دین کا ایک تصور ہے، اس کی اساس فرائضِ دینی کے ایک جامع تصور پر قائم ہے۔ اس پر ذہنی طور پر جمے رہنا سب سے پہلا صبر ہے جو اس وقت درکار ہے۔ جب مخالفانہ فضائیں مخالفانہ ہوائیں چلتی ہیں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ شعور کے ساتھ اپنے اس فکر پر قائم نہیں ہے اور اسے اس پر استقامت حاصل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہی کیفیت ہوگی "کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے"۔ ایک ریلا اِدھر سے آیا، ایک اُدھر سے۔ ایک بات اِدھر سے آئی دوسری اُدھر سے۔ تو کسی تحریک کے لئے ایسی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سب سے اہم ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے وابستگان اپنی فکر کا از سرِ نو جائزہ لیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں نا سمجھی میں یا بے شعوری میں اس کی بنیادی فکر کا تانا بانا ہی بکھر جائے۔ میں یقیناً اس امکان کو پیش نظر رکھتا ہوں اور ہر شخص کو رکھنا چاہئے کہ ہو سکتا ہے کہ ہماری فکر میں کوئی غلطی ہو لیکن اس کو انسان شعوری طور پر سمجھے، غیر شعوری طور پر کسی مخالفانہ رو کے اندر بہنا شروع کر دیا جائے تو پھر یہ معاملہ غلط ہے۔ ہاں نظرثانی کیجئے، تنقیدی نگاہ ڈالئے اور غور و فکر کیجئے۔ اس میں قطعاً کوئی شے بری نہیں۔ تاہم غیر شعوری طور پر مخالفت کی وجہ سے رویہ تبدیل کرنا بودا پن اور کچاپن ہے۔

سیاسی زعماء کی ماضی و مستقبل سے بے خبری

اب میں یہاں اپنے اس فکر کے ضمن میں چند باتوں کا آج پھر اعادہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس وقت کے حالات کے اعتبار سے یہ اہم نکات آپ کے سامنے رکھوں۔ ہم نے سیاسی اور انقلابی کے درمیان جو مختلف اعتبارات سے فرق و تفاوت سمجھا ہے کہ سیاسی نہج اور انقلابی نہج اور ان کے اہداف میں کیا فرق ہے' ان کے طریق کار میں کیا فرق ہے؟۔ اس سے قطع نظر آج ایک اور بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں وہ یہ کہ بالعموم جو سیاسی ذہن ہوتا ہے یا جو لوگ اس اکھاڑے میں لنگوٹ کس کر اترے ہوتے ہیں' ان کی سوچ کے بارے میں آپ تین چیزیں نوٹ کریں گے۔ ایک یہ کہ ان کو صرف حال سے دلچسپی رہتی ہے' ان کو نہ ماضی کی فکر ہوتی ہے نہ مستقبل کی۔ اس لئے کہ سیاست کے میدان میں تو صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں' اتار چڑھاؤ رہتا ہے' کوئی ادھر پھدک گیا کوئی ادھر کھسک گیا' یہ جا رہا ہے اس پر ڈورے ڈالے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر جو فضاء ہمارے ملک میں سیاست کی ہے' اس میں ناپختگی ہے اور سیاسی عدم بلوغت ہے۔ ساری سوچ مرتکز ہو جاتی ہے حال پر جس میں انسان گم ہو جاتا ہے۔ ماضی سے بھی اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور مستقبل کی بھی اس کو زیادہ فکر نہیں رہتی۔ اس کی سوچ بھی سطحی ہوتی ہے' عمیق نہیں ہوتی۔ ہمارے سیاست دانوں کو فرصت نہیں کہ حالات اور ان کے اسباب پر غور کریں۔ پنجاب میں اگر یہ کیفیت پیدا ہو رہی ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ سندھ میں اتنی زبردست تحریک ابھری تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ ان اسباب میں سے کتنے حقیقی ہیں کتنے مصنوعی' کتنے مثبت ہیں کتنے منفی' کتنوں میں مبالغہ ہو رہا ہے کتنے واقعی ہیں؟ اس پر ان کو توجہ دینے کا موقع نہیں ہوتا۔

علاقائی منافرت شدّت اختیار کر چکی ہے

آپ حضرات میں سے جنہوں نے بھی میری کتاب "استحکام پاکستان" کے دوسرے حصے کا جو مسئلہ سندھ سے متعلق ہے' مطالعہ کیا ہے' ان کو معلوم ہو گا کہ ایک لفظ اس میں بار بار آیا ہے "ردِ عمل کا پیچ در پیچ سلسلہ"۔ اس ضمن میں ایک بات کا اندیشہ اُس وقت ہمارے سامنے تھا جو اب سامنے آ چکا ہے۔ اسی ردِ عمل کا ایک شدید ردِ عمل پنجاب میں آ چکا ہے اور صورت حال اب یہ ہے کہ پنجاب جو پاکستان' نظریہء پاکستان اور پاکستان کی سالمیت کا سب سے بڑا علمبردار تھا بلکہ شاید پاکستان اور نظریۂ پاکستان کا "ٹھیکیدار" تھا' آج وہاں جذبات کی

شدت سے مغلوب ہو کر لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ لے' ہم کب تک سندھیوں کے ہاتھوں میں کھیلیں گے اور کب تک یہ پارٹی سندھ کارڈ استعمال کرے گی۔ پھر وہ باتیں جو کبھی دبی دبی کہی جاتی تھیں کہ آخر سندھیوں کو کس نے روکا تھا کہ وہ فوج میں شامل نہ ہوں' کس نے روکا تھا کہ وہ آگے نہ بڑھیں اور اپنے خول میں بند رہیں وغیرہ وغیرہ' وہ کیفیات بھی اس وقت پوری شدت کے ساتھ پنجاب میں پیدا ہو رہی ہیں اور اس وقت یہاں کی فضا اس حوالہ سے در حقیقت ہمارے لئے سب سے زیادہ مخالف بن چکی ہے۔ اس موضوع پر میں جن باتوں پر ہمیشہ زور دیتا رہا ہوں' آج چاہتا ہوں کہ پھر اپنے ساتھیوں کی توجہ اس طرف مبذول کراؤں

عالم اسلام میں سرزمینِ پاکستان کی خصوصی اہمیت

جن حضرات نے "استحکامِ پاکستان" کا مطالعہ کیا ہے انہیں اندازہ ہے کہ میرے نزدیک اسلام کے ماضی اور مستقبل' یعنی اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ اور آئندہ اسلام اور امتِ مسلمہ کے مستقبل کے اعتبار سے دو باتیں نہایت اہم ہیں۔

پہلی یہ کہ تجدیدِ دین کا سارا کام الفِ ثانی میں یعنی ہجری کیلنڈر کے حساب سے پہلے ہزار کے بعد جو چار سو سال بیت گئے ہیں' وہ برِّعظیم پاک و ہند ہی میں ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ' انہی کے ساتھ ان کے ہم عصر شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ' پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ' پھر تحریک شہیدین جیسی عظیم تحریک' پھر چودھویں صدی میں علامہ اقبال' مولانا ابو الکلام آزاد' مولانا مودودی' تبلیغی جماعت' علماء کے طبقہ میں سے چوٹی کی شخصیت حضرت شیخ الہندؒ جن کو میں چودھویں صدی کا سب سے بڑا مجدد سمجھتا ہوں' ان سب کا ظہور حالات کا ایک خاص رخ ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مشیتِ ایزدی ہے جو اس خطہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ میں نے انہی دنوں ایک کتاب "زندہ رود" کے نام سے دیکھی ہے جو حیاتِ اقبال سے متعلق ہے اور جسے لکھا ہے ان کے صاحب زادے جاوید اقبال صاحب نے۔ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے ایک بات کہی ہے جس کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے۔ اُس وقت کی فضاء کچھ ایسی بن گئی تھی کہ علامہ اقبال شدت کے ساتھ قائل تھے کہ ہندوستان میں جداگانہ انتخابات لازمی ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ انتخابات کا نظام شروع ہوا تو وہ مسلمانوں کے لئے مہلک ہو گا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ قائداعظم بھی اس وقت تک اس معاملہ میں کچھ نرم اور ڈھیلے تھے اور مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی' ایک جناح لیگ کہلاتی تھی دوسری شفیع لیگ۔

علامہ اقبال شفیع لیگ کے ساتھ تھے اور ان کا موقف یہ تھا کہ ہمیں کسی بھی صورت میں مخلوط انتخابات قبول نہیں کرنے چاہئیں۔ "تجاویزِ دہلی" کا ایک فارمولا آیا تھا اس میں کسی درجہ میں مسلم لیگ نے ایک امکان سامنے رکھا تھا کہ اگر ہمارے فلاں فلاں مطالبے مان لئے جائیں تو ہم مخلوط انتخاب تسلیم کرلیں گے۔ اس پر علامہ اقبال نے ایک تصور پیش کیا کہ بقیہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سوچ کا زاویہ مختلف ہے تو بالائی ہندوستان یعنی اب جو علاقہ پاکستان میں شامل ہے' اس علاقے کے مسلمانوں کی ایک علیحدہ کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ وہ اپنے مسائل کے بارے میں غور کریں اور اپنی پالیسی معین کریں۔ اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ:۔

> "اس کانفرنس کے طلب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان صوبہ جات کے مسلمانوں کو حالاتِ حاضرہ اور آج کی سیاسی تحریکات سے آگاہ کیا جائے اور ہماری ہمسایہ اقوام اور ہندوستان کی حاکم قوم کی حکمتِ عملی سے واقف کر کے ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جن سے ملتِ مرحومہ دوچار ہے۔ اور اس کے بعد مسلمانانِ ہند کی اس کثرت کو جو ان صوبہ جات میں ہے پنجاب' سرحد' سندھ اور بلوچستان جن کو خدائے علیم و خبیر نے یقیناً بلا مصلحت نہیں بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لئے جو اربابِ دانش و بینش پر روز بروز عیاں ہوتی چلی جارہی ہے یک جا کر رکھا ہے' ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل ہونے کا پیغام دیا جائے"۔

علامہ اقبال کا تصوّرِ پاکستان

پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ الٰہ آباد میں علامہ نے جو خطبہ دیا اس میں بھی پاکستان کا ایک تصور پیش کیا تھا اور وہ پاکستان یہی تھا جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔ علامہ اقبال کے سامنے مشرقی پاکستان کا کوئی تصور اُس وقت تک تھا ہی نہیں۔ یہ تو بعد میں جب تحریک شدت کے ساتھ پھیلی ہے اور ایک قومی و ملی جذبہ جاگ گیا تو یہ صورت پیدا ہوئی کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں شمال مغربی اور شمال مشرقی ہند کا ذکر آیا اور وہاں بھی "ریاستوں" کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں "سٹیٹس" میں سے "ایس" نکال دیا گیا اور وہ لفظ "سٹیٹ" رہ گیا۔ اور اس میں مزید اضافہ کیجئے کہ در حقیقت یہ وہی خطہ تھا برعظیم پاک و ہند میں جو پہلا پاکستان تھا۔ ۷۱۲ء (۹۳ ہجری) میں جب محمد بن قاسمؒ کے ذریعے یہاں اسلام آیا اور ملتان

تک ان کی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت ملتان ایک شہر کا نہیں "علاقے" کا نام تھا جس میں زیریں پنجاب اور سطح مرتفع کو چھوڑ کر ہمارا موجودہ پورا پنجاب آجاتا تھا۔

ہمارے اس چار سو سالہ تجدیدی کام کے بارے میں علامہ اقبال کی رائے بھی یہ ہے کہ خدائے علیم و خبیر و قدیر نے یقیناً یہ تمام کام بلا مصلحت نہیں کرائے بلکہ کچھ ایسی حکمت کے تحت ہوئے جو روز بروز اصحابِ دانش و بینش پر عیاں ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے اس علاقے کے اندر ایک یکجائی کی صورت پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بات جو میرے فکر کے اعتبار سے اہم تر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر اور حضورؐ کے تمام نوعِ انسانی کے لئے مبعوث ہونے کا منطقی نتیجہ اور "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ" کے قرآنی الفاظ میں حضور کے مقصدِ بعثت کا تعین، ان تین چیزوں کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے، اور مجھے الحمد للہ یقین کی حد تک اس پر اطمینان ہے کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ یہ ہے ہمارا مستقبل۔ یہ مستقبل اگر سامنے نہ ہو اور اس پر یقین نہ ہو تو انسان کے پاؤں میں لغزش آجاتی ہے۔ مجھے فوری کامیابی کی امید تو نہیں ہے لیکن میں مستقبل پر یقین کی بات کر رہا ہوں جو میرے لئے قوت کا اصل سرچشمہ ہے اور اسی میں صبر و استقامت کا بھی بہت سا سامان ہے۔

جدید اسلامی ریاست کے قیام کا امکان صرف پاکستان میں ہے

ماضی اور مستقبل کے ان حقائق کے حوالے سے پاکستان کی بہت اہمیت ہے اور دوسری طرف نظری اعتبار سے بھی یہ حقیقت میرے سامنے آئی کہ آج کے پورے عالم اسلام میں صحیح معنی میں ایک جدید اسلامی ریاست کے قیام کا اگر امکان ہے تو صرف پاکستان میں ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے افغانستان کے بارے میں ہمیں بہت سی اچھی امیدیں ہو گئی تھیں، اب ان میں کچھ کمی آئی ہے۔ وہاں اسلامی حکومت تو قائم ہو سکتی ہے اور اس کی امید نے ابھی دم نہیں توڑا۔ پورے افغانستان میں نہ ہو تو اس کے ایک بڑے حصے پر تو ہو ہی سکتا ہے لیکن وہ جدید اسلامی ریاست نہیں ہوگی۔ افغانستان تمدنی ارتقاء کے اس مرحلے میں نہیں ہے کہ اس دور میں نوعِ انسانی کے لئے ایک نمونہ کی جدید اسلامی ریاست بن سکے۔ وہ ابھی تمدنی ارتقاء کے اعتبار سے بہت پیچھے ہے۔ پاکستان اس اعتبار سے پورے عالم اسلام میں ایک امتیاز رکھتا ہے۔ تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی میں تین ہی ممالک پوری دنیا میں کسی حیثیت کے حامل ہیں۔ عالم عرب میں مصر اور غیر عربوں میں پاکستان اور ترکی۔

پاکستان کی ولدیت اسلام ہے

اس کے ساتھ ہی وہ میرا پورا فلسفہ ذہن میں لایئے کہ پاکستان وہ واحد ملک ہے جس کی ولدیت اسلام ہے باقی کسی ملک کی ولدیت اسلام نہیں۔ ایک اخبار میں پروفیسر حسنین کاظمی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا اور میں اس کو پڑھ کر حیران رہ گیا۔ اس میں انہوں نے "شہاب نامہ" سے ایک حوالہ دیا ہے کہ صدر ایوب نے ایک موقع پر اپنی کسی خاص ترنگ میں یہ بات کہہ دی کہ اسلام کا معاملہ یہاں سے ہٹانا چاہئے' اسلام ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ تو قدرت اللہ شہاب نے جو ان کے سیکرٹری تھے' اس موضوع پر ایک مفصل نوٹ فوراً انہیں بھیجا اور دلائل کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کیا کہ پاکستان کے لئے اسلامی پس منظر اور اسلامی تشخص کو چھوڑ دینا ممکن نہیں ہے۔ ایسا کرنا پاکستان کی جڑیں کھودنے کے مترادف ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرحوم صدر ایوب ان کا نوٹ پڑھتے گئے اور ان کا رنگ بدلتا گیا اور آخر کار انہوں نے کہا کہ تم نے ٹھیک کہا ہے اور اس کے بعد انہوں نے اپنی گفتگوؤں میں کئی بار اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا۔ میرے علم میں صدر ایوب کے بارے میں پہلے بھی یہ بات آئی تھی کہ ڈاکٹر رفیع الدین کا فکر بھی جب ان تک پہنچا تو انہوں نے اسے اچھی طرح اپنایا تھا۔ وہ سائنس اور مذہب کو قریب تر لانے کے خواہشمند تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین

بہرحال یہ دو باتیں ذہن میں رکھئے کہ ماضی کا یہ معاملہ اور مستقبل کے بارے میں الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر' ان دونوں کو میں جوڑتا ہوں تو مجھے اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے اس خطے کی مشیت ایزدی میں بڑی حکمت نظر آتی ہے جس کے لئے علامہ اقبال نے بالکل ابتدائی زمانے میں کوشش کی۔ اس کے دور جدید کی ایک اسلامی ریاست بننے کا کوئی امکان اگرچہ اس وقت ہمیں نظر نہیں آرہا "کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے" لیکن اگر کوئی امکان ہے تو یہیں ہے۔

مرہٹہ قوت مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک چیلنج

دوسری اور اضافی بات یہ ہے کہ احیائے اسلام کی ضرورت بھی روئے ارضی کے اسی حصے کو ہے جس کا واسطہ ہندو سے پڑا ہے۔ ہندوستان میں جو کٹر ہندو ذہنیت ہے وہ نہ پاکستان کو تسلیم کرتی ہے نہ مسلمان کے وجود کو گوارا کرنے کو تیار ہے۔ ان کا یہ اعلان کردہ ہدف ہے کہ افغانستان' پاکستان' بھارت اور بنگلہ دیش سے اسلام کو

ختم کر دو۔ وہ ان سب علاقوں کو یاد کرتے ہیں جن میں کسی بھی زمانے میں ان کی حکومت رہی۔ صرف پاکستان پر ہی نہیں افغانستان پر بھی ان کا کلیم ہے۔ دریائے آمو تک جو سرحد بنتا ہے افغانستان اور روس کے درمیان۔ یہ طوفان کم از کم دو مرتبہ تاریخ میں جس طرح اٹھا ہے' وہ انتہائی بھیانک تھا۔ اب اگر انسان کی ماضی پر نگاہ ہو تو اس کو بھولنا نہیں چاہئے۔ شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیر دکن میں پچیس برس تک مرہٹوں کے ساتھ لڑنے میں مصروف رہے' ایک دن کے لئے بھی دار الخلافہ نہیں آئے۔

میرے نزدیک حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارناموں کا سب سے بڑا مظہر اورنگ زیب تھے۔ اس مغلیہ خاندان میں جس میں اکبر ہوتا تھا جس میں جہانگیر ہوتے تھے، جو شراب کے ایک پیالہ کے عوض حکومت دے بیٹھتے تھے' عالمگیر جیسی شخصیت دراصل نتیجہ تھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کام کا۔ اس نے ایک طرف ہمہ اوستی تصورات کو ختم کیا اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ کو ختم کر کے۔ حقیقت یہ ہے کہ دارا شکوہ تصوف کی آڑ میں وہی کام کر رہا تھا جو اکبر نے کئے تھے' دینِ الٰہی کا ایک ملغوبہ تیار کیا جا رہا تھا تاکہ اسلام کا تشخص ختم کیا جاسکے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے نہ صرف یہ کہ تصوف کے راستے اسلام پر حملہ روکا بلکہ دوسری طرف اس عسکری قوت کی کمر بھی توڑی جو مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کے لیے ابھر رہی تھی۔ دکن میں وہ مرہٹوں کی اسی قوت سے ربع صدی تک برسرِپیکار رہا اور اسے کچل کر خود بھی وہیں دفن ہوا۔

ایک ہی سو برس کے بعد وہ قوت پھر ابھری۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں جرمنی کی طرح کی مردم خیزی ہے۔ ایک صدی میں وہ قوم دو مرتبہ برباد ہو کر پھر اٹھ کھڑی ہوئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ مہاراشٹرا کا علاقہ ہے۔ یہیں سے شیواجی ابھرا تھا' یہیں سے مرہٹے دوبارہ اٹھے اور پورے ہندوستان پر چھا گئے۔ دلی کے لال قلعہ میں بیٹھے ہمارے مغل بادشاہوں کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ ایسے میں ایک مردِ درویش حالات کا مشاہدہ اور مستقبل کا نظارہ کر رہا تھا۔ وہ علمی اور تجدیدی کام کرنے والی شخصیت تھی جس نے نہ کوئی تحریک اٹھائی نہ کبھی شمشیر و سناں ہاتھ میں لی اور نہ کسی محلاتی جوڑ توڑ میں شرکت کی۔ دیکھئے تجدیدِ دین کے ساتھ سیاسی اور عسکری حکمتِ عملی یوں جڑ جایا کرتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا کہ اب اس امڈتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کو ہندوستان میں کوئی طاقت موجود نہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو بچانا ہے تو ادھر کا رخ کرو۔ احمد شاہ ابدالی آتا ہے اور سو برس بعد بلکہ اس سے بھی کم مدت میں مرہٹوں کی قوت پھر توڑی جاتی ہے۔ اس کے دو سو برس کے بعد جس میں انگریزوں

کی حکومت کے سو برس بھی شامل ہیں جب ہندو مسلم دونوں دب گئے تھے' ایک بار پھر ہندوؤں کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ تعلیمی اعتبار سے' معاشی و سیاسی اعتبار سے' ووٹوں اور گنتی کے اعتبار سے' ملازمتوں کے اعتبار سے وہ آگے بڑھ گئے۔۔ لیکن بہرحال اس طرح کی کوئی عسکری تحریک مسلمانوں کے خلاف اس دور میں اٹھنی ممکن نہیں تھی۔ تاہم ہندو کا جذبہ اندر ہی اندر لاوے کی طرح کھولتا رہا۔ اب پچھلے چونسٹھ (۶۴) برس سے وہاں ایک تحریک موجود ہے' آر ایس ایس نام کی جو ہندوستان میں مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے جذبے کے ساتھ وہاں سے ابھر رہی ہے۔ گویا معاملہ پھر کچھ اسی نوع کا ہے جس کا نقشہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا تھا۔

از خاکِ سمرقندے' ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے' ہنگامہء چنگیزے

یہ ہیں وہ حالات جن کے اعتبار سے میرے نزدیک پاکستان کی سالمیت کا معاملہ صرف پاکستان کے لئے نہیں بلکہ اس پورے علاقہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لئے نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ میری سوچ کا وہ دوسرا رخ ہے جس کے بارے میں بعض ساتھیوں کو بدگمانی رہتی ہے کہ میں کسی وہم کا شکار ہوں۔ کوئی مجھے "ایکس پلائٹ" کر رہا ہے' اسلام کے نام پر' سندھ کے نام پر۔

عدمِ استحکام کا اصل سبب

میری سوچ کا تیسرا رخ وہ ہے جس پر رمضان المبارک کے بعد کئی خطباتِ جمعہ میں روشنی ڈالی گئی۔ یہ کہ احتجاجی' مطالباتی اور مظاہراتی سیاست میں کہاں کہاں کامیابی ہوئی' کہاں ناکامی ہوئی۔ یہ پوری ایک تاریخ ہے جو میں نے اس حوالے سے مرتب کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کے عدم استحکام کا سب سے بڑا سبب یہاں سیاست کے میدان میں اسلام کا نعرہ لگانا ہے' کھوکھلا اور خالی نعرہ۔ اسلام جیسا کچھ ہمارے ہاں ہے سب کو معلوم ہے' عوام کا بھی اس سے جو تعلق ہے وہ سب جانتے ہیں۔ اس کے جو تجزیئے مولانا مودودی نے کئے تھے وہ "تحریک جماعت اسلامی" میں دیکھ لیجئے۔ اصلاحی صاحب نے کہا تھا کہ سانپوں کی اقسام گنی جا سکتی ہیں' مسلمان کی قسمیں نہیں گنی جا سکتیں حالانکہ مسلمان تو ہوتا ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا پابند۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام

کا پابند مسلمان تو اب چراغِ رُخِ زیبا لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے' لیکن سیاست کے میدان میں یہاں اسلام کا نام خوب چلتا ہے۔ اسلام کا کھوکھلا نعرہ لگانے میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں۔ پاکستان کے عدم استحکام کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ یہ میری پختہ سوچ ہے اب میں ساٹھ کے پیٹے میں ہوں آپ کو میری اس سوچ کے بارے میں غور کرنا چاہئے۔ غلط معلوم ہو تو مجھے سمجھایئے اور اگر میں اڑا رہوں تو مجھے میرے حال پہ چھوڑ جایئے۔ نیمے دروں نیمے بروں ساتھ چلنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ریلے تو آتے رہیں گے' ایک آیا اور آپ بہہ گئے تو دوسرا بھی آسکتا ہے۔ میرا تجزیہ بہر حال یہ ہے جو میری تقاریر اور کتابوں میں آپ کے سامنے آتا رہا ہے۔

ہمارا معاشرہ سیکولر ہے

اگر آپ پورے بیالیس سال کی تاریخ کا جائزہ لیں گے اور اس قوم کے احساسات' اس کی فکر اور سوچ' اس کی اقدار' اس کے رہن سہن' اس کی زندگی کے معاملات کا مشاہدہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ سب کچھ خالص دنیاداری کے گرد گھومتا ہے اور دنیاداری ہی سیکولرازم ہے۔ سیکولرازم میں مذہب کی نفی نہیں ہوتی' مذہب کو زندگی کے ایک حصے میں محدود کر دیا جاتا ہے۔ سیکولرازم کے معنی مذہب کی مخالفت نہیں نہ مذہب کی نفی ہے بلکہ اس میں مذہب کو آپ کے عقائد' آپ کی عبادات' آپ کے شادی بیاہ' وراثت وغیرہ کے قوانین جنہیں پرسنل لاء کہتے ہیں اور فوتیدگی و پیدائش وغیرہ کی رسومات تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ باقی جو اصل زندگی ہے' کاروبار ہے' سیاست ہے' معاشرت ہے' معیشت ہے' اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اپنی زندگی کا ہر شخص جائزہ لے لے۔ کیا ہم میں سے ایک ایک شخص کا تعلق مذہب کے ساتھ محض عقائد' عبادات و رسومات تک محدود نہیں ہے! رہا ہمارا معاش' ہمارا رہن سہن' ہمارا تمدن اور شب و روز کی زندگی کا پورا نقشہ تو اس پر اقبال کا یہ شعر ہی کافی ہے کہ ۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اسلام کا کھوکھلا نعرہ مارشل لاء کی راہ ہموار کرتا ہے

لیکن اسلام کا نعرہ لگا کر اور جذباتی ہنگامے کھڑے کر کے ملک کی اس گاڑی کو پٹڑی پر چلنے نہیں

دیا گیا۔ سب سے پہلے ۵۳ء کی ختم نبوت تحریک نے اس کو پنسری سے اتارا' اس کے بعد جب ذرا استحکام کے آثار پیدا ہوئے کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس ہنگامہ آرائی کی سیاست کو مارشل لاء والوں نے استعمال کیا اور خوب استعمال کیا۔ فوج کو اور کیا چاہئے۔ حکومت کرنا کسے پسند نہیں اور نظام حکومت درہم برہم ہو جائے تو فوج کو دلیل ہاتھ آجاتی ہے۔ صدر ایوب نے محض اسی دلیل پر اپنی حکومت کی بساط بچھائی اور صرف چند سال پکا مارشل لاء رکھ کر انہوں نے نیم سیاسی نظام حکومت بہت جلد بحال کر دیا۔ لیکن ضیاء الحق صاحب نے اس دلیل کے ساتھ ساتھ اسلام کا نعرہ بھی اپنا لیا۔ وہی نعرہ جو پہلے مخالف قوتوں کے پاس ہوتا تھا جب سرکاری سرپرستی میں آگیا تو گیارہ سال جو مزے اڑائے گئے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ لیکن یہ حکمت عملی ملک کے لئے تباہ کن ہے۔ میں خود جمہوریت کے میدان کا آدمی نہیں' بحالیء جمہوریت کی تحریک میں میں شامل نہیں ہوا' کسی انتخابی معرکہ میں شامل ہونے کا سوچا بھی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پر جمہوریت آنی چاہئے اور اگر جمہوریت نہ ہوگی تو ملک کے مزید حصے بخرے ہونے کے امکانات شدید تر ہو جائیں گے۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ۱۹۸۰ء سے میں یہ بات ضیاء الحق صاحب سے کہہ رہا ہوں۔

ہمارا موقف: جمہوریت کی تائید اور انقلاب کے لیے محنت

———— میرا موقف اور طریقہ کار کیا ہے؟ دو جملوں میں عرض کر رہا ہوں۔ تائید جمہوریت کی اور محنت انقلاب کے لئے۔ اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں' اپنی صلاحیتیں اسی میں کھپائیں۔ مولانا مودودی کے ساتھ اپنے اختلاف کو بھی دو جملوں میں بیان کر چکا ہوں۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے دو کام کئے' ایک صدفی صد صحیح اور دوسرا صدفی صد غلط۔ مطالبہء دستورِ اسلامی کی مہم چلائی جس کا قرار دادِ مقاصد میں بہرحال حصہ ہے' یہ بہت درست کام ہوا۔ انتخابات میں حصہ لیا' یہ صدفی صد غلط۔

اس کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے دو کام کئے۔ ایک جمہوریت کی تائید اور آمریت کی نفی' دوسرا بحالیء جمہوریت کی مہم میں خود اپنی پوری جماعت کو لے کر کود پڑنا۔ دوسرا حصہ غلط تھا' تائید والا پہلا حصہ درست۔ آمریت کی مخالفت اور جمہوریت کی تائید ہونی چاہئے تھی لیکن خود آپ نے انقلاب کے لئے جو ایک گھروندہ بنایا تھا' کچھ لوگ جمع کئے تھے' ان کی تربیت ہوئی تھی اور ان کو منظم کیا گیا تھا۔ اس قافلے کو اسی رخ پر بڑھتے رہنا چاہئے تھا۔ تائید ضرور کی

جاتی جمہوریت کی اس لئے کہ ملک کی سالمیت کا معاملہ جمہوریت کے ساتھ وابستہ ہے' لیکن خود بحالیء جمہوریت کی تحریک میں پڑ کر حاصل کیا ہوا! ۔ جمہوریت جب بھی آئی' خالص سیکولر ہی آئی اس لئے کہ قوم سیکولر ہے۔ اپنی سوچ میں' اپنے اخلاق میں' اپنے معاملات میں اور اپنی اقدار میں سیکولر ہے۔ چنانچہ جب بھی جمہوریت آئے گی' سیکولر ہی آئے گی۔

پاکستان کے ساتھ تنظیم اسلامی کے اور میرے رویّے کے یہ عناصر ترکیبی ہیں جن کے حوالے سے موجودہ سیاسی فضا میں آپ کو بھی سوالات سے سابقہ پڑتا ہے اور میرا بھی ہر روز ایک نئی صورت حال سے سامنا ہے۔ اپنے فکر کی یہ بنیادیں آپ پر واضح ہوں تو آپ اپنی جگہ جازم اور مستقیم رہیں گے اور سوالات کے شافی جواب دے سکیں گے لیکن یہی موقف آپ پر واضح نہیں یا اس پر دل ٹھکتا نہیں اور اس کے لئے شعوری مواد آپ کے پاس موجود نہیں تو آپ مخالف کے اعتراضات کا جواب نہیں دے پائیں گے' ہزیمت ہوگی جس کا نتیجہ بد دلی ہو گا۔ یہ بد دلی پھر آپ تنظیم میں پھیلائیں گے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آزمائش کے اس دور کے دو طرح کے نتیجے نکل سکتے ہیں۔ یا تو تحریک کو ایک ابھار ملتا ہے یا وہ دم توڑ دیتی ہے۔ جس بد دلی کا میں نے ذکر کیا' اس کا منطقی نتیجہ تحریک کی موت ہے۔

مذہبی جذبات بھڑکانا مناسب نہیں

جو موقف میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے' اس میں تین چیزیں موجودہ حالات میں ہمارے طرزِ عمل کی بنیاد ہیں۔ ایک یہ کہ ہمیں ہر حال میں جمہوریت کی تائید کرنی ہے۔ ویسے تو حالات الحمد للہ ایسے نظر آ رہے ہیں کہ جلد کسی مارشل لاء کی نوبت آنے کا اندیشہ کم ہے تاہم ہمیں اپنی گفتگوؤں سے اور اپنے وسائل کے ذریعہ اس فکر کو عام کرنا ہے کہ مارشل لاء یہاں کسی صورت میں نہیں آنا چاہئے۔ وہ مہلک ہے اس ملک کے لئے۔ جو تبدیلی آئے وہ دستور کے دائرے کے اندر اندر ہو۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ معاشرے کی عام سطح کے مطابق یہاں سیاست میں سب کچھ ہو گا۔ ممبروں کی خرید و فروخت بھی ہوگی کیونکہ دولت کے انبار دونوں طرف ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ایک توازن سا بھی قائم نظر آتا ہے۔ دستور میں بھی کوئی ترمیم ضروری سمجھی جائے تو اسی طریقہ ٔ کار سے ہو جو خود دستور میں طے کر دیا گیا ہے۔ ہماری سیاست کی گاڑی دستور کی پٹڑی پر چڑھی رہنی چاہئے۔ اس سلسلے میں ہم اخلاقی دباؤ جتنا بھی ڈال سکتے ہیں' ڈالنا چاہئے۔ یہ ملحوظ رہے کہ افراد کی فکر بھی ایک اخلاقی قوت ہوتی ہے جو اگر ان

میں راسخ ہو تو معاشرے میں یہ فکر نفوذ کر جاتی ہے' خود بخود پھیلتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مذہبی جذبات کو بھڑکا کر' بالکل انمل بے جوڑ متحدہ محاذ بنا کر اور غیر تربیت یافتہ عوام کو میدان میں لا کر ہنگامہ کرنا ملک کے لئے مہلک ہے۔ میں نے تین الفاظ بہت ہی سوچ سمجھ کر کہے ہیں' کسی مذہبی مسئلہ پر مذہبی جذبات بھڑکا کر' پھر ایک جماعت یا ایک قیادت کے تحت نہیں بلکہ انمل بے جوڑ متحدہ محاذ بنا کر جبکہ نظریہ ایک نہیں' فکر ایک نہیں' ایک دوسرے پر کفر کے فتوے ہوں بلکہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کے بھی روادار نہ ہوں' لیکن کسی ایک مسئلہ پر جذبات بھڑکا دیئے جائیں اور جمع ہو جائیں اور پھر غیر تربیت یافتہ افراد کو میدان میں لا کر ہنگامہ کھڑا کر دینا۔ ہم کبھی اور کسی صورت اس طرز عمل کی تائید نہیں کریں گے چاہے ہماری مخالفت میں فضاء کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو جائے' چاہے ہمارے گھروں پر حملے شروع ہو جائیں اور ہمیں کسی کا ایجنٹ کہا جائے لیکن ہمیں اس ر، خ پر نہیں جانا ہے' اس کی نفی کرنی ہے' اس کی تردید کرنی ہے۔

انقلابی نہج پر جدّوجہد کو تیز کرنا ہوگا

اور تیسری بات یہ کہ ہمیں اپنی اصل محنت اور مساعی کو انقلابی نہج پر مرتکز رکھنا ہے اور اس میں تیزی اختیار کرنی ہے۔ اس لئے کہ جب تک وہ تیزی نہیں آئے گی' کوئی حرکت پیدا نہ ہو سکے گی۔

ہمیں نظر آ رہا ہے کہ عالمی سطح پر جو کچھ ہو رہا ہے اور خود اپنے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس ملک کے ٹکڑے کر کے چھوڑے گا۔ لوگ اس پر تلے ہوئے ہیں۔ کچھ برملا کہتے ہیں کہ ٹکڑے کر دیں گے اور کچھ کا طرز عمل یہ ہے کہ ہوتا ہے تو ہو جائے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ صورت حال کے بارے میں میرے اس پورے تجزیئے سے آپ کو اتفاق ہے تو آپ کو اپنی جدوجہد تیز کرنی ہوگی۔ مثبت کام کئے بغیر کسی طرز عمل کو غلط کہتے رہنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میرا ذہن آج ان اشعار کی طرف منتقل ہو رہا ہے' جو کبھی میں نے "عزم" میں شائع کئے تھے۔ ان اشعار میں ایک پیغام تھا۔ ان میں سے چند آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ ؎

ساتھیو مشعلوں کو تیز کرو
جنگ بازوں کا ملک گیروں کا
قافلہ تیز گام ہے کتنا
اور بھی قافلوں کو تیز کرو

دو اعتراضات

ہمارے اس موقف پر دو اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جمہوریت تو پھر لادینی آئے گی اور آ رہی ہے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ جیسی قوم ہوگی ویسی ہی جمہوریت آئے گی۔ اسے ہمیں ذہناً قبول کرنا ہے کیونکہ اسی معاملے کو اشکال بنا کر لوگ آپ کو چھیڑیں گے۔ پھر یہ کہ اس کے ساتھ اباحیت بھی آئے گی' بے پردگی اور فحاشی بھی آئے گی۔ اس لئے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں جمہوریت ہے بدقسمتی سے یہ وہ لوگ ہیں جن کے نظریات وخیالات' طرز زندگی' رہن سہن اور مغربیت پرستی اظہر من الشمس ہے۔ قوم کی تقدیر ان کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ جمہوریت کے علمبردار اور پرستار کسی زمانے میں کچھ اور لوگ ہوا کرتے تھے لیکن اب جو لوگ جمہوریت کا علم بلند کرتے ہیں' ان کا حال کس سے پوشیدہ ہے۔ مغربیت اور اباحیت دونوں متحارب گروہوں میں یکساں ہے جس کے خلاف ہمیں اپنی تحریک کو تیز کرنا ہے۔ یہ نہی عن المنکر باللسان کی تحریک ہے' بالقوت نہیں' اس لئے کہ ہمارے پاس ابھی مطلوبہ قوت موجود ہی نہیں۔ اس طاقت کو تو ابھی فراہم کرنا ہے۔ فی الحال تو احتجاج کیا جائے گا مظاہروں کی شکل میں' کارنر میٹنگ کی شکل میں' تاکہ یہ بات سامنے آ جائے کہ ہم ان چیزوں کے خلاف ہیں۔

پُرامن احتجاجی مظاہرے کثرت سے کیے جائیں

تاہم ہم اس سلسلے میں کوئی بدامنی پیدا کر دینے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ایسا کرنا اس ملک کی سالمیت اور استحکام کے لئے خطرناک ہوگا۔ یہ بات اگر ہم صرف زبان سے کہیں گے تو اس کا اثر نہیں ہوگا لیکن اگر ہمارے مظاہروں کا اور کارنر میٹنگز کا سلسلہ جاری رہے جو پچھلے دنوں لاہور میں سلسلہ شروع بھی ہوا تھا تو میں سمجھتا ہوں کہ بالخصوص بڑے شہروں میں یہ کام کرنے کا بڑا ہی مناسب موقع ہے۔ لوگوں سے کہا جائے کہ یہ سب ہمارے ہی کرتوت اور ہمارے ہی اعمال ہیں۔ جو آج ہم پر مسلط نظر آتے ہیں۔ ہم نے مغربی تہذیب کو اختیار کیا' ہمارے گھروں میں مغربی تہذیب رائج ہے اور یہ سب کچھ اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ آج ایک عورت ہم پر حکمران ہے۔ عورت کا جن ہم نے بوتل سے نکالا ہے' ہم اسے گھروں سے باہر لائے ہیں۔ جب تک کہ ہم اپنے طرز عمل میں تبدیلی نہیں لائیں گے اور دین کی طرف حقیقتاً اور عملاً نہیں پلٹیں گے' ایک سے بڑھ کر ایک لعنت ہمارے سروں پر مسلط ہوگی۔ حضورؐ نے تو فرمایا تھا کہ میں نے اپنی امت کے لئے عورت سے بڑھ کر

کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔ وہ فتنہء خواتین اس وقت سامنے ہے لیکن کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ وہ اس میں موردِ الزام نہیں بنتا' اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

شر میں خیر کا ایک پہلو

ایک تو یہ کام ہمیں کرنا ہے کہ نہی عن المنکر کے ضمن میں جو ہماری احتجاجی تحریک ہے اس کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ دوسرے ایک حقیقت کو سامنے رکھئے کہ ہر شر میں ایک خیر ہوتا ہے۔ شرِ محض کا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ نہ باطلِ محض کا کوئی وجود ہے' نہ شرِ محض کا۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی بات میں شر کا پہلو غالب ہے تو کسی میں خیر کا۔ جیسے فرمایا گیا شراب اور جوئے کے بارے میں۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں فائدے کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں بلکہ فرمایا گیا کہ ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ بڑا ہے اور پوری شریعت میں یہی حکمت کار فرما ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سیکولر جمہوریت کا کھُل کر سامنے آنا' اباحیت کا فروغ اور مغربی تہذیب کا اپنی سب قباحتوں کے ساتھ بے حجاب ہو جانا بھی خیر کا ایک پہلو رکھتا ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں دین کی غیرت اور شریعت کی حمیت موجود تو ہے لیکن دبی ہوئی چنگاری کی مانند ہے' وہ اب بھڑکے گی۔ منافقانہ اسلام ان جذبات کو دباتا اور تھپکی دے کر سلاتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر راگ رنگ اور ڈراموں میں بے حجابی و عریانی کے ساتھ اذان اور مذہبی پروگرام بھی چلتے رہیں، سیرت کانفرنسیں بھی ہوں اور عورتوں کو گھروں سے نکال کر اسمبلیوں اور وزارتوں میں ان کا حصہ بڑھایا بھی جا رہا ہو تو یہ جذباتِ غیرت و حمیت ابھرتے نہیں۔ نیمے دروں نیمے بروں کی کیفیت لوگوں کو کشمکش و پیچ میں مبتلا کئے رکھتی ہے۔ ہمارے ملک میں یہی کچھ ہوتا رہا۔ ۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اب جمہوریت آئی ہے اور اپنے منطقی تقاضے کے مطابق سیکولر آئی ہے تو اس میں وہ پہلی سی لیپا پوتی نہیں رہی۔ یہ بات سب لوگوں کو جمہوریت کی آرزو اور اس کے لئے جدوجہد کرنے سے پہلے ہی سوچ لینی چاہئے تھی۔ اگر اس ملک کی سالمیت کے لئے جمہوریت لازمی ہے تو موجودہ صورت حال کے مقابلے کا پروگرام بھی بنایا جانا چاہئے تھا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ اگر جمہوریت یہاں مستحکم ہو گئی تو اسلام کا راستہ رک جائے گا۔

یہ بات پہلے بھی کہی جاتی تھی اور اس کے جواب میں مولانا مودودی مرحوم کا یہ جملہ ریکارڈ پر ہے کہ یہ جو سیاسی شیاطین آپس میں لڑ رہے ہیں' اسی لڑائی کے شر میں سے ہمارے لئے خیر کا راستہ نکلے گا اور جتنے یہ آپس میں زیادہ لڑیں گے' اتنا ہی ہمارے لئے امکان ہو گا کہ یہاں پر کوئی اچھی تبدیلی برپا ہو سکے۔ میرے نزدیک اس خیال کے پیچھے ایک پورا فلسفہ ہے۔

جماعت اسلامی کے حلقوں میں اور دیگر مذہبی اور دینی جماعتوں میں یہ بات عام طور سے زبانوں پر آتی ہے کہ اگر ہم یہاں اسلام نہیں لا سکے تو کسی اور نظریئے یا نظام کو بھی تو ہم نے قدم جمانے نہیں دیئے۔ یہ طرز فکر بہت خطرناک ہے۔ میری رائے میں ہمارے ملک میں عدمِ استحکام کا ایک بڑا سبب یہی طرز فکر ہے۔

کوئی مستحکم جمہوریت بھی انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتی

انقلاب کے بارے میں میری رائے اچھی طرح سمجھ لیجئے' کوئی مستحکم سے مستحکم جمہوریت بھی انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتی۔ انقلاب کا راستہ تو بادشاہتیں نہیں روک سکیں' زارِ روس کی فوجیں اور شہنشاہِ ایران کا اسلحہ خانہ انقلاب کا راستہ نہیں روک سکے۔ انقلاب کی کچھ اپنی شرائط ہوتی ہیں' اس کے کچھ مطالبات ہوتے ہیں' آپ وہ پورے کر دیجئے پھر کوئی طاقت انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتی۔

مغربی طرز کی جمہوریت میں بھی جو تماشا لوگوں کو نظر آتا ہے وہ کچھ اور ہوتا ہے اور پس منظر میں کچھ اور ہوتا ہے۔ سامنے تو یہ الیکشن لڑتے ہوئے مہرے آپ کو نظر آتے ہیں' ان کے پیچھے لابیاں کام کرتی ہیں۔ جس طرح میں نظری سیاست اور عملی سیاست کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں اسی طرح آج ایک اور اصطلاح سن لیجئے کہ ایک ہے براہ راست سیاست' ایک ہے بالواسطہ سیاست۔ امریکہ میں بھی لابیاں بنی ہوئی ہیں' جن پر کروڑوں اربوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ یہ لابیاں بالواسطہ طور پر سیاست پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بظاہر کچھ کٹھ پتلیوں اور نمائندوں کا کھیل ہو رہا ہوتا ہے۔ جن کو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ "اعضائے مجلس کی گرمی الاماں" لیکن پیچھے طاقتور لابیاں کار فرما ہوتی ہیں جو خود کبھی سامنے نہیں آتیں۔

جمہوری نظام میں پریشر گروپس مؤثر ہوتے ہیں

جمہوری نظام میں دوسری اہم کار فرما قوت پریشر گروپس ہوتے ہیں' جو معاملات کو اپنی

مرضی کا رخ دیتے ہیں۔ پھر جمہوری نظام ہمیں پر امن احتجاج' مظاہرے اور ایجی ٹیشن کا حق دیتا ہے۔ جمہوریت صرف انتخابات کا نام نہیں ہے' آپ پر امن مظاہرے اور ایجی ٹیشن کے ذریعے بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا! یہ تمام راستے ایسے ہیں جن کے ذریعے جمہوریت کے اندر بھی اسلام کے لئے کام کیا جاسکتا ہے اور مسلسل جاری رکھا جاسکتا ہے۔ یہ کام ہمیں کرنے ہیں' اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے ہمت دے' اپنے اس فکر پر استقامت اور انشراح عطا کئے رکھے۔ ہمیں زیادہ آگے جانے کی اور جان و مال کھپانے کی توفیق دے' ہمیں اس رُخ پر چلنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اصل توجہ اپنی تنظیم اور تربیت پر مرتکز کرتے ہوئے اپنی صفوں کو ترتیب دینا ہے اور اپنے کاڈرز بنانے ہیں تاکہ ایک وقت آئے کہ ہم پھر میدان میں آکر کہہ سکیں کہ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ فلاں غلط کام یہاں نہیں ہوگا یا ہم نہیں ہوں گے۔

ہدایات و تجاویز

اب کچھ ہدایات اور تجاویز ہیں جنہیں پلّے باندھ لیجئے۔ پہلی بات اپنے فکر پر صبر۔ اس کے لئے میں درخواست کرتا ہوں' ہدایت دیتا ہوں' حکم دیتا ہوں' جس لفظ سے بھی آپ کے اندر تھوڑی سی حرکت پیدا ہو جائے۔ ہر رفیق تنظیم کے لئے لازم ہے کہ وہ (۱) "تحریک جماعت اسلامی" (۲) "اسلام اور پاکستان" (۳) "سرافگندیم" (۴) "استحکامِ پاکستان" (۵) "استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ" اور (۶) "منہجِ انقلاب نبوی" کا مطالعہ ضرور کرے۔ پہلے پڑھ چکا ہو تو پھر پڑھے۔ پھر دیکھے کہ اس وقت کے حالات کے بارے میں کیا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس تجزیئے کے وزن اور توازن کو محسوس کیجئے' اس کا ادراک حاصل کیجئے! میں نے سندھ کے مسئلے کا بھرپور تجزیہ کیا ہے' اہل سندھ کے جائز مطالبات کی پُرزور تائید بھی کی ہے۔ اسی طرح میں نے پنجاب کا دفاع بھی کیا ہے۔ اگر ہوشیار پور اور جالندھر کے لوگوں کو اللہ نے صلاحیت دی ہے' انہوں نے پنجاب کی زمینوں کو آباد کیا' بہاولپور کی زمینوں کو آباد کیا' اس سے آگے سندھ کی زمینوں کو آباد کیا تو کوئی جرم نہیں کیا۔ البتہ پھر اس میں جو زیادتیاں ہوئیں' جود اود دہش کی گئی' سندھ کی زمینیں جرنیلوں اور سرکاری افسروں میں تقسیم کی گئیں' حلوائی کی دوکان پر نانا جی کی فاتحہ شروع ہو گئی' اصل خرابی یہ ہے۔ اگر اس کی اصلاح نہ ہوئی' اس کی تلافی نہ کی گئی تو پھر ایک ایک پنجابی کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی سندھ میں۔ جو بات جائز ہے اسے تسلیم کرنا چاہئے اور جذبات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہر فریق کے مسئلے اور

شکایت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

مگر اس وقت جذبات میں ابال ہے' لوگ بخار کی سی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ اس وقت تو شاید ہمیں یہ کہا جائے کہ پنجاب کے غدار اور سندھ کے ایجنٹ ہیں۔ یہ سارے امکانات ہیں' ان کے لئے ذہناً تیار رہنا چاہئے۔ میں تو تیار ہوں' آپ کو بھی تیار رہنا ہے۔ بہر حال یہ سب باتیں آپ پڑھیں گے تو بات سمجھ میں آئے گی۔

دوسری ہدایت یہ ہے کہ دعوت کے لئے کمر کس لیں یہ تو ہمارے کرنے کا کام ہے ہی۔ یہ سنہری موقع ہے۔ جب اس قسم کی فضا ہوتی ہے تو موقع ملتا ہے' سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ آپ سے الجھیں گے آپ ان سے بات کریں گے جواب دیں گے' لیکن پہلے اپنا گھر مضبوط ہو تو جواب دیں گے۔ آپ کے پاس دلائل ہوں' تجزیہ ہو' آپ اس سے واقف ہوں تو جواب دے سکیں گے۔ ورنہ خالی خولی آپ ٹکرائیں گے تو اس کا ایک ردعمل آپ کی طبیعت پر بھی ہو گا اور آپ تنظیم کے اندر بددلی پھیلائیں گے۔

طویل سیاسی جنگ کا سامنا ہے

موجودہ سیاسی صورت حال میں دو چیزیں اچھی نظر آرہی ہیں' مایوس کن پہلو تو اتنے ہیں کہ جتنے چاہے بیان کروں۔ امید کی کوئی کرن کبھی نظر آئے تو اس کو بڑی مضبوطی سے تھام لینا چاہئے۔ وہ جو عام طور پر سوچا جا رہا تھا کہ ایک ہی ہلے میں پیپلز پارٹی آئی جے آئی کو ختم کر دے گی یا آئی جے آئی پیپلز پارٹی کو ختم کر دے گا' یہ ہونے والی بات نہیں ہے۔ سیاسی جنگ جو ہو گی لمبی ہو گی۔ ربڑ کی طرح کھنچے گی' وہ جلدی ہونے والا معاملہ نہیں ہے۔ اگر فوج ہوتی اس پرانی ذہنی فضاء کے اندر تو وہ جھٹ پٹ اس انتشار کو اور بڑھا کر اقتدار پر قبضہ کر لیتی' لیکن اس وقت کچھ بین الاقوامی حالات اور کچھ فوج کے اپنے اندرونی احساسات مارشل لاء کی راہ میں روک بنے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی احساس ہو چکا ہے کہ بہت بدنامی فوج لے چکی ہے۔ اس لئے اب فوج جھٹ پٹ آگے نہیں بڑھے گی۔ اب تو لمبی سیاسی جنگ چلے گی۔ جن لوگوں نے ایک ہنگامہ سا اٹھانے کی سی کوشش کی تھی انہیں اس وقت بہت جلد مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہی مایوسی آپ کے لئے سنہری موقع فراہم کرتی ہے۔

یہ کام کرنے اور سمجھانے کا وقت ہے جو کارکن خلوص سے ایک دھن میں لگے ہوئے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ رابطہ رکھیں گے' انہیں بتائیں گے کہ بھائی بات یہ ہے کہ تم

ایک سراب کے پیچھے دوڑ رہے تھے' تمہارا طریقہء کار غلط تھا اور تم نے حالات کا صحیح اندازہ نہیں کیا' جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ یہ ہمارا ایک بہت بڑا فرض ہے اس لئے کہ کارکن جب مایوس ہو جاتے ہیں تو ان کے اندر دوبارہ زندگی پیدا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انہیں فوری طور پر مسیحائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ وہ ابھی غوطہ لگا رہا ہو' یہی وقت ہوتا ہے کہ آپ اس کو بچائیں اور یہ وقت بہت جلد آئے گا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں شروع ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ اب مسلم لیگ کی تنظیم نو کی باتیں شروع ہو چکی ہیں۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کا پھر دوبارہ اتحاد ہو گیا ہے۔ اُدھر سرحد میں محسوس ہوتا ہے کہ آئی جے آئی اپنی کوششوں میں ناکام ہو چکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آئی جے آئی میں جو مذہبی جماعتیں وقتی طور پر اہمیت حاصل کر گئی تھیں' ظاہر بات ہے کہ ان کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ اس وقت ان کے کارکنوں کے اندر بددلی پیدا ہوگی۔ آپ نے لنگر لنگوٹا کسا ہوا ہو گا تو یہ وقت ہو گا سمجھانے کا' ایسا نہ ہو کہ وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہیں۔ اگر ڈوب کر تہہ میں بیٹھ گئے تو ہمارے ہاتھ سے بھی گئے اور کسی کام سے بھی گئے۔ اس وقت اگر ان کے ذہنوں میں آپ یہ بات اتار سکیں کہ بھائی آپ جس نصب العین کے حصول کے لئے کوشاں ہیں اس کے لئے وہ طریقِ کار درست نہیں تھا جس پر آپ عمل پیرا تھے۔ صحیح طریق کار یہ ہے جس پر ہم کاربند ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں کہ خلوصِ دل سے کی گئی محنت اگر کسی سبب سے دنیا میں بار آور نہ بھی ہو تب بھی اللہ کے ہاں وہ رائیگاں جانے والی نہیں ہے۔ آپ نے اگر خلوص سے محنت کی تھی تو اس کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ پائیں گے۔ لیکن اب دوبارہ کمرِ ہمت کسنے کی ضرورت ہوگی۔ اور صحیح رخ پر اپنی جدّوجہد کو آگے بڑھانا ہو گا۔ کسی زمانے میں مجھے فیض کی ایک نظم بہت پسند تھی۔ اپنے قریبی حلقے میں بارہا میں نے وہ نظم سنائی بھی ہے' آج آپ بھی میری زبان سے سن لیجئے! ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنے کے بعد انقلاب کی راہ کے ایک صاحبِ عزم مسافر کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے' اس سلسلے میں یہ نظم ایک شہ پارے کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ فصل امیدوں کی ہمدم' اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی اب کے بھی اکارت جائے گی
دھرتی کے کونوں کھدروں میں پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو!
پھر مٹی سینچو اشکوں سے' پھر اگلے رُت کی فکر کرو!
پھر اگلے رت کی فکر کرو جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

دعوت کا کام جاری رہے

دعوت کے ضمن میں کم از کم لاہور کی حد تک ہماری پہلی ترجیح درسِ قرآن ہے یہی ذ،
ہے دین کی اصولی اور بنیادی دعوت کا البتہ اس وقت حالات کا تقاضا یا تبلیغی بھائیوں کی اصطلا
میں "امرِ حال" یہ ہے کہ آپ کی دعوت انہی چھ کتابوں پر مرتکز ہو جائے۔ درسِ قرآن
جو حلقے مستحکم چل رہے ہیں' ان کو مستحکم رکھیں' جاری رکھیں۔ بنیادی دعوت تو ہمیں اس
ذریعہ سے ہی دینی ہے۔ لیکن یہ چھ کتابیں آپ پڑھیں اور ان ہی کو پڑھائیں' زیادہ
زیادہ تعداد میں اپنے پاس رکھیں' لوگوں کو دیں' پھر ان سے ملیں۔ ان سے پوچھیں کہ
میں اگر کوئی اختلاف ہے تو بیان کریں' اگر بات صحیح ہے تو بتائیں۔ جن حالات سے ہم
وقت دوچار ہیں ان کا تقاضا ہے کہ آپ کی دعوت انفرادی سطح پر ہو اور ان کتابوں کے مطا
ترجیح دی جائے۔

مظاہرے بھی اہم ذریعہ ہیں

تیسری بات یہ ہے کہ نہی عن المنکر باللسان کے تحت اردو روزناموں میں عریان
فحاشی کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھیے۔ سات اگست کو اسلام آباد میں میرا د
قرآن ہوگا اور آٹھ کو وہاں مظاہرہ ہوگا۔ میں نے کمیونٹی سنٹر اسلام آباد میں تین بار د
قرآن کی منسوخی قبول کرلی مگر موضوع نہیں بدلا۔ اب یہ درس کمیونٹی سنٹر کے قریب ہی
مسجد میں ہو رہا ہے۔ موضوع وہی ہوگا "اسلام میں عورت کا مقام اور نظریۂ مساواتِ
زن اسلام کی نظر میں"۔ میرے کئی ساتھیوں نے کہا کہ آپ موضوع بدل دیجیے۔ میر
کہا نہیں' درس ہوگا تو اسی موضوع پر ہوگا۔ ہم اصولوں پر مصالحت نہیں کریں گے۔
انشاء اللہ اپنی دعوت اور فکر کو پھیلائیں گے اور اسلام آباد میں پھیلائیں گے۔ ہم عورت
سربراہی کے مسئلے کو ایجی ٹیشن کا موضوع بنانے کے حق میں نہیں کیونکہ کسی مذہبی مسئ
ہنگامہ کھڑا کر کے جمہوریت کو نقصان پہنچانا غلط ہے۔ لیکن دین کی تعلیم میں کسی قسم کی تر
اسے مسخ کرنے کی کوشش کو بھی ہم برداشت نہیں کرسکتے۔ ہمارے پاس جتنی طاقت ہے
دین کی فکر' سوچ اور تعلیم کو صحیح رخ پر برقرار رکھنے میں صَرف کریں گے۔

اگر اسلام آباد میں اللہ کو منظور ہوا اور میرا درس ہو گیا تو میری خواہش ہوگی کہ اسی
پر راولپنڈی میں بھی اخبارات میں بے پردگی اور عریانی کے خلاف اسی نوع کا خاموش احت

ظاہرہ ترتیب دیا جائے جیسا کہ اس سے قبل لاہور میں ہو چکا ہے۔ اور کوشش ہونی چاہئے کہ یہ
فقاءِ تنظیم کا ایک بھرپور مظاہرہ ہو۔ پھر لاہور میں ۱۶ر اگست کو، جیسا کہ ہم طے کر چکے ہیں،
یورپن اسٹیشن کے سامنے احتجاجی مظاہرہ ہونا چاہئے اور پچھلے تجربات کی روشنی میں اسے مزید
ر انداز میں ترتیب دیا جانا چاہئے۔ احتجاجی مظاہروں کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ یہ چیز
ارے طریقِ کار سے بھی مطابقت رکھتی ہے اور ہماری تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔

ظامِ جمعہ کو مزید محکم بنایئے

چوتھی بات خاص طور پر لاہور کے حضرات کے لئے یہ ہے کہ مسجد دارالسلام کے اجتماعِ
جمعہ میں شرکت کو آپ حضرات اپنا ایک دینی فریضہ سمجھئے۔ آپ نے اسے ابھی صرف ایک تنظیمی
ریضہ سمجھا ہوا ہے۔ دیکھئے عام لوگ جن کی نہ کوئی دعوت ہے نہ تحریک وہ تو جمعہ جہاں بھی پڑھ
یں گے ان کا جمعہ تو شاید ادا ہو جاتا ہو لیکن کسی دینی تحریک سے جو لوگ وابستہ ہوں در حقیقت
صل جمعہ تو ان کا ہے۔ حکمت اور فلسفۂ دین کے اعتبار سے تو حقیقی جمعہ ان کا ہو رہا ہے۔ نظامِ
جمعہ کی اہمیت کسی تحریک میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے۔ لاہور میں مسجد دارالسلام کا اجتماعِ جمعہ
ی طور سے ہونا چاہئے۔ مجھے رپورٹ ملی ہے کہ وہاں رفقاء کی حاضری اور نظم کی پابندی
تدریجاً بہتر ہو رہی ہے۔ "تدریجاً" کے لفظ میں ابھی کچھ کمزوری جھلکتی نظر آتی ہے۔ آپ
وگ اسے مزید پختہ کریں، اور اس بات کو سمجھیں کہ تنظیمی اور دینی تقاضے وہاں بتمام و کمال جمع
ہو جاتے ہیں۔ میری غیر حاضری نے اس میں قطعاً کوئی کمی نہ آنے دیں۔ آپ اپنے اس قسم
کے طرزِ عمل سے ثبوت دیتے ہیں کہ آپ کی وابستگی ایک شخص سے ہے، تنظیم سے نہیں ہے۔ یہ
ت اجتماعیت کے لئے مہلک ہے ________ ہم نے تو اس اجتماعِ جمعہ کو اپنی
ظیم کا اجتماع بنایا ہے اور اسی حیثیت سے اسے برقرار رہنا چاہئے۔

وتِ کار کا مظاہرہ۔ امید کی ایک کرن

ایک بات مجھے آئندہ ہونے والے طلبہ کنونشن کے حوالے سے عرض کرنی ہے۔ میں
نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان" کے پہلے باب میں اس امید کا اظہار کیا تھا کہ اس ملک کو
نے ہوئے اب چالیس برس ہونے کو آئے ہیں۔ اب یہاں ایک ایسی نسل پیدا ہو کر جوان
کی ہے جس پر غلامی کا داغ نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو میرے نزدیک امید کی ایک کرن کی
ت رکھتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اگر اس نسل کے سامنے کام کا کوئی نقشہ رکھا جائے

اور وہ اس کے دل میں اتر جائے تو اس کی قوتِ کار کو تعمیرِ نو اور احیائے دین کی راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ سرِ دست اسلام کے حوالے سے اس کا کوئی مظہر تو سامنے نہیں آیا لیکن اس نوجوان نسل کی قوتِ کار کا ایک مظہر ایک اور رنگ میں بہرحال ہمارے سامنے آیا ہے۔ جسے نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔

کراچی میں مہاجر قومی موومنٹ کی صورت میں نوجوانوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کے اظہار کو میں اسی سلسلے کی ایک کڑی شمار کرتا ہوں۔ ایم کیو ایم بنیادی طور پر نوجوانوں کی تحریک ہے۔ وڈیروں اور سرمایہ داروں کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے اصل کارکن 'اور قائد او جن لوگوں نے الیکشن لڑا' سب نوجوان ہیں اور میدانِ سیاست میں نووارد ہیں۔ سیاست میں انہوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کر دکھایا ہے۔ "مفت بازار" کی اسکیم میں انہوں نے حال ہی میں دو کروڑ کی مالیت کا سامان تقسیم کیا ہے۔ ان کی تحریک تنظیم پر بھی سنجیدگی سے توجہ دے رہی ہے۔ ان کے باقاعدہ تربیتی کیمپ منعقد ہو رہے ہیں۔ اور ایک اعتبار سے اقبال کے اس شعر کی تھوڑی بہت جھلک وہاں نظر آتی ہے کہ ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

امید کی یہ کرن میرے اُسی تجسس کا مظہر ہے جس پر گفتگو میں نے "استحکام پاکستان" میں تفصیل سے کی ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس کا رخ غلط ہے۔ صحیح رخ پر تحریک اٹھانا تو ہماری ذمہ داری ہے مگر ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہماری ملازمتیں' ہمارے کیریرز' ہماری کاروباری و گھریلو مصروفیات ہمیں ہلنے نہیں دیتیں۔ لیکن ایم کیو ایم کو دیکھئے' وہ تحریک غلط رخ پر سہی مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں الطاف حسین نے کہا ہے کہ اسی قسم کی تحریک پنجاب میں بھی اٹھنی چاہئے۔ معلوم نہیں وہ یہاں کون سی قومیت کی تحریک اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ ہمارے لئے چیلنج ہے۔ نوجوانوں کی قوتوں کو صحیح رُخ دینا ہمارا فرض ہے۔ آج وہ گولیوں سے ایک دوسرے کے سینے چھلنی کر رہے ہیں۔ اس رخ پر ڈالنے میں یقیناً ہماری بعض تحریکوں کی بھی غلطی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ کوتاہ ہمتی اور کوتاہ دستی ہماری ہے کہ صحیح رخ سامنے رکھتے ہوئے بھی اُسے پیش نہیں کر سکے۔ اس اعتبار سے میری نگاہ میں کراچی کی بڑی اہمیت ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہاں نظم کا معاملہ اب کچھ بہتر ہوا ہے۔ بھائی جمیل الرحمٰن صاحب نے اپنی پیرانہ سالی کے باوصف بڑی ہمت سے نظم کو سنبھالا ہے لیکن یہ

کرنے کا ہے۔ اللہ کرے کہ ہمارے نوجوان ایم کیوایم کی طرح کی کسی تحریک کو دین کے رخ پر موڑ سکیں یا یہ کہ نوجوانوں اور طلبہ کی تحریک کو جاندار انداز میں احیائے دین کے کام کے لئے اٹھا سکیں۔

تربیت گاہوں کی اہمیّت

اس موقع پر تربیت گاہوں کے موجودہ نظام کی طرف بھی آپ کو متوجہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ مبتدی اور منتظم رفقاء کی درجہ بندی کے ساتھ تربیت گاہوں کا جو سلسلہ میاں محمد نعیم صاحب نے شروع کیا ہے' اس کو ترجیحی بنیادوں پر پوری اہمیت کے ساتھ جاری رہنا چاہئے۔ میاں صاحب نہ صرف یہ کہ تربیت گاہوں کی جانب حسب سابق پوری توجہ دیں گے بلکہ اضافی طور پر احتجاجی مظاہروں اور کارنر میٹنگز کے پروگراموں کو بھی آرگنائز کریں گے۔ اس لئے کہ نہی عن المنکر باللسان کے معاملے کو اب ہمیں بڑے پیمانے پر شروع کرنا ہے۔ اقول قولی ھذا و استغفراللہ لی ولکم و لسائر المسلمین و المسلمات

الہدٰی

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصُول

سُورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۸)

"الہدیٰ" کے عنوان سے میثاق میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے وہ سلسلہ وار دروسِ قرآن شائع کیے جا رہے تھے جو چند سال پیشتر پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام "الہدیٰ" کے تحت نشر ہوتے تھے۔ ٹی وی کا یہ انتہائی مقبول سلسلہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ پر پہنچا تو اسے بعض مصلحتوں کی بنا پر بند کر دیا گیا تھا اور اس طرح سورۃ الحجرات بھی مکمل نہ ہو سکی تھی۔

قارئینِ میثاق کے علم میں ہو گا کہ دروسِ قرآن کا یہ سلسلہ "قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب" کے دروس پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر صاحب یہ منتخب نصاب متعدد مرتبہ بیان کر چکے ہیں اور حسنِ اتفاق سے اس کے تیس تیس منٹ کے دروس آڈیو کیسٹس میں بھی محفوظ ہیں۔ اس اشاعت سے "الہدیٰ" کے زیرِ عنوان انہی دروس کو ٹیپ سے اتار کر شائع کیا جا رہا ہے — سورۃ الحجرات کی آخری پانچ آیات کا درس پیشِ خدمت ہے۔

(ادارہ)

احمدہٗ واصلّی علیٰ رسولہِ الکریم ○ اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ○
قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

صدق اللّٰہ العظیم

"یہ بدّو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو تو اللہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشش والا' مہربان ہے"۔ مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر' پھر شک میں نہیں پڑے۔ اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ وہی ہیں جو سچے ہیں۔ کہئے' کیا تم اللہ پر جتلانا چاہتے ہو اپنا دین' حالانکہ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں' اور اللہ تو ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ وہ آپ پر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے۔ کہئے مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو' بلکہ اللہ تم پر احسان جتلاتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ سجھائی اگر تم فی الواقع سچے ہو۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کی ہر چھپی چیز اللہ کے علم میں ہے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو"۔

یہ سورۃ الحجرات کی آخری پانچ آیات ہیں۔ ان آیات کا مرکزی مضمون ہے اسلام اور ایمان کے مابین ایک فرق و تفاوت۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس سورۃ میں یہ مضمون کس نسبت و تعلق سے اور کس ربط کی بنیاد پر آیا ہے۔ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلامی معاشرہ یا اسلامی ریاست ایک نظریاتی معاشرہ اور نظریاتی ریاست ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلام عام معنی میں صرف ایک مذہب نہیں ہے کہ وہ صرف انفرادی زندگی سے بحث کرے اور صرف عقائد اور مراسم عبودیت ہی پر مشتمل ہو' بلکہ اسلام اس دنیا میں ایک نظام بناتا ہے' ایک معاشرہ قائم کرتا ہے' ایک حکومت اور ایک ریاست تعمیر کرتا ہے۔ یہاں ایک لازمی ضرورت از خود پیدا ہوتی ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ کون اس معاشرے میں شریک ہے' کون اس ریاست کا شہری ہے۔ اس کے لئے کوئی معین بنیاد فراہم کی جائے۔ پھر یہ کہ یہ بنیاد محسوس اور مشہود ہونی چاہئے جس پر حکم لگایا جاسکے' جس کے بارے میں رائے قائم کی جاسکے' جس کے ردّ و قبول کے لئے کوئی معیار بنایا جاسکے۔ یہ ہے وہ چیز جہاں سے اس مسئلے کا آغاز ہوتا ہے۔

اصولی اعتبار سے اسلام کی اصل جڑ ایمان ہے۔ ایمان ایک مخفی حقیقت ہے۔ یہ انسان کے قلب و ذہن کی ایک خاص کیفیت ہے جو خدا کے یقین' آخرت کے یقین اور نبوت و رسالت کے یقین سے وجود میں آتی ہے۔ یہ انسان کے باطن کا ایک پہلو ہے۔ اس کی بنیاد پر کوئی اجتماعی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ قانون کا موضوع نہیں بن سکتا۔ اس کی بنیاد پر دنیا میں فیصلے نہیں ہوسکتے۔ ہمارے پاس کوئی آلہ نہیں ہے کہ جس کے ذریعے سے ہم کسی کے دل میں جھانک کر دیکھ سکیں کہ ایمان موجود ہے یا نہیں' اور اگر موجود ہے تو کتنا ہے۔ لہٰذا دنیا میں کسی قانونی نظام کی بنیاد' کسی شہریت کی بنیاد' کسی معاشرے میں شمولیت کی بنیاد ایمان نہیں ہوسکتا' بلکہ کچھ مظاہر ہوں گے۔ کچھ ایسے پہلو کہ جو نظر آئیں' دکھائی دیں' جن کے عدم و وجود پر حکم لگایا جاسکے۔ وہ پہلو ہیں کہ جن کو معین کیا گیا ہے اور ان کو ارکانِ اسلام کا نام دیا گیا ہے۔ از روئے حدیث نبوی :۔ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ......... یہ مشہور حدیث متفق علیہ ہے۔ اس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ وہ کہتے ہیں' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے"۔ شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ۔ "اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں"۔ اب یہاں دیکھئے' لفظ "شھادۃ" استعمال کیا گیا ہے' یعنی گواہی' زبان سے اقرار۔ ایمان کا جو اقرار باللسان والا پہلو ہے وہ "اسلام" میں زیر بحث آئے گا۔ جو شخص

زبان سے گواہی دے کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ ہمیں اس سے بحث نہیں ہوگی کہ اس پر اس کا دل میں یقین بھی ہے یا نہیں' اس کی اس شہادت کو قبول کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد چار چیزیں ہیں جن کا التزام اس کے لئے ضروری ہوگا۔ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ' وَ اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ' وَ حَجِّ الْبَیْتِ' وَصَوْمِ رَمَضَانَ..... "نماز کو قائم کرنا' زکوٰۃ کی ادائیگی' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا" ۔ یہ ارکانِ اسلام ہیں۔ یہ شعائرِ اسلام ہیں جن کی بنیاد پر کسی شخص کو اسلامی ریاست کا شہری اور مسلمان معاشرے کا فرد تسلیم کیا جائے گا' اس سے ایک مسلمان کا سا معاملہ کیا جائے گا' مسلمان عورت سے اس کا نکاح جائز ہوگا' مسلمان باپ کی وراثت اسے مل جائے گی' اِلّا آنکہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص کسی ایسی بات کا بھی قائل ہے جس سے دین کی بنیادی باتوں میں سے کسی کی نفی ہوتی ہے۔ یہ بات ثانوی درجے میں اس کی تکفیر کی بنیاد بنے گی۔ لیکن جب تک کوئی ایسی چیز علم میں نہیں آتی اس وقت تک صرف ان ارکان کی بنیاد پر اسے مسلمان معاشرے کا ایک فرد اور اسلامی ریاست کا ایک شہری تسلیم کیا جائے گا۔ یہ ہے اسلام۔ اس فرق و تفاوت کو اس سورۂ مبارکہ میں بڑی ہی خوبصورتی اور بڑی ہی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ جیسا کہ قرآن مجید کا عام اسلوب ہے بہت سی آیات کا ایک خاص پس منظر ہوتا ہے جسے اس کا شانِ نزول کہا جا سکتا ہے اور اس سے یقیناً اس آیت کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے' لیکن آیت کے مفہوم کو عام (GENERALIZE) کیا جائے تو پھر وہ ابدی رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ ارشاد ہوا...... قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا...... "یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے" ۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ الحجرات مدنی سورت ہے اور اس کا اسلوب بتا رہا ہے کہ یہ مدنی دور کے بھی آخری زمانے سے متعلق ہے۔ اس دور میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں فیصلہ کن اقتدار اور اختیار کے مالک ہو چکے تھے۔ اُس وقت بہت سے قبیلوں نے یہ سوچا کہ اب مزاحمت جاری رکھنے کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اجتماعی سطح پر فیصلہ کیا اور مختلف قبائل کے وفود حضورؐ کی خدمت میں جوق در جوق حاضر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ ان لوگوں کا جو اسلام میں داخلہ ہوا ہے اور جس کا نقشہ قرآن مجید میں بایں الفاظ کھینچا گیا کہ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ظاہر بات ہے کہ یہ داخلہ نوعیت کے اعتبار سے بہت مختلف تھا اُس داخلے سے جو مکی زندگی کے آغاز میں ہو رہا تھا۔ جب حضرت ابوبکر اور حضرت حمزہ ایمان لائے ہیں۔ جب حضرت علی اور حضرت عمر ایمان لائے ہیں (رضی اللہ عنہم و ارضاہم اجمعین)۔

ایمان کچھ اور ایمان تھا، یہ ایمان کچھ اور ایمان ہے۔

ان لوگوں میں سے بعض کا قول نقل کیا گیا کہ یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا "(اے نبی ان سے) کہہ دیجئے تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو"۔ اس مغالطے میں مبتلا نہ ہو، ایمان تو چیزے دگر ہے، اک دوسری حقیقت ہے۔ تم ایک بات کہہ سکتے ہو...... وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ "یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں"۔ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ بالفظی ترجمہ کیجئے...... 'WE HAVE SURRENDERED' ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے۔ اسلام کے لفظی معنی "گردن نہادن" ہیں۔ یعنی مخالفت اور مقابلہ چھوڑ کر سپر ڈال دینا۔ یہ ہے اسلام۔ تو تم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ہو۔ یا اصطلاح میں یوں کہہ لو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ "اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے"۔ ابھی صرف اقرار' باللّسان کا مرحلہ طے ہوا ہے۔ تم نے زبان سے ان حقائق کا اعتراف کر لیا ہے لیکن ان حقائق پر جو یقین مطلوب ہے وہ ابھی تمہارے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔ یہاں دیکھئے کہ نفی کی تاکید کے لئے دو اسلوب آئے۔ یہ بھی فرمایا...... "لَمْ تُؤْمِنُوْا" (تم ایمان نہیں لائے ہو)۔ مزید تاکید کر دی گئی...... "وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" (اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا)۔

یہ بحث ہمارے اس منتخب نصاب میں حقیقتِ ایمان کے ضمن میں اجمالاً آچکی ہے۔ اس مرحلہ پر اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر اسلام اور ایمان کے الفاظ مترادفات کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں۔ ایک شخص میں جب یہ دونوں حقیقتیں بیک وقت موجود ہوں تو وہ مومن بھی ہے، مسلم بھی! دل میں نورِ ایمان ہے، ظاہر میں اسلام ہے، یعنی عمل اسلام کے مطابق ہے۔ نماز ہے، روزہ ہے، زکوٰۃ ہے، حج ہے، حلال اور حرام کی پابندی ہے۔ جب تصویر کے یہ دونوں رخ موجود ہیں اور تصویر مکمل ہے تو پھر تو انگریزی کا وہ محاورہ ہو گا کہ......

"CALL THE ROSE BY ANY NAME, IT WILL SMELL AS SWEET"

مومن کہہ لیں، مسلم کہہ لیں برابر ہے۔ اس معنی میں لفظ اسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں بھی آیا ہے۔ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل (علیہما الصلوٰۃ والسلام) دعا کر رہے ہیں، رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ یعنی پروردگار، ہم دونوں کو اپنا مسلمان بنائے رکھ، ہمیں اپنی فرمانبرداری پر کاربند رکھ، ہمیں

اس بات کی توثیق بھی کہ ہم تیری اطاعت میں سرگرم رہیں...... تو اس معنی میں اسلام بہت بلند حقیقت ہے اور ایمان اور اسلام مترادف اور ہم معنی ہیں۔ لیکن ایک پہلو سے ان کے مابین زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسلام اس دنیا میں ایک نظام کی بنیاد بن رہا ہے' ایک قانون کی اساس بن رہا ہے' اس کی بنیاد پر ایک معاشرہ تعمیر ہو رہا ہے' اس کی بنیاد پر ایک ریاست اور حکومت تعمیر ہو رہی ہے' اس کی اساس پر اس ریاست کی شہریت کا معاملہ طے ہو گا۔ جبکہ ایمان اس دلی کیفیت' یقین اور محبتِ خداوندی پر مشتمل ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی بنیاد پر آخرت میں معاملے طے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی شخص دنیا میں صرف مسلمان ہی نہیں مسلمانوں کا بہت بڑا قائد تسلیم کیا جائے اور آخرت میں حقیقی ایمان کے اعتبار سے وہ تہی دست اور محرومِ مطلق قرار دیا جائے اور جہنم کی آگ کے حوالے کر دیا جائے۔ تو معلوم ہوا کہ اس پہلو سے اسلام اور ایمان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

یہ مقام اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایمان اور اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل میں لا کر ایک کی نفیِ کُلّی کے باوصف دوسرے کا اثبات کیا گیا ہے۔ اور نفی کا بھی انتہائی تاکیدی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ جب فعل مضارع پر "لَمْ" لگا کر ماضی کی نفی کی جائے تو یہ انتہائی تاکید ہوتی ہے۔ مزید تاکید وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا) کے الفاظ سے ہو گئی۔ بایں ہمہ تمہارا اسلام قبول ہے...... وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا۔ "اور (اس حالت میں) اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر کاربند رہو تو تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کمی نہ کی جائے گی"۔ یہاں پھر دیکھئے کہ اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کے الفاظ میں اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسولؐ بالکل اسی طرح یکجا ہو کر آ رہے ہیں جیسے اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں آ چکا ہے: لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ۔ "اللہ اور اس کے رسولؐ سے آگے مت بڑھو!" یہ تمہارے اسلام کا ابتدائی اور اولین تقاضا ہے۔ اگر تم اس پر کاربند ہو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کرے گا۔ یہاں غور کیجئے کہ بظاہر توجیح صورت یہ نظر آتی ہے کہ بغیر ایمان کے کوئی عمل قبول نہ ہو۔ یہ بات منطقی ہے' معقول ہے' سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہاں اس کے برعکس بات کہی جا رہی ہے۔ ایمان کی اس نفیِ کُلّی کے باوجود نیک عمل کو سندِ قبول دی جا رہی ہے لیکن غور کیجئے کہ یہ نفیِ کُلّی حقیقی ایمان کے اعتبار سے ہے' قانونی ایمان کے اعتبار سے نہیں۔ اس ایمانِ حقیقی کی انتہائی مؤکد نفی کے باوصف ان کی اطاعت کو قبول کیا جا رہا ہے اور انہیں یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تمہارے اجر و ثواب میں سے

کوئی کٹوتی نہ ہوگی کوئی کمی نہ کی جائے گی۔

آیت کے آخر میں اللہ کی صفات کا حوالہ دیا گیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ "یقیناً اللہ تعالیٰ بخشش والا' مہربان ہے"۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اکثر آیات کے آخر میں اللہ کے اسماء و صفات میں سے کوئی ایک یا بالعموم دو اسماء جوڑوں کی شکل میں آتے ہیں اور یہ یونہی الل ٹپ نہیں آتے...... نعوذ باللہ من ذالک...... بلکہ ان اسماء یا صفات کا اس آیت کے مفہوم سے کہ جس کے آخر میں وہ آرہے ہوں' ایک بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ یہ اللہ کی شانِ رحیمی اور غفاری کے طفیل ہے کہ اس حالت کو بھی وہ قبول کر رہا ہے' اس میں بھی اگر اطاعت پر کاربند رہو گے تو اگرچہ اللہ نے تمہارے کان کھول دیئے ہیں اور تمہیں سنا دیا ہے کہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا' بایں ہمہ صحیح طور پر اللہ کی اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت پر کاربند رہو تو تمہارے اعمال میں سے کوئی کمی نہ کی جائے گی اس لئے کہ اللہ غفور ہے' رحیم ہے' بہت بخشنے والا ہے' بہت رحم فرمانے والا ہے۔ وہ بندوں سے اگر بالکل ناپ تول کا معاملہ کرے تو شاید کسی کو رستگاری نہ ہو سکے' کوئی بھی چھٹکارا نہ پاسکے۔ وہ بندوں کے ساتھ بہت ہی رعایت کا معاملہ کرتا ہے۔ اگر تم اس حالت میں بھی اطاعت پر کاربند رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال کے اجر و ثواب میں سے کوئی کمی نہ کرے گا۔

یہاں ذہن میں رکھئے کہ اس آیۂ مبارکہ کا مصداق دورِ نبوی ؐ میں تو صرف وہ لوگ تھے جو آخری زمانے میں اس طور سے ایمان لے آئے کہ ایک قبیلے نے بیٹھ کر طے کیا' پھر شیخ قبیلہ اور اس کے دو چار اور بڑے افراد وفد کی صورت میں آئے' انہوں نے اطاعت کی' اسلام لے آئے تو گویا کہ پورا قبیلہ اسلام لے آیا۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس حالت میں وہ دل کی دنیا تو یکسر نہیں بدل سکتی۔ الاماشاء اللہ۔ وہ تو ایک بالکل دوسرا مرحلہ ہے لہٰذا اس آخری دور میں جو لوگ ایمان لانے والے تھے ان میں سے کچھ لوگوں کی حالت کا نقشہ ان آیاتِ مبارکہ میں کھینچا گیا ہے' لیکن بعد کے ادوار میں آنے والے مسلمانوں میں سے اکثریت کا حال یہی ہے۔ یہ ذہن میں رکھئے کہ اس وقت جب رو چلی کہ سب لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں تو لوگ اسلام لے آئے۔ اسی طرح جب ایک مسلمان کے گھر میں جو بچہ پیدا ہوا وہ مسلمان' اس کی اگلی نسل چلی تو وہ بھی مسلمان تو اس طرح نسلاً بعد نسلٍ جو اسلام آیا ہے اور اس نے جو ایک امت اور ایک قوم کی شکل اختیار کی ہے تو اکثر کا حال یہی ہے۔ وہ ایمانِ شعوری' وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر یقین' انسان کے شعور اور اس کے قلب و ذہن میں ان حقائق کا اجاگر ہونا' یہ

کیفیت شاذ لوگوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

پہلے سورۂ آل عمران کی آخری آیات کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ تقلیدی ایمان تو پھر بھی کچھ لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے، لیکن جنہیں اکتسابی اور شعوری ایمان حاصل ہو وہ شاذ ہوتے ہیں، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اکثر و بیشتر کا معاملہ اسی صورت کے مشابہ ہے جو اس آیت میں سامنے آ رہی ہے کہ "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا" اس میں ہمارے لئے بڑی نوید جانفزا اور بڑی بشارت ہے کہ اگر ہم اپنے باطن میں جھانکیں اور یہ محسوس کریں کہ وہ ایمان کی مثبت حقیقت، وہ یقین کی کیفیت، وہ نورِ ایمان اس سے تو ہمیں حصہ نہیں ملا، اس میں ہم تہی دامن اور تہی دست ہیں، تب بھی مایوسی کی بات نہیں۔ اللہ کی شانِ رحیمی اور غفاری کا معاملہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر کاربند رہیں تو ہمیں اپنے اعمال کی پوری پوری جزا مل کر رہے گی۔ اگرچہ یہ بات واضح رہے کہ یہ اطاعت جزوی اطاعت نہیں کلی اطاعت مطلوب ہے۔ اطاعت صرف وہی قرار دی جائے گی جس میں پوری اطاعت ہو۔ یہ نہیں کہ جو چیز پسند آ گئی اس میں اطاعت کر لی اور جو بات کٹھن نظر آئی یا طبیعت کے لئے کچھ ناگوار ہوئی تو اس میں اس اطاعت کا قلادہ گردن سے اتار پھینکا۔ ایسی اطاعت قابل قبول نہیں۔ اطاعتِ کلی نہیں ہوگی تو معاملہ یہ ہوگا جو سورۃ البقرۃ میں آیا کہ: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ یعنی کیا تم ہمارے احکام، ہماری کتاب اور ہماری شریعت کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟ ایک حکم سر آنکھوں پر اور دوسرا حکم پاؤں تلے۔ اگر تم یہ کرو گے تو جان لو کہ کوئی اور سزا نہیں ہے ان کی جو اس جرم کا ارتکاب کریں سوائے اس کے کہ دنیا میں انہیں ذلیل و رسوا کر دیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔ اور کان کھول کر سن لو اللہ غافل نہیں ہے، بے خبر نہیں ہے اس سے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو۔ تو معلوم ہوا جزوی اطاعت اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت، کلی اطاعت کا نام ہے۔ اگر اس اطاعت پر کاربند رہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ غفاری اور رحیمی کے طفیل ہمیں یہ اطمینان دلایا ہے کہ ہمارے ان اعمال کی جزا میں سے وہ کچھ کاٹے گا نہیں۔

اس اطاعتِ کاملہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے حقیقتِ ایمان کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر اس اطاعت پر مسلسل عمل رہے تو اس کے نتیجے میں بھی ایک ایمان پیدا ہو جاتا ہے' جس طریقے سے انسان کا باطن اس کے ظاہر پر اثر ڈالتا ہے اسی طرح انسان کا خارج بھی اس کے باطن پر عکس ڈالتا ہے۔ اگر ایک انسان مسلسل اطاعتِ خداوندی اور اطاعتِ رسولؐ پر کاربند رہے تو اس کے نتیجے میں اس کے دل میں ایمان اور یقین کی ایک کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ ایمان شعوری ایمان کے درجے کو نہ پہنچے' ایک تقلیدی ایمان ہی ہو' لیکن یقین قلبی کی ایک کیفیت بہرحال پیدا ہو جائے گی۔ اس پہلو سے بھی گویا کہ اس میں ایک منطقی ربط نظر آیا کہ اگر تم اس اطاعت پر کاربند رہو تو تمہاری جزا میں سے بھی کچھ کمی نہ ہو گی اور اس کا یہ نتیجہ نکلنے کی بھی توقع ہے کہ ایمانِ حقیقی سے بہرہ ور ہو جاؤ۔ اس مقام پر اس آیۂ مبارکہ کے مضمون کا اصل فائدہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا' یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد اسلام پر ہے' ایمان پر نہیں۔ یہاں ایمان کے عدم و وجود کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ تکفیر ہو سکتی ہے۔ کوئی شخص نماز کا منکر ہوا تو کافر ہو گیا۔ آپ اسے اپنے معاشرے سے کاٹ دیجئے۔ کسی شخص نے زکوٰۃ کا انکار کیا تو وہ کافر ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے زکوٰۃ کا انکار کرنے والوں سے قتال کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ان کا ارتداد ہر شک و شبہ سے بالاتر تھا' تبھی ان سے قتال جائز ہوا۔ اسی طرح کوئی شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی کا انکار کر دے تو اس کی تکفیر ہو جائے گی۔ لیکن جب تک ایسی کسی چیز کا ظہور اس کی طرف سے نہیں ہو رہا ہے تو توحید و رسالت کی شہادت اور ارکانِ اسلام کی بنیاد پر اس کو مسلمان سمجھا جائے گا' مسلمان کا سا معاملہ کیا جائے گا اور وہ اسلامی ریاست کا شہری ہو گا۔ وہ اگر نیک ہے' متقی ہے' پانچ وقت کا نمازی ہے' تہجد گزار ہے تو اس کی عزت زیادہ کی جائے گی' لیکن اگر وہ ان صفات سے متصف نہیں ہے تو اس کی وقعت معاشرے میں اتنی ہی کم ہو جائے گی' لیکن قانونی اعتبار سے اس کا STATUS مساوی رہے گا۔ اسے وہ تمام شہری حقوق حاصل رہیں گے جو اسلامی ریاست میں کسی بھی شہری کو حاصل ہوتے ہیں۔

اب دیکھئے کس قدر منطقی ربط ہے! جب مسئلہ یہ چھڑ گیا کہ اسلام اور ہے' ایمان اور تو پھر چاہے متعین لوگ تھے انہیں مخاطب کر کے ان سے کہلوایا گیا۔ بہرحال ایک بات اصولی طور پر سامنے آ گئی کہ ایمان کی مؤکد اور کامل نفی کے باوصف اسلام کا اثبات اور ان کی اطاعت کو قبول کرنے کی ایک امید دلا دی گئی۔ لیکن یہاں از خود سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ ایمان کیا ہے؟ اس کو DEFINE کیا جانا چاہئے۔ اس ایمان کے ارکان کونسے ہیں' اس کے لوازم کیا

ہیں اور ان کی بنیادیں کیا ہیں۔ لہٰذا اگلی آیت اس کو طے کر رہی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت خاص اس پہلو سے قرآن مجید کی اہم ترین آیت ہے' اس لئے کہ ایمان کے مظاہر' ایمان کے ثمرات و نتائج اور ایمان کے لوازم تو قرآن مجید میں جا بجا بیان ہوئے ہیں، ہم سورۃ التغابن کے دوسرے رکوع میں بھی ان میں سے بہت سوں کا مطالعہ کر چکے ہیں لیکن جہاں ایمان کو اسلام کے بالمقابل لایا گیا اور ایمان کی نفی کرتے ہوئے اسلام کا اثبات کیا گیا اور پھر اس پس منظر میں ایمان کو DEFINE بھی کیا گیا' یہ مقام منفرد حیثیت و اہمیت کا حامل ہے۔ اب یہاں اس ایمان کی ایک تعریف (DEFINITION) آرہی ہے۔ اور اس آیۂ مبارکہ میں آپ دیکھیں گے کہ اول و آخر حصر کا اسلوب ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ...... "اِنَّمَا" کلمۂ حصر ہے۔ ترجمہ ہو گا۔ "مومن تو بس وہ ہیں"۔ تم جاننا چاہو گے کہ اگر ہمارے ایمان کی نفی کی جا رہی ہے تو پھر ایمان کیا ہے' ایمان کے تقاضے کیا ہیں' ایمان کے لوازم کیا ہیں' تو جان لو۔ مومن تو بس وہ ہیں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا۔ "جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر۔ پھر شک میں نہیں پڑے"۔ یعنی اس ایمان نے ایک یقین کی صورت اختیار کر لی۔ قرآن مجید کا یہ واحد مقام ہے جہاں ایمان کے بعد "ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا" کے الفاظ میں ایک اضافی شرط عائد کی گئی ہے۔ یعنی وہ ایمان یقینِ قلبی کی شکل اختیار کر چکا ہو۔ وہ صرف ظن و تخمین اور گمان کے درجے میں نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ انسان صرف کچھ اپنے منطقی استدلال کے تانے بانے کی بنیاد پر کچھ چیزوں کو مان رہا ہو' بلکہ ایمان ایک یقین کی کیفیت بن کر اس کے قلب میں جاگزیں ہو گیا ہو۔ ایک ایسی کیفیت کے ساتھ کہ اس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں۔ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا۔ یہ ارتیاب "ریب" سے بنا ہے جو سورۃ البقرہ کی بالکل آغاز کی آیت میں آیا ہے..... ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ تو وہ ریب میں مبتلا نہ ہوں۔ ایمان ایک چٹان کے مانند ان کے دلوں میں قائم ہو جائے۔

شک و شبہ سے پاک ایمان و یقین پھر ایک باطنی کیفیت ہے' جو دوسرے انسان کے مشاہدہ میں نہیں آسکتی۔ اس پر انسان اپنی حسِ ظاہری سے کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ اس یقین باطنی کا جو ظہور ہے انسان کے عمل میں اب یہاں اس کو معین کیا گیا: وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ "اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں"۔ اس کے راستے میں اپنی قوتیں لگائیں' صلاحیتیں لگائیں' اوقات صرف کئے اور اس میں اپنے مالی وسائل و ذرائع کو کھپایا اور جھونکا۔

یہاں ایمان اور جہاد کے باہمی تعلق کو بھی سمجھ لینا چاہئے۔ ایمان حقیقی کے دو ارکان

ں۔ ایک یقین قلبی اور دوسرے جہاد۔ یعنی مجاہدہ و کشمکش۔ اللہ کے دین کے لئے یہ جہاد یہ
وجہد' یہ مجاہدہ' یہ کشمکش' یہ سعی پیہم اور یہ جہدِ مسلسل اس ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اول ہے' یہ
ں کا یقینی نتیجہ ہے۔ بالکل اس طرح جیسے کہ ہم کسی کمیونسٹ کے بارے میں بڑے اطمینان
ے ساتھ کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں شخص مارکسسٹ بنا پھرتا ہے' حالانکہ وہ اس
رمایہ دارانہ معاشرے میں بڑے اطمینان سے رہ رہا ہے' پاؤں پھیلا کر سوتا ہے۔ چونکہ اس
ے مفادات اس معاشرے سے وابستہ ہیں لہٰذا اس کی زندگی میں وہ تصادم اور کشمکش نظر نہیں
آرہا۔ ایک شخص اگر واقعتہً مارکسسٹ اور کمیونسٹ ہے تو اس کا کسی سرمایہ دارانہ
معاشرے میں اطمینان سے رہنا' اس میں اپنے لئے جگہ بنانا' اس میں پھلنے پھولنے کی کوشش
کرنا اور اس میں پاؤں پھیلا کر سونا' اس کے حقیقی معنی میں مارکسسٹ ہونے کی نفی کردے
گا۔ اسی طریقے سے حقیقی ایمان سے بہرہ ور ایک مسلمان ایک ایسے ماحول میں جہاں اسلام کا
غلبہ نہ ہو' جہاں اللہ کے احکام کو نافذ نہ کیا گیا ہو' جہاں اللہ کا دین غالب نہ ہو' جہاں کا
معاشرہ سنتِ رسولؐ کی بنیاد پر استوار نہ کیا گیا ہو' وہاں اس کی زندگی ایک کشمکش اور تصادم کی
زندگی ہوگی۔ وہ ہمہ وقتی مجاہدہ اور سعی وجہد میں معروف رہے گا۔ اس ماحول کو بدلنے اور اس
میں ایک ایسا انقلاب لانے کے لئے کہ جس میں اللہ کا دین قائم ہو' اللہ کے احکام کی تنفیذ ہو'
جو اللہ چاہتا ہے وہی ہو' بقول حضرت مسیح علیہ السلام کہ اے رب تیری مرضی جیسے آسمان پر
پوری ہوتی ہے ایسے ہی زمین پر پوری ہو۔ اس مقصود کے لئے اگر اس میں محنت و مشقت'
قربانی و ایثار' جدوجہد اور کوشش اور یہاں تک کہ اگر وقت آئے تو اپنی نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر
میدان میں حاضر ہونے کا اگر جذبہ اور مادہ نہیں ہے تو یہ اس کے ایمان حقیقی کی نفی کے لئے
کامل ثبوت ہے۔ گویا کہ ایمان حقیقی کے دو رکن بتا دیئے گئے۔ یقینِ قلبی والا ایمان اور مجاہدہ
اور جہاد اور کشمکش کی زندگی۔ فرمایا "اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ "یہ ہیں وہ لوگ جو سچے
ہیں (اپنے دعوائے ایمان میں)" کہنے کو تو سب مومن ہیں اور جو چاہے ایمان اور اسلام کا
دعویٰ کرے اور چلئے جس شخص کے اندر یہ کیفیت نہیں بھی ہے اگر وہ بنیادی تقاضے پورے
کرتا ہے' اگر اس نے شہادت کا کلمہ ادا کیا ہے' اگر وہ ارکانِ اسلام کا' شعائرِ اسلام کا پابند
ہے' اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے میں اسے قبول کر لیا جائے گا' لیکن حقیقی ایمان
در حقیقت مجموعہ ہے ان دو چیزوں کا' یعنی یقینِ قلبی اور عمل میں جہاد اور مجاہدے کی ایک
کیفیت' ایک مسلسل کشمکش' ایک مسلسل جدوجہد' ایک سعی پیہم۔ اگر کوئی اللہ کے لئے' اس
کے دین کی سربلندی کے لئے اپنی جان بھی کھپا رہا ہے اور مال بھی لگا رہا ہے تو ایسا شخص فی الواقع

مومن ہے اور اس کا دعویٰ ایمان حقیقت کے اعتبار سے سچا ہے۔

یہاں ذہن میں رکھئے کہ یہ آیہء مبارکہ ہمارے اس منتخب نصاب میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم نے اس کا آغاز سورۃ العصر سے کیا تھا۔ اس میں انسان کی نجات کے چار لوازم یا شرائط ہمارے سامنے آئی تھیں۔ ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق تواصی بالصّبر۔ یہاں یوں سمجھئے کہ ان چار کو دو میں سمو دیا گیا۔ جب ایمانِ حقیقی یعنی یقین قلبی والا ایمان ہے تو عمل تو اس کے تابع آپ سے آپ آگیا۔ یہ حقیقتِ ایمان کی تقریر میں تفصیل سے واضح کر چکا ہوں اور دوسرے جہاد در حقیقت تواصی بالحق اور تواصی بالصّبر دونوں کا مجموعہ ہے۔ تو اس آیت میں گویا کہ سورۃ العصر کی چار چیزیں دو اصطلاحات کی شکل میں سامنے آرہی ہیں۔ اور ہمارے اس منتخب نصاب کا جو چوتھا حصہ اب شروع ہونے والا ہے اس کا مرکزی مضمون اور اس کا عنوان "جہاد" ہے۔ جہاد کی حقیقت' جہاد کی غایتِ اولیٰ' جہاد کی غایتِ قصویٰ' اس کا ابتدائی مقصد اور اس کی انتہائی منزل...... پھر اس جہاد کی کیا اہمیت ہے اور اس کے لئے کس کس طور سے پکارا گیا ہے' اہل ایمان سے کس طریقے سے اس کا تقاضا کیا گیا ہے' یہ مضامین تواصی بالحق کے ذیل میں اس منتخب نصاب کے چوتھے حصے میں آنے والے ہیں۔

اس سورہ مبارکہ کی بقیہ آیات کا اب صرف خلاصہ دیا جاسکتا ہے۔ وہ لوگ جو اس نہج ایمان لائے تھے کہ ان کے دلوں میں ایمان ابھی داخل نہیں ہوا تھا وہ جس طرح ہمارے ہاں کہاوت ہے کہ "تھوتھا چنا باجے گھنا" اپنے ایمان اور اسلام کا کچھ زیادہ ہی اظہار کیا کرتے تھے۔ حضور پر احسان بھی جتایا کرتے تھے کہ دوسرے تو لڑ بھڑ کر ایمان لائے' ہم نے تو ویسے آپ کی اطاعت قبول کرلی ہے۔ ان آیات میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے' ارشاد ہوا کہ اے نبی ان سے کہئے کہ تم اللہ پر اپنا دین جتلانا چاہتے ہو' حالانکہ اگر اللہ کو تم مانتے ہو تو اللہ تو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا جاننے والا ہے۔ پھر یہ بار بار اپنے ایمان اور اپنے اسلام کا اظہار اس انداز میں کرنا کہ جیسے تم نے اسلام قبول کر کے مجھ پر کوئی احسان کیا ہے یا ایمان لا کر اللہ کے دین پر کوئی احسان کیا ہے' یہ چیز در حقیقت غمازی کر رہی ہے کہ اندر کچھ خلا ہے' معاملہ خالی ہے۔ تم ابھی حقیقتِ ایمان سے بہرہ ور نہیں ہو۔ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا "اے نبی یہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ یہ ایمان لے آئے"۔ قُلْ لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ۔ "کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا کوئی احسان نہ دھرو۔ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ

باقی ص۔۔

کیا سندھ کو نبی اکرمؐ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہے؟

ممتاز دینی سکالر و محقق، ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" کے ابتدائی صفحات میں برصغیر میں اسلام کی آمد اور اشاعت کے ضمن میں سرزمین سندھ کی خصوصی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور سکالر اور محقق ڈاکٹر حمید اللہ کے حوالے سے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ سرزمین سندھ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہے۔ اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳ پر فٹ نوٹ میں محترم ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کر دی تھی کہ اس بات کا انکشاف ڈاکٹر حمید اللہ نے چند سال قبل سندھ یونیورسٹی جام شورو کے انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی میں ایک لیکچر کے دوران فرمایا تھا۔ ریکارڈ کو درست رکھنے کی خاطر اور اس معاملے کی مزید وضاحت کے خیال سے ہم نے حال ہی میں سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر حمید اللہ کے متعلقہ لیکچر کا کیسٹ حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ لیکچر اصلاً 'سیرت النبی' کے موضوع پر تھا۔ تقریر کی ابتدا میں بطور تمہید انہوں نے سندھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور اہل سندھ سے آپؐ کی ملاقات کے امکان پر گفتگو فرمائی تھی، اور اس ضمن میں اپنی تحقیق کا حاصل سامعین کے سامنے رکھا تھا۔ تقریر کا متعلقہ حصہ ٹیپ کی ریل سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

محترم وائس چانسلر صاحب، محترم اساتذہ اور عزیز طلباء!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

یہ میرے لئے بڑے شرف کا باعث ہے کہ آپ نے مجھے اس مبارک تقریب میں حصہ

لیے کا موقع دیا اور سیرت النبی کے وسیع اور شاید اکثر موضوع کے چند پہلوؤں پر آپ سے
عرض کرنے کی فرمائش کی گئی ہے، جسے میں اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں۔
سندھ میں اس (سیرت النبی کے جلسے) کا اجتماع بہت سی پرانی چیزیں یاد دلاتا ہے۔ اگر
مجھے سندھی زبان آتی تو یقیناً سندھی زبان ہی میں آپ کو مخاطب کرتا، کیونکہ شاید یہ وہی زبان
ہے جو ہمالیہ کے برِاعظم میں سب سے پہلے اسلام سے متعارف ہوئی اور سارے برِاعظم میں دُور
دُور تک اسلام پھیلتا چلا گیا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے کہ اس کی تمام تفصیل میں جاؤں۔
سیرت النبیؐ کے سلسلے میں دو چیزیں یاد آتی ہیں جن کا تعلق سندھ سے ہے۔ اس کا ذکر
کرنے کے بعد میں بعض اور چیزیں آپ سے عرض کروں گا۔
پہلی چیز جو ہے اس کا تعلق سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے سیرت النبیؐ سے
نہیں، یعنی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مبعوث نہیں ہوئے تھے اُس وقت اس کا پتا
چلتا ہے کہ آپ کم از کم سندھیوں سے واقف ہوئے تھے، سندھیوں سے مل چکے تھے، چاہے
سندھ تشریف لانے کا آپ کو موقع نہ ملا ہو۔ ممکن ہے سندھ بھی تشریف لائے ہوں اسی لئے
اس زمانے کے لئے یہ ناممکن نہیں تھا، لیکن اس کا تو پتا چلتا ہے، اگرچہ سو فیصد یقین سے نہیں
کہا جا سکتا کہ آپ سندھیوں سے ملے تھے۔
اولاً سفر کا امکان...... اس سے سب لوگ واقف ہیں جو سیرت النبیؐ کی کتابیں پڑھتے ہیں
کہ حضور دو مرتبہ شام تشریف لے گئے تھے، ہمارے مؤرخ اُس کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ آپ
یمن بھی گئے تھے کم از کم دو مرتبہ...... اس کا بھی ہمارے پاس اب قطعی ثبوت موجود ہے
آپ عرب کے مشرق میں، بحرِ عمان کے علاقے میں بھی ایک مرتبہ تشریف لے گئے تھے۔ اس کا
امکان بھی ہے کہ آپ حبشہ تشریف لے گئے ہوں، اگرچہ اس کا بھی کوئی قطعی ثبوت نہیں
ہے۔ استنباط کے طور پر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے حبشی زبان کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ یہ چیز لکھی ہوئی موجود ہے کہ جب حبشہ کے
مہاجرین مکہ واپس تشریف لائے تو آپؐ نے ایک چھوٹی بچی سے جو وہیں پیدا ہوئی تھی اور حبشی
زبان بولتی تھی، چند الفاظ حبشی زبان میں کہے تھے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کوئی شخص کسی
زمانے میں کسی ملک میں گیا ہو، اس لئے کہ باوجود مسافر ہونے کے بھی چند الفاظ اُس کے ذہن
میں محفوظ رہ جاتے ہیں، جن کو وقتاً فوقتاً وہ استعمال کر سکتا ہے...... ایک اور تائیدی دلیل اس
سے بھی ملتی ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'نجاشی' کا انتخاب کیا کہ مکہ کے
مصیبت زدہ مسلمان ترکِ وطن کر کے اس کے ملک میں جا کر پناہ گزین ہوں تو پہلے نجاشی

نام ایک خط لکھا جس میں لکھا تھا، "میرا چچازاد بھائی جعفر بن ابی طالب آرہا ہے' دوسرے مسلمانوں کے ساتھ...... ان کی مہمان نوازی کرنا!" - یہ جو ایک طرح کی 'INTIMACY' اور قریبی تعلقات کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں' یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب پہلے سے ملاقات رہی ہو- گویا کہ ان چیزوں سے استنباط کیا جاسکتا ہے کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم حبشہ جاچکے ہوں- جب اتنے ممالک کا آپؐ سفر کر چکے تھے تو کوئی تعجب نہیں کہ ہندوستان اور سندھ بھی آئے ہوں- تجارت کے سلسلے میں......

اس مختصری تمہید کے بعد وہ بات عرض کرنی ہے کہ حضور کی ملاقات سندھیوں سے کب اور کیسے ہوئی تھی؟؟- اولاً میں مشرقی عرب جانے کی بات کرتا ہوں اس لئے کہ وہیں سے آپؐ سندھیوں سے ملاقات کر سکتے ہیں یا سندھ جاسکتے ہیں- مُسند احمدؒ ابن حنبل حدیث کی مشہور کتاب ہے' اور ابن حنبلؒ وہ شخص ہیں جو امام بخاریؒ کے استاد ہیں' انہوں نے اپنی مُسند میں دو صفحات کی ایک طویل حدیث میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ عبدالقیس کے لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ آئے-

رسولؐ اللہ نے ان سے مختلف چیزیں دریافت کیں- فلاں شہر کیا ابھی موجود ہے؟ فلاں سردار یا فلاں شخص کیا ابھی زندہ ہے؟ ان سوالات پر وہ لوگ حیرت زدہ ہوگئے اور کہنے لگے یا رسول اللہؐ! آپ ہمارے ملک اور ہمارے آدمیوں سے ہم سے بھی زیادہ واقف معلوم ہوتے ہیں! اس پر مسند احمد ابن حنبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو جواب نقل ہوا ہے وہ یہ ہے؛

"میں وہاں گیا ہوں' بہت دن تک اس سرزمین کو میرے پاؤں روندتے رہے ہیں' قلعہء مشقّل کی چابیاں میں نے حاصل کیں اور چشمہء زہرا پر بھی میں کھڑا ہوا" ...... یہ تمام مقامات مشقّل اور زہرا مشرقی عرب میں اب بھی موجود ہیں' جہاں آج کل پیڑول کے چشمے بہہ رہے ہیں- مشرقی عرب میں آپؐ کیوں گئے تھے؟ اس کا ایک دوسری روایت سے ہمیں پتا چلے گا جو حدیث کی کتابوں میں نہیں بلکہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے- ابن حبیب ایک بڑا مشہور مورخ گزرا ہے' جس کی وفات ۲۴۵ ہجری میں ہوئی' اس کی کتاب "المحبّر" میں 'عرب کے میلے" کے نام کا ایک باب موجود ہے- ان میلوں کے سلسلے میں جو ہر سال لگا کرتے تھے وہ بیان کرتا ہے کہ عرب کے مشرق میں 'دباء' نامی ایک مقام ہے (جو متحدہ عرب امارات میں حدیبہ نامی بندرگاہ کے شمال میں اب بھی موجود ہے) ...... 'دباء' میں سالانہ میلہ فلاں تاریخ کو ہوتا تھا' اُس میں فلاں فلاں قسم کا سامان فروخت کے لئے آتا تھا' اس میں شرکت کرنے والے لوگ ہندی' سندھی' چینی' رومی' ایرانی' مشرق والے اور

معرب والے ہوتے تھے۔ یہ الفاظ ہیں جو ترجمہ کر کے میں نے آپ کو سنائے اور اس میں سندھ کا لفظ صراحت کے ساتھ آتا ہے...... اس واسطے سے گمان کیا جاسکتا ہے کہ غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ کا مالِ تجارت لے کر اس بڑے میلے میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہوں گے اور وہاں چینیوں سے اور سندھیوں سے اور دیگر لوگوں سے بھی ملے ہوں گے۔

وہ مشہور حدیث کہ "علم سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے چاہے چین ہی جانا پڑے" ...... غالباً اس کی وجہ یہی ہوگی کہ رسول اللہؐ نے 'دباء' کے بازار میں چینی تاجروں کے پاس اُن کا پیش کردہ سامان دیکھا ہوگا جن میں چینی ریشم اور دیگر سامان جو وہ لائے تھے آپ نے دیکھا ہوگا اور آپؐ متاثر ہوئے ہوں گے کہ اتنی اچھی صنعت ان کے ملک میں ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا ہوگا کہ "علم سیکھو چاہے چین جیسے دور دراز کے ملک ہی کیوں نہ جانا پڑے" ...... غالباً حضورؐ نے اُن سے پوچھا ہوگا کہ تم کتنی دور سے آئے ہو؟ چینیوں نے کہا ہوگا کہ ہم دو ماہ کی مسافت سے چل کر آئے ہیں......!

اسی واقعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع ملا تھا کہ سندھیوں کو دیکھیں۔ ممکن ہے کہ اور آگے جاکر سندھ میں تجارت کے لئے تشریف لے گئے ہوں۔

اسی تذکرہ میں ابھی آپ نے سنا کہ 'ہند' کا بھی ذکر ہے یعنی ہندوستانیوں کا بھی، جس کا بعد میں ایک اور حدیث میں ہمیں ثبوت ملتا ہے ایک دن بعض لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے دُور سے مدینہ آئے۔ سیدناؐ نے پوچھا...... "یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستانیوں کے سے نظر آتے ہیں" ...... بعینہٖ یہی الفاظ ہیں جو حدیث میں موجود ہیں اور یہ وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے ہندوستانیوں کو اور ہندوستانیوں کے لباس کو دیکھا ہو۔ یہ لوگ یمن کے ایک قبیلے کے لوگ تھے جو مسلمان ہونے کے لئے آئے تھے۔

گویا کہ ایک چیز جو میں سندھ کے سلسلے میں آپ سے عرض کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ سیرتِ محمدیؐ میں (بعثت نبویؐ سے پہلے) سندھ کا ذکر ملتا ہے۔

دوسری چیز جو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہر شخص کو کسی خاص پہلو سے آپؐ سے دلچسپی ہوتی ہے اور مجھے رسول اکرمؐ کی سیاستِ خارجہ اور ڈپلومیسی سے دلچسپی رہی، اس پر میں نے کام کیا، کتابیں بھی شائع کیں اور علمی ڈگریاں بھی حاصل کیں...... (اس کے بعد جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے اس خاص موضوع پر تفصیلاً گفتگو فرمائی)۔

مشاھدات وتأثرات

بے پردگی اور عریانی کی دوڑ میں ٹی وی کسی سے پیچھے نہیں!

لاہور میں پی ٹی وی کے دفاتر کے سامنے تنظیم اسلامی کا پُر امن احتجاجی مظاہرہ

لاہور میں پاکستان ٹیلی ویژن کے دفاتر کے سامنے تنظیم اسلامی کے پُرامن احتجاجی مظاہرے کی یہ رُوداد اوّلاً ہفت روزہ "ندا" میں شائع ہوئی تھی۔ مقبول الرحیم مفتی صاحب کی مرتب کردہ اس رُوداد میں چونکہ مظاہرے کی منظر کشی بہت عمدہ طریقے سے کی گئی ہے لہٰذا قارئین "میثاق" تک پہنچانے کی غرض سے اسے من وعن شائع کیا جا رہا ہے۔ البتہ مظاہرے کے دوران تقسیم کیا گیا "دو ورقہ" اور تنظیم اسلامی کی طرف سے ٹیلی ویژن حکام تک پہنچائی جانے والی عرضداشت کے متن کو قارئین کی دلچسپی کے پیشِ نظر اضافی طور پر اس میں شامل کیا گیا ہے۔

(ادارہ)

سولہ اگست کی شام کو شملہ پہاڑی کے دامن میں واقع سادہ سی کشادہ مسجد میں غیر معمولی رونق نظر آ رہی تھی حالانکہ عام طور پر یہاں نمازیوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ عصر کی اذان ہو چکی تھی اور جماعت میں چند منٹ باقی تھے جس کے انتظار میں تنظیم اسلامی کے رفقاء مسجد کے اندر اور صحن میں کھڑے دبی دبی آوازوں میں مصروفِ گفتگو تھے۔ آج وہ یہاں نماز عصر کے بعد قریب ہی واقع لاہور ٹیلیویژن سنٹر کے سامنے عریانی اور فحاشی کے خلاف خاموش مظاہرہ کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ گذشتہ تین ماہ کے دوران لاہور، کراچی اور راولپنڈی میں دو بڑے اردو روزناموں "جنگ" اور "نوائے وقت" کے دفاتر کے سامنے خاموش مظاہروں کے بعد اب تنظیم اسلامی کی یہ شائستہ احتجاجی مہم سرکاری ذرائع ابلاغ کا رخ کر کے ایک قدم آگے بڑھاتی دکھائی دیتی ہے۔ تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد اپنی انقلابی فکر کے تناظر میں ان مظاہروں کے لئے "نہی عن المنکر باللسان" کی خالص اور ٹھیٹھ دینی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی بھی اس سلسلے میں ایک رہنما اصول کا کام دیتا ہے کہ "دین تو نام ہے نصیحت اور خیر خواہی کا"۔ اس طرح کے پر امن خاموش اور بے ضرر مظاہرے بلاشبہ اربابِ اقتدار اور عوام دونوں کے حق میں نصیحت اور خیر خواہی کا انداز رکھتے ہیں۔ اب تک تنظیم اسلامی نے ان مظاہروں کے دوران جس نظم و ضبط اور اخلاق و شرافت کا مظاہرہ کیا ہے وہ بلاشبہ دین کے اصولوں پر عمل کی ایک عمدہ مثال ہے۔ مگر ہمارے ملک میں ابھی اس طرزِ عمل

کو ایک انوکھی چیز تصور کیا جارہا ہے۔
مغربی دنیا اور بالخصوص برطانیہ جن سے ہم نے تمدن ہی نہیں پارلیمانی جمہوریت اور انتخابات کا سبق بھی سیکھا' ان کے ہاں اس طرح کے پُرامن اور خاموش مظاہرے احتجاج اور اظہارِ رائے کا ایک مسلمہ اور مؤثر ذریعہ سمجھے جاتے ہیں اور وہاں کا پولیس چند افراد کے مظاہروں کو بھی پوری اہمیت دیتا ہے۔ مگر پاکستان کا پریس غالباً ابھی عالم حیرت میں مبتلا ہے کہ کسی ہنگامے' دھکم پیل' گالم گلوچ' گھیراؤ' جلاؤ اور توڑ پھوڑ کے بغیر انہیں مظاہرے کیسے قرار دیا جائے۔ ان سے تو کوئی خبر بھی نہیں بنتی کیونکہ مظاہرین کوئی قابل دست اندازیٔ پولیس حرکت نہیں کرتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تنظیم اسلامی کے یہ منظم اور خاموش مظاہرے ابھی تک اہلِ صحافت کی نظر میں اس قابل نہیں کہ ان کی خبر اہل ملک تک پہنچائی جائے یا ایک مستحسن اور قابل تعریف اقدام کے طور پر ان کے حق میں کلمۂ خیر کہنے کے لئے اپنے ادارتی صفحات کو استعمال کیا جائے۔ اس کا ایک سبب تنظیم اسلامی کی یہ "بنیادی غلطی" بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے اس کارِ خیر کا آغاز ہی اخبارات کے خلاف مظاہروں سے کیا۔
نماز عصر میں اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہونے کے بعد تنظیم اسلامی کے تمام رفقاء منظم انداز میں قطاریں بنائے مسجد کے صحن میں کھڑے تھے' چند منٹ بعد انہیں بینر اٹھا کر سڑک پر نکلنا تھا۔ مگر اس سے پہلے ان کے امیر ڈاکٹر عبد الخالق انہیں ضروری ہدایات دے رہے تھے۔ چونکہ یہ کوئی پہلا مظاہرہ نہ تھا اور تمام رفقاء اب مظاہرے کے انداز اور مزاج سے بخوبی واقف ہو چکے تھے اس لئے ڈاکٹر عبد الخالق نے انتہائی مختصر طور پر یاد دہانی کے انداز میں کہا کہ مظاہرے کے دوران تمام رفقاء نظم کی مکمل پابندی کریں گے۔ مظاہرے کے دوران اپنی نگاہوں کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا جائے اور زبان کو ذکر میں مشغول رکھیں۔ غالباً اس ہدایت میں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ نگاہیں بھی بھٹکنے سے محفوظ رہیں اور دل کا تار اپنے رب سے جڑا رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی آخری ہدایت یہ تھی کہ کسی فقرہ چست کرنے والے کا اور کسی آوازے کا جواب نہ دیں اور اگر کوئی سوال کیا جائے تو اسے وہاں موجود ذمہ دار افراد کی طرف منتقل کر دیا جائے۔
حفاظتی امور کا اہتمام کرنے اور مظاہرے کے نظم کی دیکھ بھال کے لئے جواں سال مگر سنجیدہ اور کم گو عبد الرزاق کی قیادت میں سات ذمہ دار رفقاء کا گروپ پہلے مسجد کے دروازے پر پہنچا اور ان کے بعد قطاروں میں کھڑے رفقاء مسجد سے نکلتے ہوئے اپنے اپنے حصے کا بینر یا کتبے لے کر سڑک پر آنے لگے۔ نسبتاً عمر رسیدہ اور بزرگ حضرات کو بینر اٹھانے کی زحمت نہیں دی جارہی تھی۔ اس طرح سڑک کے کنارے کلاس میں جاتے بچوں کی طرح ایک رویہ قطار میں چلتے ہوئے مظاہرین کی ترتیب کچھ یوں بن گئی تھی کہ ہر تین افراد میں سے ایک فرد بینر اٹھائے ہوئے تھا تو دو خالی ہاتھ تھے۔
کم و بیش ڈیڑھ سو مظاہرین اپنے بینروں اور کتبوں کے ساتھ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے ٹیلیویژن سنٹر کے سامنے پہنچے اور دو حصوں میں بٹ کر سڑک کے دونوں طرف خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔
کپڑے کے بڑے بینروں اور چھوٹے کارڈز پر جو عبارتیں درج تھیں ان کا انداز اس جارحیت سے پاک تھا جو ایک طویل عرصے سے ہمارے سیاسی مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ کچھ چھوٹے کارڈز پر قرآنی آیات کا ترجمہ بھی لکھا ہوا تھا اور کچھ پر دردمندانہ یاددہانیاں تھیں۔ "خدا کے لئے ٹیلیویژن فحاشی اور عریانی بند کر دے۔ یہ اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے"۔ "ٹیلیویژن کا کردار تعلیمی اور تعمیری ہونا چاہیے فحاشی و عریانی کی دوڑ میں کیا

اپنا کردار فراموش نہیں کر چکا؟" ۔ "خدارا غور کریں کیا فحاشی اور بے حیائی کے بغیر تفریح ممکن نہیں؟" "بے پردگی اور بے حیائی کے فروغ سے غیرت کا جنازہ نکل جاتا ہے" ۔

مظاہرین کی نقل و حرکت یا سڑک کے کنارے ان کے کھڑے ہونے سے ٹریفک میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ البتہ بینروں کی عبارتیں پڑھنے کی کوشش میں ٹریفک کی رفتار فطری طور پر سست پڑ گئی۔ تنظیم کے چند رفقاء ایک دو ورقہ بھی تقسیم کر رہے تھے جس میں ٹیلی ویژن کارپوریشن اور حکومت پاکستان دونوں سے دلسوزی کے ساتھ اپیل کی گئی تھی کہ ٹی وی کی موجودہ روش اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس ملک کے نظریات و مقاصد کے بالکل برعکس رخ پر جارہی ہے۔ اس دو ورقے کے آخری پیراگراف سے بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیاسی طرز کی مطالبہ بازی اور دردمندی کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی کے انداز میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس دو ورقے کا مکمل متن سطور ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

ٹیلی ویژن کی انتظامیہ اور حکومت کے ذمہ دار افراد سے

تنظیمِ اسلامی کی اپیل

جس میں وطن عزیز کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی تائید شامل ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے ہمیں آزادی و خودمختاری کی نعمت سے نوازا اور پاکستان کی شکل میں زمین کا یہ ٹکڑا عطا کیا، لیکن ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس سے پہلے ہم نے اجتماعی طور پر ایک عہد کیا تھا اور اس کا اعلانِ عام بھی ہوا تھا۔ ہمارا وعدہ تھا کہ انگریز کی غلامی اور ہندو کی بالادستی سے گلوخلاصی پا کر ہم اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دے دیں گے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے پر زندگی گزاریں گے اور بھٹکتی ہوئی انسانیت کے لیے اپنے ملک کو روشنی کا مینار بنائیں گے۔ اسلام کے مثالی معاشرے کی تشکیل کریں گے تاکہ دو انتہاؤں کی ماری ہوئی اور افراط و تفریط کا شکار دنیا کے سامنے امن و سکون، عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کا ایک قابلِ تقلید نمونہ آجائے۔ ہم اللہ کے آخری اور ابدی پیغامِ ہدایت کے امین ہیں جسے بنی نوع انسان تک پہنچانے کا حق تبھی ادا ہوسکتا ہے جب ہم خود اس پر عمل پیرا ہو کر اس کی برکات کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیں۔ یہی کارِ رسالت ہے جسے نبھاتے چلے جانے کی ذمہ داری نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد قیامت تک کے لیے امتِ مسلمہ پر عائد ہو گئی ہے۔

ہماری بدبختی کہ ہم اللہ کے ساتھ بدعہدی اور وعدہ خلافی کے مرتکب ہوتے۔ ہم نے قرار دادِ مقاصد پاس کر کے گویا کلمۂ شہادت ترپڑھا اور ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین میں اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دے کر دین کی طرف پیش قدمی کی راہ بھی متعین کی، لیکن جیسے ہم اپنی انفرادی زندگیوں میں دین کی روح اور اسلام کے مزاج سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں، ویسے ہی ہماری قومی زندگی کا دھارا بھی روز بروز اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے سے جدا ہو رہا ہے۔ یوں ہم ایک بار پھر عذابِ الٰہی کو دعوت دے رہے ہیں جس کا ایک کوڑا سقوطِ ڈھاکہ کی شکل میں ہم پر پڑ چکا اور آثار بتاتے ہیں کہ ایک اور برسنے والا ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر کریں ؟ افسوس کہ بچاؤ کی فکر کرنے کی بجائے ہم اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے کے نئے سے نئے وطیرے اختیار کرتے ہیں جن میں سے ایک عریانی، بے حیائی اور فحاشی کا فروغ ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہمیں اپنی اس روش کے مہلک اور تباہ کن ہونے کا احساس بھی نہیں رہا۔ اس کے خلاف بات کی جائے تو ہنسی میں اڑا دی جاتی ہے۔

ٹیلی ویژن جدید دنیا میں ابلاغِ عامہ کا مؤثر ترین ذریعہ ہے، جس کی تاثیر کو اپنے حق میں یا اپنے خلاف استعمال کرنے کا ہمیں اختیار ہے۔ اس اختیار کو ہمارا قومی ادارہ 'پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن' قوم کی تباہی میں لگانے کا فیصلہ کر لے تو دنیائے اسلام کی سب سے قیمتی متاع پاکستان کا خدا ہی حافظ ہے۔ ٹی وی نے اوّل روز ہی سے اسلامی تہذیب و تمدن اور دینی اقدار کا عملی طور پر مذاق اڑایا ہے۔ برائے نام اور اوپرے سے "اسلامی پروگراموں" کا اثر زائل کرنے کو ڈراموں، انگریزی فلموں اور موسیقی کے دلوں میں اتر جانے والے پروگراموں کی کبھی کمی نہیں رہی، لیکن اب تو معاملہ سب حدوں کو پھلانگتا نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسلمان قوم اور اس کی نوخیز نسل کو شرم و حیا اور عفت و عصمت کے بندھنوں سے آزاد کرانے کا گویا تہیہ کر لیا گیا ہے۔ نفسِ انسانی کو یہ مادر پدر آزادی مرغوب ہے۔ اس کی طرف رغبت کو بڑھانا بہت آسان اور اس سے طبیعت میں بیزاری پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ کام پہلے بھی مشکل تھا، آج بھی مشکل ہے اور ہمیشہ مشکل رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین تقویم پر پیدا فرمایا لیکن اس میں اسفل سافلین کے درجے تک گرتے چلے جانے کا رجحان بھی رکھ دیا۔ اسی رجحان کو زیر کرنے اور سفلی جذبات پر قابو پانے میں ہی وہ آزمائش ہے جس سے دنیا کی زندگی میں ہم دوچار ہیں اور جس میں کامیابی ہمیں ابدی راحت سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

ٹیلی ویژن اس آزمائش پر پورا اترنے میں مدد دینے کی بجائے ہمیں ناکامی و نامرادی کے غار میں دھکیل رہا ہے۔ قوم کے اخلاق اور اس کی تہذیبی قدروں کو ملیامیٹ کر دینے کے لیے ٹیلی ویژن سکرین کو صنفِ نازک کی نمائش گاہ اور جنس کا بازار بنا دیا گیا ہے۔ عریانی، بے حیائی اور فحاشی کے نشے کو اتنا عام کیا جا رہا ہے کہ طلب میں اضافہ روزافزوں ہے جسے پورا کرنے کے لیے رسد میں بھی برابر اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ طلب اور رسد کا یہ منحوس چکر مسلمانوں کو غارت کر کے چھوڑے گا، کیونکہ اسکی نحوست کا سایہ گھروں کی چار دیواری کے اندر بھی گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ٹی وی ہمارے دل و دماغ میں جو نقب لگا رہا ہے اس سے بچاؤ کا کوئی وسیلہ دستیاب نہیں، سوائے اس کے کہ ہم حکومت اور ٹیلی ویژن کارپوریشن کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دیں۔ چنانچہ ہم متعلقہ محکمے اور اس قومی ادارے کو پوری دردمندی اور دلسوزی سے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کسی اور سے نہیں، ان لوگوں سے ہی پوچھ دیکھیں جنہیں وہ اپنا خیر خواہ سمجھتے ہوں کہ ٹی وی کی موجودہ روش پاکستان کے مسلمانوں میں سے دین و مذہب اور اخلاق و شائستگی کا جنازہ نکالنے والی ہے یا نہیں؟

ہمیں یقین ہے کہ خود ٹی وی کے ذمہ داروں میں سے بھی کسی کلمہ گو کو اس بات سے انکار کی ہمت نہ ہوگی کہ ان کی طرف سے پیش کئے جانے والے ڈرامے اور رقص و موسیقی پر مشتمل یا ان کی آمیزش سے تیار کئے جانے والے پروگرام قوم کی دین سے وابستگی اور اخلاقی حس کا جنازہ نکال رہے ہیں۔ تو پھر کیوں انہیں اپنی موت یاد نہیں آتی، اس وقت کا خیال نہیں آتا جب وہ اپنا دفترِ عمل لے کر اللہ کے سامنے حساب کتاب کے لیے حاضر ہونگے؟ ہماری درخواست ہے، مطالبہ ہے اور اصرار ہے کہ ٹی وی اپنا چلن درست کرلے اور مسلمانوں کی سوئی ہوئی غیرت کو جگانے کا سامان نہ کرے۔ یاد رکھیے کہ دینی غیرت و حمیت کی آگ دب گئی ہے، بجھی نہیں۔ آپ یونہی پھونکیں مارتے رہے تو یہ چنگاری بھڑک اٹھے گی اور اس دفترِ بے معنی کو بھسم کر کے چھوڑے گی۔ وہ وقت آنے سے پہلے اپنے رویے کی اصلاح کرلے تو یہی پاکستان ٹیلی ویژن کے حق میں بہتر ہے۔

حسن اتفاق یا سوء اتفاق تھا کہ عین مظاہرے کے وقت "نیلام گھر" کی ریکارڈنگ میں شرکت کے لئے آنے والے مرد اور خواتین حضرات کی بڑی تعداد بھی گیٹ پر جمع تھی۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس ماڈرن گھرانوں کی نوخیز بچیوں اور خواتین کی اچھی خاصی تعداد بھی بڑے سکون سے قطار بنا کر اندر داخل ہونے کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ گیٹ کے محافظ پوری چھان بین کے بعد ایک ایک فرد کو اندر داخل

ہونے کی اجازت دے رہے تھے۔ نیلا گنبد کے ان شرکاء میں سے مردوں کے ہاتھوں میں تو دو رقعہ دکھائی دے ہی رہا تھا ایک سفید ریش بزرگ نے ہمت کر کے اسے خواتین تک بھی پہنچا دیا۔
تنظیم اسلامی کے یہ باریش مظاہرین جن کی اکثریت پڑھے لکھے نوجوانوں' انجینئروں' ڈاکٹروں اور اساتذہ پر مشتمل تھی تقریباً آدھ گھنٹہ پورے سکون اور دلجمعی کے ساتھ بینر لئے ٹیلیویژن سنٹر کے سامنے کھڑے رہے۔ نماز مغرب سے پندرہ منٹ قبل ڈاکٹر عبدالخالق نے مظاہرین کو واپس روانہ ہونے کا حکم دیا اور اللہ کے یہ بندے اپنے امیر کا اشارہ پاتے ہی منظم انداز سے ایک قطار میں چلتے ہوئے اسی مسجد میں آجمع ہوئے جہاں سے نماز عصر کے بعد روانہ ہوئے تھے۔ مسجد کے صحن میں رفقاء کے جمع ہونے کے بعد ڈاکٹر عبدالخالق نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھوائے۔ اللہ کے یہ بندے اس کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اس نے انہیں کسی فتنے اور آزمائش سے دوچار کئے بغیر نہی عن المنکر کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھنے کی سعادت بخشی۔ نماز مغرب ادا کرنے کے بعد یہ سب لوگ پرسکون چہروں اور مطمئن دلوں کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔

نصح و خیر خواہی پر مبنی عرضداشت

مظاہرے کے دوران ٹیلی ویژن سنٹر کی انتظامیہ کو تنظیم اسلامی کے ناظم اعلیٰ کی طرف سے ایک عرضداشت بھی پیش کی گئی تھی۔ سطور ذیل میں اس عرضداشت کا پورا متن درج کیا جا رہا ہے۔

مکرمی جناب جنرل منیجر پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن لاہور

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

تنظیم اسلامی پاکستان کے رفقاء و احباب پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے اربابِ بست و کشاد کی توجہ پاکستان ٹی وی کے اس روزافزوں منفی رجحان کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں بے پردگی' عریانی اور فحاشی کا ایک سیلابِ بلاخیز امڈتا چلا آرہا ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ اپنے اندر قوم کی شرم و حیا اور اخلاقی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔
ہماری بدقسمتی ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کی گھٹی میں اسلامی تہذیب و تمدن سے بیزاری اور اقوامِ مغرب کی نقالی میں مادر پدر آزادی کے جراثیم روزِ اول ہی سے ڈال دیئے گئے تھے اور یہ قومی ذریعہء ابلاغ بے پردگی و فحاشی کی ترویج' مغرب کی مخلوط طرزِ معاشرت کے فروغ اور شرم و حیا اور ستر و حجاب کی اسلامی تعلیمات کا عملی طور پر مذاق اڑانے میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ لیکن اب معاملہ جس طرح تمام حدود و قیود کو پھلانگتا چلا جا رہا ہے' اس پر ہر دردمند اور باشعور پاکستانی کو گہری تشویش ہے۔ ٹی وی پر پیش کئے جانے والے ڈرامے' انگریزی فلمیں' رقص و سرود کی محفلیں اور اسی قماش کے دیگر مخربِ اخلاق پروگرام دینی اقدار اور اخلاق و شائستگی کا جس طرح جنازہ نکال رہے ہیں اس سے صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتی چلی جا رہی ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی قوم اور بالخصوص اس کی نوخیز نسل کو شرم و حیا اور عفت و عصمت کے بندھنوں سے آزاد کرانے کا تہیہ کر لیا گیا ہے۔

ٹیلی ویژن جدید دنیا میں ذرائع ابلاغ کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے' جس کی تاثیر کو ملک و ملت کے مفاد میں یا اس کے خلاف استعمال کرنے کا اختیار آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے۔ چنانچہ ہم آپ سے دردمندانہ گزارش کرتے ہیں کہ اس اختیار کو معاشرہ کی اخلاقی بنیادوں کو منہدم کرنے میں استعمال نہ کیجئے' بلکہ اسے قوم کی تعمیر سیرت اور اصلاح احوال کے لئے لگایئے!

ہمیں یقین ہے کہ آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ مملکت خداداد پاکستان کا معاملہ دنیا کے دوسرے مسلمان ممالک سے بہت مختلف ہے۔ اس ملک کے لئے جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا' بقاء و استحکام کی واحد بنیاد صرف اور صرف اسلام ہے۔ لہٰذا یہاں اسلام کے خلاف اٹھایا گیا ہر قدم دراصل اس ملک کی جڑیں کھودنے کا باعث بنتا ہے۔

یاد رکھئے کہ ہم میں سے ہر ایک کو موت سے سابقہ پیش آنا ہے اور روز محشر اپنا دفترِ عمل لے کر اللہ جل جلالہ کے سامنے حساب کتاب کے لئے حاضر ہونا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ مسلمان قوم کو اخلاقی آوارگی اور جنسی بے راہروی کی راہ دکھانے والے اُس روز اپنے مالک حقیقی کے سامنے کس منہ سے حاضر ہوں گے؟

ہم توقع کرتے ہیں کہ آپ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے ٹی وی کا چلن درست کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلہ میں مثبت پیش قدمی سے یقیناً آپ کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوگا اور آپ محاسبۂ اخروی میں بھی سرخرو ہو سکیں گے!

بقیہ: الہدیٰ

عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ "ہاں اللہ کا احسان مانو اپنے اوپر کہ اس نے تمہیں اسلام کی توفیق دی اور تم ایمان ــــ، آئے ہو تو گویا کہ ایمان کی شاہراہ پر پڑ گئے ہو۔ اب ایمانِ حقیقی کی منزل تک بھی رسائی کی توقع کر سکتے ہو۔ اور دیکھو آسمان اور زمین کی ہر چھپی چیز بھی اللہ کے سامنے ہے...... اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے' لہٰذا جتلانے اور بار بار کہنے کی حاجت نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کس کے دل میں کتنا ایمان ہے اور کتنا نہیں ہے۔ بہرحال اسلامی معاشرے اور ریاست کی شہریت تمہیں حاصل ہو گئی' تم نے کلمہ شہادت زبان سے ادا کیا اب ارکانِ اسلام کی پابندی کرو' تم مسلمان تسلیم کئے جاؤ گے اور تمہارے حقوق جو ہیں دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے وہ محفوظ رہیں گے۔ لیکن اگر جاننا چاہو کہ وہ مقام مطلوب کیا ہے' ایمان کی اصل حقیقت کیا ہے تو اس معیار کو ذہن میں رکھو کہ یقینِ قلبی اور مجاہدۂ مسلسل۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ!

مشاہدات وتأثرات

"مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں"

چوتھی تربیت گاہ برائے مبتدی رفقاء کی ایک منفرد انداز کی رپورٹ

(مرتب: ہمایوں ارشد)

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

وہ بھی اس شبستان وجود کو لرزا دینے والی سحر تھی کہ اچانک میاں نعیم صاحب نے مجھے خوابِ غفلت سے بیداری کا اِذن دیا۔ دیدۂ ظاہری کے لئے اس میں کوئی بات لائق التفات نہ تھی، لیکن میری نگاہیں میرے مرشدِ معنوی کے عطاکردہ نور سے اس "عالمِ نو" کی سحر "بے حجابانہ" دیکھ رہی تھیں کہ جس کے چہرۂ افکار کی حشر سامانیوں اور سحر خیز نواؤں سے عالمِ فرنگ لرزاں ہے۔

یہ شب بیداری اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو صدیوں پر محیط امتِ مسلمہ کے تاریک دور کو گریزاں کرنے اور خواب غفلت میں پڑی اس قوم کو بیدار کرنے کے لئے ہر دور میں جاری رہی۔ ہماری تاریخ جذبۂ حُریت سے سرشار اور اپنا تن من دھن راہ خدا میں قربان کر دینے کے نشے میں ڈوبے ہوئے دیوانوں سے بھری پڑی ہے۔ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی نوید لے کر 'مبتدی رفقاء کے انفاسِ سوختہ کی دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلۂ جوالہ بنانے اور سلیقۂ شہبازی سکھانے کے لئے ہماری تربیت گاہ کے پہلے دن کا آغاز نماز تہجد سے ہوا۔

تربیت گاہ کا پہلا دور نماز اشراق پر ختم ہوا' جس میں نماز فجر تکبیر اولیٰ کی ترغیب کے ساتھ 'تلاوتِ قرآن پاک' قراءت وترتیل کی تشویق کے ساتھ 'ادعیۂ ماثورہ اور اذکار مسنونہ عشق واتباع کے سوز وگداز کے ساتھ شامل تھے۔

بقیہ دن کی مصروفیات میں چھ دروس کا اہتمام تھا' جن میں سے چار نماز ظہر سے پہلے اور دو نمازِ عصر اور عشاء کے درمیان تھے۔ نماز ظہر کے بعد آرام کا وقفہ تھا۔ امیر محترم کے روزانہ دو خطابات آڈیو اور وڈیو کے ذریعے دیئے جاتے تھے' جن کے موضوعات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) تنظیم اسلامی کا تعارف اور اسلام کا انقلابی منشور۔
(۲) حقیقت جہاد۔
(۳) قُربِ الٰہی بذریعہ فرائض ونوافل۔

(۴) پاکستان میں اسلامی انقلاب...... کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟۔
(۵) تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے اوصاف۔

اس کے علاوہ راہِ نجات، مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق، باطنی امراض اور ان کا علاج، تنظیم اسلامی کی ہیئت ترکیبی، فرائض دینی کا جامع تصور، امیر تنظیم اسلامی کا سوانحی خاکہ اور خانگی حالات، تنظیم اسلامی کے قیام کا مقصد اور دوسری دینی جماعتوں سے مابہ الامتیاز اور اصول قراءت وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر نہایت جامع دروس کا انتظام تھا۔

اس کے لئے جن حضرات کی خدمات حاصل کی گئی تھیں ان میں غلام محمد صاحب، ڈاکٹر عبدالخالق صاحب، محمد غوری صدیقی صاحب، محمد اقبال صاحب، میاں نعیم صاحب اور حافظ خالد صاحب کے نام شامل ہیں۔ ان تمام حضرات نے جس قدر محنت اور عرق ریزی سے ان موضوعات کی باریکیاں سمجھائیں وہ بہت متاثر کن تھیں۔ اور میرا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ امیر محترم نے ان جیسے بے شمار افراد کو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے چنا ہے اور اپنی شخصیت کے قالب میں ڈھال رہے ہیں۔
اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس سفر کو جاری رکھتے ہوئے اُس مضبوط "NUCLEUS" کی تیاری میں اپنی توانائیاں نچوڑ دیں جو کہ انقلابی جدوجہد میں اساس کی اہمیت رکھتا ہے۔

اس تربیت گاہ میں شرکاء کو کیا پیغام ملا اور جہدِ عمل کو کیا جلا ملی، ان سب موضوعات کا احاطہ تو مشکل ہے، تاہم چند سنگ ہائے میل کے ذریعے منزل مقصود کا فاصلہ ضرور متعین کرنے کی کوشش کروں گا۔

"قوم کے نام پیغام بعنوانِ اشعارِ اقبال"

ع حافظِ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

اسلام کے سماجی نظام کا یہ انقلابی پہلو، تہذیب حاضر سے خیرہ نگاہوں کو سحرِ باطل سے نجات دلانے کے لئے آب حیات ہے۔ یہ عریاں و برہنہ تہذیب حاضر جس نے ماؤں کو نام نہاد معیار زندگی کے کولہو میں جوت رکھا ہے اور آرٹ و کلچر کی ہوس ناکی کا شکم بھرنے کے لئے تہی آغوش کر دیا ہے۔ وہ محفلوں کے لئے شمع فروزاں تو بن سکتی ہیں، لیکن زہر قاتل سے مسموم یخ بستہ ہواؤں سے معصوم کونپلوں کو آغوشِ تحفظ عطا نہیں کر سکتیں۔ تربیت گاہ ہمارے لئے یہ نوید جانفزا لائی کہ "اے مومنِ محرومِ یقین اٹھ کہ اب وقت ہے کہ اپنے عملی نمونوں سے ثابت کر دیا جائے کہ زنِ حافظِ عصمت و عفت کی زرخیز گود ہی میں وہ نسلِ حیات افزا پروان چڑھ سکتی ہے، جو قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر سکے۔

؎ اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

معاشی انقلاب کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ہمیں بتایا گیا ہے کہ "بنی نوع انساں کا قافلہ صفحہء ہستی پر ابھی چند گام ہی چل پایا تھا کہ اس کی رگوں سے خون چوسنے کے لئے سودی نظام کی سفاک امر بیل نے اپنا جال پھیلا دیا اور دیمک کی طرح چاٹتی ہوئی آڑھت اور جاگیرداری نے اپنے پنجے گاڑ دیئے۔ اس طاغوتی نظام کے در و دیوار ہلا دینے والا اسلام کا معاشی نظام جہاں غریبوں اور مزدوروں کو نغمہء نوبہار عطا فرماتا ہے' وہیں اُمراء کو بھی یہ احساس دلاتا ہے کہ یہی وہ نظام ہے جو امیر و غریب کے درمیان بھائی چارے کی فضا پیدا کر کے غریب کو امیر کا حفیظ اور نگہبان بناتا ہے۔ یہی وہ نظامِ عدل و قسط ہے جو انسان کو اس خونی دلدل میں ڈوبنے سے بچاتا ہے کہ جس کے چھینٹوں سے اشتراکیت اور سرمایہ داری کا دامن تربہ تر ہے"۔

کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام
ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام

شمشیر و سناں کے سائے میں پروان چڑھنے والی وہ اُمّت کہ جس کے سَیلِ رواں کے سامنے عرب و عجم کے ناقابلِ تسخیر قلعے ریت کے گھروندے ثابت ہوئے' جن کی ٹھوکروں سے صحرا و دریا پامال ہوئے' جن کے فلک شگاف نعرۂ توحید سے وسعتِ افلاک میں ہیجان اور طوفان برپا تھا' آج وہ اُمّت بے نیزہ و شمشیر ہے اور یہود و نصاریٰ کی سیاسی اور اقتصادی غلامی کی زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہے اور اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ اُنہی کی تہذیب و اقتدار کی رسیا و اسیر ہے۔

وہ مسلمان جس کے لہو کی تپش آتش فشاں کے مانند تھی کہ محض ایک عورت کی فریاد پر ان کی غیرت و حمیّت کے طوفان نے ہند کے بت کدوں کو لرزا دیا تھا۔ آج اُسی مسلمان کا خون اسی کی بے جان شریانوں میں اس طرح منجمد ہو چکا ہے کہ قوم کی ان گنت ماؤں اور بہنوں کے تار تار دامنِ عصمت اس کی غیرت و مردانگی کی دہائی دیتے رہتے ہیں لیکن اس کے تنِ مردہ میں کوئی ہیجان برپا نہیں ہوتا۔

ہمیں تربیت گاہ میں حقیقتِ جہاد کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا گیا۔ اس کی لامتناہی گہرائی کا شعور بخشا گیا۔ اس کی حقیقی وسعتوں سے باخبر کیا گیا۔ جذبہء جہاد کے پیرہن سے جسد و روح کو آراستہ کرنے کا جذبہ و شوق پیدا کیا گیا۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تھا جو 'ناخوب' بتدریج وہی 'خوب' ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

یہ قرآن وہی صحیفہء رشد و ہدایت ہے کہ جس نے ریگزارِ عرب کے خوابیدہ ذروں کو وہ تابانی و درخشانی عطا فرمائی کہ تاریخِ انسان آج تک علم و عمل' رشد و ہدایت' اور ایمان و عمل کے وہ نمونے پیش

نے سے قاصر ہے۔ یہی وہ شمشیر بے زنہار ہے کہ جس کی ضرب کاری سے طاغوتی قوتیں تھرا اٹھیں
ں باطل لرزہ براندام تھا۔ یہاں تک کہ ظلمتوں کے پروردہ چلا اٹھے کہ جب تک یہ کتاب موجود
ے ہمیں امن و چین نصیب نہیں ہو سکتا۔

لیکن آج خود مسلمان ہی اس قرآن کی عظمت سے ناآشنا اور اس کے حقوق سے بیگانہ ہے۔
یں اس تربیت گاہ میں قرآن مجید کے حقوق کے سلسلے میں اس کی صحیح تلاوت کی ترغیب دلائی گئی، اس
لم حاصل کرنے کا شوق دلایا گیا اور اس کا پیغام لے کر مردانہ وار چہار دانگ عالم میں پھیل جانے پر
راستہ کیا گیا۔

> با نشۂ درویشی درساز و دمادم زن!
> چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!

جہاں جوش و ولولے کی ترغیب اور چیتے کے جگر اور شاہین کے تجسس کی تشویق لہو گرمانے کا بہانہ
رہی، وہاں جوئے اشکِ خوں اور داغ ہائے دل بھی دکھائے گئے جو تنظیم کی مہم عصر تحاریک کے ناپختہ
رات کا ثمر تھے۔ اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ ہر لحظہ اور ہر لمحہ رضائے الٰہی کو اپنی
ی وجہد وجہد کا مرکز بنایا جائے۔ اور کبھی کسی ثانوی مقصد کو بنیادی مقصد پر فوقیت نہ دی جائے۔ اور
بایہ کہ جہاد کے مراحل میں صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) نہایت اہم حصہ ہے۔ یہی وہ بھٹی
ے جس نے صحابہ کرامؓ کو کندن بنا دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ گوہر گراں مایہ جانثار عطا
ائے جن کی نظیر دنیا نے پھر کسی دور میں نہ دیکھی۔

ف آخر......

مجھے امید ہے کہ اگر ہمہ وقت رفعت و بلندی پر نگاہ رکھی گئی تو یہ تربیتی نظام بہتر سے بہتر ہوتا جائے
اور انشاء اللہ جلد وہ وقت آئے گا کہ جب یہاں سے وہ شاہکار تربیت پا کر نکلیں گے کہ جن کو مستقبل
مؤرخ شب کے راہب اور دن کے شہسوار کے لقب سے یاد کرے گا۔

> مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
> وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے!

آپ افغان مجاہدین پر اور پاکستان پر برہم کیوں ہیں؟

ایران کے اہلِ اقتدار سے ایک سوال

مکتبہ کارواں کے چودھری عبدالحمید صاحب صحافتی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ قومی و سیاسی مسائل پر ان کے تجزیے گاہے بگاہے روزنامہ "نوائے وقت" کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ چودھری صاحب کا زیرِ نظر مضمون ہفت روزہ "زندگی" میں شائع ہوا تھا۔ ان کی رائے سے کوئی اختلاف کرنا چاہے تو اُسے یہ حق حاصل ہے، لیکن ملتِ اسلامیہ کو درپیش جس مسئلے پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اس کی اہمیت اور نزاکت سے انکار ممکن نہیں۔ (ادارہ)

ایرانی انقلاب کے ابتدائی ایام میں ایک بڑی اہم خبر بڑے ہی غیر اہم انداز میں سنگل کالم میں شائع [illegible]ئی۔ خبر یہ تھی کہ ایران اور روس کے مابین باہمی آمدورفت (میوچل ٹرانسپورٹ) کا معاہدہ طے [illegible]لیا ہے۔ یہ فیصلہ علامہ خمینی کی رضا و رغبت کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایران ابھی اپنی داخلی کشمکش کے [illegible]وں سے چُور تھا اور اپنے ہمسایہ گرگ کو دعوتِ رفاقت دے رہا تھا۔ اتنی جلدی اتنا اہم فیصلہ محض [illegible]یکہ کو چڑانے کے لئے نہیں کیا گیا تھا، اس میں یقیناً قلبی لگاؤ اور ذہنی جھکاؤ کا عنصر بھی موجود تھا۔ اس [illegible]بعد ۱۹۸۷ء میں جب ابھی ایران عراق جنگ جاری تھی، خبر آئی کہ روس ایک معاہدے کے مطابق [illegible] صوبہ خوزستان (جہاں سے تیل نکلتا ہے) سے شمالی علاقوں تک ریلوے لائن بچھائے گا جو آگے [illegible]ر روسی ریلوے سے مل جائے گی۔ نیز اسی صوبے سے تیل کی پائپ لائن بھی بچھائی جائے گی جس [illegible]لیے ایرانی تیل روس بھیجا جائے گا۔

[illegible]ت گزرتا گیا اور ایران کے تعلقات دونوں ہمسایوں کے ساتھ مختلف سمتوں میں ترقی کرتے [illegible]انی زعماء جہاں امریکہ کو شیطان کبیر [illegible] [illegible]بنا رہے تھے، لیکن [illegible] [illegible]ان کی حمایت کرتے تھے۔ [illegible]

اس میں پیش پیش تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ پاکستان کے شدید ترین مخالف ایران کے قریبی دو
تھے۔ علامہ خمینی شہنشاہ کے خلاف اپنی کامیاب مہم سے فارغ ہوئے توانہوں نے پاکستان، ترکی
سعودی عرب کے خلاف فتویٰ دے کر حکم دیا کہ ان ممالک کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا جائے۔ پاکس
سے تووہ کچھ زیادہ ہی خفا تھے اور اگر عراق ان کا راستہ نہ بدل دیتا تو ان کا پہلا ہدف پاکستان ہی تھا
بھارت کو اپنا دوست اور پاکستان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ذرا ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔

ایرانی انقلاب کی کامیابی کے بعد ایرانی زعماء کا ایک اعلیٰ سطح کا وفد پاکستان آیا۔ اس وفد
ایرانی سفیر محترم گنجی دوست کے علاوہ آیت اللہ کے درجے کے چند اور بزرگ بھی موجود تھے۔ یہ
جمعے کے روز مسجد شہداء میں وارد ہوا اور انہوں نے اسی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ نماز کے بعد ان کی تقا
کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس مسجد سے ایرانی انقلاب کی تائید ہوئی تھی، للذا ہم اسی م
سے اہل پاکستان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے پاکستان کا دورہ شروع کر رہے ہیں۔ میں نے سوال کرنا
تو امام صاحب نے منع کر دیا لیکن جب سامعین کی طرف سے پیہم مطالبہ کیا گیا تو سوال کرنے کی اجاز
مل گئی۔ اتفاقاً میں صفِ اول میں مائیک کے قریب بیٹھا تھا۔ چنانچہ میں نے ہی سوال کر دیا۔ میں
اردو میں بات شروع کی تو محترم مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے جو بطور ترجمان اس وفد کے سا
منسلک تھے، مسکراتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو فارسی سمجھتے ہیں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میری بات سامعین بھی
لیں اور فاضلِ محترم حسبِ سابق ایرانی وفد کے لئے اس کا ترجمہ کر دیں۔ اب مجھے فارسی میں تق
کر کے اس کا ترجمہ بھی خود ہی کرنا پڑا۔ میں نے تمہید کے طور پر ایرانی وفد کا خیر مقدم کیا اور بالخصوص
کے اس اقدام کی توصیف کی کہ انہوں نے ایک سُنّی امام کی اقتداء میں ہمارے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کی۔ ا
کے بعد میں نے سوال کیا، "آپ کے بعض سینیئر سیاست دان پاکستان کے بارے میں معاند
جذبات رکھتے ہیں اور اس بارے میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ بھارت کو پاکستان پر ترجیح د
ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟" سفیر صاحب نے فرمایا کہ ایسے لوگوں سے ہم بھی ب
ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بیزاری کی یہ کیسی علامت ہے کہ ایک شخص ایک روز اپنے اخبار میں یہ مضم
لکھتا ہے کہ "پاک بھارت جنگ کی صورت میں ہم بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف لڑ
گے، اس سے دوسرے روز اسی شخص کو وزیر اعظم کے منصبِ جلیلہ پر فائز کر دیا جاتا ہے؟" میری م
ایران کے وزیر اعظم موسوی سے تھی۔ میں نے عرض کیا، "ہم تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں لیکن آ
بیگانہ وشی کرتے ہوئے کفار کو ہم پر ترجیح دیتے ہیں۔ اخوت اور رفاقت کی یہ کونسی قسم ہے؟ ہم آپ
معتدل مزاج لیڈر بنی صدر کو پسند کرتے ہیں، لیکن آپ کے وزیر اعظم موسوی کے خلاف میں
مسجد میں اظہارِ نفرت کا ایک ریزولیوشن پیش کرتا ہوں۔" ریزولیوشن پیش کیا گیا اور مسجد میں تمام حاض
نے ہاتھ اٹھا کر بڑے جوش و خروش سے اس کی تائید کی۔ میں نے دیکھا کہ اس قرارداد کی منظوری
ان سب کے رنگ متغیر ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد یہ وفد جو پورے پاکستان کا دورہ کرنے آیا تھا، م

کرشن نگر کی شیعہ مسجد تک گیا اور اپنے دورے کا بقیہ پروگرام منسوخ کر کے واپس ایران چلا گیا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے 'ایران آج بھی بھارت کو پاکستان پر ترجیح دیتا ہے اور بھارت ' کشمیر اور پاکستان میں ایران کو اپنا قبلہء سیاست ماننے والوں کی غالب اکثریت اسی پارٹی کا ساتھ دیتی ہے جو ہماری ثقافت اور روایات کا ستیاناس کرنے پر تلی ہوئی ہو اور جو ہمارے اسلامی تشخص سے بر سرپیکار ہو۔

جہاں تک روسیوں اور ان کے اشتراکی گماشتوں کے خلاف افغان مجاہدین کی جنگِ آزادی کا تعلق ہے 'ایران میں مقیم ہزارہ جات کے مہاجرین نے اس میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا اور اگر لیا ہے تو برائے نام! اس لئے کہ ایران روس کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا' بلکہ وہ اس سے اپنی لاتعلقی کی قیمت بھی وصول کرنا چاہتا تھا۔ ایسی خبریں بھی آتی رہیں کہ ہزارہ جات کے مہاجر نجیب حکومت سے تعاون کر رہے ہیں۔ کابل میں متعین ایرانی سفیر اور ان کا عملہ جو سابقہ دور میں لئے دیئے سا رہتا تھا' اب نجیب حکومت کی دعوتوں میں شریک ہوتا ہے اور وہاں کے سوشل معاملات میں حصہ لیتا ہے۔ ہمارے اخبارات ان خبروں سے مصلحتاً چشم پوشی کرتے ہیں' لیکن اب مصلحت آمیز خاموشی کا وقت گزر چکا ہے اور ضروری ہو گیا ہے کہ اہل وطن کو اپنے "دوستوں" کی روباہی سیاست سے آگاہ کر دیا جائے۔ مبادا ہماری یہ "مروت" کسی بہت بڑے حادثے کا باعث بن جائے۔ اربابِ اقتدار سے میری گزارش ہے کہ گاندھی جیسی نمائشی دوستی کے فریب میں نہ آئیں۔ قائداعظم کی طرح کھل کر صاف بات کریں۔

ایرانی مجلس کے صدر جناب رفسنجانی جو اپنے ملک کے سالارِ اعلیٰ بھی ہیں' روس کے ساتھ مضبوط تر روابط قائم کرنے کے لئے متعدد خفیہ اور علانیہ معاہدوں پر دستخط کر چکے ہیں۔ ان میں افغانستان کا مسئلہ اہم ترین ہے۔ ایران اپنے ہشت جماعتی شیعہ کارڈ کے زور پر اپنے حصے کا "گوشت" طلب کر رہا ہے۔ یہ ہشت جماعتی اتحاد دراصل ہفت جماعتی اتحاد کے نہلے پر دہلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ یہ صرف ایک ہی گروہ ہے جس کا لیڈر خلیلی نامی ایک شخص ہے' دوسرے گروہ کو جو غالباً سنیوں پر مشتمل تھا' ایرانیوں نے ملک بدر کر دیا تھا۔ ایرانی مہاجرین کے مطالبات کی سابقہ تاریخ سے تائید نہیں ہوتی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ ماقبل جنگ کے افغانستان میں کوئی شیعہ کسی محکمے یا وزارت میں ڈائریکٹر (رئیس) کے عہدے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ایران کے سنیّوں کا حال بدستور خراب ہے۔ انہیں تہران میں مسجد بنانے کی بھی اجازت نہیں۔ بدلے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایران اب مضطرب پانیوں میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے بے چین ہے۔ چنانچہ ایران میں مقیم شیعہ مہاجرین نے افغانستان کی آئندہ حکومت میں ۲۵ فیصد حصہ طلب کر لیا ہے جو تناسب آبادی کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ مغربی جرمنی کے ہفت روزہ اخبار "سپیگل" کے مطابق "یہ لوگ ایرانی انٹیلی جنس سے ہدایات لیتے ہیں جو اپنے روسی دوستوں کو ہر قیمت پر خوش کرنا چاہتی ہے" .... ایرانی مہاجرین کے لیڈر خلیلی کا کہنا ہے کہ اسے پاکستانی زعماء کی بات ماننے کے بجائے کابل میں متعین

روسی سفیر سے بات کرنے کا حکم ہے۔ (بحوالہ فرنٹیئر پوسٹ) روس نے تو "حلوائی کی دکان اور دا جی کی فاتحہ" کے محاورے پر عمل کرتے ہوئے ایران کو یہ پیشکش بھی کر دی ہے کہ افغانستان میں جنگ بندی کے عوض ہزارہ جات میں ایک خود مختار شیعہ حکومت قائم کر دی جائے گی۔ حالانکہ تعلقات میں بہتری پیدا کرنے کا اولین تقاضا تو یہ تھا کہ روس 'ایران کو اس کا محروسہ علاقہ آذر بائیجان واپس کر دیتا۔ یاد رہے کہ آذر بائیجان کا علاقہ تقریباً آدھا آدھا روس اور ایران کے قبضے میں ہے۔ چنانچہ اسی نسبتِ خاص کی وجہ سے جناب رفسنجانی نے اپنے دورۂ روس کے موقع پر ایک روز آذر بائیجان کے دورے کے لئے بھی نکال لیا۔ روسی پیشکش کا مطلب یہ ہے کہ افغانستان کے عین قلب میں ایران کا تیر پیوست رہے گا۔

بعض لوگ روسی قیادت کو اس بات کی داد دیتے ہیں کہ اس نے افغانستان سے اپنی فوج واپس بلا کر امن پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ روسی فوج کے چند ہزار سپاہیوں کی موت سے روس کے اندر جو ہنگامے کھڑے ہوئے تھے 'ان کو فرو کرنے کے لئے فوج کو واپس بلایا گیا تھا۔ ملی ہونے کی وجہ سے یہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور اپنے ملک کے لئے خوشدلی سے کوئی قربانی نہیں دے سکتے۔ روسی قوم کی بزدلی ضرب المثل ہے۔ مجھے اس وقت دوسری عالمی جنگ کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ جنگ کے ابتدائی ایام میں جرمنی اور روس آپس میں حلیف تھے۔ دونوں نے پولینڈ کے بارے میں "نصفٌ لی و نصفٌ لکمْ" کہہ کر یہ فیصلہ کیا کہ اپنے اپنے حصے پر حملہ کر کے اسے فتح کر لو۔ جرمنی نے ا واک اوور کر کے اپنے حصے پر تسلط جمالیا۔ روس کا معاملہ خُرد رگِل کا سا ہو گیا۔ اس کا جو قدم آگے بڑھتا' وہی پیچھے ہٹ جاتا۔ آخر ہٹلر کی فوج نے وہ حصہ بھی فتح کر کے روس کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ روسی کوئی جنگجو قوم نہیں۔

ان کی امن پسندی کے ہم کیسے قائل ہو جائیں جب ان کی طرف سے ہتھیاروں کی سپلائی بہت بڑے پیمانے پر بدستور جاری ہے۔ انہوں نے صرف اپنے جوانوں کی جانیں بچائی ہیں 'شرارت سے ہاتھ نہیں کھینچا۔

بقول غالب ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

ان کا مقابلہ ان لوگوں سے ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھتے ہیں 'جو رجز پڑھتے ہوئے سر سے کفن باندھ کر میدان میں جاتے ہیں اور پھر شہید یا غازی بن کر مقصدِ حیات کو پا جاتے ہیں۔ ان کا اقبال کی طرح عقیدہ ہے کہ ؎

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید؟
مرگ است صیدے تو در کمینی!

(اے ہمیشہ زندہ رہنے والے، کیا تو موت سے ڈرتا ہے؟ موت تو تیرا شکار ہے۔ تو اس کی مات میں ہے)

افغانستان کے بارے میں پاکستان اور اقوام متحدہ کی پالیسی یہی رہی ہے کہ اس کی اصلی حیثیت بحال کی جائے جس کا اقتضا یہ ہے کہ افغانستان ایک آزاد مسلمان ریاست کی حیثیت سے نقشۂ عالم پر دوبارہ واپس آئے۔ البتہ ان دنوں ہماری اپنی پالیسی کچھ گومگو کی حالت میں ہے۔ مستقبل کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

آج کل بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "ایران اور پاکستان کی افغان پالیسی شروع سے ہی ایک رہی ہے"۔ حالانکہ یہ کبھی یکساں نہیں تھی۔ ایران نے ابھی ابھی عراق سے گلوخلاصی کرائی ہے۔ کوئی نیا جھنجٹ مول لینا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ایران، پاکستان کے ساتھ افغان پالیسی پر تبادلہء خیال کرنے کا روادار نہ تھا۔ ہمارے وزیر خارجہ کو صرف اتنی "اجازت" تھی کہ اپنی بات سنا لے۔ ان کی طرف سے کبھی کسی ردِعمل کا اظہار نہیں ہوا۔ مگر آج کے تبدیل شدہ حالات میں پوری ایرانی حکومت جلے پیروں کی بلی بن کر اِدھر اُدھر اس طرح سلسلہ جنبانی کر رہی ہے کہ اس کا فائدہ ہمارے دشمنوں کو پہنچ رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایران پہلے کی طرح خاموش رہے اور مجاہدین کے راستے میں کانٹے بچھانے سے احتراز کرے۔

اب اس بدقسمت ملک کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کرنے کی تجاویز بھی سامنے آرہی ہیں۔ ہمارے موجودہ حکمران خاندان کا جھکاؤ بھی چونکہ ایران کی طرف ہے، اس لئے خطرہ ہے کہ وہ اس دامِ ہمرنگِ زمیں کے حلقے کسنے میں خود بھی شامل نہ ہو جائیں۔ وزیراعظم زیارات کے لئے ایران جانا چاہتی ہیں۔ انہیں وہاں جاکر کسی معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے اس کے مضمرات پر سو بار سوچنا ہوگا۔

آنے والا دور جنگِ افغانستان کو کیا نئی شکل عطا کرتا ہے، اس کے بارے میں پیش گوئی کرنا ابھی مشکل ہے، شاید تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرائے گی۔ جناب رفسنجانی کا مشن کئی طرح کے وسوسوں کو جنم دیتا ہے۔ محبِ وطن اہلِ صحافت (جو کسی ملک کا چوتھا اور مضبوط ستون کہلاتے ہیں) پر لازم ہے کہ وہ اس کے مضمرات سے قوم کو آگاہ کریں۔ اشارے کنائے سے نہیں، واضح اور واشگاف الفاظ میں!

پچھلے دنوں محترم گورباچوف نے ازبکستان سے ایک آواز لگائی ہے کہ یہاں کی سُنّی اکثریت شیعہ اقلیت پر ظلم ڈھا رہی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی اشتراکی لیڈر بلکہ سربراہِ مملکت نے اس انداز میں بات کی ہے۔ مدبّر اور فہمیدہ لوگ جلتی پر تیل نہیں ڈالا کرتے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اور اس سے ان کا کیا مقصد ہے؟ کہیں وہ اس خطے میں شیعہ سنّی فساد تو نہیں کرانا چاہتے؟

میری گزارش ہے کہ ایران، افغانستان کے بارے میں دخل در معقولات کرنا چھوڑ دے تو صرف ہزارہ جات ہی نہیں، پورا افغانستان اس کا دوست بن کر رہے گا۔ اگر آپ ایک مختصر سا کوہستانی

علاقہ اپنے زیر اثر لا کر پورے ملک کو تباہ کر دیں تو یہ کوئی دانشمندی نہیں۔ روس کے اندر سے احیاءِ اسلام کی خبریں مسلسل آ رہی ہیں۔

کوئی معمولی بات نہیں کہ اشتراکی قیادت خود یہ شکایت کر رہی ہے کہ "بنیاد پرست مسلمان" روس میں ہنگامہ خیزی کر رہے ہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ ۷۲ سال کے جبر و قہر کے باوصف یہ بنیاد پرست مسلمان زندہ کیسے رہ گئے؟ وقت اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ روس کے اندر اور روس کے باہر ہم آپس میں اتحاد و اتفاق کی مثال پیش کرکے ایک مضبوط موقف اختیار کریں اور تاریخ کے دامن سے اپنے اپنے حصے کے دھبے دھو ڈالیں۔

(۴)

نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہونا وقت کا امر ہے

مراد آباد (بھارت) سے ملتِ اسلامیہ کا درد رکھنے والے ایک بزرگ کا خط

تازہ میثاق سے امر بالمعروف نہی المنکر کے عالی عمل کی بشارت ملی۔ اس وقت پورا عالمِ اسلام اِس عمل کا محتاج ہے۔ جو عذاب منڈلا رہے ہیں اور جو برس رہے ہیں اُن کا تریاق یہی ہے۔ یہ وقت کا امر ہے۔ اِس کو چلانے والے اور چلنے والوں کے لیے دِلوں سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ ہماری ملّت اِس وقت جس حال میں ہے اس کے لیے یہی راہِ عمل کارگر ہے۔ آپ کے اس اقدام نے پاکستان کی بقاء کی راہ نکالی ہے۔ اِس وقت ملکی دُور ہی پر چلا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے لیے ایک غیبی نظام کارفرما ہے۔ نواب لیاقت علی خاں شہیدؒ کے بعد جو کچھ ہوتا رہا ہے اب اس سے بھی زیادہ بھیانک صورتِ حال ہے۔ حق تعالیٰ استقامت و قبولیت عطا فرمائے۔ میرا عریضہ میثاق میں دے دیجئے۔ پچھلا والا بھی دینا چاہیے تھا۔ ایک درخواست یہ ہے میثاق کی تحریر بہت باریک کر دی گئی ہے، یہ تو دعوت کے عظیم عمل کا شاہکار ہے۔ براہِ کرم سے خوب جلی قلم سے شائع کیا جاتا رہے۔ تاکہ ہر عامی معیار کا اور کمزور نگاہ والا مجھ جیسا بھی خوب مطالعہ کرکے عمل کی راہ پر پڑ سکے۔ چاہے مضامین کم ہو جائیں۔ ہم پیمانوں کے عادی ہیں خدا کرے آپ کی تشریف آوری ہو۔ براہِ کرم جب ہو تو ذرا قبل سے مطلع فرمائیں براہِ کرم ہوگا۔

غلام محی الدین ... قمری

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

تحریک رجوع الی القرآن

دینی تعلیم کا ایک سالہ نصاب

عربی زبان سیکھ کر قرآن حکیم کا براہ راست فہم حاصل کرنے کا بہترین موقع

——— لطف الرحمن خان

یہ بات اراکین انجمن کے علم میں ہے کہ قرآن اکیڈمی کے قیام کا اصل مقصد ایسے تعلیم یافتہ افراد کی تیاری ہے جو جدید علوم کی کسی بھی شاخ میں اعلیٰ علمی استعداد کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور قرآنی علوم پر بھی خاطر خواہ دسترس رکھتے ہوں تاکہ وہ قرآن مجید کے فلسفہ و حکمت کو دورِ حاضر کی اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔ کسی بھی علمی تحریک کی کامیابی کے لئے ایسے ادارے کا وجود ضروری ہے جو اس علمی تحریک کے مقاصد کی آبیاری کر سکے اور اس عمل کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

یہی وجہ ہے کہ اکیڈمی کی تعمیرات کی تکمیل کے فوراً بعد ۱۹۸۲ء میں فیلو شپ اسکیم کا آغاز کیا گیا جس میں سات اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے تعلیم و تعلمِ قرآن کے لئے زندگی وقف کرنے کے عزم کے ساتھ شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ ان میں سے اکثر آج بھی رجوع الی القرآن کی اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں "دو سالہ تدریسی کورس" کے نام سے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا آغاز کیا گیا جس میں ترجیحاً ایم۔ اے اور بی۔ اے پاس طلبہ کو داخلہ دیا جاتا تھا اور دو سال کے عرصہ میں عربی اور ترجمہء قرآن کی بھرپور تعلیم کے ساتھ ساتھ حدیث اور فقہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۷ء تک اس کورس میں چار گروپوں کے داخلے ہوئے جن میں داخلہ لینے والے طلبا کی مجموعی تعداد تقریباً ۸۰ تھی جبکہ تعلیم کی تکمیل کرنے والے طلبا کی مجموعی تعداد تقریباً ۳۰ رہی۔

"دو سالہ تدریسی کورس" میں تعلیم مکمل کرنے والے اکثر طلبا نے اپنے اپنے طبعی میلان اور صلاحیت کے مطابق میدانِ عمل منتخب کر کے ہماری تحریک رجوع الی القرآن کے ساتھ براہ راست وابستگی اختیار کی ہے اور اس سلسلے میں گرانقدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے والے جو طلبہ اپنی معاشی جدوجہد میں واپس چلے گئے ہیں وہ بھی اپنے اپنے حلقہ میں کسی نہ کسی انداز میں قرآن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی یہ خدمات بھی ہماری تحریک کا بالواسطہ اثاثہ ہیں۔

جو طلباء تعلیم مکمل نہ کر سکے ان کے متعلق ہمارا احساس اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ بھی کلیتاً تہی دامن

نہیں رہے۔ ان میں سے اکثر کے بارے میں بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جتنا عرصہ وہ اکیڈمی میں رہے انہوں نے کچھ نہ کچھ علم حاصل کیا' ان کی فکر موروثی عقیدوں کے ریگزار سے نکل کر علمی بنیادوں پر مستحکم ہوئی اور ان کے خدمتِ قرآنی کے جذبہ کی آبیاری ہوئی اور اب وہ اپنے معاشرہ میں الحاد و بے دینی کے سیلاب کے خلاف پہلی دفاعی لائن کی حیثیت سے ہماری جدوجہد میں شریک ہیں' گو بالواسطہ ہی سہی۔

مذکورہ بالا تجزیہ کی روشنی میں "دو سالہ تدریسی کورس" کا چار سالہ دور اگر قابل فخر نہیں تو مایوس کن بھی نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ اسی نے ہمیں یہ ہمت اور توفیق عطا فرمائی کہ موجودہ حالات اور معاشرہ میں ہم سے جو بھی بن پڑا ہم کر گذرے اور یہ بھی اسی کا کرم ہے کہ اُس نے ہمیں اس کام کو جاری رکھنے کا عزم نو بخشا ہے۔

یک سالہ کورس کا آغاز

دو سالہ کورس میں داخلوں کے دوران کچھ ایسے اصحاب سے بھی رابطہ ہوا جو دینی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ اور شوق تو رکھتے تھے لیکن ان کے لئے دو سال کے لئے چھٹی لینا یا کاروباری مصروفیات سے فراغت حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان لوگوں کا اصرار ہوتا تھا کہ اس کورس کی میعاد مزید کم کر کے اسے ایک سال میں مکمل کرانے کی منصوبہ بندی کی جائے۔

اس خواہش کو سامنے رکھ کر جب دو سالہ کورس کے نصاب کا جائزہ لیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ اس کورس کے پہلے سال دیگر مضامین کے ساتھ اصل تعلیم عربی زبان و قواعد کی ہوتی ہے' جبکہ دوسرے سال بنیادی اہمیت ترجمہ ءقرآن کو حاصل ہے چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک ہی سال کے اندر طلباء کو محکم بنیادوں پر عربی قواعد کی تعلیم بھی دی جائے اور ساتھ ہی قرآن حکیم کے منتخب مقامات کی تدریس کے ذریعے فلسفہ و حکمتِ قرآنی سے بھی انہیں روشناس کرا دیا جائے۔ گویا وہ بنیاد فراہم کر دی جائے کہ طلباء اپنے طور پر عربی زبان کی مزید تحصیل بھی کر سکیں اور ترجمہ ءقرآن کے معاملے میں انہیں دشواری پیش نہ آئے۔

یہ فیصلہ کرنے میں اس بات سے بھی مدد ملی کہ استادِ محترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کے ترجمہ ء قرآن کے مکمل دروس ٹیپ کر لئے گئے ہیں جو انجمن کے مکتبہ سے دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ "لغات و اعرابِ قرآن" پر ان کی تالیف ماہنامہ "حکمت قرآن" میں قسط وار شائع ہونا شروع ہو گئی ہے۔ ایک سالہ کورس مکمل کرنے والے طلباء مطالعہ ءقرآن میں ان دونوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس فیصلے کے پیش نظر ۱۹۸۸ء میں ایک سالہ کورس کے پہلے گروپ کو داخلہ دیا گیا جو انشاء اللہ اس سال ستمبر میں سالانہ امتحان دے کر فارغ ہو گا۔

اس گروپ میں کل ۲۲ طلباء نے داخلہ لیا' جن میں سے ۶ انجنیئر ہیں۔ ان میں سے ایک طالب علم نے

...نے سول انجینئرنگ میں M.S کیا ہوا ہے۔ شرکاء میں سے ۳ ڈاکٹر ہیں اور ایک طالب علم نے انگریزی ادب میں M.A کیا ہے۔ ۲۲ میں سے ۱۴ طلباء مختلف مرحلوں پر مختلف مجبوریوں کی بناپر کورس میں اپنی شرکت کو برقرار نہ رکھ سکے۔ لیکن ہمیں اندازہ ہے کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ سیکھ کر گئے ہیں بالخصوص وہ طلباء جو ششماہی امتحان کامیابی سے پاس کر کے گئے ہیں۔

باقی ۸ طلباء انشاء اللہ سالانہ امتحان میں شریک ہوں گے۔ یہ وہ طلباء ہیں جنہوں نے پورے سال خود کو تحصیل علم کے لئے وقف کئے رکھا اور یہی ہماری محنت کا حقیقی ثمرہ ہیں جس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کی محنت کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور انہیں اقامت دین کی جدوجہد کا سپاہی بنائے۔ (آمین)

واضح رہے کہ اس سے قبل دو سالہ مدرسی نصاب میں شریک طلبہ کو معین شرح سے وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ ...م۔ اے یا اس کے مساوی ڈگری رکھنے والے طالب علم کو ماہانہ ایک ہزار روپیہ اور گریجویشن تک تعلیم مکمل کرنے والے طالب علم کو ۸۰۰ روپے تک وظائف دیئے جاتے تھے۔ جبکہ ایک سالہ تعلیمی کورس کے شرکاء کو وظائف کی پیشکش نہیں کی جاتی۔

ایک سالہ کورس میں نئے داخلے

ایک سالہ کورس کے دوسرے گروپ کے لئے داخلہ کی درخواستیں انشاء اللہ ستمبر میں طلب کی جائیں ...۔ جو اصحاب اس کورس میں داخلہ کے متعلق سوچ رہے ہیں ان کی خصوصی توجہ کے لئے ہم چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

کورس کو درمیان میں چھوڑ کر جانے والے طلباء کے اپنے انفرادی حالات اور مسائل بھی یقیناً ہوتے ہیں لیکن ایسے تمام طلباء کے درمیان ایک مسئلہ مشترک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ صبح کے وقت تقریباً ساڑھے پانچ یا چھ گھنٹے کی پڑھائی کے بعد یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے کہ شام کو روزانہ دو تین گھنٹے اسباق کے اعادہ کے لئے وقف کئے جائیں۔ جو طلباء اپنی دفتری یا کاروباری مصروفیات کی بنا پر باقاعدگی سے ایسا نہیں کر پاتے ان کے لئے کلاس کے ساتھ چلنا ممکن نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں انفرادی مسائل ایک اضافی سبب بن جاتے ہیں۔

اس لئے داخلہ کا ارادہ رکھنے والے اصحاب سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اپنے معمولات کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیں کہ انہیں صرف صبح کے اوقات ہی تعلیم کے لئے فارغ نہیں کرنے ہیں بلکہ شام کے وقت بھی کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے اس مقصد کے لئے فارغ کرنے ہیں۔ دو سالہ اور ایک سالہ کورسز کا تجربہ ہے کہ جن طلباء نے اس کا اہتمام کر لیا انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کر لی اور اس سلسلہ میں حائل مسائل پر بھی قابو پانے میں کامیاب رہے۔

لمحۂ فکریہ

ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ بھی سوچنا چاہئے کہ دنیوی علوم کے حصول اور اس دنیا کی کامیابی کے لئے ہم اپنی زندگی کا کتنا حصہ کتنی تندہی اور یکسوئی کے ساتھ وقف کر چکے ہیں اور آئندہ کے لئے کیا منصوبے ہیں۔ لیکن اپنے رب کے کلام کو سمجھنے اور پڑھنے کے لئے کیا ہمارے پاس ایک سال بھی نہیں ہے جبکہ اس پر دائمی زندگی کی کامیابی کا انحصار بھی ہے اور اس زندگی کی حقیقی مسرتیں اور سکون بھی اسی پر منحصر ہیں۔

ہمارے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بہت چونکا دینے والا ہے کہ قیامت کے دن قرآن مجید یا تو ہمارے خلاف حجت بنے گا یا ہمارے حق میں۔ ایک اور حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین بار یا چار بار (یہاں راوی کو شبہ ہے) دوزخیوں کو آگ سے نکال کر لائیں گے اور جنت میں داخل کر دیں گے۔ اس کے بعد آپؐ فرمائیں گے کہ میرے رب! اب تو بس وہی لوگ رہ گئے ہیں جنہیں قرآن نے روک رکھا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِن فرامین کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جن کے خلاف حجت بنے گا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم رہیں گے اور ہمیشہ ہمیش کے لئے آگ میں رہیں گے۔ دوسری بات یہ سوچیں کہ قرآن کن کے خلاف حجت بنے گا اور وہ کون لوگ ہوں گے جن کو قرآن آپؐ کی شفاعت سے محروم کر دے گا؟ آپ کے فرمودات کی روشنی میں اس سوال کا جواب بھی بہت سادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس دنیا میں قرآن مجید کے حقوق کو ادا کرنے میں تساہل برتیں گے۔

اس ضمن میں زیادہ بہتر تو یہی ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا از سر نو مطالعہ کر کے ایک مرتبہ پھر ہم اپنا جائزہ لے لیں کہ قرآن کے حقوق کی ادائیگی میں ہم سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے؟ لیکن میں یہاں اُن حضرات کے لئے جنہوں نے دنیاوی تعلیم کے حصول میں برس ہا برس لگائے ہوں' ایک ایم اے نہیں کئی کئی ایم اے کئے ہوں یا کم سے کم یہ کہ گریجویشن میں ۱۴ سال کھپائے ہوں' مذکورہ بالا کتابچے کا ایک نکتے کا اختصار کے ساتھ بیان ضروری سمجھتا ہوں۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے بڑی وضاحت سے اس بات کو بیان کیا ہے کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لانے اور اس کی تلاوت کرنے کے بعد قرآن کا تیسرا حق یہ ہے کہ "اسے سمجھا جائے"۔ ظاہر ہے کہ کلام الٰہی نازل ہی اس لئے ہوا ہے اور اس پر ایمان کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ اس کا فہم حاصل کیا جائے۔ بغیر سمجھے صرف تلاوت کرنے کا جواز ایسے لوگوں کے لئے تو ہے جو تعلیم سے محروم رہ گئے۔ ایسے لوگ [illegible] تلاوت کرلیں تو بھی بہت غنیمت ہے اور اس کا ثواب انہیں ضرور ملے گا۔ لیکن

پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے تعلیم پر زندگی کا اچھا خاصا حصہ صرف کر دیا' بہت سے علوم و فنون حاصل کئے اور صرف مادری نہیں بلکہ غیر ملکی زبانیں بھی سیکھیں' اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو یہیں ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین کے مجرم گردانیں جائیں۔

قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے کے کئی درجے ہیں۔ اولین درجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کا رواں ترجمہ بھی ذہن نشین ہوتا چلا جائے اور قرآنی آیات میں نصیحت و عظمت کا جو پہلو ہے اسے انسان اخذ کرتا چلا جائے۔ اس درجے کو "تذکر بالقرآن" کہتے ہیں اور یہ ہر انسان کی ضرورت ہے خواہ وہ معاشرہ کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "تذکر" کے لئے قرآن کو انتہائی آسان بنا دیا ہے اور ایک ہی سورت میں چار مرتبہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہم نے آسان بنا دیا ہے قرآن کو یاد دہانی کے لئے۔ تو ہے کوئی یاد دہانی سے فائدہ اٹھانے والا"!!!

لیکن "تذکر بالقرآن" کے لئے عربی زبان کا اتنا علم حاصل کرنا ناگزیر ہے کہ تلاوت کرتے ہوئے متن سے نظر ہٹائے بغیر قاری اس کے مفہوم سے سرسری آگاہی حاصل کرتا چلا جائے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ عربی زبان کی اس قدر تحصیل ہر پڑھے لکھے مسلمان کے لئے فرض عین کا درجہ رکھتی ہے۔

ایک مسلمان جس نے بی۔ اے' ایم۔ اے پاس کیا ہو۔ غیر ملکی زبان سیکھی ہو۔ ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی ہو' وہ اتنی سی بھی عربی نہ سیکھ سکنے پر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کیا عذر پیش کر سکے گا؟ یہ وہ سوال ہے جس پر ہم سب کو ٹھنڈے دل سے اور پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے۔ اور اس اہم موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے جو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے "ایک سالہ تدریسی نصاب" کی شکل میں ہر پڑھے لکھے شخص کے لئے فراہم کیا ہے۔

خموشی گفتگو ہے

صحافت میں عریانی و فحاشی کی ترویج کے خلاف

کراچی میں ایک علامتی مظاہرہ

جولائی کا آخری ہفتہ کراچی میں شدید بارشوں کی نذر ہو گیا۔ برسات کی آفات سے متعلق اخبارات نے بڑی بڑی سرخیاں لگائیں لیکن اسی موسم میں یہاں ایک بڑا واقعہ رونما ہوا جس سے اخبارات نے بڑی حد تک اغماض برتا اور خبر کو غیر نمایاں کر کے چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔ معاملہ دراصل یہ تھا کہ تنظیم اسلامی (کراچی) نے اعلان شدہ دو روزہ پروگرام کے مطابق روزنامہ "نوائے وقت" اور "جنگ" کے دفاتر کے سامنے اخبارات و جرائد میں فحاشی و عریانی کی اشاعت کے خلاف خاموش و پرامن علامتی مظاہرہ کیا۔ تنظیم اسلامی نے ان مظاہروں کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اخبارات کے رنگین صفحات بالعموم اداکاراؤں، ماڈلوں اور آبرو باختہ عورتوں کی اداؤں کی عکاسی کے لئے وقف ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں باقاعدہ ایک دوڑ لگی ہوئی ہے، جس کے سدِباب کی اشد ضرورت ہے۔

بدھ ۲۶ر جولائی ۱۹۸۹ء کو مظاہرین تقریباً ۵ بجے شام سے ہی "نوائے وقت" کے قریب ایک مسجد میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے، جہاں انہوں نے تلاوتِ قرآن پاک اور اذکارِ مسنونہ میں مشغول رہنے کے بعد نماز عصر با جماعت ادا کی۔ شدید اور مسلسل بارش کے باوجود کراچی کے ہر علاقے سے افراد شریک ہوئے۔ بعد از نماز عصر تنظیم اسلامی (پاکستان) کے مرکزی ناظم تربیت میاں محمد نعیم صاحب نے مختصر خطاب کیا اور شرکاء مظاہرہ کو ضروری ہدایات دیں۔ بعد ازیں مظاہرین نے دو دو کی قطار میں "نوائے وقت" کے دفتر کی طرف مارچ کیا۔ شرکاء جو کہ پہلے ہی بھیگے ہوئے تھے موسلادھار بارش میں مزید بھیگتے ہوئے نوائے وقت کے سامنے پورے نظم و ضبط کے ساتھ پہنچ گئے۔ وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے۔

برہم ہوں بجلیاں کہ ہوائیں خلاف ہوں
کچھ بھی ہو اہتمامِ گلستاں کریں گے ہم!

شدید بارش کے باعث پلے کارڈز تو "ڈس پلے" نہیں کئے گئے البتہ بینرز کے ذریعے اپنے مدعا و مقصد کا اظہار ضرور کیا گیا۔ بینرز پر اخبارات کی انتظامیہ کو متوجہ و متنبہ کرنے کے لئے مختلف عبارات درج

گئے۔ جنگ بلڈنگ کے سامنے سے گزرنے والی ٹریفک میں "اخبارات و جرائد میں فحاشی و عریانی کے خلاف ایک دردمندانہ اپیل" کے عنوان سے ایک ہینڈ بل بڑی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ اس دوران نہ تو کسی قسم کی نعرہ بازی کی گئی نہ تقریر، حتیٰ کہ مظاہرین نے آپس میں گفتگو سے بھی اجتناب کیا اور ایک مثالی ڈسپلن کا مظاہرہ کیا۔ مظاہرین اللہ رب العزت کے ذکر سے طمانیتِ قلبی حاصل کرتے رہے۔ ٹریفک بھی حسبِ معمول رواں دواں رہی اور اس میں قطعاً کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ بارش کی وجہ سے دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی ٹریفک کے مسافر بڑی آسانی سے ہینڈ بل وصول کرتے رہے۔ پولیس کی موبائل گاڑی میں بیٹھے سپاہی بھی بڑی حیرت و استعجاب سے جائے وقوعہ کا معائنہ دور ہی دور سے کرتے رہے۔

دورانِ مظاہرہ تنظیم کے اکابرین نے نوائے وقت کی انتظامیہ سے ملاقات کی اور ایک عرضداشت پیش کی جس میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے اخبار میں عریانی و فحاشی کی اشاعت ترک کر دیں۔

اس مظاہرہ کو نقار خانہ میں طوطی کی آواز قرار دینے کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ عریانی و فحاشی کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی یہ ادنیٰ سی کوشش اللہ کے ہاں انشاء اللہ ضرور مقبول ہوگی۔ اگرچہ فضا میں ارتعاش پیدا نہ بھی ہو تاہم کسی درجہ میں مخاطبین کو متوجہ تو کیا جاسکے گا۔ کیا عجب کہ آئندہ اسی راہ پر چلنے کی ہمت پکڑنے والے کسی "فتح قریب" سے بھی نوازے جائیں۔ تنظیم اسلامی نے، جو کہ ابھی تنظیم سازی ہی کے مرحلے میں ہے، اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی دیگر جماعتوں کے لئے ایک جہت (LINE OF ACTION) متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تنظیم نے ابتدا کر دی ہے لیکن یہ بات مدِنظر رہے کہ ایسے مظاہروں کا مقصد سیاسی و گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر ابتغاءً اللہ کی رضا کا حصول ہی ہو۔ بندوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جب چاہے انہیں پلٹ سکتا ہے۔ ان معاملات میں دردمندی و دلسوزی اور جذبۂ نصح و خیر خواہی کو کسی صورت ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

اسی طرح "دوسروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت" کی کیفیت کا بغور جائزہ از حد ضروری ہے۔ اگر جذبہ سچا ہو تو "پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"۔

اگلے روز یعنی جمعرات ۲۷ر جولائی کو مظاہرین "جنگ" کے قریب ایک مسجد میں جمع ہوئے اور نمازِ عصر کے بعد قافلہ ترتیب دیا گیا، ہدایات دی گئیں اور پھر پُروقار خاموشی کے ساتھ "جنگ" کی طرف روانگی ہوئی۔ آج بارش نہیں ہو رہی تھی اس لئے مظاہرین بینرز کے علاوہ پلے کارڈز بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے فاصلے پر واقع جنگ کی عمارت کے سامنے مظاہرین خاموش کھڑے ہو گئے اور حسبِ معمول اذکارِ مسنونہ میں مشغول رہے۔ چند افراد نے ہینڈ بلز تقسیم کئے۔ اسی اثناء میں تنظیم اسلامی کے رہنماؤں نے "جنگ" کے مالک میر خلیل الرحمٰن سے ملاقات کی اور انہیں عرضداشت پیش کی۔ اُن کی توجہ فحش و مخربِ اخلاق مواد کی اشاعت کی طرف دلائی گئی اور یہ یاد دہانی بھی کرائی گئی

لہ ہر شخص کو موت کے مرحلے سے گزر کر حساب کتاب کے لئے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ اُس روز غفلت کے پردے چاک کر دیئے جائیں گے اور آنکھیں بڑی تیز بین ہو جائیں گی۔ یاد رہے کہ دو روز قبل ہی موصوف پر نامعلوم افراد نے قاتلانہ حملہ کیا تھا جس میں وہ بال بال بچ گئے تھے۔

کراچی کی فضاؤں میں یہ مظاہرے یقیناً بالکل انوکھے اور منفرد نوعیت کے تھے۔ ورنہ جس میں ہلڑ بازی نہ ہو' گاڑیوں کے شیشے تک نہ ٹوٹیں اور جس میں آنسو گیس تو کیا بارود کی بُو نہ رچ جائے وہ مظاہرہ ہی کیا۔ ٹریفک کا روک دیا جانا اور ٹائر جلا کر سڑکیں بند کر دینا تو ہے ہی مظاہروں کا جزوِ لازم لیکن جہاں خاموش مظاہرین 'انتہائی پر امن' ٹریفک کے لئے سہولت پیدا کرنے والے اور نعرہ بازی کی بجائے ذکر و اذکار کرنے والے ہوں تو مکار و چالاک طاغوت کو ضرور خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ "امن و امان" اور "ایمان" میں طاغوتی طاقتوں کو اپنی موت نظر آتی ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

شاید انہیں خبر نہیں کہ جو لوگ اہلِ ایمان میں فحاشی کی ترویج و اشاعت کے خواہشمند ہوں اُن کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں دردناک عذاب ہے اور واقعی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ کون کون سا عذاب سہہ رہے ہیں اور آخرت کا حال تو کلیتاً اللہ ہی کے علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

رحیم کاشفی

کراچی میں مبتدی رفقاء کے لئے تربیتی کیمپ کا انعقاد

(۲۱ تا ۲۸ جولائی ۸۹ء)

کسی بھی تنظیم کے لئے جو اپنے مقاصد کے حصول کی احسن انداز میں خواہاں ہو' کارکنوں کی مناسب تربیت ناگزیر ہوتی ہے اور جب کوئی تنظیم ملک کے نظام میں انقلابی تبدیلی چاہتی ہو تو اس تربیت کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

اسی حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تنظیم اسلامی نے اپنے رفقاء کی تربیت کا ایک مرحلہ وار نظام مرتب کیا ہے۔ اسی ضمن میں گزشتہ دنوں مبتدی رفقاء کے لئے کراچی میں ایک تربیتی کیمپ منعقد کیا گیا۔ یہ اقامتی تربیتی کیمپ ۱۷۔ اے' بلاک بی' نارتھ ناظم آباد' کراچی میں ۲۱ جولائی کو شروع ہوا اور ۲۸ جولائی کو کراچی کی مختلف تنظیموں کے مشترکہ اجتماع پر اختتام پذیر ہوا۔ اس کیمپ میں ۳۱ رفقاء نے مستقل جبکہ ۶ رفقاء نے جزوقتی شرکت کی۔ کیمپ کے پروگرام تنظیم کا تفصیلی تعارف' نصاب میں شامل ادبی [illegible] مطالعہ اور قرآن مجید کی تصحیح تلاوت کے علاوہ تزکیہ نفس اور ذکر و فکر کی محافل پر

صبح

رفقائے تنظیم کو شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس مصرعے کا مصداق بنانے کے لئے کہ ؏ "کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی" اکابرین تنظیم نے روزانہ پروگرام کا آغاز صبح ۴ بجے رکھا تھا۔ صبح صادق تک نوافل کا اہتمام اور چند منٹوں کے لئے ادعیہ ماثورہ اور اذکار مسنونہ کا مذاکرہ کیا جاتا تاکہ ہر رفیق کو یہ دعائیں اور اذکار ازبر ہو جائیں۔ اذان کے بعد سنتوں کی ادائیگی اور جماعت کے قیام تک قرآن مجید کی تلاوت کا پروگرام جامع مسجد المدینہ میں رکھا گیا تھا جو قیام گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تھی۔ نماز فجر کے بعد مسجد کے امام صاحب جو بنوری ٹاؤن کے دار العلوم سے فارغ التحصیل عالم ہیں درس قرآن دیتے۔ نماز اشراق کی ادائیگی کے بعد رفقاء واپس قیام گاہ آتے اور ساڑھے سات بجے تک آرام کرتے۔ ناشتہ کے بعد ساڑھے آٹھ بجے پہلا پیریڈ لگتا جو صدر انجمن خدام القرآن سندھ سراج الحق سید صاحب لیتے۔ ان کے لیکچرز کا اپنا ایک منفرد اسٹائل ہے جس میں ہلکے پھلکے مزاح کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے جس کی وجہ سے رفقاء ان کی بھاری بھرکم شخصیت سے مرعوب ہونے کے بجائے ان کے مذاکراتی انداز درس سے استفادہ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیکچرز کے دوران تنظیم کا تفصیلی تعارف، اس کا انتظامی ڈھانچہ اور ذمہ دار حضرات کی ذمہ داریوں کی تفصیلات کا بڑی خوبی سے احاطہ کیا۔ ساتھ ہی "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" نامی کتابچہ کا جو کہ مبتدی رفیق کے نصاب میں شامل ہے اجتماعی مطالعہ کرایا۔ ان کے لیکچرز کے دوران ایک خاص بات یہ نوٹ کی گئی کہ موصوف اپنے مزاج کی سختی کو، جس کے لئے وہ مشہور ہیں شاید اپنی قیام گاہ پر چھوڑ آئے تھے۔ ان کا پیریڈ ساڑھے نو بجے اختتام کو پہنچتا۔ دوسرا پیریڈ استماعِ کیسٹ کا ہوتا جس میں نصاب میں شامل مختلف موضوعات پر مشتمل کیسٹس سنائی جاتیں۔ اس کے بعد ۲۵ منٹ کے لئے چائے کا وقفہ ہوتا۔

وقفہ کے بعد ۱۰۔ ۱۲ تک ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر عبد الخالق کا پیریڈ ہوتا جس میں قرآن و حدیث کے حوالے سے اخلاقی برائیوں پر سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ ناظم اعلیٰ صاحب پیشے کے اعتبار سے ڈینٹل سرجن ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے چہرے پر گمبھیرتا زیادہ نظر آتی ہے لیکن گفتگو کا انداز نہایت مشفقانہ اور موثر ہوتا جس کی بناء پر رفقاء نے ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا۔ اس کے بعد مطالعہ لٹریچر کا پیریڈ ہوتا جو جناب اسد الرحمٰن صاحب لیتے۔ موصوف کراچی کے رفقاء میں درس قرآن کے حوالے سے زیادہ متعارف ہیں اور شاید یہ قرآن مجید ہی کا اعجاز ہے کہ ان کی گفتگو میں فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ انہوں نے بڑے ہی دل نشین انداز میں نصاب میں شامل کتب کا اجتماعی مطالعہ کرایا۔ نماز ظہر اور ظہرانے کے بعد قیلولہ کے لئے ۲ گھنٹے کا وقفہ ہوتا۔ ساڑھے چار بجے چائے پیش کی جاتی جس کے بعد رفقاء نماز عصر کی تیاری کرتے۔

انقلاب اسلامی کا لٹریچر قرآن مجید ہے جس کی تفہیم اور تبلیغ و تبیین کے لئے سب سے پہلی ضرورت اس کے الفاظ کی درست ادائیگی ہے۔ چنانچہ عصر اور مغرب کے درمیان صحیح تلاوت کا پیریڈ رکھا

"

تھا جو بہت مفید ثابت ہوا۔ قاری صاحب صحیح تلاوت کی مشق کروانے کے ساتھ ساتھ تجوید کے بنیادی قواعد بھی بتاتے۔ ان کے دلچسپ انداز تعلیم نے شرکاء میں فن تجوید کے لئے خاصی دلچسپی اور پیاس پیدا کردی۔

نماز مغرب کے بعد امیر محترم کے خطابات کے ویڈیو کیسٹ دکھائے جاتے۔ یہ خطابات امیر محترم نے "تنظیم اسلامی کا تعارف اور اسلام کا انقلابی منشور" کے عنوان سے گزشتہ ماہ لاہور میں منعقد ہونے والی تربیت گاہ میں فرمائے تھے۔ یہ خطابات چھ ویڈیو کیسٹ پر مشتمل تھے لیکن افسوس کہ وی سی آر میں خرابی کی بناء پر یہ کیسٹ مکمل طور پر نہ دیکھے جاسکے۔ نماز عشاء کے بعد کھانا ہوتا اور پھر آرام کیا جاتا۔

آپ حیران ہوں گے کہ پورے دن کی روداد میں ناظم تربیت صاحب کا کہیں ذکر ہی نہیں آیا .. ہمارے مرکزی ناظم تربیت جناب میاں محمد نعیم صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر رقصاں رہتی ہے۔ شب و روز کی مصروفیات کے باوجود تھکان کا نام و نشان بھی کسی وقت نظر نہیں آتا۔ اس تربیتی کیمپ میں اگرچہ انہوں نے براہ راست تعلیم و تدریس کے فرائض انجام نہیں دیئے لیکن تمام پروگراموں کی تنظیم و ترتیب اور تقسیم اوقات کا نظام انہی کے باصلاحیت ہاتھوں میں تھا۔ اس کیمپ میں جناب ناظم تربیت نے کراچی کے رفقاء کو بھرپور موقع دیا کہ وہ آئندہ کے پروگراموں کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ سوائے جناب ناظم اعلیٰ کے پروگرام کے باقی تمام پروگرام کراچی کے رفقاء ہی نے کنڈکٹ (CONDUCT) کئے۔

جناب ناظم تربیت نے رفقاء سے امیر محترم کے خانگی و معاشی حالات پر خطاب کیا جس میں رفقاء کو امیر محترم کی پر عزیمت زندگی کے بارے میں تفصیلات بہم پہنچائیں اور ان میں بھی راہِ عزیمت پر گامزن ہونے کا ولولہ پیدا کیا۔ .. جناب ناظم تربیت نے اخبارات کے دفاتر کے سامنے ہونے والے فحاشی و عریانی کے خلاف مظاہروں میں بھی اپنی بہترین تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا

اس تربیت گاہ کا نقد نفع تو یہ حاصل ہوا کہ رفقاء کے آپس کے تعلقات میں پختگی پیدا ہوئی اور یقیناً انہوں نے اس تربیت گاہ کے دوران "دین کے جامع تصور" کو سمجھتے ہوئے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کی اہمیت کا اندازہ کر لیا ہوگا اور "تنظیم اسلامی کے قرار داد تاسیس اور اس کی توضیحات" کے لئے "اسلام کے انقلابی منشور" کو ذہن نشین کر لیا ہوگا اور (ULTIMATE CONSEQUENCES) اب وہ اللہ تعالیٰ سے تنظیم اسلامی کے سایہ دار درخت سے پیوستہ رہ کر امید بہار لگائے اس کی آبیاری میں مصروف ہوں گے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امیر محترم کے اس حسن ظن کو عملی صورت عطا فرمادے جو انہیں اس خطہ زمین سے احیائے اسلام کے سلسلے میں ہے۔ آمین۔

مرتب، عبدالسمیع، کراچی

اخبارات میں عریانی وفحاشی کی بڑھتی ہوئی وبا کے خلاف

راولپنڈی میں رفقاء تنظیم اسلامی کا مظاہرہ

امیر محترم کا ماہانہ درس قرآن کیمونٹی سنٹر ہال اسلام آباد میں گزشتہ تقریباً سات سال سے منعقد ہو رہا تھا۔ جس میں کبھی کبھی امیر محترم کی ملک سے غیر حاضری یا کبھی کسی اور سبب سے ناغہ ہو جاتا تھا۔ لیکن اس سال حکومت کی طرف سے بندش کے باعث درس قرآن کا انعقاد نہ ہو سکا۔ (اس سلسلے میں تفصیلی وضاحتی نوٹ ماہ جون کے میثاق کے "عرض احوال" میں شائع کیا جاچکا ہے) بالآخر پچھلے ماہ مسجد الشہداء آب پارہ اسلام آباد میں ۷ر اگست ۱۹۸۹ء کے لئے امیر محترم کے درس قرآن کا انعقاد طے پایا اور موضوع وہی رکھا گیا جس پر حکومت نے پابندی لگادی تھی۔ یعنی "اسلام میں مساواتِ مردوزن"۔ اس درس سے متصل اگلے روز یعنی ۸ر اگست ۱۹۸۹ء بعد نماز عصر راولپنڈی میں روزنامہ "جنگ" اور "نوائے وقت" کے دفاتر کے سامنے خاموش احتجاجی مظاہرے کا پروگرام بھی اسی موقع پر ترتیب دیا گیا۔

ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب ۶ر اگست بعد دوپہر راولپنڈی تشریف لے آئے اور بعد نمازِ عصر اسی دن رفقائے تنظیم اسلامی راولپنڈی اسلام آباد کا ایک اجتماع منعقد ہوا' جس میں دیگر امور کے علاوہ مظاہرے کے انعقاد سے متعلق انتظامی معاملات کی تفصیلات طے کی گئیں۔ اگلی صبح جناب ناظم اعلیٰ نے راقم کے ہمراہ مظاہرے سے متعلق جگہوں کا جائزہ لیا۔ فاصلوں کا اندازہ کیا گیا اور دیگر جزئیات پر غور کیا۔ اسی شام امیر محترم کا درس قرآن بخیر و خوبی منعقد ہوا اس کے بعد عمومی سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ پشاور اور چکوال کے بعض رفقاء مظاہرے میں شرکت کی غرض سے درس سے قبل ہی اسلام آباد پہنچ چکے تھے۔ نماز عشاء وہیں مسجد میں ادا کی گئی۔ اور اس کے بعد مہمان رفقاء قیام کے لئے فیری لینڈ سکول سٹلائٹ ٹاؤن روانہ ہو گئے۔

اگلے دن یعنی ۸ر اگست کو لاہور' گجرات اور فیصل آباد سے بھی بعض رفقاء راولپنڈی پہنچ گئے۔ شام پانچ بجے تمام رفقاء نے لیاقت باغ کے سبزہ زار میں درختوں کی چھاؤں میں مولانا فیض الرحمن صاحب کی اقتداء میں نماز عصر ادا کی۔ نماز سے قبل تمام رفقاء کو ضروری ہدایات کی یاددہانی کرائی گئی۔ اور سینئر رفقاء کے ذمے مختلف فرائض سونپے گئے۔ اس کے بعد رفقاء پہلے سے طے شدہ جگہ پر جمع ہو گئے اور تشکیل (FORMATION) مکمل کی گئی۔ یہاں سے روزنامہ "جنگ" کے دفتر کا فاصلہ ۱۰۰ میٹر سے زیادہ نہ تھا۔ جسے طے کرنے کے بعد رفقاء باوقار انداز میں بالکل خاموشی سے 'حسب ہدایت دل میں اللہ کا ذکر کرتے ہوئے مقررہ ہدف پر رک گئے۔ ترتیب وہی تھی۔ یعنی دو قطاروں میں [illegible] اور بینرز لئے اس حال میں کہ سڑک اور روزنامہ "جنگ" کا دفتر" دونوں سامنے کی [illegible]

جیسے ... [illegible] ... چہرے، صاف ستھرا لباس، سر ڈھانپے ہوئے، من میں اپنے رب سے لو لگائے، نظم و ضبط کے پابند، حق کا کلمہ بلند کرنے والے اور باطل سے نہ دبنے کا عزم رکھنے والے لوگ جو ... [illegible] ... افراد کی یہ جمعیت ایسے کھڑی تھی جیسے ایک تسبیح کے دانے۔

صف بندی کے ذمہ دار چودھری محمد اسحاق صاحب، عبدالرزاق صاحب، یونس قریشی صاحب تھے۔ آٹھ رفقاء کی ایک ٹکڑی جس کے ذمے دو ورقہ تقسیم کرنا تھا۔ غلام مرتضیٰ اعوان صاحب کی سربراہی میں مستعدی سے اپنا کام سرانجام دے رہی تھی۔ روزنامہ جنگ کے سامنے آدھ گھنٹہ خاموش مظاہرہ کرنے کے بعد اسی صف بندی اور ترتیب سے رفقاء مری روڈ پر صدر کی جانب پیدل روانہ ہو گئے۔ دو کلومیٹر کا فاصلہ وقت کی کمی کے باعث تیزی کے ساتھ بیس منٹ میں طے کر کے رفقاء بینک روڈ پر واقع روزنامہ "نوائے وقت" کے دفتر کے سامنے پہنچ گئے اور اسی نظم و ضبط کے ساتھ خاموش احتجاج کی تصویر بن کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں بھی بڑی تعداد میں دو ورقہ تقسیم کیا گیا۔ موقع پر موجود پولیس دستے کے نگران آفیسر سے راقم کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔

انہوں نے مظاہرے کے موضوع اور طریق کار کو بہت سراہا۔ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے ہر دو اخبارات کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر صاحبان کو ایک ایک یادداشت بھی پیش کی، جس میں اخبارات میں تیزی کے ساتھ پھیلتی ہوئی بے پردگی اور عریانی کی وباء کی جانب انہیں دلسوزی کے ساتھ متوجہ کیا گیا تھا اور ملک و قوم اور دین و مذہب کی خیر خواہی کے حوالے سے انہیں اپنے طرز عمل میں اصلاح کی تلقین کی گئی تھی۔ آدھ گھنٹے کے بعد یہ مظاہرہ اختتام پذیر ہوا۔ رفقاء پورے نظم کے ساتھ وہاں سے چل کر جی ٹی ایس کے یارڈ میں پہنچے جہاں بینرز اور پلے کارڈز اکٹھے کئے گئے۔ اس کے بعد قریب ہی مارکیٹ چوک میں جامعہ اسلامیہ کی مسجد میں نماز مغرب ادا کی گئی۔ نماز مغرب کے بعد مہمان رفقاء کے لئے قریب ہی ایک گھر میں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

الحمد للہ کہ اس مظاہرے کی تیاری سے لے کر اختتام تک تمام مراحل بہت حسن و خوبی سے مکمل ہوئے۔ اور نظم میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آیا۔ جو یقیناً بہت خوش آئند بات ہے۔

ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ ان کا دھیما اور شگفتہ انداز سب کو بہت بھایا۔ قیام و طعام کا انتظام جناب اکرم واسطی صاحب نے بہت محنت اور مستعدی سے کیا۔ پشاور سے جناب غلام رسول رحمانی صاحب، راولپنڈی سے جناب عابد اکرام اللہ صاحب اور جناب رؤف اکبر صاحب نے رفقاء کی مہمانداری میں خصوصی معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی محنتوں کو شرف قبول عطا فرمائے۔ (آمین)

اس مظاہرے کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ راولپنڈی میں تنظیم اسلامی کا تعارف وسیع پیمانے پر ہوا۔ عوام کا ردعمل معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اس مظاہرے کو بحیثیت مجموعی سراہا گیا اور ایک نہایت مہذب انداز مظاہرہ اُن کے سامنے آیا ہے۔ ایک پولیس آفیسر نے یہاں تک کہا کہ ایسے مظاہرے مسلسل ہوتے رہنے چاہئیں۔

مرتب: محمد نیاز مرزا، راولپنڈی

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd.L.No
VOL.38
SEPTEMBER